تاریخِ انقلاباتِ عالم

حصّہ اوّل

ابوسعید بزمی ایم۔اے

کتاب منزل لاہور

تاریخِ انقلاباتِ عالم

ابوسعید بزمی
ایم۔ اے



کتاب منزل لاہور

نوائے کارگر: احسان دانش کی اس معرکہ آرا کتاب میں اُن کی وہ شاعری ہے جس کی آج ملک اور قوم کو ضرورت ہے۔ اس کی بیشتر درد انگیز نظموں میں نسوانی معاشرت کے بیمار پہلوؤں کی منظر کشی میں احسان اس مقام پر نظر آتا ہے جہاں شاعر کا ہر لفظ اس کا شاہکار ہوتا ہے۔

قیمت تین روپے آٹھ آنے

چراغاں: یہ کتاب بھی احسان دانش کی اُنہیں نظموں کا باقی سلسلہ ہے جو نوائے کارگر میں آئی ہیں کیونکہ اس میں بھی ورق ورق پر وہی حقیقی نقاشی وہی اخلاقی دیانت وہی جزئیات نگاری بول رہی ہے۔

قیمت۔ دو روپے آٹھ آنے عہ

آتشِ خاموش: اس کتاب میں نوائے کارگر اور چراغاں کی طرح آنسوؤں کا زیادہ حصہ نہیں بلکہ ایسی نظمیں ہیں جو فاقوں اور غمگینیوں کا نتیجہ کہلائی جا سکتی ہیں۔ اس کی ہر نظم میں شاعر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے سماج پر برستا ہے اور پڑھنے والے کا خون جوش کھانے لگتا ہے۔

قیمت۔ دو روپے عہ

جادۂ نو: یہ کتاب ان جدید طرز کے قطعات کا مجموعہ ہے جس میں اس حساس شاعر نے سیکڑوں مختلف مناظر اور معاشرت کے خستہ پہلوؤں کو تشبیہی عمل سے چولی دامن کیا ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ احسان کو قدرت نے نقاشِ فطرت پیدا کیا ہے مگر یہ کتاب بھی اس کا ایسا شاہکار ہے جو اُسے تاریخ کے صفحات میں محترم رکھے گا۔

قیمت سوا روپیہ عہ

زخم و مرہم: یہ کتاب بھی قطعات کا مجموعہ ہے جس میں عموماً دیہاتی زندگی کے بیشمار مرقعے اس شان سے ملیں گے جو صحیح معنی میں جدید ادب کہلانے کے مستحق ہیں اور جن میں شوخی بھی ہے، اور معصومیت بھی، سادگی بھی اور پرکاری بھی۔

قیمت۔ ڈیڑھ روپیہ عہ

[redacted]

کتاب منزل، لاہور

تاریخ انقلاباتِ عالم

جلد اوّل

سیّد ابوسعید بزمی ایم۔اے

کتاب منزل۔ لاہور

پی۔آر۔بی۔ایس پریس انارکلی لاہور میں باہتمام شیخ نیاز احمد
پرنٹر پبلشر چھپ کر کتاب منزل
لاہور سے شائع ہوئی

بار اوّل
۱۹۴۹ء

قیمت مجلد دس روپیہ

انتساب

اعلیٰ حضرت نواب سیّد رضا علی، ایل، ایل، ڈی، ڈی لٹ
فرمانروائے ریاست رام پور نے قیامِ پاکستان سے پہلے
اس کتاب کا مسودہ دیکھا، پسند کیا، اور اس کی اشاعت میں
عملی ہمدردی فرمائی، انقلاباتِ عالم کا یہ بھی کتنا دلچسپ منظر
ہے کہ جس کتاب کا موضوع شہنشاہیت شکن اور امارت شکن
ہے اُس کو ایک "امیر الامرا" نے اپنے نام سے انتساب کی اجازت
بھی دی، — اب اگرچہ وہ بساط اُلٹ گئی لیکن میں اِن
اوراق کا انتساب انہی کے نام کرتا ہوں۔ کیونکہ اب اس
انتساب میں ایک نئے معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ دراصل اس
امر کا اعتراف ہے کہ ایک نواب کے سینے میں بھی وہ چنگاری
روشن ہو سکتی ہے جو بزمِ انقلاب کو منوّر کرتی ہے۔

وَذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ

سیّد ابو سعید بزمی

تعارف

انقلاباتِ عالم کا موضوع اتنا وسیع ہے۔ کہ اگر اس کے ساتھ انصاف کیا جائے تو اس جیسی پچاس جلدیں بھی کم ہیں لیکن آج کی مصروف دُنیا میں ہر شخص کے پاس اتنی مہلت کہاں کہ وہ اتنی ضخیم جلدوں کے مطالعے کا وقت نکال سکے۔ اس لئے فاضل مصنف سیّد ابوسعید صاحب بزمی نے ان اوراق میں ایک مصروف انسان کے لئے دریا کو کوزے میں بند کر کے پیش کرنے کی جو کوشش کی ہے، وہ ہر لحاظ سے داد کی مستحق ہے اس کے لئے طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے۔ کہ تاریخ کے بنیادی واقعات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ پڑھنے والے کی قوّت متخیلہ کے سامنے تفصیلات و جزئیات کا نقشہ خود بخود کھنچ جائے۔

اس جلد میں انگلستان، امریکہ (شمالی وجنوبی) آسٹریلیا، جاپان، چین، انڈونیشیا فلپائن، ہند چینی، سیام، ملایا، وسطی وجنوبی افریقہ، آسٹریلیا ہندوستان اور پاکستان شامل نہیں ہیں۔ اور جو ممالک شامل ہیں۔ اُن کے انقلاب کی تاریخ بھی ۱۹۳۹ء تک ہے۔ ۱۹۳۹ء کی جنگ کے نتیجے میں جو عظیم الشان انقلاب ہماری آنکھوں کے سامنے ظہور پذیر ہُوا ہے۔ اُس کی تفصیل کے لئے (نیز مذکورہ بالا ممالک کے احوال کے لئے) دوسری جلد مخصوص کی گئی ہے۔ اور اگر کوئی ناگہانی افتاد پیش نہ آئی۔ تو امید ہے کہ دو ڈیڑھ ماہ کی مُدت میں وہ بھی پیش کی جاسکے گی۔ اس کا مسودہ تیار ہے صرف طباعت وکتابت کے مراحل سے گذرنا ہے

ملک کے بعض مشہور ارباب علم نے اس کتاب پر ایک تفصیلی تعارف لکھنے کی پیشکش کی تھی۔ لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے صرف اس مختصر سے تعارف پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔ علاوہ ازیں بزمی صاحب کو ہمارے ملک کی دنیائے صحافت وسیاست اور دُنیائے علم وادب میں جو حیثیت حاصل ہے۔ اُس کی بناء پر، غالباً کسی لمبے چوڑے تعارف کی ضرورت بھی نہیں۔

ناشر

تاریخ کی تاریخ

جب آپ کسی طوفان کا، کسی سیلاب کا، کسی ہنگامہ خیز حادثے کا، یا اسی قسم کے کسی اور واقعے کا حال بیان کرتے ہیں تو عموماً اس کے تین ہی طریقے ہوتے ہیں:۔

(۱) کتابیں پڑھ کر اور دوسروں کی زبان سے حالات سُن کر، پردۂ تخیل پر ایک نقشہ تیار کیا جائے اور پھر اُسے الفاظ کی شکل دے دی جائے۔

(۲) حالات کا مشاہدہ خود اپنی آنکھ سے کیا ہو، اور پھر فرصت کے لمحات میں اس مشاہدے کو دوسروں تک پہنچایا جائے۔

(۳) خود آپ پر سب کچھ بیتا ہو اور جب سب کچھ ہو چکا ہو، تو آپ میز پر بیٹھ کر ان تجربات کو قلم کے حوالے کریں۔

عموماً واقعات کو بیان کرنے کی یہی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایک چوتھی شکل بھی ہے اور وہ یہ کہ عین اُس وقت جب کہ آپ واقعات و حوادث کے طوفانی دھارے میں ہچکولے کھا رہے ہوں، آپ ان تجربات کو بیان کریں، اس حالت میں کبھی آپ کے ہاتھ سے قلم چھوٹ جاتا ہو، کبھی زبان بہک جاتی ہو، کبھی ہوا کا کوئی تیز جھونکا کاغذ کے اوراق کو بکھیر کر رکھ دیتا ہو، اور کبھی کوئی سرکش بگولا آپ کو اٹھا کر کہیں سے کہیں پھینک دیتا ہو، مگر آپ ہوں کہ حالات کو بیان کرتے چلے جا رہے ہوں، کہے چلے جا رہے ہوں، کبھی ہوش میں اور کبھی

بے ہوشی میں، کبھی اپنے آپ میں رہ کر اور کبھی اپنے آپے سے باہر ہو کر

کبھی آ کے منظرِ عام پر، کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

اب یہ فیصلہ کرنا تو آپ کے اختیار میں ہے کہ ان چاروں طریقوں میں سے واقعات کو صحیح سے صحیح تر شکل میں پیش کرنے کا بہترین طریقہ کونسا ہے، میں تو صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ یہ صفحات جو آپ کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں، اسی چوتھی شق سے تعلّق رکھتے ہیں ــــــــــ یعنی انقلاباتِ عالم کی یہ داستان، ٹھیک انقلابات کے دھارے میں بیٹھ کر لکھی گئی ہے: پہلی سطر سے لے کر آخری سطر تک!

ان اوراق کی تحریر کا آغاز دسمبر ۱۹۴۲ء سے ہوتا ہے، جب میں ڈیفینس آف انڈیا ایکٹ کے تحت بھوپال جیل میں دو سال کے لئے بند تھا،

لیکن اصل میں اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف کا خیال مجھے ۱۹۳۷ء کے آخر میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ۱۹۳۵ء کے آئین کے ماتحت پہلی بار ہندوستان کے صوبوں میں نیم آزاد قسم کی وزارتیں قائم ہوئی تھیں اور سارا ملک ایک نئے ہنگامے سے دوچار تھا، برِّصغیرِ ہند کی تاریخ میں یہ اپنی قسم کا پہلا تجربہ تھا جس میں بہت سی نئی امیدیں پیدا ہوئیں اور بہت سی پرانی امیدیں خاک میں ملتی نظر آئیں، خصوصاً ہندو مسلم سوال نے ایک نیا چولا بدلا تاہم میں چونکہ عملی سیاست سے دُور تھا، اس لئے خیال تھا کہ ایک تماشائی کی طرح دُور سے ان حالات کو دیکھتا رہوں گا، اور اطمینان کے ساتھ اپنی میز پر

بیٹھ کر مؤرخ کے فرائض سرانجام دیتا رہوں گا، لیکن نئے حالات کے نتیجے میں، انقلاب کی جو ہوائیں اب برِ صغیرِ ہند کے کونے کونے میں آندھی بن کر چلنی شروع ہو گئی تھیں، انہوں نے میرا دامن بھی پکڑ لیا اور مجھے سکون کا ایک مہینہ بھی میسّر نہ آ سکا، کبھی بمبئی سے کوئی آواز اٹھی اور مجھے اپنی طرف کھینچ لے گئی، کبھی بنگال کی خاک نے صحرا نوردی کی دعوت دی، کبھی جنوبی ہندوستان نے گریبان کھینچا اور کبھی وسطی و شمالی ہندوستان کی خاک چھاننی پڑی۔

اسی زمانے میں ہندوستانی ریاستوں کی تحریک نے بھی ایک نیا چولا بدلا اور چونکہ میرا سکونتی تعلّق ریاست بھوپال سے ہے (جو وسطِ ہند اور راجپوتانہ کے ریاستی جمگھٹ کے بیچ میں واقع ہے) اس لئے وہاں کی سیاست نے زیادہ شدّت سے میرا دامن کھینچا۔ ۱۹۳۹ء کے آخر میں دوسری جنگِ عظیم کے نقارے پر چوٹ پڑی اور اس کے چند ماہ بعد ہی، بھوپال کے دوستوں نے وہاں کی مجلسِ آئین ساز کے الیکشن میں مجھے کشاں کشاں دھکیل دیا، رجعت پسندی کی تمام انقلاب شکن طاقتیں میرے خلاف صف آرا ہو گئیں اور میرے سامنے ایک نیا نقشہ کھنچ گیا، صبح سے لے کر شام تک اور شام سے لے کر صبح تک مختلف قسم کے لوگوں سے نرالے قسم کی بحثوں میں سر کھپانا پڑا، آخر ۱۹۴۰ء کے اوائل میں، یہ قصّہ ختم ہوا، اور بھوپال کے ہندو مسلم عوام کی اکثریت نے رجعت پسندی کی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مجھے اپنی نشانی کے طور پر بھوپال لیجسلیٹو کونسل کا ممبر منتخب کر لیا،

اس ہنگامے کے بعد میرا ارادہ تھا کہ اب کسی نئے ہنگامے کو دعوت نہ دوں گا

اور سکون کے ساتھ تاریخ انقلاب کی ترتیب شروع کردوں گا، لیکن ابھی میرے انتخاب کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ میرے دس بارہ ساتھی گرفتار کر لئے گئے۔ میں اس گرفتاری کے وقت بھوپال میں نہ تھا، مگر جیسے ہی یہ آواز میرے کانوں میں پہنچی، بھوپال پہنچا اور اس سلسلے میں جو کچھ کہہ سکتا تھا، اُسے ایک بیان کی صورت میں پیش کیا، یہ بیان میں نے واقعات کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لئے لکھا تھا، اس کے فوراً ہی بعد مجھ پر پھر سنیچر سوار ہوا، اور مختلف سیاسی و نیم سیاسی اجتماعات کے سلسلے میں مختلف مقامات پر جانا پڑا۔ اس دوران میں بھوپال کونسل کے اجلاس کی تاریخیں آگئیں اور مجھے واپس بھوپال آنا پڑا، مگر ابھی مجھے اس سرزمین پر قدم رکھے، چند گھنٹے بھی گزرنے نہ پائے تھے، کہ ڈیفینس آف انڈیا کے بھوپال ایڈیشن کے تحت مجھے گرفتار کر لیا گیا۔

قصّہ کوتہ گشت، ورنہ دردِ سر بسیار بود!

تاہم اس عرصے میں تاریخ انقلابات کے لئے بہت سا ضروری مصالحہ میں نے جمع کر لیا تھا، اور جلد سے جلد اس کام کو ختم کر لینا چاہتا تھا، اس لئے اس گرفتاری کو میں نے آیۂ رحمت سمجھا اور خیال کیا کہ جیل کی چہار دیواری میں سکون کے ساتھ بیٹھ کر اس کی تکمیل کر سکوں گا،

مگر جیل میں پہنچنے پر مجھے یہ بتایا گیا، کہ یہاں قلم دوات، کاغذ، کتاب یا اخبار کی قسم کی کوئی چیز نہیں مل سکتی، مل ہی نہیں سکتی، بلکہ اگر اتفاق سے کسی طرح اندر آجائے، تو لانے والے اور رکھنے والے دونو کو سزا ملے گی، فرشِ خاک

پر سونا ہوگا، صبح سے شام تک مشقّت کرنی ہوگی، شام کو لوہے کی سلاخوں کے پیچھے تالے کے اندر گھُپ اندھیاری میں بند ہونا ہوگا، کسی قیدی سے بات چیت کرنے کی اجازت نہ ہوگی، اور رات شروع ہوتے ہی، چاہے نیند آئے یا نہ آئے فرشِ خاک پر دراز ہو جانا ہوگا، جہاں سے سر اٹھا کر بھی کسی سے بات چیت کرنے کی اجازت نہ ہوگی، اٹھ کر بیٹھنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

کھانے پینے کی خرابی، بستر و چارپائی کی عدم موجودگی، مچھر اور کھٹمل وغیرہ کی ایذا رسانی، قید خانے کی غلاظت و گندگی سے اُنس پیدا کر لینا تو کوئی بڑی بات نہ تھی مگر لکھنے پڑھنے، سوچنے اور غور کرنے پر جو پابندیاں تھیں، وہ روحانی موت کے برابر تھیں، میں جیل میں احتجاج کا قائل نہیں، مگر کتاب، کاغذ اور قلم دوات کے لئے مجھے اپنے اس اصول میں ترمیم کرنی پڑی اور آخر کئی ماہ کی کشاکش کے بعد لکھنے پڑھنے کی اجازت حاصل ہوئی مگر اخبارات اور سیاستِ حاضرہ کی کتابیں دیکھنے کی اجازت آخر تک نہ دی گئی؛

میں نے اسی کو غنیمت سمجھا، اور انقلاباتِ عالم کی تاریخ کا خاکہ دماغ میں تیّار کرنے لگا، مگر سیاستِ حاضرہ کی کتابوں پر جو سنسر تھا، اس نے عجیب و غریب شکل اختیار کر لی، مثلاً انگلستان کی تاریخ پر کچھ کتابیں میں نے منگوائیں، تو انہیں اس لئے نہ آنے دیا گیا کہ ان میں جارج پنجم تک کے واقعات ہیں۔ جو سیاستِ حاضرہ کے دائرے میں آجاتے ہیں، مصطفٰے کمال کی زندگی پر جو کتابیں تھیں ان پر بھی اعتراض کیا گیا ——— اور جناح، ابوالکلام، جواہر یا گاندھی کی قسم کا تو نام بھی اگر کتاب کے کسی صفحے پر جیلر صاحب کی نظر پڑ گیا تو وہ سنسر کے

لیے کافی سمجھ لیا گیا،

تاہم اس سنسر کو میں دوا کے کڑوے گھونٹ کی طرح پیتا رہا، اور جو کتابیں بھی اس بے ڈھب سنسر کے شکنجے سے نکل کر مجھ تک پہنچتی رہیں، انہی کو غنیمت جانا۔

اس طرح سنہ ۱۹۴۷ئہ کے آخر میں، جیل کی آہنی سلاخوں کے اندر، اس کتاب کا ذہنی خاکہ، جو کئی سال سے تیار کیا جا رہا تھا، کاغذ پر منتقل ہونا شروع ہوا۔

تقریباً دو سال تک، یعنی رہائی سے چند دن پیشتر تک لکھنے کا یہ کام جاری رہا

اس دوران میں اتفاق سے جیل کے ارباب اختیار میں سے ایک صاحب نے "قیدیوں" کے حالات کی نگرانی کرنے والے ایک دورے میں، ان اوراق کو بھی چند منٹ کے لیے اِدھر اُدھر سے دیکھا، اور تنبیہہ کے طور پر فرمایا "یہ سب کچھ آپ نے کہاں سے لکھا جب کہ ہم نے سیاستِ حاضرہ کی کسی کتاب کو دیکھنے کی اجازت نہ دی تھی؟"

مگر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی ارشاد ہوا، "بہرحال چونکہ آپ کی رہائی کے دن قریب آ گئے ہیں، اس لئے میں کچھ باز پرس تو نہیں کرتا، البتہ یہ بتائے دیتا ہوں کہ آپ یہ پلندہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکیں گے، اس لئے رہائی کے وقت آپ ان کاغذات کو دفتر میں جمع کرا دیں، جہاں ان کو سنسر کیا جائے گا، اور اگر حکومت نے منظوری دے دی تو بعد میں آپ کو واپس کر دئے جائیں گے"۔

یہ دھمکی میرے قلب و دماغ پر بجلی بن کر گری، حکومت کا سنسر جیسا کچھ ہوتا ہے، میں جانتا تھا، مجھے یقین تھا کہ اگر اس شکنجے سے یہ اوراق گزرے، تو پھر کبھی مجھے نہ مل سکیں گے —— اس لئے مجبوراً مجھے "صدر دروازے" کے بجائے "چور دروازے" کی تلاش کرنی پڑی اور آخر بڑی کشاکش کے بعد، توڑ مروڑ کر ان اوراق

کو جیل سے باہر نکالا گیا۔

تاہم اگرچہ ان اوراق کی ضخامت چھ سو فلسکیپ سے زائد تھی، مگر یہ کوئی مرتب کتاب نہ تھی، بلکہ مختلف واقعات پر منتشر قسم کے نوٹ تھے، تاریخ و سیاست کی تمام ضروری کتابیں اور اخبارات و رسائل چونکہ میسّر نہ تھے، اس لئے جگہ جگہ اضافے اور نظرِ ثانی کی ضرورت تھی، بہت سے واقعوں، تاریخوں اور ناموں کی تفصیل تحقیق طلب تھی، پھر بھی چونکہ ایک خاکہ تیار ہو گیا تھا، اس لئے خیال تھا کہ رہائی کے بعد اس کی تکمیل آسانی سے ہو سکے گی،

مگر ابھی رہائی کو پانچ ہی دن ہوئے تھے کہ ۸ راگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کا ریزولیوشن پاس کر کے ایک نیا ہنگامہ بپا کر دیا، میں بھی اس میں اُلجھ گیا۔ میری گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا، مگر اتفاق سے اس سے کچھ ہی پہلے میں بھوپال سے باہر چلا گیا تھا،

اب میری زندگی خانہ بر دوشوں کی سی زندگی تھی، ہندوستان کے گوشے گوشے میں نئے نئے روپ کے ساتھ گھوم رہا تھا اور انقلاب کے نئے نئے نظارے دیکھ رہا تھا، آخر دو تین ماہ کے بعد میں نے اس سلسلے کو ختم کیا، اور "مدینہ" (بجنور) کی ادارت کے ٹوٹے ہوئے سررشتے کو پھر سے جوڑ کر بجنور میں مقیم ہو گیا، خیال تھا کہ بجنور کی پُر سکون فضا میں، ان اوراق کی ترتیب بہت جلد ممکن ہو سکے گی، مگر وہاں پھر حالات نے چٹکی لی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایک مضمون پر ڈیفینس آف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا، کئی مہینے تک یہ سلسلہ چلتا رہا ——— جب یہ ختم ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ بجنور کی

قصباتی فضا اگرچہ سکون کے لحاظ سے شہری فضا سے اچھی ہے لیکن علمی ریسرچ کے لئے جن لوازم کی ضرورت ہوتی ہے، وہ وہاں میسر نہیں آسکتے، اس لئے ارادہ کیا کہ دہلی آؤں، مگر بعد میں قرعۂ فال لاہور کے نام پڑا اور ۱۹۴۵ء کے اوائل میں یہاں آکر کام شروع کیا گیا۔

جن دوستوں نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا، اُن کے ناموں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن فرداً فرداً ان سب کا ذکر نہ کرنے کے باوجود، یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ ان اوراق کی تدوین و ترتیب میں ان کا اتنا ہاتھ ہے کہ اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ تاریخ تنہا میں نے نہیں لکھی، بلکہ ایک ایسے "بورڈ" نے تیار کی ہے جس میں میری حیثیت زیادہ سے زیادہ کنوینر یا چیرمین کی تھی۔

لیکن افسوس ہے کہ جنگ اور جنگ کے اثراتِ مابعد نے کاغذ کی فراہمی اور کتابت و طباعت کے دیگر لوازم کی دستیابی میں جو گوناگوں مشکلات پیدا کردی ہیں اُن کی بنا پر یہ اوراق اب بھی خاطر خواہ حُسن و زیبائی کیساتھ پیش نہیں کئے جاسکے۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں مسودے کے کچھ اوراق نظرثانی کے بعد کاتب کو دئے گئے مگر اب بھی اتنی مہلت نہ مل سکی کہ پابندی کے ساتھ کام ہوتا رہتا، کبھی کاتب نے دیر کی اور کبھی مسودہ نہ دیا جاسکا، غرض کوئی دو سال کی مدّت میں آٹھ سو صفحات کا یہ طومار مختلف مدارج سے گذر کر پریس تک پہنچا۔

مگر جنگ کے حالات نے ہر پریس پر کام کا جو زبردست دباؤ ڈال دیا تھا، اب اُسکا مقابلہ کرنے کی باری آئی، بہرحال کچھ دِن کی دوڑ دھوپ کے بعد یہ مرحلہ بھی ختم ہُوا اور چھپائی کا کام شروع ہُوا ——— کہ ناگاہ پنجاب میں ایک دُوسرا بگولا

اُٹھ کھڑا ہُوا۔ جنوری ۱۹۴۷ء کے آخر میں پنجاب لیگ نے بڑے زور شور سے سول نافرمانی شروع کی، جس کے نتیجے میں بازار کی ہر چیز اُلٹ پلٹ ہونے لگی، ڈیڑھ ماہ کی مدّت میں یہ قصہ ختم ہُوا تو پنجاب کی کولیشن وزارت نے استعفا دے دیا اور ایک نیا خلفشار مچ گیا، فسادات، کرفیو، قتل و غارت، اور اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ آپ سب کے سامنے ہے،

پریس ان مشکلات کی وجہ سے وقت پر کام نہ کر سکا، سنگسازی بھی ٹھیک طرح نہ ہو سکی، جگہ جگہ نقشے شامل کرنے کے لئے بلاک بنوانے کا جو پروگرام تھا، وہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا، یہ ہے اس تاریخ انقلاباتِ عالم کی مختصر سی تاریخ۔

اس میں جو خامیاں اور کوتاہیاں رہ گئی ہیں، اُن کو مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے، مگر اتنا عرض کر دوں کہ یہ سب کچھ نوکِ دار پر نہیں تو نوکِ خار پر کھڑے ہو کر لکھا گیا ہے۔ اس لئے ظاہری آب و رنگ کی کوتاہیاں ناگزیر تھیں، لیکن واقعات کو پوری دیانتداری اور سچائی کے ساتھ بے لاگ طور پر پیش کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے، وہ غالباً اس کوتاہی کی تلافی کے لئے کافی ہے،

ان اوراق کی ترتیب میں جس تصوّر کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، اُس کا ماحصل یہ ہے کہ ـــــ دُنیا ایک ہے، آج بھی ایک ہے اور آج سے ہزاروں سال پہلے، اُس وقت بھی ایک تھی، جب نہ ریل تھی، نہ تار برقی، اور نہ ہوائی جہاز ـــــ جب آدمؑ کی پہلی اولاد نے دُنیا میں بسنا شروع کیا تھا اور جب قابیل کو ہابیل سے شکایت پیدا ہوئی تھی، تب بھی ایک تھی، اور آج جبکہ ایٹم بم کا زمانہ ہے اور

بجلی کی کلوں کا جال ہر طرف بچھا ہُوا ہے، تب بھی ایک ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ انقلابات کا سلسلہ آدمؑ سے لے کر آج تک نہ تو کہیں منقطع ہوتا ہے اور نہ ایک جگہ کے واقعات سے دُوسری جگہ غیر متأثر رہی ہے آدمؑ کی پہلی اولاد یا نسلِ انسانی کی پہلی جماعت بندی کے بعد جس کشمکش اور جس انقلاب کی بنیاد رکھی گئی تھی، اُسی کشمکش اور اُسی انقلاب کا سلسلہ آج تک بدستور چلا جا رہا ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس اُلجھی ہوئی گتھی کا آخری سرا کب ملے گا،

انقلاباتِ عالم کا آغاز ٹھیک اُس وقت سے شروع ہو گیا تھا، جب انسان نے، یا یوں کہئے کہ انسانیت نے، ہوش کی پہلی کروٹ لی اور اُس کی خودی نے ہر معاملے میں "یوں نہیں بلکہ یوں" کی صدا بلند کرنی شروع کی۔

آج سے ہزاروں سال پہلے، انقلاب کی جو پہلی آواز اٹھی تھی، اُسی کی مسلسل کڑیاں ہیں، جو آج تک برابر ایک دُوسرے کے ساتھ لگی لپٹی چلی جا رہی ہیں —— اس لئے آج جو کچھ ہو رہا ہے، اُسے پچھلے انقلابات کی اُن لہروں سے جُدا نہیں کیا جا سکتا، جو ہزاروں سال پہلے، پہلی بار نمودار ہوئیں، گو زمانے کے لحاظ سے آج کا انسان، ہزاروں سال پہلے کے انسان سے بہت دُور ہے مگر انسانی تاریخ کے تسلسل کے لحاظ سے، جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہو چکا ہے۔ اسی کا ایک ملا جُلا سلسلہ ہے —— خواہ ہم اسے سمجھیں یا نہ سمجھیں۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ کوشش تو یہی کی گئی ہے کہ

یہ کتاب جس شکل میں جیل کی چہار دیواری میں لکھی گئی تھی، اُس میں زیادہ ردّوبدل نہ ہوا لیکن اس کے لکھنے سے لے کر آج تک دنیا ایک بہت بڑے انقلاب سے گزر گئی، جب اس کتاب کی آخری سطریں لکھی جا رہی تھیں، تب ہٹلر کا آفتابِ اقبال چمک رہا تھا، میسولینی آسمان کا ستارہ بنا ہوا تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا، کہ یہ دونوں مل کر ساری دُنیا کو اُلٹ ڈالیں گے، دُوسری طرف جاپان کا ستارہ بھی عرُوج پر تھا، اور اُس کی فتوحات کا سیلاب بلا کی طرح بڑھتا چلا جا رہا تھا، روس ہار رہا تھا، برطانیہ کے چھکّے چھوٹ رہے تھے، اور امریکہ بدحواس ہو رہا تھا، لیکن رفتہ رفتہ حالات نے رُخ بدلا اور دُنیا کا نقشہ کُچھ سے کُچھ ہو گیا،

اِن حالات کی بنا پر ان اوراق کے ابتدائی مسوّدے کو بھی آخر وقت تک بے شمار ترمیموں اور اضافوں کا شکار ہونا پڑا،

پھر جیل میں حوالے کی ساری کتابیں بھی میسّر نہ آسکی تھیں، اس لئے مجبوراً جو خلا واقعات کی ترتیب میں جگہ جگہ رہ گئے تھے، وہ بھی جیل سے باہر ہی آ کر پُر کئے گئے،

اس کا نتیجہ یہ ہوُا، کہ جیل سے رہائی کے وقت مسوّدے کی جو ضخامت تھی، وہ چھپتے چھپتے دُگنی سے زائد ہو گئی،

بہر حال آج جب کہ خود ہمارے ملک کی تاریخ میں بھی ایک انقلابی دور شرُوع ہو رہا ہے، یہ اوراق اس دُعا کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں، کہ خدا کرے آنے والے انقلاب میں، یہ کچھ مفید ثابت ہو سکیں +

ایم - ایچ - ماڈل ٹاؤن - لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۴۹ء سید ابوسعید بزمی

فہرس

باب ۱۱

باب ۱۲
یورپ کی نئی زندگی

باب ۱۳

باب ۱۴

باب ۱۵
اشتراکیّت و اشتمالیت

باب ۱۶
۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم

باب ۱۷

باب ۲۵

ایران

باب ۲۶

افغانستان

باب ۲۷

روس

باب ۱

زندگی اور زندگی کی کشمکش

"قابیل نے ہابیل سے باتیں کیں اور آخر ایک کھیت میں اپنے بھائی ہابیل کے خلاف بھڑک اٹھا اور اُسے مار ڈالا۔"

(توریت: پیدائش ۴)

زندہ رہنے کی کوشش کرنا، انسان کا سب سے پہلا فرض ہے۔ لیکن زندگی کیا ہے؟ زندگی نام ہے حرکت کا، زندگی نام ہے طاقت کا اور زندگی نام ہے اپنے ارادے، اپنی خواہش اور اپنی مرضی پر قدرت رکھنے کا۔ مشین بھی حرکت کرتی ہے اور طاقت بھی رکھتی ہے، مگر اُس کا نہ کوئی ارادہ ہے نہ کوئی خواہش و مرضی، اس لئے اس کی زندگی کسی دوسرے کی زندگی کے تابع ہے، اسی طرح صرف سانس لینے کا نام بھی زندگی نہیں۔ جب تک حرکت کے ساتھ طاقت اور طاقت کے ساتھ اپنے ارادے پر قدرت نہ ہو زندگی کے عناصر کی تکمیل نہیں ہوتی، ارادہ حیوانوں میں بھی ہے مگر ایک بالکل بندھا ٹکا ارادہ جسے نہ وہ بدل سکتے ہیں، نہ نیا ارادہ بنا سکتے ہیں۔ اس لئے ان کی زندگی، زندگی سہی مگر ناقص زندگی ہے۔ کامل زندگی کی نعمت انسان ہی کے حصے میں آئی ہے۔ اور قدرت کا منشا یہ ہے کہ ہر انسان مرتے دم تک اس زندگی کے لئے جدوجہد کرتا رہے، زمین کے اوپر اور زمین کے نیچے جو کچھ

ہی وہ سب اِسی زندگی کو حاصل کرنے اور برقرار رکھنے میں مدد دینے کے لئے بنایا گیا ہی۔ زمین اپنے خزانے اسی لئے اُگلتی ہی اور سمندر اپنی دولت اسی مصرف کے لئے وقف کئے ہوئے ہی۔ قدرت کی طرف سے ہر انسان کو ان ذخیروں سے فائدہ اٹھانے کا یکساں حق دیا گیا ہی۔ اور ہر ایک زندگی دوسروں کی زندگی کو مدد پہنچانے کے لئے بنائی گئی ہی تاکہ سب کے ملنے سے وہ عظیم الشان زندگی پیدا ہو جو قدرت کا اصل منشا ہی اور جس کے لئے یہ سارا کارخانۂ فطرت بپا کیا گیا ——— لیکن انسانی زندگی کا ابھی آغاز ہی تھا کہ انسان نے اپنے اس فرض کو بھلانا شروع کر دیا کہ اُس کی زندگی دوسروں کی زندگی کو مٹانے کے لئے نہیں بلکہ اُبھارنے کے لئے آئی ہی۔ آدم و حوّا کا خاکی پُتلا ابھی نظر بھر کر ہر چیز کو دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ ابلیسیت نے اُس پر اثر ڈالنا شروع کر دیا اور ابھی وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ قابیل نے ہابیل کی زندگی کا چراغ گُل کر کے کائنات میں اندھیر مچا دیا، انسانیت کی روح بہت چیخی مگر ابلیسیت کے شور و غوغا نے اس کی آواز دبا دی اور آج تک دبا رہا ہی۔

انقلاباتِ عالم کی تاریخ کا آغاز ہابیل و قابیل کے اسی واقعے سے ہوتا ہی یہ واقعہ دُنیا کی سب سے پُرانی کتاب توریت میں مذکور ہی اور قرآن نے بھی اس کی تصدیق کی ہی۔ انسانی معاشرت میں باہمی تصادم و تخالف کی کی ابتدار اسی واقعہ سے ہوئی ہی۔ قرآن و توریت دونوں کی رُو سے قابیل و ہابیل روئے زمین کے سب سے پہلے انسان آدم کے بیٹے تھے جن میں کسی بات پر اختلاف ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ قرآن و توریت میں یہ مذکور نہیں ہی کہ یہ اختلاف کس

بات پر ہوا تھا۔ البتہ قرآن کے قدیم مفسّروں نے اُس زمانے کے علمائے توریت سے جو کچھ سُنا تھا اُس سے پتہ چلتا ہی کہ اختلاف اس امر پر تھا کہ اُس کے عہد کے دستور کے مطابق جس لڑکی کی شادی ہابیل سے ہونی چاہئے تھی، اُس پر قابیل قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب اُس کے باپ آدم نے ہابیل کی حمایت کی اور قابیل ناکام رہا تو اُس نے غصّے میں آکر اپنے بھائی ہابیل کو مار ڈالا[۵]

تاریخی حیثیت سے بعض لوگ اس واقعے کو ماننے سے انکار کر سکتے ہیں لیکن قابیل و ہابیل کے وجود کو کوئی مانے یا نہ مانے، قابیلیت وہابیلیت کی اُس انسانی کشمکش کے ماننے سے کون انکار کر سکتا ہی جو ہماری سیاست ومعیشت اور معاشرت وتہذیت کے تمام انقلابات کی بنیاد ہی۔ یہی قابیلیت تو ہی جس نے انسانی زندگی کے آغاز سے لے کر آج تک ایک شورِ محشر بپا کر رکھا ہی اور یہ اسی کے نتائج تو ہیں جن کا سب سے زیادہ تڑپا دینے والا منظر ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک ساری دُنیا کھڑی دیکھتی رہی اور تڑپتی رہی۔

جنگ کیوں ہوئی؟ ۱۹۳۹ء میں جرمنی نے جنگ کے نقارے پر پہلی چوب لگائی، تو دُنیا نے پوچھا، تو کیوں لڑتا ہی، جواب ملا ورسیلز کے عہدنامے کو مٹانے کے لئے۔ اُس نے کہا اس عہدنامے نے جرمنی پر زندگی تنگ کردی ہی۔ اتنی بڑی دُنیا میں ہر چیز کے ہوتے ہوئے بھی، جرمنی فاقے کر رہا ہی اور دوسری قوموں کے ہم پلّہ ہونے کے باوجود بھی سب کا دستِ نگر بنا ہوا ہی، اس کے سال بھر بعد ایشیا کی سب سے بڑی طاقت

---

[۵] دیکھو توریت: کتاب پیدائش باب ۴۔ اور قرآن: سورۂ مائدہ۔ رکوع ۵

جاپان بھی جنگ کی اس دہکتی ہوئی بھٹی میں کود پڑی اور اس نے بھی یہی کہا کہ میرے ملک میں کروروں انسان آباد ہیں وہ بھی دُنیا کی دولت میں حصہ چاہتے ہیں۔ وہ بھی چاہتے ہیں بحرالکاہل کے جزیروں کی پیداوار سے فائدہ اُٹھائیں اور آسٹریلیا کی سونا اگلنے والی زمین سے سونا نکالیں۔ اٹلی کے آنجہانی ڈکٹیٹر مسولینی نے بھی جب جنگ کے میدان میں قدم رکھا تو اسی قسم کی باتیں کہیں لیکن برطانیہ اور امریکہ نے کہا، یہ سب فریب کارانہ باتیں ہیں۔ دراصل یہ قومیں دُنیا پر اپنا غلبہ جماکر دوسروں کے لئے زندگی اجیرن بنا دینا چاہتی تھیں اور اپنے قومی مفاد کے مقابلہ میں ساری دُنیا کی عافیت کو ہیچ سمجھتی تھیں۔ روس نے بھی یہی کہا اور یہی کہہ کر ساری دُنیا سے مدد مانگی گئی ——

اِن میں سے سچا کون ہو اور جھوٹا کون؟ اس وقت اس سے بحث نہیں۔ بتلانا یہ ہو کہ یہ سب ایک ہی بات کہتے ہیں اور ایک ہی راگ الاپتے ہیں۔ سب یہی کہتے ہیں کہ دوسروں نے ہماری زندگی کو برباد کرنے کی ٹھان رکھی ہے اور ہماری زندگی کے راستہ میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سب قابیلیت کے شاکی ہیں اور سب ہابیل کی زبان میں اپنے کو مظلوم قرار دیتے ہیں۔

قیامِ امن کی کوششیں

ابتدا سے لے کر آج تک ہر جنگ صرف اسی لئے لڑی گئی ہو کہ انسانوں نے اپنا یہ فرض بُھلا دیا ہو کہ ایک کی زندگی دوسرے کی زندگی میں مدد دینے کے لئے ہو اور دُنیا کی دولت کے تمام انبار اور زمین کے دامن کے تمام ذخیرے صرف ایک انسان یا چند انسانوں کے لئے نہیں ہیں بلکہ اس میں ہر انسان برابر کا شریک ہو۔ موجودہ جنگ سے پہلے ۱۹۱۴ء کی جنگ کو دُنیا کی سب سے

زیادہ ہولناک جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس میں ایک دو نہیں اَسّی لاکھ جانیں ضائع ہوئی تھیں اور کروڑوں انسان اس بُری طرح زخمی ہوئے تھے کہ ان کی زندگی برائے نام رہ گئی تھی۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد جب یہ ہولناک نظارہ دُنیا نے ٹھنڈے دل سے دیکھا تو اس پر سکتے کا عالم طاری ہوگیا۔ جنگ کے جوش میں دُنیا اندھی ہوگئی تھی اور اُسے کچھ نظر نہ آرہا تھا کہ کیا ہورہا ہے، ابلیسیت نے ہر ایک آنکھ پر پٹی باندھ رکھی تھی اور ہر کان میں روئی ٹھونس دی تھی " آنکھیں دیکھتی تھیں مگر دیکھ نہ سکتی تھیں، کان سنتے تھے مگر سُن نہ سکتے تھے" ہر ایک اندھا، بہرا، گونگا ہوکر رہ گیا تھا اور مشین کی طرح لڑائی کے تندور میں ایندھن جھونکنے کے سوا اور کوئی بات کسی کو سوجھتی ہی نہ تھی۔ بارے جب جنگ ختم ہوئی اور دنیا کی آنکھوں پر سے پردے ہٹے تو سب نے مِل کر یہ کہنا شروع کیا کہ اب کوئی ایسی تدبیر کرو کہ یہ نظارہ دُنیا کو دوبارہ دیکھنا نہ پڑے۔ جنیوا میں سب سَر جوڑ کر بیٹھے اور یہ طے کیا گیا کہ دنیا کی تمام قوموں کی ایک انجمن بنائی جائے جس کا نام جمعیتِ اقوام یا لیگ آف نیشن ہو اور یہ انجمن ہر شکایت کو مل جُل کر باہمی مشورے سے غور وخوض کرنے کے بعد طے کیا کرے۔ اگر کوئی قوم جنگ کرے تو اس انجمن کی تمام "ممبر قومیں" مل کر اُس پر دباؤ ڈالیں اور اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو پھر مظلوم کی طرف سے سب مل کر لڑیں۔ اور حملہ آور قوم کی عقل ٹھکانے لگادیں۔ اس انجمن نے ایک بہت لمبا چوڑا قانون بنایا۔ روزانہ کے کاروبار کے لئے ایک مستقل دفتر کھولا۔ ایک بین الاقوامی عدالت بنائی جس میں پندرہ جج تھے اور جن کا کام یہ تھا کہ وہ قوموں کے باہمی جھگڑوں کو امن وآئین کے ساتھ حق وانصاف کی روشنی میں فیصل کردیں۔ اس انجمن میں آہستہ آہستہ

دُنیا کی تقریباً تمام قومیں شامل ہوگئیں جن کی تعداد ۱۹۲۹ء میں پچاس سے اوپر تھی۔ صرف امریکہ آخر وقت تک اس سے علیحدہ رہا۔ لیکن یہ علیحدگی محض برائے نام تھی۔ عملاً وہ بھی اس خیال کا حامی تھا۔ اور کیسے نہ ہوتا، یہ خیال ہی جمہوریۂ امریکہ کے پریزیڈنٹ وِلسن کا تھا۔ جس کے چوُدہ نکات نے جنگ کے خاتمہ پر دُنیا میں دھوم مچادی تھی اور جن میں سے گو اور سب نکتے تو ہمیشہ نکتۂ لاینحل ہی بنے رہے البتہ تمام قوموں کی ایک مشترک انجمن والے نکتہ نے عملی شکل اختیار کرلی تھی۔

پھر دنیا نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس اشتراک واتحاد کو اور زیادہ قوی بنانے کے لئے ۱۹۲۲ء میں جاپان، امریکہ اور برطانیہ کا ایک بحری معاہدہ بھی ہوا جس میں تینوں طاقتوں نے یہ عہد کیا کہ اندرونی امن کے لئے جتنے جنگی جہازوں کی ضرورت ہے صرف اُتنے ہی بنائیں گے۔ اس سے زیادہ نہیں بنائیں گے۔ جاپان نے بہت آگے بڑھ کر یہ اقرار کیا کہ اُس کا رقبہ چونکہ برطانیہ اور امریکہ سے چھوٹا ہے اس لئے اس کی ضروریات کے لئے ان ملکوں کے مقابلہ میں کم جہازوں کی ضرورت ہے، ـــــ طے ہوا کہ برطانیہ اور امریکہ کے مقابلہ میں جاپان صرف ساٹھ فیصدی جہاز رکھے گا یعنی اگر برطانیہ اور امریکہ کے پاس سو سو جہاز ہوں گے تو جاپان اپنے پاس ساٹھ جہازوں سے زیادہ نہ رکھے گا اور نہ بنائے گا۔

اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں سب قوموں نے مل کر ایک قانون بنایا جس کا نام "جنرل ایکٹ" (قانونِ عمومی) رکھا گیا اس قانون پر دستخط کرنے والی تمام قوموں نے (جن میں جاپان، جرمنی اور اٹلی بھی شامل تھے) یہ اعلان کیا کہ آئندہ سے وہ اپنے تمام جھگڑوں کو لڑائی کے ذریعے طے نہیں

کریں گے بلکہ کسی کو پنچ یا ثالث بنا کر طے کیا کریں گے۔ لیکن اگر اس طرح کوئی جھگڑا طے نہ ہو تو پھر اُسے بین الاقوامی عدالت کے سامنے پیش کیا کریں گے پھر اُس کے چند ماہ بعد دُنیا نے ایک اور معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ پر اکیس قوموں نے دستخط کئے تھے اور اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ دُنیا کے امن کو برقرار رکھنے کے لئے ہم سب مل کر جد و جہد کریں گے اور کسی قوم کو اِس بات کی اجازت نہ دیں گے کہ وہ دُنیا کو جنگ کا اکھاڑہ بنا سکے۔

معاہدہ ورسیلز کے خلاف جرمنی کو سخت شکایت تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اس معاہدہ نے جرمنی کی اقتصادی حالت کو بالکل تباہ کر دیا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں دُنیا نے اس شکایت کی طرف بھی توجہ کی اور اس سال اکتوبر کے مہینے میں لوکارنو کے مقام پر ایک جدید معاہدہ جرمنی، برطانیہ اور فرانس کے درمیان کیا گیا۔ اس کی رو سے معاہدۂ ورسیلز میں تو کوئی ترمیم نہ کی گئی، البتہ فرانس اور جرمنی کے بعض سرحدی جھگڑے طے کر دیئے گئے نیز جرمنی کو دوسری قوموں کے ہم پلہ قرار دے کر جمعیتِ اقوام کا ممبر بنایا گیا۔ کیونکہ ابھی تک وہ اس قابل نہ سمجھا گیا تھا کہ فرانس اور جاپان جیسی قوموں کے دوش بدوش کسی مجلس میں بیٹھ سکے۔ جب یہ معاہدہ انجام پا گیا تو بڑی خوشیوں کا اظہار کیا گیا۔ اخباروں نے اس پر بڑے بڑے مقالے لکھے اور لیڈروں نے بہت بلند بانگ دعووں کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ کہا گیا کہ جنگ دراصل ۱۹۱۸ء میں نہیں بلکہ آج ۱۹۲۵ء میں لوکارنو میں ختم ہوئی ہے۔ اس معاہدہ کو بروئے کار لانے میں برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے مسٹر آسٹن چمبرلین کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ چنانچہ اُن کے اس کارنمایاں کو بے حد سراہا گیا اور اسی پر اُنھیں آٹھ ہزار پونڈ تقریباً

ایک لاکھ روپیہ) کا وہ انعام دیا گیا جسے نوبل پیس پرائز کہا جاتا ہی اور جو کسی ایسے کارنامے پر عطا کیا جاتا ہی جو دنیا کے امن وسلامتی کی ضمانت کر سکے

لیکن کہنے والوں نے کہا کہ جب تک دُنیا میں ہتھیار موجود ہیں، جنگ ختم نہیں ہو سکتی اگر ہتھیار بنانے والے ہاتھ اسی تیز رفتاری کے ساتھ کام کرتے رہے تو جنگ کا بھوت دُنیا کے سر سے نہ اُتر سکے گا۔ بات معقول تھی۔ ساری دُنیا نے اس طرف توجہ کی۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۵ء تک اِس سلسلہ میں بڑی بڑی کانفرنسیں ہوئیں۔ مگر کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوا۔ جرمنی نے کہا کہ "یا تو تمام قومیں اسلحہ بنانا بند کر دیں اور آبدوز، ٹینک، جنگی ہوائی جہاز، بڑی بندوقیں اور بھاری جہاز دُنیا سے بالکل نیست و نابود کر دیئے جائیں اور یا پھر جرمنی کو بھی اجازت دو کہ وہ بھی اپنے کو مُسلح کر سکے"۔ لیکن اِن دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہ مانی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۳۳ء کے آخر میں جرمنی نے تخفیف اسلحہ کانفرنس اور انجمن اقوام دونوں سے استعفا دے دیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد منچوریا (چین) کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے جاپان بھی اس انجمن سے الگ ہو گیا۔ اس لئے کہ وہ چین کے اس صوبے میں جو کچھ کرنا چاہتا تھا، انجمن اقوام، اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ پھر سنہ ۱۹۳۵ء میں اٹلی کے معنوی بادشاہ، مسولینی نے اپنے نمائندوں کو حکم دیا کہ وہ بھی انجمن اقوام کو خیرباد کہیں اور حبش کی آزاد ریاست کو غلام بنا کر نئی اطالوی سلطنت کے شاندار تصوّر پر سب کچھ قربان کر دیں۔

لیکن سوال یہ ہی کہ انجمن اقوام اتنی بے بس کیوں ہو گئی کہ وہ اِن "بغاوتوں" کا کوئی تدارک نہ کر سکی۔ اور دنیا کی وہ بیسیوں قومیں جنہوں

نے یکجا ہو کر یہ حلف لیا تھا کہ وہ کسی قوم کو امنِ عالم کے خلاف کچھ نہ کرنے دیں گی وہ سب مفلوج ہو کر کیوں رہ گئیں اور آخر یہ کیوں ہوا کہ ۱۹۳۹ء میں دُنیا ایک بار پھر خاک وخون کے سیلاب میں غرق ہو گئی اور آج جنگ ختم ہوجانے کے باوجود بھی امنِ عالم خطرے سے بچا ہوا نظر نہیں آتا ——؟

یہ ایسے سوالات نہیں جن کا جواب چند لفظوں یا چند جملوں میں دیا جا سکے۔ اس کے لئے ضروری ہو کہ آپ ذرا پیچھے مڑ کر حالات کے اُلجھے ہوئے تاروں پر ایک نظر دوڑائیں اور دیکھیں کہ وہ کیا کیا اسباب و عوامل تھے جنہوں نے گتھیوں پر گتھیّاں پیدا کیں اور جن کا نتیجہ ۱۹۱۴ء کے بعد ۱۹۳۹ء کی ہولناک جنگ کی صورت میں آپ کو نظر آیا۔ اور جس کی ہولناکیوں کا سلسلہ اب بھی ختم نہیں ہوا ہو۔ حالات و واقعات کے اس جائزے ہی سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ اب یہ گتھیّاں کیسے سلجھیں گی اور دنیا جن الجھنوں میں پھنس گیئ ہو وہ کب اور کس طرح رفع ہو سکیں گی۔

انسانی تاریخ کا یہ سانحہ جتنا عجیب ہو اتنا ہی قدیم بھی ہو کہ انسان خود الجھنیں پیدا کرتا ہو اور پھر خود ہی بے چین ہوتا ہو۔ جب یہ بے چینی برداشت کے قابل نہیں رہتی تو ان حالات و ماحول میں انقلاب بپا کر دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہو جو آخرکار جنگ کا باعث بنتا ہو انسانی زندگی کے آغاز سے لے کر آج تک جتنی جنگیں ہوئی ہیں، وہ سب اسی جذبۂ انقلاب کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ابھی تک اس جذبے کی تکمیل پوری طرح نہیں ہو سکی ہو اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک ہو گی۔

عرفِ عام میں ۱۹۱۴ء کی جنگ کو "عالمگیر جنگ" کہا جاتا ہو لیکن حقیقت میں انسانی تاریخ کی کوئی جنگ بھی ایسی نہیں ہو جسے عالمگیر نہ کہا

جا سکے۔ انقلاب لانے کی بنیادی خواہش کے لحاظ سے ہزاروں سال پہلے کی جنگ اور ۱۹۳۹ء کی جنگ میں کوئی فرق نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے اس خواہش کی تکمیل میں کمزور قسم کے ہتھیار استعمال کئے جاتے تھے لیکن آج ان کی جگہ طاقتور ہتھیاروں نے لے لی ہے، انسانوں کی وہ چھوٹی سی جماعت جو ڈھال تلوار سے لڑ کر اپنے دشمن پر قابو حاصل کر لینا چاہتی تھی، ٹھیک ٹھیک وہی جذبات رکھتی تھی جو آج ایٹم بم کی طاقت رکھنے والی قوتیں رکھتی ہیں، جس طرح وہ لوگ اپنے حالات سے تنگ آکر جنگ پر اُتر آتے تھے، اسی طرح آج بھی ہو رہا ہے جس طرح اس زمانے میں انقلاب کی تمنا پرورش پاتی تھی۔ اسی طرح آج بھی پاتی ہے انقلابِ عالم کی تاریخ دراصل انسانی امنگوں اور تمناؤں کی تاریخ ہے اس لئے اس کا آغاز انسانی پیدائش کے وقت سے ہوتا ہے۔ اس تمنا کی تکمیل کے لئے جو وسائل پہلے استعمال کئے جاتے تھے، وہ ضرور بدل گئے ہیں لیکن تمنا اپنی جگہ پر بدستور باقی ہے

انسانی زندگی اپنے آغاز سے لے کر آج تک ایک مسلسل کڑی کے مانند ہے۔ اس کڑی میں رنگ و روغن کا امتیاز نظر آتا ہے۔ ظاہری بناوٹ میں بھی کہیں کہیں فرق دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اندرونی طور پر اس کڑی کے ہر حلقے کی زندگی دوسرے حلقے سے وابستہ ہے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ بعض ظاہری حالات کے چکر میں کھو کر ایک حلقہ دوسرے حلقے کو نظر انداز کرنے لگتا ہے ـــــ یہیں سے بے چینی کا آغاز ہوتا ہے، جو بڑھ کر جنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور آخر کسی نہ کسی قسم کے انقلاب پر ختم ہوتی ہے۔

اسی اجمال کی تفصیل ہے جس پر آئندہ اوراق میں ہم غور کریں گے۔

باب ۲

بنائے فساد کہاں سی شروع ہوتی ہی؟

"خود بھی جیو اور دوسروں کو بھی جینے دو"۔ قدرت نے تو انسانی زندگی کا اصول یہ بنایا تھا۔ مگر ابلیس نے اس اصول کو بدل دیا۔ اور بدل کر یوں کر دیا کہ "خود ہی جیو، دوسروں کو نہ جینے دو"۔ دُنیا کے سارے جھگڑے اسی ابلیسانہ تلبیس کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ دُنیا میں زندگی کے اسباب کی کیا کمی تھی جو انسان ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتا؟ خدا کی اس سرزمین پر آج بھی جب کہ انسانی آبادی کی تعداد اربوں تک پہنچ گئی ہی، کھانے پینے اور عیش و آرام کرنے کے لئے بہت ہی۔ اب بھی اس زمین کے ذخیروں میں اتنی وسعت ہی کہ وہ اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی دُگنی آبادی کو پرورش کر سکے اور راحت و اطمینان کے ساتھ پرورش کر سکے لیکن قابیل نہیں چاہتا کہ اپنے بھائی ہابیل کو بھی ان ذخیروں میں برابر کا شریک رہنے دے۔ وہ سارا عیش، ساری راحت اور سارے ذخیرے صرف اپنے لئے محفوظ کر لینا چاہتا ہی۔ اور اپنے اس

مقصد کے لئے قابیل کا گلا گھونٹ کر اُسے راہ سے ہٹا دینا چاہتا ہی قابیل کی وحشیانہ قوت اس مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہی اور، ہابیل کے حصّہ کا عیش بھی قابیل کے لئے وقف ہو جاتا ہی۔ لیکن وہ اب بھی خوش نہیں ہی وہ اب بھی اور کچھ چاہتا ہی۔ ابلیسیت نے اس کے پیٹ کی دوزخ میں ھل من مزید کی جو آگ سلگا رکھی ہی وہ اُسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، وہ دوسروں سے بے نیاز بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن دوسروں کو برداشت بھی نہیں کر سکتا۔ پھر ہابیل اگرچہ نہیں رہا، مگر ہابیلیت سے اُسے نجات نہیں ملتی ہابیل کی روح اس پر مسلط ہی اور اس روح کو کچلنے کی ناکام کوشش میں وہ نئے نئے فتنے کھڑے کرتا رہتا ہی۔

انسان کی غایتِ تخلیق: خداشناسی دُنیا جب سے پیدا ہوئی ہی، اُس وقت سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر خدا جانے کب تک، دُنیا کا بنیادی مسئلہ صرف قابیلیت وہابیلیت کا مسئلہ ہی: خدا نے اس بیس کروڑ مربع میل زمین کو کل انسانوں کا مشترک ورثہ بنایا تھا اور اس لئے اس کی پیداوار کو سب کی ضروریات پر اس طرح صرف ہونا چاہئیے تھا کہ ہر ایک کے لئے پیٹ بھرنے کو روٹی، تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کے لئے ایک آرام دہ مکان میسر آ سکتا، تاکہ ہر ایک کو اپنی دماغی قابلیت اور ذہنی صلاحیت کے مطابق کام کرنے کی آزادی حاصل ہوتی اور انسان کو عقل و بصیرت کی جو نعمت عطا کی گئی ہی، اس کی مدد سے ایک بڑی بلند اور لازوال زندگی حاصل کرنا ممکن ہو سکتا —— بڑی، بلند اور لازوال زندگی درحقیقت انسانی تخلیق کا مقصد ہی اور اسی مقصد کو "عبادت" کے لفظ سے تعبیر کر کے یہ کہا گیا ہی کہ "جنات ہوں یا انسان سب کو صرف اس لئے پیدا کیا گیا ہی کہ وہ خدا

کی عبادت کریں"[1] عبادت کیا ہے؟ خدا شناسی کا دوسرا نام۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا شناسی کی سرحد، ادراک و احساس کی اس سرحد سے دُور بہت دُور واقع ہے۔ جہاں تک یہ آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ جہاں کی آواز یہ کان نہیں سُن سکتے۔ جہاں کی بُو کو یہ ناک نہیں سونگھ سکتی۔ اُس سے بھی بڑے خدا شناسی کا مقام ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پاؤں رکھتے فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں اور وہ چلّا اُٹھتے ہیں کہ:-

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

خدا شناسی کے اسی مقام تک پہنچنے کے لئے کہا گیا ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی اس کائنات پر غور کرو، ان چاند ستاروں، درختوں اور پہاڑوں کی ساخت پر غور کرو، زمین و آسمان پر غور کرو، دن رات کے یکے بعد دیگرے آنے پر غور کرو اور دیکھو کہ یہ نیلی نیلی بلند چیز جسے تم آسمان کہہ کر پکارتے ہو کیا ہے اور کیسے بنائی گئی ہے، دیکھو یہ اونچے اونچے پہاڑ جن کی چوٹیاں آسمان کی خبر لاتی ہیں، کیسے کھڑے کئے گئے ہیں، دیکھو یہ لمبی چوڑی زمین جو تمہاری تربیت گاہ ہے کس طرح فرش کی طرح تمہارے پاؤں کے نیچے بچھا دی گئی ہے[2] ——— یہ سب کچھ دیکھو، ان پر غور کرو، انھیں سمجھو تاکہ تم خدا شناسی، معرفت الٰہی اور عرفانِ ربّی کے مرتبے کو پہنچ سکو اور جان سکو کہ اس سارے کارگاہِ ہستی کی علت العلل کیا ہے اور یہ پورا کارخانۂ حیات کیا مقصد رکھتا ہے۔

---

[1] قرآن - ذاریات - ع ۳ [2] سورۂ آلِ عمران و سورۂ جاثیہ

افلاس وغربت کے نتائج

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے وجود کا اصلی مقصد یہی ہے، یہ مقصد ہرگز نہیں کہ کھائے، پیئے، سوئے اور مر جائے ـــــ لیکن کھانا پینا اس کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا مچھلی کو تیرنے کے لئے پانی یا پرندے کو اڑنے کے لئے ہوا کی ضرورت ہے۔ پرندے سے پر چھین لو اور پھر اس سے کہو کہ اُڑ اور اُڑ کر عالم بالا کے سر پیلے نغمے گا، تو وہ اس حکم کی تعمیل کیسے کر سکے گا؟ مچھلی کو پانی سے محروم کر دو، اور پھر اس سے کہو کہ اپنے وظیفۂ حیات میں مشغول رہ، تو وہ اس فرمان کی تکمیل کیسے کرے گی؟ ہوا سے محروم ہو کر پرندہ صرف ہوا کی جد وجہد میں پھڑپھڑائے گا اور پانی سے دُور ہو کر مچھلی کا کام صرف یہ رہ جائے گا کہ پانی کے حصول کے لئے تڑپتی رہے۔ انسان کی حالت بھی بالکل یہی ہے۔ وہ ایک وقت فاقہ کر سکتا ہے، دو وقت فاقہ کر سکتا ہے، لیکن اگر اُسے مسلسل فاقہ کشی کی زندگی میں مبتلا رکھو گے تو پھر وہ خدا شناسی اور معرفت الٰہی کی منزل کا تصوّر کیسے کر سکے گا؟ جو جسم بھوک سے نیم جاں ہوگا۔ اس میں بیٹھی ہوئی رُوح آسمان کی طرف نہیں، زمین سے بھی کچھ نیچے دھنستی چلی جائے گی۔ اور چاہے وہ جبراً و قہراً خدا کی جناب میں دو زانو ہو کر بیٹھے مگر اس کا دماغ اس کا دل اور اس کے قوٰی اُس کا ساتھ نہ دیں گے۔

شب چوں عقد نماز بر بندم
چہ خورد بامداد فرزندم

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:-

معاشی پریشانی و بے سروسامانی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی صبح سے شام

تک اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کی فکر میں سرگرداں رہتا ہے۔ اور اس دھندے کے سوا کسی اور مسئلے پر غور کرنے کی مہلت ہی اُسے نہیں ملتی۔ خدا، روح اور آخرت کے مسائل پر فکر کرنا اس کے لئے ناممکن ہوجاتا ہے۔ حتّٰی کہ آہستہ آہستہ اُس میں پیٹ کے دھندوں کے سوا دوسرے اہم سوالات پر غور وخوض کرنے کا مادہ ہی فنا ہوجاتا ہے۔ پھر یہ مصیبت مرض متعدی کی طرح بڑی بڑی انسانی بستیوں میں اس طرح سرایت کرجاتی ہے کہ بعض اوقات ایک پورے کے پورے ملک میں کوئی فردِ بشر بھی ایسا باقی نہیں رہتا جو روٹی اور پیٹ کے دھندوں سے نظر اُٹھا کر روحانی بلندیوں کے اصول کے مطابق کوئی حرکت کرسکے۔

اس لئے سب سے پہلی اور بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے لئے جو لوازم ضروری ہیں وہ اُسے حاصل ہوں ورنہ پھر اس کی اور ایک بدترین کیڑے مکوڑے کی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ اور جب اُس کی انسانیت اُس سے چھن گئی تو پھر انسانی اعمال کی توقع اس سے کرنا فضول ہے۔ پھر اگر وہ لڑتا ہے، قوانین کو توڑتا ہے، حدود کو پھاندتا ہے۔ انسانی خون سے ہاتھ رنگتا ہے اور شیطانوں کی طرح شور وہنگامہ مچاتا ہے تو تم اس پر الزام کیوں دھرتے ہو؟ یہ کونسا انصاف ہے کہ مچھلی کو پانی سے باہر لے آؤ اور پھر جب وہ تڑپے اور تڑپ کر اپنے بازوؤں سے تمہیں زخمی کردے تو تم اس پر غصّہ کرو، اُسے مجرم قرار دو اور اُسے یہ نصیحت کرو کہ وہ ایسا نہ کرے؟ اسی طرح یہ کیا اصول ہے کہ اڑتی چڑیا

---

[1] حجۃ البالغہ صفحہ ۱۰۶

کو ہوا سے محروم کر دو، اور جب وہ اس محرومی پر دیوانہ وار ادھر اُدھر اپنا سر ٹکراتی پھرے تو تم اُسے گناہگار قرار دو؟ —— انسان جس جانور کا نام ہی اس کے لئے ہوا اور پانی کی جتنی ضرورت ہی اُتنی ہی ضرورت غذا، لباس اور گھر کی بھی ہی - پھر اگر تم اسے ناقص غذا دیتے ہو جو اس کی جسمانی ضروریات کی پوری طرح تکمیل نہیں کر سکتی، اگر تم اُسے اتنے کپڑے نہیں دیتے جو اس کے جسم کو ضروری حفاظت بہم پہنچا سکیں اور اگر تم اُس کے لئے مکان فراہم نہیں کر سکتے جو اُسے گرمی اور سردی کی تکلیف سے نجات دے سکے تو پھر تم اس غریب انسان سے، اِس سوکھے ہوئے جسم اور دھنسی ہوئی آنکھوں والے انسان سے، اُس انسان سے جس کے گال پچکے ہوئے ہیں، جس کا رنگ پیلا ہی، جس کی آنکھیں بے رونق ہیں، جس کا دماغ کمزور ہی، جس کا دل مریض ہی، جس کا جگر خراب ہی، جس کا معدہ بگڑا ہوا ہی، جو رات بھر کھانستا ہی، جو دن بھر بے چینی سے گزرتا ہی اور جس کے پاس نہ تو دوا کے لئے پیسے ہیں، نہ غذا کے لئے چھدام، اُس انسان سے تم یہ توقع کیسے کر سکتے ہو کہ وہ شرافت و انسانیت کا مجسمہ ہوگا وہ گناہ سے لرزے گا اور معصیت سے کانپنے گا ——؟ جس ڈاکٹر سے بھی پوچھو گے کہ انسانی زندگی کے لئے بالکل ضروری اور ناگزیر ضروریات کیا ہیں تو وہ تمہیں بتائے گا کہ ہر انسان کی زندگی کے لئے ضروری ہی کہ دودھ، مکھن گوشت، پھل، ترکاری اور غلے کی ایک معقول مقدار روزانہ معدے میں پہنچتا رہے، کم از کم سات آٹھ گھنٹے آرام و اطمینان کے ساتھ سوئے، دو تین گھنٹے کھلی ہوا میں چلے پھرے اور ایسے مکان میں رہے جہاں کی فضا صاف ہو اور جہاں پانی نہ سڑتا ہو۔ غلاظت نہ پڑی رہتی ہو اور

جہاں مچھروں اور مکھیوں جیسے حشرات الارض کی پیدائش ممکن نہ ہو ——— لیکن غور کرو کہ زندگی کے یہ ضروریات، یہ لوازم حیات، یہ ناگزیر اسبابِ زندگی کتنے انسانوں کو حاصل ہیں، دور جانے کی ضرورت نہیں، اپنے ارد گرد ہی نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ کیا نظارہ نظر آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے تنگ و تاریک مکانوں میں دس دس پانچ پانچ انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح سکڑے سکڑائے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ گھر کیا ہیں غلاظت کے ڈھیر ہیں، مکھی کے چھتے کی طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے لیکن بے ڈھنگے اور بے ترتیب جیسے کوڑے کرکٹ پر کُکُرمتے اُگ آتے ہیں، سانپ کی چھتریاں! کوئی چھوٹی کوئی بڑی، کوئی اِدھر کوئی اُدھر، نہ کوئی سلیقہ نہ کوئی قرینہ، کسی کا دروازہ مشرق میں ہے تو کسی کا مغرب میں، کسی کے گھر میں دو گز کا صحن ہے تو کسی کے یہاں صحن ہی ندارد، ان میں رہنے والوں کی حالت یہ ہے کہ بچوں کے پیٹ بڑھے ہوئے ہیں یا پچکے ہوئے، بڑوں کی حالت نڈھال، رات کو قہقہوں کے بجائے کھانسنے کی آواز کے سوا اور کچھ نہ سنوگے۔ البتہ کبھی کبھی کوئی کراہ اس میں شامل ہو جائے تو ہو جائے، ہر ایک کا مزاج چڑچڑا، جسے دیکھو دنیا سے بیزار، جسے دیکھو دوسروں کا شاکی، آنکھیں آنسوؤں سے خالی مگر دل ہر وقت غم سے لبریز ——— ذرا غور کرو کہ اس قسم کے انسانوں سے تم کیا توقع رکھ سکتے ہو؟ کیا ان سے تم یہ چاہتے ہو کہ وہ انسانیت کے معیار پر پورے اُتریں گے اور اُن کے چہروں میں تم کو فرشتوں کا سا نظارہ نظر آئے گا؟ انسان کا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ وہ زندہ رہے۔ مگر زندہ رہنے کے جتنے لوازم تھے اُن سب سے یہ محروم ہیں۔ زندہ ضرور ہیں، مگر برائے نام، ایسی زندگی جو صرف زندگی کی حسرت میں کٹ رہی ہے ——— اور کیوں؟

اس کیوں کے جواب ہی میں دُنیا کی تمام مشکلات، تمام مسائل اور تمام اُلجھنیں پوشیدہ ہیں۔ اسی کیوں کے جواب ہی میں اس جنگ کا اور اس سے پہلے

کی تمام جنگوں کا راز پنہاں ہے اور اسی کیوں کے جواب پر سب کی خوشحالی اور دنیا کی فلاح وبہبود کا انحصار ہے۔

غربت وافلاس کا باعث کیا ہے؟

قدرت کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ "زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی روزی کی ذمہ دار ہے[۱]" اور یہ حقیقت بھی ہے۔ اس لئے کہ انسان وحیوان کو اپنی غذا کے لئے جس سرو سامان کی ضرورت ہے۔ اس سب سے زمین کا دامن بھرپور ہے۔ اس کے دامن میں کھانے کے لئے پھل، ترکاریاں اور غلّہ اس کثرت سے ہے کہ جتنی زندگی اس وقت دُنیا میں نظر آرہی ہے اگر اس سے دُگنی اور تگنی بھی ہوجائے، تب بھی ان چیزوں کی کمی محسوس نہ ہو، اسی طرح پہننے اور تن ڈھانکنے کے سامان کی افراط ہے۔ رہنے سہنے کے لئے بھی خدا کی زمین فرش بنی ہوئی ہے اور پہاڑوں کے پتھر، دریاؤں کا پانی اور پاؤں کے نیچے کی مٹّی ہر وقت انسانی رہائش گاہ کو تیار کرنے کے لئے موجود ہے۔ لیکن پھر یہ کیا ہے کہ انسانی آبادی کا اسّی فیصدی حصّہ فاقہ کشی سے کچھ ہی اچھی زندگی گذارتا ہے، اور اُسے کھانے کے لئے غذا، پہننے کے لئے مناسب کپڑے اور رہنے کے لئے کوئی مناسب مکان میسر نہیں؟ اس کا جواب وہی ہے جس کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، یعنی قابیل کی قابلیت نہیں چاہتی کہ اپنے بھائی ہابیل کی ضروریات کا بھی خیال رکھے۔ قابیل کے پاس پیٹ بھر کھانے کو موجود ہے، مگر پھر بھی وہ ہابیل کے کھانے کو چھین کر اس کا مالک بن بیٹھتا ہے اس لئے کہ ابلیسیت اُسے یہ سمجھا دیتی ہے کہ ہابیل کے کھانے میں کچھ لذات زیادہ ہیں۔ قابیل کے پاس اچھا مکان موجود ہے مگر ابلیسیت اُسے اُکساتی ہے کہ وہ مکان چھوٹا ہے، اس لئے وہ ہابیل کے

---

[۱] پارہ ۱۲ - آیت اوّل

مکان پر چھاپہ مار کر اُسے بے گھر بنا دیتا ہے اور اس کے گھر کو بھی اپنا گھر قرار دیتا ہے، اس کے پاس پھل اور ترکاریاں کافی ہیں، لیکن ابلیسیت اُس سے کہتی ہے کہ پھلوں کا ذخیرہ کرکے رکھو اور گرمی کے پھل سردی میں اور سردی کے پھل گرمی میں کھاؤ، اور پھر بھی اگر بچ رہیں تو اُن کا حلوا بناؤ، مُربّا بناؤ، شراب بناؤ اور جو کچھ کھا سکو کھالو، باقی کو پھینک دو
قابیل کے اس عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ ہابیل تو زندگی کی لازمی ضروریات سے محروم ہو رہا ہے لیکن اس کا سفّاک و بیدرد بھائی بُری طرح عیش و عشرت کے گہوارے میں جھول رہا ہے، ہابیل صرف اتنی زمین چاہتا ہے جس پر اپنا گھر بنا سکے، جس میں کچھ بو سکے اور جس پر چل پھر سکے، مگر قابیل کے لئے وسیع سے وسیع تر رقبے کی ضرورت اس لئے ہے کہ وہ اس میں گھوڑے دوڑائے، اور ایک جگہ نہیں جگہ جگہ اپنے لئے محل بنوائے، ہابیل اس ابلیسی خواہش کو ایک حد تک برداشت کرتا ہے، مگر آخر کب تک؟ وہ اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ اس احتجاج کو دبانے کے لئے قابیل کا ہاتھ ہابیل کی جان کو اپنی ابلیسیت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ لیکن ہابیل کا احتجاج اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ہابیل مر گیا مگر ہابلیت کو مارنا قابیل کے بس کی بات نہیں۔ وہ سخت پیچ و تاب کھاتا ہے، مگر چاروں طرف سے ہابیل کا احتجاج اس کے سامنے صف آرا ہو جاتا ہے۔ آخر یہ کیوں ہے کہ زمین کی پیداوار پر قابیل ہی کا حصّہ ہو اور ہابیل محض اس کے رحم و کرم پر جئے؟ دونوں انسان ہیں، دونوں کو قدرت نے ایک ہی قسم کا جسم و جثہ دیا ہے، دونوں کے پاس دماغ ہے، عقل ہے، فہم و فراست ہے، دونوں میں کام کرنے کی طاقت ہے اور دونوں کی رگ و پے میں ایک ہی قسم

کا خون گردش کر رہا ہی، ایک ہی روح ہی جو دونوں کے قالب کو تابناک بنائے ہوئے ہی۔ پھر یہ کیوں ہو کہ ایک تو میلوں زمین پر قابض ہو اور بیشمار درختوں کے پھل اور اَن گنت کھیتوں کی پیداوار سے فائدہ اُٹھائی اور دوسری کے پاس اتنا بھی نہ ہو کہ جسم و جان کا باہمی تعلق باقی رکھ سکے؟

قابلیت کا افسوں

قابیل کے پاس طاقت کے سوا اس کا کوئی جواب نہیں، مگر طاقت مخالف کے پاس بھی ہی۔ اس لئے دونوں میں ٹکر ہوتی ہی۔ قابیل ڈرتا ہی کہ اس کے خلاف جو محاذ ہی وہ اس پر غالب آجائے گا، اب ابلیسیت اُسے ایک نیا افسوں سکھاتی ہی وہ اس افسوں کو مخالف پر پڑھ کر پھونک دیتا ہی اور مخالف کی طاقت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتی ہی۔ وہ افسوں کیا تھا؟ اس افسوں کے نام مختلف ہیں۔ کہیں اس کا نام "قیام امن" ہی اور کہیں "نظام عالم" کہیں اسکا نام "بادشاہت" ہی اور کہیں "شہنشاہیت" کہیں "قانون" ہی اور کہیں "مذہب" غرض ہر جگہ اس کو ایک نیا لقب دیا گیا ہی اور ہر جگہ کے حالات کے مطابق قابلیت نے اسے کسی نام سے پکارا ہی۔

کہا گیا امن کو قائم کرنے اور دُنیا کے نظام کو برقرار رکھنے کیلئے ضروری ہی کہ ایک بادشاہ ہو جو آئین و قانون کو عملی جامہ پہنائے مگر یہ بادشاہ قابیل تھا، اور اُس کی زبان کا نام آئین و قانون۔

کہا گیا کہ سب کچھ خدا کے حکم کے مطابق ہونا چاہیئے، ہر انسان کو قدرت کے بنائے ہوئے اصولوں کے بموجب چلنا چاہیئے۔ لیکن خدا کے حکم کو منوانے والا اور قدرت کے بنائے ہوئے اصولوں کو بنانے والا قابیل تھا۔

کہا گیا کہ آؤ سب انسان مل کر رہنے سہنے کا ایک اٹل نظام بنالیں۔

ہر ایک کے لئے کچھ کام مقرر کر دیئے جائیں جن کو وہ کرتا رہے اور اُن کاموں کی بجا آوری اس کی ذات کا جز ولاینفک بنا دی جائے۔ مگر ان کاموں کا انتخاب کرنیوالا قابیل تھا جس نے سب کے لئے جو چاہا کام مقرر کر دیا مگر اپنے لئے صرف "عیش" منتخب کیا۔

اب دنیا میں ایک قابیل نہ تھا بلکہ اس کی ایک چھوٹی سی ٹولی تھی جو ہابیل کی تمام نسل پر حکمراں تھی اور اب کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے مُنہ آئے۔ البتہ اس ٹولی کا سب سے بڑا پروگرام یہ تھا کہ ہابیل کی نسل کو آپس میں متحد ہونے اور کسی ایک نقطے پر جمع ہونے سے روکتی رہے۔

اگر کبھی ہابیل کی نسل میں کوئی جان پیدا ہوتی تھی اور قابیل کی ٹولی کو کسی نئے خطرے کا امکان نظر آتا تھا تو امن، قانون، نظم عالم، ذات پات اور مذہب واخلاق کے نام پر پوری بے رحمی مگر انتہائی چالاکی کے ساتھ اس خطرے کا مقابلہ کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے قابیل کی ٹولی نے یہ اعلان کیا کہ خدا کے نام سے تم جس ہستی کو تعبیر کرتے ہو، وہ بادشاہ ہی کی ہستی ہے۔ بادشاہ خدا ہے اور خدا بادشاہ ہے۔ فرعون خدا ہے اور خدا فرعون ہے، نمرود خدا ہے اور خدا نمرود ہے، شدّاد خدا ہے اور خدا شدّاد ہے۔ غرض ہر مقام پر جو سب سے بڑا قابیل تھا وہ خُدا ٹھہرایا گیا۔ اور اس کی ٹولی کے دوسرے چھوٹے موٹے قابیلوں کو اِس خُدا کے دست وبازو ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اور ان سب کا مشترک فرض یہ قرار پایا کہ ہابیلیت کی گردن پر سوار رہیں تاکہ وہ کبھی سر نہ اٹھا سکے، اور اپنی بدنصیبی، اپنی فاقہ کشی اور اپنی بدحالی پر صابر وشاکر رہے اور ہمیشہ قابیلیت کے قدموں پر سر ڈالے پڑی رہے۔

معاشرت و معیشت کے قابیلی نظام ہائے حیات

غرض آدم و حوا کی آفرینش کے بعد ہی سے دنیا میں سب سے بڑا سوال یہی ہابیلیت و قابیلیت کا سوال رہا ہے، ہر فلسفہ، ہر نظام معیشت، ہر نظام معاشرت، ہر نظام اخلاق اور ہر نظام مذہب اِسی سوال کو حل کرنے کے لئے بنایا گیا، لیکن ابلیسیت نے جو افسوں پڑھ کر پھونک دیا تھا اُس نے صحیح حل تلاش کرنے اور پھر اُس پر صحیح اسپرٹ میں عمل کرنے سے قابیلی ذہنیت کو ہمیشہ باز رکھا، صحیح تعلیم دینے والوں کو یا تو راہ سے ہٹا دیا گیا، یا ان کی تعلیم کی تعبیر اپنی مرضی کے مطابق کر لی گئی، نئے نئے اصول گھڑے گئے جن میں یہ بتایا گیا کہ کچھ انسانوں کو خدا نے اونچا بنا کے پیدا کیا ہے اور کچھ کو نیچا بنایا ہے۔ ہندوستان میں آنے والے آریہ نسل کے فاتحوں نے تو غضب ہی کر دیا۔ یہ فرمان جاری ہوا کہ وہ چند مٹھی بھر افراد جو برہمن کہلاتے ہیں، صرف وہی خدا کے ہم پلّہ ہیں گویا یہاں شدّاد و فرعون کا مرتبہ برہمنوں کی ٹولی کو عطا ہوا۔ برہمن کے بعد شرف و بزرگی کا درجہ اُن لوگوں کو دیا گیا جو برہمن کی اس برتری اور فوقیت کو قائم رکھنے کے لئے لڑتے بھڑتے رہیں یا یوں کہئے کہ جو لوگ لڑنے بھڑنے والے تھے ان کو رشوت دے کر ملایا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ برہمن تو روحانی اعتبار سے افضل ہیں؛ لیکن جنگجو اور لڑاک افراد اس دنیا میں سب سے بلند و ممتاز ہیں اور سلطنت و فرمانروائی انہی کا حق ہے۔ یہ لوگ کھتری کہلائے، کھتریوں کے بعد تیسرا منصب اُن لوگوں کو عطا کیا گیا جن کے ہاتھ میں تجارت اور زراعت کی کنجیاں تھیں اور جو زمین کی پیداوار اور اس پیداوار کی تقسیم پر چھائے ہوئے تھے۔ اِن

لوگوں کو ویش کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور حکم ہوا کہ زراعت وتجارت کی سلطانی صرف انہی کا ورثہ ہی کسی دوسرے کو یہ حق نہیں کہ وہ اس ورثہ میں حصّہ بٹائے۔ بنیوں اور زمینداروں کی اس ٹولی کے بعد کی جو اَن گنت مخلوق بچی اُسے شودر اور اچھوت کا نام ملا۔ قابلی دربار سے فرمان جاری ہوا کہ ہر وہ شخص جو برہمن، کھتری یا ویش سے تعلق نہیں رکھتا، وہ دنیا کی بدترین مخلوق ہی اور اس کا کام صرف یہ ہی کہ اونچی ذات والوں کی خدمت گزاری کرتی رہی۔ لیکن اُسے یہ حق نہیں کہ وہ اپنے اِن آقاؤں کے قریب سے گزرے، انھیں ہاتھ لگائے یا آنکھ ملاکر اُن سے باتیں کرے۔ اِس بدنصیب مخلوق کو یہ سمجھایا گیا کہ تم کو خدا نے میل کچیل سے پیدا کیا ہی اور تم نے پچھلے جنم میں جو گناہ کئے تھے اس کی یاداش میں تم کو یہ زندگی دی گئی ہی، گویا غریبی ایک جرم قرار دیا گیا اور وہ بھی ایسا جرم جو غریب بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر نکلتا ہی اور جس جرم کی سزا اپنی زندگی بھر اُسے اس طرح بھگتنا پڑتی ہی کہ وہ دولت وثروت اور طاقت وقوّت کے دیوتاؤں کے پاس بھی کھڑا نہیں ہوسکتا، اس کی جگہ صرف جوتیوں میں ہی یا اُن غلاظتوں اور عفونتوں میں جو ان دیوتاؤں کے پاک وپوتر جسم سے خارج ہوتی ہیں، اُسے حق نہیں کہ گھی کھاسکے، گھی کا چراغ جلاسکے، چاندی سونے کا استعمال کرسکے، عام کنوؤں سے پانی بھر سکے، چشموں اور دریاؤں میں نہاسکے، یہی نہیں بلکہ وہ غریب اس قابل بھی نہیں کہ اپنے خالق کے آگے سر نیاز جھکاکر اپنے گناہوں پر دو آنسو بہاسکے، اس لئے کہ قدغن ہی اور سخت قدغن ہی کہ خبردار، کوئی شودر یا اچھوت مندر میں نہ گھسنے پائے، بت کو نہ دیکھنے پائے، منتر نہ پڑھنے

پائے، وید اور شاستر کو پڑھنا تو درکنار سُننے بھی نہ پائے اور اگر اتفاق سے سُن پائے تو اس کی سزا یہ ہے کہ کڑکڑاتا ہوا تیل اس کے کانوں میں اُنڈیل دیا جائے تاکہ وہ گنہگار کان جنہوں نے مقدس احکام کو سننے کا جُرم کیا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سننے کی نعمت سے محروم ہو جائیں —— اور یہ سب کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہابیلیت کبھی سر نہ اٹھا سکے اور قابیل کی چھوٹی سی ٹولی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا کی تمام لذّتوں اور زمین کی ساری نعمتوں کی تنہا ٹھیکے دار بنی رہے۔

قابیل کی ٹولی کا یہ عمل ہندوستان میں نہیں ساری دُنیا میں ہوا تھا مصر میں فرعون کے خاندان اور قبطیوں کی اولاد کے علاوہ باقی ساری دُنیا "اچھوت" تھی۔ بنی اسرائیل کی داستانِ مظلومیت کون نہیں جانتا؟ کہ ان کا کام صرف یہ تھا کہ بھوکے مریں اور اپنے چند مُٹھی بھر آقاؤں کے آگے ماتھا رگڑیں اور اگر کبھی ان آقاؤں کی مرضی کے خلاف کچھ کر گذریں تو جوتوں اور ٹھوکروں کی ضربیں سہیں۔ یہی حال عراق اور بابل میں بھی تھا جہاں نمرود و شدّاد نے چند قابیلوں کی مدد سے ساری انسانیت کو پامال کر رکھا تھا۔ بخت نصر نے فلسطین و شام کو برباد کر رکھا تھا، ایران میں کیکاؤسوں، کیقبادوں اور کیخسروؤں نے اسی قابیلی مذہب کو مختلف ناموں سے منوا رکھا تھا۔ چین کے خاقان و فغفور بھی یہی کر رہے تھے۔ یونان میں ارسطو اور افلاطون جیسے حکیم گذرے جن کا نام آج بھی دُنیا بڑی عزت سے لیتی ہے۔ مگر کیا انہوں نے ہابیل کی فریاد کو سُنا؟ نہیں، ان کا فلسفہ بھی قابیلی گروہ کا فلسفہ تھا اور اس فلسفہ میں بھی ہابیل کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ انہوں نے جمہوریت

اور دستوریت کے نام سے بڑے لمبے چوڑے نظام بنائے اور بادشاہ کا منصب عوام کے سپرد کیا۔ مگر جانتے ہو کہ یہ عوام کون تھے؟ یہ عوام صرف قابیل کی ٹولی کے افراد تھے۔ ہابیل کی نسل یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ انسانوں کی ایک وسیع تر آبادی کو صرف "خدمتگار" Serf کا نام دیا گیا تھا، ان خدمتگاروں کا کام یہ تھا کہ وہ محنت مزدوری کریں، کھیتی باڑی کریں، لوہا پیٹیں اور اوزار بنائیں، دھات تپائیں اور برتن تیار کریں، پتھر توڑیں اور مکانات کھڑے کریں لیکن حکومت و سروری اور سلطنت و فرمانروائی میں انھیں کوئی دخل نہ تھا۔ یہ کام صرف اُن "آزاد" افراد کا تھا جو انسانوں کی اس لاتعداد آبادی کی محنت و مزدوری پر جیتے تھے۔ گویا افلاطون کی جمہوریت اور ارسطو کی کی اشرافیت کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہابیل کام کریں اور قابیل اُس کام سے فائدہ اٹھائیں اور حکومت کریں۔

یہی حال رومتہ الکبریٰ کی اُس جمہوریت کا تھا جسے دُنیا میں سب سے پہلی یا سب سے بڑی جمہوریت کہا جاتا ہے۔ یہ جمہوریت کس کے لئے تھی؟ صرف رومنوں کے لئے۔ اِن رومنوں کے علاوہ باقی ساری خدائی "خدمتگار" تھی اور شہری حقوق یا عمرانی آزادی میں اُن کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ یونانی جمہوریت کی طرح ان غریبوں کو بھی نہ تو ووٹ کا حق حاصل تھا، نہ حکومت کے نمائندے چننے کا اختیار تھا اور نہ کسی اور طرح سیاست و حکومت کے معاملات میں دخل دینے کا حق یہ رکھتے تھے۔ اور کیوں رکھتے؟ اگر ہابیلوں کو یہ حق دے دیا جاتا تو پھر قابیل کی ٹولی کا عیش کیسے باقی رہتا؟

ابلیس کا سب سے پہلا چیلنج

غور کرو، انسانی تخلیق کی غرض کیا تھی اور انسان نے اُسے کیا سے کیا بنا دیا۔ قدرت کا مقصد یہ تھا کہ انسانی کالبُد کی یہ زندگی خدا کی تحمید و تقدیس کرنے اور معرفت الٰہی کے منصبِ جلیل تک پہنچنے میں صرف ہو۔ لیکن ہوا یہ کہ ابلیسیت کے دام میں آکر کھانے پینے اور رہنے سہنے کی چیزوں پر جھگڑے اُٹھے اور انسانی خون خود انسانی ہاتھوں ہی سے پانی کی طرح بے دریغ بہایا جانے لگا۔ ابلیسیت نے انسانی تخلیق کے پہلے ہی دن یہ اعلان کیا تھا کہ " وہ انسانوں کو بہکائے گا، انھیں سیدھے راستے سے بھٹکائے گا۔ سامنے آکر انھیں گمراہ کرے گا، پیچھے سے چھپ کر انھیں ورغلائے گا، داہنی طرف سے اُن پر حملہ کرے گا اور بائیں طرف سے اُن پر یلغار بولے گا[1]"

قدرت نے اس دھمکی کے جواب میں کہا تھا کہ " جا اور جو کچھ تجھ سے ہوسکتا ہے اُس سے دریغ نہ کر، تیرے زہریلے منتر کو اُتارنے اور تیرے مسموم اثرات کو دُور کرنے کے لئے خود انسانوں ہی میں سے ہادی و رہنما پیدا ہوں گے، جو پوری قوت و شدت کے ساتھ ابلیسیت کا مقابلہ کرتے رہیں گے[2]"

انبیاء و اولیاء

چنانچہ یہی ہوا۔ ادھر قابیل پر ابلیسیت نے افسوں پھونکا اور اُدھر انبیاء، اولیا، صوفیا اور صلحاء کی شکل میں اس افسوں کی زہرناکیوں کو دفع کرنے والے پیدا ہونے

---

[1] و [2] سورہ اعراف۔ رکوع اوّل

لگے، ایک طرف قابیل کی ٹولی تھی، فرعون و ہامان تھے، شدّاد و نمرود تھے، قیصر و کسریٰ تھے، خاقان و فغفور تھے۔ یونان و روما کے فلسفی تھے، ہندوستان میں اونچ نیچ کا امتیاز پیدا کرنیوالے مُقنّن و وکیل تھے اور دوسری طرف ہابیل کی حمایت میں انبیاء اور اولیاء کی صف تھی؛ گوتم بدھ تھا جسنے ذات پات اور اونچ نیچ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا لہرایا، مہابیر جین تھا جس نے برہمنوں کی فرمانروائی کو اعلانِ جنگ دیا، کنفیوشس نے چین میں خاقان و فغفور کی ٹولی کو جھنجوڑا، مصر میں کلیم اللہؑ نے آگے بڑھ کر فرعون و ہامان کی شہ رگ پر ضرب لگائی، فلسطین و شام میں روح اللہؑ نے رومنوں اور رومنوں سے ساز باز رکھنے والی ٹولیوں کے خلاف آواز اٹھائی ایران میں زرتشت نے کیقبادوں اور کیکاؤسوں کے مقابلے کا اعلان کیا——غرض جس طرح ابلیسیت نے آگے، پیچھے، دائیں بائیں اور اوپر نیچے ہر طرف سے انسانی روح پر گھیرا ڈالا تھا، اُسی طرح انبیاء کی ایک کثیر تعداد اس کے مقابلے کے لئے ہر گوشے اور ہر کونے سے نمودار ہونے لگی اور قابیلیت کے بنائے ہوئے جھوٹے اصولوں کا پردہ چاک کرنے لگی، لیکن ابلیسیت نے "شجرِ ممنوعہ" کی جس زہریلی لذّت سے قابیلیت کو آشنا کردیا تھا اِس کا جو نشہ دماغ پر چڑھا دیا تھا، اور اس کے حصول کی جو طلب اس کے رگ وپے میں دوڑا دی تھی وہ آسانی سے مٹنے والی نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قابیلیت نے ہر اُس تعلیم، ہر اُس فلسفے اور ہر اُس وعظ و تبلیغ کا مقابلہ کیا جو اس کے عیش و عشرت میں خلل ڈالنے والی تھی

اور جس سے عیش و آرام کی اُس محلسرا کو نقصان پہنچتا تھا جس کی ہر ہر اینٹ کے نیچے غریب انسانوں کی لاشیں دفن تھیں۔ چنانچہ انبیار کو بے دریغ قتل کیا گیا، صوفیار، اور اولیار کو رسوا کیا گیا، کلیم اللہ کے خلاف جنگ کا طبل بجایا گیا، روح اللہ کے لئے سولی کے تختے تیار کر کے اُن کے گوشت و پوست کو چیلوں اور کوّوں کی غذا بنا دینا تجویز کیا گیا —— لیکن قابلیت کے یہ حربے کامیاب نہ ہوسکے علاوہ ازیں قابلیت نے دیکھا کہ انبیا اور صلحار کے قتل سے اُن کی آواز نہیں دبتی۔ اس کے برعکس ان کے خون کے ہر قطرے سے یہ آواز اُور زیادہ بلند ہوتی ہے اور دنیا پر اپنا زبردست اثر ڈالتی ہے

قابلیت کا دوسرا افسوں

یہ چیز قابلیت کے لئے بڑی سخت تھی۔ وہ بے گناہوں کے خون سے اپنی تلوار رنگین کرسکتی تھی، لیکن خون کے قطروں سے تبلیغ و ہدایت اور جہاد و بغاوت کی جو آواز اٹھتی تھی اُسے کیسے دبائے ——؟ بارے ابلیسیت کے معلّم نے ایک نیا افسوں بتاکر قابلیت کی یہ مشکل بھی حل کر دی، یعنی جن انبیار اور صلحار کی تعلیم کا مقابلہ ممکن نہ ہوا، اُن کی تعلیم کو قبول کرنے اور ان کے آگے سر اطاعت جھکا دینے کا اعلان کیا جانے لگا۔ لیکن اس طرح کہ ان کی تعلیمات کے مفہوم و منشار کو نہایت چالاکی سے بدل دیا گیا۔ الفاظ انبیار کے تھے، مگر جو معنی اُن کو قابلیت پہنانا چاہتی تھی پہنا دیتی تھی۔ دانش فروشوں کی ایک جماعت نے اس کام میں قابلیت کا ساتھ دیا۔ اور اب سیدھی سیدھی باتوں کے اُلٹے معنے دنیا کو سمجھائے جانے لگے۔

روح اللہ نے پہاڑی پر کھڑے ہو کر جو وعظ[1] کہا تھا اُس میں رحم و درگذر کی تبلیغ تھی اور قابلیت کو تلوار اُٹھانے اور انسانی خون بہانے سے روکا گیا تھا۔ مگر قابیلیت کے نقیبوں کی طرف سے اس کا مطلب یہ سمجھا یا گیا کہ غریب انسانوں کو ہر ظلم خاموشی سے برداشت کر لینا چاہیئے، حتیٰ کہ اگر اُن کے ایک گال پر تھپڑ پڑے تو دوسرا گال بھی ظالم کے تھپڑ کے لئے بڑھا دینا چاہیئے۔ غرض اسی طرح ہر اچھّی تعلیم کو قابیلی رنگ دے دیا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ دنیا کے دل و دماغ میں قابیل کا فلسفہ گھر کر گیا اور ہر مظلوم نے صبر و شکر کے ساتھ اپنی مظلومیت کو قبول کرنا شروع کر دیا۔ بادشاہ کو خدا یا خدا کا اوتار سمجھا جانے لگا اور اپنی بادشاہت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر شہر، ہر قصبے، ہر قریے اور ہر گاؤں میں جو لوگ بادشاہ کے دست و بازو بنائے گئے انھیں بھی خدا کی غریب مخلوق نے یا تو حق بجانب سمجھا اور یا یہ خیال کیا کہ یہ دُنیا غریبوں کے لئے نہیں ہے، غریبوں کے لئے جو کچھ ہے، مرنے کے بعد ہے۔ اِس دنیا میں انھیں سب کچھ برداشت کرنا چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ عوام کا یہی عقیدہ دراصل قابلیت کی سب سے بڑی پشت پناہ ثابت ہوا، خدا کی غریب مخلوق کو یہ سمجھایا گیا کہ "وعدۂ فردا" کی اُمید میں آج کے مظالم کو برداشت کر لو۔ تلوار اٹھانے کے بجائے انھیں صرف آنسو بہانا سکھایا گیا اور ظلم و بے انصافی کے خلاف کھُلّم

---

[1] انجیل متی۔ باب ۵،

کھلّا بغاوت کرنے کے بجائے، اس پر صبر کرنے کی تلقین انھیں کی گئی گویا اس طرح عوام کے ناخن وچنگال کی تیزی ختم کر دی گئی! اُن کے دست وبازو کی قوت سلب کر لی گئی، اُن کے ہتھیاروں کو کُند بنا دیا گیا اور ان کی قوت و طاقت کو عضو معطل کر کے رکھ دیا گیا۔ اب وہ خود یہ سمجھنے لگے کہ بھوکوں مرنا، فاقے کرنا، مصیبتوں اور تکلیفوں کی زندگی گذارنا اور چند مٹھی بھر افراد کے عیش و آرام کے لئے خون پسینہ ایک کرنا ہی ان کا کام ہے، اُن کا کام ہی یہ ہے کہ خود تو رات بھر آسمان کی چھت کے نیچے سردی میں اکڑا کریں، لیکن قابیل کی ٹولی کی راحت کے لئے دن بھر قالین و کمخواب کے تھان تیار کیا کریں، اُن کا کام ہی یہ ہے کہ سال بھر کی محنت سے گرمی، سردی اور بارش کی سختیاں جھیل کر کھیتوں میں جو کچھ پیدا کریں، اُسے قابیل کی ٹولی کے آگے لاکر رکھ دیں تاکہ وہ اُن سے کھیلے، اُن میں نہائے، اُن کی شراب بنائے اور پھر اُس کے نشے میں چور ہو کر ان غریبوں ہی کے خون سے ہولی کھیلے۔

باب ۳

روحانی نجات اور معاشی ماحول

قابلیت نے انسانی زندگی کا جو نقشہ تیار کیا تھا، اُس میں عوام کی حیثیت صرف خدمتگاروں کی تھی۔ پہاڑوں سے سونا نکالنے اور زمین سے غذا پیدا کرنے کا کام تو عوام کے سپرد تھا، لیکن اس پیداوار کی ملکیت قابیلی گروہ کو حاصل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام تو دانے دانے کو ترسنے لگے لیکن قابیلی گروہ دولت سے کھیلنے لگا لیکن چونکہ زندہ رہنا انسان کا سب سے پہلا فطری فرض ہی یا دوسری لفظوں میں یوں کہو کہ زندگی کو باقی رکھنا ہر جاندار کا سب سے پہلا فطری تقاضا، سب سے بڑی فطری طلب اور سب سے شدید فطری احتیاج ہی۔ اس لئے عوام میں زندہ رہنے کی جدوجہد نے سخت خوفناک شکل اختیار کرلی۔ مگر قابیلیت و ہابیلیت کا یہ تقابل، دولت وغربت کا یہ مقابلہ اور پُرخوری اور فاقہ کشی کا یہ موازنہ جو

دُنیا کے آغاز میں ایک غیر فطری اور غیر قدرتی چیز تھی، اب بالکل فطری اور قدرتی سمجھی جانے لگی۔ اب عوام کی ذہنیت اتنی ماؤف ہو چکی تھی کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ قدرت ہی کا منشا، یہ ہے کہ دولت کی دیوی صرف قابیلی گروہ ہی کی مہمان رہے اور دُنیا کی بقیہ آبادی صرف حسرت و حرماں نصیبی کے ساتھ اس گروہ کے عیش و عشرت کو دُور سے کھڑی تکتی رہے۔ لیکن ھابیل کی نسل کا عقیدہ فطری نہ تھا بلکہ قابلیت کی لگاتار کوشش اور بیسیوں فلسفہ طرازیوں کا رہین منت تھا، اس لئے بظاہر عوام نے اس کو مان تو لیا، یا زیادہ صحیح طور پر یوں کہو کہ اِس کے آگے لاجواب تو ضرور ہو گئے لیکن ان کے دل کی گہرائی سے زندہ رہنے اور زندگی کے لوازم سے اپنے جسم و جان کے رشتے کو باقی رکھنے کی جو فطری آواز، جو قدرتی تڑپ اور جو امڈ بے چینی پیدا ہوتی تھی، اس کو دبا دینا اُن کے بس کا روگ نہ تھا۔ آدمی کو آپ منطق و فلسفہ کی مدد سے یہ سمجھا سکتے ہیں کہ آگ میں حرارت نہیں، لیکن آگ میں ہاتھ ڈالنے سے حرارت کا جو فطری احساس پیدا ہوتا ہے اُسے آپ کیسے چھین سکتے ہیں؟ پیٹ بھرنے تن ڈھانکنے اور گرمی سردی سے محفوظ رکھنے کی طلب بالکل فطری طلب ہے۔ اس لئے منطق و فلسفہ کی مدد سے آپ اس فطری طلب کو بھی نہیں مٹا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قابیلی گروہ کی فلسفہ طرازی اور اس کی مکر و تلبیس یا قوت و سطوت کے سامنے ہابیلی نسل کا جم غفیر بے بس تو ضرور ہو گیا لیکن زندہ رہنے کے فطری تقاضے کی جد و جہد کو نہ چھوڑ سکا۔ مگر اب اس جد و جہد کی نوعیت صرف یہ رہ گئی کہ ہر انسان خود کو قابیلی گروہ میں شامل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بارہا ایسا ہوا کہ آج کا

ہابیل کل کا قابیل بن گیا۔ لیکن ہابیلیت بدستور اپنی جگہ پر قائم رہی، فرعون کی قابیلی گروہ کو موسیٰؑ کی ہابیلی جماعت نے سرنگوں کر دیا۔ لیکن آخر میں نتیجہ کیا ہوا؟ کچھ دنوں کے بعد خود یہی ہابیلی جماعت، قابیل بن گئی، اور دنیا جس مصیبت میں مبتلا تھی اُس میں اُسی طرح مبتلا رہی، ہاتھ کا پھوڑا اچھا ہو گیا۔ لیکن سارا بدن ویسے ہی پھوڑوں سے ڈھکا رہا۔ انسانی روح اُسی طرح کرب و اذیت سے کراہتی رہی انسانی روح کی فریاد یہ تھی کہ تمام پھوڑے اچھے ہوں، وہ اندرونی عفونت و گندگی اور وہ اندرونی مادّہ جو اس تمام فساد کی جڑ ہے، اُسے دور کیا جائے، لیکن اس کی یہ فریاد، صرف فریاد ہی فریاد تھی، ایک آواز تھی جو لق و دق بیابان میں بلند کی جا رہی تھی، ایک کراہ تھی جو سنسان ویرانے میں کی جا رہی تھی۔ ایک دردبھری پکار تھی جو سائیں سائیں کرنے والے جنگل میں مچائی جا رہی تھی۔ بیکسی کا ایک شورِ المدد تھا جو اندھوں، بہروں اور گونگوں کے سامنے کیا جا رہا تھا —— طوطی کی آواز کو قابیلی نقار خانے میں سُننے والا کوئی نہ تھا؟

صحیح اصولوں کی غلط تشریح

انبیاء اور صلحاء مسلسل آرہے تھے، لیکن وہ کہتے کچھ تھے، اور اس کی تشریح کچھ کی جاتی تھی۔ انبیاء اس بات پر زور دیتے تھے کہ انسان کا اصلی مقصد کھانا پینا اور کھانے پینے کی طرف دوڑنا نہیں ہے، بلکہ روحانی بلندی حاصل کر کے خداشناسی اور خدارسی کے درجے تک پہنچنا ہے۔ قابیلیت نے اس اصول کا مطلب عوام کو یہ سمجھایا کہ دُنیا کی دولت کو چھوڑ کر اور زندگی سے مُنہ موڑ کر ایک کونے میں بیٹھ جاؤ اور اللہ اللہ کیا کرو۔ اور زندگی، صحت، قوت اور دولت صرف قابیلی گروہ کے لئے چھوڑ دو۔ چنانچہ ایک طرف تو عوام میں وہ عقیدہ پیدا ہوا جسے رہبانیت، ریاضت یا تپسیا اور گوشہ نشینی و عزلت گزینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسری طرف اُن کے اخلاق میں

عفو و درگذر، ضبط و تحمل اور صبر و استقلال وغیرہ کا مفہوم قابیلی گروہ کی اطاعت و غلامی قرار پایا۔ قابیلی گروہ کو اب اور کس چیز کی حاجت ہو سکتی تھی۔ فریق مخالف نے خود ہی اپنے ہتھیاروں سے نفرت کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ خود ہی کار زار حیات کے میدان سے منہ موڑ کر کونوں میں سر چھپا کر بیٹھ رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔

عیسیٰ، بدھ، زرتشت اور کنفیوشس کے ماننے والے دنیا میں جتنے پھیلے اتنے ہی شاید کسی دوسرے مذہب کے پھیلے ہوں گے۔ لیکن ان کی تعلیم جس کا سب سے پہلا مقصد دکھی انسانیت کے دکھ کو دور کرنا تھا، اسے رفتہ رفتہ بالکل مسخ کر دیا گیا تھا۔ عیسیٰ نے اخلاق و شرافت کا جو بلند معیار پیش کیا تھا۔ وہ صرف غلامانہ بیچارگی و بیکسی میں تبدیل ہو کر رہ گیا، گویا حضرت عیسیٰ صرف اس لئے آئے تھے کہ مظلوم کو ظلم سہنا اور ظالم کو ظلم کی تلقین کرنا سکھائیں اور اپنی امت کو یہ تبلائیں کہ ظلم کرنے والے ہاتھ کو پکڑ لینے کے بجائے مظلوم کا ہاتھ پکڑ لیا جائے —— اگر حضرت عیسیٰ کے "پہاڑی کے وعظ" کا مطلب یہی تھا تو بہتر ہوتا کہ حضرت عیسیٰ کبھی نہ آتے۔ اسی طرح گوتم بدھ کی تعلیم جو ذات پات کے امتیازات کو مٹانے اور انسانی فرق مراتب کو نیست و نابود کر کے سب کو مساوی حقوق دینے کے لئے پیش کی گئی تھی، اس کا مدعا صرف یہ رہ گیا کہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے مرد و عورت صرف بھکشو اور بھکشنی بن جائیں اور انسانوں کا جم غفیر جس درد و الم سے کراہ رہا ہے، اسے ویسا ہی چھوڑ دیں۔

زرتشت نے خدا کی وحدانیت کا سبق دے کر قابیل کے بنائے ہوئے انسانی بتوں کے سر پر گرز لگایا تھا، اور انسان کو اس غیر فطری بوجھ سے نجات دلائی تھی تاکہ دنیا کے بسنے والے ایک دوسرے کو ایک ہی خدا کا بندہ سمجھ کر لطف و آشتی

سے زندگی گذارنا سیکھیں، لیکن کیقبادوں اور کیخسروؤں نے اس تعلیم کو صرف آگ کی پوجا کر لینے تک محدود کر کے رکھ دیا اور عوام کی بیکسی بدستور بیکسی بنی رہی۔

کن فیوشس نے بھی انسانی فریاد و فغاں کی دادرسی چاہی تھی اور اسی غرض سے پچھلے تمام صوفیاء وصلحاء کے اقوال و اعمال کو جمع کر کے باہمی بھائی چارگی اور باہمی مروت و محبت کے ساتھ رہنے سہنے کا سبق دیا تھا لیکن اس سبق میں سے قابلیت نے صرف اتنا باقی رکھا کہ خاقان چین کو خدا نے خاقان بنا کر بھیجا ہے اور اس کے حکم کی اطاعت خدا کے حکم کی طرح واجب التعمیل ہے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

ایسا کیوں ہوتا رہا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مصلح و ہادی نے انسانی اخلاق کو سدھارنے اور انسانی زندگی کا صحیح مقصد بتانے کی کوشش کی اور یہ توقع کی کہ اِس تعلیم کا اثر یہ ہوگا کہ قابلی گروہ خود بخود خودغرضی و نفس پرستی سے تائب ہو جائے گا اور اپنے نفس کی عیش و راحت پر ساری دُنیا کو قربان کر دینے کے بجائے، کُل انسانیت کو ایک برادری سمجھ کر بھائی چارگی کے ساتھ رہنا سیکھے گا۔ لیکن یہ توقع بالکل فضول تھی۔ ایک آدھ قابیل کا اپنی دولت و ثروت کو دوسروں کی راحت و آسائش کے لیئے وقف کر دینا ممکن تھا اور ایسا ہوا بھی، لیکن قابلیت کا جو نظام بن چکا تھا اور اس نظام کے نیچے انسانوں کا جمِ غفیر جس طرح پامال ہو رہا تھا، وہ جوں کا توں باقی رہتا تھا۔ ایک قابیل یا چند قابیلوں کے مر جانے تباہ ہو جانے یا اپنی رائے بدل دینے سے کیا ہو سکتا تھا جب کہ قابلیت موجود تھی اور ہر شخص قابیل بننے کا خواہشمند تھا؟ اس لیئے قابیل کو نہیں قابلیت کو ختم کرنے کی ضرورت تھی۔ اس تصور کو مٹانے کی ضرورت تھی کہ دُنیا میں دولت

کے انبار صرف چند گنے چُنے افراد کے لئے مخصوص ہیں اور باقی ساری خدائی صرف غلامی کرنے اور بھوکوں مرنے کے لئے ہے۔ اس عقیدہ کو ختم کرنے کی ضرورت تھی کہ انسانوں میں کچھ بڑے بنا کر پیدا کئے گئے ہیں اور کچھ چھوٹے اور چھوٹوں کا فرض صرف یہ ہے کہ زندگی بھر درد و الم سے کراہتے رہیں اور اپنی محنت و مشقت کا سارا نتیجہ بڑوں کی گود میں لاکر ڈال دیں، اس عقیدے کو ناپید کرنے کی ضرورت تھی کہ نجات کا راستہ صرف یہ ہے کہ قابلیت کی زیادتیوں اور بے انصافیوں سے مُنہ موڑ کر اور زندگی کی جد و جہد سے جدا ہو کر انسان پاؤں توڑ کر ایک گوشے میں بیٹھ جائے؛ اس فلسفے کو ضرب لگانے کی ضرورت تھی کہ مظلوم کا کام صرف یہ ہے کہ ظلم سہتا رہے اور ظالم کی طاقت کو طاقت سے مغلوب کرنے کا خیال دل میں نہ لائے ---- غرض اِن بنیادی اصولوں کو طے کرنے اور صرف اخلاق ہی میں نہیں بلکہ سیاست، معاشرت اور معیشت کے پورے نظام میں ایک انقلاب عظیم برپا کرنے کی ضرورت تھی۔

باب ۴

انسانی فطرت کی ابتدائی کروٹیں

تاریخ کا آغاز انسانی ہاتھوں میں معلومات کا جو ذخیرہ اس وقت موجود ہے، اور جس کی رو سے ہم ماضی کے واقعات کو کسی قدر یقین کے ساتھ جان سکتے ہیں، وہ آج سے صرف چار ہزار سال پہلے تک کی خبر ہم کو دیتا ہے، چار ہزار سال پہلے دنیا میں جو کچھ ہوا، اس کی نسبت ہم یقین تو کیا "نیم یقین" کے ساتھ بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تاہم زمین سے برآمد شدہ مختلف کتبوں، سکوں اور اسی قسم کے دوسرے آثار و نشانات کی مدد سے چار ہزار سال قبل کی تاریخ کا کچھ اجمالی سا علم مؤرخوں نے حاصل کیا ہے، مگر وہ اتنا ناکافی ہے کہ "انقلاباتِ عالم" کی تاریخ کو جاننے میں اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ہندوستان کی "مہابھارت" اور موسیٰ کلیم اللہ کی توریت کو دنیا کی سب سے پرانی کتاب کہا جاتا ہے۔ ہندو رشیوں کے چاروں وید، رامائن اور زرتشت کی ژند اور اوستا کی قسم کی چند اور کتابیں بھی دنیا کی قدیم ترین

تصنیف کہلائی جاتی ہیں۔ ویدوں کا سنہ تالیف بعض قوموں نے چار ہزار سال قبل مسیح مقرر کیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ امر مسلمہ ہے کہ ہندوستان میں آریوں کی آمد دو ہزار سال قبل مسیح سے پہلے نہیں ہوئی بلکہ زیادہ یقینی تحقیق تو یہ ہے کہ ان کی آمد پندرہ سو قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ پھر چونکہ ویدوں کا متن ہندوستان کے ماحول سے پوری طرح متاثر ہے، اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ آریہ لوگ انھیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ ممکن ہے اس کے تھوڑے بہت منتر ہندوستان آنے سے پہلے بھی آریوں میں رائج ہوں، لیکن اصل کتاب کی تالیف بہر صورت ہندوستان آنے کے بعد ہی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے ویدوں کی تصنیف کا آغاز زیادہ سے زیادہ دو ہزار سال قبل مسیح قرار پا سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ چاروں وید جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں وہ سب دو ہزار سال قبل مسیح میں موجود تھے۔ اس کے برعکس سارے محققین اس امر پر متفق ہیں کہ یہ کسی ایک شخص کی تصنیف نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً مختلف مُصلحوں اور ہادیوں نے ان میں اضافے کئے ہیں۔ اس لئے آخری شکل جو وید نے حاصل کی وہ سنہ عیسوی کے آغاز سے بھی بہت بعد کی ہے

وید کے بعد مہابھارت کا درجہ ہے۔ جس کو زیادہ سے زیادہ ہزار سال سے پندرہ سو سال قبل مسیح تک کی تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ رامائن کے بارے میں ایچ۔ جے کوبی نے چھ سو قبل مسیح کا زمانہ معیّن کیا ہے۔ لیکن دوسرے محققین نے ۲۰۰ ق م کو زیادہ قرین قیاس قرار دیا ہے۔ لیکن آجکل اس کا قدیم ترین نسخہ صرف ۸۰۰ء کا ہے۔ اس سے قبل کا کوئی نسخہ موجود نہیں[1]۔

---

[1] تاریخ ادب قدیم (سنسکرت)، از میکس ملر (Max Muller) اور اوریجنل ٹیکسٹ از جے میور، اور چیمبرس انسائیکلوپیڈیا۔

منوجی کی منوسمرتی کو بھی دنیا کی قدیم ترین کتابوں کی صف میں رکھا جاتا ہی اس کا سنہ تصنیف بارہ سو قبل مسیح بتایا جاتا ہی، لیکن بُلر (Buhler) نے دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہی کہ اگر اتنا پرانا کوئی نسخہ واقعی تھا تو وہ ضائع ہو چکا ہی اور اب دُنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں ہی اس وقت جو نسخہ موجود ہی، وہ زیادہ سے زیادہ دوسری صدی قبل مسیح اور دوسری صدی عیسوی کے چار سو سالہ زمانہ میں سے کسی زمانے میں تیار ہوا ہی۔[۲]

زرتشت کی ژند اور اوستا کی تاریخ تصنیف کا صحیح علم بھی مؤرخین کو نہیں ہی۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور پروفیسر براؤن وغیرہ کی تحقیق سے پانچ اور چھ صدی قبل مسیح کا زمانہ متعین کیا گیا ہی۔[۳]

غرض تاریخی تحقیق کی رو سے اس وقت دنیا کی سب سے قدیم ترین کتاب "تورات" ہی قرار پاتی ہی جس کا زمانۂ تصنیف کسی محقق کی رائے میں بھی چودہ سو سال قبل مسیح سے کم نہیں ہی، مزید براں تاریخی لحاظ سے توریت کے متعلق عام مورخوں کی رائے یہی ہی کہ اگرچہ بعد میں اس پر کچھ اضافے ضرور ہوئے ہیں، لیکن پھر بھی اس کے اکثر حصے حضرت موسیٰ ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور اس وقت ہمارے پاس اس کا جو متن ہی اس کے اصلی ہونے کا دعویٰ دوسری تمام کتابوں کے مقابلے میں زیادہ قوت کے ساتھ کیا جا سکتا ہی۔[۳]

اس وقت دُنیا میں قرآن ہی ایک ایسی قدیم ترین کتاب ہی جو اپنی صحیح

---

[۱] تاریخ ادبِ قدیم سنسکرت از میکس مُلر (Max Muller) و اوریجنل سنسکرت ٹیکسٹ از جے میور و چیمبرس انسائیکلو پیڈیا۔

[۲] جلد ۱۷ و جلد اوّل صفحہ ۲۶ [۳] چیمبرس انسائیکلو پیڈیا در بیانِ موسیٰ

شکل میں ہمارے سامنے ہو اس لئے پرانی تاریخ کے جن واقعات کا حوالہ قرآن میں بھی مذکور ہو، اُن ہی پر ہم اپنی معلومات کی بنیاد قائم کر سکتے ہیں، مہابھارت وید، توریت یا انجیل کی طرح قرآن کا اصل موضوع بھی تاریخ نہیں۔ پھر بھی قدیم تاریخ کے جن واقعات کا ذکر بر سبیل تذکرہ قرآن میں آگیا ہو، وہ ایک مؤرخ کے لئے بڑی قیمت رکھتا ہو، یہ صحیح ہو کہ اس قسم کے مختصر حوالوں سے تاریخ قدیم کا تفصیلی علم حاصل نہیں کیا جا سکتا، تاہم ہزاروں سال قبل دنیائے انسانیت جن انقلابات سے گذر رہی ہو، ان کی ایک دھندلی سی تصویر ان حوالوں سے ضرور ذہن میں آجاتی ہو۔ اسی بنا پر ہم نے انقلاباتِ عالم کا سب سے پہلا دور قابیل و ہابیل کے باہمی تصادم کو قرار دیا ہو، اس کا ذکر توریت میں بھی ہو اور قرآن میں بھی۔ تفصیلات کا ہم کو علم نہیں۔ نہ ہی اس واقعہ کی صحیح تاریخ متعین کی جا سکتی ہو۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس زمانہ میں دُنیا کی معیشی، سیاسی اور معاشرتی حالت کیا تھی۔ لیکن اگر اس واقعہ کو محض مجاز و استعارے کی حیثیت ہی سے دیکھا جائے، تب بھی ہمارا مقصد اس سے پورا ہو جاتا ہو۔ یہی وجہ ہو کہ ان اوراق میں ہم نے ظلم و مظلومیت کی باہمی کشمکش کے لئے دوسرے لفظوں کے مقابلے میں "قابلیت" و ہابلیت" کے الفاظ کو ترجیح دی ہو۔ قابیل و ہابیل کے ساتھ جو واقعہ منسوب ہو وہ خواہ مجاز و استعارے پر مبنی ہو یا اصلیت و حقیقت پر، دونوں صورتوں میں اس کی نوعیت اُس تصادم و کشمکش کی اصل ماہیت کو ٹھیک ٹھیک طور پر ظاہر کرتی ہو جو انقلاباتِ عالم کی بنیاد ہوتے ہیں اور جن کے اسباب و محرکات پر بحث کرنا اس کتاب کا موضوع و مقصد ہو۔

انسانی معاشرت کا پہلا گہوارہ

اسی بنا پر قابیل وہابیل کا جو واقعہ قرآن اور توریت دونوں میں مذکور ہی اُسی کو انقلابات عالم کا پہلا واقعہ تسلیم کرکے اس تاریخ کا آغاز کیا گیا ہی

آدم وحوّا اور اُن کی اولاد قابیل وہابیل کی معاشرت کو انسانی زندگی کے اُس ابتدائی دور کا پہلا نمونہ سمجھنا چاہیئے جب شہری و مدنی تنظیم کا خاکہ تیار ہو رہا تھا اور انسان یہ سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ باہم مِل جُل کر رہنا کس طرح ممکن ہو سکتا ہی۔ ہمیں یہ مان لینا چاہیئے کہ قابیل وہابیل کا یہ دور سیاسی و معیشی زندگی کی بیداری کا پہلا دَور تھا۔ یعنی ہم یہ قرار دیتے ہیں کہ اس واقعے سے پہلے تک انسانی زندگی، معاشرت و تمدن کے آئین وضوابط سے آزاد تھی لیکن جب قابیل نے اپنی غرض کو پورا کرنے کے لئے ہابیل پر تشدد کیا اور اُسے جان سے مار ڈالا تو پہلی بار انسان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس قسم کی حرکتوں کو روکنے کے لئے کچھ تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں۔ شروع شروع میں یہ تدبیریں بہت مختصر اور سادہ تھیں۔ مگر جیسے جیسے انسانی آبادی بڑھتی گئی اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے گئے، ان تدبیروں کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، حتّٰی کہ رفتہ رفتہ سیاست ومعیشت اور آئین و قانون کے نام سے ایک ایسا طومار تیار ہو گیا کہ آج بڑے بڑے دماغ بھی اس کی باریکیوں میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔

ابن آدم کے مدنی شعور کا پہلا دَور قتل کے احساس سے شروع ہوتا ہی اور انسانی معاشرت میں سب سے پہلی پابندی بھی اسی کے خلاف عائد کی جاتی ہی۔ چنانچہ توریت میں اس واقعے کا ذکر کرنے کے بعد خود قابیل کی زبان سے یہ کہلوایا گیا ہی۔

"اے خدا میری دامن کا یہ داغ سزا سے بھی نہیں دھل سکتا۔ میں اب ہمیشہ ایک خانماں برباد و آوارہ انسان کی طرح روئے زمین پر گھومتا پھروں گا اور پھر یہ ہوگا کہ جو شخص بھی مجھے پائے گا، قتل کر ڈالے گا۔"

(پیدائش باب[1])

دوسرا دور، نوحؑ

قابیل وہابیل کے اس دور کے بعد انسانی آبادی بڑھنی شروع ہوئی اور ملی جلی مدنی زندگی نے نئی نئی پیچیدگیاں پیدا کیں۔ لیکن اس زمانے کی بھی کوئی معتبر تاریخ موجود نہیں ہے۔ تاہم توریت وقرآن کی روایات کی رو سے ہم یہ قرار دیتے ہیں کہ انسانی معاشرت کا دوسرا دَور نوح کے زمانے سے شروع ہوتا ہے یا دوسرے لفظوں یوں کہئے یہ پہلا معاشرتی انقلاب تھا جو انسانی زندگی میں برپا ہوا[1]۔ قابیلی دَور کی سیاست رفتہ رفتہ پیچیدہ ہوتی چلی گئی اور نئے نئے مسائل پیدا ہونے لگے، ابتدا میں باہمی سمجھوتے سے ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی اور افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کیا گیا، مگر جب قابیلی ذہنیت نے زیادہ زور باندھا تو ہابیلیت کا خون سر چڑھ کر بولنے لگا اور رفتہ رفتہ طوفان بن کر ہر طرف پھیل گیا۔ "طوفانِ نوح[2]" کی مذہبی

---

[1] پیدائش۔ باب ۵۔ فقرہ ۲۹

[2] نوح کا نام اگرچہ ہندوستان اور ایران کی قدیم مذہبی کتابوں میں مذکور نہیں ہے لیکن طوفان کا واقعہ ہندوؤں کی "ستاپت برہمن" میں (بحوالہ سنسکرت ٹیکسٹ از میور) اور زرتشت دھند یداد (ترجمہ انگریزی از ڈرمیسٹیٹر) میں مذکور ہے۔ چیمبرس انسائیکلو پیڈیا (مطبوعہ ۱۹۳۵ء) نے طوفانِ نوح کی تاریخی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "اس طوفان کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں، وہ اگرچہ بظاہر افسانوی معلوم ہوتی ہیں، لیکن چونکہ مختلف مذاہب کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے، اسلئے اسے بالکل بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ طوفان نہ سہی کسی نہ کسی قسم کی تباہی دُنیا کے ایک وسیع رقبے میں ضرور آئی ہوگی۔" (جلد سوم)

تاویل خواہ کچھ ہی ہو۔ لیکن انقلاباتِ عالم کے مؤرخ کے لئے اس کی یہ تاویل بھی کچھ کم اہم نہیں کہ انسانی سوسائٹی کے ظالمانہ دستور وآئین کے خلاف یہ پہلی بغاوت تھی جو روئے زمین پر ظاہر ہوئی۔ چنانچہ توریت میں "طوفانِ نوح" کے ختم ہو جانے کے بعد عوام کہتے ہیں

"اب نوح ہمیں امن وسلامتی سے ہم کنار کر دے گا، اور اب ہمارے عمل اور ہماری محنت کا صحیح پھل ہم کو ملے گا"

مزید براں اس طوفان کی جو وجہ توریت میں بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے

"نافرمان انسانوں نے زمین کو ظلم وتشدد سے بھر دیا ہے"[1]

اس کے بعد جب دوبارہ امن وامان قائم ہوا تو نوح نے سب سے زیادہ زور قتل انسان ہی کے خلاف صرف کیا ہے اور یہ فرمان نافذ کیا ہے کہ جو کوئی انسانی خون گرائے گا اس کے بدلے میں اس کا خون بھی بہایا جائے گا۔[2]

یہودیوں کی مذہبی روایات کے لحاظ سے نوح کے زمانہ کا جو تعین کیا جاتا ہے وہ تو بہت زیادہ ہے۔ لیکن طبقات الارض کے ماہروں نے زمین کی کھدائی سے نکلے ہوئے بعض آثار سے اس طوفان کا جو قرین قیاس زمانہ متعین کیا ہے، وہ لینگ ڈان (Lang Don) کی رائے میں تین ہزار دوسو اور چار ہزار قبل مسیح کے درمیان ہو سکتا ہے۔ یعنی آج سے چھ ہزار سال قبل۔[3]

---

[1] پیدائش: باب ۶ فقرہ ۱۳

[2] ایضاً: ایضاً فقرہ ۶

[3] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۵ء

پھر چونکہ حضرت موسیٰ کا سنہ پیدائش چودہ سو قبل مسیح کے نصفِ اوّل کو قرار دیا جاتا ہے، اس لئے نوح اور موسیٰ کے زمانے کی درمیانی مدّت ڈھائی ہزار سال کے قریب ہوتی ہے۔ اس دوران میں بہت سے انقلاب آئے ہیں، لیکن حضرت ابراہیم کی ذات کے ساتھ جس انقلاب کا ذکر توریت و قرآن دونوں میں موجود ہے وہ خصوصیت سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ البتہ موسیٰ کے بعد سے تاریخ کے مناظر ذرا نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آنے لگتے ہیں اور داعی اسلام کے عہد تک پہنچتے پہنچتے تو انقلابات کے یہ نقشے بہت ہی نمایاں ہو جاتے ہیں۔

انقلابات کا مرکز

لیکن ان انقلابات کا مرکز وہ علاقہ رہا ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں بلادِ عرب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور جو عراق سے لے کر مصر و یمن تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جس میں مصر و بابل کی قدیم ترین تہذیبیں شامل ہیں۔ تاریخی اعتبار سے چین اور ہندوستان کی تہذیب بھی بہت پُرانی ہے۔ اس لئے یہاں کی انسانی بستیاں بھی سیاسی و معیشی انقلاب کے دورسے گذری ہیں۔ ہندوستان کا سب سے پہلا انقلاب وہ ہے جس کا تذکرہ مہابھارت میں ملتا ہے اور جس کا ہیرو رامؔ کو قرار دیا جاتا ہے، رامؔ اور راونؔ کی جنگ اگرچہ افسانوی دُنیا میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ تاہم اس کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد دوسرا انقلاب وہ ہے جس کا ذکر رامائن میں مذکور ہے۔ اور جس کا سنہ چار سو اور چھ سو قبل مسیح کے درمیان واقع ہے، چین کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا آغاز ۲۲۰۰ قم

---

[1] چیمبرس انسائکلوپیڈیا مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۵ء

ہی ہونا ظاہر ہوتا ہی۔ لیکن زیادہ منظّم زمانہ ڈیوک آف چاؤ Duke of Chau) کے دور سے شروع ہوتا ہی جو ۱۱۰۵ق م میں فوت ہوا اس کے بعد کنفیوشس کی حیثیت چین میں بہت اہم ہی۔ لیکن وہ صرف ایک معلّمِ اخلاق تھا، کسی منظّم تحریک کا بانی نہ تھا۔ البتہ ایران میں زرتشت ایک بہت بڑے انقلاب کا داعی تھا۔ تاریخی لحاظ سے اس کے زمانے کا صحیح تعیّن نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم محققین نے ایک ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ کسی زمانے پر اتفاق کیا ہی[لہ]۔

لیکن اصل یہ ہی کہ سیاسی و معیشی نظامِ حیات کے انقلابات کے لحاظ سے ایران سے لے کر ہندوستان و چین تک کے علاقوں نے بہت ہی کم کروٹیں بدلی ہیں۔ یہاں کے لوگ کچھ ایسے قناعت پسند واقع ہوئے تھے کہ انہوں نے قابلی نظام کا مقابلہ کرنے کے بجائے صبر و برداشت کی طاقت کو ترقی دینا زیادہ اچھّا سمجھا۔ واقعہ یہ ہی کہ ہندوستان میں قابلی طاقتوں نے ذات پات کی طبقاتی تقسیم کا جو چھو منتر پھونک رکھا تھا، اس نے عوام کو بالکل بے بس بنا دیا تھا۔ اس چھو منتر کی مدد سے انسانی آبادی کو چند طبقات میں محدود کر کے کچھ اس طرح جکڑبند کر دیا گیا تھا کہ صدیوں تک عوام میں کوئی انقلابی کروٹ لینے کی ہمّت ہی باقی نہ رہی۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر اپنی اپنی قسمتوں پر قانع رہے اور اس قسمت کو خدا کی دین سمجھتے رہے۔

کوئی چھ سو سال قبل مسیح میں، گوتم بدھ نے اس کے خلاف آواز بلند کی جس کا کافی اثر ہوا۔ لیکن چونکہ سیاسی طاقت پر قبضہ کر کے ایک صحیح

لہ یہ تفصیلات برٹانیکا و چیمبرس انسائکلوپیڈیا سے ماخوذ ہیں۔

ہیئتِ سیاسیہ پیدا کرنے کے بجائے، بدھ نے رہبانیت و ترکِ دُنیا کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار دے دیا، اس لئے رفتہ رفتہ پُرانی قابیلی ذہنیت پھر عود کر آئی اور بدھ مت کا خاتمہ ہو گیا۔

ایران و چین کی حالت بھی ہندوستان ہی کی طرح تھی، یہاں اگرچہ ذات پات کی بندشیں نہ تھیں، لیکن ہیئت سیاسیہ میں بادشاہ نے اور بادشاہ کے بعد طبقۂ امرا نے جو اہمیت حاصل کر لی تھی، اس کی بنا پر عوام کے ذہن و دماغ بے حد مرعوب و ہیبت زدہ ہو چکے تھے اور انسانی معاشرت کے ہر دائرے میں ایک جمود سا پیدا ہو گیا تھا۔ مجبوراً لوگوں نے اپنے دل و دماغ کی جولانیوں کے لئے ریاضت و ترکِ دُنیا کی راہبانہ زندگی کا میدان منتخب کر لیا اور دولت و حکومت کی لذتوں کو قابیلی گروہ کا حق سمجھ کر چھوڑ دیا۔

لیکن بلادِ عرب کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معمورۂ ارضی کے سکون و جمود کو توڑ کر انسانی زندگی کی سطح کو بلند کرنے کی ساری ذمہ داری قدرت نے بابل سے لے کر مصر و روما کی سرزمین پر عائد کر دی تھی۔ انسانی زندگی کی تاریخ میں ہر نیا ورق پہلے یہیں اُلٹا گیا ہے، انقلاب کا ہر جھٹکا پہلے یہیں محسوس ہوا ہے۔ اور انسانی شعور نے قابیلی ذہنیت کے خلاف سب سے بڑی جد و جہد پہلے پہل یہیں کی ہے۔

اس لحاظ سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ دُنیا کے افکار و خیالات اور ہیئتِ سیاسیہ، و اجتماعیہ کے تمام دائروں میں بلادِ عرب کو استاذ الاساتذہ کی حیثیت حاصل ہے۔ سیاسی و معیشی نظام ہائے حیات میں قابیلی ظلم کے خلاف فعّال و مؤثر جد و جہد زیادہ تر یہیں سے شروع ہوئی ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ ساری دُنیا میں پھیل گئی ہے۔

ابراہیم

نوح کے بعد دنیا کا دوسرا اہم انقلاب ابراہیم کے نام سے وابستہ ہے، جو بابل کی قدیم ترین تہذیب کے زمانہ میں رونما ہوا۔ آپ کی جائے پیدائش بابل قدیم کے ایک شہر اُر (Ur) میں ہوئی اور آثارِ قدیمہ کے محققین کی رائے میں آپ کا سنہ پیدائش دو ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ قرار پاتا ہے۔ لیکن نومبر ۱۹۴۵ء میں عراق کے ماہرین آثار قدیمہ نے جو کھدائی کی ہے کہ اس کی رو سے اُن کی رائے ہے کہ اُر کی عمر آٹھ ہزار قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے[۱] اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ابراہیم کا زمانہ دو ہزار قبل مسیح سے پہلے ہونا چاہیئے، بابل کے مشہور واضع قانون خامو ربی (Khammu Rabi') نے قانون کی جو کتاب لکھی ہے اور جو آج بھی موجود ہے اور قانون کی قدیم ترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اس کا سنہ تالیف دو ہزار قبل مسیح قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں زیادہ تر زمین اور زمین کے محاصل کے آئین و ضوابط درج ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو ہزار قبل مسیح میں بابل کی تہذیب اپنے پورے شباب پر تھی۔

غرض ان تنقیحات کے لحاظ سے حضرت ابراہیم کا زمانہ دو ہزار سے تین ہزار قبل مسیح کے بیچ میں قرار پاتا ہے۔ اسلامی روایات کی رُو سے آپ کے زمانے میں بابل پر جو بادشاہ حکمران تھا اس کا نام نمرود تھا لیکن توریت میں اس کا ذکر نہیں ملتا، تاہم نمرود کا نام توریت میں ضرور مذکور ہے[۲]۔ علاوہ ازیں "برس نمرود" (Birs-i-Nimrod) کے نام سے ایک

---

[۱] اسٹیٹسمین۔ ۸۔ نومبر ۱۹۴۵ء

[۲] پیدائش باب ۱۰، فقرہ ۹ - ۱۰

مقام آج تک عراق میں موجود ہے جس کے بعد نمرود کی تاریخی شخصیت ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

حضرت ابراہیم کے زمانہ میں آئین و قانون کا تصوّر نسبتاً زیادہ صاف ہوکر سامنے آگیا تھا اور انسانی حقوق کا ایک معیار قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

ابراہیم کے وقت سے پہلے انسانی معاشرت چھوٹے چھوٹے قبائل میں بٹی ہوئی تھی۔ مگر بعد میں رفتہ رفتہ شاہی کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی۔ اور آخر نمرود کے زمانے میں اس شاہی نظام حکومت کی پہلی محسوس شکل دُنیا کو نظر آئی۔ تاہم اس وقت یہ نظریہ دُنیا کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ مختلف رنگ و نسل کے لوگ کسی ایک شخص کی اطاعت کا دم بھرنے لگیں۔ نمرود کے سامنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے دو ہی طریقے تھے۔ ایک تو یہی کہ تشدد و سخت گیری سے کام لیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ عوام میں اس نظریہ کی اشاعت کی جائے کہ بادشاہ ہی دراصل خدا ہوتا ہے۔ اس لئے جو لوگ اس کی اطاعت نہ کریں گے وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہوں گے۔ نمرود کے یہ دونوں حربے کامیاب رہے، اور خدا کے بندے خدائی کے اس نئے تصور کے آگے ماتھا ٹیک کر مطلق العناں بادشاہی کی بنیادیں مضبوط کرنے لگے۔ یہی وہ وقت تھا جب ابراہیم نے انقلاب کا جھنڈا فضا میں بلند کیا اور آگے بڑھ کر اس سارے قابلی گورکھ دھندے کو الٹ پلٹ کرکے رکھ دیا۔

بعض مؤرخوں کا خیال ہے کہ ابراہیم محض ایک تخیلی ہستی ہیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں ایسے محققوں کی تعداد زیادہ ہے جو ابراہیم کو تاریخی شخصیت مانتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اِس دورِ انقلاب کی تفصیلات آج موجود نہیں

تاہم اس میں شک نہیں کہ حضرت ابراہیم نے نمرود کے خلاف بغاوت کرکے دُنیا کی سیاسی و معیشی رفتار کا رُخ بدل دیا۔[۱]

فرعون و موسیٰ لیکن شاہی مطلق العنانی کا جو پودا انسانی سوسائٹی میں جڑ کرتا جارہا تھا، اب اس نے دوسرے طریقے سے برگ و بار لانے کوشش کی اور آخر چند سال بعد فراعنۂ مصر کے دامن میں ایک نئے رنگ و روپ کے ساتھ ظاہر ہوا، فرعون اُس وقت کی مصری زبان میں بادشاہ کو کہتے تھے اور غالباً دُنیا کی یہ پہلی کامیاب "مطلق العنان شاہی" تھی جو بہت سی چھوٹے چھوٹے قبائل کی اطاعت و وفاداری حاصل کرکے بنائی گئی تھی۔ اس شاہی میں نسلی امتیاز کو بھی بہت بڑی اہمیت حاصل تھی اور قبطی نسل کے مقابلے میں بنی اسرائیل کی نسل بہت ذلیل و حقیر سمجھی جاتی تھی۔ اس طرح نسلی بنیاد پر پست و بلند کے دو طبقے بن گئے اور پست طبقے کے افراد کا کام صرف یہ تھا کہ ان کے مرد غلامی کریں اور ان کی عورتیں لونڈیوں باندیوں کی طرح عیش و تفریح کا ساماں بنیں۔

انسانوں کو لونڈی غلام بنانے کا دستور شروع میں اس طرح پیدا ہوا کہ چھوٹی موٹی لڑائیوں میں جو لوگ مغلوب ہوکر پکڑے جاتے تھے، انھیں قتل کرنے کے بجائے فاتحوں کی خدمتگاری کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ لیکن جب چند طاقتور انسانوں کی جتھے بندی نے کمزور قبیلوں اور خاندانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا محکوم بنالیا اور شاہی کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی تو ہر کمزور جماعت کے افراد کو پکڑ کر غلام بنالینے کا رواج پڑنے لگا۔ بعد میں طاقت کے اس فلسفے نے ایک نیا قانون یہ

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور چیمبرس انسائیکلوپیڈیا سے یہ تفصیلات ماخوذ ہیں۔

بنایا کہ جو شخص کسی کا مقروض ہو اور اپنی مفلسی کی وجہ سے اس قرض کو ادا نہ کر سکے وہ قرضخواہ کا غلام سمجھا جائے، چوری کرنیوالے کی سزا بھی غلامی مقرر کی گئی۔ حد یہ ہے کہ یونان کا مشہور فلسفی ارسطو جس نے جمہوریت و مساوات کے بڑے بڑے اصول وضع کئے ہیں غلامی کے رواج کے بارے میں اس اصول کا قائل تھا کہ قدرت کی طرف سے کچھ لوگ پست بنا کر پیدا کئے جاتے ہیں اور کچھ بلند، اس لئے پست فطرت لوگوں کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ بلند فطرت انسانوں کی غلامی میں زندگی گذاریں۔ افلاطون نے بھی اسی اصول کی تائید کی ہے۔ البتہ غالباً افلاطون میں اپنے ہم وطنوں کی محبت کا جذبہ ارسطو سے زیادہ تھا۔ اس لئے یونانیوں کو غلام بنانے کا وہ مخالف تھا۔ یونان قدیم میں غلاموں کو لمبے بال رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ اور نہ وہ کھیل تماشے کی محفلوں یا آزاد لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کے قابل سمجھے جاتے تھے۔ بھاگے ہوئے غلام کو پناہ دینا جرم تھا۔ زمین کو جوتنا بونا صرف غلاموں کا کام تھا۔ بعد میں لوہاری، معماری اور نجاری کی قسم کے تمام محنت طلب کام بھی غلاموں ہی سے لئے جانے لگے لیکن اس کا معاوضہ انھیں کچھ نہ ملتا تھا۔ مؤرخوں کا بیان ہے کہ قدیم روم میں غلاموں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ایک معمولی آزاد انسان کے پاس عموماً دو، دو سو غلام ہوا کرتے تھے۔ یونان کے ایک شہر اٹیکا میں غلاموں کی تعداد چار لاکھ تھی حالانکہ "آزاد انسان" صرف ڈیڑھ لاکھ تھی۔ قدیم روم میں ایک رواج یہ بھی تھا کہ جو غلام بوڑھے یا ناکارہ ہو جاتے تھے ان کو ٹائبر نام کے ایک جزیرے میں بے آب و دانہ چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ وہ سسک سسک کر مر جائیں۔ ان حالات کے خلاف غلاموں میں جذبۂ بغاوت کا پیدا ہونا قدرتی تھا۔ چنانچہ کئی بار اس جذبے نے عملی شکل بھی اختیار کی لیکن اس حالت میں خاطر خواہ انقلاب لانے کے لئے غلاموں کو ہزاروں سال کی جدوجہد درکار ہوئی ہے۔ [لے]

لے 1. History of the Slave Trade: Clarkson;

2. The Slave in History: W. Stevens;

4, The Slave Power: Cairnes.

باب ۵

انقلاب کا پودا برگ و بار لانا شروع کرتا ہی

شہنشاہیت کا نیا بہروپ مصر کو انسانی تہذیب کے نشو ونما کا اولین گہوارہ سمجھا جاتا ہی۔ لیکن اس تہذیب کی سب سی بڑی خصوصیت یہ ہی کہ مطلق العنان شاہی کو نئے آب و رنگ میں جلوہ گر کیا گیا۔ اب تک دنیا کی ہئیت اجتماعیہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹی ہوئی تھی اور ہر ٹولی کا ایک مخصوص سردار ہوتا تھا۔ یہ سردار عموماً عمر اور تجربے کے لحاظ سے سب میں بہتر ہوتا تھا اور ایک خاندان کے بزرگ کی طرح باہمی اعتماد و رواداری سے اپنے مخصوص گروہ کا نظم وضبط قائم رکھتا تھا، اس قسم کے مختلف گروہ اور قبائل اپنے مفاد کے لحاظ سے باہم متحد بھی ہو جاتے تھے مگر اس اتحاد کی نوعیت صرف اتنی ہوتی تھی کہ کسی مشترک مفاد کی حفاظت میں سب ایک ہو جائیں یا کسی ہمہ گیر خطرے کی مدافعت پر ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اس کے علاوہ اور کوئی مشترک نظام حکومت ان کے درمیان نہ تھا۔ ہر قبیلہ صرف اپنے سردار کو مانتا تھا اور دوسرے سردار کی اطاعت سے

بے نیاز تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ زیادہ طاقتور قبیلے نے اپنے سے کمزور قبائل کو زیر کرنا شروع کیا، اور جہاں تک ممکن ہو سکا انھیں اپنے احکام کا پابند بنا لیا۔ یہ چیز رفتہ رفتہ بڑھتی رہی اور نمرود کے زمانے میں اس کے موٹے موٹے خط وخال تیار ہو گئے۔ مگر ابراہیمی انقلاب نے اس نقشے کو درہم برہم کرکے رکھ دیا، تاہم قابیلی طاقتیں مایوس نہ ہوئیں اور اب انہوں نے ایک دوسرے راستے سے مخلوقِ خدا پر چھاپہ مارنے کی کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ آخر فراعنۂ مصر کے زمانے میں ایک مکمل و مضبوط قسم کی "شاہی" معرضِ وجود میں آئی۔ فرعون کے نام سے جو شخص مصر اور مصر کے اردگرد کے قریبی علاقوں پر حاکم ہوتا تھا، وہ اس زمانے میں دُنیا کا سب سے بڑا فرمانروا تھا۔ اور اس کی فرمانروائی پر عوام کو بے چون وچرا راضی کرنے کے لئے وہی حربہ استعمال کیا گیا جو اس سے قبل نمرود کے زمانے میں استعمال ہو چکا تھا، یعنی فرعون کو خدا کا مرتبہ دے کر اس کو ہر تنقید و نکتہ چینی سے بالاتر قرار دے دیا گیا۔

لیکن نمرود کے مقابلے میں فرعون کے نظامِ شاہی کے کامیاب ہو جانے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ایک مخصوص نسل کے تمام افراد کو حکمراں نسل سمجھ لیا گیا تھا اور وہ سب مل کر باقی مخلوق کو زیر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ قرآن کی زبان میں اس دَور کا نقشہ یہ تھا۔

فرعون نے روئے زمین پر غلبہ پا لیا، اور اپنے غلبہ کو برقرار رکھنے کے لئے اُس نے انسانی آبادیوں میں پھوٹ ڈال کر انھیں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بانٹ دیا تاکہ ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے ٹکرا کر سب کو کمزور رکھا جا سکے۔ اُس نے مظلوم رعایا کے نوجوانوں کو قتل کرنے اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ کر غلام بنانے کی پالیسی اختیار کی، غرض اس نے ہر طرف فساد ہی فساد

پھیلا دیا۔ لیکن جب حالات حد سے تجاوز کر گئے تو قدرت نے کمزوروں کی مدد کی اور انھیں حکومت و سرداری کی مسند پر بٹھا دیا۔[۱]

فرعونی نظامِ حکومت کے ان مظالم کے خلاف نفرت و انتقام کی جو چنگاریاں عوام کے دل میں اندر ہی اندر سُلگ رہی تھیں، رفتہ رفتہ وہ شعلہ بننے لگیں اور آخر آخری فرعونِ مصر کے عہد حکومت میں دنیائے مظلوم کے ایک فرزندِ جلیل موسیٰ کلیم اللہ کی ہدایت و رہبری میں فرعونی ہئیت اجتماعیہ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا پوری قوت کے ساتھ بلند کر دیا گیا۔

انقلابِ موسوی کے نتائج

دنیا کا یہ انقلاب اپنے نتائجِ مابعد کے لحاظ سے بیحد اہمیت رکھتا ہے۔ اس انقلاب کے بعد دنیا کی پوری ہئیت اجتماعی نے ایک نیا قالب اختیار کیا اور قانون و آئین کے نام سے وہ چیز دنیا کے سامنے آئی، جس کا کوئی واضح تصوّر اس سے پہلے تک نہ تھا، اسی بناء پر حضرت موسیٰ کو دنیا کا پہلا واضعِ قانون کہا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ "احکام عشرہ" کے نام سے آپ نے قانون و اخلاق کے جو دس اصول اُس وقت کی دُنیا کو بتائے تھے، بعد میں معاشرت و سیاست کے سارے قوانین کی بنیاد انہی پر رکھی گئی۔ اِن احکام میں چوری زنا، قتل وغیرہ افعال کو پہلی بار اخلاقی، انسانی، روحانی اور معاشرتی ہر لحاظ سے جرائم قرار دیا گیا اور ان پر کڑی سزائیں رکھی گئیں۔[۲]

بادشاہت کے تصوّر کو خدا سے ملا دینے کی جو کوشش شاہی نظام کو مضبوط

---

[۱] القصص۔ رکوع ۴

[۲] توریت۔ اخراج۔ باب ۱۶ تا ۲۲

بنانے کے لئے کی جارہی تھی، اس داعی انقلاب نے اس کی شدید مخالفت کی اور پکار پکار کر یہ اعلان کیا کہ اس قسم کے تمام بتوں کو توڑ ڈالو اور کسی انسان کو خدا سمجھ کر نہ پوجو۔ اور خدائے مطلق کے سوا کسی اور کے آگے گردن نہ جھکاؤ[1]۔

عہدِ موسوی کا یہ انقلاب، دُنیا کا کامیاب ترین انقلاب تھا لیکن قابیلی طاقتیں اب بھی اپنے کام میں مصروف تھیں۔ بادشاہ کو خدا سمجھنے کا تصور، حضرت موسیٰ نے مٹا دیا تھا۔ اس لئے اب یہ کوشش کی گئی کہ خُدا کے بعد سب سے بڑی طاقت بادشاہ کو قرار دیا جائے۔ در اصل موسوی انقلاب نے شاہی نظام کی اصلاح کرنی چاہی تھی، اس نظام کو درہم برہم کرکے اس کی جگہ کوئی دوسرا نظام نافذ کرنے کی سعی نہیں کی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ کے بعد بادشاہ کو خدا تو نہیں، البتہ ماورائے انسانیت (Superman) قسم کی ہستی سمجھا جانے لگا اور بادشاہت کا معیار حضرتِ سلیمان جیسی شخصیت کو قرار دیا گیا جو ــــــ سب سے زیادہ عقلمند تھے، درختوں، مچھلیوں، پرندوں اور چرندوں سے باتیں کرسکتے تھے تین ہزار اقوالِ حکمت اپنے حافظے میں محفوظ رکھتے تھے، ساری دنیا میں ان کی عقل و فراست کی دھوم تھی اور موسوی احکام و قوانین کی پیروی کرتے تھے[2]۔

ان صفات کے بعد دنیوی عیش و عشرت کے تمام ساز و سامان سے

---

[1] توریت۔ اخراج۔ باب ۱۶ تا ۲۲

[2] توریت۔ بادشاہ۔ باب ۴ فقرات ۳۰ تا ۳۴

بادشاہ پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ چنانچہ توریت کی روایت کے مطابق شان وشوکت اور راحت و آسائش کی بے شمار چیزوں کے علاوہ حضرت سلیمان کی نو سو بیویاں تھیں اور تین سو لونڈیاں۔ (بادشاہ۔ باب دوم ۔فقرہ ۳)

مزید برآں پست و بلند کا امتیاز بھی ایک حد تک باقی رکھا گیا حتیٰ کہ کہ توریت میں واضح طور پر مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے نوکر کو جان سے مار ڈالے تو اس کے بدلے میں آقا کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ غلام اس کا مال ہے۔[۵۱] علیٰ ہذا القیاس اگر کوئی آقا اپنے نوکر کو اتنا مارے کہ اُس کا دانت ٹوٹ جائے یا آنکھ جاتی رہے، تو اس کی سزا آقا کو صرف یہ دی جائے گی کہ وہ نوکر کو آزاد کردے۔[۵۲]

غرض موسوی انقلاب نے انسانی مساوات کو صرف ایک حد تک تو تسلیم کیا؛ پوری طرح تسلیم نہیں کیا۔ شاہی نسل کی بے روک مطلق العنانی پر بند ضرور باندھا گیا اور اسے عدل و انصاف کا پابند کیا گیا، لیکن اس کے باوجود شاہی خاندان کی عظمت و تقدیس کو عام انسانوں سے بلند سمجھا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ

> "عدل و مساوات کے نام سے شہزادوں کی بے حرمتی کرنا ٹھیک نہیں ہے۔" (امثال۔ باب ۱۷۔ فقرہ ۲۶)

قابلیت پھر لوٹتی ہے

اس انقلاب کے بعد ایک بہت مہلک قسم کی غلط فہمی یہ پیدا ہوگئی کہ بنی اسرائیل کی نسل

---

۵۱ توریت ۔ اخراج ۔ باب ۲۱ ۔ فقرہ ۲۱

۵۲ " " " ۲۷

حضرت موسیٰ کو صرف اپنا نسلی ہیرو سمجھنے لگی اور موسیٰ نے قبطی نسل کی حاکمیت کے خلاف جو آواز بلند کی تھی، اس نے رفتہ رفتہ بنی اسرائیلی حاکمیت کی شکل اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موسوی دعوتِ انقلاب میں غلط عناصر نے جگہ پیدا کرنی شروع کر دی۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ کو پوری دُنیا کا ہادی سمجھنے کے بجائے صرف اپنا قومی ہادی قرار دے لیا اور اُن کا نعرہ یہ ہو گیا

"یُہودا اسرائیل کا خدا ہے، اور اسرائیل یہودا کی قوم ہے"[۵]

اس طرح گویا بنی اسرائیل کی اس نسل نے خود کو دُنیا کی ایسی برگزیدہ ترین نسل قرار دے لیا، جس پر خدا کافی طور سے مہربان ہے۔

لیکن حضرت موسیٰ کی مشعلِ انقلاب نے روشنی کی جو کرنیں دُنیا میں پھیلا دی تھیں، وہ اپنا اثر دکھا رہی تھیں اور یونان و روما میں کچھ حقیقت شناس افراد ایسے پیدا ہو رہے تھے جو اگرچہ مذہباً موسیٰ کو ماننے والوں میں شامل نہ تھے لیکن موسیٰ کی دعوتِ انقلاب نے غور و فکر کی ایک نئی راہ ان کے سامنے کھول دی تھی۔ مگر یونان کے افلاطون و ارسطو کے نظامِ زندگی کا عملی نمونہ تو صرف یونان ہی تک محدود رہا، البتہ رومتہ الکبریٰ کی سلطنت نے اپنے پاؤں دُور دُور تک پھیلا دیئے۔ روما کی سلطنت فرعون کی شاہیت سے بہت بہتر تھی اور اس میں بالائی طبقے کے مخصوص افراد کی رائے کو حکومت میں بھی کافی دخل حاصل تھا۔ اس چیز نے نسلی اور وطنی امتیاز کے علاوہ، پست و بلند کا امتیاز بھی پوری شدت سے پیدا کر دیا تھا۔

۵؎ چیمبرس انسائیکلوپیڈیا۔

——دوسری طرف موسیٰ کو ماننے والے یہودیوں نے بھی نسلی برتری کا ایک نیا طوفان کھڑا کر رکھا تھا اور خدا کا نام لے کر چند افراد کے عیش و راحت پر کمزور عوام کی زندگیاں قربانیاں کی جارہی تھیں، موسیٰ کی دعوتِ انقلاب محدود ہوکر رہ گئی تھی اور ان کے جانشینوں نے قابلی طاقتوروں سے ایک قسم کا سمجھوتہ سا کرنا شروع کر دیا تھا، مگر موسیٰ کی قوم کی اِن خود غرضیوں کے باوجود موسیٰ کا پیام دنیا کے عوام میں ہر جگہ ایک نئی حرارت اور ایک نیا جوش پیدا کر رہا تھا۔ چنانچہ ایران میں زرتشت، ہندوستان میں مہاتما بدھ، اور مہابیر جین، چین میں ڈیوک آف چاؤ اور کنفیوشس اور یونان و روما میں افلاطون و ارسطو نے جن مختلف نظامہائے حیات کی داغ بیل ڈالی، اُسے موسوی انقلاب سے بے تعلق نہیں کہا جا سکتا، آب و ہوا، حالات و ماحول، تاریخ و روایات اور مواقع و مشکلات کی نوعیت کے لحاظ سے ہر داعی انقلاب کے پیام کی نوعیت بھی ہر جگہ مختلف رہی، لیکن موسیٰ نے طور کی پہاڑی پر چڑھ کر جو چراغ جلایا تھا، دوسرے تمام چراغ مختلف ہونے کے باوجود اِسی کی لو سے جلائے گئے ہیں۔

زرتشت انقلاب آفرینی کے لحاظ سے ایران کے زرتشت اور ہندوستان کے مہاتما بدھ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ زرتشت کے زمانے کا صحیح تعیّن محققین نہیں کرسکے ہیں، اس لئے کہ ۳۳۳ ق م میں سکندر نے ایران پر جو خوفناک حملہ کیا تھا اُس میں بہت سا ایسا علمی ذخیرہ ضائع ہوگیا، جس سے ایران کی تاریخ قدیم پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ تاہم مختلف روایتوں کی چھان بین کرنے کے بعد پانچویں یا چھٹی صدی قبل مسیح کو زرتشت کا عہد قرار دیا جاتا ہے۔[۱]

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ اور تاریخ ادبیات ایران از براؤن جلد اول صفحہ ۲۶

ژند اور اوستا کے نام سے دو مقدس کتابیں زرتشت کی طرف منسوب ہیں۔
لیکن ان کے سالم اور مکمل نسخے آج موجود نہیں ہیں اور غالباً چوتھی صدی قبل
مسیح میں سکندر اعظم کی تاخت و تاراج کی نذر ہو گئے۔ کہا جاتا ہے یہ بہت ضخیم کتابیں
تھیں اور ان میں دینی و دنیوی تمام معاملات پر بہت تفصیلی ہدایات درج تھیں
تاہم ان کے جو متفرق و نامکمل ابواب اس وقت موجود ہیں، وہ بھی ایک مؤرخ
کے لئے بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کو دیکھنے سے زرتشت سیاسی، فوجی اور مذہبی
تینوں قسم کی ملی جلی تحریک کے ایک بہت عظیم الشان و فعال لیڈر کی حیثیت میں
نظر آتا ہے جو ایک مقدس " زرعی ریاست " کی بنیادیں استوار کرنے کی جد وجہد
میں مصروف ہے۔ زرتشت کا زمانہ ایران کی سیاست میں فرعون کے زمانے سے
کم نہ تھا شہنشاہ جمشید اگرچہ مر چکا تھا، لیکن اس کو خدا سمجھ کر پوجنے والے موجود
تھے۔ جمشید نے بھی اپنے اقتدار شاہی کا سکہ عوام کے دلوں پر جمانے کے لئے وہی
حربہ اختیار کیا تھا جو بابل میں نمرود اور مصر میں فرعون کر چکے تھے۔ اس لئے یہاں
بھی اسی قسم کے حالات رونما ہو رہے تھے، جو انقلاب کے محرک ہوتے ہیں۔ ایران
کی سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ خانہ بدوش قبائل ہر طرف لوٹ مار مچاتے
پھرتے تھے اور امن و امان مفقود تھا۔ کھیتی باڑی کر کے روزی پیدا کرنے اور
زمین کو بونے جوتنے کا پیشہ اختیار کرنے کو حقیر سمجھا جاتا تھا اور اس کے بجائے
خونریزی، ڈاکہ زنی کو بہادری و جوانمردی کا کام شمار کیا جاتا تھا۔ زرتشت نے
ایک طرف تو عوام کی اس ذہنیت میں انقلاب پیا کیا اور دوسری طرف خدا کو
واحد مطلق قرار دے کر بادشاہ کی ذات کو خدا سمجھنے کے تمام تصورات ختم کئے۔

زرتشت کی یہ آواز شروع میں عوام اور خواص سب کے کانوں
کو بہت ناگوار گزری۔ لیکن ایک سچے پیغامبر انقلاب کی طرح وہ مشکلات کے

گرداب سے مرعوب ہونے کے بجائے جرأت وہمّت کے ساتھ اُس کا مقابلہ کرنے میں لگا رہا۔ آخر عوام و خواص دونوں اس کے آگے مغلوب ہوگئے اور کیانی خاندان کے مشہور تاجدار گشتاسپ نے زرتشت کو اپنا ہادی و پیشوا مان کر اس کی تمام ہدایات کو نافذ کرنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ سارا ایران اِس دعوتِ انقلاب کے زیر اثر آگیا اور سیاسی و اخلاقی حالات کی کایا پلٹ ہوگئی۔[۱]

گوتم بُدھ

ٹھیک اُسی زمانے میں جب خیالات و افکار کا یہ انقلاب ایران میں زرتشت کے نام پر پھیل رہا تھا، ہندوستان میں گوتم بدھ بھی اسی قسم کی تحریکیں چلا رہے تھے۔ لیکن اس داعِیِ انقلاب کی زمین بہت سنگلاخ تھی۔ ایران کے باشندے بھی اگرچہ نسلاً ہندوستانی آریوں کے بھائی ہی تھے۔ لیکن ذات پات کی عجیب و غریب آہنی حد بندیوں سے ہندوستان کی معاشرت میں جو جمود و ابتری پیدا ہو گئی تھی، ایران اس سے محفوظ تھا۔ اِس لئے زرتشت کے مقابلے میں گوتم بدھ کو بہت زیادہ مشکلات و موانع کا مقابلہ کرنا پڑا۔

تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح میں جب آریائی نسل نے وسطی ایشیا سے ہندوستان میں داخل ہونا شروع کیا تو اُن کی عام حالت یہاں کے مقامی باشندوں سے نسبتاً بلند تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی اس برتری سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ہندوستان کے تمام پرانے باشندوں کو اپنا محکوم بنا لیا اور سارے ملک میں ایک زبردست آریائی اقتدار کی بنیاد رکھ دی۔ اس اقتدار کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے سب سے زیادہ فائدہ تناسخ یا آواگون کے فلسفے سے اُٹھایا

---

[۱] تاریخ پارسیاں از کارکا جلد دوم و زرتشت پیغمبرِ ایران از جیکسن۔

گیا اور یہ اصول طے کیا گیا کہ ہندوستان کی تمام غیر آریائی نسلیں (جنھیں شودر کا نام دیا گیا تھا) پہلے جنم میں گناہوں کی مرتکب رہی ہیں۔ اس لئے انھیں ذلیل ہی رہنا چاہیئے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق سیاست و معاشرت کا جو نظام تیار کیا گیا، اس کی تفصیل ہندوؤں کی مشہور کتاب "منوسمرتی" کے الفاظ میں یہ ہے۔

ہندو نظامِ حیات دنیا کا کاروبار چلانے کے واسطے برہمن، کھشتری، ویش اور شودر چار ذاتیں خالق نے بنائی ہیں۔ ان میں سے برہمن کو خالق نے اپنے مُنہ سے پیدا کیا، کھشتری کو بازو سے ویش کو ران سے اور شودر کو پاؤں سے۔ پھر ان چاروں ذاتوں کے الگ الگ فرائض مقرر کر دیئے۔ پڑھنا پڑھانا اور مذہبی رسوم کی حفاظت کرنا برہمنوں کا کام ہے۔ حکومت کرنا، دُنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا اور برہمنوں سے وید وغیرہ پڑھنا کھشتری کا کام ہے، تجارت و زراعت کرنا اور وید پڑھنا ویش کا کام ہے۔ لیکن شودر کے لئے ایک ہی کام خالق نے ٹھہرایا اور وہ یہ کہ تن مَن دھن سے ان تینوں ذاتوں کی خدمت کریں۔

(پہلا ادھیائے۔ اشلوک ۸۷، تا ۹۱)

مشرقی سمندر سے لے کر مغربی سمندر تک اور ہمالہ سے لے کر بندھیاچل تک کا علاقہ آریہ ورت کہلاتا ہے۔ برہمن کھشتری اور ویش اس علاقے میں حاکم بن کر رہیں اور شودر اگر معاش کی تنگی سے مجبور ہوں تو جہاں چاہیں چلے جائیں شودر کو ہمیشہ حقیر سمجھنا چاہیئے اور اس کے نام میں حقارت کو ظاہر کرنے والا کوئی لفظ شامل کر دینا چاہیئے، اس کے برعکس برہمن کے نام میں خوشی کو ظاہر کرنے والا، کھشتری کے نام میں طاقت کو ظاہر کرنے والا اور ویش کے نام میں

مال و دولت کو ظاہر کرنے والا کوئی لفظ شامل کرنا چاہیئے۔

(دوسرا ادھیائے اشلوک ۲۲، ۲۴، ۳۱)

شودر لوگ سور اور کتے کی طرح ہیں اس لئے جب برہمن کھانا کھائے تو ایسی جگہ بیٹھے جہاں ان کی نظر نہ پڑے۔

(تیسرا ادھیائے۔ اشلوک ۲۳۹)

جو شخص شودر کو مذہب اور عبادت کا درس دیتا ہے وہ شودر سمیت دوزخ کا ایندھن بنتا ہے۔ کسی شودر کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ پڑھنے لکھنے کا خیال بھی دل میں لائے۔ اگر کوئی شودر چھپ چھپا کر کہیں وید کو سن لے تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دو۔

(چوتھا ادھیائے)

شودر کو مہینے میں صرف ایک بار حجامت کرانی چاہیئے اور برہمن کا کھایا ہوا جھوٹا کھانا اس کی غذا ہے

(ادھیائے ۵۔ اشلوک ۱۴۰)

اگر نیچ ذات کا کوئی آدمی اونچی ذات کے برابر بیٹھ جائے تو اس کی کمر کو آگ سے داغ دو یا اس کے چوتڑ اس طرح کاٹ دو کہ مرنے نہ پائے۔ خالق نے شودر کو برہمن کی خاطر بنایا ہے، اس لئے شودر خواہ برہمن کا زرخرید ہو یا نہ ہو، اُس سے برابر کام لینا چاہیئے

(نواں ادھیائے۔ اشلوک ۲۸۱ و ۴۱۳)

برہمن، کھشتری اور ویش دو جنمے ہیں یعنی ان کی روح ترقی کی دو منزلوں سے گذر چکی ہے لیکن شودر ایک جنما ہے اور ابھی انسانیت کی پہلی منزل ہی میں پڑا ہوا ہے، اس لئے شودر کو ذلیل رہنا چاہیئے۔ وہ طاقت رکھنے پر

بھی دولت جمع نہیں کر سکتا کیونکہ اگر شودر کے پاس دولت ہو جائے تو وہ برہمنوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

(دسواں ادھیائے۔ اشلوک ۴ و ۱۲۹)

برہمن اگر شودر کو قتل کر دے تو صرف کفارہ ادا کرے اور کچھ جرمانہ دے دے، بس اتنا کافی ہے

(گیارھواں ادھیائے۔ اشلوک ۱۳۰)

یہ تو عام معاشرت کی حالت ہوئی جس میں شودر کے نام سے عوام کی حالت عہد فرعونی کے بنی اسرائیل سے بدرجہا ذلیل بنا دی گئی تھی۔ ایسی صورت میں بادشاہ کو خدا ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی، تاہم شاہی نظام کو مضبوط بنانے کے لئے راجہ کے بارے میں ہندوؤں کے جو عقائد تھے وہ منوسمرتی کی زبان میں یہ ہیں:۔

"راجہ ایک دیوتا ہے جو انسانوں کے لئے ہر کام اپنی طاقت کے مطابق کرتا ہے۔ اس لئے راجہ اگر نابالغ بچہ ہو، تب بھی اس کی بے عزتی نہ کرنی چاہیئے، کیونکہ ہر راجہ انسان کی صورت میں روئے زمین کا سب سے بڑا دیوتا ہے۔"

(ساتواں ادھیائے۔ اشلوک ۸۔ ۹)

یہ تو راجہ کی ذاتی عظمت کا حال ہوا۔ اب اس کے فرائض کو دیکھئے۔ ان میں وید پڑھنے والوں کی حفاظت کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں شودر کے لئے راجہ پر کوئی خاص فرض نہیں، ہاں اگر کسی راجہ کے راج میں وید پڑھنے والا بھوکا مرے تو اس کا راج جلد مٹ جانا چاہیئے۔

(ادھیائے ۷۔ اشلوک ۱۳۵)

راجہ کو چاہیئے کہ شودر سے کسی قسم کا کوئی واسطہ نہ رکھے جس راجہ کے کاروبار میں کوئی شودر شامل ہوگا، اس راجہ کا راج اس طرح مٹ جائے گا جیسے دلدل میں گائے پھنس کر مر جاتی ہے

(ادھیائے ۸۔ اشلوک ۲۱)

یہ تھا ہندوستان کی ہیئت اجتماعیہ کا نقشہ جب گوتم بدھ نے اس کے خلاف صدائے انقلاب بلند کی۔

طبقاتی تقسیم کے خلاف پہلا انقلاب

زرتشت وغیرہ کی طرح گوتم بدھ کا صحیح زمانۂ حیات بھی یقین کے ساتھ کسی کو معلوم نہیں تاہم اہل تحقیق کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ مسیح سے پانچسو سال پہلے ہوا ہے۔

گوتم کی تحریکِ انقلاب کا پہلا اور بلا واسطہ حملہ اس برہمنی راج کیخلاف تھا جس نے انسانوں کو چار طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا۔ بدھ نے سب سے پہلے یہ آواز بلند کی کہ مذہبی رسوم کو ادا کرنے کے لئے کسی پنڈت یا برہمن کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص اپنا پنڈت آپ ہے۔ ذات پات کے خلاف اُس نے صاف طور سے کچھ نہیں کہا، لیکن اُس نے اپنی تعلیمات میں شودروں کو شامل کرکے عملاً ان امتیازات کو مٹا دیا۔ گوتم بدھ کی اس آواز کا اثر یہ ہوا کہ تمام پست و زبوں حال طبقے اس کے گرد جمع ہونے لگے اور آخر ایک وقت وہ آیا کہ چندر گپت نامی ایک شودر کے سر پر ہندوستان کی شہنشاہیت و فرمانروائی کا تاج رکھا گیا۔

بدھ نے تبلیغ و تعلیم کو عام کر دیا اور کسی شودر کے لئے یہ قدغن نہ رہا کہ اگر وہ وید کے اشلوک سُن لے تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال

دو اُس کے وعظ و تبلیغ کی محفلوں میں ہر شخص کو شریک ہونے کی عام اجازت تھی۔ وہ سب انسانوں کو یکساں طور سے مخاطب کرتا تھا اور سب کو بھائی بھائی کے ایک ہی رشتے میں پرو دینا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک انسانی نجات کا دارومدار برہمنی اصول کے مطابق نسل و نسب پر نہ تھا بلکہ عمل پر تھا۔ بدھ مذہب کی اس دعوتِ انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں تعلیم عام ہونے لگی، شودر اور غیر شودر کے امتیازات ٹٹنے لگے، نسل و نسب کے بجائے کردار و عمل کو معیارِ شرافت سمجھا جانے لگا، اور انسانی مساوات و برادری کا تصور پہلی بار ہندوستان میں عام ہوا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بدھ نے سب سے پہلی ضرب ویدوں پر لگائی اور ان کو الہامی ماننے سے انکار کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے بُت پرستی کا خاتمہ کرکے راجہ اور برہمن دونوں کے دیوتا ہونے کا تصور یک قلم مٹا دیا۔ اب راجہ بھی ایک عام انسان تھا اور برہمن بھی ——— جنھیں صرف عمل کے معیار سے پرکھا جانے لگا۔

گوتم بدھ کی ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ برہمنوں کا بنایا ہوا نظامِ زندگی تیزی سے ٹٹنے لگا اور آخر چندر گپت اور اشوک نے مسیح کی ولادت سے کوئی دو تین سو سال قبل بدھ کے لائے ہوئے انقلابِ حیات کو تقریباً سارے ہندوستان میں عام کر دیا۔

گوتم بدھ کی کمزوری

بُدھ نے اپنی تعلیمات میں رہبانیت و ترکِ دُنیا کو زندگی کا سب سے بلند معیار قرار دیا ہے۔ چنانچہ بہترین انسان کی کسوٹی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ پھٹے ہوئے چیتھڑے پہنے، اِن میں پیوند اپنے ہاتھ سے لگائے، جنگلوں میں رہے اور

دہاں بھی کوئی جھونپڑی نہ بنائے بلکہ صرف درختوں کے سائے ہی پر گزارہ کرے لیٹ کر سونے کی کوشش کبھی نہ کرے۔ اگر نیند بہت زیادہ ستائے تو کسی درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر پلک جھپکالے۔ کھانا دن رات میں صرف ایک وقت کھائے اور وہ بھی سورج ڈھلنے سے پہلے پہلے، مگر کھانے کے حصول کے لئے کوئی محنت مشقت بالکل نہ کرے، صرف بھیک مانگ کر کام چلائے۔ شادی کا تصوّر بھی دل میں نہ لائے بلکہ عورت کی صورت بھی کبھی نہ دیکھے، حد یہ ہے کہ اگر اس کی ماں پانی میں ڈوب رہی ہو اور اس کے چیخنے چلانے کی آواز اُس کے کان میں پڑ جائے، تب بھی بچانے کے لئے نہ دوڑے۔ ہاں اگر کوئی لمبا سا بانس ہو تو اس کے سہارے سے اُسے بچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ لیکن اگر ایسا کوئی بانس موجود نہ ہو تو پھر ماں کا ڈوب جانا گوارا کرے مگر اُسے ہاتھ سے پکڑ کر چھونا ہرگز گوارا نہ کرے اس لئے کہ آخر وہ بھی تو عورت ہی ہے۔

غرض بدھ نے زندگی کو عذاب قرار دیا اور ایک انسان کی بہترین قابلیت یہ ٹھہرائی کہ وہ جلد سے جلد اس پاپ سے چھٹکارا حاصل کر کے "نجاتِ ابدی، (نروان) تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

بدھ کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اچھے پیروؤں کی توجہ زندگی کے کاروبار سے ہٹنی شروع ہو گئی، دراصل اس کی تعلیمات کا یہی وہ رخنہ تھا جس نے قابلی طاقتوں کو پھر اپنا عمل دخل جمانے کا موقعہ دے دیا اور رفتہ رفتہ انہوں نے عملی دُنیا میں بدھ کی آواز کو بے اثر بنانا شروع کر دیا آخر چھٹی صدی میں راجہ بکرماجیت کے زمانے میں برہمنی تصورات پھر فاتح و منصور بن کر عود کر آئے اور غریب عوام پھر شودر کے شودر ہو کر رہ گئے[1]۔

---

[1] گوتم بدھ کے متعلق یہ تفصیلات ذیل کی کتابوں سے ماخوذ ہیں (بقیہ دیکھئے صفحہ ۹۰ پر)

مہابیرجین گوتم بدھ کے زمانے کے لگ بھگ ہی مہابیر جین نے بھی برہمنی تصورِ حیات کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اس نے بھی ویدوں کو الہامی ماننے سے انکار کیا۔ البتہ ذات پات کی قیود کو قائم رکھا۔ بُت پرستی کے خلاف بھی جو آواز اٹھائی اس میں بھی ہر قسم کے بتوں کو شامل نہ کیا اور بہت سے ہندو بتوں کو باقی رکھا۔ لیکن ریاضت و ترکِ دُنیا کے معاملے میں گوتم بدھ کی پوری ہمنوائی کی، حد یہ ہے کہ کپڑے پہننے تک کو دُنیا طلبی سمجھا گیا اور بہترین انسان کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ ننگا رہے۔ یا اگر پہنے تو صرف سفید کپڑے پہنے۔

مہابیر جین کی تعلیمات چونکہ ذات پات اور مورتی پوجا کو باقی رکھتی تھیں، اس لئے برہمنی نظامِ زندگی نے ان کو مٹانے پر زیادہ زور صرف نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں بدھ کے ماننے والے تو بالکل نیست و نابود ہو گئے لیکن جین کے پرستار ابھی تک کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔[۵]

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۸۹)

[۴] گوتم بدھ کے متعلق یہ تفصیلات ذیل کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

(۱) بدھسٹ نالزم از میکس ملر

(۲) للیتا وستارا (ترجمہ انگریزی) از راج مترا

(۳) سلسلہ مقدس کتب مشرق (انگریزی)

(۴) چیمبرس انسائیکلوپیڈیا۔

[۵] جینی تصورِ حیات کے بارے میں یہ تمام باتیں مندرجہ ذیل دو کتابوں سے ماخوذ ہیں:۔
آؤٹ لائن آف جینزم از جگمندر لال جینی اور چیمبرس انسائیکلوپیڈیا مطبوعہ کلکتہ۔

کیفیوشش اور خاقان چین

تاریخ انسانی کے جس دور کا ذکر اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس میں انسانیت کی معاشرتی زندگی صرف روما سے لے چین کے ساحل تک محدود تھی اس کے علاوہ باقی ساری دُنیا وحشت و جاہلیت کی زندگی گذار رہی تھی، اس لئے موسیٰ، زرتشت گوتم بدھ اور مہابیر جین کی سرزمینوں کا ذکر کر دینے کے بعد صرف چین کا ذکر کر دینا باقی رہ جاتا ہے لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ چین اور ہندوستان میں انسانی زندگی کا دھارا بہت کم تبدیلیوں سے دوچار ہوا ہے۔ یہاں زندگی کا دریا بہت آہستہ آہستہ بہا ہے اور بلادِ عرب جیسے انقلابی طوفان یہاں بہت ہی کم آئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر بلادِ عرب کے داعیانِ انقلاب کی مساعی شاملِ حال نہ ہوتیں تو شاید آج دُنیا ویسی بھی نظر نہ آتی جیسی آج نظر آ رہی ہے۔

تہذیب اور شہنشاہیت

چین میں انسانی دماغ کی صنعت گری نے بہت سے کمالات دکھائے، فن تعمیر اور نقاشی میں نئی نئی گل کاریاں کیں، علم و ادب میں ترقی کی اور فطرت کے بہت سے اسرار بے نقاب کئے، لیکن بابل، نینوا اور مصر کی قدیم تہذیبوں کی طرح ایجاد و اختراع کے ان نتائج سے فائدہ صرف اُس مخصوص و محدود طبقے ہی نے اُٹھایا جو اقتدار و اختیار کا مالک تھا۔ اس کے علاوہ خدا کی باقی تمام مخلوق بدستور پستی و زبوں حالی میں پڑی رہی۔ چین میں بادشاہ کو خدا کی نسل سے سمجھا جاتا تھا اور حکومت کرنا اُس کا قدرتی حق ٹھہرا دیا گیا تھا، وہ جو چاہے کرے۔ اس پر گرفت کرنے کا کوئی اختیار عوام کو نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسری صدی قبل مسیح کے اوائل میں جس خاندان کو

شہنشاہی کی طاقتیں سپرد کی گئی تھیں، وہ تقریباً ڈھائی ہزار سال تک مسلسل حکومت کرتا رہا اور بمشکل تمام ۱۹۱۱ء میں جاکر اس کا خاتمہ ہوا۔

چین کا پہلا واضع قانون ڈیوک آف چاؤ (Duke of Chau) کو قرار دیا جاتا ہے، جس کا سنہ وفات ۱۱۰۵ ق م ہے۔ لیکن اخلاقی معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے کنفیوشش کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ ۴۷۹ ق م میں فوت ہوا ہے۔ اس لئے اس کا اور گوتم بدھ کا زمانہ قریب قریب ہی تھا۔ لیکن کنفیوشس کی تعلیمات کو موسیٰ اور زرتشت جیسے داعیانِ انقلاب سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ وہ کسی منظم تحریک کا بانی نہ تھا، صرف ایک معلم اخلاق تھا۔ اور سیاست و معیشت کے آئین و ضوابط میں ڈیوک آف چاؤ ہی کا دم بھرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چین کے باشندوں پر کنفیوشس کے مقابلے میں گوتم بدھ کی تعلیمات کا زیادہ اثر ہوا اور وہاں بدھ کو ماننے والے لوگوں کی اکثریت ہو گئی۔ پھر چونکہ ذات پات کی برہمنی قیود سے چین پاک تھا اور شہنشاہیت کے سنگھاسن پر بدھ مت حملہ کرنا نہ چاہتا تھا، اس لئے چین میں بدھ کے خیالات پر کوئی روک ٹوک عائد نہ کی گئی اور وہ آج بھی وہاں زندہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ صرف وہیں زندہ ہے۔

باب ۶

عوامی جدوجہد کا نیا میدان

طوفان کے آثار ظلم و تشدد کی دراز دستیاں اپنے شباب پر پہنچ چکی تھیں، غلامی کا رواج پورے زوروں پر تھا جس نے یہ حالت کر دی تھی کہ ابھی ابھی ایک آدمی آزاد ہے اور ابھی کسی قزاق کے چنگل میں پھنس کر غلاموں کی طرح بیچ ڈالا گیا ہے۔ چنانچہ دیو جانس کلبی جیسا شخص بھی محض اس چکر میں آکر عرصے تک غلاموں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور[1] رہا۔ اس کے علاوہ بادشاہوں اور رئیسوں کے درباروں میں خود مختاری و مطلق العنانی کا وہ طوطی بولتا تھا کہ بات بات پر زبانیں کٹتی تھیں اور ذرا ذرا سی لغزش پر گردنیں اُڑائی جاتی تھیں۔ ہر طاقتور اپنے سے کمزور کو دبا رہا تھا اور ہر بڑی مچھلی، چھوٹی کو نگلے جا رہی تھی۔ بدھ، جین اور

---

[1] دیکھو:- Hermann's Diogenese

کنفیوشس نے زخمی انسانیت کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، مگر ان کے پیام میں مصائب کا مقابلہ کرنے کے بجائے مصائب سے الگ ہٹ کر جنگلوں اور بیابانوں میں پناہ ڈھونڈھنے کا درس دیا گیا، اسی طرح یونان و روما میں زینو، دیو جانس کلبی اور ایپی کورس پیدا ہوئے اور انہوں نے بھی کچھ خشک منطقی تاویلیں اور فلسفیانہ بحثیں کر کر کے مصیبت زدہ انسانیت کو مطمئن کرنے کی سعی ناکام کی لیکن ان تمام تحریکوں میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ مظلوم انسانیت کو اپنا کوئی مستقبل نظر نہ آتا تھا، گوتم بدھ کی نجات ابدی (نروان) ایک منفی سی چیز تھی جس کا کوئی مثبت پہلو نہ تھا، اس کے نزدیک انسان کی آخری معراج یہ تھی کہ "نروان" کے نام پر "کچھ نہیں" ہو کر رہ جائے یہی حال زینو کے فلسفۂ اسٹوئس اِزم، دیو جانس کلبی کے فلسفۂ کلبیت (سینی سِزم) اور ایپی کورس کے فلسفۂ مسرت کا تھا۔ یہ سب لوگ اجتماعی زندگی میں انسان کی کوئی مدد نہیں کرتے تھے بلکہ جو اندھیر نگری مچی ہوئی تھی، اس سے دامن بچا کر گزر جانا سکھاتے تھے۔ لیکن انسانیت کی روح ان حالات کے خلاف سراپا پھوڑا بنتی جا رہی تھی اور رفتہ رفتہ یہ پھوڑا اتنا پک چکا تھا کہ بس کسی مرد کامل کے ذرا سے چھیڑ دینے کی دیر تھی۔

اک ذرا چھیڑیئے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے!

عیسیٰ روح اللہ

آخر انسانیت کی پکار رنگ لائی اور عیسیٰ روح اللہ کی شکل میں ایک کامل شخصیت اس رِستے ہوئے پھوڑے پر نشتر لگانے کے لئے پیدا ہو گئی۔

جب عیسیٰ نے اس انقلاب کی آواز بلند کی، تو ساری پست و زبوں مخلوق اُن کے گرد جمع ہونے لگی۔ اس داعیِ انقلاب کی آواز پوری انسانیت

کے مصائب پر حاوی تھی۔ لیکن چونکہ آپ کا مستقر فلسطین تھا۔ اس لئے آپ کو سب سے پہلا اور براہِ راست واسطہ تو یہودیت سے تھا اور اس کے بعد روما کے جابرانہ اقتدار سے، روما کا یہ اقتدار (یہودیوں سے بیزار تھا اور یہودی اس سے بیزار تھے۔ لیکن جب مسیح کی دعوت انقلاب کی آواز بلند ہوئی تو دونوں کو اپنی ہستی خطرے میں نظر آنے لگی۔ اس لئے اس مشترک خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے روما کی طاقت نے بھی یہودیت ہی کی حمایت کی۔ اور عیسیٰ کے مقابلے کے لئے یہ دونوں طاقتیں اپنے اختلافات کو بھول کر ہم آواز ہوگئیں اور آخر اس داعی انقلاب کو واصل بحق کر دیا گیا۔ لیکن داعی کے نہ ہونے کے باوجود دعوت اپنی جگہ پر باقی رہی، باقی ہی نہیں رہی، آندھی مینہ کی طرح چاروں طرف پھیلنے لگی۔ اور آخر دجلہ و فرات کے ساحل سے لے کر یونان و روما کے پایۂ تخت تک اس انقلاب کی صدا سے گونج اٹھے۔

ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی اس دعوتِ انقلاب کا زمانہ وہ تھا جب تشدد و سخت گیری عالمگیر ہو چکی تھی اور انسانوں کے ایک محدود طبقے نے طاقت و قوت کے تمام سرچشموں پر قبضہ کر کے خدا کی تمام مخلوق کو مفلوج اور اپاہج بنا کر چھوڑ دیا تھا اور ان میں مرعوبیت اور بے چارگی کا احساس اتنا بڑھ گیا تھا کہ ظلم کے خلاف بغاوت کرنے کا تصور کرتے ہوئے بھی لرزہ آتا تھا۔ ایسی حالت میں عیسیٰؑ کا کام یہ تھا کہ وہ ظلم و استبداد کے خلاف مقابلہ کرنے کی اسپرٹ عوام میں پیدا کریں۔ لیکن عوام کے پاس نہ اسلحہ کی طاقت تھی نہ دولت کی، اس لئے سوال یہ تھا کہ وہ کونسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اسلحہ اور دولت کی طاقت کے بغیر بھی مقابلہ ممکن

ہوسکے۔ عیسیٰ نے اس کے لئے قربانی و ایثار کا حربہ دُنیا کے ہاتھ میں دیا اور پکار کر یہ اعلان کیا کہ تشدد کو تشدد سے دبانے کی طاقت اگر تم میں نہیں ہے تو پریشان نہ ہو جاؤ بلکہ روح اور اخلاق کی طاقت سے ظلم و تشدد کا مقابلہ کرو۔ اگر تمہارے ایک گال پر کوئی تھپڑ مارے تو تم مرعوب ہونے کے بجائے ظالم سے کہو کہ لے یہ دوسرا گال بھی حاضر ہے، اسے بھی اپنے تھپڑ کا تختۂ مشق بنا لیکن میرا دل تیرے ظلم کے آگے گردن جھکانے کے لئے تیار نہ ہوگا۔

سلطنتِ روما اس زمانے میں روما کی سلطنت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ آگسٹس اس کا فرمانروا تھا اور اگرچہ اس کے رعب و جلال کی دھاک سب پر بیٹھی ہوئی تھی مگر اس نے نظم و نسق کے تمام اختیارات صرف اپنی ذات میں محدود کرکے ایک بہت بڑی طاقتور قسم کی مطلق العنان شاہی کی بنا ڈال دی تھی۔ آگسٹس سے پہلے روما کی حکومت ایک قسم کی نیم جمہوری حکومت تھی جس میں ایک مخصوص طبقے کی آواز کو آئین و قوانین کے بنانے بگاڑنے میں بہت دخل حاصل تھا، لیکن آگسٹس نے تمام اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کرلئے، پھر چونکہ وہ بہت زیرک و فہیم قسم کا انسان تھا، اس لئے جہاں اس نے ایک طرف یہ غیر مسئول اقتدار حاصل کیا، وہاں دوسری طرف عوام کو مطمئن کرنے کی تدبیروں سے بھی غافل نہ رہا، چنانچہ روما کی تاریخ میں اس کو بڑا شاندار بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کی شانداری کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ نسلی اقتدار کی ایک گرتی ہوئی عمارت کو اپنی مطلق العنانی کے زور سے تھام لیا گیا اور جس ہئیتِ اجتماعیہ سے دُنیا نالاں تھی، اس

پر کچھ رنگ و روغن پھیر کر آبدار بنا دیا

آگسٹس نے دور دراز کے بہت سے چھوٹے چھوٹے علاقوں کی فرمانرواؤں سے اپنی اطاعت کا لوہا منوالیا اور اس اطاعت کے صلہ میں اُن کے تمام مظالم کے لئے ایک طاقتور ڈھال کا کام دینے لگا۔ گویا آگسٹس کے اقتدار کے زیر سایہ وسطی دُنیا کے تمام جابر و غاصب افراد کی ایک انجمن سی بن گئی اور عوام پر رعب و دہشت کی حوصلہ شکن فضا طاری ہونے لگی۔

ہیروڈ کی مطلق العنان شاہی فلسطین میں اس وقت ہیروڈ کی حکومت تھی جو آگسٹس کا وفادار تھا۔ طاقت و اقتدار کے لحاظ سے یہ بھی اپنے ملک میں آگسٹس سے کم نہ تھا۔ البتہ ظلم وستم کے میدان میں اپنے آقا سے بہت آگے تھا۔ تاریخ میں اُس جیسا ظالم بادشاہ مشکل سے ملے گا، ذرا ذرا سے شُبہ پر پوری بستیوں کی بستیوں کو اُجاڑ دینا اس کا ایک معمولی کام تھا، وہ بڑی بڑی عالیشان عمارتیں بنانے کا بہت شوقین تھا، اور اس کی حکومت میں فنِ تعمیر کے بڑے بڑے شاندار نمونے تیار ہوئے[1]، لیکن عہدِ ابراہیمی کی تہذیبِ بابل کی طرح اس ظاہری شان وشوکت کے پیچھے انسانی آزادی بے بس پڑی دم توڑتی رہتی تھی۔

پہاڑی کا وعظ چنانچہ جب حضرت مسیح کی دعوتِ انقلاب کی آواز ہیروڈ کے کانوں تک پہنچی تو وہ اور اس کے تمام ساتھی سخت پریشان ہو گئے[2]۔ لیکن داعیِ انقلاب اپنے فرض کی بجا آوری میں مصروف رہا

---

[1] ہسٹیرس - جلد پنجم صفحہ ۶۸۸

[2] انجیل - متی - باب ۲ - فقرہ ۳

اور ظلم و تشدد کی اس اندھیر نگری میں خدا کے بندوں کو مخاطب کرکے یہ پیام دیا:۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں اگلے پیغمبروں یا ان کے بنائے ہوئے قانونوں کو توڑنے آیا ہوں۔ میں تو اُن کے اصلی مقصد و منشا کو پورا کرنے کے لئے آیا ہوں میں چاہتا ہوں کہ اِن قوانین کے ایک ایک حرف اور ایک ایک شوشے پر عمل ہو۔

خدا کی رحمت ہو اُن پر جو تحمّل و بردباری سے کام لیتے ہیں، وہی خدا کے رحم کے مستحق ہیں۔

خدا کی رحمت ہو اُن پر جو امن و صلح کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہی خدا کے محبوب بندے ہیں۔

خدا کی رحمت ہو اُن پر جو ظلم و ستم سہتے ہیں، وہی خدائی حکومت کے اصلی حق دار ہیں۔

خدا کی رحمت ہو تجھ پر جب لوگ تجھے گالیاں دیں۔ تجھ پر ظلم ڈھائیں اور ہزاروں قسم کے بہتان تجھ پر تراشیں۔

تم اگلے لوگوں سے سُن چکے ہو کہ قتل بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں: اگر تم اپنے بھائی کو گالی دیتے ہو، اُسے دھتکارتے ہو یا بلا وجہ اس سے ناراض ہوتے ہو، تب بھی تم خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔

تم اگلے لوگوں سے سُن چکے ہو کہ زنا بہت بڑا پاپ ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں: جو شخص پرائی عورت کی طرف بُری نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ دل میں زنا کا مرتکب ہو چکا۔ اس لئے اگر تمہاری آنکھ یا ہاتھ ایسی حرکت کرے تو اُسے کاٹ کر پھینک دو

تم یہ سن چکے ہو کہ آنکھ کا بدلہ آنکھ ہی اور دانت کا بدلہ دانت۔ لیکن میں کہتا ہوں، تم بدی کا مقابلہ نہ کرو۔ بلکہ اگر کوئی تمہارے داہنے گال پہ تھپڑ مارے تو تم اپنا بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو۔

تم کو یہ بتایا جا چکا ہے کہ اپنے پڑوسیوں سے محبت کرو۔ لیکن میں کہتا ہوں، اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرو، جو تمہیں گالیاں دیں، انھیں بھی دعائیں دو جو تم سے نفرت کریں ان کے ساتھ بھی نیکی کرو اور جو تمہیں ستائیں اور تم پر بہتان باندھیں، اُن کے لئے بھی دُعا مانگو۔[1]

ظلم کے مقابلہ کا عیسوی حربہ

حضرت عیسیٰ کے اس پیام نے ظلم و تشدد کے مقابلے کا ایک ایسا نادر حربہ دنیا کو دیا کہ عوام کے مردہ دلوں میں زندگی کا نیا خون دوڑنے لگا اور مظلومیت یہ سمجھنے لگی کہ ظلم کے دانتوں کے کُند کرنے کا ایک مؤثر طریقہ یہ بھی ہے کہ مظلومیت اپنی تمام بے چارگی کے باوجود ظلم کے آگے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دے اور اس سلسلے میں ہر مصیبت کو خاموشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار رہے۔ ہندوستان کے گوتم بدھ اور مہابیر جین نے دنیائے مظلوم کو جو پیام دیا تھا اس میں ظلم سے بھری ہوئی دُنیا کو چھوڑ دینے کا وعظ کہا گیا تھا اور زندگی سے نفرت کرنا سکھایا گیا تھا۔ لیکن عیسیٰ نے ظلم سے خاموش مقابلہ کرنے کا سبق دیا۔

ہندوستان میں گوتم بدھ کی تعلیمات کا یہ اثر ضرور رہا کہ ذات پات کے بندھن ٹوٹنے شروع ہوئے، اور برہمنوں کے راج کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ لیکن اس فلسفۂ انقلاب میں ترکِ دنیا کا جو عنصر تھا، اُس کا سہارا لے کر قابلی

---

[1] انجیل متی۔ باب ۵

طاقتوں نے رفتہ رفتہ اس کی تعلیمات کو زندگی کے عملی کاروبار سے تقریباً بالکل بے دخل کرنا شروع کیا اور آخر چھٹی صدی عیسوی میں برہمنی نظام نے ہلہ بول کر بدھ مت کو ہندوستان سے بالکل مٹا ہی دیا۔ البتہ مہابیر جین کی تحریک میں چونکہ ذات پات کو تسلیم کر لیا گیا تھا، اس لئے اس پر اتنا نزلہ نہ گرا اور برہمنوں نے اس سے سمجھوتہ کر لیا۔

عیسیٰ کے پیام نے بدھ جیسے داعیانِ انقلاب کے مقابلے میں مظلوم انسانیت کو ایک موثر حربہ دیا۔ مگر اس میں صبر و ضبط اور ایثار و قربانی کا جو عنصر ظلم کے مقابلے کے لئے تجویز ہوا تھا۔ اُسے قابیلی طاقتوں نے آہستہ آہستہ مسخ کر دیا اور رہبانیت و ترکِ دُنیا کے جذبات کو ترقی ہونی شروع ہو گئی۔

سیاسی اقتدارِ اعلیٰ

عیسیٰ کی دعوتِ انقلاب نے انسانی زندگی کو معاشی و سیاسی نقشوں میں بہت تبدیلیاں کیں۔ لیکن اس پیام میں ایک کمی یہ تھی کہ سیاسی اقتدار اعلےٰ کو کوئی ایسی شکل دینے کی کوشش نہیں کی گئی جس سے قابیلیت بے بس ہو جاتی۔ آپ نے امن و سلامتی کے اصول بتا دیئے لیکن اقتدار اعلیٰ کو قابیلی طاقت کے ہاتھ سے چھین کر ہابیلیت کے ہاتھ میں دینے کی کوئی ایسی جامع و ہمہ گیر اسکیم نہیں بنائی گئی جو انسانوں کو معاشی ضرورتوں کی طرف سے بے نیاز کر کے روحانی و الوہی افکار و اشغال کی طرف راغب کر سکتی۔ انسانی معاشرت میں فساد و خرابی کی اصلی جڑ یہ تھی کہ زندگی کے وہ معاشی لوازم جن کے بغیر آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا، انتہائی بے اصولی کے ساتھ چند افراد کے عیش و راحت کے لئے استعمال ہو رہے تھے، اور دُنیا کی بیشتر آبادی صرف کرب و اضطراب کی آہیں بھرنے کے لئے چھوڑ دی گئی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی تو انسان نے "کرم" کے

نظریے میں پناہ ڈھونڈ کر اپنی تقدیر پر صبر کرنے کی کوشش کی، کبھی رہبانیت و ترک دنیا کو اپنا معیار بنایا، کبھی تصوف و ریاضت کی طرف دوڑ لگائی، کبھی دین و دُنیا کو دو حصّوں میں بانٹ کر افلاس و بدحالی کی زندگی کو معیاری زندگی قرار دیا۔ کہیں مہاتما بدھ کے نام پر غریبوں اور مفلسوں کے غول کے غول بھکشو اور بھکشنی بن کر جنگلوں میں گھومنے لگے۔ کہیں زینو کے ترکِ لذات (Cynicysm) کے فلسفے نے بدحالوں کو صبر کرنا سکھایا۔ کہیں دیوجانس کلبی نے راحت و مسرت کے تمام لوازم سے بدنصیب بندگانِ خدا کو نفرت کرنے کا سبق پڑھایا (Stoicism) کہیں ایپی کورس نے سادہ زندگی کی ترغیب دے کر مسرت کو صرف دل کی مسرت سے تعبیر کیا۔ کہیں یزدان اور اہرمن کے نام سے زرتشت کے پیروؤں نے ہر مصیبت و کلفت کو قدرت کی طرف سے بھیجا ہوا سمجھا۔ کہیں آواگون اور تناسخ کے پھیر میں پست و زبوں حال مخلوق نے اپنی بیکسی کو اپنے پچھلے کرموں کی پاداش ٹھہرایا —— غرض دُنیا میں ہر جگہ ہابیلیت نے اپنی مظلومیت کو قابلِ برداشت بنانے کے لئے نئے نئے فلسفوں اور نظریوں کے دامن میں پناہ لینی شروع کر دی، لیکن نتیجے میں خدا کی یہ مظلوم و مجبور مخلوق گردابِ حیرت میں ڈوب کر رہ گئی۔

عیسیٰ نے ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جو پیام دیا وہ بہت مؤثر تھا لیکن رفتہ رفتہ اس پیام نے بھی ترک دنیا کے گوشوں میں پناہ ڈھونڈھنی شروع کر دی اور دنیا میں قابیلی طاقتوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا۔

اِن حالات میں ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کی ضرورت تھی جو اس پورے طلسمِ خیالات کو توڑ کر پھینک دیتا اور مخلوق کو خالق سے ہم کنار کرنے کے

لئے طاقت و اقتدار کے سرچشموں کو قابلی ہاتھوں سے چھین کر یہ آواز بلند کرتا کہ

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

یہ تھا انسانی نظام حیات کا وہ پس منظر جب پیرانِ کلیسا اور پیران کلیسا کے دامن میں پلنے والے تمام قابلِ عشرت کدوں کو تباہ کرنے کے لئے ۶۱۱ء میں اسلام کے نام سے انقلاب کی وہ عظیم الشان آواز گونجی جس نے پوری دُنیائے قابلیت کو تہ و بالا کر کے رکھدیا۔

انقلاباتِ عالم کی تاریخ میں اسلام کی دعوتِ انقلاب کی اہمیت اتنی زبردست ہی کہ اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ جان لینا ضروری ہی کہ اس وقت دُنیا کن کن افکار و خیالات کے دور سے گذر رہی تھی، اور خدا کی مخلوق پر اُن کے کیا کیا نتائج و عواقب مرتب ہو رہے تھے۔ اس لئے ذیل میں اُس وقت کی انسانی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہی:۔

ہندوستان ہندوستان میں بدھ کی تعلیمات کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ذات پات کے برہمنی رواج نے چند مخصوص افراد کے سوا باقی ساری مخلوق کو شودر اور چنڈال بنا کر چھوڑ دیا تھا جن کا کام غلامی و بندگی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اُس وقت ہندوستان کا نظام حیات، تصورات کے جن جھمیلوں میں پھنسا ہوا تھا اُن کی نوعیت مختصراً یہ تھی۔

۱- ویدانت:۔ خدا قادرِ مطلق اور کل اشیاء کا عالم اور خالق ہی۔ دُنیا صرف ایک فریبِ نظر (مایا جال) ہی، ہر ذی روح مختلف

قالبوں سے گزر کر آواگون یا تناسخ کے ذریعہ نجاتِ ابدی (نروان) حاصل کرتا ہے۔

۲۔ سانکھیہ:۔ مادہ اور روح دو جُدا جُدا چیزیں ہیں اور دونوں ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گے۔ مادے میں شعور و احساس کی صفت روح کے اتصال سے پیدا ہوتی ہے، خدا فعالِ مطلق نہیں ہے بلکہ چند اصول کے مطابق ایک مشین کی طرح اس سے تمام کام سرزد ہوتے ہیں۔ سنسکرت کی اصطلاح میں اس فلسفے کو ماننے والے نریشور کہلاتے ہیں یعنی ایشور (خدائے فعال و ذی ارادہ) کے وجود سے انکار کرنے والے۔

۳۔ یوگا:۔ اصولی لحاظ سے اس فلسفے کو ماننے والے بھی سانکھیہ خیالات ہی رکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے نزدیک روح کو جسم کے جھمیلے سے نجات دلانے کے لئے بہت سخت قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کی بھی ضرورت ہے۔ یوگا کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ ریاضتوں کی مدد سے آدمی اس زندگی میں بھی اپنی روح کو مادے سے الگ کر سکتا ہے۔

۴۔ نیایا۔ ویشیشیکا اور لوکایتیکہ:۔ ان کا ماحصل یہ تھا کہ اس دُنیا کے بعد کوئی اور دنیا نہیں۔ یعنی دہریت اور الحاد کا فلسفہ[1]

---

[1] دیکھو

1. System of Indian Philosophy: Max Muller.

2. Indian Philosophy: Radha Krishna.

یہ تھی ہندوستان کی فکری و نظری زندگی۔ لیکن عملی زندگی اس سے بھی بدتر تھی۔ ذات پات کے وہ تمام فتنے جاگ چکے تھے جن کا ایک اجمالی نقشہ منوسمرتی کی زبان میں اوپر پیش کیا جا چکا ہی، برہمن خدا کا اوتار تھا اور کائنات کی ہر چیز برہمنوں کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ برہمن کا درجہ اتنا اونچا کر دیا گیا کہ سخت سے سخت سنگین جرم پر بھی راجہ اُسے قتل نہیں کرا سکتا تھا قتل کروانا تو بڑی بات ہی، راجہ کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ برہمنوں کو ناخوش ہرگز نہ کرے۔ ورنہ ان کی ذرا سی بددُعا سے اُس کا سارا راج پاٹ تباہ ہو سکتا ہی۔[1]

ان حالات کا نتیجہ یہ تھا کہ —— "انسانی آزادی کی روح سلب ہو چکی تھی، عوام کے جذبات کچلے جا چکے تھے اور اُن کے ذہن و دماغ پر خوف و دہشت کی حکمرانی تھی، وہ جنتر منتر کی قسم کے ڈھکوسلوں میں پڑ گئے تھے اور انسانی زندگی کے عملی سوالات کو غور و فکر کرنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا اس کے بجائے ٹونے ٹوٹکے اور کرامات و افسانے کی دُنیا میں لوگ مگن رہتے تھے"۔[2]

چین یہ تو تھی ہندوستان کی حالت۔ ہندوستان کے بعد دنیائے تمدن کا سب سے بڑا علاقہ چین تھا، یہاں گوتم بدھ کا فلسفۂ زندگی رائج تھا۔ لیکن کنفیوشس کے ماننے والوں کی تعداد بھی کم نہ تھی، مگر کیفیوشس کا فلسفہ صرف ایک اخلاقی درس ہو کر رہ گیا تھا جو سیاست و معیشت پر

---

[1] منوسمرتی

[2] چیمبرس: انسائیکلوپیڈیا۔ جلد نمبر ۱۰

مطلق کوئی اثر نہ ڈالتا تھا۔ بدھ کے خیالات کی نوعیت بھی رفتہ رفتہ یہی ہوگئی۔ نروان کے نصب العین نے زندگی کے مسائل سے لاپرواہی پیدا کردی تھی بلکہ زندگی کو ایک بوجھ سمجھ کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرنا، کمال بلند خیالی سمجھا جانے لگا[۱] نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں کی ہیئت معاشیہ و سیاسیہ ابتر ہوگئی اور خاقانِ چین کے نام پر قابلیت خوب کھل کھیلنے لگی۔

ایران چین و ہندوستان کے بعد اب ایران کو لیجئے، زرتشت نے جو تصورِ حیات پیش کیا تھا، وہ بالکل بگڑ چکا تھا اور مُزدک نامی ایک شخص نے ہر چیز کو حلال قرار دے کر انسان کو چوری زنا ڈکیتی غرض ہر جرم کو کھُلم کھُلا کرنے کی اجازت دی تھی۔ ساسانی خاندان کے آخری تاجداروں کی فرمانروائی تھی جن کے عیش و عشرت کا اندازہ اس کے آخری تاجدار خسرو پرویز اور شیریں فرہاد کے مشہور واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے، زرتشت کی تحریک نے ایران کی ہیئت سیاسیہ و معاشیہ کو جو نیا قالب بخشا تھا، قابلی ذہنیت نے رفتہ رفتہ اس کا وہی حشر کیا جو ہندوستان میں منوسمرتی کے قائل برہمنوں نے آریہ دھرم کا کر رکھا تھا۔ ایران میں بھی "مغوں" نے برہمن کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور زرتشت کے فلسفۂ زندگی میں بے شمار فضول چیزیں شامل ہوگئی تھیں غرض انسانی زندگی نئی نئی پیچیدگیوں کے جھمیلے میں اُلجھ کر رہ گئی تھی[۲]۔

مشہور پارسی مفکر زیبان کہتا ہے: ساسانی سلاطین (ایران کے آخری زرتشتی فرمانروا) کے عہد میں زرتشت کی تعلیمات مسخ ہوکر رہ گئی تھیں اور یہ اس لئے ہوا کہ مُغوں (یعنی برہمنوں کے زرتشتی ایڈیشن) نے زرتشت کی تعلیم کو اپنے من مانے

---

[۱] دیکھو۔ Buddhist Nihilism: Max Muller.

[۲] خزینۂ مُغ صفحہ ۶۴

نظام حیات کے موافق بنانے کی کوشش کی جس نے سب کچھ بگاڑ کے رکھدیا۔[1]

یونان و روما چین، ایران اور ہندوستان کے بعد اُس وقت کی دنیائے آباد کا وسیع خطہ یونان و روما تھا۔ اس میں مندرجہ ذیل اصول حیات کارفرما تھے!

(۱) **اِسٹوئس اِزم** اسٹوئس اِزم (Stoicism)جس کے اصول مختصراً حسب ذیل تھے۔

۱۔ دنیا پر نیکی اور بدی کی طاقتیں حکمراں ہیں جس طاقت کا نام خدا ہی وہ "شر" کی خالق نہیں ہی۔

۲۔ خدا آدمی کی طرح جسم رکھتا ہی۔

۳۔ ہر رنج و راحت خدا کی طرف سے ہی اس لئے رنج و مصیبت پر صبر کرو۔ اور برداشت کی قوت پیدا کرو۔

۴۔ خوشی ایک عارضی اور آنی فانی چیز ہی اس لئے اس کی پروانہ کرو۔

۵۔ قسمت پر شاکر رہو اور جو مصیبت آئے اُسے خدا کی طرف سے سمجھو۔[2]

(۲) **سنی سیزم** اسٹوئس ازم کے بعد دوسرا فلسفہ کلبیت یا سنی سزم Cynicism تھا۔ اس کے اصول حسب ذیل تھے۔

۱۔ نیکی نام ہی خوشی سے ارادۃً کنارہ کشی کرنے کا۔

۲۔ دولت، عزت، علم اور عیش و راحت سب سے نفرت کرو۔ اور سخت سے سخت مشقت کی زندگی گذارنے کی عادت ڈالو۔

---

[1] ایران و پارسیاں: دیباچہ

[2] اسٹوئک فلاسفی از گلبرٹ مرے۔

دیوجانس کلبی جو اس فلسفے کا بہت بڑا ترجمان سمجھا جاتا تھا اس کی زندگی کا عالم یہ تھا کہ آپ ایک ناند میں شب روز بسر فرماتے تھے اور شہر بھر میں اسی کو لڑھکائے پھرتے تھے۔ گرمی میں آپ گرم ریت پر لوٹتے تھے اور سردی میں برف سے ڈھکے ہوئے پتھر کے بتوں سے ہم آغوش ہوتے، سکندر جو اس وقت یونان کا بادشاہ تھا، جب اُسے آپ کی ان اداؤں کا علم ہوا تو ایک دن وہ اس "عجائب گھر" کو دیکھنے آیا۔ اور قریب آکر بولا:-

"میں سکندر اعظم ہوں"

آپ نے سر اٹھا کر دیکھا اور حسب دستور اپنے معمولی کھرّے پن سے جواب دیا،

"اور میں دیوجانس کلبی ہوں"

سکندر نے یہ سُن کر کہا۔ "میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" اس کے جواب میں کلبی صاحب نے ارشاد فرمایا "تم دھوپ روکے ہوئے کھڑے ہو۔ ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ"۔

سکندر نے یہ سُنا تو حیرت کرکے چلا گیا[1]

(۳) فلسفۂ مسرت

یونان کا تیسرا فلسفہ وہ تھا جو ایپی کورس کے نام سے منسوب ہے اور جسے "فلسفۂ مسرت" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن ایپی کورس جس چیز کو "مسرت" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، وہ "نیکی" ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس کے نزدیک مسرت کا سرچشمہ صرف نیکی ہے، اس لئے وہ لوگوں سے کہتا ہے، نیکی میں مسرت محسوس کرو، اور مسرت کو نیکی قرار دو۔ وہ اسٹوئس ازم اور سنی سیزم کے ماننے والوں کی طرح انسانی جذبات کو نظر انداز کرکے صرف دماغ ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتا بلکہ اخلاق کی بنیاد جذبات

---

[1] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا۔

پر رکھتا ہے، وہ کہتا ہے "جب ہم کہتے ہیں، راحت نیکی ہے تو اس کا مطلب شراب و کباب، رقص و سرود، عیاشی و اوباشی یا عورتوں سے خلا ملا رکھنا نہیں ہے، بلکہ سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے اُن چیزوں کو حاصل کرنا مطلوب ہے جو مستقل طور سے "نیکی" ہیں اور اسی کے ساتھ اُن چیزوں کو چھوڑ دینا بھی مقصود ہے جو مسرت کی وقتی اور عارضی کیفیت پیدا کرتی ہیں[1]"

چنانچہ یہ لوگ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ فلسفہ عیاشی و بدمعاشی، کے تصورات میں ضم ہو کر رہ گیا اور اس کی عملی تعبیر صرف یہ کی جانے لگی کہ

خوش باش دمے کہ زندگانی این ست!

انقلاباتِ عالم کا گہوارۂ اوّلین

بلادِ عالم کے ہر حصّے کی حالت آپ دیکھ چکے ہیں۔ لیکن ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ انقلابات عالم کا مرکز دُنیا کا وہ علاقہ رہا ہے جو آجکل بلادِ عرب کے نام سے موسوم ہے۔ یہیں دُنیا کا سب سے پہلا ضابطۂ اخلاق اور ضابطۂ قانون موسیٰ نے توریت کے نام سے ہم کو دیا، عیسیٰ نے اس ضابطے میں کچھ جزوی ترمیمیں ضرور کیں۔ لیکن اصلاً اسی کو باقی رکھا یہ ضابطہ انسانی معاشرت کو فلاح و بہبود کی طرف لے جانے والا بہت بڑا قدم تھا، مگر انسانوں کو پست و بلند کے دو ممتاز گروہوں میں بانٹ دینے کی جو ذہنیت قابیلی گروہ نے پیدا کر دی تھی اُسے یہ بھی نہ مٹا سکا۔ توریت کی رو سے غلام کو "مال" سمجھا گیا ہے جس کے قتل پر آقا کو سزائے موت نہیں دی جا سکتی[2]۔ علیٰ ہذا القیاس اگر آقا اپنے غلام کو مار کر اس کا ہاتھ پاؤں یا ناک کان توڑ ڈالے تب بھی کوئی خاص سزا نہیں صرف آزاد

---

[1] اسٹوئک اینڈ اپیکیورین از۔ آر۔ ڈی ہکس

[2] توریت اخراج باب ۲۱ فقرہ ۲۰-۲۱

کردینا کافی ہے[۱]۔ بادشاہ اور بادشاہ کے خاندان کا غیر معمولی امتیاز بھی توریت نے تسلیم کیا حتّٰی کہ یہ حکم دیا کہ انصاف و مساوات کی خاطر بھی شاہزادوں کی توہین کرنا اچھا نہیں[۲]۔

ذہنی مرعوبیت لیکن انسانی مظلومیت کا سب سے زیادہ دردناک پہلو یہ تھا کہ ان مظالم کو مظالم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور ہر مظلوم یہ خیال کرتا تھا کہ اس کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے، وہ حق بجانب ہے، صحیح اصولوں پر غور و فکر کرنے کی صلاحیت انسانی دماغ سے مفقود ہو گئی تھی، وہ ہر طاقت سے مرعوب ہوتا تھا اور اپنی طاقت سے بالکل ناواقف تھا، وہ ہر طاقت کو خدا سمجھتا تھا، اس لئے ظالم کے خلاف بغاوت کرنے کے بجائے اس کے آگے سر جھکا دینے ہی میں اپنی عافیت دیکھتا تھا وہ طاقت کے ہر مظاہرے کو خدا کہتا تھا اور ہر خدا کو اپنی پرستش سے خوش کرنا چاہتا تھا حتّٰی کہ آگ میں چونکہ جلانے کی طاقت تھی، اس لئے اُسے بھی خدا سمجھا جانے لگا، سانپ کی زہریلی طاقت کو بھی خدا قرار دیا گیا۔ دریا کی غضبناک لہروں کو بھی خدا سمجھ کر پوجا گیا۔ غرض ہر طاقت کو ناقابلِ تسخیر سمجھ کر پہلے تو خدا بنا دیا گیا اور پھر ان خداؤں کے مظالم کو اپنی تقدیر سمجھکر برداشت کیا جانے لگا۔ انسانی دماغ کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہر طاقتور انسان دیوتا بن گیا اور جس خوش نصیب نے ان دیوتاؤں پر بھی غلبہ حاصل کر لیا وہ نمرود و فرعون کی طرح خداؤں کا خدا ٹھہرایا گیا۔

ذہنی مرعوبیت کی حالت عام انسانوں پر طاری تھی اور جو دو چار اس سے مستثنیٰ تھے، وہ اس میں انقلاب بپا کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔

---

[۱] توریت اخراج باب ۲۱ فقرہ ۲۶ - ۲۷

[۲] " امثال " ۱۷ " ۲۶

ان حالات میں دنیا کو ایک ایسے داعی انقلاب کی ضرورت تھی جو ایک طرف تو انسانی دماغ سے مرعوبیت کا یہ بوجھ اتارنے میں مدد دے اور دوسری طرف ایک ایسا صالح سیاسی و معیشتی ماحول پیدا کرے جس میں انسان کی ذہنی صلاحیتیں صحیح اصولوں پر غور و فکر کرنے کی اہل ہو سکیں ——— دنیا ایک ایسے انقلاب کی پیاسی تھی جو اُسے خداؤں اور خدا زادوں کے دم گھونٹ دینے والے ہجوم سے نجات دلائے اور انسانی دماغ کو اس مرعوبیت سے آزاد کرے جو طاقت کے ہر مظہر کو دیکھ کر پیدا ہوتی تھی اور جس نے غور و فکر کی تمام صلاحیتوں کو ٹھٹھرا کے رکھ دیا تھا۔ انسانیت کی روح یہ درس انقلاب سننے کے لئے بیتاب تھی کہ ——— "خدا صرف ایک ہے وہ خوشامد درامد یا نذر و نیاز کی خواہشوں سے بے نیاز ہے وہ نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کے کوئی اولاد ہے اور کائنات کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی"[1]

پھر کیا انسانیت کی یہ پکار سُنی گئی ———؟

آئندہ ابواب میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جائے گی۔

---

[1] سورۂ اخلاص: پارہ ۳۰

باب ۷

دنیا کا پہلا بنیادی اور ہمہ گیر انقلاب

انقلاب اسلام کا آغاز

ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک ایسے بنیادی اور ہمہ گیر انقلاب کا جھنڈا دُنیا کے ایک چھوٹے سے شہر مکّہ میں لہرایا گیا۔ جس نے انسانیت کو ایک بالکل نیا آب و روغن عطا کر دیا۔ ابتدا میں حسب دستور انقلاب کی اس آواز کا مذاق اُڑایا گیا، لیکن جب مذاق اڑانے کے باوجود اس کی طاقت برابر بڑھتی چلی گئی تو پھر تلوار سے اس کا مقابلہ کیا گیا اور داعیٔ انقلاب کو قتل کرنے کی سازش کی گئی۔ مگر یہ سازش کامیاب نہ ہوئی۔ البتہ اب جدوجہدِ انقلاب کا مرکز مکّہ سے مدینہ میں منتقل کر دیا گیا۔ مدینہ میں دس سال تک قابلی گروہ کی تمام طاقتوں نے اس انقلاب کی آواز کو دبانے کی انتہائی کوشش کی، مگر سب کوششیں رائگاں گئیں۔ آخر کار دس سال کے بعد یہ داعیٔ انقلاب ایک فاتح و منصور کی حیثیت سے مکّہ میں دوبارہ داخل ہوا اور بڑی بڑی قابلی طاقتوں نے اس کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دیا۔ دُنیا مشرق سے لیکر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک اس انقلاب کی صدائے بازگشت سے گونج اُٹھی قیصر و کسریٰ

کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا، قابلی آتشکدے ٹھنڈے پڑگئے، شام وعراق کے سلاطین کے قلعوں کی بنیادیں ہل گئیں، مصرو روما کے عالیشان محلوں کے چراغ گل ہوگئے اور چین وہندوستان کے خاقان وفغفور اور مہاراج ادھیراج غفلت کی نیندسے چونک اٹھے ——— دنیا کی غریب و مظلوم عوام کی تاریک رات کی سحر نمودار ہوئی، ہابیلی جم غفیر نے قوت وطاقت اور دولت وصحت کی کھوئی ہوئی نعمت کو دوبارہ پانے کا مژدہ سُنا ——— اعلان کیا گیا کہ سب انسان برابر ہیں اور برتری وسربلندی سوائے خدا کے کسی کو حاصل نہیں ——— خدا کے سوا کسی کے آگے گردن نہ جھکاؤ اور داعیٔ انقلاب کی آواز کے سوا اور کسی کی آواز نہ سُنو ——— کوئی اطاعت وعبادت کا مستحق نہیں، مگر اللہ اور محمدؐ اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہے"۔[۱]

اسلام ایک عالمگیر انقلاب کا داعی تھا لیکن اس کا پہلا اور براہ راست مقابلہ قیصر روم اور کسرائے ایران کی شہنشاہتیوں سے تھا، اسلامیات کے مفکر اعظم شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں "ظلم وبداعمالی کی تمام طاقتوں نے روم وایران کی شہنشاہتیوں کے دامن میں پناہ لے رکھی تھی، اس لئے اسلام کا سب سے پہلا مقابلہ انہی سے تھا تاکہ اس آشیانے ہی کو تباہ کردیا جائے، جس کے سائے میں فتنہ وفساد کے یہ جراثیم پل رہے تھے"[۲]

اسلام نے قابیلی فلسفہ میں جو انقلاب بپا کیا اور دُنیا کو جو نظامِ معاشرت اور نظامِ سیاست دیا اس پر تفصیل کے ساتھ کچھ لکھنے کا یہاں موقع نہیں۔ یہاں مختصراً صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ اسلام نے زندگی اور معیشت کے کیا اصول مقرر کئے تھے۔ یہ اصول حسب ذیل تھے:۔

---

[۱] کلمہ طیبہ۔

[۲] دیکھو ازالۃ الخفا صفحہ ۴۶ وحجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل صفحہ ۱۵۵

(۱) توحید خدا صرف ایک ہی اور وہ کوئی ایسی شکل و صورت نہیں رکھتا جسے انسان ان آنکھوں سے دیکھ سکے، وہ ایک ایسی طاقت کا نام ہی جو ساری کائنات پر چھائی ہوئی ہی. ایک ایسی قدرتِ کاملہ ہی جو پورے نظام عالم کی تخلیق کی ذمہ دار ہی، وہ حسن و خوبی کا مجسمہ ہی، تمام سچائیوں اور صداقتوں کا سرچشمہ ہی، وہ ابتدائی اور بنیادی حقیقت ہی، وہی اوّل ہی اور وہی آخر، وہی ازل ہی اور وہی ابد ——— اس لئے بادشاہ ہو یا بادشاہوں کا بادشاہ، پنڈت ہو یا پنڈتوں کا پنڈت، پیر ہو یا پیروں کا پیر، سب اس ایک خدا کے بندے ہیں اور سب عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں اور سب خدا کے سامنے ایک حیثیت رکھتے ہیں۔

(۲) مساوات انسان انسان سب برابر ہیں، نسل و نسب کوئی چیز نہیں، خاندان و دودمان کوئی چیز نہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔[۱]

خدا کے نزدیک شرافت و بزرگی ہر اُس شخص کو حاصل ہی جو برائیوں سے بچے اور نیکیوں کی طرف دوڑے۔[۲] اس لئے کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ ترقی و بلندی کے کسی ایک دروازے کو بھی کسی انسان پر بند کرے، خواہ وہ انسان کسی نسل سے ہو، کسی خاندان کا ہو، اور خواہ غریب ہو یا امیر. چنانچہ اسلام کے سب بڑے مخالفوں کی طرف سے داعی اسلام کے خلاف یہ الزام لگایا گیا تھا:۔

مذہب او قاطعِ ملک و نسب　　　از قریش و منکر از فضلِ عرب

یہ عجیب مذہب ہی جو کہتا ہی کہ نسل اور نسب کوئی چیز نہیں، اور یہ عجیب محمدؐ ہی جو

---

[۱] آنحضرتؐ کا خطبہ حجۃ الوداع

[۲] حجرات - ع ۲

عرب کے افضل ترین قبیلۂ قریش سے ہونے کے باوجود عربوں کو ساری دُنیا سے افضل نہیں مانتا۔

در نگاہِ او یکے بالا و پست　　با غلامِ خویش بریک خواں نشست

اُس کی نظر میں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں اور اپنے غلاموں کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتا ہے۔

قدرِ احرارِ عرب نشناختہ　　با کلفتانِ حبش در ساختہ

آزاد عربوں کی قدر نہیں پہچانتا اور کالے حبشیوں سے دوستی گانٹھتا ہے۔

احمراں با اسوداں آمیختند　　آبروئے دودمانی ریختند

کالے گورے ایک ہوگئے اور خاندان کی آبرو جاتی رہی۔

(جاوید نامۂ اقبال)

اسلام نے خیالات و افکار میں جو انقلاب برپا کیا اور انسانی مساوات کا جو درس دیا اس کا خلاصہ اقبال کی زبان میں یہ ہے:-

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخساریم

نہ ہم پٹھان ہیں، نہ ترک نہ تاتاری۔ ہم سب ایک درخت کی شاخوں کی طرح ہیں۔

تمیزِ رنگ و بو برما حرام است　　کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

رنگ و نسل کا امتیاز ہم پر حرام ہے، کیونکہ ہم سب ایک ہی بہار کے پروردہ ہیں۔

(۳) غلامی کا خاتمہ　آدمی کو آدمی کا غلام بنا کر بیچنے کا جو قابلی رواج مدّتوں سے چلا آرہا تھا، اُسے ختم کیا گیا۔ لیکن اس معاملہ میں اسلام نے "کھُلی جنگ" کے بجائے "مدبرانہ جنگ" کا وہ اصول اختیار کیا جسے آجکل کی اصطلاح "ڈپلومیٹک جنگ" کہتے ہیں اور جس کی ضرب کھُلی جنگ کے تشدّد پسندانہ حربوں سے کہیں زیادہ مؤثر و کارگر ہوتی ہے۔ داعیِ اسلام نے غلامی کے رواج کو انسانیت کے جسم پر ایک

پھوڑا سمجھا جس کو دور کرنے کے دو ہی طریقے ہو سکتے تھے، یا تو ایک جرّاح کی طرح چاقو سے اسے کاٹ کر پھینک دیا جائے اور یا اندرونی تنقیہ سے اس کو تحلیل کر کے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ اسلام نے دونوں طریقے استعمال کئے، لیکن دوسرے طریقے کی طرف زیادہ توجہ دی یعنی لوگوں کے دل میں غلامی کے خلاف جذبہ پیدا کیا۔ غلامی کا رواج اس زمانے کی معاشیات سے اس طرح وابستہ ہو چکا تھا کہ کسی فوری حکم سے ایک دم اس کو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا، اگر ایسا ہوتا تو وہ لاکھوں انسان جو اپنے آقاؤں کے رحم و کرم پر پل رہے تھے قوم کی حیاتِ اجتماعی پر ایک ہولناک بوجھ بن کر رہ جاتے اور معاشی نظام کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگتا۔ اس لئے اگر ایک بے صبرے طبیب کی طرح جلد بازی کے ساتھ اس پھوڑے کو کاٹ کر پھینک دینے کی کوشش کی جاتی تو بیمار انسانیت کی جان کے لالے پڑ جاتے اور فضا میں یہ چیخیں بلند ہونے لگتیں کہ:۔

ساتھ پیکاں کے مری جان نکل آئی دہیں
تیر بے درد نے کھینچا جو مرے پہلو سے

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام نے بتدریج غلامی کو ختم کرنا چاہا۔ ہرگز نہیں۔ اسلام نے فوراً غلامی کو ختم کرنا چاہا، اور پوری طاقت سے اس کی جڑ بنیاد کو اکھیڑ کر پھینک دینے کی کوشش کی۔ البتہ ہزاروں سال کے پرانے جمع شدہ فاسد مادّے کے صاف ہونے میں جتنا وقت صرف ہونا ضروری تھا، اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ غلامی کے بارے میں اسلام کے تمام احکام اسی اصول پر موقوف ہیں، اسی بنا پر داعی اسلام نے اپنی فتوحات کے موقع پر کسی "اسیر جنگ" کو غلام نہ بنایا، بلکہ یا تو ویسے ہی آزاد کر دیا یا "فدیہ" کے نام سے کچھ معاوضہ لے کر چھوڑ دیا۔ قرآن نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ کوئی آزاد انسان غلام نہیں بنایا جا سکتا،[1] البتہ جو لوگ

---

[1] سورۂ انفال رکوع نمبر ۹

پہلے سے غلام چلے آرہے تھے ایک طرف تو انھیں یہ حق دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی محنت کی کمائی سے کچھ روپیہ آقا کو دے کر آزادی حاصل کرلیں[۱] اور دوسری طرف اُن آقاؤں کو یہ بتایا گیا کہ غلام کو آزاد کرنے سے بڑی کوئی عبادت نہیں[۲]۔ پھر غلام اور آزاد کے اتصالِ جنسی سے پیدا ہونے والی اولاد کو آزاد قرار دیا گیا، اور کسی آزاد انسان کو خواہ وہ کتنا ہی لاوارث کیوں نہ ہو غلام سمجھنے کی شدت سے ممانعت کی گئی جو لوگ جہاد کے دوران میں لڑتے ہوئے پکڑے جائیں اور جنھیں آج کل کی زبان میں "جنگی قیدی" کہا جاتا ہے، انھیں گرفتار کرنے کا حکم ضرور تھا لیکن اِن کے سوا محکوم و مفتوح ملک کے وہ تمام باشندے جو میدانِ جنگ میں براہِ راست و بلا واسطہ شریک نہ تھے، ہر طرح آزاد تھے۔ پھر میدانِ جنگ کے قیدیوں کے لئے بھی یہ ہدایت تھی کہ اوّل تو انھیں ویسے ہی سمجھا بجھا کر چھوڑ دو۔ لیکن یہ عمل مصلحت کے خلاف ہو تو پھر "فدیہ" کے نام سے کچھ رقم لے کر اُنھیں آزاد کردو[۳]۔ لیکن اگر وہ یا ان کا کوئی رشتہ دار اس قسم کی کوئی رقم ادا نہ کرسکے تو پھر اُن سے کوئی شرط (مکاتبت) کرلیا کرو اور جب وہ اس شرط کو پورا کردیں تو انھیں آزاد کردو۔ لیکن جب ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ ہو سکے، تب البتہ ان اسیرانِ جنگ کی حیثیت ایک قیدی کی سی تھی۔ مگر چونکہ اس زمانے میں جیل خانے کا نظام اتنا وسیع نہ تھا، اس لئے جنگ کے اِن قیدیوں کو خلیفہ اسلام کی صوابدید کے مطابق مختلف افراد کی نگرانی میں دے دیا جاتا تھا۔ پھر چونکہ غلامی کے صدیوں پُرانے رواج نے "غلام" کا ایک لفظ وضع کر رکھا تھا، اس لئے عرفِ عام میں ان کو غلام ہی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان سب کے ساتھ جو سلوک کیا

---

[۱] سورۂ نور رکوع ۴

[۲] رواہ براءؓ بن عازبؓ فی الصحیحین

[۳] سورۂ محمدؐ رکوع ۱

جاتا تھا، اُسے روم و قیصر کے عہد کے غلاموں سے کوئی نسبت نہ تھی۔ مزید براں مختلف طریقے سے ان کو آزاد ہو جانے کا حق تھا۔

غرض عہدِ اسلام میں "غلام" کا لفظ صرف جنگی قیدیوں تک محدود تھا۔ آزاد انسانوں کو حبش وغیرہ سے پکڑ کر غلاموں کی طرح فروخت کرنا یا اس قسم کے کسی انسان کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک روا رکھنا جس کا رواج اس وقت عام تھا، بالکل ناجائز اور حرام قرار دیا گیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے مصر کے گورنر عمرو ابن العاص سے اس قسم کے ایک واقعہ کی اطلاع پا کر سختی سے کہا تھا! "تم نے ان لوگوں کو غلام کب سے بنا لیا ہے درانحالیکہ ان کی ماؤں نے انھیں ایک آزاد انسان کی حیثیت سے پیدا کیا ہے"[1]

بہرحال اسلام نے انسانی ہیئت اجتماعیہ میں جو انقلاب بپا کیا تھا، اگر وہ داعیِ اسلام کی وفات کے صرف تیس چالیس سال بعد اہلِ غرض کی دست درازیوں سے کمزور نہ پڑ جاتا، تو "جنگی قیدیوں" کو غلام کے لفظ سے تعبیر کرنے کا سوال بھی باقی نہ رہتا، تاہم دُور و دراز ممالک سے آزاد انسانوں کو جبراً پکڑ کر غلاموں کی طرح بیچنے کا جو دستور امیر معاویہؓ کی خلافت کے بعد سے نظر آتا ہے، وہ احکام اسلام کے اتنا ہی خلاف ہے جتنا باپ کے بعد بیٹے کو خلافت و حکومت کی گدی پر بٹھانے اور بیت المال کو قصرِ شاہی کی ذاتی ملکیت سمجھ کر عیش و عشرت پر لُٹانے کا معاملہ منشائے اسلام کے خلاف ہے۔

(۴) لارہبانیت

اسلام رہبانیت کا قائل نہیں[2]۔ خدا شناسی کا راستہ یہ نہیں ہے کہ دُنیا سے مُنہ موڑ کر انسان کسی گوشے میں چھپ کر بیٹھ جائے بلکہ زندگی کی دوڑ میں اُسے سب کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیئے، اور اپنی قوتِ بازو

---

[1] حسن المحاضرہ۔ جلد دوم صفحہ ۱

[2] حجرات۔ ع ۲

سے اپنے لئے روزی حاصل کرنا چاہیئے۔[۱]

داعی اسلام کا ارشاد ہے "جائز وسائل سے اپنے لئے معاش پیدا کرنا، عبادت کے بعد تمہارا سب سے پہلا فرض ہے"۔[۲] ایک اور موقعہ پر آپ نے فرمایا۔ "صبح کی عبادت سے فارغ ہونے کے بعد اپنی روزی پیدا کرنے کی کوشش کرو اور اس کے لئے محنت ومشقت کئے بغیر رات کو بستر پر نہ جاؤ"۔[۳] لیکن ایک اور موقعہ پر تو معاشی جد وجہد کو اتنا اہم قرار دیا گیا ہے کہ ارشاد ہوا ہے "تمہارے بہت سے گناہوں کا کفارہ صرف اُسی صورت میں ممکن ہے جب تم محنت ومشقت سے اپنی روزی آپ پیدا کرنے کی کوشش کرو"۔[۴] خلیفہ دوم جناب فاروق رضی کا قول ہے، "خبردار! طلبِ معاش کی جد وجہد سے غافل ہو کر کبھی نہ بیٹھنا چاہیئے"۔[۵] اس قول کی تشریح میں امام غزالی کی مشہور تصنیف "احیاء العلوم" کے شارح علامہ مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں، "آدمی پر فرض ہے کہ وہ معاش حاصل کرنے کے رائج الوقت پیشوں میں سے کسی پیشے کو ضرور اختیار کرے اور اس طرف سے غفلت ہرگز نہ برتے"۔[۶]

(۵) ظلم کا مقابلہ اگر زندگی کی اس جد وجہد میں ظلم وبے انصافیاں تمہارا راستہ روکیں تو پوری پامردی کے ساتھ آگے بڑھ کر ان مشکلات کا

---

[۱] لا رہبانیۃ فی الاسلام۔ الحدیث الصحیح

[۲] کنز العمال جلد دوم

[۳] ایضاً

[۴] الاوسط۔ طبرانی اور الحلیہ نعیم

[۵] احیاء العلوم جلد دوم صفحہ ۵۰

[۶] اتحاف السادہ۔ جلد ۵ صفحہ ۴۱۷

مقابلہ کرو، ظالم اگر تمہارے ایک گال پر تھپٹر مارے تو دوسرا گال بھی اس کے تھپٹر کے لئے پیش کرنے کے بجائے، تم اُس کو اس ظلم کا مزہ چکھاؤ اور بلا تامل اپنے ہاتھ سے اس کے منہ پر بھی تھپٹر جما دو ——— " اگر کوئی ظالم کسی بے گناہ کا دانت توڑے تو اس کا بھی دانت توڑا جائے۔ اگر کسی بے گناہ کی آنکھ نکالے، تو اس کی آنکھ بھی نکال ڈالی جائے، اگر کسی بیگناہ کا کان اینٹھے تو اس کا کان بھی اینٹھا جائے، غرض جو جس قسم کا صدمہ کسی بے گناہ کو پہنچائے، اس کے بدلے میں اُسے بھی اسی قسم کا صدمہ پہنچایا جائے۔"[1] اور ہر محاذ پر ڈٹ کر برائی کا مقابلہ کیا جائے اور قابیلیت کو اس کا موقعہ نہ دیا جائے کہ وہ طاقت کے ناجائز استعمال سے حق و انصاف کا خون کرتی رہے۔

(۶) حصول اقتدار

طاقت کے سرچشموں پر قبضہ کرو اور ایسا نہ ہونے دو کہ تمہاری غفلت یا سُستی سے طاقت و قوت پر ابلیسیت قابض رہے ——— اپنے جسم کو طاقتور بناؤ، ایسی ریاضت نہ کرو جو تمہیں نیم جان کردے اور نہ ان غذاؤں کو ترک کرو جو تمہاری صحت و عافیت کو برباد کردیں۔ زمین کی پیداوار سے فائدہ اُٹھاؤ اور حق و انصاف کو قائم رکھنے کے لئے زمین کی سرداری قابیلی گروہ سے چھین لو، اُن سے لڑو، اُن پر جہاد کرو اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔

دین دُنیا

قابیلی گروہ کا سب سے کامیاب حربہ یہ تھا کہ اُس نے زندگی کے دو ٹکڑے کر رکھے تھے۔ ایک دُنیا دوسرا دین، خوش حالی و فارغ البالی اور سربلندی و سرسبزی کے تمام لوازم دنیوی زندگی میں داخل تھے اور بدحالی و تنگدستی اور کمزوری و بے چارگی کو دین سے تعبیر کیا جاتا تھا، زندگی کی تمام لذتیں، زمین کی ساری پیداوار، حسن فطرت کی تمام رنگینیاں اور کائنات کی ساری چہل پہل صرف "دنیادار"

---

[1] المائدہ - ع ۷

کا حصہ ہیں، دیندار کو ان سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئیے" دیندار" کو اس دنیا میں فاقہ کشی، بیماری، برہنگی اور حسرت و حرماں نصیبی کی زندگی گذارنا چاہئیے جس کا صلہ اُسے "دوسری دُنیا" میں ملے گا۔ دیندار کا کام یہ ہے کہ وہ محنت و مشقت سے ایک ایسی دُنیا میں "اکل حلال" پیدا کرے، جہاں اکل حلال پیدا کرنا ناممکن بنا دیا گیا ہے، روکھی پھیکی غذا کھائے، موٹا جھوٹا کپڑا پہنے، اُن گڑھے جوڑ مکانوں میں رہے اور اگر بہت زیادہ دیندار بننا چاہے تو انسانی بستیوں کو چھوڑ کر جنگلوں اور بیابانوں میں نکل جائے، پہاڑ کے غاروں میں رہے، درخت کی پتیاں کھائے یا بھیک مانگ کر گذر کرے —— اگر کچھ مِل جائے تو کھالے، نہ ملے تو بھوکا سو رہے۔

دنیا و دین کی یہ تقسیم اتنی عام تھی کہ دنیا کا کوئی گوشہ اس سے بچا ہوا نہ تھا دُنیا میں مذہب بہت سے تھے اور بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے زبردست اختلاف بھی رکھتے تھے، کوئی بت پوجتا تھا، کوئی بت توڑتا تھا، کوئی آگ کو خدا مانتا تھا، کوئی اُسے خدا کی پیدا کی ہوئی ایک حقیر چیز سمجھتا تھا: غرض مذہبی عقائد میں بڑے بڑے اختلاف تھے، لیکن دنیا و دین کی اس تقسیم میں سب مذہب، سب انسان اور ساری خدائی متحد تھی اور متحد کیسے نہ ہوتی؟ دنیا کی اصل تقسیم تو اہلیت و قابلیت کی تقسیم ہے جو ساری دُنیا میں ایک ہی طرح پھیلی ہوئی ہے، اس لئے قدرتاً قابلی گروہ نے اپنی مشترک اغراض و مفاد کو برقرار رکھنے کے لئے ساری دنیا میں ایک ہی قسم کے خیالات کو پھیلا رکھا تھا، ہندوستان ہو یا چین، ایران ہو یا عرب، یورپ ہو یا افریقہ سب جگہ دینداری کا نقطۂ کمال سنیاس، بن باس، بھکتا، ترک دنیا، گوشہ نشینی، اور رہبانیت کو قرار دیا گیا تھا اور دنیا کی لذتوں سے فائدہ اٹھانے کو دینداری کے خلاف ٹھہرایا گیا تھا۔

مگر قابلی دانش فروشوں کی فسونکاری و شعبدہ طرازی سے یہ خیال دُنیا میں عام تو ہو گیا۔ لیکن چونکہ فطرت کا اقتضا یہ نہ تھا، اس لئے اس کے تباہ کن نتائج نے دُنیا کے

پورے نظام میں عفونت پیدا کر دی۔ آپ عقل و دانش سے یہ تو منوا نا سکتے ہیں کہ خاک پھانکنا اور ریت میں لوٹنا روح کی بلندی کا بہترین وسیلہ ہے، لیکن خاک پھانکنے اور ریت میں لوٹنے سے صحت و تندرستی پر جو اثر پڑے گا، نظام جسمانی میں جو تباہی آئے گی اور اس تباہی سے دل و دماغ میں جو ابتری پیدا ہوگی اُسے آپ نہیں روک سکتے

چنانچہ یہی ہوا کہ رہبانیت اور سنیاس کے خیالات نے عوام کو بھوکوں مرنا تو سکھا دیا لیکن چونکہ قدرت نے انسان کے جسمانی نظام کو غذا سے بے نیاز نہیں بنایا تھا، اس لئے افلاس و فاقہ کشی کے ساتھ بیماری اور بیماری کے ساتھ خیالات میں پستی، اوہام پرستی، ضعیف الاعتقادی، غلامی و بے چارگی بھی آگئی۔ اِس غلامی و بے چارگی کو اچھا جامہ پہنانے کے لئے صبر و رضا، تسلیم و توکل اور قناعت و استغنا کے الفاظ کو استعمال کیا گیا، مگر الفاظ سے کہیں پیٹ بھرتا ہے؟ اس لئے دین و دُنیا کے اس فلسفے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ دینداری یا تو راہبوں اور سنیاسیوں کا حصہ ہو کر رہ گئی اور یا اُن مجبوروں اور معذوروں کا جو مصیبت پر صبر نہ کریں تو کیا کریں؟ لیکن ایسا صبر چونکہ اقتضائے فطرت کے خلاف ہے اس لئے جب بھی موقعہ ملے مکر، فریب، جعلسازی، دروغ بافی، ایمان فروشی، غرض ہر ممکن طریقے سے زندگی کی ضروریات حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہر انسان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی۔

جسم و روح کا تعلق

یہ ٹھیک ہے کہ انسان صرف کھانے پینے اور عیش و آرام کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا، اس کے برعکس اس کی زندگی کا مقصد خدا شناسی اور خدا شناسی کے بعد خدا رسی ہے، لیکن اس خدا شناسی اور خدا رسی کا راستہ جسم سے ہو کر گزرتا ہے، اس لئے اگر جسم کی ضروری پرورش اور فطری نگہداشت نہ کی جائے تو سارا مقصد فوت ہو جائے گا ——— کون نہیں جانتا کہ تندور کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اس میں روٹی پکائی جائے، لیکن کیا بغیر ایندھن

ڈالے آپ یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں یا کیا خراب ایندھن ڈالنے کے بعد آپ اس سے اچھی روٹی حاصل کر سکتے ہیں؟ موٹر کا مقصد پٹرول جلانا نہیں اور نہ ریلوے انجن کا مقصد کوئلہ پھونکنا ہے، لیکن کیا پٹرول جلائے یا کوئلہ پھونکے بغیر آپ موٹر اور انجن کو حرکت میں لا سکتے ہیں؟ یا آپ یہ کر سکتے ہیں کہ بُرا پٹرول اور بُرا کوئلہ استعمال کریں اور پھر بھی آپ کی سواری کی رفتار اچھی ہو؟ اگر یہ چیزیں ناممکن ہیں تو بھوک کے مارے اور بیماری کے ستائے انسانوں سے بھی آپ بلند دماغی اور صحیح الفکری کی توقع نہیں کر سکتے ——— پھر جانتے ہو کہ جس طرح ایک موٹر کی ٹھیک رفتاری کے لئے اچھے پٹرول کی ضرورت ہے اور جس طرح ایک انجن کی تیز رفتاری کے لئے بجلی یا کوئلہ کی احتیاج ہے، اسی طرح انسانی دل و دماغ کو منشائے قدرت کے مطابق بلند پروازی کرنے اور اعلیٰ تخیلات سے مالامال ہونے کے لئے کس ایندھن کی ضرورت ہے، علم الانسان کے تمام ماہروں کا اس پر اتفاق ہے کہ انسان کے دل و دماغ کو فطرت کی منشا کے مطابق تندرست و توانا رکھنے کے لئے صرف جَو کی روٹی یا جوار کا دلیہ کافی نہیں ہے اور نہ یہ کافی ہے کہ وہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں اینٹ کے تکیئے پر سر رکھ کر سو جائے۔ اس کے برعکس اس کے لئے صاف اور کھلی ہوا، صاف پانی، ہوادار مکان اور ایسی مناسب غذا کی ضرورت ہے جس میں شکریت بھی ہو دُھنیت بھی ہو، وٹامن بھی ہوں اور پروٹین بھی ہو ——— اگر ان میں سے کسی ایک کی بھی کمی ہے تو انسانی صحت منشائے قدرت کے مطابق نہیں ہو سکتی اور جب انسانی صحت بگڑی تو دل و دماغ کا سارا نظام غارت ہوا۔

قدرت سراپا حُسن ہے اس لئے اس کا ہر مظہر حسین ہے۔ قدرت سانپ کے بچے کو بھی حسین بنا کر پیدا کرتی ہے اور بچھو کی ساخت میں بھی حُسن و زیبائش کو مدنظر رکھتی ہے، غلاظت میں رینگنے والے کیڑے کو بھی اگر دیکھو گے تو اس کے رنگ و روغن

میں تمہیں حُسن نظر آئے گا ——— پھر کیا جو فطرت ہر چیز میں حسن دیکھنا چاہتی ہے، اُس کا اقتضاء یہ ہو سکتا ہے کہ انسان جو مخلوقات میں سب سے افضل و اشرف کہا جاتا ہے، اپنے حُسن کو غارت کر دے، افلاس و فاقہ کشی سے، بیماری و تنگدستی سے اور بے جا ریاضت و محنت کشی سے؟ کیا فطرت جو سانپ کے بچے میں بھی حسن دیکھنا چاہتی ہے وہ انسان کے بچے کے لئے یہ تجویز کر سکتی ہے کہ پہلے وہ اپنے جسم کو توڑ مروڑ کر ستیاناس کرلے، خود کو زشت منظر اور بھیانک بنالے اور پھر کہیں جا کر اس کی روح کو نجات ملے ———؟

اس سوال کا جواب کتنا صاف اور کتنا سادہ ہے، مگر قابیلی سحر طرازی کا یہ کرشمہ قابلِ دید ہے کہ اس کے باوجود بھی انسانی جمِ غفیر دھوکے میں مبتلا ہے۔

غلامانہ فلسفہ اخلاق کی تبدیلی

دین و دنیا کی اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہے کہ دُنیا کے جس مذہب کی بھی فلسفۂ اخلاق کو اُٹھا کر آپ دیکھیں گے، یہ محسوس کریں گے کہ غلامی و بے چارگی، مفلسی و فاقہ کشی اور ذلت و دنائت کو برداشت کرنے کی ایک غلام ساز تعلیم ہے جس کی مدد سے کمزوروں محتاجوں اور غلاموں کو اپنی کمزوری، محتاجی اور غلامی پر ناز کرنا سکھایا گیا ہے۔

جرمنی کا مشہور فلسفی نیٹشے اسی بناء پر عیسائی فلسفۂ اخلاق کو غلامانہ سمجھتا ہے جو انسان کی قوتِ ارادی کو برباد کر دیتا ہے اور قوائے عمل کو مفلوج بنا کے رکھ دیتا ہے۔

لیکن عیسائیت ہی پر کیا منحصر ہے، دُنیا کے ہر مذہبی نظام پر قابیلی اغراض پروری نے غلامانہ فلسفے کا یہی رنگ چڑھا دیا ہے ——— ایسی حالت میں انسانیت کی سب سے بڑی پکار اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی کہ اُسے اس غلامی و بے چارگی اور اِس ذلّت و دنائت سے نکالا جائے اور انسان کو منشائے قدرت کے مطابق زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ انقلابِ اسلام انسانیت کی اسی پکار

کا جواب تھا۔ داعی اسلام نے انسان کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ انسانی ترقی بیمار رہنے اور خود کو پژمردہ و افسردہ بنا لینے میں نہیں ہے، بلکہ زندگی کی لذّتوں سے منشائے فطرت کے مطابق فائدہ اٹھانے میں ہے لیکن چونکہ اس مقصد کے حصول میں قابیلی نظام سدِّ راہ تھا اس لئے ضروری تھا کہ اس نظام کو توڑنے کے لئے انسانوں کا جمِ غفیر قوت و طاقت کا استعمال کرنا سیکھے تاکہ قابیلی نظام کے مقابلے میں ایک منصفانہ نظام دنیا میں قائم ہو سکے اور قائم ہونے کے بعد باقی رکھا جا سکے۔ اسی لئے قرآن نے صاف لفظوں میں کہا، "خدا نے داعی اسلام کو اس لئے بھیجا ہے تاکہ حق و صداقت کا نظام تمام دوسرے نظاموں پر غالب آ جائے، خواہ مُفسد لوگ اسے پسند کریں یا نہ کریں۔"[۱]

اسلام نے دین و دُنیا کے پرانے عقیدے کے مقابلے میں اس عقیدے سے دُنیا کو روشناس کیا کہ منشائے فطرت کے مطابق دُنیا سے فائدہ اُٹھانا عین دین ہے اور منشائے فطرت کے خلاف خود کو نحیف و نزار رکھنا دین کے سراسر منافی ہے۔ اسلام دُنیا کی پہلی وہ مؤثر آواز ہے جس نے افلاس و فاقہ کشی کو زندگی کا اعلیٰ معیار قرار نہیں دیا بلکہ صاف صاف لفظوں میں کہا:۔ روئے زمین پر جتنی حلال و طیب چیزیں ہیں اُن سے خوب جی بھر کر فائدہ اٹھاؤ، البتہ شیطانی طریقوں سے دوسروں کا حق مارنے کی کوشش نہ کرو۔[۲] خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے، اُسے خوب کھاؤ۔[۳] زمین کی پیداوار سے لطف اندوز ہونے سے تمہیں کوئی نہیں روکتا بشرطیکہ تم نیکی کی راہ سے نہ ہٹو۔[۴] تمام لطیف و دل پسند چیزیں تمہارے لئے حلال ہیں

---

[۱] الصف ع ۹

[۲] بقرہ، ع ۲۱

[۳] مائدہ ع ۱۲

[۴] المنون ع ۱۹

ہاں گندی اور ناپاک چیزوں سے پرہیز کرو۔ [۵۴]

چنانچہ داعی اسلام نے ایسی ریاضتوں اور عبادتوں کی اجازت نہ دی جو انسانی صحت وعافیت کے لئے نقصان رساں ہیں حتی کہ صوم دوام اور صوم وصال تک کو ممنوع قرار دیا گیا، گوشہ نشینی اور ترک دُنیا کے بجائے زراعت وتجارت میں مصروف ہونے اور جہاد وغزوات کے لئے خود کو تیار کرنے کی تعلیم دی گئی۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ انقلابِ اسلام کے سو ڈیڑھ سو سال بعد تک مسلمانوں میں کوئی خانقاہ نہ بن سکی جہاں پیر ومرشد گوشہ نشین ہو کر صرف "دینداری" کے لئے اپنی زندگی وقف کرتے ہیں۔ [۵۵]

داعی اسلام نے ایک فلسفی یا صوفی کی طرح صرف اپنے پیغام کی زبانی اشاعت ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ ایک باکمال جنرل کی طرح اس پیغام کو عملی جامہ پہنانے اور دُنیا کے پرانے نظام کو بدل ڈالنے کے لئے قابلیت کے خلاف میدان عمل میں بھی اُترے اور پھر ایک باہمت مدبر سیاست کی طرح انسانی فلاح کے نئے پیغام کو نافذ کرنے کے لئے حکمرانی و فرمانروائی کے تعمیری فرائض بھی انجام دیئے۔

در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند، جام و سنداں باختن

اسلام نے جنگ کا نام جہاد کیوں رکھا؟

داعیِ اسلام سے پہلے جو انبیاء، واولیاء اور ہادی و مصلح آئے انہوں نے اپنا جہاد صرف خیالات کی دُنیا تک محدود رکھا۔ عملی دُنیا میں جو نظامِ زندگی نافذ تھا اُس سے براہ راست دبلا واسطہ کوئی مقابلہ نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے پیغام

---

[۵۴] اعراف ع ۱۹

[۵۵] الاسلام والحضارۃ العربیہ وتاریخ ادبیاتِ عرب از پروفیسر نکلسن

کی اشاعت صرف ہابیل کی پست و زبوں حال نسل تک محدود رہی ——— اور وہ بھی انتہائی مسخ شدہ صورت میں ——— اور قابیلی گروہ نے من حیث المجموع اُن کے پیغام کو یا تو ناقابل التفات سمجھا اور یا اُسے ایک ناممکن الحصول آئڈیل قرار دے کر ناقابل عمل ٹھہرایا ——— لیکن انقلابِ اسلام نے دُنیا کو تبلایا کہ جب تک دین و دُنیا، مذہب و سیاست، حکومت و عبادت، دھرم اور راج نیتی اور چرچ اور اسٹیٹ کو ایک نہ کیا جائے گا، انسانی نجات ناممکن ہی۔ چنانچہ قابیلی گروہ کے مظالم کو غلاموں کی طرح برداشت کرنے اور ذلت و بے چارگی کو قناعت و تسلیم کے پردے میں چھپانے کے بجائے انسانوں کو تلوار اٹھانے کی تلقین کی گئی۔ اور یہ آواز بلند کی گئی کہ قابیلی گروہ کو جہاں کہیں پاؤ، اس کا مقابلہ کرو، اُسے پکڑو، گھیرو اور اُس کی تاک میں بیٹھو۔[۱] لیکن اس جد وجہد کا نام جنگ و حرب نہیں بلکہ جہاد رکھا گیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ جنگ و حرب جیسے الفاظ سے ذہن میں وہی مفہوم آتا تھا جو قابیلی گروہ کی جنگوں کا تھا۔ یعنی ایک مخصوص جماعت کے مفاد کی خاطر انسانی خون کو پانی کی طرح بہایا جائے اور فتح حاصل کرنے کے لئے حق و ناحق منصفانہ و غیر منصفانہ اور اچھے بُرے تمام ذریعے استعمال کئے جائیں۔ انگریزی کی مشہور ضرب المثل ہی کہ "عشق اور جنگ میں سب کچھ روا ہی"۔ اسی طرح عربی میں یہ مقولہ مشہور ہی کہ "جنگ مکر و فریب کا دوسرا نام ہی" لیکن انقلاب اسلام کی جنگ میں نہ تو "سب کچھ روا" تھا اور نہ وہ "مکر و فریب کا دوسرا نام" تھی۔ اس کے برعکس اس جنگ کا مقصد یہ تھا کہ خُدا کی مخلوق پر امن و عافیت کے جو دروازے بند کر دیئے گئے ہیں انھیں کھول دیا جائے۔ اس لئے انقلابِ اسلام کی جنگ اور قابیلی جنگ میں مقصد اور طریق عمل

---

[۱] توبہ ع

دونوں کا اختلاف تھا۔ قابیلی جنگ کا مقصد ایک مخصوص طبقے کے ذاتی مفاد تک محدود تھا۔ لیکن انقلاب اسلام کی جنگ کا مقصد انسانیت کی عام فلاح و بہبود کے سوا اور کچھ نہ تھا —— قابیلی جنگ کے طریقِ عمل میں سب کچھ روا تھا، مخالف پر فتح حاصل کرنے کے لئے مکر و فریب، دغابازی و جعل سازی، دروغ بافی و عہد شکنی بے دریغ قتل و غارت گری اور وحشیانہ لوٹ مار سب کی اجازت تھی۔ لیکن انقلاب اسلام کی جنگ کا طریقِ عمل یہ نہ تھا۔ اس میں ہر فوجی کمانڈر کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ لاتغدروا ولاتمثلوا ولا تقتلوا ولیدا - خبردار! کبھی بدعہدی و دغا بازی نہ کرنا، دشمنوں کو رسوا کرنے کے خیال سے کبھی کسی کے ناک کان نہ کاٹنا، اور بچوں کو قتل نہ کرنا، علاوہ ازیں ہر فتح کے موقع پر یہ اعلان ہوتا تھا کہ الامان علی انفسہم واموالہم وملتہم وشرائعہم ہر شخص کی جان، مال، مذہب اور شریعت (پرسنل لا) کی حفاظت کی ضمانت کی جاتی ہے —— اس لئے قدرتاً یہ جنگ، دُنیا کے عام مفہوم کے اعتبار سے جنگ نہ تھی، اسی بنا پر انقلابِ اسلام کی اصطلاح میں اس کا نام جہاد رکھا گیا، جس کے معنی دراصل جدوجہد کرنے کے ہیں، ایسی جدوجہد جس میں قوت و طاقت کے مقابلے میں قوت و طاقت استعمال کی جائے اور تشدد کا جواب تشدد سے دیا جائے۔

پھر جہاد کا مقصد صرف تخریبی نہ تھا، یعنی صرف یہی نہیں کہ قابیلیت کی قوت کو توڑ دیا جائے اور بس۔ بلکہ اس تخریب کے ساتھ تعمیری پہلو بھی اس میں داخل تھا یعنی ایک طرف تو ایک نظام کو توڑا جائے، اور دوسری طرف اس کی جگہ پر ایک بہتر نظام قائم کیا جائے۔ اسی لئے داعیٔ اسلام نے سلطنت و فرمانروائی کے فرائض بھی سرانجام دیئے اور یہی عمل آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشینوں کا رہا۔

تنظیم اور ڈسپلن

جماعتی طاقت کے سب سے بڑے سرچشمے دو ہیں، اتحاد اور تنظیم اور نظم وضبط یا ڈسپلن۔ اسلام نے اس پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ حتیٰ کہ اس پیام انقلاب کا نام ہی "اسلام" رکھا گیا کہ اسلام کے معنی ہیں "اطاعت کے لئے گردن جھکا دینا"۔ عبادت کے جو طریقے تجویز کئے گئے اُن میں بھی اس اصول کی زبردست رعایت تھی۔ نماز میں اتحاد وتنظیم اور ڈسپلن دونوں ہیں۔ جو انسان مقتدیوں کی طرح اپنے امام کے اشاروں پر عمل کرنے کے عادی ہو جائیں اُن کے اتحاد اور ڈسپلن کا مقابلہ کون کر سکتا ہے اور ان میں اور ایک بہترین تربیت یافتہ فوج میں کیا فرق ہو سکتا ہے ——؟

اسی ڈسپلن اور اتحاد کے لئے یہ تعلیم دی گئی کہ —— "صرف خدا اور رسول ہی کی اطاعت کافی نہیں ہے بلکہ تم پر اپنے اُس سردار کی اطاعت بھی واجب ہے جو تم میں سے ہو[1]" "تم میں سے ہو" کا مطلب یہ ہے کہ جو انقلاب اسلام کے نصب العین پر یقین رکھتا ہو اور جس کا عمل داعیٔ انقلاب کے عمل کے مطابق ہو نیز ارشاد ہوا "تم سب خدا کی رسی کو اکٹھے ہو کر تھامے رہو اور اپنی تنظیم کو منتشر نہ ہونے دو[2]"۔

داعیٔ اسلام نے نظم وضبط اور تنظیم واتحاد کو جو اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ آپ کا ارشاد ہے "اگر کسی لق ودق میدان میں تین مسلمان بھی اکٹھے ہو جائیں تو وہاں بھی اُنھیں تنظیم واطاعت کے جماعتی اصول سے غافل نہ رہنا چاہیئے، اور ان پر لازم ہے کہ تین میں سے کسی ایک کو اپنا امیر منتخب کریں اور باقی دو اس کی اطاعت

---

[1] سورۂ نساء۔ رکوع ۸

[2] سورۂ آلِ عمران۔ رکوع ۱۱

کریں۔[۱]"

لیکن اس سے بھی زیادہ واضح ہدایت یہ ہے کہ:۔ اجتماع و تنظیم کے بغیر اسلام نہیں، اور امیر کے بغیر کوئی اجتماع و تنظیم، اجتماع و تنظیم نہیں اور اطاعت (ڈسپلن) کے بغیر کوئی امیر، امیر نہیں۔[۲]

چنانچہ دعوتِ اسلام کو قبول کرنے والوں کو آپ نے صاف لفظوں میں متنبہ کیا ہے "۔۔۔۔۔ جس شخص نے اسلامی تنظیم کے اصولِ اطاعت (ڈسپلن) کو ماننے سے انکار کیا اور اسلام کی تنظیم سے علیحدہ ہو گیا، وہ کفر کی موت مرے گا۔[۳]"

ان ارشادات کا صاف مطلب یہ ہے کہ داعی اسلام نے اسلام کو صرف انفرادی اصلاح تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے پوری ہئیتِ انسانیہ کی جماعتی و معاشرتی زندگی پر حاوی کرنے کی کوشش کی۔

اگر داعی اسلام بھی گوتم بدھ یا عیسیٰ مسیح کی طرح صرف ایک صوفی و فلسفی ہی کی حیثیت سے اپنے پیغام کا پرچار کرتے رہتے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ وہی جو بدھ مت یا عیسائیت کا ہوا، یعنی قابیلی ذہنیت اپنے پرانے دستور کے مطابق اس کو بھی اپنے مقصد کے مطابق بنا لیتی اور انسانیت کا مرض بدستور لاعلاج بنا رہتا۔ چنانچہ قابیلی ذہنیت کے ترجمانوں نے داعیِ اسلام کو بھی یہی پیشکش کی تھی کہ وہ ایک صوفی یا فلسفی کی طرح کسی گوشے میں بیٹھ کر اگر چاہیں تو اپنے خیالات کی اشاعت کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ان خیالات کا تعلق صرف اخلاق کی درستی سے ہو، معاشرت یا سیاست کے نظام سے کوئی تعرض نہ کیا جائے

---

[۱] مسند احمد و مشکوۃ باب الامارہ

[۲] جامع ابن عبداللہ صفحہ ۶۲

[۳] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۲۸

لیکن داعی اسلام نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کیا اور یہ اعلان کیا کہ دُنیا کی حقیقی نجات صرف اسی میں ہے کہ بادشاہوں کے سر سے تاج اتار لئے جائیں، اُن کے تخت چھین لئے جائیں اور ان کی بنائی ہوئی غرضمندانہ سیاست کو مٹا دیا جائے اور اس کے بجائے اسلام کے انقلابی پیغام کے مطابق دنیا کو سیاست وحکومت اور معاشرت ومعیشت کے ایک نئے نقشے سے روشناس کیا جائے، تاکہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور امیر وغریب کا غیر فطری تقابل وتفاوت ختم ہو، ہر شخص کو اپنی محنت کا مناسب صلہ ملے اور خدا کی مخلوق امن واطمینان سے اُس مقصدِ عظیم کو حاصل کرسکے جو انسانی تخلیق کا سبب اوّل ہے۔

اخلاق ونکوکاری کا درس اگر کمزور کی طرف سے دیا جائے تو اس کی تعبیر طاقت وقوت جس طرح چاہتی ہے کر دیتی ہے اس لئے اگر داعیٔ اسلام ایک پیرِ خانقاہ یا ایک صوفیٔ صومعہ کی حیثیت سے اپنے پیغام کو سُناتے تو یقیناً وہ انقلاب کبھی رونما نہ ہوتا جس کے لئے انسانیت تڑپ رہی تھی۔

انبیا واولیا کی سادہ زندگی

لیکن یہاں ایک چیز واضح کر دینے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ دُنیا میں جتنے انبیاء، اولیا، صلحا، مصلح اور ہادی آئے اُن سب کی زندگی نہایت سادہ رہی اور عیش وراحت کے لوازم کو فراہم کرنے کی کوشش انہوں نے کبھی نہ کی۔ خود داعیٔ اسلام کی زندگی کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن انبیاء واولیا کے اس عمل میں اور قابلیت کے اس فلسفے میں کہ دین ودنیا دو جُداگانہ چیزیں ہیں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ انبیا واولیا کا یہ عمل محض اس لئے تھا تاکہ دُنیا کے حقیر سے حقیر اور غریب سے غریب انسان میں عزت وخودداری کے جذبات پیدا کئے جائیں اور وہ دولت وسرمایہ کی تحقیر وہ اس لئے کرتے تھے تاکہ غریب ومحنت کش انسانیت کے دل ودماغ سے حقارت وذلت کا احساس مٹائیں۔ وہ

عیش وراحت کی نعمت کو چند نفوس کیلئے نہیں بلکہ کل انسانیت کے لئے چاہتے تھے۔ اس لئے جب کہ دنیا کی ننانوے فی صدی آبادی افلاس وفاقہ کشی کی زندگی گزار رہی ہو، ایک دردمند انسان کے لئے یہ کیسے روا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے چاروں طرف عیش وراحت کے لوازم اکٹھے کرے —— اگر ساری دُنیا کے لئے ریشم وکمخواب میسر نہیں آسکتا تو بلاشبہ ریشم وکمخواب ہر انسان پر حرام ہے، اگر ساری دُنیا کے لئے مرغ وماہی فراہم نہیں ہو سکتے، تو چند آدمیوں کے لئے بھی نہ ہونے چاہئیں، اگر یہ ممکن نہیں کہ ساری دُنیا کے لئے عالیشان محل بنائے جا سکیں تو پھر چند نفوس بھی اپنے لئے محل نہیں بنوا سکتے۔ —— یہ ہے وہ اصول جو ہر اُس انسان کے پیش نظر ہونا چاہیے، جس کے دل ودماغ پر ابلیسیت نے قبضہ نہیں پایا اور جو اپنے وجود کو دنیائے انسانیت سے جُدا کوئی چیز نہیں سمجھتا۔

اسی اصول کی بنیاد پر انبیا واولیا نے غریب ترین انسان کی زندگی بسر کرنے کو پسند کیا ہے اور یہی اصول داعی اسلام کی سادہ زندگی میں پنہاں تھا —— اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ روئے زمین کی دولت صرف "دُنیا داروں" کا حصہ بنا دی گئی ہے اور "دیندار" کی تقدیر میں "نفس کشی" کے نام پر صرف افلاس وتباہ حالی لکھی گئی ہے۔ اسکے برعکس اس کا مطلب دولت کی نامنصفانہ تقسیم کو مٹانے کے لئے سوسائٹی کے نچلے طبقے میں ہمت وحوصلہ پیدا کرنا تھا۔ یہ دُنیا جس میں ابلیسیت کا چیلنج ہر وقت ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے، صرف خاموش احتجاج یا چند نفوس کی عملی مثال سے کوئی اثر نہیں لیتی، اگر ابلیسیت کی طاقت کو طاقت سے نہ دبایا جائے تو پھر سارے درس فضول ہیں —— اس لئے داعیٔ اسلام نے عوام کی سی سادہ زندگی اس لئے بسر نہیں کی کہ وہ دیوجانس کلبی یا ہٹوئنک فلاسفہ کی طرح خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں سے دُنیا کو متنفر کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ مقصد صرف یہ تھا کہ اس طرح پست وزبوں حال طبقات سے براہ راست رابطہ پیدا کر کے ان میں قابلی

طاقتوں کے خلاف صف آرا ہونے کا عزم و ولولہ پیدا کریں۔ اور دُنیا کو یہ بتائیں کہ طاقت کا سرچشمہ مال و دولت یا قصر و ایوان نہیں ہیں بلکہ اصلی طاقت دل کی وہ طاقت ہے جو حق کے نام سے پیدا ہوتی ہے۔

چنانچہ داعیٔ اسلام نے دنیا کو جو "درس انقلاب" دیا اس کو مختصر الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں:-

(۱) دین و دُنیا دو مخالف و متضاد چیزیں نہیں ہیں بلکہ دونوں یا تو ایک ہی ہیں یا ایک دوسرے کو امداد پہنچانے والی ہیں،

(۲) قدرت نے ہر چیز کو حسین بنایا ہے، اس لئے انسانیت کا کمال یہ نہیں ہے کہ فاقہ کشی، ریاضت و محنت اور سنیاس یا تپیا سے صحت و توانائی کو برباد کر کے خود کو بدصورتی و زشت روئی کا ڈھانچہ بنا لیا جائے،

(۳) زمین کی پیداوار سے فائدہ اٹھانا اور خوش حالی و فارغ البالی کی زندگی بسر کرنا خدا شناسی کے منافی نہیں،

(۴) البتہ قابیلی گروہ کی طرح صرف مادّی لذّتوں اور جسمانی آسائشوں ہی کے لئے زندگی کو وقف کر دینا، انسان کی سب سے بڑی گمراہی ہے۔ زندگی کا اصل مقصد خدا شناسی ہے، اس لئے جسم کی ہر پرورش اسی مقصد کے حصول کے لئے ہونی چاہیئے،

(۵) دنیا کی دولت میں ہر انسان برابر کا شریک ہے، اس لئے ہر اُس نظام کے خلاف اعلانِ جہاد کرو جس میں چند افراد نے دولت پر قبضہ کر کے باقی انسانیت کو فاقہ کشی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

(۶) انسانیت کی فلاح کے اس نظام کو دُنیا میں برقرار رکھنے اور قابیلی نظاموں کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت و فرمانروائی کی طاقتوں پر

قبضہ کرو اور قبضہ رکھو۔

(۷) لیکن حکومت وفرمانروائی کی یہ طاقت جس کسی کو سونپی جائے، عام لوگوں کے مشورے سے سونپی جائے اور یہ خیال رہے کہ اگر یہ طاقت کسی وقت بھی حق سے انحراف کرنے لگے اور غلط روی اختیار کرے تو اس کی اطاعت سے انکار کردو، اور اُسے بدل ڈالو لا طاعة فی معصیة الخالق

(۷) دولت پر عوام کا حق — دولت کے ڈھیر جمع کرکے نہ رکھو، کیونکہ جو چیز تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی مخلوق کا حصہ ہے

اس اصول کی بنا پر یہ طے کیا گیا کہ ہر وہ شخص جس کے پاس ایک مقررہ مقدار سے زیادہ دولت ہو وہ اس میں سے ایک مقررہ مقدار ہر سال ایک مرکزی خزانے میں جمع کرے، اس کا شرعی نام زکوٰۃ تھا اور جس مرکزی خزانے میں یہ جمع ہوتی تھی اور جہاں سے پھر رائے عامّہ کے مطابق حسب ضرورت صرف ہوتی تھی اس کا نام بیت المال تھا۔

انقلابِ اسلام کا یہ حکم قابیلی ذہنیت کے لئے اور تمام احکام سے زیادہ سخت تھا۔ زبان سے وہ ہر بات کہنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے اور عقیدہ بھی بدل سکتے تھے۔ لیکن ان کا اصل سوال دولت کا سوال تھا، وہ اپنی دولت میں کسی کو شریک بنانے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ داعیِ انقلاب کی وفات کے بعد سب سے پہلی بغاوت اسی زکوٰۃ کے سوال پر ہوئی، قابیلی ذہنیت نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہم اسلام کا ہر حکم بجالانے کو تیار ہیں، ہم ہر عبادت اور ہر ریاضت کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اپنی دولت میں سے کچھ دینے کے لئے تیار نہیں، مگر داعیٔ انقلاب کے جانشین اوّل حضرت ابوبکرؓ نے اس مطالبے کو ماننے سے صاف انکار کیا۔ اس پر قابیلی ذہنیت کھلم کھلا بغاوت پر آمادہ ہوگئی اور اسلام کے احکام کو

ماننے سے انکار کرنے لگی۔ انقلاب اسلام کے لئے یہ وقت سب سے بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ یہ اس کی موت و زندگی کا سوال تھا۔ اگر یہ قابیلی ذہنیت غلبہ پا لیتی تو پھر اسلام کی تعلیم پر بھی آہستہ آہستہ وہی زنگ چڑھا دیا جاتا جو اب تک دوسری تعلیموں پر چڑھایا جاتا رہا تھا۔ اگر اس وقت داعی انقلاب اسلام کے جانشین خاموش ہو کر بیٹھ جاتے، یا اس مطالبے کے آگے ہتھیار ڈال دیتے تو پھر امیدوں کے وہ تمام شگوفے کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جاتے جن کی مہک کو سونگھنے اور جن کی چمک کو دیکھنے کی دنیا منتظر تھی، ہمارے جناب ابوبکرؓ کا فیصلہ وہی ہوا، جو ہونا چاہئے تھا یعنی اس بغاوت کا مقابلہ کیا گیا، باغیوں کے خلاف اعلان جہاد ہوا اور آخرکار قابیلی ذہنیت کو شکست ہوئی اور انقلاب کا یہ سب سے بڑا اور سب سے اہم اصول تسلیم کر لیا گیا کہ ——— جو دولت انسان کی ضروریات سے سوا ہو، اُس پر قوم کا حق ہو۔

(۸) سود

قرض جو دیا جائے اس پر سود ہرگز نہ لیا جائے، اور نہ کسی چیز کے تبادلے میں اُسی چیز کی زیادہ مقدار وصول کی جائے یعنی اگر کسی کو ایک سیر گیہوں قرض دیا گیا ہو تو یہ معاہدہ نہ کیا جائے کہ جب واپس کرو گے تو ایک سیر کے بجائے سوا سیر یا ڈیڑھ سیر دو گے۔

دولت جمع کرنے کے دو بڑے ذریعے ہیں۔ ایک زمین کی ملکیت اور دوسرے ضروریات زندگی کا لین دین یعنی تجارت۔ لیکن زمین کی ملکیت کا حشر یہ ہوا کہ قابیلی گروہ نے اس کی تقسیم صرف اپنی ٹولی کے مخصوص و معلوم افراد تک محدود کر دی اور باقی ساری دنیا کو محض خدمتگاروں، مزدوروں اور محنت کش انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ یہ محنت کش مخلوق اپنی محنت کی کمائی سے خود فائدہ اُٹھانے کے بجائے اُسے بادشاہوں، وزیروں، امیروں، سرداروں، جاگیرداروں اور

زمینداروں کے قدموں میں لاکر ڈال دینے پر مجبور ہوئی اور پھر ایک بھکاری کی طرح کچھ آذوقۂ حیات حاصل کرنے کے لئے اپنے ان "مفت خور" آقاؤں کے سامنے دامن پھیلا کے کھڑی ہوگئی ——— تجارت کا بھی یہی حشر ہوا۔ ہندوستان میں تو چند مخصوص افراد (ویشیہ طبقے) کے سوا کسی اور کو تجارت کا پیشہ اختیار کرنے کا حق ہی نہ تھا لیکن دنیا کے دوسرے حصوں میں اگرچہ تاجروں اور لین دین کرنے والوں کی کوئی "ذات" نہیں بنائی گئی تھی لیکن عملاً حالت یہی تھی کہ ایک مخصوص و محدود طبقہ تجارت پر قابض تھا۔ زمین کی ملکیت رکھنے والے سرداروں اور تجارت کے سرمایہ داروں کے درمیان ایک اتحاد تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کی امداد کرکے ہابیلی جم غفیر کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے تھے۔ اس لوٹ میں تجارتی کاروبار کرنے والوں کا سب سے بڑا ہتھیار سود تھا۔ اور آج بھی ہے۔ دنیا کے سرمائے پر یہ قابض ہیں لیکن صرف سرمائے سے کیا ہوتا ہے، جب تک اس کے ساتھ محنت و مشقت شامل نہ ہو، خالی روپیہ زمین سے گیہوں نہیں اگا سکتا۔ اس کے لئے ہل چلانے والے ہاتھوں اور رات دن خون پسینہ ایک کرنے والے محنت کش انسانوں کی ضرورت ہے۔ یہ محنت ہابیلی جم غفیر کے حصے میں آئی تھی۔ لیکن اس محنت پر آمادہ کرنے کے لئے اسے کوئی معاوضہ دینا ضرور تھا ورنہ کام کرنے والے کے ہاتھ پاؤں حرکت میں نہ آتے۔ گھوڑے اور گدھے سے کام لینے کے لئے بھی اسے چارہ دینا ضروری ہے۔ لیکن محنت کا معاوضہ اگر اتنا ہی دیا جائے جتنا کہ حق ہے تو پھر قابیلی گروہ کی دنیائے عیش ختم ہوتی ہے اور ہابیل کو بہت کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ اصول مقرر کیا گیا کہ سرمایہ رکھنے والے قابیل ان محنت کش ہابیلوں کو کچھ ضروری سرمایہ بطور قرض دیدیا کریں تاکہ اس میں سے وہ خرچ کرکے زمین سے پیداوار کریں۔ لیکن جب پیداوار ہوجائے تو جو سرمایہ انھوں نے قرض حاصل کیا ہے اس سے زیادہ واپس کیا کریں۔ مثلاً اگر انھوں نے زمین میں بیج ڈالنے، اپنے بیلوں اور جانوروں کو زندہ رکھنے اور اپنی

زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے دس من غلہ قابیلی گروہ کے کسی خوش نصیب فرد سے لیا ہی تو بونے جوتنے اور کھلیاں کرنے کے بعد ایک معیّنہ وقت کے اندر اندر اُنھیں دس من کے بجائے بیس من یا تیس من یا اس سے بھی زیادہ ادا کرنا پڑے گا۔ پھر اگر پیداوار نہ ہو، برفباری سے کھیتی کا ستیاناس ہو جائے، یا پالے اور اولے سے پیداوار تباہ ہو جائے یا کوئی اور زمینی یا آسمانی آفت اسے برباد کر دے تو کر دے۔ قرض دینے والے کو اس کی کوئی پروا نہیں وہ اپنا قرض مع سود بلکہ سود در سود سمیت پائی پائی سے وصول کئے بغیر نہ رہے گا۔ اور اگر ایک سال میں وصول نہ ہو سکے گا تو بقایا دوسرے سال پر ڈال دے گا، اور دوسرے سال کا بقایا تیسرے سال پر، غرض اس طرح کاشتکار کے گرد ایک ایسا جال تان دے گا جس میں یہ غریب مکھی اور مچھر کی طرح پھنس کر رہ جائے گا اور عمر بھر ہاتھ پاؤں پیٹنے کے باوجود بھی اس سے نجات نہ پا سکے گا۔

سرمایہ داری کا سب سے بڑا ستون

سود کا یہ نظام ہر محنت کش انسان کے لئے غلامی کی دستاویز ہی، پہلے تو غریب کے پاس سے قابیلی گروہ نے سب کچھ چھین لیا۔ اور پھر اس سے کہا کہ ہم تمہیں ایک دیتے ہیں لیکن دو واپس لیں گے، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہی۔ احتیاج انسان کو پاگل بنا دیتی ہی۔ اس لئے یہ شرط قبول کر لی جاتی ہی، لیکن نتیجے میں ثابت ہوتا ہی کہ اس طرح جو روپیہ قرض لیا گیا ہی اس کے معاوضے میں قرض دار نے اپنی پوری زندگی دوسرے کے ہاتھ میں دے دی ہی۔ اس سودی کاروبار کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح زمین کے مالک گھر بیٹھے، محنت و مشقت کرنے والوں کا ہاتھ بٹائے بغیر پڑے پڑے سب کچھ حاصل کرتے رہتے ہیں، اسی طرح سود پر رقم دینے والا کچھ سرمایہ ایک صندوقچی میں بند کر کے گویا۔ خدا کی غریب مخلوق کے آگے چارہ ڈال کر مچھلیوں کی طرح ان کا شکار کرتا رہتا ہی اور ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر محنت و مزدوری کرنے والوں کی تمام پیداوار دونوں ہاتھوں

سے بٹورتا رہتا ہے، اگر آپ کے پاس دس روپے ہیں تو آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں صرف اتنا کیجئے کہ دو چار غریب و محتاج محنت کش افراد کو ڈھونڈھ لیجئے اور ان کو دوگنے، تگنے، بلکہ اگر موقع ہو تو دس گنے اور بیس گنے سود پر کچھ روپیہ قرض دیدیجئے نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک سال گزرنے نہ پائے گا کہ غریبوں کی گاڑھی کمائی کا پیسہ، ایک ایک کرکے آپ کی تھیلی کی طرف دوڑنا شروع ہوگا اور آپ دس کے بجائے کئی سو کے مالک ہوں گے اور اگر یہی دستور چند سال جاری رہا تو آپ کے پاس دولت و سرمایہ کا ڈھیر ہوگا اور انسانوں کے جس جمِ غفیر نے دن کی دھوپ میں تپ تپ کر اور رات کی سردی میں سکڑ سکڑ کر یہ سرمایہ پیدا کیا ہے، وہ سب غلاموں اور بھکاریوں کی طرح آپ کے دروازے کے چاروں طرف کھڑا آپ سے کچھ اور بھیک مانگ رہا ہوگا۔

اس لئے دنیا کی بھلائی اور خدا کی مخلوق کی بہتری کے لئے جو پروگرام بھی بنایا جائے گا اس میں سودخوری کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ چنانچہ انقلابِ اسلام نے انتہائی سختی اور بے حد شدت کے ساتھ اس کی ممانعت کی۔ پھر اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قابیلی گروہ کسی تاویل و تلبیس سے اس ممانعت کے باوجود سودخوری کا کوئی راستہ نکال لے، یہ فیصلہ کیا گیا کہ روپے پیسے ہی کے معاملے میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جتنا دو اتنا ہی واپس لو، بلکہ دوسری چیزوں کے لئے بھی یہی اصول ہے۔ دس من گیہوں دو تو دس من ہی واپس لو۔ یہ نہ ہو کہ تم روپے کے بجائے اب اجناس سے سودخوری شروع کردو۔

سودخوری کا یہ اصول بند کرکے سرمائے کو تجارت و زراعت میں لگانے کے لئے یہ اصول مقرر کیا گیا کہ سرمایہ دار اور محنت کش طبقہ آپس میں یہ سمجھوتہ کرلے کہ روپیہ ہمارا اور محنت تمہاری، اس لئے اس سے جو نفع ہو اس میں ہم دونوں برابر کے

یا کچھ کم و بیش کے شریک ہیں، اسلامی اصطلاح میں اس اصول کا نام "مضاربت" ہے ——— گویا اس طرح سود خوری کے اصول کو اڑا کر اس کے بجائے یہ اصول مقرر کیا گیا کہ سرمایہ دار اور محنت کش افراد دونوں ایک مشترک انجمن سی بنا کر کاروبار کریں اور سرمایہ دار کوئی مقررہ رقم لینا طے نہ کرے بلکہ یہ معاہدہ کرے کہ اس کاروبار میں جو نفع بھی ہوگا اس میں سے اتنا میرا اور اتنا تیرا۔

چونکہ سود خواری قابلی نظام حیات کا سب سے بڑا ستون تھا اس لئے محض معمولی طور سے اس کی ممانعت نہیں کی گئی بلکہ یہ اعلان کیا گیا کہ ——— جو شخص سود لے یا سود دے وہ خدا کے اور خدا کے پیغام پہنچانے والے کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے، اس لئے اُسے خدا اور خدا کے پیغامبر سے جنگ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔[1]

سود کے اس امتناع سے قابلیت کی گویا شہ رگ کٹ گئی۔

(۹) دولت کے ذخائر کا جمع رکھنا

سرمایہ کو جمع رکھنے اور دولت کو ٹھور کر صرف اپنے لئے محفوظ کر لینے کو روکنے کے لئے اسلام نے زکوٰۃ کے اجراء اور سود خوری کے امتناع ہی پر بس نہیں کیا بلکہ عام طور سے روپیہ کو جمع رکھنے کو بھی منع کیا گیا اور روپیہ کو اکٹھا کر کے اُسے اپنے پاس رکھ لینے پر سخت لعنت و نفرین کی گئی، اس قسم کے لوگوں کی نسبت قرآن میں صاف طور سے مذکور ہے کہ "——— جو لوگ سونے چاندی کے ڈھیر اکٹھے کر کے رکھتے ہیں اور خدا کی ہدایات کے مطابق خرچ نہیں کرتے اُنھیں اُس تڑپا دینے والے عذاب کے دن کے لئے تیار رہنا چاہئے جب اُن کا یہ جوڑا ہوا مال و اسباب آگ کی بھٹی کی طرح دہکایا جائے گا اور پھر اس سے ان کی پیشانیاں داغی جائیں گی، اور ان کے جسموں کو جھلسا جائے گا، اور کہا جائے گا کہ یہ ہے

---

[1] قرآن سورہ بقرہ ع ۳۸

وہ مال و دولت جسے تم نے جمع کر کے رکھا تھا۔ اب مزہ چکھو اپنے اس خزانے کا"[1]

قرآن کریم میں اس قسم کی تنبیہیں بکثرت ہیں جن کا صاف مطلب یہ ہے کہ سرمائے کو اکٹھا کر کے مت رکھو، بلکہ اسے گردش دیتے رہو تاکہ وہ دست بدست سب کے ہاتھوں سے گزرتا رہے اور سب کی ضروریات کی تکمیل ہوتی رہے۔ کیونکہ چند افراد کے دولت پر سانپ بن کر بیٹھ جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھانے، پینے کی چیزیں چاہے کتنی ہی زیادہ ہوں، مگر ان کی تقسیم صحیح طور پر نہیں ہو سکتی چنانچہ اس قسم کے لوگوں کو تنبیہ کر کے پکارا گیا اور ان سے کہا گیا کہ ——— تم یہ نہ سمجھو کہ تم نے جو کچھ بٹور رکھا ہے وہ تمہارے لئے کچھ بہتری کا سبب ہوگا۔ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ وہ تمہاری تباہی کا راستہ ہے، یاد رکھو تم جو کچھ جوڑ جوڑ کر رکھ رہے ہو اُسے ایک خوفناک طوق بنا کر یومِ آخر کو تمہاری گردنوں میں ڈالا جائیگا۔ تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ دُنیا کی دولت کے وارث تم ہو، حالانکہ اس کا وارث صرف خدا ہے۔[2]

اسلام میں وراثت کا قانون بھی اسی اصول پر مبنی ہے یعنی ہندو مت یا عیسائیت وغیرہ کی طرح اسلام، مرنے والے کی دولت کا مالک صرف بڑی اولاد کو یا اولادِ ذکور کو نہیں بناتا بلکہ تمام عزیزوں کو بلا تفریقِ مرد و زن، اس کا حقدار بناتا ہے۔[3]

(۱۰) شراب نوشی

دولت مند کا سب سے زیادہ دلچسپ و پُر کیف مشغلہ شراب نوشی ہے۔ شراب اور عیش ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جو شراب نہیں پیتا اُس

---

[1] قرآن: سورۂ توبہ

[2] قرآن: سورۂ بقرہ۔ ع ۲۸

[3] حقیقت یہ ہے کہ وراثت کا یہ اصول حد سے بڑھی ہوئی سرمایہ داری کے حق میں سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم سرمایہ دار و رؤسا نے اس قانونِ شریعت کو نظر انداز کر کے "رواجی قانون" کی پناہ ڈھونڈی ہے۔

کا عیش آدھی سی بھی کم رہ جاتا ہے۔ انسان کام کرنے اور محنت و مشقت سے روزی کمانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے بیکار بیٹھے رہنا اور ہاتھ پاؤں توڑ کر نکما بن کر، ندوں اور سہریوں پر پڑا رہنا فطرت کے خلاف ہے۔ اس خلافِ فطرت کام میں، شراب سب سے بڑی مددگار ہے۔ آپ ایک گھنٹے بھی بیکار نہیں بیٹھ سکتے لیکن شراب کی مدد سے آپ پوری زندگی بیکار رہ کر گزار سکتے ہیں۔ پھر شراب نوشی اور زناکاری، شراب نوشی اور فتنہ جوئی اور شراب نوشی اور عربدہ پردازی کا جوڑ ہے۔ شراب پی لیجئے، اور پھر تمام بلند تصورات سے آپ کا دماغ خالی ہو جائے گا۔ اب آپ کا دل کیا چاہے گا؟ صرف یہ کہ ایک مہوش ساقی ہو، کنار آبجو ہو، سبزہ زار نغمہ وموسیقی ہو، بزم لطف ونشاط ہو اور آپ کا ایک ہاتھ ساقی مہوش کی گردن میں حمائل ہو اور دوسرا ہاتھ صراحی ومینا کے گرد ہو۔ پھر کبھی آپ مست و بیخود ہو کر ناچنے لگیں گے کبھی وجد و سرمستی سے پاکوبی کریں گے اور ہاتھ مٹکائیں گے۔ کبھی ساقی مہوش کی مدھ بھری نگاہوں میں کھو جائیں گے اور کبھی اس کی مہوشی پر پروانہ کی طرح نثار ہوں گے اور قمری کی طرح کو کو کریں گے۔ غرض شراب کے بعد ساری زندگی آپ کے لئے ایک کھیل بن کر رہ جائے گی اور آپ بچوں کی نظر سے ہر چیز کو دیکھیں گے، اور ہر سنجیدہ اور اہم مسئلہ کو "دفتر بے معنی" قرار دے کر "مئے ناب" کے حوض میں غرق کر دیں گے آپ کتنے ہی سنجیدہ مزاج ہوں، لیکن شراب آپ کو تنک مزاج بھی بنا دے گی اور تنک ظرف بھی، ذرا کوئی بات آپ کی مرضی کے خلاف ہوئی اور آپ کے غصے کا پارہ آسمان پر پہنچا، ہمت وجرأت شراب کے پہلے گھونٹ ہی کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہے۔ شرابی صرف غصہ کر سکتا ہے لیکن کسی پر غالب نہیں آسکتا، وہ غصہ کرنے کے بعد صرف پٹے گا۔ البتہ اس پٹنے کی تکلیف اُسے اس وقت معلوم ہوگی جب نشہ ہرن ہو چکا ہوگا۔

غرض حقیقت یہ ہے کہ شراب تمام برائیوں کی جڑ اور تمام خبائث کی ماں ہے روس کے مشہور صوفیانہ فلسفی ٹالسائی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ اگر دنیا میں شراب نہ ہوتی تو معصیت وگنہگاری کے دروازے کی کنجی کبھی کسی کو ہاتھ نہ آتی۔ ابلیس نے بہت کوشش کی کہ انسان کو اپنے

دام میں پھانسنے لیکن کامیابی نہ ہوتی تھی۔ آخر کار اُس نے شراب بنائی اور انسان کو پلائی۔ شراب کا پلانا تھا کہ انسان نے اپنی عقل و فراست، ابلیسیت کی دکان پر رہن رکھ دی ابلیست نے یہ دیکھا اور خوشی سے ناچنے لگی اور چلّا اٹھی کہ جب تک شراب ہی، اُس وقت تک دنیا میں ابلیسیت کا مقابلہ انسان سے ممکن نہیں[1]۔

اس لئے اسلام کے داعی انقلاب نے اعلان کیا کہ نہ صرف شراب پینے کی ممانعت ہی بلکہ شراب کو چھونا، اُسے ہاتھ لگانا، اور اس کو خارجی طور سے استعمال کرنا بھی ممنوع ہی، شراب حرام ہی نہیں گندی اور غلیظ بھی ہی۔ اور تم جس طرح غلاظت کے ڈھیر سے بچتے ہو، اسی طرح شراب کے قطروں اور چھینٹوں سے بھی اپنے جسم کو بچاؤ۔" شراب ایک گندی چیز ہی اور ابلیسیت اس میں پنہاں ہی۔ اس لئے اس سے دور رہو۔ ابلیس چاہتا ہی کہ شراب پلا کر انسانوں کے درمیان پھوٹ اور نفرت کا بیج بودے اور تم کو خدا کی یاد اور خدا شناسی کی طلب سے روک دے[2]۔

شراب کی طلب دنیا کی ہر طلب سے زیادہ طاقتور ہی، اس کی ترغیب اتنی زبردست ترغیب ہی کہ بڑے سے بڑے عزم و ارادہ کو پھسلا دیتی ہی اور اس کی کیفیت و سرمستی اتنی عیش پرور و عیش انگیز ہی کہ اس کا مقابلہ کوئی اور چیز نہیں کر سکتی۔ جس نے ایک بار اس کی لذت چکھ لی، وہ عمر بھر اس کا بندہ بن گیا کہ —————— "چھٹتی نہیں ہی منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"۔

اس لئے اس کے خلاف جہاد کرنا، بڑی مشکل اور سخت کٹھن بات تھی، اسی لئے

---

[1] ٹالسائی نے اپنے ایک بلند پایہ ڈرامے The First Distiller میں شراب کے اس ام الجرائم ہونے کی حیثیت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہی۔

[2] سورۃ المائدہ۔ رکوع ۱۲

اسے نہ صرف حرام قرار دیا گیا بلکہ اس کی نجاست اور گندگی کا بھی اعلان ہوا کہ نہ کمبخت کبھی نظر کے سامنے آئے گی اور نہ اس کی ترغیب انسان کو ورغلائے گی، ورنہ انسانی فطرت سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ پینے سے باز رہتا لیکن کم از کم بدن پر ٹپکنے، سر پر مالش کرنے یا اس کی بو سونگھنے ہی کے بہانے اس سے قربت حاصل کر لیتا، چور چوری سے جائے لیکن ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جام و مینا کی قربت ایک دن کسی بے کیف لمحے میں، کسی بے خیالی کے عالم میں، کسی خلوت و تنہائی میں انسان کے عزم و ارادہ کے قدم کو ڈگمگا دیتی اور وہ بے اختیار اپنی عقل و خرد کو ابلیسیت کے ہاتھ میں دے دیتا۔ لیکن شراب کے گندہ اور نجس ہونے کے انقلابی حکم نے ان تمام خطرات کو یک قلم دفع کر دیا۔

شراب کے خلاف یہ سب سے پہلا جہاد تھا جو دنیا میں کیا گیا ہے۔ پھر شراب میں ہر وہ چیز شامل کر لی گئی جو شراب کی طرح نشہ لانے والی تھی، جیسے افیم، بھنگ، چرس یا گانجہ دنیا کے دوسرے مصلحوں اور پیغمبروں نے بھی شراب کو برا کہا لیکن نجس و ناپاک کسی نے قرار نہ دیا اور اس لئے برا سمجھنے کے باوجود بہ لوگ اس آتشِ سیال سے خود کو نہ بچا سکے لیکن اسلام کے اس حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مقامات اسلام کے دائرۂ اثر میں آ گئے تھے۔ وہاں اس کا وجود باقی نہ رہا۔

(۱۱) حکومت اور عوام اسلام نے بادشاہت کا تصور بالکل بدل دیا۔ اعلان ہوا کہ بادشاہ نہ خدا ہے، نہ خدا کا اوتار بلکہ دوسرے انسانوں کی طرح ایک بندہ ہے جس پر صرف نظم و نسق کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ نظم و نسق کو حق اور انصاف کے مطابق نہیں چلاتا تو ہر انسان کا فرض ہے کہ اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اس سے محاسبہ کرے اور

ل قرآن: سورۂ مائدہ ع ۱۲

بادشاہت کی مسند سے اُتار دے، قابلیت کا سب سے بڑا کامیاب حربہ یہی تھا کہ بادشاہ یا تو خدا ہی، یا خدا کی طرف سے مقرر کیا گیا ہی اور اس لئے نہ صرف اس کا حکم خدا کا حکم ہی بلکہ اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا اس کا جانشین ہی ——— پھر بادشاہ اچھا ہو یا برا، ظالم ہو یا عادل، احمق ہو یا عاقل، چونکہ وہ خدا یا خدا کا ساختہ پرداختہ تھا، اس لئے اس کی اطاعت میں چون وچرا کرنے کی مجال کسے ہو سکتی تھی، ہاں البتہ بادشاہ کے خاندان میں سے اگر کسی میں بادشاہ بننے کی اُمنگ پیدا ہو تو وہ بادشاہ کے خلاف جنگ کر سکتا تھا اور عوام کا خون بہا کر بادشاہت کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا دنیا کی پوری تاریخ اسی قسم کی جنگوں سے بھری ہوئی ہی۔ لیکن اسلام نے اعلان کیا کہ بادشاہت کسی خاندان، کسی قبیلے یا کسی مخصوص گروہ کے افراد کا حصّہ نہیں، بلکہ ہر وہ شخص جسے عوام پسند کریں اور جو عوام پر حق وانصاف کی رو سے حکومت کر سکتا ہو اُسے بادشاہ بنایا جائے۔

قرآن میں صاف طور سے محکوم ہی کہ مسلمانوں کے تمام معاملات کو باہمی مشورے سے طے ہونا چاہئیے[1]۔ حد یہ ہی کہ نبی کریم کو بھی مشورے کی اس ضرورت سے مستثنیٰ نہیں رکھا گیا اور آپ کے لئے بھی ہدایت ہوئی کہ ہر معاملے میں مسلمانوں سے مشورہ کر لیا کرو البتہ جب کسی بات کا عزم کر لو، تو پھر صرف خدا پر بھروسہ رکھو[2]

اس آیت میں "عزم" کا جو لفظ آیا ہی اس کی نسبت حضرت علی سے مروی ہی کہ آپ نے آنحضرت سے اس کی تشریح چاہی تو آپ نے فرمایا کہ "عزم" کا مطلب یہ ہی کہ پہلے رائے دینے والوں سے مشورہ کرو اور پھر اس مشورے کا جو کچھ نتیجہ مرتب

---

[1] قرآن: سورۂ شوریٰ

[2] قرآن: آلِ عمران

ہو اس پر عمل کرو۔[1]

غرض جب داعیٔ اسلام کو بھی مشورے کی احتیاج سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا تو آپ کے جانشینوں کا تو ذکر ہی کیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں بغیر مشورے کے کسی کو اپنا جانشین بنا سکتا تو عبداللہ ابنِ مسعود کو بناتا۔[2] خلیفۂ ثانی جناب عمر فاروق رض کا ارشاد تھا کہ حکومت (یا اسلامی اصطلاح میں خلافت) مشورے کے بغیر نہیں ہو سکتی۔[3]

چنانچہ اسی اصول کے مطابق داعیٔ اسلام کی وفات کے بعد آپ کے کسی عزیز کو جانشینی نہیں دی گئی بلکہ حضرت ابوبکر رض کو اس منصب کا اہل سمجھ کر انھیں جانشینی کے لئے منتخب کیا گیا۔ پھر حضرت ابوبکر رض کے بعد بھی جانشینی کا یہ منصب آپ کے صاحبزادے کو نہ ملا بلکہ حضرت عمر فاروق رض جیسے جنرل کو سونپا گیا جنہوں نے اسلام کے انقلابی پیغام کو دنیا کے اِس سرے سے لے کر اُس سرے تک پہنچا دیا اور داعیٔ اسلام نے جس کام کو شروع کیا تھا، اس کی تکمیل کرنے میں آخر دم تک مصروف رہے۔ حضرت عمر رض فاروق کے بعد جانشینی کا قرعۂ انتخاب حضرت عثمان رض کے نام پڑا اور آپ کے بعد حضرت علی رض کے نام پر ــــــ!!

---

[1] تفسیر ابن کثیر اور درِ منثور عن ابن مردویہ

[2] مستدرک۔ حاکم

[3] کنز العمال

باب ۸

سیاسی اقتدارِ اعلیٰ اور اسلام

انقلابِ اسلام نے "قابلیت" کی شہرگ پر سب سے کاری ضرب یہ لگائی کہ سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کا مرکز بادشاہ یا بادشاہ کی قسم کے چند مخصوص افراد کے بجائے عوام کی طرف منتقل کر دیا۔ قابلیت سب کچھ برداشت کر سکتی تھی، مگر اقتدارِ اعلیٰ کی طاقتوں کو اپنے ہاتھ سے چھوڑنا قدرتاً اس کی برداشت سے باہر تھا، یہ اس کی موت و زندگی کا سوال تھا۔ اس لئے داعی اسلام کی وفات کے بعد ہی قابلیت نے اپنی جدوجہد نئی نئی شکلوں میں شروع کر دی۔ چنانچہ داعی اسلام کی جانشینی کے معاملے میں اس امر پر زور دیا گیا کہ اس مسئلے کو اسی طرح طے ہونا چاہیے جس طرح بادشاہوں کی جانشینی کا مسئلہ طے ہوتا ہے یعنی بیٹا جانشین ہو اور اگر بیٹا نہ ہو تو پھر قریب ترین عزیز۔ دنیا کا یہ تصور چونکہ بہت قدیم تھا اور اس کے علاوہ کسی اور تصور کو دنیا بھول چکی تھی اس لئے بہت سے لوگوں نے معصومیت کے ساتھ اس کی تائید کی حتے کہ قابیلی گروہ کو ہابیل ہی کی نسل میں سے اس خیال کے حامی بکثرت ملنے لگے جس دنیا

کی عقل و دانش کو قابلیت نے ہزار ہا سال سے مسخ کر رکھا تھا اس کی سمجھ میں یہ کیسے آسکتا تھا کہ سلطنت و فرمانروائی میں جانشینی کا مسئلہ عوام کی رائے سے اور حق و انصاف کے معیار کے مطابق طے ہونا چاہیئے نہ کہ باپ کے مرنے پر آنکھیں بند کر کے بیٹے کو جانشین بنا دیا جائے۔ تاہم داعی اسلام نے خیالات میں جو انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اور انسانی دماغ کو جس روشنی سے آشنا کیا جا چکا تھا اس کی بناء پر قابلیت کو زیادہ کامیابی نہ ہوئی، علاوہ ازیں اس وقت چونکہ داعی اسلام کے پیغام کی آواز تازہ تھی، اس لئے قابلیت کی شکست یقینی تھی۔ لیکن گو قابلیت کو شکست ہو گئی مگر اس نے اپنی کوشش برابر جاری رکھی۔

امیر معاویہ کی بغاوت

آخر داعی اسلام کی وفات کے پچاس ساٹھ برس بعد وہ وقت آیا کہ قابلی گروہ کو امیر معاویہ کی شکل میں اپنا "نجات دہندہ" نظر آیا اور اس نے کھل کر بغاوت کا اعلان کر دیا۔

امیر معاویہ، حضرت عثمانؓ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بہت زیرک و فہیم انسان تھے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کو شام میں گورنر بنا کر بھیجا تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی وفات کے بعد جب حضرت علی کی خلافت کا انتخاب عمل میں آیا تو امیر معاویہ نے آپ کی خلافت کو ماننے سے انکار کیا اور آپ کے مقابلے میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اس پر میدانِ کارزار گرم ہوا۔ دونوں طرف کی فوجیں صفّین کے میدان میں جمع ہوئیں۔ اور سخت گھمسان کا رن پڑا۔ حضرت علی کی طرف جوش و خروش بہت زیادہ تھا اور امیر معاویہ کے اس رویّہ کو حق و انصاف کے خلاف سمجھنے کا رجحان عام تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سخت مقابلے کے بعد حضرت علی کی فوجیں بھاری پڑنے لگیں اور امیر معاویہ کے آدمیوں کے دل ٹوٹنے لگے۔ اس لئے پیغام صلح کے نقیب بن کر امیر معاویہ کے سپاہی نیزوں پر قرآن کے اوراق اٹھائے میدان جنگ میں

نمودار ہوئے اور چلّانا شروع کیا کہ ـــــــ لڑنا بند کرو اب ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرآن فیصلہ کرے گا۔ اس کا جو کچھ فیصلہ ہوگا اُسے ہم مان لینگے۔

امیر معاویہ کی حکمت عملی

حضرت علی کی فوجوں نے معاویہ کی اس پیشکش کا خیر مقدم کیا اور لڑنے سے انکار کر دیا۔ حضرت علی نے اوّلاً اپنی فوج کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ لیکن جب آپ کے حامیوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے صاف طور پر کہدیا کہ قرآن کے بیچ میں آجانے کے بعد ہم تلوار نہیں اٹھا سکتے تو آخر حضرت علی کو مجبوراً امیر معاویہ کی یہ پیشکش قبول کرنا پڑی۔ جنگ ختم ہوئی۔ اور اب سوال اٹھا کہ فیصلہ کیونکر ہو۔ باہمی مشورے سے طے کیا گیا کہ ایک ذمہ دار آدمی کو حضرت علی اپنا نمائندہ بنا دیں اور اسی طرح کسی ایسے ہی شخص کو امیر معاویہ اپنا نمائندہ بنا دیں۔ یہ دونوں نمائندے ایک جگہ بیٹھ کر حالات پر غور کریں اور قرآن کی روشنی میں جو فیصلہ مناسب سمجھیں اُس سے ہم کو مطلع کر دیں۔ ہم سب اس فیصلے کے پابند ہوں گے۔

امیر کی طرف سے عمرو ابن العاص اور حضرت کی طرف سے ابو موسیٰ اشعری کو نمائندہ مقرر کیا گیا۔ عمرو بن العاص عمر میں ابو موسیٰ اشعری سے چھوٹے تھے۔ لیکن سیاسی تدبّر اور حکمت آفرینی میں اپنے رفیق کار سے بہت بڑھ چڑھ کر تھے۔ ابو موسیٰ اشعری ان کے مقابلے میں ایک سیدھے سادے متقی قسم کے آدمی تھے۔ جب ان دونوں کی کمیٹی غور و خوض کے لئے بیٹھی تو عمرو ابن العاص کی اس تجویز کو آپ نے منظور کر لیا کہ ـــــــ معاویہ اور علی دونوں میں سے جس کسی کو بھی خلیفہ بنایا جائے گا اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کے ماننے والے دو ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے اور یہ تفرلق اسلام کے لئے سخت نقصان کا موجب ہوگی اس لئے بہتر یہ ہو کہ ان دونوں کو خلافت سے معزول کر دیا جائے اور کسی تیسرے شخص کو اس کے لئے منتخب کر لیا جائے۔

ایک اصولی غلطی

اشعریؓ اور ابن العاصؓ کی کمیٹی کے سپرد جو کام کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ حضرت علی اور امیر معاویہ کی خلافت کے سلسلہ میں جو جھگڑا ہے اُسے قرآن کی روشنی میں طے کر دے۔ اس لئے اس کمیٹی کو صرف اسی سوال پر غور و خوض کرنے کا حق تھا، اس کے علاوہ کسی اور تجویز کو پیش کرنے یا کوئی نیا سوال پیدا کرنے کا حق اسے نہیں دیا گیا تھا لیکن ابو موسیٰ اشعری اپنی سادگی کی وجہ سے اس فرق و امتیاز کو نہ سمجھ سکے اور اس کمیٹی کے حدود اختیار Terms of Reference سے تجاوز کر کے انہوں نے عمرو ابن العاص کی مذکورہ بالا تجویز کو منظور کر لیا حالانکہ اس تجویز کو منظور کرنے یا نامنظور کرنے کا اختیار کسی طرح بھی اس کمیٹی کو حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

بہرحال اس تجویز کو منظور کر لیا گیا اور طے ہوا کہ اس کا اعلان جمعہ کی نماز کے اجتماع میں کر دیا جائے۔ اعلان کا طریقہ یہ تجویز کیا گیا کہ ہر ایک نمائندہ کھڑا ہو کر پہلے اس تجویز کا اعلان کرے اور اس کے بعد اپنے خلیفہ کے مختار کی حیثیت سے اس کی معزولی کا اعلان بھی کر دے۔ اور جب دونوں خلیفہ اس طرح معزول ہو جائیں تو پھر اسی وقت سب کی موجودگی میں کسی تیسرے موزوں نام کا انتخاب کر لیا جائے۔

خلافت سے حضرت علی کی معزولی

چنانچہ جب اعلان کا وقت آیا تو ابو موسیٰ اشعری نے حضرت علی کی نمائندے کی حیثیت سے حضرت علی کی معزولی کا اعلان کر دیا۔

جب یہ ہو چکا تو عمرو ابن العاص کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ابو موسیٰ اشعری نے جو کچھ کہا میں اُس سے اتفاق کرتا ہوں، مگر حضرت علی کی معزولی کے بعد چونکہ نظم و ضبط کی ضرورت کے لئے کسی فرمانروا کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے جب

تک باہمی نزاع طے نہ ہو،، امیر معاویہ کو مسلمانوں کا امیر تسلیم کر لیا جائے۔

عمرو ابن العاص کی یہ حکمت آفرینی اپنا کام کر گئی اور عوام ایک مخمصے میں پھنس گئے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ جو کچھ ہوا ٹھیک ہوا، کچھ نے کہا غلط ہوا

ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان مستقل طور سے دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک نے علی کا ساتھ دیا دوسرے نے معاویہ کا۔ مگر ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو دونوں کا مخالف تھا یہ طبقہ "خوارج" یعنی باغی کے نام سے موسوم ہوا۔ ان باغیوں کو سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت علی اور امیر معاویہ دونوں کی فوجوں نے انھیں پیس دیا[۱]۔

بہرحال اب امیر معاویہ کی خلافت و جانشینی پر مہر لگ چکی تھی۔ اور اگرچہ اُن کے خلاف بغاوتیں ہوئیں، مگر اُن کو دبا دیا گیا۔ اور ان کی خلافت عام طور سے تسلیم کر لی گئی۔

امیر معاویہ کے بعد انکے بیٹے یزید کی جانشینی

معاویہؓ اور علیؓ کے اس اختلاف میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حق بجانب کون تھا۔ معاویہ کے حامیوں کا مطالبہ یہ تھا کہ خلیفہ سوم جناب عثمانؓ کے قتل کی تحقیقات کا انتظام حضرت علی نے نہیں کیا اس لئے وہ خلافت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ بہرحال یہ سوال ایک حد تک بحث طلب ہو سکتا ہو اور ایک مورخ کے لئے ان دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ دے دینا بہت مشکل ہو۔ لیکن امیر معاویہ نے اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشیں بنانے کا جو فیصلہ کیا، وہ ہر لحاظ سے داعی اسلام کی تعلیماتِ انقلاب کے سراسر خلاف تھا

---

[۱] امیر معاویہ اور حضرت علی کے قضیہ کی ان تمام تفصیلات میں اسلامی تواریخ کے علاوہ کتاب کامل للمبرد حصہ سوم، بھی ہمارے پیشِ نظر رہی ہو۔

معاویہ نے چاہا کہ شاہی کے پُرانے اصول کے مطابق ان کی وفات کے بعد اُن کا بیٹا تاج وتخت کا وارث بنے اور اس طرح سلطنت صرف ان کے خاندان میں رہے۔ عوام کو اپنے بادشاہ کے منتخب کرنے اور بادشاہ پر احتساب ونگرانی رکھنے کا کوئی حق واختیار نہ ہو۔ معاویہ کی یہ آرزو قابلی ذہنیت کے لئے تو مطلق حیرت انگیز نہ تھی لیکن اسلام نے جو پیام انسانیت کو دیا تھا اس کے قطعاً منافی تھی۔ اسلام کے پیروؤں نے معاویہؓ کی خلافت کو قبول کر لیا تھا لیکن جب ان کی وفات پر اُن کے بیٹے یزیدؔ نے اپنی خلافت کا اعلان کیا اور عام مسلمانوں کے منتخبہ خلیفہ امام حسنؑ (جو حضرت علی کے صاحبزادے تھے) کی خلافت کو ماننے سے انکار کیا تو مسلمانوں میں سخت برہمی پھیلی۔ بدنصیبی سے امام حسنؑ میں قائدِ انقلاب کا صحیح جانشین بننے کی صلاحیت بہت کم تھی۔ انہوں نے اس جھگڑے میں پڑنا پسند نہ کیا اور خود ہی خلافت سے دستبرداری دیدی لیکن عام مسلمانوں نے اب بھی یزید کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اور امام حسنؑ کی جگہ پر ان کے چھوٹے بھائی امام حسین کو خلیفہ بنانا چاہا۔ امام حسین اس کے لئے تیار ہو گئے مگر امام حسین کے سامنے بھی وہی مہم تھی جو ان کے والد ماجد حضرت علی کے سامنے تھی۔ انھیں یزید سے لڑکر عوام کے اس حق کو تسلیم کرانا تھا۔ چنانچہ پھر لڑائی ٹھنی۔ مگر اب یزید ابنِ معاویہ کی طاقت بہت جمی ہوئی طاقت تھی اور قابلیت کے صدہا سال پُرانے اصول کے مطابق بادشاہوں کو اپنی بادشاہت کے قیام کے لئے جس قسم کی سیاسی طاقتوں اور جس قسم کے ہتھکنڈے بازمشیروں اور بیرحم جنرلوں کی ضرورت تھی وہ سب یزید کے گرد جمع تھے۔ اس کے مقابلے میں امام حسینؑ کی حالت ایک ایسے رہبر و ہادی کی سی تھی جسے ایک منظم طاقت اور منظم ظلم وبے انصافی کا مقابلہ کرنا تھا۔ کربلا کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور یزید کی طرف سے وہی ہوا جو دنیا کی تاریخ میں قابلیت کی طرف سے ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ امام حسینؑ

نے دیکھا کہ یزید کی فوجی طاقت بے پناہ ہے اور اس کے مقابلے میں لوگ اُن کی طرف آتے ہوئے ڈرتے ہیں اور اگرچہ عوام کے دل ان کے ساتھ ہیں مگر یزیدی قابلیت کے مظالم کی دہشت سے ان کی زبانوں پر بھی تالے پڑے ہوئے ہیں اور دست و بازو بھی مفلوج ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر امام حسین نے یزید کی فوج کے کمانڈر کے پاس پیام بھیجا کہ :۔

۱۔ یا تو مجھے وہیں لوٹ جانے دو جہاں سے آیا ہوں،

۲۔ یا مجھے خود یزید سے اپنا معاملہ طے کر لینے دو۔

۳۔ یا مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پر بھیج دو۔ وہاں کے لوگوں پر جو گذرتی ہے، وہی مجھ پر گذرے گی

شرائط بہت معقول تھیں لیکن انھیں تسلیم کرنے سے محض اس بنا پر انکار کر دیا گیا کہ "_____ اس وقت حسین قبضے میں آچکے ہیں۔ اگر اطاعت کئے بغیر نکل گئے تو عجب نہیں عزت و قوت حاصل کر لیں اور ہم کمزور و عاجز قرار پائیں۔ بہتر یہی ہے کہ اب انھیں قابو سے نہ نکلنے دیا جائے جب تک وہ اطاعت نہ کر لیں[1]"

چنانچہ قابلی ذہنیت کے مطابق وہ تمام سختیاں کی گئیں جو ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہیں اور جن کے پیس ڈالنے والے بوجھ سے عوام کو نجات دلانے کے لئے انقلاب اسلام کے داعی نے اور ان کے بعد ان کے چار جانشینوں نے جدوجہد کی تھی _____ امام حسینؑ کو جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر کیا گیا۔ مکر و فریب کو بیدریغ استعمال کیا گیا۔ کچھ لوگوں کو روپے کا لالچ دے کر توڑا گیا اور کچھ کو ڈرا دھمکا کر دبایا گیا۔ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کیا گیا۔ ان کو چاروں طرف سے گھیرا گیا، اور جب تک

---

[1] ابن جریر وغیرہ بحوالہ "شہید اعظم" از ابوالکلام آزاد

ایک ایک آدمی کو قتل نہ کیا گیا جنگ کا ڈھول برابر بجایا جاتا رہا۔ اس کے بعد قابلیت کے انسانیت سوز مگر قدیم دستور کے مطابق مُردہ لاشوں کی توہین کی گئی۔ — غرض وہ سب باتیں دہرائی گئیں جن کی خونی داستان سے قابیلی گروہ کی تاریخ کا ہر صفحہ رنگین رہا ہے۔

خلافت کا خاتمہ اور شہنشاہیت کا آغاز

کربلا کی اس خونابہ فشاں ٹریجڈی کے بعد یزید کی حکومت تسلیم کرلی گئی۔ لیکن اب اس حکومت میں اور شاہانِ سلف کی حکومت میں بہت کم فرق تھا، یہ ٹھیک ہے کہ اسلام نے خدا کی وحدت اور انسانی مساوات و اخوت کا جو صور پھونکا تھا، اس کے اثرات نے فرعون و نمرود جیسی بادشاہت کا نظریہ ختم کر دیا تھا، اور ایک نئے نظریئے سے دُنیا آشنا ہو چکی تھی، مگر اس نظریے کو قائم و برقرار رکھنے اور اس کے عملی ثمرات سے دُنیا کو بہرہ مند کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اقتدارِ اعلیٰ کی طاقت اسلام کے انقلابی پیغام کے مطابق عوام کے ہاتھ میں ہوتی اور بجائے اس کے کہ عوام بادشاہ سے انصاف کی بھیک مانگتے، بادشاہ کا دامن عوام کا تعاون و اشتراک عمل حاصل کرنے کے لئے عوام کے آگے ہر وقت پھیلا رہتا، اور عوام کو یہ حق ہوتا، حق ہی نہیں اختیار ہوتا کہ وہ جب بھی یہ دیکھیں کہ بادشاہ کے اعمال و افعال حق و انصاف کے خلاف جا رہے ہیں، فوراً اپنے اشتراک و تعاون کا ہاتھ کھینچ لیں اور اُسے مسندِ حکومت سے نیچے اتار لیں۔ چنانچہ داعی اسلام اور داعی اسلام کے بعد کے چار جانشینوں کی حالت یہی تھی کہ اگرچہ اقتدار و حکومت کے لحاظ سے وہ دُنیا کے بڑے سے بڑے سلاطین سے کم نہ تھے: اور یمن سے لے کر ایران و ہندوستان تک اور ایران و ہندوستان سے لے کر شام و مصر تک ان کی فرمانروائی کا جھنڈا لہرا رہا تھا، مگر مسلم عوام کی تائید و حمایت کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتے تھے۔ حضرت عمر فاروق جیسے جلیل القدر خلیفہ تک کا یہ حال تھا کہ ہر آدمی کھلم کھلا اُن کے عمل پر نکتہ چینی کر سکتا تھا۔

اس نکتہ چینی کا یا تو معقول جواب دیا جاتا تھا، یا اگر یہ حق بجانب ہوتی تھی تو اس کے مطابق عمل میں تبدیلی کی جاتی تھی لیکن معاویہ کے بعد ان کے بیٹے یزید کی مسند نشینی کے بعد یہ نقشہ بالکل بدل گیا، اب بادشاہ، عوام کے تعاون و اشتراک عمل کے بجائے توپوں اور تلواروں کی طاقت سے حکومت کرنے لگا! اور عوام کی حیثیت حکومت میں برائے نام رہ گئی۔ اسی لئے صرف حضرت علی کے زمانے تک کے خلفاء کو خلفائے رشید یعنی داعی اسلام کے سچے اور حقیقی جانشین کہا جاتا ہے اور صرف ان ہی چار خلفاء کے زمانۂ حکومت کو "خلافتِ راشدہ" یعنی حقیقی جانشینی کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے بعد کے خلفاء کو خلیفہ تو کہا گیا مگر نہ وہ خلیفۂ رشید تھے اور نہ اُن کی خلافت، خلافتِ راشدہ، لیکن نظامِ ریاست کو چلانے کے لحاظ سے چونکہ حضرت علی کو کوئی موقعہ حاصل نہ ہوا۔ اس لئے انقلاب اسلام کی پیدا کی ہوئی ہیئت سیاسیہ کا زمانہ خلیفۂ سوم کی شہادت پر ختم ہو جاتا ہے[۵]

دو بنیادی اصول: کتاب وسنت اور اجماعِ اُمت:

انقلاب اسلام کا مدعا یہ تھا کہ ملوکیت اور شہنشاہیت کے وجود کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور اقتدار و اختیار کے سرچشمے پر عوام کو قابض بنا دے۔ لیکن یہ کام سب سے زیادہ دشوار ہی نہ تھا بلکہ اپنی تکمیل کے لئے کچھ وقت بھی چاہتا تھا، قابل گروہ نے ہزارہا ہزار سال سے معاشرت و ریاست کا جو نظام بنا رکھا تھا اور جس کی دنیا عادی بھی ہو چکی تھی اُسے دماغوں سے نکال ڈالنا اور اس کے بجائے ایک بالکل نئے تصور سے دنیا کو آشنا کرنا چند دنوں کا کام نہ تھا، اس کے لئے کچھ زمانہ درکار تھا۔ اسی لئے داعی اسلام نے اس بارے میں صرف

---

۵ ازالۃ الخفا۔ شاہ ولی اللہ صفحہ ۱۲۱

بنیادی اصول بتانے پر اکتفا کیا، تفصیلات وجزئیات کا کام بعد کی نسلوں پر چھوڑ دیا گیا آپؐ نے یہ تبلا دیا کہ حکمرانی کسی بادشاہ کی نہیں بلکہ حق و انصاف کی ہونی چاہیئے اور حق و انصاف کو طے کرنے کے لئے قرآن سے اور قرآن کے بعد اس عمل سے روشنی حاصل کرو جو داعی اسلام اور داعی اسلام کے جانشینوں کا ہو، اسلامی اصطلاح میں اسی چیز کا نام کتاب وسنت ہے۔ پھر کتاب وسنت کی توضیح وتشریح کا کام کسی ایک خاص فرد یا چند مخصوص افراد کے سپرد نہیں کیا گیا بلکہ بلا امتیاز تمام مسلمانوں کو اس توضیح وتشریح کا مجاز قرار دیا گیا اور یہ اصول طے کیا گیا کہ

مسلمانوں کی اکثریت غلطی نہیں کر سکتی

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اسلامی قانون سازوں نے کتاب وسنت کے بعد "اجماع امت" کو ہر معاملے میں معیار فیصلہ قرار دیا ہے۔ لیکن کسی مسئلے میں مسلمانوں کی اکثریت کا فیصلہ معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہونا چاہیئے؟ اس سوال کو داعی اسلام نے اپنی جانشینوں پر چھوڑ دیا۔ البتہ یہ اصول ہمیشہ کے لئے معین کر دیا گیا کہ

زمین کا وارث خدا ہے،[1] نہ کہ بادشاہ یا بادشاہ کا خاندان اور تمہارا حاکم در اصل تمہارا خادم ہے جس کا عزل و نصب عوام کے اختیار میں ہے۔

ہیئت حاکمہ اور عوام

داعی اسلام کی وفات کے بعد، اسی اصول کے مطابق آپ کے جانشین کا انتخاب عمل میں آیا۔ مسلمانوں کے ایک دسیع اجتماع میں آپ کی جانشینی یا خلافت کے لئے کئی نام پیش کئے گئے، لیکن حضرت ابوبکر کے نام پر اتفاق کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لئے سب نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ بیعت کا طریقہ یہ تھا کہ ہر وہ شخص جو کسی کی خلافت کے حق میں ہو وہ اپنا ہا

---

[1] ان الارض للہ (سورہ عمران)

رائے کے اظہار کے لئے خلیفہ یا خلیفہ کے مقرر کئے ہوئے کسی نائب کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اطاعت وفرمانبرداری کا عہد کرے۔ یہ بیعت دراصل ہر ایک کا انفرادی ووٹ تھا۔ اس لئے جو لوگ کسی خلیفہ کو نہ مانتے تھے وہ بیعت کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ حضرت علی اور امام حسینؑ نے یہی کیا تھا کہ معاویہ اور یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سی مثالیں ایسی ہیں، غرض بیعت کرنے کے معنی یہ تھے کہ خلیفہ کی خلافت کے حق میں ووٹ دے دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ اسلام نے رائے عامّہ کو معلوم کرنے کے لئے انفرادی رائے کو —— جسے روسو نے Volonte de Touse کے لفظ سے تعبیر کیا ہے —— معیار فیصلہ بنانے کے بجائے، ابتدائے اسلام میں اُس عمومی رائے Volonte Generale پر بھروسہ کر لینا کافی سمجھا، جسکی ترجمانی انقلاب اسلام کے سچے حامیوں کی جماعت کرتی تھی اور جس میں شامل ہونے کا دروازہ ہر شخص پر یکساں طور سے کھلا ہوا تھا۔

خلیفۃ المسلمین کی حیثیت بادشاہ جس کا اسلامی نام خلیفہ تھا، اس کے انتخاب کے بعد ہر مسلمان کا یہ فرض تھا کہ وہ اس بات کی جانچ کرتا رہے کہ خلیفہ کا ہر عمل کتاب وسنت اور اجماعِ اُمت کے مطابق ہو۔ جن مسائل میں کتاب وسُنت کے احکام واضح تھے اور جن میں کوئی اختلاف نہ تھا وہاں عوام کی رائے لینے کی ضرورت نہ تھی، لیکن جو مسائل مبہم یا غیر واضح تھے اور جن میں اختلاف رائے ممکن تھا یا جو نئے نئے مسائل پیدا ہوتے تھے اُن کو طے کرنے کے لئے خلیفہ کا فرض تھا کہ وہ عام مسلمانوں کی رائے حاصل کرے اور اکثریت کا جو فیصلہ ہو اس کے مطابق عمل کرے۔ عام مسلمانوں کی رائے کو حاصل کرنے کے لئے مسجد، اسمبلی ہال کی حیثیت رکھتی تھی اور جمعہ کے دن جو عام اجتماع ہوتا تھا، اُسے سب سے بڑی مشورت گاہ یا پارلیمنٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ جمعہ کے دن خود خلیفہ منبر پر کھڑا ہو کر حالات حاضرہ پر ایک تقریر کرتا تھا جس

اسلامی اصطلاح میں خطبہ کہتے تھے جن مقامات پر خلیفہ نہیں پہنچ سکتا وہاں اس کا نائب خطبہ دیتا تھا۔ خطبہ عربی زبان میں فصیح و بلیغ تقریر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ داعی اسلام اور داعی اسلام کے بعد آپ کی چاروں جانشینوں کی خلافت راشدہ کے زمانے تک جو خطبے دیئے گئے ان میں انتہائی فصاحت و بلاغت کے ساتھ معاشرت و سیاست کے اہم مسائل پر روشنی ڈالی جاتی تھی اور انقلاب اسلام کے پیغام کو نہایت پُرزور انداز سے دُنیا کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔

اِن خطبوں میں اگر خلیفہ کی زبان سے کوئی بات کتاب و سنت یا اجماع امّت کیخلاف نکل جاتی تھی تو اسی وقت کوئی شخص کھڑا ہو کر اُسے ٹوک دیتا تھا۔ جس پر یا تو خلیفہ اُس کا جواب دیتا تھا یا علی الاعلان اپنے الفاظ واپس لے لیتا تھا۔

غرض روزمرہ کے عاملانہ (ایگزکٹو) اختیارات کو نافذ کرنے میں اگرچہ خلیفہ بالکل آزاد تھا، صوبوں کے گورنر وہ خود اپنی رائے سے مقرر کرتا تھا، فوجی عہدے بھی اُسی کی مرضی کے مطابق دیئے جاتے تھے اور خارجی پالیسی کو بھی وہی طے کرتا تھا۔ لیکن ان سب چیزوں پر کتاب و سنت اور اجماع امت کی روشنی میں احتساب و نگرانی رکھنے اور حسب ضرورت نکتہ چینی کرتے رہنے کا حق عام مسلمانوں کو حاصل تھا۔

ایک مرتبہ داعی اسلام سے پوچھا گیا کہ اگر ہم پر ایسا امیر (یا آج کل کی اصطلاح میں صدر جمہوریہ) مُسلّط ہو جائے جو نہ آپ کے اصول پر عمل کرتا ہو اور نہ آپ کی ہدایات کو خاطر میں لاتا ہو تو اس کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے، آیا اس کی اطاعت بھی ہم پر واجب ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں آپ نے بالکل صاف لفظوں میں جو دو ٹوک فیصلہ دیا وہ اسلامی ہیئت سیاسیہ کو جمہوری نظام کا وہ مرتبہ عطا کرتا ہے جس میں صدر جمہوریت کو ایک بار منتخب کر لینے کے باوجود معزول کر دینے کا حق بھی عوام کو حاصل ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا "جو خدا کے احکام کی پیروی نہیں

کرتا، اس کی اطاعت بندوں پر واجب نہیں رہتی۔"[1]

داعی اسلام کے اس قول کی توضیح میں خلیفہ چہارم جناب علی مرتضیٰ کا ارشاد ہے کہ "امیر" کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کے مطابق عمل کرے اور جو ذمہ داری اسے سونپی گئی ہے، دیانت کے ساتھ اُسے بجالائے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس کی اطاعت سے انکار کردیں[2]۔

خلیفۂ دوم نے اپنے ایک گورنر ابوموسیٰ اشعری کو ایک فرمان میں صاف طور سے لکھا:۔ امیر صرف اسی وقت تک امیر ہے جب تک وہ قرآنی ہدایات کے مطابق چلتا ہے۔ ورنہ نہیں[3]۔

دولت کی تقسیم نظم ونسق کے بعد دولت کی تقسیم کا سوال سب سے بڑا سوال ہے بلکہ حقیقت میں نظم ونسق کا مقصد ہی یہ ہے کہ دولت کی تقسیم کو کسی خاص طریقے پر عمل میں لایا جائے، قابلیت نے جو نظم ونسق تیار کر رکھے تھے اُن میں دولت صرف قابلی گروہ تک محدود تھی، لیکن اسلام اسی لعنت کو دنیا سے مٹانے کے لیے آیا تھا، اسی لئے دولت کی تقسیم کا اصول یہ طے کیا گیا تھا کہ داعی اسلام کے قریب کی لوگوں کو اور اُن لوگوں کو جنہوں نے اپنے خون سے انقلاب اسلام کی کھیتی کو سینچا تھا، کچھ زیادہ رقم دی جاتی تھی اور پھر اس تعلق سے جتنی دوری ہوتی جاتی تھی اس رقم میں کمی ہوتی جاتی تھی۔ اس ایک استثناء کے بعد پھر سب کا حصہ مساوی تھا چنانچہ خلافت راشدہ کے زمانے تک ہر مسلمان کو حکومت کے خزانے سے ایک مقررہ رقم ملتی تھی حتیٰ کہ شیرخوار بچے بھی اس سے مستثنےٰ نہ

---

[1] مجمع الزوائد۔ جلد نمبر ۵ صفحہ ۲۲۵

[2] کتاب الاموال صفحہ ۵

[3] کتاب الاموال صفحہ ۶

تھے۔ پھر یہ چیز صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ غریب، معذور اور بوڑھے غیر مسلموں کو بھی بیت المال سے نفقہ دیا جانا طے کیا گیا۔ چنانچہ اسلام کے مشہور کمانڈر خالد ابن ولید نے حیرہ کی فتح کے وقت جو صلحنامہ ترتیب دیا تھا اس میں صاف الفاظ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اسی بنا پر جہاں اسلام نے بادشاہ کا نام خلیفہ اور بادشاہت کا نام خلافت رکھا وہاں خزانہ کا نام بھی بدلنا پڑا اس لئے کہ جس طرح خلیفہ عام بادشاہوں کی طرح کا بادشاہ نہ تھا اور نہ خلافت کا نظام حکومت بادشاہوں کی بادشاہت کے مانند تھا، اسی طرح خلافت کا خزانہ بھی بادشاہوں کا سا خزانہ نہ تھا بلکہ اب یہ عوام کا روپیہ تھا اسی لئے اسلامی اصطلاح میں خزانہ کا نام بیت المال یعنی "دولت کے رکھنے کی جگہ" قرار پایا

نسلی ونسبی امتیازات

دولت کی اس مساوی تقسیم کے ساتھ ساتھ وہ تمام امتیازات بھی مٹا دیئے گئے جو نسل ونسب، ذات پات یا عہدہ ومنصب کے نام پر انسانوں نے کھڑے کر رکھے تھے۔ خطاب دینے یا اس قسم کا کوئی اور امتیازی اعزاز دینے کا طریقہ بھی مسدود کیا گیا، خلیفہ کو معمولی طور سے امیر المومنین (مسلمانوں کا سردار) کہا جاتا تھا یا خلیفۃ المسلمین "مسلمانوں کا خلیفہ" کہہ کر پکارا جاتا تھا، لیکن روزمرّہ کی زندگی میں اس کی حیثیت عام انسانوں کی طرح تھی، انسانوں انسانوں کے مابین صرف بھائی کا رشتہ تسلیم کیا گیا اور اونچ نیچ کے باقی تمام رشتے ختم کر دیئے گئے۔ البتہ جو لوگ قابلیت کے خلاف صف آرا ہوکر انسانی مساوات وحریت کے پیام انقلاب سے دنیا کو روشناس کرنے کے لئے اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں نکلتے تھے ان کو ایک امتیاز ضرور دیا جاتا تھا۔ اگر وہ فتحمند ہوکر لوٹیں تو "غازی" کا لقب پاتے تھے۔ اور اگر اس راہ میں اپنی جان قربان کر دیں، خواہ لڑکر یا مظلوم کی حیثیت سے کسی اور طرح تو "شہید" کا خطاب انھیں حاصل ہوتا تھا "غازی" کے معنی ہیں

"جد وجہد کرنیوالا" اور "شہید" کے معنی ہیں گواہی دینے والا" شہید کو گواہی دینے والا کا خطاب اس لئے دیا گیا کہ اس نے اپنے خون کے قطروں سے اس بات کی شہادت فراہم کی کہ اسلام کا پیغام سچا ہے اور وہ سچے دل سے اس پیغام پر یقین رکھتا ہے۔

غرض اسلام نے انسانی مساوات کی زبانی تعلیم ہی نہ دی، بلکہ سیاست اور معاشرت اور معیشت کے تینوں شعبہ ہائے زندگی میں اسے عملی جامہ بھی پہنایا (۱) سیاست و حکومت جسے بادشاہ اور بادشاہ کے چند حاشیہ نشینوں کی جائداد سمجھا جاتا تھا، اب عوام کی رائے اور ان کی خواہش و مرضی کو اُس میں دخل ہونے لگا! ور سیاسی مسائل پر گفتگو کرنا صرف اوپر کے چند مخصوص افراد کا حق نہیں رہا بلکہ ہر عامی سے عامی انسان کو بھی یہ حق دے دیا گیا۔ (۲) تہذیب و معاشرت میں نسل و نسب خاندان و دودمان، ذات پات اور اونچ نیچ کے تمام امتیازات کو مٹا دیا گیا اور اب نہ عبادت خانوں میں امیروں اور سرداروں کے لئے کوئی مخصوص امتیاز تھا اور نہ مجلسوں اور محفلوں میں ان کی کوئی مخصوص جگہ تھی، نہ ان کے پاس کوئی مخصوص آداب تھے، نہ ان کو سلام کرنے اور ان کے آگے سر خم کرنے کا کوئی دستور تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس ہر انسان برابر تھا اور ہر ایک سے برابری سے ملتا تھا، (۳) اقتصاد و معیشت میں بھی یہی حال تھا، دولت و سرمایہ کی وہ تمام پرانی تقسیمیں توڑ دی گئی تھیں جن میں دولت صرف چند افراد کا استحقاق ہو کر رہ جاتی تھی اور باقی انسان صرف اُن کی سخاوت و بخشش اور اکرام و انعام کے بھکاری بنے رہتے تھے۔

اسلام اور شہنشاہیت

زندگی کے اس انقلاب کا نتیجہ یہ تھا کہ جو انسان بھی اسلام کے اس پیغام سے آشنا ہوا، اس کی نظر میں بادشاہوں اور شہنشاہوں کی کوئی عظمت باقی نہ رہی، اور شاہی جلال و جبروت کے وہ تمام مظاہرے جو انسانوں کو مرعوب و خوف زدہ بنا دیا کرتے تھے، اب حقارت و ذلت

کی نظروں سے دیکھے جانے لگے۔ چنانچہ اُس زمانے میں جب اسلام کی انقلابی فوجیں عراق و ایران کے تاجداروں کے خلاف میدان میں کھڑی ہوتی تھیں تو دُنیا ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھتی تھی ایک طرف تو شان و شوکت اور رعب و جلال کے تمام مظاہرے تھے، آراستہ و پیراستہ فوجیں تھیں، زرق برق لباس تھے، چمکتے ہوئے ہتھیار تھے، شاندار جنرل تھے، اونچے اونچے خیمے تھے، سونے چاندی کے ڈھیر تھے، لذّتوں اور نعمتوں سے لدے ہوئے دسترخوان تھے، چاؤش تھے چتر تھا، تخت تھا، دربار تھا، کمخواب و بانات کے فرش تھے، لونڈی غلاموں کی مودّب صفیں تھیں ——— لیکن اس کے مقابلے میں دوسری طرف پیوند لگے ہوئے بوسیدہ کپڑے تھے۔ ٹوٹے ہوئے نیزے اور زنگ آلود تلواریں تھیں، نہ چتر تھا نہ چاؤش، ایک جنرل تھا جس میں اور عام سپاہیوں میں کوئی فرق نہ تھا، نہ اس کے چاروں طرف باڈی گارڈ تھا، نہ لونڈیوں اور غلاموں کی مودّب صفیں اس کا حلقہ کرتی تھیں نہ اس کا کوئی مخصوص خیمہ تھا اور نہ اس کے آگے کوئی جھکتا تھا۔

چنانچہ جب یہ حیرت ناک نظارہ ایران و شام کے پُرشوکت و جلال کمانڈروں اور جنرلوں نے دیکھا تو وہ سمجھے کہ عرب کے یہ فلاکت زدہ، غریب انسان بھوک سے تنگ آکر لڑنے پر کمربستہ ہوگئے ہیں، اس لئے انھیں کچھ دے دلاکر رخصت کر دیا جائے، چنانچہ سلطنتِ روم کے فوجوں کے کمانڈر نے ۶۳۶ء میں غزوۂ یرموک (شام) کے موقعہ پر انقلاب اسلام کی فوج کو یہ پیشکش کی تھی کہ ——— خواہ مخواہ لڑ کر اپنی جان کیوں کھوتے ہو، ہم جانتے ہیں کہ تم افلاس سے تنگ ہو، اس لئے جاؤ ہم تم میں سے ہر سپاہی کو سو سو گنّی اور تمہارے افسروں کو ہزار ہزار گنّی اور تمہارے کمانڈروں کو دس ہزار گنّی دیئے دیتے ہیں۔ انھیں لو اور واپس چلے جاؤ۔

اسی طرح ۶۳۵ء میں غزوۂ بویب (عراق) کے موقعہ پر جب اسلام کے

انقلابی سپاہی شاہِ ایران کے تاج و تخت کے خلاف صفیں باندھے کھڑے تھے تو ان کی ظاہری حالت کو دیکھ کر ایرانی افواج کے کمانڈر۔انچیف رستم نے بھی ان کو کچھ دے دلا کر رخصت کر دینا چاہا۔ چنانچہ اس نے پیام بھیجا کہ تم اپنے کسی نمائندے کو بھیجو تاکہ ہم اس سے گفتگو کریں۔ پہلے ربعی بن عامر اور مغیرہ کو نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔ رستم نے ایرانی سلطنت کے جلال و جبروت سے ان کو متاثر بنانے کے لئے پورے شاہی آداب و رواج کے مطابق اپنا دربار سجایا۔ رستم کے بیٹھنے کے لئے ایک زرنگار تخت ایک زرنگار خیمے میں بچھایا گیا اس کے چاروں طرف نقیب او چاوش مقرر کئے گئے تخت کے دونوں طرف فوجی افسروں کی صفیں تھیں۔ پیچھے ایک غلام کھڑا چنور ہلا رہا تھا، دائیں بائیں کچھ غلام ننگی تلواریں۔لئے کھڑے تھے۔ اس کے علاوہ خیمے سے باہر بہت دور تک بانات و قالین کا فرش بچھایا گیا تھا جس کے دونوں طرف باوردی سپاہی، قدم سے قدم ملائے، سینہ تانے، تلواریں اٹھائے اور کمر باندھے رعب و جلال کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ جب مغیرہ آئے تو دُور سے اُن کا استقبال کرنے کے لئے ایک فوجی وفد موجود تھا۔ مغیرہ سمجھے اس وفد کا صدر ہی ایران کا کمانڈر ان چیف ہی۔ مگر جب انھیں بتایا گیا کہ وہ کمانڈر ان چیف کا ادنیٰ خادم ہی، تو انہوں نے مطلق کسی مرعوبیت کا اظہار نہیں کیا۔ یہ وفد بانات و قالین کے فرش پر سپاہیوں کی دورویہ قطار کے درمیان سے مغیرہ کو لے جا رہا تھا او شاہی رعب و داب کی پوری فضا چاروں طرف نظر آ رہی تھی لیکن مغیرہ پر اس کا کوئی اثر نہ تھا، آپ انتہائی بے توجہی اور لاپرواہی سے ایرانی کمانڈر ان چیف کے خیمے تک پہنچے اور اُسے ایک زرنگار تخت پر بیٹھا ہوا دیکھا جسے جواہرات کی چمک دمک نے آفتاب کی طرح چمکا رکھا تھا، مگر مغیرہ پر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور ٹھیک رستم کے بالمقابل جا کر نہایت بے نیازی و لاپرواہی سے اُچک کر تخت پر اُسکے

بازو میں بیٹھ گئے۔ اس بے ادبی اور گستاخی پر افسروں اور غلاموں نے انھیں ہاتھ پکڑ کر نیچے اتار دیا۔ اس پر مغیرہ بھپر پڑے۔ مگر ایرانی فوج کے کمانڈر نے اسے بھی گنوارپن پر محمول کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ مغیرہ نے یہ دیکھا تو سب کی طرف مخاطب ہو کر بولے :-

"تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہارے بلانے سے آیا ہوں اور تمہارا مہمان ہوں۔ مگر مجھے حیرت ہے کہ اس کے باوجود تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا جو اخلاقی اعتبار سے بہت پست ہے۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت و افسوس مجھے اس پر ہے کہ تمہارے یہاں ایک آدمی خدا بن کر بیٹھتا ہے اور تم سب اُس کے آگے غلاموں کی طرح سجدے کرتے ہو اسلام اس دستور کا قائل نہیں"

عراق کے ایک شہر قادسیہ (جو اُس وقت بہت بڑا شہر تھا مگر اب ویران ہے) کی فتح کی خبر جب خلیفۂ دوم کو ملی تو آپ نے سب کو جمع کیا اور ایک طویل تقریر کی اور اس تقریر کے اختتام پر فرمایا ——— میں نہ بادشاہ ہوں اور نہ بادشاہوں کی طرح تم کو غلام بنانا چاہتا ہوں، میں خود تمہاری طرح خدا کا ایک بندہ ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ حکومت و فرمانروائی کی ذمہ داریاں تم نے مجھے سونپ رکھی ہیں لیکن اگر میں اس سے ناجائز فائدہ اٹھاؤں اور بادشاہوں کی طرح خدا کی مخلوق کو اپنے آستانے پر جھکانا چاہوں تو یہ میری سب سے بڑی بدبختی ہے۔ اس کے برعکس میرا فرض صرف یہ ہے کہ تمہاری راحت و آسائش کا انتظام کروں جس کا ثبوت میرا قول نہیں، عمل دے گا۔

یاد رہے کہ اس تقریر کے وقت خلیفۂ دوم کی سلطنت کا رقبہ پندرہ لاکھ مربع میل سے زائد تھا۔ یعنی تین چوتھائی ہندوستان کے قریب۔

اسی طرح ایک اور موقعہ پر آپ نے ارشاد فرمایا ——— میں اگرچہ خلیفہ ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ بیت المال کی رقم میں سے میرا حق صرف اتنا ہی ہے جتنا کسی یتیم کی

سرپرست کو یتیم کے مال میں سے ہو سکتا ہے یعنی اگر میری پاس کھانے پینے کو ہے تو کوئی حق نہیں اور اگر نہیں ہے تو صرف اس قدر تم پینے کا حق ہے جو معمولی گزر بسر کے لئے کافی ہو - لوگو تمہارا فرض ہے کہ تم میرے ہر عمل کی نگرانی کرتے رہو اور دیکھتے رہو کہ میں اس مال کا ایک غلط طور سے جمع نہ کروں، نہ اُسے غلط طور سے صرف کروں، تم لوگوں کی کفالت کا انتظام رکھوں، ملک کو بد امنی سے بچاؤں اور تمہیں آفات و خطرات سے محفوظ رکھوں[1]۔

چنانچہ بیت المال میں سے آپ کو صرف ہزار درہم سالانہ یعنی تقریباً بارہ تیرہ سو روپے ملتے تھے ——— پھر جانتے ہو کہ اس بارہ تیرہ سو روپیہ سالانہ لینے والے کی حدودِ مملکت کیا تھیں؟ آپ کی وفات کے وقت اس مملکت کا رقبہ بیس لاکھ، ۵۱ ہزار مربع میل تھا۔ یعنی پورے ہندوستان کے رقبے سے ڈھائی لاکھ مربع میل زیادہ۔

غزوۂ فحل (۱۳۵ھ) کے موقعہ پر معاذؓ سفیر کی حیثیت سے شام کی افواج کے کمانڈر کے دربار میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ نیچے میں ریشم کا فرش بچھا ہے۔ جس پر جابجا سونے کا زرق برق کام آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے۔ آپ یہ دیکھ کر ٹھٹکے اور پھر بجائے فرش کے زمین پر بیٹھ گئے۔ اور جب اُن سے اوپر بیٹھنے کے لئے اصرار کیا گیا تو بھڑک کر بولے ——— جو فرش غریبوں کی محنت و دولت کو غصب کر کے تیار کیا گیا ہو میں اس پر نہیں بیٹھ سکتا۔

خالد ابن الولید، اسلام کی افواج کے بہت بڑے جنرل تھے۔ لیکن ایک بار انہوں نے بیت المال کی رقم میں سے ایک شاعر کی کسی نظم پر خوش ہو کر کثیر رقم بطور انعام دیدی۔ اس پر بارگاہِ خلافت سے بازپرس کی گئی اور سوال کیا گیا کہ عوام کی دولت پر بادشاہوں کی طرح دستِ تصرف دراز کرنے کا حق تمہیں کہاں سے حاصل ہوا؟ چنانچہ اسی الزام میں افواج کی کمانڈ ان کے ہاتھ سے لے لی گئی۔

---

[1] الاسلام والحضارت العربیہ جلد دوم صفحہ ۱۲۸

غرض زندگی کا یہ نقشہ تھا جس سے اسلام نے دنیا کو آشنا کیا تھا اور ریاست و معیشت اور تہذیب و معاشرت کے بارے میں یہ تصورات تھے جن کا درس دنیا کو دیا گیا تھا اور جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کا ایک معمولی انسان جو انقلاب اسلام سے پہلے ایک حقیر ہستی تھا، آج وہ اور اس کے اُسی جیسے ساتھی خود کو بڑے سے بڑے بادشاہ سے کم نہ سمجھتے تھے۔ اور وہ جو ان کا سردار تھا اور خلیفہ و امیر کہلاتا تھا، اُس کا عالم یہ تھا کہ عام انسانوں کی طرح کے ایک گھر میں رہتا تھا، عام انسانوں کی طرح کھاتا تھا، عام انسانوں کی طرح پہنتا تھا اور عام انسانوں کی طرح چلتا پھرتا تھا چنانچہ جب غیر ملکی سفیر دربار خلافت میں آتے تھے، تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے تھے کہ ان مسلمانوں کا فرمانروا جنہوں نے روئے زمین کے بڑے بڑے کج کلاہوں کو مغلوب و متاثر کر رکھا ہے، اُس کے رہنے کی جگہ ایک معمولی انسان سے کچھ زیادہ اچھی نہیں اور اس کے دروازے پر نہ کوئی دربان ہے، نہ نقیب اور عوام کے ساتھ اُس کا برتاؤ بھائیوں جیسا ہے نہ کہ خداؤں اور دیوتاؤں جیسا۔

خلیفۂ دوم کے وقت عراق و شام کی فتح کے بعد وہاں کی مزروعہ و غیر مزروعہ زمینوں کے بارے میں یہ سوال اٹھا کہ آیا انھیں حکومت کی ملکیت سمجھا جائے یا مال غنیمت کی طرح مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے۔ پہلے یہ مسئلہ صحابہ کی مخصوص جماعت کے سامنے پیش ہوا۔ مگر جب اختلاف رائے کی وجہ سے کوئی متفقہ فارمولا طے نہ ہو سکا تو پھر جناب عمر فاروقؓ نے مسجد نبوی میں عام مسلمانوں کا ایک کھلا اجتماع طلب کر کے سب کے سامنے اس سوال کو پیش کیا۔ گویا اُس اصول پر عمل کیا جسے آج کل کی سیاسی اصطلاح میں "ریفرنڈم" کہہ سکتے ہیں۔ آپ نے اس اجتماع میں جو تقریر کی، اُس میں فرمایا:-

"میں نے آپ لوگوں کو اس لئے زحمت دی ہے کہ آپ میری اُن ذمے داریوں میں میرا ہاتھ بٹائیں جن کو آپ ہی نے مجھے سونپا ہے۔ میں بھی آپ لوگوں کی طرح

ایک انسان ہوں۔ آپ جس بات کو حق سمجھیں اُسے ظاہر یں (اس کے بعد آپ نے اصل مسئلے پر اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے بعد فرمایا) جس کسی کو میری اس رائے سے اختلاف ہو، وہ اُسے کھل کر کہے اور جسے اتفاق ہو وہ اپنے اتفاق کا اعلان کرے میں یہ خواہش قطعاً نہیں رکھتا کہ آپ میں سے کوئی بھی بے سوچے سمجھے میری ہاں میں ہاں ملائے[۱]"

اسی طرح خلیفہ اوّل جناب ابوبکرؓ نے ایک اجتماع عام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر میں ٹھیک ٹھیک کام کروں تو آپ لوگ میرے ساتھ تعاون و اشتراک عمل کریں۔ لیکن اگر میں سیدھی راہ سے بھٹکنے لگوں تو پھر آپ اپنی طاقت استعمال کریں اور میرے کس بل نکال دیں[۲]"

غرض اسلام کی بعثت نے روحانی اعتبار سے انسانیت کو جو کچھ دیا، وہ تو ایک الگ چیز ہی لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے جو انقلاب رونما کیا اس نے شہنشاہیت و سرمایہ پرستی کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے اور بادشاہ کے اعمال پر عوام کو محاسب و نگراں بنا کر اُس جمہوریت کا پہلا سنگ بنیاد نصب کیا جس کی ترقی اگر بعض وجوہ کی بنا پر بیچ میں رُک نہ گئی ہوتی تو آج دنیا کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔

اسلامی شہنشاہیت

لیکن داعی اسلام کی وفات کے بعد دُنیا کے اس انقلاب کی عمر صرف ۲۴ سال کی تھی کہ سب سے پہلے امیر معاویہ نے اس کے خلاف بغاوت کی، اور پھر ان کے بعد ان کے بیٹے یزید نے اس بغاوت

۱؎ کتاب الخراج از قاضی ابویوسف صفحہ ۲۵

۲؎ کتاب الاموال۔ ابی عبید صفحہ ۵ و اشہر مشاہیر الاسلام صفحہ ۴۲۸

کی رہی سہی کمی کی تکمیل کردی۔ اس بغاوت کے بعد اسلام کی انقلابی سیاست و معاشرت بدلنا شروع ہوئی اور قابلی سیاست و معاشرت آہستہ آہستہ پھر دنیا پر قبضہ جمانے لگی، اسلام کے احکام پر بظاہر عمل اب بھی ہوتا تھا اور اپنے آپ کو اسلام کے پیرو کہلانے والوں کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی تھی لیکن اب صرف الفاظ رہ گئے تھے اور روح بہت بڑی حد تک مفقود ہونے لگی تھی نمازیں اب بھی پڑھی جاتی تھیں اور جماعتیں اب بھی ہوتی تھیں مگر ان نمازوں اور جماعتوں سے اتحاد اور ڈسپلن کی انقلابی روح دھیرے دھیرے غائب ہوتی جارہی تھی۔ زکوٰۃ دینے والوں اور صدقات و خیرات کرنے والوں کی تعداد بھی کم نہ تھی لیکن دولت کی تقسیم کے جس نظریے کے پیش نظر یہ احکام جاری کئے گئے تھے۔ اس کا سرچشمہ سوکھنے لگا تھا، جمعے اور عیدین کی نمازوں میں خطبے اب بھی دیئے جاتے تھے، مگر اب ان میں عوام کو حکومت و سیاست کے مسائل سے آشنا کرنے اور اخوت و مساوات کی روح پھونکنے کے بجائے یا تو قابلی ذہنیت کی ترجمانی ہوتی تھی اور یا پرانے اقوال کو خشک و بیجان انداز سے پیش کیا جاتا تھا۔

پھر یہ صحیح ہے کہ امیر معاویہ کی حکومت کے بعد اسلام دور دور تک پھیلا اور مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ مگر یہ مسلمانوں کی سلطنتیں تھیں، اسلام کی فرمانروائی نہ تھی۔ یہ سلطنتیں اسپین میں بحرِ اوقیانوس کے ساحل سے لے کر مشرقِ بعید میں بحرالکاہل تک پھیلی ہوئی تھیں اور دنیائے معلوم کا کوئی علاقہ ایسا نہ تھا جہاں مسلمانوں کا قدم نہ پہنچا ہو لیکن اسلامی نظامِ سیاست و معاشرت کا انقلابی قدم اپنی صحیح انقلابی شکل میں کسی ایک جگہ بھی نہ پہنچ سکا، اسلام شہنشاہیت یا امپیریلزم قائم کرنے کے لئے نہ آیا تھا، اس لئے ان سلطنتوں پر عرب افغان، ترک یا مغل وغیرہ من حیث الفرد یا من حیث القوم فخر کریں تو کریں، لیکن دنیائے انسانیت من حیث المجموع ان سلطنتوں میں اپنے درد کا درماں نہ پا سکی۔

ایسا کیوں ہوا؟

اس کا جواب کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ بات یہ ہے کہ داعیِ انقلاب نے انسانی مساوات

وحریت کے اصول بتا دیئے تھے، لیکن ان اصول کو زیرِ عمل لانے کے لئے جس مشینری کی ضرورت تھی اس کی تکمیل کے لئے آپ کی حیات کا مختصر وقفہ ناکافی تھا۔ آپ کے بعد خلافتِ راشدہ کا زمانہ آیا۔ یہ زمانہ بھی زیادہ طویل نہ تھا اور اسلام کے پیامِ انقلاب سے دنیا کو باخبر کرنے اور قابلی طاقتوں کا مقابلہ کرنے میں گذر گیا۔ اس عرصے میں دنیا کی ایک بڑی اکثریت اسلام کے سیاسی معاشی اور معاشرتی نظریوں سے واقف ہوگئی اور عوام نے اپنے حقوق و فرائض کو جان لیا مگر وہ یہ نہ جان سکے کہ ان حقوق و فرائض کو قائم و برقرار رکھنے کا طریقہ کیا ہو۔ اقتدارِ اعلیٰ کے تقرر کا دستور کیا ہو، اس کو فرمانروائی کے حقیقی فرائض و واجبات پر قائم رکھنے کا طریقِ کار کیا ہو، دولت کی پیداوار اور تقسیم کا ضابطہ کیا ہو، عوام کے کن حقوق کی ذمہ داری حکومت پر ہو اور وہ کونسے امور ہیں جن کے انجام نہ دینے پر حکومت کو بدل دینا چاہیئے اور بدل دینا چاہیئے تو کیسے ——— ؟

غرض اصول معلوم تھے، مگر ان اصول کو عملی شکل میں لانے کی مضبوط و موثر مشینری نامعلوم تھی۔ داعیِ اسلام اور داعیِ اسلام کے بعد خلفائے راشدین نے ان پر عمل کیا اس لئے کہ وہ عمل کرنا چاہتے تھے، مگر یہ سوال طے نہ ہوا کہ اگر آگے چل کر کوئی ان پر عمل نہ کرے اور اپنی طاقت و اقتدار کا غلط استعمال کرنے لگے تو اُسے اس بے راہ روی سے کیسے روکا جائے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ جب امیر معاویہ نے شاہانِ خود مختار کی طرح اپنا دربار سجایا تو انھیں اس سے روکنے کی طاقت عوام کے قبضے میں نہ تھی، اور جو طاقت تھی، اس کے صحیح استعمال کا طریقہ وہ نہ جانتے تھے۔ اس لئے اب پھر دنیا کے پرانے رواج کے مطابق اسلام کے اصول کی بجاآوری بھی بادشاہ کے رحم و کرم پر منحصر ہوگئی۔ اور عوام کے ہاتھ میں احتساب و نگرانی کی طاقتور مشین نہ ہونے کی وجہ سے خلیفۃ المسلمین بھی بادشاہ علی الاطلاق بن گیا۔ وہ انصاف کرے تو اس کی مرضی، نہ کرے تو ہماری قسمت اور اُس پر لعنت ——— عوام صرف بغاوت کر سکتے تھے۔ لیکن اگر تحریر و تقریر کی آزادی کو چھین لیا جائے یا سیاسی جماعتوں کے قیام

کو روک دیا جائے اور تعلیمی اداروں کو حکومت کے قبضے میں لے آیا جائے تو پھر بغاوت بھی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ امیر معاویہ کے بعد سے یہی ہوا کہ جو کوئی ان کی مرضی کیخلاف زبان وقلم کو حرکت دیتا تھا، اُسے کامل بے رحمی کے ساتھ دبا دیا جاتا تھا اور اس کے مقابلے میں اپنی مرضی وخواہش کے مطابق اسلام کے اصول واحکام کی تعبیر کرنے والے عالموں قاضیوں اور مفتیوں کا حلقہ پیدا کیا جاتا تھا۔ مسلم اکثریت کے فیصلے اب بھی ہر معاملے میں اسلام کی حقیقی روح کے مطابق ہوتے تھے۔ مگر اب ان فیصلوں کو بر روئے عمل لانے والی طاقت عوام کے ہاتھ میں نہ تھی، اب اس پر قابیلی گروہ کا قبضہ تھا اور یہ گروہ اپنے دستور کے مطابق جس طرح چاہتا تھا، اسلام کے مسائل کو توڑ مڑوڑ کر پیش کرتا تھا اور اپنے چند دانش فروش حواریوں کی مدد سے جس رائے کو چاہتا تھا عام مسلمانوں کی رائے بنا دیتا تھا۔ گویا اجماعِ اُمت کی باگ صرف اُن چند علماء کے ہاتھ میں تھی جن کو شاہی خاندان نے اپنے گرد اکٹھا کر رکھا تھا

دَور میں اُس کی مست آنکھوں کے
محتسب بھی شراب خوار ہوا

خلافت کس کا حق ہی

اسی زمانے میں یہ بحث اٹھی کہ خلافت کس کا حق ہی؟ اس سے پہلے بھی یہ بحث اٹھی تھی اور کچھ لوگوں نے خلافت کو صرف خاندانِ رسول تک محدود کرنا چاہا تھا مگر یہ چل نہ سکی۔ مگر اب یہ سوال اٹھا تو کچھ یہ کہنے والے بھی پیدا ہو گئے کہ خلافت صرف قبیلۂ قریش کا حق ہی؛ کچھ نے کہا کہ عرب کا حق ہی گویا اسلام اس لئے آیا تھا کہ وہ روئے زمین پر خاندانِ رسول، یا قبیلۂ قریش یا اہلِ عرب کی ایک ابدی شہنشاہیت اور امپیریل اِزم قائم کر دیتا!! اجماعِ امت کا فیصلہ ظاہر ہی کہ اس کے خلاف تھا۔ جو اسلام نسل ونسب اور ملک وملت کی دیواریں ڈھانے آیا تھا، کیا وہ نئی دیواریں کھڑی کرے گا؟ جو اسلام انسانوں کی نسبی ونسلی شرافت کے نام

اختیارات کو شاکر صرف عمل صالح کی شرافت قائم کرنے آیا تھا، کیا وہ شریفوں اور سرداروں کا کوئی نیا طبقہ پیدا کرے گا ــــــ؟ مگر اجماعِ امت کی حقیقی آواز کو نہ کوئی سننے والا تھا، نہ سنانے والا اور نہ منوانے والا۔ چند علمار تھے جن سے ضرورت کے مطابق اجماع امت کے خواب کی جو تعبیر مناسب سمجھی جاتی تھی لے لی جاتی تھی۔

قرآن اب بھی موجود تھا اور اس میں اب بھی وہ اصول موجود تھے۔ جو خلافتِ راشدہ کے زمانے میں زیرِ عمل لائے گئے اور جن کا مفہوم اتنا صاف و واضح ہے کہ انگلستان کے ایک مشہور مدبر و خطیب ایڈمنڈ برک[۱] کو عیسائی ہونے کے باوجود اٹھارویں صدی میں بھی ان کا مفہوم سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ چنانچہ اپنی اُس مشہور تقریر میں جو ہندوستان کے ایک ظالم گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے خلاف پارلیمنٹ میں کی گئی تھی، وہ کہتا ہے:۔

"اگر کوئی شخص قرآن کی ایک آیت بھی ایسی بتا دے جس میں بادشاہ کو مطلق العنان اختیارات دیئے گئے ہوں تو مجھے یہ اعتراف کر لینے میں کوئی تأمل نہ ہو گا کہ میں نہ تو قرآن کے بارے میں کچھ جانتا ہوں اور نہ ایشیا کے بارے میں۔"[۱]

لیکن قرآن کی کھلی ہوئی ہدایتوں اور داعی اسلام اور داعی اسلام کے جانشینوں کے کھلے ہوئے عمل کے باوجود امیر معاویہ کے بعد سے مسلمانوں کی جتنی حکومتیں دُنیا میں قائم ہوئیں وہ مطلق العنان تھیں۔ یہ بات بحث طلب ہو سکتی ہے کہ ان حکومتوں کے تمام فرمانروا یا اکثر فرمانروا نیکدل اور کریم النفس تھے یا نہیں اور عدل و انصاف سے حکومت کرتے تھے یا نہیں لیکن یہ بات بالکل مسلّمہ ہے کہ ان حکومتوں میں عوام کو کوئی دخل و اختیار نہ تھا اور نظم و نسق کے اصول و آئین کو بنانے یا بگاڑنے میں ان کی کوئی آواز نہ تھی۔ وہ عادل

[۱] اسپیچز آف ایڈمنڈ برک۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۱۰۵

بادشاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھتے تھے، مگر ظالم کو صرف کوستے تھے۔ اس پر لعنت بھیج سکتے تھے، مگر وہ بھی کھل کر نہیں، چھپ کر، ورنہ زندگی یا کم ازکم آزادی کی بھینٹ مانگی جاتی۔

خلافِ رائے سلطاں رائے جستن زخونِ خویش باید دست شستن

اگر شہ روز را گوید شب است ایں بباید گفت اینک ماہ و پرویں

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کو جس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے اسلام آیا تھا وہ پوری طرح رفع نہ ہو سکی اور گو انسانیت کے بہت سے زخم اچھے ہو گئے، مگر ابھی بہت سے باقی تھے۔ زخموں کو پیدا کرنے والے مادہ کا تنقیہ پوری طرح نہ ہو سکا جو بار بار نئی نئی شکلوں میں ابھر کر انسانی کرب و بے چینی میں اضافہ کرتا رہتا تھا، ان زخموں کا مرہم معلوم ہو گیا تھا، مگر مرہم بنانے اور لگانے والے ہاتھ زنجیروں میں باندھ دیئے گئے تھے، روشنی آنکھوں کے سامنے تھی، مگر وہاں تک پہنچنے کے راستے پر پہرے بٹھا دیئے گئے تھے، منزلِ مقصود کی سرسبز وادی نظر آنے لگی تھی، مگر حصولِ مقصود کے تمام ذرائع مسدود کر دیئے گئے تھے۔

انقلاب اسلام اور ڈکٹیٹرشپ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے جس ہیئت سیاسیہ کی بنا رکھی تھی، اس کو قائم کرنے کے لئے ایک آہنی بازو کی ضرورت تھی، زہر کو زہر مارتا ہے۔ اس لئے قبائلی تشدد کو دبانے کے لئے اولاً ایک ایسی فولادی ڈکٹیٹرشپ قائم ہونی چاہیے تھی جو پرانے تصورات کے بچے کھچے آثار کو ازسرنو ابھرنے کا موقعہ نہ ملنے دیتی اور جو نیا نظام اسلام نے نافذ کیا تھا اُسکی تفصیلات سے لوگوں کو پوری طرح مانوس کر دیتی۔ جس انسانی معاشرت کا مذاق صدیوں سے بگڑا چلا آرہا تھا، اس کی رگ رگ سے قدامت پسندی کے زہریلے جراثیم کو نکالنے کے لئے تھوڑی سی بہت مدت تو درکار ہونی ہی چاہیئے تھی۔ اس لئے سیاسی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ جب تک انقلابِ اسلام کی روح عوام کی زندگی کے ہر ہر گوشے میں پوری طرح اپنا گھر نہ کر جاتی

ان پر ایک ایسی ڈکٹیٹر شپ مسلط رکھی جاتی جسے عوام کا اعتماد تو ضرور حاصل ہوتا لیکن اسی کے ساتھ پرانے غیر صالح نظام کے تمام باقیات السیّآت کو نیست و نابود کرنے کی پوری طاقت بھی بے روک ٹوک حاصل ہوتی۔ لیکن خلفائے اوّل نے اسی سیاسی نکتے کی طرف سب سے کم توجہ کی۔ وہ بالکل غیر محفوظ طور پر رہتے تھے، تن تنہا گلیوں، سڑکوں اور بازاروں میں گھومتے تھے اور ہر شخص بے روک ٹوک ان سے مل سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عمر فاروق جو قیصر و کسریٰ کی شہنشاہیتوں کو ڈھا رہے تھے خود ان کی جان اتنی غیر محفوظ تھی کہ ایک ادنیٰ درجے کے عیسائی غلام کو جب اُن کے کسی فیصلے سے ذاتی رنجش پیدا ہوئی تو وہ آپ کے قتل کرنے میں بڑی ہی آسانی سے کامیاب ہو گیا۔ اسی طرحِ عثمان و علی کو شہید کرنے میں بھی قابیلی طاقتوں کو مطلق کسی قسم کی کوئی مشکل پیش نہ آئی اور انہوں نے بڑی آسانی سے سارے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

آج بیسویں صدی میں جمہوریت و مساوات کے تصورات پہلے سے نسبتاً بہت زیادہ عام ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہٹلر جیسے ہر دلعزیز جرمن لیڈر کا یہ حال تھا کہ ہر وقت فوج کے ایک مسلّح دستے کی حفاظت میں رہتا تھا، اور کوئی شخص اجازت نامہ حاصل کئے بغیر اس تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ روس کے حاکمِ اعلیٰ اسٹالن کو اپنے ملک میں جو مقبولیت حاصل ہے اُس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا بھی یہ حال ہے کہ جب باہر نکلتا ہے تو موٹروں میں مسلح سپاہی ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ خود تیسری موٹر میں ڈرائیور کے پہلو بہ پہلو بیٹھتا ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی اور اپنی کاروانوں کی جگہ ادلتا بدلتا رہتا ہے تاکہ اگر کوئی "دشمن" حملہ کرنا چاہے تو اُسے اسٹالن کی صحیح جگہ کا علم نہ ہو سکے ——— لیکن اس کے مقابلے میں عہدِ اوّل کے خلفائے اسلام کا یہ حال تھا کہ عمر فاروق، عثمان غنی اور علی مرتضیٰ جیسے جلیل القدر فرمانرواؤں کو قتل کر دینے

کا ارادہ جب مخالفوں نے کیا تو انھیں اتنی مشکل بھی پیش نہ آئی جتنی پرائے کھیت سے گاجر مولی توڑنے میں آسکتی ہی۔

غرض، ہیئت سیاسیہ و حاکمہ میں انقلاب اسلام کے نظام کے پوری طرح نافذ نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خلفائے اوّل نے جمہوریت و مساوات کے تمام اصول پر ایک دم عمل شروع کر دیا اور اپنی اور اپنے مقصد کی حفاظت کا کوئی ایسا بند و بست نہ کیا جو قابلی طاقتوں کو بے بس کر سکتا۔

باب ۹

انقلابِ اسلام کے نتائج

یزید ابن معاویہ کی "بغاوت" نے اسلام کے انقلابی پیام کو صحیح رنگ میں جلوہ گر ہونے سے یقیناً روک دیا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام نے انسانی ذہنیت انسانی معاشرت و معیشت اور انسانی نظامِ سیاست کی جو نئی تعمیر کی تھی وہ سب کالعدم ہوگئی۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام جس شان سے اُٹھا تھا اور انسانیت کی اصلاح کے لئے جو اصول اس نے مرتب کئے تھے، وہ سب بروئے عمل نہ آسکے، مگر پھر بھی اس انقلاب کی کامیابیاں کم نہیں ہیں۔ ان کامیابیوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کا محل یہ نہیں ہے۔ تاہم اسلام دنیا کے جس خطے، جس علاقے، جس قوم اور جس ملک میں بھی پہنچا اور وہاں اُس نے انسانی فکر و عمل کی دنیا میں جو نیا رنگ پیدا کیا اس کا اجمالی خاکہ یہ ہے

۱۔ اسلام کی سب سے بڑی اور سب سے پہلی کامیابی عقیدۂ توحید کی عام اشاعت و مقبولیت ہے۔ انسانی جبینِ نیاز کے لئے بیسوں خداؤں کے جو آستانے بنے ہوئے تھے وہ ختم ہوئے۔ اپنے اوہام و خیالات سے ڈرنا، مظاہرِ قدرت کو خدا سمجھنا اور ہر چیز میں

دیوتا دیکھنا ختم ہوا جس کے ساتھ ذہنی غلامی اور ذہنی مرعوبیت کا دور بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا اور اس کے بجائے آسمان و زمین کے مناظر اور قدرت کے مظاہر پر غور و خوض کرنے کا دور شروع ہوا۔ سائنس و فلسفہ کو اوہام کے قید خانے سے باہر نکلنے کا موقع ملا اور انسانی دماغ نے آگ کے شعلوں، آفتاب کی کرنوں، پہاڑ کے پتھروں اور اونچے اونچے درختوں کو خدا سمجھ کر اُن سے لرزنے اور کانپنے کے بجائے اُن پر غور کرنا، اُن سے فائدہ اٹھانا اور اُن کی تسخیر کرنا سیکھا ——— ذہن و دماغ کی یہی غلامی، انسانیت کی سب سے بڑی غلامی تھی، اس لئے اس سے بچانے کے لئے اتنا اہتمام کیا گیا کہ نہ صرف بت پرستی ہی کو روکا گیا بلکہ بت تراشی و تصویر کشی کی بھی ممانعت کی گئی اور پھر اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر قبروں کو پختہ بنانے کی بھی مذمت کی گئی تاکہ ایسا نہ ہو کہ انسان کے پرانے تعصبات کو ان پردوں میں پھر جگایا جاسکے اور چند نفوس اپنے مفاد کی خاطر پھر کسی فرعون و شداد کو خدا بنادیں یا کسی گوسالہ و مقبرے کے آگے انسانوں کی گردنیں جھکا کر دنیا کو پھر ذہنی غلامی و مرعوبیت میں مبتلا کردیں۔

۲۔ خدا شناسی و خدارسی کسی خاص طبقے کا استثنائی حق نہیں رہی خدا اور بندے کے درمیان جو حجابات، انسانوں نے کھڑے کر رکھے تھے وہ سب ختم ہوتے اور ہر شخص کو علم سیکھنے اور سکھانے کا یکساں حق حاصل ہوا۔ خدا سب کا مربی ہے اور اس کی رحمت کا دروازہ ہر شخص پر ایک ہی طرح کھلا ہوا ہے، اس لئے اس تک پہنچنے کے لئے کسی برہمن، کسی قسیس، کسی صوفی یا کسی پجاری کے درمیانی واسطے کی احتیاج نہیں رہی۔

۳۔ خدا کی عبادت اور روزمرہ کی معاشرت دونوں میں سینکڑوں پیچیدہ رسوم جو مذہب کے اجارہ داروں نے اپنی مفاد و اغراض کی خاطر رائج کر رکھی تھیں۔ وہ سب ختم کی گئیں اور ان کی جگہ نہ صرف عبادت میں بلکہ پیدائش سے لے کر موت تک کی ہر معاشرتی رسم میں بھی فطری سادگی کو پیش نظر رکھا گیا جن کی بجاآوری کے لئے پروہت یا پادری کے نام سے

کسی "پیر مذہب" کے درمیانی واسطے کی ضرورت باقی نہیں رہی،

۴۔ ایمان وعقیدے کی پختگی کے لئے محیر العقول کرشموں اور معجزوں پر یا اندھی تقلید و تائید پر زور دینے کے بجائے کائناتِ فطرت کے مظاہر و مناظر پر غور و خوض کرنے کی تعلیم دی گئی۔ اسی بنا پر امام رازیؒ (صاحبِ تفسیر الکبیر) کا ارشاد ہے کہ جو شخص اسلامی عقائد پر غور و خوض کر کے عقل و فراست کے ساتھ اُن پر یقین نہیں رکھتا اُس کا ایمان و یقین ناقص رہتا ہے۔

۵۔ دین اور دُنیا دو متضاد چیزیں نہ رہیں بلکہ ایک دوسرے کی مدد و معاون بن گئیں۔ رہبانیت و ترکِ دنیا کے نام سے قوائے عمل کو مفلوج کر دینا، تسلیم و رضا کے نام سے ذلت و مظلومیت پر قناعت کرنا اور اخلاق و انکساری کے نام سے غلامی و بندگی پر فخر کرنا ختم ہوا۔

۶۔ دوسرے مذہبوں کے ساتھ محض ظاہرداری یا مجبوری کی بنا پر نہیں بلکہ اصلی، دلی اور گہری رواداری کا دور شروع ہوا۔ دنیا کی ہر قوم کے ہادی و مصلح کو برحق قرار دیا گیا اور دوسرے مذہبوں سے نفرت و عناد رکھنے یا علیحدگی و کنارہ کشی اختیار کرنے کے بجائے، ہر الہامی کتاب رکھنے والی ملت کے ساتھ مل جل کر رہنے اور آپس میں ہر قسم کے معاشرتی اور ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی ہمت افزائی کی گئی۔

۷۔ انسانوں میں کوئی اونچ نیچ نہیں، کوئی چھوت اچھوت نہیں، دولت و ثروت یا نسل و نسب کوئی معیار شرافت نہیں، نہ صرف ہر مسلمان بلکہ ہر الہامی کتاب رکھنے والے کے ساتھ شادی کرنے، ساتھ کھانے اور ساتھ رہنے میں کوئی برائی نہیں، قبیلے اور قومیں صرف اس لئے ہیں تاکہ باہم ایک دوسرے کی پہچان ہو سکے۔ ان میں سے کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ فضیلت صرف اُسے ہے جس کے اعمال اچھے ہیں[1]۔

---

[1] انّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم (قرآن)

"آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز | قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز | نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
تیری سرکار میں پہنچے تو سب ہی ایک ہوئے | بندۂ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے"

(اقبال)

۸۔ بادشاہ بالکل خدائے مطلق نہ رہا بلکہ احکامِ الٰہی کی اطاعت کا ثبوت دینا اُس کے لئے لازم ہو گیا اور احکامِ الٰہی کی تفسیر کا حق علماء کو دیا گیا۔ اور عالم بننے کا حق ہر انسان کو ———— اس لئے بادشاہ کی غیر مسئول خود اختیاری پر ایک حد تک روک ضرور قائم ہو گئی۔ پھر دنیا کو یہ بتایا گیا کہ ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے سر ہتیلی پر رکھ کر حق بات کا اعلان کرنا سب سے بڑی عبادت ہے۔

۹۔ نسلی، وطنی، قومی ہر امتیاز ختم ہوا، نہ کوئی قوم بلند نہ کوئی نسل بلند۔ ہر جگہ کا مسلمان بھائی قرار دیا گیا اور ہر مسلمان میں اُولی الامر حتیٰ کہ خلیفۃ المسلمین بننے کی صلاحیت تسلیم کی گئی۔ چنانچہ صدیوں تک دنیائے اسلام نے ترک قوم کے سلاطین کو خلیفۃ المسلمین کے نام سے پکارا، اُن کی اطاعت کی اور مسجدوں میں ان کا نام خطبہ میں پڑھا گیا حالانکہ ترک آغازِ اسلام سے کئی سو سال بعد مسلمان ہوئے تھے۔

۱۰۔ جماعت بندی، اطاعت (ڈسپلن) اور امارت پر زور دیا گیا، جس نے اجتماع اور ڈسپلن کی تعلیم دی اور انتشار و پراگندگی سے بچایا۔ اُولی الامر کی اطاعت کا اصول عام ہوا اور خلافت کے نام سے دین و دنیا کے صحیح امتزاج کو قائم کیا گیا۔

۱۱۔ عورتیں جائداد نہ رہیں جن کو ہبہ، بیع یا رہن کیا جا سکے۔ اس کے برعکس دُنیائے انسانیت کی اس نصف آبادی کو مرد کے برابر انسانیت کے تمام حقوق دیئے گئے۔ اُسے مہر کا حق دیا گیا، کفالت و نفقہ پانے کا حق دیا گیا، طلاق حاصل کرنے کا حق دیا گیا، آبائی جائداد میں سے ورثہ پانے کا حق دیا گیا، اولاد کی پرورش کی ذمہ داری مرد پر ڈالی

گئی حتیٰ کہ رضاعت کے زمانے میں عورت کو یہ حق دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی مرد سے وصول کر سکتی ہے علاوہ ازیں ایک سے زائد بیویاں رکھنے پر بھی بند لگایا گیا

۱۲۔ اسلام کے بنیادی اصول و عقائد کو انسانی فلاح کا آخری پیغام قرار دیا گیا جس کا اثر یہ ہوا کہ اصولی حقیقتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عوام کے سامنے روشن ہو کر آگئیں اور دین فروشوں کے لئے عوام فریبی کا موقعہ باقی نہ رہا۔ اپنے اغراض کے لئے نئے نئے اصول گھڑنے اور اٹل سچائیوں کو مسخ کر کے انسان کو اولاً ذہنی انتشار میں مبتلا کرنے اور پھر ذہنی غلامی میں جکڑنے کا دور ختم ہوا۔

داعیِ انقلاب اور حکیم و فلسفی میں کیا فرق ہے؟

اس موقعہ پر یہ یاد دلادینا ضروری ہے کہ ہر سچائی ایک ابدی حقیقت ہے جو پہاڑوں سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ اس لئے کسی سچائی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کہ اُسے کسی نے "ایجاد" کیا ہے، سچائی خدا کی ایک صفت ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس لئے مذکورہ بالا تمام اصول بھی سچائی ہونے کی حیثیت سے ابدی ہیں اور علمی تحقیقات کرنے والے کے لئے یہ بتانا کچھ مشکل نہیں کہ ہزاروں سال پرانے، قبل از تاریخ زمانے میں بھی ان اصولوں کا وجود تھا۔ اسی بناء پر اسلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کی تعلیمات اُس کی "ایجادات" ہیں۔ اس کے برعکس اُس نے ہمیشہ خود کو تمام پچھلے انبیاء کی اصولی تعلیمات کی تصدیق و توثیق کرنے والا قرار دیا۔ اس لئے انقلاب اسلام کا وصف یہ نہیں ہے کہ اس نے مذکورہ بالا سچائیوں کو "ایجاد" کیا، بلکہ اس کا وصف یہ ہے کہ اس نے ان سچائیوں کو عالمگیر بنایا اور چند خواص کے حجروں سے نکال کر ان کو عوام کے جھونپڑوں تک پہنچایا۔ اسلام سے پہلے بھی یہ سچائیاں موجود تھیں لیکن ان کا علم چند مخصوص حلقوں تک محدود تھا اور ان پر عمل ان سے بھی کمتر حلقوں تک۔ مگر اسلام نے دنیا کے ہر پست و بلند اور ہر چھوٹے بڑے پر ان کی بخشائش عام کر دی اور کُل دنیائے انسانیت کو من حیث المجموع اِن سے فائدہ اٹھانے اور ان کے مطابق

زندگی کے تمام رسوم و رواج کو نئے قالب میں ڈھالنے کا موقعہ بہم پہنچایا۔

ایک حکیم و فلسفی اور ایک داعی انقلاب میں یہی فرق ہے کہ حکیم و فلسفی کا فلسفہ و حکمت صرف اس کے گھر کی چہار دیواری یا اُس کے شاگردوں کے مخصوص حلقوں تک محدود رہتا ہے۔ لیکن داعی انقلاب کی تعلیمات و ہدایات عوام کے ہر طبقے، ہر گروہ اور ہر فرد میں سرایت کر جاتی ہیں اور ان کی زندگی کا نقشہ بدل دیتی ہیں، ان کو حیات تازہ بخشتی ہیں اور دنیا کو ایک نیا خلعت عطا کرتی ہیں، اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ بالا حقیقتوں کو جاننے والے کچھ نفوس قدسیہ ہر زمانے میں رہے ہیں، مگر ان حقیقتوں کو عام کرنے اور ان کو دبانے، مٹانے اور مسخ کرنے والی ابلیسی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی قوت و ہمت دنیا میں نہ تھی۔ اسلام نے یہی قوت دنیا کو دی جس کے بعد انسانی فلاح و بہبود کی آرزوئیں اور تمنائیں، صرف آرزوئیں اور تمنائیں ہی نہ رہیں، بلکہ انہوں نے عملی شکل اختیار کی، نفوس قدسیہ کے خواب کی تعبیر نمودار ہوئی اور ساری دنیا ایک نئے رنگ میں رنگ دی گئی۔

اس اعتبار سے اسلام کی کامیابی دُنیائے انسانیت کی پہلی کامیابی ہے اور اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ دنیا نے من حیث المجموع مذکورہ بالا سچائیوں کی روشنی انقلاب اسلام کے بعد ہی دیکھی، اس سے پہلے یہ روشنی صرف خواص کا حصّہ تھی، عوام کا نہیں۔

لیکن اسلام کی مذکورہ بالا کامیابیوں کے علاوہ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو امیر معاویہ اور یزید کی "بغاوت" کی وجہ سے پوری طرح عملی جامہ نہ پہن سکیں اور جو بر روئے عمل تو آئیں مگر جن کی تکمیل ادھوری اور ناتمام رہ گئی۔ ان کی اجمالی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ سلطنت و بادشاہت کا خاتمہ اور باپ کے بعد بیٹے کے ولی عہد ہونے کی رسم کا خاتمہ۔ سلطنت و بادشاہت کے بجائے خلافت کا قیام جس میں عوام کے مفاد میں حکومت کی جائے اور خلیفہ کا انتخاب بھی عوام کے سپرد ہو۔ کسی فرد، کسی قبیلے، کسی قوم

یا کسی نسل کو یہ حق نہ ہو کہ وہ دنیا پر اپنے یا اپنے قبیلے، یا اپنی قوم یا اپنی نسل کے مفاد میں حکومت کرے۔ بالفاظِ دیگر سیاسی و معاشی دونوں قسم کی شہنشاہیت یا امپیریل ازم کا مکمل خاتمہ۔

۲۔ خلیفہ کو حق نہیں کہ وہ من مانے قوانین بنائے یا من مانے پن سے حکومت کرے اس کے برخلاف اس کا ہر فعل آئین و ضابطے کے مطابق ہو اور اس آئین و ضابطے کی بنیاد کتاب و سُنت اور اجماعِ اُمت یعنی عوام کے اختیار تمیزی پر ہو۔

۳۔ انسان کو غلام بنا کر بیچنے کا انسداد جس کے لئے اصولی ہدایات دیدی گئی تھیں مگر ان ہدایات کے مطابق غلامی کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنے کا کام حالات و ماحول کے پیش نظر بعد کی نسلوں پر...... موقوف تھا ـــــ اس وقت دنیا کے مہذب ترین ممالک یونان و روما کا بھی یہ دستور تھا کہ جنگی قیدیوں کو قتل کر دیا جائے یا غلام بنا لیا جائے لیکن داعی اسلام نے اسلام کی سب سے پہلی "جنگ"، غزوہ بدر کے موقعہ پر جس اصول کی عملی تعلیم دی وہ یہ تھا کہ قیدیوں کو غلام نہ بنایا جائے بلکہ کچھ تاوان لے کر چھوڑ دیا جائے۔ جو قیدی تاوان بھی نہ دے سکتے تھے۔ انھیں یونہی چھوڑ دیا گیا، البتہ اُن میں سے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اُن سے تاوان کے عوض کچھ مسلمانوں کو لکھانے پڑھانے کا کام لے کر رہا کر دیا گیا۔ اسی طرح فتح مکّہ کے موقعہ پر بھی تمام قیدی آزاد کر دیئے گئے۔ خلیفۂ دوم جناب عمر فاروقؓ نے ایک موقعہ پر عمرو ابن العاص (گورنر مصر) سے فرمایا تھا "ـــــ یہ کیا ہے کہ تم لوگوں کو غلام بنا لیتے ہو حالانکہ وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوتے ہیں۔[۱]"

۴۔ دولت کی تقسیم عوام کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر کی جائے، نہ کہ کسی مخصوص طبقے

---

[۱] حسن المحاضرہ۔ جلد دوم صفحہ ۱

قبیلے یا قوم و نسل کے مخصوص مفاد کو سامنے رکھ کر ——— تاکہ سب کو امن و اطمینان حاصل ہو اور یہ نہ ہو کہ کروڑوں انسان تو افلاس و عسرت کی بے چین زندگی بسر کریں لیکن چند مٹھی بھر نفوس مال و دولت کو اپنی عیش و راحت پر پانی کی طرح بہائیں اور مٹی کی طرح روندیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ایک طرف حکومت و سیاست کا نظام بدلا گیا اور دوسری طرف "شاہی خزانے" کو عوام کی ملکیت قرار دے کر اس سے ہر شخص کی کفالت و پرورش کا انتظام کیا گیا۔ اسی کے ساتھ تقسیم دولت کا یہ اصول طے کر دیا گیا کہ: ایسا نہ ہونے دو کہ دولت صرف چند افراد میں محدود ہو کر رہ جائے، اس لئے دولت مند کو آزاد نہ چھوڑ دو بلکہ اس کی فالتو دولت کو عوام میں گردش دینے کا اصول قائم کرو[۵]

۵- دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا جائے اور نہ ایسے دستور قائم کئے جائیں جن سے محنت و مشقت کے بغیر دوسروں کی محنت کا صلہ کسی کو ملتا رہے۔ اسی غرض سے سود کی قسم کے ہر لین دین کو بند کیا گیا اور قمار بازی کی قسم کے ہر دستور کو روکا گیا۔

۶- دولت کے ذخائر جمع کر کے نہ رکھے جائیں بلکہ ہر وہ روپیہ جو ضرورت سے زیادہ ہو اس پر عوام کا حق تسلیم کیا جائے، جس کے لئے ایک طرف تو زکوٰۃ، صدقات و خیرات اور عُشر وغیرہ کے علاوہ مرنے والے کی چھوڑی ہوئی دولت کو اس کے تمام قریبی اعزا میں تقسیم کرنے کا اصول جاری کیا گیا اور دوسری طرف بخل کی مذمت سختی کے ساتھ کی گئی۔

بخیل ار بود زاهد بحر و بر
بہشتی نہ باشد بحکم خبر (سعدیؒ)

۷- حکومت و ریاست کا تعلق صرف ملکی نظم و نسق ہی سے نہ ہو بلکہ دولت کی تقسیم پر بھی اُس کی براہ راست نگرانی ہو تاکہ یہ تقسیم عوام کے مفاد میں ہو نہ کہ افراد کے مفاد میں۔

---

[۵] صحیح البخاری۔ جلد اول۔ کتاب الزکوٰۃ

لیکن امیر معاویہ کی "بغاوت" نے ان تمام اصولوں کی صحیح نشو ونما کو روک دیا جسکی وجہ سے ہر ملک اور ہر زمانے کے حالات کے مطابق ان اصولوں کی بنیاد پر سیاست اور معیشت کے نظام کی تعمیر نہ ہو سکی۔ جس طرح کسی درخت کا پودا پوری نگہداشت نہ ہونے سے پوری طرح برگ و بار نہیں لا سکتا، اسی طرح ان اصولوں کا پودا بھی اپنی حقیقی آن بان کے ساتھ برگ و بار نہ لا سکا۔

باب ۱۰

انقلابِ اسلام کے بعد

امیر معاویہ کے بعد اسلام کے اثرات

اگر امیر معاویہ کی شہنشاہیت پسند حوصلہ مندی اسلام کی انقلابی تعلیمات کی خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند نہ کرتی تو دنیا کے مسائل صدیوں پہلے طے ہو گئے ہوتے۔ داعی اسلام نے اپنی زندگی کے چالیسویں سال میں سنہ ہجری سے تیرہ سال قبل ۶۱۰ء کے قریب انقلاب اسلام کا پہلا درس دنیا کو دیا تھا اور اس کے بعد سے آپ کی زندگی کے پورے ۲۳ سال اسی پیام کی تبلیغ واشاعت میں صرف ہوئے ۲۳ سال کی اس مدت میں روئے زمین کا وہ دس لاکھ مربع میل رقبہ جو جزیرہ نمائے عرب کے نام سے موسوم ہے اسلام کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی پر عامل ہو گیا۔ یعنی فلسطین سے لے کر یمن اور حضرموت تک اور حجاز سے لے کر عمان و کویت تک انسانوں کا جو جم غفیر بستا تھا وہ سب آپ کی حیات ہی میں زندگی کا پرانا چولا بدل چکا تھا۔ آپ کی رحلت کے بعد خلافتِ راشدہ کا جو دور آیا وہ صرف ۲۹ سال رہا[1]۔ اس کے بعد امیر معاویہ کی شہنشاہیت شروع ہو گئی۔ لیکن

---

[1] لیکن اگر حضرت علی کے زمانہ خلافت کو شامل نہ کیا جائے تو پھر یہ مدت صرف ۲۴ سال رہ جاتی ہے

اس ۲۹ سال کے مختصر زمانے میں اسلام کا پیام دنیائے معلوم کے نصف سے زائد حصے پر چھا گیا۔ مشرق میں افغانستان، سندھ اور پنجاب تک مغرب میں مصر اور ٹیونس کے میدانوں تک اور شمال میں عراق و شام اور سمرقند و بخارا تک ہر ملک نے اسلام کی انقلابی پیام کے مطابق زندگی کی نئی تعمیر شروع کی ـــــــ گویا امیر معاویہ کے اعلان خلافت تک تقریباً ایک چوتھائی صدی کے زمانے میں آدھی سے زائد دنیا کا نقشہ اسلام بے بدل دیا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر اسلام کی اشاعت اسی رفتار سے جاری رہتی تو ساری دُنیا کا نقشہ بدلنے میں اتنی ہی مدت اور درکار ہوتی۔ لیکن جب امیر معاویہ نے مرکز خلافت کو مکے کی بے جاہ و حشم والی سادہ عمارت سے اٹھا کر دمشق کی عالیشان محلسراؤں میں منتقل کیا اور اسلام کا پیام پہنچانے والے ایک معمولی انسان کی طرح رہنے سہنے کے بجائے سرداروں اور رئیسوں کی طرح رہنے لگے تو قدرتاً صورتِ حالات بدل گئی۔ دُنیا اب بھی اسلام سے اثر پذیر ہوتی تھی مگر اب اس اثر پذیری کی نوعیت بدل گئی تھی۔ اس کے قبل انسانیت اسلام کے پیام میں اپنے مصائب کا علاج پاتی تھی اور محبت و منت پذیری کے ساتھ اس پیام کا خیر مقدم کرتی تھی۔ مگر اب اس خیر مقدم میں خوف و ہراس کا جذبہ بھی شامل ہونے لگا تھا۔ دمشق کے سلطان کی طاقت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ آج دنیا میں اس کی سطوت و قوت کا وہ ڈنکہ بج رہا ہے کہ اگر اس کے سامنے سرِ اطاعت خم نہ کیا گیا تو دنیا میں کوئی پناہ گاہ نہیں۔ چنانچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر معاویہ کے بعد اسلامی فتوحات کا سیلاب دور دور تک پہنچا، لیکن یہ سیلاب عوام کے جذباتِ محبت و منت پذیری کو اتنا نہ اُبھارتا تھا جتنا جذباتِ خوف و مرعوبیت کو برانگیختہ کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فتوحات تو ہوئیں، مگر یہ فتوحات انسانی دل و دماغ پر بہت کم اثر ڈال سکیں۔ تاہم دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہ بچا جو کسی نہ کسی حد تک اسلام کی تعلیمات سے متاثر نہ ہوا ہو۔

ہندومت امیر معاویہ کی سلطنت کے وقت دنیائے انسانیت کو مذہب و معاشرت کے لحاظ سے تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ہندومت اور عیسائیت، ہندومت ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا اور ہزار ہا سال کے رسوم و رواج اور آبائی خیالات و اعمال پر عمل پیرا ہونے کا دوسرا نام تھا۔ جس کی طبقاتی تقسیم کی وجہ سے مذہب و روحانیت کی شہنشاہیت برہمنوں کے چھوٹے سے طبقے کے ہاتھ میں تھی، سیاست و نظم و نسق کی بادشاہی کھتریوں کی ٹکڑی کے قبضے میں، تجارت و زراعت کی فرمانروائی ویش نامی مختصر سے گروہ کے حصے میں اور اس کے بعد انسانوں کا جو جم غفیر بچا وہ شودر تھا یا اچھوت —— جن کے حصے میں صرف محنت کشی، مزدوری اور غلامی آئی تھی۔

دین و دنیا کے اس نظام کو قابلی دماغ کا بہترین شاہکار کہا جا سکتا ہے جس میں خواص کے عیش و راحت کی مکمل ترین حفاظت کر دی گئی تھی۔ عوام کو اپنی بدحالی پر قانع رکھنے کا اس سے بہتر نظام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

بدھ مت اس نظام کے خلاف سب سے پہلی موثر آواز گوتم بدھ نے اٹھائی تھی۔ جس نے چند ہی سال کے اندر اس کو درہم و برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر ہندومت کے سرداروں نے اپنا مقابلہ جاری رکھا اور بالآخر ایک طویل عرصے کی کوشش کے بعد بدھ مت کو کم از کم ہندوستان سے ناپید کر دیا گیا۔ چنانچہ انقلاب اسلام کے وقت ہندوستان میں بدھ مت صرف برائے نام تھا۔ البتہ برما سے لیکر بحرالکاہل کے تمام جزیروں تک بدھ مت ہی کی حکمرانی تھی۔ مگر وہاں بھی اس کی اسپرٹ کو بہت بڑی حد تک مجروح کیا جا چکا تھا۔ ذات پات کی طبقاتی تقسیم کے کچھ آثار وہاں بھی پیدا ہونے لگے تھے۔ بادشاہ کو خدا کا اوتار (مظہر) سمجھا جاتا تھا اور خلق خدا کی دینی پیشوائی کا منصب صرف بادشاہ ہی کو تھا اور ہر سال خدا کے نمائندے کی حیثیت

سے اس کی "عام پرستش" کی رسم سرکاری طور پر منائی جاتی تھی۔[5]

اِن حالات میں ظاہر ہے کہ بدھ مت کی تعلیمات کا صرف وہی حصّہ باقی رہ سکا، جو بادشاہ اور بادشاہ کے حواریوں کی اغراض و مفاد کے مخالف نہ تھا۔

بدھ مت اور ہندو مت اسلام کے انقلابی مرکز سے بہت دُور تھے۔ لیکن جب اسلام سندھ اور پنجاب تک آیا تو اس میں شہنشاہی اغراض بُری طرح شامل ہو گئے تھے اس لئے قدرتاً ہندوستان اور چین پر اسلام کے اثرات بہت کم اور بہت بعد میں مُرتّب ہوئے۔ لیکن عیسائی یورپ شام و مصر سے دور نہ تھا، اس لئے انقلاب اسلام کا سب سے زیادہ اثر عیسائیت نے قبول کیا۔ مگر چونکہ امیر معاویہ کی سلطنت و فرمانروائی کے بعد سے خلافتِ راشدہ کے نظامِ سیاست کے نقوش بہت دھندلے ہو گئے تھے۔ اس لئے قدرتاً عیسائیت پر خلافت راشدہ کے مقابلے میں بنو اُمیہ اور بنو عباس کی شاہانہ سطوت و جلال اور ان کے عہدِ زرّیں کے پُرشوکت و عظمت قاضیوں اور مفتیوں کا اثر زیادہ پڑا۔ چنانچہ دمشق و بغداد کے زرق برق دار الخلافت کی طرح عیسائیت نے بھی یورپ میں پاپائی نظام کا عالیشان محل تعمیر کرنا شروع کیا۔ اور بالآخر چند دنوں کے بعد شاہی عظمت و جلال کے اعتبار سے پاپائیت کا مرکزِ جلال بھی دمشق و بغداد کے سُلطانی دبدبہ و طنطنہ کا مقابلہ کرنے لگا۔

پاپائیت

مذہبی سردار کی حیثیت سے پوپ یا پاپا کا وجود یوں تو بہت پہلے سے ہو گیا تھا، لیکن اس کی زبردست طاقت کا دور ۸۰۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب رومۃ الکبریٰ کی "مقدس سلطنت" کے پہلے شاہنشاہ شارلی مان کو روما میں پوپ نے مذہبی رسوم کے ساتھ اپنے ہاتھ سے تاج پہنایا تھا۔ اسی تاج پوشی

---

[5] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا: جلد نمبر ۳ صفحہ ۱۸۷

کے بعد سے رومتہ الکبریٰ کی سلطنت کا نام "مقدس سلطنت روما" یا ہولی رومن ایمپائر رکھا گیا جس وقت پوپ نے شارلی مان کو اس سلطنت کا فرمانروا بنایا تھا اس وقت اس کی حدود میں وہ تمام ممالک شامل تھے جو آج کل فرانس، جرمنی، اٹلی اور وسطِ یورپ کی ریاستوں یوگوسلاویا، رومانیہ وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں ـــــــــ یہ وہ زمانہ تھا جب بحرِ روم سے لے کر بحرِ ہند کے سواحل تک دولتِ عباسیہ کے سلاطین کا آفتابِ اقبال جگمگا رہا تھا اور اسپین میں عرب سلاطین کے ہاتھوں قرطبہ و غرناطہ کی بنیادیں رکھی جارہی تھیں۔

۸۰۰ء کے بعد سے پوپ در اصل یورپ کا معنوی فرمانروا ہو گیا۔ اس تاریخ کے بعد سے سولھویں اور سترھویں صدی تک یورپ کے بادشاہوں کا تخت و تاج عملاً پوپ کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جس کو چاہتا تھا تخت پر بٹھا سکتا تھا اور جسے چاہتا تھا تخت سے اتار دیتا تھا۔ چنانچہ شارلی مان کی وفات کے بعد جب اس "مقدس سلطنت روما" میں انتشار پیدا ہوا اور ہر جگہ کے صوبیدار اور گورنر بغاوت کر کے خود مختار ہونے لگے تو یہ پوپ ہی تھا جس کی مداخلت سے آٹو اعظم (Otto the Great) کو باقاعدہ تاجدار تسلیم کیا گیا۔ اور اس تاج پوشی کے بعد یورپ کے تمام سرداروں، جاگیرداروں اور چھوٹے بڑے سب فرمانرواؤں نے یہ طے کیا کہ آئندہ سے ہر بادشاہ کی تاج پوشی پوپ یا پوپ کے مقرر کئے ہوئے نائب ہی کے ہاتھ سے کی جائے گی، دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ جس بادشاہ کے سر پر پوپ کے ہاتھ سے تاج نہ رکھا جائے گا، وہ بادشاہ بادشاہ تسلیم نہ کیا جائے گا ـــــــــ اسی زمانے میں یہ بھی طے ہوا کہ مقدس سلطنتِ روما کے بادشاہ کا انتخاب یورپ کے رؤساء اور پوپ مل کر کیا کریں گے لیکن چند دن کے بعد انتخاب کرنیوالوں کی تعداد صرف سات تک محدود کر دی گئی۔ چار رؤساء اور تین پاپائیت کے نمائندے۔ پھر چونکہ ان رؤساء پر بھی پاپائیت کا زبردست اثر

تھا۔ اس لئے بادشاہ کی تاج پوشی ہی نہیں بلکہ بادشاہ کا انتخاب بھی پوپ کے اختیار میں آگیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یورپ کی شہنشاہیت پوپ کے اختیار میں آتی گئی یہاں تک کہ تیرہویں اور چودہویں صدی میں تو سارے یورپ میں صرف پوپ ہی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ یورپ کے اس سرے سے لے کر اُس سرے تک جتنے چھوٹے بڑے فرمانروا تھے سب اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے تھے۔ بادشاہ کا قانون کچھ نہیں، پوپ کا قانون سب کچھ چنانچہ جرمنی میں جب سلطنت کا جھگڑا اٹھا تو اس وقت کے پوپ انوسنیٹ سوم نے پہلے آٹو چہارم کو تخت نشین کرایا اور پھر فریڈرک دوم کو۔ انگلستان کے بادشاہ جان نے ذرا بیں پٹاخ کی تو پوپ نے اُسے وہ سزا دی کہ مجبوراً اسے ذلت آمیز شرائط پر پاپائیت کے شاہنشاہ سے صلح کرنا پڑی۔ اور انگلستان پر ایک عرصے تک پوپ کے وائسرائے (Legate) کے ذریعے حکومت ہوتی رہی ——— غرض سارے یورپ میں پوپ ہی پوپ کا سکہ چل رہا تھا۔[1]

پوپ کا محل

پوپ اپنے اثر و اقتدار کے اعتبار ہی سے شہنشاہ نہ تھا بلکہ ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے بھی اس کا دربار بڑے سے بڑے شہنشاہ کے دربار کو شرماتا تھا۔ پوپ کا بھی باقاعدہ تاج ہوتا تھا جس پر لاکھوں کے جواہر ٹکے ہوتے تھے اور جسے نئے پوپ کے تقرر کے وقت بالکل اسی قسم کے آداب و رسوم کے ساتھ پہنایا جاتا تھا جو بادشاہوں کی تاج پوشی کے وقت دیکھی جاتی ہیں۔ پوپ کے صرفِ خاص کی جو جاگیر تھی اُس کا رقبہ تیرہویں صدی میں سترہ ہزار مربع میل تھا یعنی موجودہ صوبۂ دہلی سے تین گُنا

پاپائیت کا مرکز یا پایۂ تخت روم تھا۔ یہاں وے ٹی کن کے مقام پر پوپ کا محل ہے جسے ۱۳۷۷ء میں پوپ گری گوری یازدہم نے اپنا مستقر بنایا تھا اور جو اُس وقت سے آج

---

[1] دیکھو ہسٹری آف دی پوپس از رینک اور "ہولی رومن ایمپائر"

تک پاپائیت کا مستقر ہی۔ یہ محل اپنی وسعت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی عمارت ہی۔ محل کے لئے اس سے بڑی عمارت آج تک دُنیا میں کبھی نہیں بنائی گئی۔ یہ محل گیارہ سو اکاون فٹ لمبا اور سات سو چہتر فٹ چوڑا ہی۔ اس کے کمروں کی تعداد دس بیس نہیں بلکہ چار ہزار ہی کئی منزلیں ہیں جن پر جانے کے لئے بے شمار زینے ہیں مگر آٹھ زینے تو اتنے عظیم الشان ہیں کہ انھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہی۔ اس کی ایک غلام گردش کا طول ⅕ میل ہی۔ جس کے برابر طول دُنیا کے کسی کمرے کا نہیں۔ اس کے علاوہ بیسیوں ایوان ہیں۔ متعدد پائیں باغ ہیں اور چند در چند بڑے بڑے ہال ہیں۔

جس طرح نیا بادشاہ اپنے پیش رو کے بنائے ہوئے محلات کو آراستہ و پیراستہ کرنے اور اس کی رونق و شان بڑھانے کی کوشش کرتا ہی اسی طرح ہر پوپ نے یکے بعد دیگرے اس محل کے حسن و آرائش اور عظمت و شان کو بڑھانے میں اپنے پیش رو پر سبقت لے جانے کی کوشش کی ہی۔ چنانچہ اس محل کا وہ چھوٹا کلیسا (Chapel) جہاں پوپ کی تاج پوشی کی جاتی ہی، اس کی چھتوں اور دیواروں کو سولھویں صدی میں اٹلی کے مشہور نقاش و مصوّر مائیکل اینجی لو کے نقش و نگار سے آراستہ کرایا گیا تھا۔ یہ نقش و نگار کیسے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہی کہ اس کلیسا کے در و دیوار آج بھی نقاشی و تصویر کشی کے فن کا بہترین شاہکار تسلیم کئے جاتے ہیں۔[۱]

عدالتِ تفتیش

پوپ کے ایک ہاتھ میں یورپ کے بادشاہوں کے تاج تھے اور دوسرے ہاتھ میں عوام کے دل و دماغ کی باگ ڈور تھی۔ اگر بادشاہ اس کی عدالت سے سرتابی کی جرأت کرتے تھے تو اُن کا تاج چھین لیا جاتا تھا۔ اور اگر عوام میں سے کسی کے سر میں سرکشی کا سودا سماتا تھا تو اُسے الحاد و بے دینی کی سزا

---

[۱] نیو اسٹینڈرڈ انسائیکلو پیڈیا۔ مطبوعہ لندن صفحہ ۱۲۵۹، نیز دیکھو

The Popes and their Church : McCabe

دی جاتی تھی۔ لیکن جب اس قسم کے سرکش افراد کی تعداد کچھ بڑھنے لگی تو ۱۲۴۸ء میں پوپ انوسینٹ چہارم (Innocent IV) نے عدالت تفتیش (Inquisition) کے نام سے استیصال الحاد کے لئے ایک عدالت قائم کی جس کی شاخیں سارے یورپ میں قائم کی گئیں۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یہ عدالت اپنے شباب پر تھی، ہر وہ شخص جس کے خلاف پوپ کی بے چون وچرا اطاعت سے سرتابی کرنے کا شبہ ہوتا اسے گرفتار کر کے اس عدالت کے ججوں کے سامنے لایا جاتا تھا مگر ملزم کو نہ تو الزام لگانے والے کا نام بتلایا جاتا تھا اور نہ اُسے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقعہ دیا جاتا تھا اور نہ اس کے مقدمے کی کارروائی علانیہ ہوتی تھی۔ ایک بند کمرے میں خفیہ اجلاس ہوتا تھا جہاں ملزم کو لایا جاتا تھا۔ دو ٹوک فیصلہ تھا۔ اقرار کر دیا انکار۔ اگر اقرار کر لیا تو جرم کی سزا موت تھی۔ مگر کیسی موت؟ آگ کے شعلوں یا کھولتے والے تیل کی لیکن اگر ملزم نے جرم کا اقرار نہ کیا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس لئے سچ بلوانے کے لئے اس پر ایسی ایسی ہولناک سختیاں کی جاتیں تھیں، جنھیں دیکھ کر انسان کے ہوش اڑ جائیں۔ ان سختیوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ملزم جرم کا اقبال کر لیتا۔ اس اقبال کے بعد اس کی سزا کیا تھی؟ موت! گویا اقبال اور انکار دونوں صورتوں میں موت کی خندق تیار رہتی تھی الا یہ کہ پادری ججوں کو کسی پر رحم آجائے اور وہ اُسے معاف کر دیں۔ موت کی سزا عموماً آگ میں جلا کر دی جاتی تھی۔ اس طرح جتنے آدمی جلائے گئے ان کی تعداد یورپ کے مؤرخوں نے کئی لاکھ تک بتائی ہے۔ فرانس کا مشہور مورخ لارینٹ (Llorent) لکھتا ہے کہ صرف سولہ سال کے عرصے میں ۹ ہزار آدمی آگ کے شعلوں کی نذر کئے گئے[1]

---

[1] تفصیلات کے لئے دیکھو 1. Medieval Heresy and the Inquisition: Turburville 2 The Inquisition: Maycock.

دستاویزِ مغفرت

پوپ کے متعلق یہ طے کیا گیا تھا کہ اس کا فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا، اس لئے اس کے کسی حکم پر بحث و تمحیص کی بھی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ خدا کا نائب تھا اور عیسیٰ مسیح کا قائم مقام۔ وہ گناہگاروں کے گناہ معاف کر سکتا تھا اور خدا کی رحمت و بخشائش کے دروازے انسانوں پر کھول سکتا تھا۔ چنانچہ سولھویں صدی عیسوی میں جب پوپ کو روم میں سینٹ پیٹر کے نام کا گرجا بنانے اور اپنے محل کی رونق بڑھانے کے لئے روپئے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے "دستاویز مغفرت" (Indulgences) فروخت کرنا شروع کر دیں۔ صلائے عام تھی کہ جو گناہگار اپنے گناہ معاف کرانا چاہے، اپنے گناہوں کی مقدار کے مطابق ان دستاویزوں میں سے کوئی ایک دستاویز خرید لے۔ ہر گناہ کی بخشش کی قیمت مقرر تھی اور ہر قیمت کی دستاویز تیار تھی۔ کہا جاتا تھا کہ خدا کی رحمت کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہو سکتا، اور پوپ کے ہاتھ میں اس خزانے کی کنجی ہے۔ اس لئے وہ جسے چاہے رحمت و بخشش سے مالامال کر سکتا ہے۔

پاپائیت کے خلاف بغاوت اور تحریکِ اصلاحِ مذہب (ریفارمیشن)

لیکن اب عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا "دستاویز مغفرت" کی اشاعت کے بعد یہ پیمانہ چھلک پڑا اور اس کے چھلکنے کی سب سے پہلی آواز مارٹن لوتھر نے بلند کی۔ پوپ کو جب یہ معلوم ہوا تو "چہرۂ تقدیس" غیظ و غضب سے تمتما اٹھا۔ چنانچہ لوتھر پر الحاد و بیدینی کا جرم قائم کر کے اسے کلیسائی حقوق سے محروم کیا گیا۔ اعلان ہوا کہ ہم نے اسے مردود و ملعون قرار دیا اس لئے کوئی "ایماندار" اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھے۔ لیکن اب "بے ایمانوں" کی تعداد "ایمانداروں" سے زیادہ ہو گئی تھی۔ چنانچہ اسکے نو برس کے بعد ۱۵۲۹ء میں انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم نے بھی سر اٹھایا اور حکم دیا کہ آئندہ سے انگلستان کے گرجا کا کوئی تعلق پوپ سے نہیں رہے گا۔

باب ۱۱

تحریکِ اصلاحِ مذہب (ریفارمیشن)

پاپائے اعظم کے ماتحت "مقدس سلطنتِ روما" کا قیام دراصل مذہب و سیاست کو یکجا کرنے کی اُس جدوجہد کا نتیجہ تھا جس کی آواز داعی اسلام نے اٹھائی تھی۔ اسلام سے پہلے تک دین کو دنیا سے الگ رکھنے کا رُجحان تھا۔ لیکن اسلام نے دُنیا کو بتایا کہ صحیح قسم کی روحانی ترقی اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک صحیح قسم کا سیاسی و معیشی ماحول پیدا نہ کیا جائے چنانچہ سیاست و معیشت کے اداروں پر قابو پاکر ان کی اصلاح کرنا عینِ دین قرار دیا گیا۔

پاپائے اعظم نے روما میں جو اقتدار قائم کیا۔ اس کی بنیاد یہی تھی کہ صحیح ہئیت سیاسیہ پیدا کرنے کے لئے سیاست و معیشت کے نظام پر اقتدار رکھنا ضروری ہے۔ مگر بدنصیبی سے پوپ نے داعی اسلام کے پیام پر ادھورا عمل کیا۔ وہ بادشاہت کے ادارے کو ختم نہ کرسکا بلکہ بادشاہ کے ساتھ ایک قسم کا سمجھوتہ کر لینے پر اکتفا کیا۔ گویا پاپائیت نے بادشاہ کا علیحدہ وجود تو تسلیم کیا۔ مگر اس پر اپنا تسلط رکھنا ضروری سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ برابر کی طاقت کے دو سیاسی ادارے قائم ہو گئے، جو حصولِ اقتدار کے لئے باہم متصادم رہنے لگے۔ جب جس کا پلہ بھاری پڑ جاتا، وہی دوسری پر چھا جاتا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں سترھویں صدی تک یورپ کی تاریخ پاپائیت و بادشاہت کے تصادم کی ایک مسلسل داستان ہے۔ اس تصادم میں پاپائیت نے اپنی طاقت کو مضبوط بنانے کے لئے "برہمنیت" کے تصوّر سے فائدہ اٹھانا ضروری سمجھا یعنی مذہبی تعلیم اور مقدس کتابوں کی توضیح و تشریح کرنے کا حق عوام کے بجائے صرف ایک مخصوص و محدود طبقے کے سپرد کیا گیا۔

"برہمنیت" کا یہ تصور انقلاب اسلام کے صریحاً خلاف تھا۔ اسلام نے خدا اور بندے کے درمیان سے برہمن و مُغ کی قسم کی ہر وسطی خلیج کو مٹا دیا تھا اور یہ اصول نافذ کیا گیا تھا کہ ہر شخص اپنا پنڈت آپ ہے اور خدا تک پہنچنے کے لئے "عملِ صالح" کے سوا اور کسی واسطے کی ضرورت نہیں لیکن چونکہ یورپ میں پاپائیت کو اپنا قابلِ اقتدار قائم کرنے کے لئے "برہمنیت" کی ضرورت تھی۔ اس لئے "کلرجی" یا پادری کے نام سے اُسے ایک نئی شکل میں جلوہ گر کر لیا گیا۔ تاہم انقلاب اسلام کا اثر اتنا ضرور ہوا کہ ہندوستان کی طرح برہمن و پنڈت کا طبقہ نسلی و نسبی نہ بنایا گیا بلکہ ایک خاص تعلیم کے بعد ہر شخص کو "پنڈت" بن جانے کا حق دیدیا گیا بشرطیکہ یہ خاص تعلیم صرف اسی نظام کے ماتحت حاصل کی جائے جسے پاپائے اعظم کی سندِ قبولیت حاصل ہو۔ جس شخص کو پوپ کی طرف سے باقاعدہ "برہمنیت" کی سند نہ ملے، اُسے دینی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ اس طرح گویا پوپ نے عوام پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے "کلرجی" کے نام سے ایک مستقل فوج تیار کر لی اور عوام کو یہ سمجھایا گیا کہ خدا تک بندے کی رسائی صرف اسی فوج کی مدد سے ہو سکتی ہے۔

شروع شروع میں کلرجی کا یہ طبقہ اپنی اہمیت کو قائم رکھنے کے لئے کردار و اعمال

میں بہت محتاط تھا۔ لیکن جب اس کی عظمت کا سکہ عوام کے دلوں پر بیٹھ گیا تو رفتہ رفتہ عیش پسندی کی طرف میلان بڑھنے لگا۔ آخر وہ وقت آیا کہ پوپ اور بادشاہ میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اب پوپ اور بادشاہ دونوں کے درمیان عوام کو لوٹنے کی ایک سازش کارفرما تھی۔ پھر چونکہ پوپ خود کو روحانی فرمانروا کہتا تھا، اور بادشاہ کی تمام باتوں کا ذمے دار اسی کو قرار دیا جاتا تھا۔ اس لئے عوام میں سب سے پہلا جذبۂ بغاوت و منافرت پوپ کے خلاف ہی پیدا ہوا۔

بغاوت و منافرت کے یہ جذبات آہستہ آہستہ بڑھتے رہے آخر پندرھویں عیسوی کے اوائل میں مارٹن لوتھر کی عظیم الشان شخصیت کی قیادت میں ریفارمیشن یا اصلاح مذہب کی اُس زبردست تحریک نے جنم لیا جس نے پاپائیت کے تار و پود بکھیر کر رکھدیئے اور انقلاب اسلام کا جو پیام پادریوں کی قابیلی سدِ یاجوج کی وجہ سے یورپ کے عوام تک نہ پہنچ سکتا تھا، وہ سارے یورپ میں عام ہونے لگا۔ مارٹن لوتھر کی تحریک کا بنیادی پتھر بھی دراصل اسلام کے اسی پیام پر مبنی تھا کہ خدا اور بندے کے درمیان پاپائیت کے نام سے کسی واسطے کی احتیاج نہیں ہے۔ لوتھر نے پاپائیت کے نظام کو انسان کی اجتماعی اور انفرادی دونوں قسم کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دے کر بالکل ڈھا دینا چاہا۔ اس کے الفاظ مختلف تھے، لیکن روح ٹھیک وہی تھی جو انقلابِ اسلام کے پیام میں مرکوز تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پاپائی نظام دولت و اقتدار کے نشے میں سرشار تھا عیش و عشرت کے دروازے ہر طرف کھلے ہوئے تھے۔ اخلاق و خدا ترسی کی دُنیا دور کھڑی اپنا سر پیٹ رہی تھی اور پوپ کا دربار دنیا کے بدترین سے بدترین بادشاہ کے دربار سے کسی طرح کم نہ تھا۔ چنانچہ ایک پادری کا یہ قول مشہور ہے کہ "———— عیسیٰ کا مذہب ہمارے لئے عیش و عشرت کا بہترین سرچشمہ ثابت ہوا ہے"۔ شہنشاہ فرانس، فلیس آگسٹس، بیت المقدس کی صلیبی جنگ میں سلطان صلاح الدین کے دبدبہ و طنطنہ کو دیکھ کر کہا کرتا تھا۔ "مبارک ہے

صلاح الدین جس کی گردن پر کسی پوپ کا جوا نہیں ہے[۱]۔"

لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ جو پوپ گیارہ[۱۵] سوا کاون فٹ لمبے اور سات سو چھیتر[۷۶] فٹ چوڑے عالیشان قصر رفیع میں رہتا ہے جس کے صرف خاص کی جاگیر کا رقبہ سترہ ہزار مربع میل ہے اور جس کے حاشیہ برداروں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ وہ ایمان و دیانت کا سرچشمہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مارٹن لوتھر (جرمنی)، زوانگ لی Zwingli (سوئٹزرلینڈ) اور کال ون Calvin (فرانس) کی قسم کے بہت سے ایسے لوگ پیدا ہونے شروع ہوئے جو اگرچہ ظاہری رسوم کے لحاظ سے مسلمان نہ تھے لیکن ان کا طریق فکر خالصتاً اسلامی تعلیمات پر مبنی تھا۔ پروفیسر آرنلڈ لکھتا ہے: "کال ون کے عقائد کلیسائے یونان سے بالکل مختلف تھے۔ بلکہ اس میں بہت سے مسائلِ فقہ ایسے تھے جو بہ نسبت یونانی کلیسا کے اسلامی علماء کے عقائد سے زیادہ موافقت رکھتے تھے[۲]۔"

سات مذہبی رسوم

پاپائیت کے خلاف اس بغاوت کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ خدا اور بندے کے درمیان برہمن کی قسم کا کوئی واسطہ نہ ہو چنانچہ سب سے بڑا حملہ اُن سات مذہبی رسوم کے خلاف تھا جن کی ادائگی صرف پادری ہی کر سکتا تھا اور جن کے متعلق مذہبی عقیدہ یہ تھا کہ جو شخص ان رسوم کی ادائگی کی طرف سے غفلت برتے گا وہ عقبیٰ میں تو نجات اُخروی سے محروم رہ جائے گا اور دنیا میں قید یا موت کی سزا پائے گا۔

۱۔ ان رسوم میں سب سے پہلی رسم بپتسمہ ہے جو بچے کی پیدائش کے بعد ادا کی جاتی ہے ——— بقیہ دوسری رسمیں یہ ہیں۔

---

[۱] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا۔ جلد ہشتم

[۲] دی پریچنگ آف اسلام از ٹی ڈبلیو آرنلڈ۔ ترجمہ اردو ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۸۱

۲۔ بچوں کے سنِ شعور پر پہنچنے کے بعد ان کو مذہبی تعلیم دینے کے آغاز کی رسم۔

۳۔ شادی

۴۔ پادری کے سامنے اپنے تمام پچھلے گناہوں کو کھول کر بیان کرنا تاکہ پادری اُسے گناہوں سے پاک کر دے۔ اس رسم میں توبہ، اعترافِ گناہ، عقوبتِ نفس وغیرہ کے نام سے کئی مدارج ہیں۔

۵۔ مذہبی پیشوا یا پادری بنانے کی رسم

۶۔ حضرت عیسیٰ کی مظلومیت کی یادگار کی رسم یا مقدس عشائے ربانی ـــــــ یہ رسم حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کی یاد میں ہر سال دسمبر میں منائی جاتی ہے۔ اس میں شراب میں بھیگی ہوئی روٹی حاضرینِ مجلس کو تقسیم ہوتی ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ یہ روٹی اور شراب پادری کی دعا کی برکت سے حضرت عیسیٰ کے "گوشت اور خون" میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے بعد آپ اپنے جسم خاکی کے ساتھ بنفسِ نفیس مجلس میں "موجود" ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے اس کا نام "حقیقی موجودگی" بھی ہے۔

۷۔ حالتِ نزع میں مرنے والے کے سر پر پادری کے ہاتھ سے مقدس تیل ملنے کی رسم

ان سات رسوم میں سے صرف ایک پانچویں رسم کے سوا باقی تمام رسوم ہر عیسائی کے لئے لازمی ہیں۔ البتہ پانچویں رسم کا تعلق صرف پادریوں سے ہے۔

یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس قسم کی رسوم اسلام میں بھی ہیں۔ مگر اسلام نے اِن کی بجا آوری کے لئے کسی پنڈت یا پادری کی ضرورت نہیں سمجھی، بلکہ ہر مسلمان ان کو ادا کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں، اسلام نے اِن رسوم کو فرض بھی قرار نہیں دیا ہے۔ لیکن عیسائیت نے ان کو ہر عیسائی کے لئے فرضِ عین ثابت کیا۔ مثلاً اسلام میں اگر کسی بچے کا عقیقہ نہ کیا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ لیکن پاپائی نظام میں، مذکورہ بالا رسوم سے روگردانی کرنے والا سخت سے سخت سزا کا مستوجب تھا۔ عیسائی پادریوں نے مذکورہ بالا تمام رسوم کو نجاتِ اُخروی

کے لئے نہ صرف لازم و ناگزیر قرار دیا ہے بلکہ ان کی بجا آوری بھی صرف اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ انسانی جسم و روح کی فرمانروائی پادریوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان رسوم کی واحد اجارے داری کی بدولت پادری لاکھوں کی دولت کے مالک ہو جاتے تھے۔ شروع شروع میں تو عوام اس چیز کو نظر انداز کرتے رہے مگر جب پاپائیت کی زنجیروں نے ان کا بند بند جکڑ دیا تو وہ چلا اٹھے۔ اسی لئے مارٹن لوتھر نے سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیا کہ انسانی نجات کے لئے صرف انجیل کو ماننا کافی ہے۔ صرف انجیل ہی ہر کام کی اچھائی برائی کی واحد سند ہے۔ مذہبی رسوم جن کو صرف پادری ہی ادا کر سکتا ہے انسانی نجات کے لئے ضروری نہیں۔ انسانی روح کا تعلق براہ راست خدا سے ہے اس لئے نجات حاصل کرنے کے لئے خود ہر انسان کا توبہ و استغفار کرنا اور اپنے عمل کو انجیل کے مطابق بنا لینا کافی ہے۔ اس کے لئے کسی پادری کے درمیانی واسطے کی کوئی احتیاج مطلق نہیں۔

مزید براں لوتھر نے یہ بھی کہا کہ مستند مذہبی بزرگوں (Saints) کے بتوں کی پرستش غلط ہے اور یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ "عشائے ربانی" کی روٹی اور شراب متبرک رسوم کی بجا آوری کی وجہ سے سچ مچ مسیح کے "گوشت و خون" میں تبدیل ہو جاتی ہے اور مسیح بجسد عنصری حاضر جلسہ ہو جاتے ہیں۔

اگر لوتھر کے اس قول میں انجیل کے بجائے قرآن رکھ دیا جائے تو اس میں اور داعی اسلام کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں رہتا[1]۔

یہ پیغام داعی اسلام نے ساتویں صدی عیسوی میں دنیا کو سنایا تھا مگر

---

[1] ریفارمیشن کی تفصیلی تاریخ کے لئے دیکھو

1. History of the Papacy (Reformation): Ranke
2. History of the Reformation: Lindsay.

پاپائیت نے سولھویں صدی تک یورپی عوام کو اس پیغام پر عمل پیرا ہونے سے روکے رکھا۔ اس غرض کے لئے لوگوں کو سزائیں دی گئیں۔ عدالتی تحقیقات کے نام سے زندہ جلایا گیا۔ لڑائیاں کی گئیں۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ کی گئی کہ اسلام کی تعلیمات سے عوام کو نہ صرف ناآشنا رکھنے کی کوشش کی گئی بلکہ اسلام کو انتہائی غلط اور مسخ شدہ شکل میں پیش کیا گیا جسکی حیرت انگیز تفصیلات گذشتہ چند سالوں میں خود یورپ ہی کے متعدد مصنفین نے فراہم کی ہیں۔ اس سلسلہ میں فرانس کے ایک نامور فاضل کانٹ ہنری دی کاستری کی کتاب "الاسلام" بیحد معلومات افزا اور سبق آموز ہے۔ اس مصنف نے خود اس امر پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ جن چیزوں کو مٹانے کی تبلیغ اسلام نے کی ہے ٹھیک انہی چیزوں کو پادریوں نے اسلام سے وابستہ قرار دیدیا ہے! اور پھر اس کے لئے انتہائی بے حیائی کے ساتھ اپنے دل سے صریحاً جھوٹے واقعات بھی گھڑ لئے ہیں۔ مصنف مذکور لکھتا ہے۔

اگر مسلمانوں کو وہ قصے اور گیت معلوم ہوں جو عیسائیوں میں قرون وسطیٰ کے زمانے میں مشہور تھے، تو معلوم نہیں انھیں کس قدر حیرت ہوگی۔ ان کا موضوع مسلمانوں سے سخت تنفر پیدا کرنا تھا، ان ہی قصوں اور گیتوں نے اسلام کے متعلق بیہودہ روایتوں کو دلوں میں راسخ کر دیا اور انہی کی بدولت وہ غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں جن میں سے اکثر آج بھی قائم ہیں

ان گیتوں کے گانے والے عموماً یہ یقین رکھتے تھے کہ مسلمان مشرک اور بت پرست ہیں اور وہ تین خداؤں کے قائل ہیں جن کے درجے مختلف ہیں۔ ایک کا نام ماہوم دوسرا ابلین تیسرا اترفاجان ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ محمدؐ نے اپنے آپ کو بھی خدا قرار

دیا تھا اور اپنی صورت کا ایک زرّین بت بنایا تھا جس کی پوجا مسلمانوں کو کرتے تھے"۔

اسلام کے متعلق عہدِ وسطیٰ کے عیسائیوں کے ان عجیب و غریب خیالات کا ذکر کرنے کے بعد مصنف مذکور لکھتا ہے کہ "ان بیہودہ روایتوں کا اثر آج کل کی تاریخ نے بھی بالکل معدوم نہیں کیا بلکہ ان کا اثر آج بھی اہلِ یورپ کے دلوں میں موجود ہے اور اسی وجہ سے پیغمبر اسلام اور قرآن کے متعلق آج بھی یورپ کے لوگوں کی نہایت مختلف رائیں ہیں"۔

اس مصنف نے ان پادریوں کے اقوال بھی نقل کئے ہیں جو قرآن کو پڑھنے سے منع کرتے تھے اور یہ ہدایت کرتے کہ قرآن کو پڑھنا نہیں چاہیئے بلکہ جلا دینا چاہیئے[۱]۔

اسی قسم کے کچھ اعتراضات انیسویں صدی میں جارج سیل کو اپنے ترجمۂ قرآن (انگریزی) کے دیباچے میں پادری ہونے کے باوجود کرنے پڑے ہیں

لیکن آخر یہ افسانہ طرازی کب تک کام دے سکتی تھی۔ اس طرح لوگوں کو اسلام اور داعی اسلام سے تو بدظن کیا جا سکتا تھا۔ مگر اُن تعلیمات کے انقلابی سیلاب کو کیسے روکا جا سکتا تھا جو منشائے فطرت کے عین مطابق ہیں اور جن کا وجدانی علم انسان ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جمہوریۂ امریکہ کے مشہور پریزیڈنٹ اور مدبرِ سیاست آدم اسمتھ کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ —— کچھ انسانوں کو ہمیشہ کے لئے یا تمام انسانوں کو کچھ دن کے لئے بیوقوف بنائے رکھنا ممکن ہے۔ لیکن تمام انسانوں کو ہمیشہ کے لئے بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا"۔

مارٹن لوتھر

مارٹن لوتھر کی مذکورہ بالا "بغاوت" یورپ کی تاریخ کا ایک بہت اہم واقعہ ہے۔ اس "بغاوت" کے بعد یورپ میں ایک بالکل نئے معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام کا آغاز ہوا اور پاپائیت کا اثر و اقتدار رفتہ رفتہ

---

[۱] اس کتاب کا ترجمہ عربی میں فتحی بک زغلول مصری نے کیا ہے۔ مگر ہم نے مذکورہ بالا اقتباسات مقالاتِ شبلی جلد اوّل صفحہ ۱۲۴ سے اخذ کئے ہیں۔

ختم ہونے لگا۔ مارٹن لوتھر جرمن کے ایک گاؤں آئل بین Eisle Ben میں ۱۰؍نومبر ۱۴۸۳ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کے والدین نہایت غریب تھے اور جس گھر میں اس نے پہلی بار آنکھ کھول کر اس دنیا کی روشنی دیکھی وہ گھر ایک معمولی جھونپڑا تھا عسرت وتنگدستی میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کے والدین نے اپنے بیٹے کی تعلیم کی طرف بڑی توجہ سے کام لیا۔ چند سال میں لوتھر نے عیسائی مذہب کی اچھی خاصی تعلیم حاصل کرلی! اور بالآخر پادری بنا دیا گیا۔ لیکن اس کی خداداد ذہانت وصلاحیت کا عالم یہ تھا کہ ۲۵ سال ہی کی عمر میں اسے وٹن برگ Wittenberg کی مذہبی یونیورسٹی کا معلم بنا دیا گیا جہاں تھوڑے ہی دنوں میں اسکی علمیت وقابلیت اور خطابت وتقریر دونوں کی دھاک جم گئی۔ اسی زمانے میں لوتھر کے دماغ میں پاپائیت کے خلاف خیالات پیدا ہونا شروع ہوئے اور بالآخر چند سال میں اس نے نجاتِ آخروی کے اُن اصولوں کے خلاف جو پوپ نے بنا رکھے تھے۔ اپنے نئے اصول تیار کئے۔ مگر ابھی ان اصولوں کی علانیہ اشاعت کی ہمت اس میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ لیکن جب پوپ نے "دستاویز مغفرت" جاری کیں تو اس کے صبر وضبط کی قوت جواب دینے لگی۔ پوپ کی طرف سے مغفرت کی یہ دستاویزیں یورپ کے ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں پادری لوگ بیچ رہے تھے۔ مارٹن لوتھر جس شہر میں رہتا تھا وہاں بھی ایک پادری صاحب جان ٹیٹ زیل John-Tetzel کے پاس ان دستاویزوں کی ایجنسی تھی۔ آخر وہ دن آیا کہ لوتھر کا پیمانۂ صبر وشکیب چھلک پڑا اور اُس نے ان پادری صاحب سے کہا کہ تمہارا یہ فعل عیسائیت کے خلاف ہے جس پر میں مناظرہ کرنے کو تیار ہوں۔ اس دعوتِ مناظرہ کے بعد لوتھر نے اس مناظرہ کے لئے ۹۵ نظریے تیار کئے اور ان کو ایک کاغذ پر نہایت خوشخط لکھ کر ۳۱؍اکتوبر ۱۵۱۷ء کو مقامی گرجا گھر کے صدر دروازے پر چپاں کر دیا۔ یہ گویا پاپائیت کے خلاف

باقاعدہ اعلان جنگ تھا جو اس تاریخ کو باقاعدہ طور پر کر دیا گیا۔

جب جرمنی کے عوام کو اس کا علم ہوا تو ان میں ایک زبردست حرکت پیدا ہو گئی ہر شخص دستاویز مغفرت کے خلاف بھرا بیٹھا تھا، مگر زبان سے کچھ کہنے کی جرأت کسی میں نہ تھی۔ لوتھر نے آگے بڑھ کر لوگوں میں یہ جرأت پیدا کر دی اور جگہ جگہ سے لوتھر کی حمایت میں آوازیں بلند ہونے لگیں۔ شروع شروع میں تو پوپ نے اس "گستاخی" کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ مقامی پادری ہی لوگوں کو ڈانٹتا دھمکاتا رہا۔ مگر جب بغاوت کا یہ سیلاب قابو سے باہر ہونے لگا تو پوپ صاحب کو بھی گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس اعلان کے تین سال بعد ۱۵۲۰ء میں پوپ نے ایک "فرمان" جاری کیا جس میں مارٹن لوتھر کے نظریوں پر لعنت و نفرین کی گئی اور ان کے ماننے والوں کو مردود و شقی قرار دیا گیا۔ مگر جب یہ "فرمان" لوتھر کی قیام گاہ وٹن برگ میں پہنچا تو اس نے علانیہ طور پر سب کے سامنے کھڑے ہو کر اسے آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا۔ لوتھر کے اس عمل کی اطلاع جب پوپ کو ملی تو اُسے غصے سے زیادہ حیرت ہوئی، ایک ماتحت پادری کی یہ گستاخی اُس پوپ کے ساتھ جس کی نسبت یہ طے کیا جا چکا ہے کہ اُس کا فیصلہ غلط نہیں ہوتا اور جس کے ہر فیصلے میں خدا بولتا ہے!! اس واقعہ کے چند ماہ بعد پوپ نے پادریوں کا ایک جلسہ طلب کیا اور اس میں لوتھر کو بھی بلایا۔ لوتھر اپنی جان کے خطرے کے باوجود وہاں پہنچا اور وہاں پہنچ کر سب کے سامنے علی الاعلان اپنے نظریوں کے صحیح ہونے کا اعلان کیا۔

اسی قسم کے کفر و الحاد کے لئے پاپائیت نے "عدالتِ تفتیش" قائم کر رکھی تھی۔ اس لئے بظاہر سب کو یقین تھا کہ لوتھر کی قسمت میں آگ کے شعلوں کی موت لکھی ہے۔ لیکن اب زمانے کی ہوا بدل چکی تھی۔ اب عوام کی ایک بڑی تعداد لوتھر کے ساتھ تھی، چنانچہ لوتھر کو پاپائیت کے جوشِ انتقام سے بچانے کے لئے ایک نہایت مستحکم قلعے

میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ ایک سال کے قریب پناہ گزیں رہا۔[1]

پروٹسٹنٹ

اب عوام میں ایک لوتھر ہی نہیں ہزاروں لوتھر پیدا ہو گئے تھے۔ لوتھر کا ایک ایک لفظ عوام کے دل کا ترجمان تھا۔ پاپائیت نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر اب اس کا زوال شروع ہو چکا تھا جسے کوئی طاقت نہ روک سکتی تھی۔ لوتھر کی تحریکِ اصلاح (ریفارمیشن) روز بروز طاقت پکڑتی گئی۔ اُس وقت یہ تحریک دراصل پاپائیت کے خلاف ایک احتجاج تھا، جسے انگریزی میں پروٹسٹ کہتے ہیں۔ اِس لئے جو لوگ اس تحریک کے حامی تھے۔ اُن کو پروٹسٹنٹ یعنی احتجاجی کہا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ تمام عیسائی فرقے جو پاپائے روما کے گرجا سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ پروٹسٹنٹ کہلانے لگے اور یہ لفظ پاپائی گرجا (یا رومن کیتھولک) سے اختلاف رکھنے والے تمام فرقوں پر حاوی ہو گیا۔

[1] ماخوذ از "لائف آف لوتھر" مرتبہ Mackinnon اور Boehmer

باب ۱۲

یورپ کی نئی زندگی

احیائے علوم

۱۴۵۳ء میں دولتِ عثمانیہ کے ایک اولو العزم ترک سلطان محمد ثانی نے یورپ کے مرکزِ علوم و اقتدار، قسطنطنیہ پر حملہ کیا اور فتح کر کے دولت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔ ظاہر ہے کہ سلطان محمد ثانی کی یہ فتح اسلام کے انقلابی پیام کی فتح نہ تھی بلکہ ایک شہنشاہ کی فتح تھی، اس لئے اس فتح کے بعد مفتوح قوم کو اُن تمام تباہیوں اور غارتگریوں سے دوچار ہونا پڑا جو اس قسم کے موقعوں پر پیش آتی ہیں۔ قسطنطنیہ کا شہر دنیا کی اُس عظیم الشان سلطنتِ بزنطینیہ کا پایۂ تخت تھا جس نے ایک ہزار سال تک اپنی عظمت و جبروت کا سکّہ دنیا پر بٹھایا تھا۔ یہ مقام چونکہ مشرق و مغرب کے بالکل سنگم پر واقع ہے، اس لئے اس کے باشندے صرف یونانی علوم و فنون ہی کے امانتدار نہ تھے بلکہ عرب و عجم کی علمی ترقیوں سے بھی آشنا تھے۔ مگر جب سلطان محمد ثانی کی افواج قاہرہ کا فاتحانہ قدم قسطنطنیہ میں داخل ہوا تو وہاں کے امراء و رؤسا کے

ساتھ ساتھ اہلِ علم وفضل بھی گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب تک دنیا نے آمد و رفت کے آسان، محفوظ اور تیز رفتار وسائل نہیں دیکھے تھے۔ اس لئے قسطنطنیہ کے یہ حاملین علم وفضل اپنے سرمایۂ علوم کو صدیوں سے اپنے وطن کی چہار دیواری میں محصور کیئے بیٹھے تھے اور ان کے علم کی روشنی صرف یونان کے ساحلوں تک محدود تھی۔ مگر اب جب ترک فاتح نے ان کے گھر پر تسلط جمایا تو یہ لوگ عیسائیت کے مرکز اٹلی میں جا جا کر بسنے لگے لیکن یہ مہاجرین اگرچہ پناہ گزیں کی حیثیت سے پہنچے تھے مگر یورپ نے جو اس وقت تک جہل کی اتھاہ تاریکی میں پڑا ہوا تھا، ان نو وارد مہمانوں کی آمد میں اپنی علمی ترقی کی توقعات کو پنہاں پایا، گویا قسطنطنیہ کی فتح نے یورپ کے لئے بیسیوں معلم و استاد فراہم کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جگہ جگہ ان نوواردوں کے گرد طالبانِ علوم کا مجمع اکٹھا ہو گیا اور آہستہ آہستہ یورپ اُن علمی خزانوں سے مالامال ہونے لگا جو اب تک صرف یونان سے آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ بقراط و سقراط اور افلاطون و ارسطو سے لے کر پندرھویں صدی عیسوی تک دُنیا نے علم و ادب کے میدان میں جو ترقیاں کی تھیں ان سب کے دروازے اب یورپ پر کھلنے لگے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پندرھویں صدی کے آخر سے لے کر سولھویں صدی تک کے سو ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں سارے یورپ کی کایا پلٹ ہو گئی۔ اسی لئے یورپ کی تاریخ میں اس زمانے کو احیائے علوم وفنون Renaissance کا زمانہ کہا جاتا ہے۔

اب تک یورپ کا دماغ پاپائیت کی خود ساختہ مذہبی پابندیوں اور افسانہ طرازیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ غور و فکر کی آزادی کسی کو حاصل نہ تھی لیکن "احیائے علوم" کی اس تحریک نے یہ گرفتیں ڈھیلی کیں اور یورپ کے لوگ، واقعات کو صحیح رنگ میں دیکھنے کے قابل ہونے لگے۔ یورپ پر اسلامی تعلیمات کا اثر اس زمانے کے بعد سے بہت نمایاں نظر آتا ہے کیونکہ پاپائیت نے اسلام کے متعلق جو جھوٹی روائتیں اور افسانے عام کر رکھے تھے، ان کا طلسم

اس تحریک کے بعد ہی ٹوٹنا شروع ہوا۔[۱]

اسی زمانے میں ایک اور واقعہ یہ پیش آیا کہ ۱۴۳۸ء میں جرمنی کے ایک

چھاپے خانہ شخص جان گٹن برگ (John Gutenberg) نے چھاپے خانے کی ایجاد کی جس کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت میں بہت آسانی ہو گئی اور اہل علم وفضل کی تعلیمات یورپ کے دور دراز گوشوں تک پہنچنے لگیں۔

احیائے علوم کے اس خوش آئند زمانے اور چھاپے خانے کی اس مفید ترین ایجاد دونوں نے مل کر لوتھر کی تحریک اصلاح مذہب کو چار چاند لگا دیئے۔ ایک طرف تو علم وفضل کے حاملین، اہلِ یورپ کو دماغی مرعوبیت سے نکال کر، کائنات کے وسیع میدان میں لا رہے تھے اور دوسری طرف چھاپے خانے کی مدد سے علم وفن کی باتیں دور دور تک پہنچائی جا رہی تھیں اور یورپ کے ہر ہر گوشے کو علوم کی روشنی سے منور کیا جا رہا تھا۔

ان سب باتوں کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ پاپائیت کے مرکزی اقتدار پر زوال آنے

قومیت لگا۔ سب سے پہلے ہنری ہشتم نے ۱۵۲۹ء میں انگلستان کو پوپ کی اطاعت سے علیحدہ کیا اور اس کے بعد دوسرے ملکوں نے بھی پوپ کے اقتدار کا جوا گردن سے اُتار پھینکا۔

پاپائیت کے مرکزی اقتدار کے زوال کے ساتھ یورپ میں ہر ملک اور ہر نسل کی لوگوں میں خود مختار ہو کر رہنے کا تصوّر پیدا ہوا۔ اب تک کُل یورپ ایک پوپ کے روحانی اقتدار کے ماتحت تھا اور مقدس سلطنتِ روما کے سلاطین، یورپ کے ایک بہت بڑے علاقے پر حکمرانی کرتے تھے۔ مگر یہ حکمرانی ظاہر ہے کہ چند مخصوص افراد کے مفاد کے تحفظ پر دوسروں کو قربان

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھو (۱) کیمبرج میڈیول ہسٹری (۲) دی رینے سینس از پیٹر (۳) سوشل اینڈ پولیٹکل آئڈیاز آف دی رینے سینس از Hearnshaw

کرنے کے پرانے رائج الوقت اصول پر قائم تھی اس لئے انسانوں کے جو طبقے اور جو گروہ نقصان میں رہتے تھے وہ بادلِ ناخواستہ محض اس لئے اُسے قبول کرتے تھے کہ پوپ کے مرکزی اقتدار سے سرتابی کرنے کا تصور وہ نہ کر سکتے تھے۔ مگر اب جب کہ اصلاحِ مذہب اور احیائے علوم نے پوپ سے بغاوت کرنا یورپ کو سکھایا تو قدرتاً ہر ملک اور ہر نسل کے لوگوں میں خود مختار ہو کر زندہ رہنے کا جذبہ بڑی شدت سے پیدا ہو گیا۔ اسی زمانے میں قوم یا نیشن کا لفظ پہلی بار بڑی گرمجوشی کے ساتھ مستعمل ہوا اور قومیت یا نیشنلزم کا وہ تصور پیدا ہوا جس سے اس وقت تک دنیا ناآشنا تھی۔ دنیا میں قومیں ہمیشہ رہی ہیں لیکن قومیت کا یہ جذبہ کہ ہر قوم خود کو آزاد و خود مختار بنا کر زندہ رہے اور قومی تحفظ و آزادی کو زندگی کا سب سے مقدس فرض سمجھے، پندرھویں صدی کے بعد ہی سے یورپ میں پیدا ہونا شروع ہوا۔ اس سے قبل فرانس اور انگلستان دونوں ایک دوسرے کو عیسائی سمجھتے تھے اور دنیا کی تقسیم زیادہ تر مذہب کی بنیاد پر تھی مگر اب ملک و نسل کی بنیاد پر ہونے لگی۔ انگلستان کے باشندے عیسائی ہوں تو ہوا کریں، وہ چونکہ تہذیب و معاشرت اور نسل و نسب کے اعتبار سے فرانس سے مختلف ہیں، اس لئے فرانس، ان کی حکومت تو درکنار ان کے اثرات کو قبول کرنا بھی گوارا نہ کرے گا۔ اسی طرح جرمنی کبھی فرانس کے ماتحت رہنا قبول نہ کرے گا۔ وغیرہ وغیرہ

قومی آزادی و خود اختیاری کا یہ جذبہ آہستہ آہستہ یورپ میں نشوونما پا رہا تھا۔ مگر چونکہ فرمانروائی کی باگ ڈور خود مختار بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی اس لئے وہ اس جذبے کو صرف اسی حد تک پھیلنے دیتے تھے جس حد تک اُن کے شاہی اغراض اس کی اجازت دیتے تھے۔ جو بادشاہ کئی قوموں پر حکمراں تھے وہ اس جذبے کو ترقی دے کر اپنی حدودِ سلطنت کو کم کر دینا کیسے روا رکھ سکتے تھے؟

اس لئے اب پاپائیت کی طرف سے عوام کی توجہ ہٹ کر بادشاہوں کی خود مختاری

کی طرف ہوگئی۔ انہوں نے دیکھا کہ پوپ کا جوا اگرچہ گردن سے اُتر گیا۔ مگر اُن کی بدحالی کا عالم اب بھی وہی ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جن جن ملکوں نے پوپ کے مرکزی اقتدار سے انقطاع کا اعلان کیا، وہاں پوپ کا روحانی اقتدار بھی بادشاہ ہی کو دے دیا گیا۔ اس لئے یہ بادشاہ بے پناہ اقتدار و تسلط کے مالک بن گئے۔ اب تک تو پوپ کی کچھ نہ کچھ نگرانی ان پر تھی، مگر اب یہ خود پوپ تھے اور خود ہی اپنی نگرانی کر سکتے تھے۔

میگنا کارٹا

بادشاہ کی زبان ہر زمانے میں قانون رہی ہے۔ لیکن جب لوگوں میں شعور و احساس پیدا ہونے لگتا ہے تو وہ بادشاہوں کو شتر بے مہار بننے سے روکتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی سب سے طاقتور روک مذہبی احکام پیدا کرتے ہیں۔ مگر یورپ میں چونکہ پوپ خود ہی بادشاہ کو تخت و تاج دیتا تھا اور خود بھی شاہی کروفر سے رہتا تھا۔ اس لئے یہ مذہبی روک بہت کمزور پڑ گئی تھی۔ ایسی صورت میں قدرتی طور پر عوام میں قانون و اصول کے نام سے بادشاہ پر احتساب قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس تصور نے سب سے پہلا عملی جامہ ۱۲۱۵ء میں پہنا جب انگلستان کے بادشاہ جان کو اُمرا اور روسا نے مجبور کر کے اُس اعلان پر دستخط کرائے جو میگنا کارٹا یعنی منشور اعظم یا منشورِ آزادی کے نام سے مشہور ہے۔ اس منشور کی خاص و اہم دفعات کا منشا یہ تھا کہ کسی آزاد شخص کو نہ تو قید کیا جائیگا اور نہ اس پر کوئی مقدمہ چلایا جائے گا الّا صرف اُس صورت میں جب کہ ملک کے رائج الوقت قوانین اس کی اجازت دیں۔ اور اُسے باقاعدہ ججوں کے سامنے پیش کر کے اس پر جرم ثابت کیا جائے، ملک کے تمام طول و عرض میں ناپنے اور تولنے کے پیمانے ایک ہوں گے۔ کسی جگہ کم یا زیادہ نہیں ہوں گے، پردیسی تاجروں کو آزادی کے ساتھ تجارتی کاروبار کرنے کی اجازت حاصل ہوگی، زمانۂ قدیم سے عوام کو جو آزادیاں حاصل ہیں ان سب کو باقی رکھا جائے گا اور کسی قسم کا کوئی محصول اس وقت تک نافذ نہیں کیا جائے گا جب تک کونسل سے اس

کی منظوری حاصل نہ کرلی جائے۔ اگرچہ کونسل کے ممبر اس وقت صرف بڑے بڑے اُمراء و روسا رہی ہوتے تھے، مگر پھر بھی اس پابندی سے بادشاہ کی بے روک مطلق العنانی پر ایک زبردست نگرانی قائم ہو جاتی تھی۔

جب اس منشور پر شاہی دستخط ثبت کر دیئے گئے تو اس کی بہت سی نقلیں تیار کی گئیں تاکہ وہ ضائع ہونے یا چرائے جانے سے محفوظ ہو جائے۔ ان نقلوں میں سے کئی نقلیں آج تک موجود ہیں۔ ان میں سے دو لندن کے عجائب گھر میں رکھی ہیں۔

شاہ جان کے بعد اس میگنا کارٹا کی تصدیق و توثیق تیس سے زائد بار بعد کے بادشاہوں کے عہد میں مسلسل کرائی جاتی رہی تاکہ کوئی بادشاہ اسے نظر انداز نہ کرسکے۔[1]

شاہی اختیارات پر پابندیاں

لیکن بادشاہ کے مطلق العنان اختیارات پر روک قائم کرنے کا خیال دراصل تحریکِ اصلاحِ مذہب اور احیائے علوم و فنون کے بعد بڑی شدّت کے ساتھ پیدا ہوا چنانچہ سترھویں صدی کے آخر میں صرف انگلستان میں بار بار ایسے قوانین پاس کئے گئے جن سے بادشاہ کے عمل پر احتساب و نگرانی کا پہرہ بیٹھ جاتا تھا۔ ان قوانین میں سب سے پہلا اور اہم قانون وہ ہے جسے "ہیبیس کارپس" (Habeas Corpus) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ان الفاظ کا لغوی ترجمہ ہے "تم جسم کو طلب کر سکتے ہو"۔ اس قانون کا منشاء یہ تھا کہ کسی شخص کو باقاعدہ عدالتِ مجاز کے سامنے لائے بغیر جیل میں نہ رکھا جائے۔

بات یہ ہے کہ شاہی فرمانرواؤں کے زمانے میں یہ چیز بہت عام تھی کہ جس شخص سے بادشاہ ناراض ہوا اُسے غیر معیّن مدت تک کے لئے قید خانے میں ٹھونس دیا گیا میگنا کارٹا میں اسی عمل پر روک قائم کی گئی تھی مگر پھر بھی یہ کسی نہ کسی طرح جاری

---

[1] ماخوذ از کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری Hallem

رہا۔ اس لئے اب اس قانون کی رو سے عدالت کو یہ حق دیا گیا کہ وہ ہر اس شخص کو اپنے سامنے طلب کر سکتی ہے جو عدالتی حکم کے بغیر کسی قید خانے میں محبوس ہو۔ اور طلب کرنے کے بعد اگر تحقیقات سے یہ ثابت ہو کہ اس کو خلاف قانون قید کیا گیا ہے تو اُسے آزاد کر سکتی ہے۔ یہ قانون ۱۶۷۹ء میں پاس کیا گیا تھا۔

اس کے بعد ۱۶۸۸ء میں "اعلانِ حقوق" کے نام سے ایک دستاویز تیار کی گئی اس کی رُو سے وہ شرائط طے کی گئیں جو انگلستان کے بادشاہ میں ہونا ضروری ہیں۔ ان شرائط میں سب سے بڑی اور اہم شرط یہ تھی کہ کوئی رومن کیتھولک تخت پر نہ بیٹھ سکے گا۔ گویا اس تاریخ کے بعد سے انگلستان کا تخت صرف پروٹسٹنٹ مذہب کے بادشاہ کے لئے مخصوص ہو گیا اور پوپ کے مرکزی اقتدار سے مکمل انقطاع کا اعلان کر دیا گیا۔ اس شرط کے علاوہ باقی شرائط تقریباً سب وہی تھیں جو میگنا کارٹا میں درج کی جا چکی تھیں مگر چونکہ ابھی تک فرمانروائی پر عوام کو اختیار نہ تھا اس لئے جو بادشاہ زیادہ اولوالعزم اور زیادہ حوصلہ مند دجری ہوتا تھا وہ ان شرائط کو نظر انداز کر کے من مانی کارروائیاں کرتا رہتا تھا۔ اس لئے بادشاہ کو حدود کے اندر رکھنے کی ایک کامیاب کوشش یہی ہو سکتی تھی کہ اس کے فرائض اور عوام کے حقوق کو بار بار دہرایا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ ۱۶۸۸ء کے اس "اعلانِ حقوق" میں بھی ایک بار پھر یہ واضح کیا گیا کہ پارلیمنٹ، جو اس زمانے میں مجلسِ امرا کا دوسرا نام تھا، کی منظوری کے بغیر بادشاہ مجاز نہ ہوگا کہ عوام پر محصول وغیرہ عائد کر کے روپیہ حاصل کرے۔ بادشاہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ قانونی دفعات کو معطل و بے عمل کر سکے۔ وغیرہ وغیرہ اس کے چھ سال بعد ۱۶۹۴ء میں پارلیمنٹ نے یہ قانون پاس کیا کہ بادشاہ مجبور ہے کہ کم از کم تین سال میں ایک بار پارلیمنٹ کا اجلاس ضرور طلب کرے۔ اس قانون کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ چارلس اول اور چارلس دوم جیسے بادشاہوں نے یہ طریقہ اختیار

کیا کہ پارلیمنٹ کو برسوں طلب ہی نہ کرتے تھے جو کسی کو اعتراضات کرنے یا بادشاہ کے عمل کو قانونی حدود کے اندر رکھنے کا موقع ملے۔

اس کے سات سال بعد ۱۷۰۱ء میں ایک اور قانون پاس کیا گیا جس میں غیر ممالک سے جارحانہ جنگ کرنے کا اختیار بادشاہ سے لے کر پارلیمنٹ کو دیا گیا۔ نیز یہ طے کیا گیا کہ جب تک جج اپنے فرائض منصبی کو صحیح طور سے انجام دیں انہیں علیحدہ نہ کیا جا سکے[۱]۔

خود مختار بادشاہوں کے دلچسپ مشغلوں میں عیش پرستی و محفل آرائی کے علاوہ جنگجوئی اور زور آزمائی بھی شامل ہے جو بادشاہ اولوالعزم اور حوصلہ مند ہوتے ہیں وہ ملک گیری و کشور کشائی کے لئے یا دولت و جائداد حاصل کرنے کے لئے جنگ کے حربے سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ لیکن چونکہ لڑنے والے عوام ہوتے ہیں۔ اس لئے فتح یا شکست دونوں صورتوں میں عوام کی تباہی و بربادی یقینی ہوتی ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا قانون کے ذریعے جنگ چھیڑنے کا اختیار بادشاہ سے پارلیمنٹ کو منتقل کیا جانا عوام کی ایک کامیابی ضرور تھی، مگر چونکہ ابھی پارلیمنٹ صرف اُمراء و رؤساء ہی پر مشتمل ہوتی تھی اس لئے اسے مکمل کامیابی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

یا پائیت کے بعد شاہیت

بادشاہ کے مطلق العنان اختیارات پر اسی قسم کی بندشیں عائد کرنے کی تحریک انگلستان کے علاوہ یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی جاری ہوئی اور وہاں بھی اس قسم کے متعدد قوانین بنائے گئے مگر چونکہ طاقت کا سرچشمہ صرف بادشاہ کی ذات ہی کو قرار دیا جاتا تھا اور عوام کے ہاتھ میں احتساب و نگرانی کی کوئی مؤثر مشینری نہ تھی اس لئے یہ قوانین زیادہ

---

[۱] ماخوذ از کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری مرتبہ Hallem

سود مند ثابت نہ ہوتے تھے۔ کمزور یا رحمدل بادشاہ تو ان پر عمل کرتے تھے لیکن طاقتور یا بے رحم بادشاہ ان کو دفترِ بے معنی سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ اٹھارویں صدی تک یورپ پاپائی اقتدار سے بہت بڑی حد تک آزاد ہو چکا تھا اور لوتھر، کالون اور زدانگ زی کے پیروؤں کی تعداد میں بیحد اضافہ ہو گیا تھا حتیٰ کہ جو لوگ خود کو رومن کیتھولک کہتے تھے، وہ بھی پرانے اصول پر سو فیصدی عامل نہ تھے۔ پروٹسٹنٹ فرقے کی اصلاح پسندی نے ان کے عقائد و اعمال میں بھی زبردست تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ غرض مذہب و معاشرت کے لحاظ سے انقلابِ اسلام کی بیشتر تعلیمات رائج ہو چکی تھیں۔ البتہ جن تعلیمات کی مکمل کامیابی کا دروازہ امیر معاویہ کی بغاوت کے بعد سے بند کر دیا گیا تھا، اُن سے نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا محروم تھی۔ یہ حقیقت تو عوام نے سمجھ لی کہ انسانی روح اور خدا کے درمیان کسی درمیانی توسل کی احتیاج نہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حکومت اصول و قانون کی ہونا چاہیئے نہ کہ ایک یا چند افراد کی من مانی خواہشوں کی۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ کسی شخص کو خدا نے انسانوں کا حاکم و قاہر بنا کر نہیں بھیجا، اس لئے ہر شخص کے حسن و قبح کا معیار اس کے اعمال و افعال کو قرار دینا چاہیئے، یہ بھی جان لیا گیا کہ پوپ ہو یا بادشاہ کسی کی آواز خدا کی آواز نہیں ہے اور اس لئے ان کے احکام پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا ٹھیک نہیں۔ یہ بھی تسلیم کر لیا گیا کہ کسی بادشاہ، کسی رئیس، کسی سردار یا کسی قوم قبیلے کو یہ حق نہیں کہ وہ انسانوں کے جمِ غفیر پر اپنے مفاد میں حکومت کرے اور عوام کے مفاد کو پسِ پشت ڈال دے۔ یہ بھی سمجھ لیا گیا کہ ہر انسان کے حقوق برابر ہیں، اس لئے چند مخصوص افراد کے لئے عیش و راحت کو مخصوص کر دینا اور انسانوں کی باقی آبادی کو صرف خدمتگار بنا کر چھوڑ دینا منشائے قدرت کے خلاف ہے ——— غرض انسانی بھلائی کے لئے یہ اصول تو عوام کو اچھی طرح معلوم ہو گئے اور پاپائیت سے نجات پانے میں بھی انھیں کامیابی ہو گئی لیکن اب شاہیت اور

شہنشاہیت کے نام سے ایک دوسری پاپائیت اُن کی گردن پر سوار ہوگئی۔ پاپائیت سے معرکہ آرا ہونے میں تو شاہیت نے عوام کی مدد کی تھی اس لئے کہ کسی بادشاہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ پوپ اس کے مطلق العنان اختیارات میں دخل دے۔ اسی بنا پر پاپائیت[1] و شاہیت کے جذبۂ رقابت نے بادشاہوں کو عوام کا پشت پناہ بنا دیا تھا۔ مگر اب کہ پاپائیت کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ بادشاہوں نے عوام کا ساتھ چھوڑ دیا اور پاپائیت کے قبضے سے جو اقتدار عوام نے چھینا تھا، اس پر خود قابض ہو گئے، بالفاظ دیگر، اب یورپ کے عوام کی حالت بالکل وہی ہوگئی جو امیر معاویہ کے بعد مسلمانوں کی تھی مسلمان بھی اصول سب جانتے تھے اور کسی پوپ کے روحانی یا جسمانی اقتدار سے آزاد تھے، مگر خلیفۃ المسلمین کے نام سے جو شخص اُن پر فرمانروائی کرتا تھا اس کا شہنشاہی جُوا اُن کی گردن پر رکھا ہوا تھا اور اس لئے وہ صرف اسی حد تک انقلابِ اسلام کے اصول پر عامل ہو سکتے تھے جس حد تک یہ شہنشاہِ مطلق اُن کو اجازت دے سکتا تھا۔ اگر کوئی شخص اس حد سے تجاوز کرتا تو جلاد کی تلوار اس کے لئے تیار تھی۔ جس طرح خلیفۃ المسلمین کے نام سے حکومت کرنے والا شہنشاہ اپنی اغراض کی حفاظت کی خاطر خود غرض یا کمزور علمار کو چن چن کر اپنے گرد اکٹھا کر لیتا تھا اور قاضی و مفتی کے عہدے ان کے سپرد کر کے انھیں اپنی اغراض کا آلۂ کار بنا لیتا تھا۔ اسی طرح اب یورپ کے بادشاہوں نے بھی پادریوں اور مذہبی عالموں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا پھر چونکہ مسلمانوں کے سامنے خلفائے راشدین کا عمل اور قرآن و احادیث کی کھلی ہوئی تصریحات موجود تھیں، اس لئے ایک طرف تو خود غرض علمار عوام کے دلوں پر زیادہ قابو نہ پا سکتے تھے، اور دوسری طرف خاموش کام کرنے والے علماء و صوفیاء کا ایک کثیر طبقہ عوام میں موجود تھا جو انھیں شہنشاہی علمار کے افسوں سے بہت بڑی حد تک غیر متاثر رکھتا تھا۔ مگر چونکہ اقتدار و اختیار کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں نہ تھی، اس لئے عوام میں توکل و تسلیم کے نام سے وہی جذبات پیدا ہونے لگے جو کمزوروں کا آخری سہارا ہوتے ہیں وہ یہ تو

سمجھتے تھے کہ خلیفۃ المسلمین کا دربار، اسلام کی تعلیمات و اصول کے مطابق نہیں ہے لیکن اس خرابی کو دور کرنے کی قدرت اپنے میں نہ پاتے تھے۔ اس لئے وہ یہ سمجھنے لگے کہ یہ ساری خرابی ہماری شامت اعمال کا قدرتی نتیجہ ہے اور قدرت ہی چاہے تو اسے دور کر سکتی ہے۔ پھر چونکہ امیر معاویہ کی بغاوت نے ان اصول کو نامکمل چھوڑ دیا جن کی رو سے اختیار و اقتدار کی باگ عوام کے ہاتھ میں آنا چاہئے تھی، اس لئے شاہی و سلطانی کے سوا کوئی اور نظام سیاست عوام کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ وہ صرف یہی سمجھتے تھے کہ بادشاہ تو ناگزیر ہے، البتہ اسے کتاب و سنت کے مطابق عدل و انصاف سے حکومت کرنا چاہیئے۔ مگر یہ سوال کہ اسے کتاب و سنت پر قائم کیسے رکھا جائے۔ اس کا جواب عوام نہ جانتے تھے۔ بجز اس کے کہ خدا سے دعا کی جائے کہ وہ سلطان کو توفیق نیک عطا کرے۔

بہت سعی کیجے تو مر رہیے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے!

روسو

لیکن جس طرح سولھویں صدی عیسوی میں مارٹن لوتھر نے عوام کے ان جذبات کی ترجمانی کی تھی جو عیسائیت کی اصلاح کے لئے ان میں موج زن تھے۔ اسی طرح سترھویں صدی میں فرانس کے ایک فلسفی روسو نے بادشاہوں کی مطلق العنانی سے آزاد ہونے کی وہ اسکیم پیش کی جس کے لئے عوام تڑپ رہے تھے۔ عوام کی حکومت اور جمہوریت کے خیالات یوں تو افلاطون اور ارسطو کے زمانے سے دنیا میں موجود تھے اور یونان اور روما میں جمہوریت کی عملی شکل کا نقشہ بھی دنیا دیکھ چکی تھی، مگر یہ جمہوریتیں عوام کی حکومتیں نہ تھیں البتہ ان میں خواص کے طبقے کو ذرا زیادہ وسیع کر دیا گیا تھا۔ یونان کی جمہوریت میں وہ لوگ جو مزدور پیشہ اور محنت کش ہوتے تھے ان کو نیز چھوٹے تاجروں اور کاشتکاروں کو حکمرانی سے اسی طرح بے تعلق رکھا گیا تھا جس طرح شاہی میں امراء و روساء کے سوا باقی انسانوں کو رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح روم میں رومن نسل کے افراد کی علاوہ

دوسرے انسانوں کو شاذ ونادر ہی رومن جمہوریت کا ممبر قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن روسو نے یہ بتلایا کہ ہر انسان کے حقوق برابر ہیں اور حکومت پر عوام ہی کو اختیار ہونا چاہئے روسو کے یہ خیالات سترھویں صدی کے نصف آخر میں "معاہدۂ عمرانی" کے نام سے ایک مختصر سے رسالے کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس رسالے میں انسانی مساوات و حریت پر فلسفیانہ بحث ہی نہیں کی گئی ہی بلکہ حکومت کے اصول اور حکومت چلانے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہی۔ یہ رسالہ جس جملے سے شروع ہوتا ہی وہ یہ ہی —— "انسان آزاد پیدا ہوا ہی، مگر جدھر دیکھو وہ پا بہ زنجیر ہی"[1] اس کے بعد ساری کتاب دراصل اسی جملے کی تشریح ہی جس میں ایک تو یہ ثابت کیا گیا ہی کہ انسان آزاد کیوں پیدا ہوا ہی اور دوسرے یہ بتایا گیا ہی کہ وہ کیا طریقے ہو سکتے ہیں جس سے انسان اپنے پاؤں کی زنجیروں سے نجات حاصل کر سکتا ہی

روسو کے اصولِ سیاست کا ماحصل یہ تھا کہ انسانی معاشرت کا تصور اس لئے پیدا ہوا کہ باہمی مفاد اور تحفظ کے لئے اپنے ارادے اور مرضی سے انسان اکٹھے ہوئے اور کچھ مشترک قوانین اور رسوم ورواج بنائے۔ اس لئے بادشاہوں یا حکمرانوں کا موروثی یا خداداد حق بہت بعد کی غیر فطری ایجاد ہی۔ بنابریں بادشاہوں اور بادشاہتوں کو ختم کر کے قوانین کی ترتیب اور ان پر عملدر آمد کرنے کی طاقت دونوں کو کاملاً عوام کی متفقہ مرضی پر منحصر ہونا چاہیئے۔ عوام کی خواہش ومرضی ہی ہر مسئلے میں اقتدارِ اعلیٰ کا درجہ رکھتی ہی اور حکمرانی کے اختیارات نہ تو بادشاہ کی ذات میں مرکوز ہونے چاہئیں اور نہ امرا ورؤسا کی ذات میں بلکہ عوام کو من حیث المجموع ان اختیارات کا مالک ہونا چاہیئے۔

---

[1] معاہدۂ عمرانی اردو ترجمہ جامعہ ملیہ صفحہ ۱

"معاہدۂ عمرانی" جس وقت شائع ہوئی، اس وقت نہ صرف بادشاہوں کی مطلق العنانی کے خلاف عوام میں زبردست جذبہ پیدا ہو رہا تھا بلکہ پادریوں کے خلاف بھی غیظ و غضب کی آگ دلوں میں سلگ رہی تھی۔ کیونکہ پادری عوام کے مقابلے میں شاہیت کا ساتھ دے رہے تھے اور امراء و روسا کی طرح لاکھوں کی جائداد پر قابض و متصرف تھے۔ ان جائدادوں میں وہ اوقاف شامل تھے جو گرجا کے لئے صدیوں سے لوگ کرتے چلے آتے تھے۔ مزید براں حکومت کے خزانے سے بھی گرجا کو کافی رقم دی جاتی تھی اس لئے یورپ میں پادریوں کے خزانے اُمراء و رؤسا سے کسی طرح کم نہ تھے۔ اس کے مقابلے میں عوام کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی، تمام اختیارات بادشاہوں اور اُمراء و رؤسا کے ہاتھ میں تھے اور ان پر کسی قسم کی کوئی نگرانی کرنے والی طاقت موجود نہ تھی، حکومت کے کاروبار کو چلانے کے لئے صرف عوام پر ٹیکس لگائے جاتے تھے اور امراء و رؤسا خود کو ان ٹیکسوں سے مستثنےٰ کر لیتے تھے، دوسری طرف پادری تھے جو قسمت و تقدیر اور توکل و تسلیم کا وعظ کہہ کر عوام کو اس بدحالی پر قانع و شاکر رہنا سکھاتے تھے۔ وہ عوام کو بتاتے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے اور ہر شخص کی تقدیر میں جو لکھا ہے وہ اُسے مل رہا ہے۔

لیکن جب روسو اور روسو کے علاوہ والٹیر وغیرہ معاشرتی مصلحوں کی کتابیں ملک میں پھیلیں تو لوگوں کی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں۔ روسو نے انھیں بتایا کہ ہر انسان کے قدرتی حقوق کیا کیا ہیں اور یہ کہ صرف وہی حکومت و ریاست منشائے قدرت کے مطابق ہو سکتی ہے جس میں عوام کی رائے سے کام ہو اور اقتدار اعلیٰ صرف عوام ہی کو حاصل ہو۔ ان خیالات کی اشاعت کے بعد لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ پادریوں اور رئیسوں نے مل کر

انسانوں کے درمیان جو زبردست امتیازی حدود قائم کر رکھی ہیں اور مساوات و برابری کے جو حقوق انسانوں سے چھین کر خدا کی ان گنت مخلوق کو ذلت و فاقہ کشی کی جس مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے، وہ نہ تو مذہبی اعتبار سے صحیح ہے اور نہ اخلاقی لحاظ سے حق بجانب ہے۔

باب ۱۳

انقلاب فرانس کا زلزلہ

اٹھارویں صدی کے آخر میں" اصلاحِ مذہب" اور" احیائے علوم" کی تحریکوں کی بدولت جب یورپ کو پاپائیت کے ذہنی استبداد سے نجات ملی تو زندگی کے ہر گوشے میں امید و رجا کی نئی کرنیں پھوٹتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ پاپائیت کے اقتدار کو مٹانے میں یورپ کے مطلق العنان بادشاہوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر عوام کا ساتھ دیا تھا لیکن اب عوام میں ہر استبداد اور مطلق العنانی کے خلاف جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ آخر ان جذبات و احساسات کی ایک نئی دنیا انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ۱۲ جولائی ۱۷۸۹ء کا آفتاب جب طلوع ہوا تو دنیا کی تاریخ کا رخ بالکل دوسری طرف پھرا ہوا نظر آنے لگا ——— انقلاب اسلام کے بعد دنیا کی تاریخ میں یہ دوسرا انقلاب تھا جو انسانیت نے اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لئے برپا کیا۔

قبائلی نظام میں عوام کی حیثیت ہمیشہ خدمتگاروں کی سی رہی ہے جن کی ضرورت صرف دولت پیدا کرنے یا میدانِ جنگ میں کام آنے کے وقت محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے اگرچہ امراء

رؤسا کے طبقے نے عوام کو ہمیشہ حقارت و ذلت کی نظر سے دیکھا ہے، مگر اپنی ان اغراض کی وجہ سے عوام سے بالکل بے تعلق ہو جانا بھی انکے لئے کبھی ممکن نہ ہو سکا۔ البتہ عوام کو اپنے مقاصد کے مطابق استعمال کرنے کے لئے مختلف مقامات پر مختلف حکمت عملیاں استعمال کی جاتی تھیں۔ ان ہی حکمت عملیوں میں سے ایک حکمت عملی "دربار عام" کے نام سے کی جاتی تھی جس میں کبھی کبھی کسی جگہ عوام کے نام سے کچھ لوگوں کو اکٹھا کر کے اپنے مقصد کے مطابق کچھ باتیں منوا لی جاتی تھیں۔ چنانچہ یورپ کے سب سے "مہذب" و متمدن ملک فرانس میں اس قسم کا ایک دربار ۱۳۰۲ء میں طلب کیا گیا تھا جس کا نام اس وقت جمعیت طبقات (States General) رکھا گیا تھا۔ اس دربار میں انسانوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا تھا: امراء و رؤسا، پادری اور عوام۔ مگر یہ تقسیم برائے نام تھی۔ ساری طاقت صرف امراء و رؤسا ہی کے ہاتھ میں تھی اور اس کے بعد پادریوں کے قبضے میں۔ عوام کی حیثیت برائے نام تھی۔ اس لئے اگرچہ اس دربار میں عوام کے نمائندے ایک نہایت ناقص انتخاب کے ذریعے جمع ضرور کئے گئے تھے مگر ان کی کوئی مؤثر آواز اس میں نہ تھی، ان کی حیثیت صرف تماش بینوں کی سی تھی جو اسی کو غنیمت سمجھتے تھے کہ امرأ رؤسا کے ساتھ ایک جگہ بیٹھنے کا موقعہ انھیں عطا کر دیا گیا۔

ہم کہاں اور بوئے باغ کہاں
اے صبا تیری مہربانی ہے!

۱۳۰۲ء کے بعد سے یہ جماعت متعدد بار طلب کی گئی مگر ہمیشہ ایسے ہی مواقع پر جب روپیہ یا آدمیوں کی ضرورت بادشاہ کو ہوتی تھی۔ لیکن ۱۶۱۴ء کے بعد سے چونکہ اس قسم کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی اس لئے اس کے بعد پونے دو سو (۱۷۵) سال تک اس کا کوئی اجلاس طلب نہ کیا گیا۔ مگر جب اصلاح مذہب، احیائے علوم، پریس کی ایجاد اور قومیت کے جذبے نے عوام میں زبردست بیداری کی ایک لہر دوڑا دی تو قدرتاً ان کا خیال اس جماعت

کی طرف مبذول ہوا اور انہوں نے کوشش کر کے پورے ۱۷۵ سال کے بعد ۵ مئی ۱۷۸۹ء کو ورسلز میں اس کا اجلاس طلب کرایا۔ اس اجلاس میں امرا اور رؤسا کے ممبروں کی تعداد ۲۸۵ تھی، پادریوں کی ۳۰۸ اور عوام کی ۶۲۱۔ لیکن اگرچہ عوام کے نمائندوں کی تعداد امرا اور پادریوں دونوں سے زیادہ تھی مگر پھر بھی اس اسمبلی میں ان کی رائے کو فوقیت حاصل نہ تھی اس لئے کہ فیصلہ افراد کی کثرت پر نہیں بلکہ طبقات کی اکثریت پر رکھا گیا تھا۔ یعنی جس فیصلے کو کوئی دو طبقے منظور کریں وہی فیصلہ قابلِ قبول سمجھا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عوام اکثریت میں ہونے کے باوجود اقلیت میں آجاتے تھے اس لئے کہ ظاہر ہے کہ پادری ان کا ساتھ کیوں دینے لگے، وہ تو طبقۂ امراء ہی کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلا جھگڑا اسی بات پر ہوا اور بالآخر عوام نے پادریوں اور امرا کے خلاف جبر اور طاقت سے اپنا فیصلہ منوالیا، اور یہیں سے انقلاب کا آغاز ہوا جس کے بعد اسٹیٹس جنرل (جمعیتِ طبقات) کے بجائے "قومی اسمبلی" کے نام سے عوام کے نمائندوں کا اجتماع طلب کیا گیا۔

جمہوریت یا عوامیہ کا پہلا آئین

اس قومی اسمبلی نے حکومت کا ایک نیا آئین مرتب کیا، جس کی رو سے ۱۷۹۳ء میں شاہی کو ختم کر کے عوام کی حکومت یا جمہوریت قائم کی گئی اور لوئس شانزدہم شہنشاہِ فرانس پر باقاعدہ مقدمہ چلا کے سزائے موت دی گئی، اس لئے کہ ۱۷۸۹ء سے ۱۷۹۳ء تک کے درمیانی سالوں میں امرا اور رؤسا کی طرف سے عوام کو شکست دینے کی جو ان تھک کوششیں کی گئی تھیں اور جن کی وجہ سے فرانس کی ہمسایہ حکومتوں پروشیا اور جرمنی نے فرانس کے عوام پر دھاوا بول دیا تھا، ان سب کا الزام بادشاہ پر رکھا گیا

فرانس کے اس نئے آئین کی رو سے امیروں، رئیسوں اور پادریوں سب کے وہ حقوق منسوخ کر دیئے گئے جو انھیں عام انسانوں کے مقابلے میں امتیازی طور سے

حاصل تھے، ہر شخص کو کامل آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کو تحریر و تقریر کے ذریعے ظاہر کرنے کا حق دیا گیا، جلسے کر کے یا انجمنیں بنا کر مسائل پر بحث و تمحیص کرنے کی آزادی پر جتنی پابندیاں تھیں اُن سب کو یک قلم منسوخ کیا گیا اور تمام غیر ممالک سے جو معاہدے شاہی حکومت نے کر رکھے تھے اُن سب پر بھی خطِ تنسیخ پھیر کر یہ اعلان کیا گیا کہ ورثے میں چلنے والی بادشاہت سے نجات دلانے کے لئے فرانس، یورپ کے تمام ممالک کے عوام کی مدد کرے گا۔

انقلاب فرانس اور انقلاب اسلام کا فرق

فرانس کے ان فیصلوں کو سُن کر تمام یورپ کے بادشاہوں رئیسوں اور امیروں پر سخت دہشت طاری ہوگئی۔ اس لئے سب نے مل کر اس انقلاب کو دبانے کی کوشش کی، مگر فرانس کے عوام میں جو جوش اور بیداری پیدا ہو چکی تھی وہ سب پر غالب آئی اور جمہوریۂ فرانس کی فوجوں کو ہر محاذ پر کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ لیکن اس انقلاب کی تیرہ بختی یہ تھی کہ اسے کوئی ایسا قائد و رہنما نہ مل سکا جو غصے، نفرت اور انتقام کے تمام جذبات سے بلند ہو کر صرف انسانی فلاح و بہبود کے مقصد کو پیش نظر رکھتا۔ عوام میں جوش تھا، اُن کے سامنے مقصد تھا، مقصد تک پہنچنے کی راہ بھی متعین ہوگئی تھی، مگر "پیغمبرانہ" کردار کا مالک ان میں کوئی نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے میں جو رکاوٹیں حائل تھیں اُن کو دور کرنے میں عوام کا جوش و جذبہ حدود سے متجاوز ہوگیا۔ امراء و رؤسا اور اربابِ کلیسا انسانیت کی عمومی ترقی کے یقیناً مخالف تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ ہونا چاہیئے تھا کہ جبر و ظلم اور قتل و غارت گری کے ہتھیاروں کو بیدریغ اُن پر استعمال کیا جاتا۔ لیکن چونکہ اُس وقت قیادت و رہنمائی صرف عوام کے ہاتھ میں تھی۔ اس لئے یہ سب کچھ ہوا، روسو کی کتاب کو اگرچہ صحیفۂ الہامی کی طرح سینوں سے لگایا جا رہا تھا اور اس کے ایک ایک حرف کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش ہو رہی تھی، مگر خود روسو کی شخصیت اگرچہ تدبر و سیاستدانی

کے اعتبار سے کافی بلند تھی لیکن اخلاقی کردار کے لحاظ سے اسکی حالت اتنی پست تھی کہ جب اس کی خود نوشت سوانح حیات کے چند حصے شائع ہوئے تو لوگ دیکھ کر انگشت بدندان گئے۔[1] اصل یہ ہی کہ اس وقت وقتی تقاضوں کے ماتحت بلاشبہ بیسیوں لیڈر پیدا ہو گئے تھے مگر ان میں سے کوئی ایک بھی "پیغمبر" نہ تھا کہ عوام کے جوش و جذبے کے غضبناک سمندر کی پُرشور لہروں پر مکمل قابو سکتا اور وحشت و درندگی کے بغیر اس قافلے کو منزل مقصود تک پہنچا سکتا۔ دوسری طرف انقلاب کے مخالف بھی مسلسل اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے اس لئے عوام ان کی طرف سے سخت خائف تھے اور ان کو دبانے اور کچلنے کے لئے ہر ہتھیار استعمال کرنے کے لئے تیار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ انقلاب ناکام ثابت ہوا تو پھر امرا اور روسا کے ہاتھوں ان کے جان و مال کی کیا درگت ہوگی۔ ان تمام حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیروں، رئیسوں اور شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والوں کو بیدریغ قتل کرنے یا قید کرنے کا عمل بڑی شدت سے جاری ہو گیا۔ جس کسی پر ذرا بھی مخالفت کا شبہ ہوا، اُسے بلا تامل تہ تیغ کر دیا گیا۔ سالہا سال کے وہ ہزاروں قیدی جو بیسٹل (Bastil) کے عالیشان قلعے میں قید تھے ان سب کو تو بلا تخصیص و امتیاز رہا کر دیا گیا، لیکن اسی کے ساتھ ہزاروں نئے قیدی پیدا بھی کر دیئے گئے۔ انقلاب کی اندرونی مخالفت کو دبانے کے لئے "تحفظ عامہ" کے نام سے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی نے ملک میں وحشت و دہراس کا ایک سناٹا طاری کر دیا۔ ذرا ذرا سے شبہ پر لوگ مقتل یا مجلس کی طرف دھکیل دیئے جاتے۔ ہر طرف غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے اور شاہی خاندان کے افراد، رؤسا و امرا اور ارباب کلیسا بلا امتیاز ان شعلوں کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ پھر یہ شعلے اتنے بڑھے کہ خود انقلاب کے لیڈر بھی ان کی لپیٹ میں

---

[1] دیکھو "اعترافات" "خطوط" اور "رنگ رلیاں" The Reverie از روسو

آنے لگے۔ کل تک جو لیڈر تھا، آج اس پر شبہ کیا گیا اور شبہ کے ساتھ ان شعلوں نے ایک کرائس کا دامن پکڑ لیا۔ ڈین ٹن (Danton) اس انقلاب کا سب سے بڑا لیڈر تھا۔ ہر طرف سے ڈین ٹن زندہ باد کی صدائیں آرہی تھیں مگر دفعتہً کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دن اسی ڈین ٹن کو لوگ کشاں کشاں قتل گاہ کی طرف لے جارہے ہیں اور رابس پیر (Robespeare) کے حکم سے اُسے "مفادِ عامہ" کی خلاف ورزی کرنے پر قتل کیا جارہا ہے لیکن اس واقعے کو ابھی چند دن ہی گزرنے پائے تھے کہ شور اٹھا کہ رابس پیر بھی گردن زدنی ہے، اور ابھی ڈین ٹن کے خون سے زمین لالہ زار ہی تھی کہ رابس پیر کا خون بھی بہا دیا گیا۔

اگر انقلابِ فرانس کے سالارانِ قافلہ میں کوئی ایک ہستی بھی "پیغمبرانہ" دل و دماغ کی مالک ہوتی تو بلاشبہ "انقلاب اسلام" کی طرح اس کی تاریخ بھی دہشت انگیزی و انتقام پروری کے ہر داغ سے سراسر معرّا ہوتی ——!!

نپولین بوناپارٹ

لیکن بالآخر غیظ و غضب کا یہ جوش چند مہینوں میں ٹھنڈا پڑا اور ۱۷۹۵ء میں پانچ آدمیوں کی ایک ڈائرکٹری (جماعتِ عاملہ) بنائی گئی جسے نظم و نسق کے تمام عاملانہ اختیارات تفویض کئے گئے۔ اب چونکہ انقلاب کے تقریباً تمام مخالف ہٹائے جاچکے تھے اس لئے عوام کا خوف و ہراس بھی کم ہوگیا تھا۔ اسی زمانے میں نپولین بوناپارٹ نامی ایک سپاہی نے اپنی سپہ گری کے جوہر دکھانے شروع کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کامیابیاں حاصل کیں کہ سارے فرانس کی نظریں اس کی طرف اُٹھ گئیں، اس نے جرمنی، اٹلی، سوئٹزرلینڈ وغیرہ ہی کو فرانس کا زیرِ نگیں نہ بنایا بلکہ یورپ کی حدود سے آگے بڑھ کر اور بحرِ روم کو عبور کرکے مصر پہنچا اور یہاں بھی فرانس کی فتح و ظفر کا پرچم لہرا دیا۔ نپولین کی ان کامیابیوں نے اُسے عوام کی آنکھ کا تارا بنا دیا۔ ہر طرف اسی کے نام کی مالا جپی جانے لگی، اس ہردلعزیزی سے فائدہ

اٹھاکر اس نے ایک دن ڈائرکٹری کو معطل کر دیا اور ۹ ر نومبر ۱۷۹۹ءکو فرانس کا واحد حاکم (Consul) بنا دیا گیا۔ عوام نے اس کے اس عمل کو ناپسند نہ کیا بلکہ بڑی خوشی سے اُسے تمام اختیارات سونپ دیئے، اس لئے کہ لوگ "لیڈر گردی" کی مسلسل بدامنی و خونریزی سے تنگ آ چکے تھے اور ہر قیمت پر امن وامان کی زندگی کو واپس لانا چاہتے تھے

لیکن اب نپولین کے حوصلوں اور امنگوں کی حد نہ تھی۔ وہ ساری دُنیا پر اپنی دھاک بٹھا دینا چاہتا تھا، اس لئے اس نے جگہ جگہ فوج کشی شروع کر دی۔ پھر چونکہ وہ ایک بے مثال جنرل ہی نہ تھا، بلکہ ایک باکمال مُدبّر و سیاست داں بھی ثابت ہوا تھا، اس لئے ہر جگہ کامیابی اس کے قدم چومتی تھی۔ مگر آخر ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ سولہ سال کی مسلسل کامیابیوں کے بعد ۱۸۱۵ء میں اُسے شکست ہوئی اور سینٹ ہلینا (St. Halena) کے جزیرے میں اسے محبوس کر دیا گیا جہاں چھ سال بعد ایک زندانی کی حیثیت سے اُس نے اپنی زندگی کی امانت قدرت کو سونپ دی۔

لیکن نپولین کی اس خودمختاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس میں شاہی پھر عود کر آئی اگرچہ اب یہ شاہی محض برائے نام تھی۔ ۱۸۴۷ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس سال عوام نے پھر بادشاہ کو تخت سے معزول کر کے دوبارہ جمہوریت قائم کی اور اس جمہوریت کا صدر نپولین بونا پارٹ کے بھتیجے نپولین ثالث کو بنایا گیا، نپولین ثالث دو تین سال تک تو قومی اسمبلی کے بنائے ہوئے آئین کے مطابق حکومت کرتا رہا مگر پھر کچھ طاقت پاکر اور کچھ حیلے پیدا کر کے اس نے آئین کو معطل کر دیا اور خود مختار فرمانروا بن بیٹھا۔ مگر ۱۸۷۰ء میں جرمنی کی جنگ میں اسے بُری طرح شکست ہوئی اور عوام کو اس سے بدلہ لینے کا موقعہ ہاتھ آیا یہ ڈر کر انگلستان بھاگ گیا۔ اس کے بعد فرانس میں اس شکست کے دوسرے سال ۱۸۷۱ء میں تیسری بار جمہوریت قائم کر دی گئی۔

انقلابِ فرانس کا اثر دنیا کے دوسرے ممالک پر

اب جمہوریت تمام مخالفتوں سے گزر چکی تھی اور عوام نے عوام کی حکومت کے تمام نکات کو اس عرصے میں خوب سمجھ لیا تھا۔ اس لئے ۱۸۷۱ء کے بعد پھر فرانس میں شاہی نے سر اٹھانے کی جرات کبھی نہ کی انقلاب فرانس کے بعد دنیا نے سیاست و حکومت کے نظام کا جو نقشہ دیکھا تھا، وہ آہستہ آہستہ ہر جگہ جڑ پکڑنے لگا اور غیر مسئول شاہی پر ہر جگہ زوال آنا شروع ہو گیا۔ انگلستان میں لبرل (آزاد خیال) سیاسیوں کا دور ہوا جنہوں نے ۱۸۳۲ء میں انتخاب کا ایک اصلاحی قانون بنایا جس کی رو سے عوام کو بہت بڑی حد تک حکومت کے کاروبار میں دخل دیا گیا۔ پھر وقتاً فوقتاً اس قانون میں ترمیمیں ہوتی گئیں یہاں تک کہ ۱۹۱۱ء میں تمام اختیارات عوام کے ہاتھ میں دیدیئے گئے اور طبقۂ امراء کا جو ایوانِ خاص اب تک ملک کی اصلی طاقت سمجھا جاتا تھا، اُسے ایوانِ عام کے عام ممبروں کے مقابلے میں بالکل بے عمل کر دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء کے اس قانون کی رو سے انگلستان کے ایوان عام کا یہ حق تسلیم کیا گیا کہ ایوان خاص اس کے کسی قانون کو نامنظور نہیں کر سکتا۔ صرف دو سال تک اُسے روک سکتا ہے یا اُسے ایوان عام میں نظر ثانی کے لئے واپس کر سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کے باوجود تین بار کسی قانون کو ایوان عام پاس کر دے تو پھر وہ نافذ ہو جاتا ہے چاہے ایوانِ خاص اس کا مخالف ہو یا موافق۔ لیکن ملک کے مالیہ کو تو ایوانِ خاص ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ بجٹ پر پورا اختیار ایوان عام کو ہے وہ جس طرح چاہے روپیہ صرف کرے، خواص اُسے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی عوام کے ہاتھ میں اختیارات کی باگ ڈور دی گئی اور بادشاہ کے مطلق العنان اختیارات کو آئین و دستور کا پابند بنا دیا گیا۔ گویا جہاں جمہوریت قائم نہ ہوئی وہاں محدود شاہی یا آئینی و دستوری حکومت

ضرور قائم ہو گئی اور جمہوریۂ امریکہ کے صدرِ اعظم ابراہام لنکن کے اس اصول سیاست کی گونج ساری دنیا میں سنائی دینے لگی کہ حکومت عوام کی ہو، عوام کے ذریعے سے ہو اور عوام کے مفاد میں ہو۔[۵]

حکومت کا یہ اصول آج سیاسی مسلّمات میں داخل ہو چکا ہے۔

غلامی کی آخری سانس

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک اسی زمانے میں جب کہ فرانس میں انقلاب کا سمندر عوام کے سینوں میں موج زن تھا نئی دنیا میں بھی یہ لہریں اٹھیں اور ۱۷۷۶ء میں شمالی امریکہ کا وہ وسطی علاقہ جو انگلستان کے ماتحت تھا، اس نے آزادی کا اعلان کیا اور ۱۷۷۸ء میں ایک جمہوری آئین تیار کر کے پہلا صدر منتخب کیا۔ اس اعتبار سے امریکہ کی جمہوریت عمر میں فرانس سے چند سال بڑی ہے۔ لیکن فرانس کی جمہوریت دراصل ایک ایسا زلزلہ آفریں جھٹکا تھا جس نے نہ صرف فرانس کو بلکہ ساری دنیا کو نیند سے چونکا دیا۔ چنانچہ اس جھٹکے کے بعد مخالفوں سے جو کچھ ہو سکا انھوں نے کیا۔ مگر اب انسانیت کروٹ بدل چکی تھی۔ اور وہ وقت آ گیا تھا کہ امیر معاویہ کی بغاوت کے بعد سے انسانی اصلاح کے جو مدارج تشنۂ تکمیل رہ گئے تھے ان کی تکمیل کی جائے۔ چنانچہ ایک طرف تو عوام نے بے روک شہنشاہیت کے مقابلے کا آغاز کیا اور دوسری طرف غلامی کے انسداد کا علم بلند کیا گیا۔ دونوں کوششوں میں عوام کو بے انتہا مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر بالآخر جیت انھی کی ہوئی۔ ٹھیک اس وقت جب کہ یورپ کی "پرانی دنیا" میں بادشاہت اور جمہوریت کے درمیان معرکے ہو رہے تھے، امریکہ کی "نئی دنیا" میں غلامی کے مخالف غلامی کے حامیوں سے

---

[۵] ابراہام لنکن Government for the people, of the people, by the people.

برسرپیکار رہتے[1] ——— آخر چند سالوں کے بعد مخالفت کے تمام بادل چھٹ گئے اور دنیا نے جمہور کی حکومت کے اصول کو بھی تسلیم کیا اور انسانوں کو غلام بنا کر بیچنے کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

توڑ ڈالیں فطرتِ انسان نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک!

انسانوں کو انسان کا پرستار بنانے کی "قابیلی رسم" پر انقلاب اسلام نے ایک ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ اگر داعیٔ[2] اسلام کی ہدایات و عمل پر صحیح اسپرٹ میں عمل کیا جاتا تو یہ غیر انسانی رواج اپنی موت آپ مرجاتا۔ لیکن افسوس کہ بعد کے مسلمانوں کے شہنشاہیت پسند جذبات نے انھیں اس طرف متوجہ ہونے کی بہت کم فرصت دی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام نے جس مساویانہ انسانی معاشرت کی داغ بیل ڈالی تھی اس کو بار آور کرنے کی سعادت دوسروں کے حصے میں آئی ——— لیکن سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ آج مسلمانوں ہی کی نسبت یہ شکایت کی جاتی ہے کہ وہ غلامی کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مجلس اقوام (لیگ آف نیشن) کی اطلاعات کی رو سے حجاز، حضرموت اور نائیجیریا، (افریقہ) کے مسلمان آج بھی انسانی خرید و فروخت کو باقی رکھنے پر مصر ہیں۔

---

[1] دیکھو

G. W. Williams H. C. Carey

1. History of the Slave in America:
2. Slave Trade.

باب ۱۴

صنعتی انقلاب اور قومیت کا تصوّر

امیر معاویہ کی بغاوت اسلام کے اس اصول کی عملی تکمیل کے راستے میں حائل ہوگئی تھی کہ حکومت و فرمانروائی عوام کے مفاد میں اور عوام ہی کی مرضی سے ہونی چاہیئے نہ کہ چند مخصوص افراد کے مفاد میں ان کی من مانی خواہشوں کے مطابق ——— جس وقت امیر معاویہ نے دمشق میں سلطنت کا دربار سجایا تھا اس وقت اسلام کے علمبرداروں نے اُنکے اس عمل کو سخت ناپسند کیا تھا اور اسے اسلام کی رُوح کے بالکل منافی قرار دیا تھا مگر امیر معاویہ نے تیغ و تفنگ کے زور سے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا اور انتہائی بیرحمی مگر کامل تدبر و دانائی کے ساتھ تمام مخالفتوں کا قلع قمع کردیا۔ امیر معاویہ کے بعد ان کے بیٹے یزید نے اس سے زیادہ بیرحمی برتی اور شہنشاہیت کے جس تصوّر کی داغ بیل باپ نے ڈالی تھی۔ بیٹے نے بھی اس کی تکمیل کردی۔ اس کے بعد معاویہ کے خاندان کے خلاف بغاوتیں ہوئیں، وہ تباہ ہوا، اس کی جگہ عباسی فرمانروا آئے۔ مصر میں فاطمی سلاطین نے بساطِ حکومت بچھائی، ایران میں مسلمان بادشاہتیں قائم ہوئیں، ہندوستان میں ترکوں، پٹھانوں، لودیوں اور مغلوں کا ڈنکہ بجا، اسپین

یہی عربوں کے سطوت وجلال نے یورپ کی آنکھیں خیرہ کیں ـــــ غرض کیا کیا نہ ہوا لیکن داعی اسلام نے سیاست و فرمانروائی کا جو پودا لگا دیا تھا اور خلفائے راشدین نے اپنی ۲۹ سالہ عہد خلافت میں جس کی آبیاری کی تھی، وہ پودا برگ و بار نہ لاسکا۔ دُنیا خلافتِ راشدہ کے طرزِ حکومت کو تاریخ کے اوراق میں پڑھتی تھی مگر اُسے زیرِ عمل لانے کا تصور نہ کر سکتی تھی۔ لیکن آخر دنیائے انسانیت قابلیت کی دست درازیوں کا شکار کب تک رہتی؟ مظلومیت و بیچارگی کے اس جوالا مکھی کو آخر ایک دن پھٹنا تھا۔ چنانچہ ۵ رمئی ۱۷۸۹ء کو فرانس میں یہ پھوٹ نکلا اور دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ حق و انصاف کو چند دن کے لئے دبا دینا تو ممکن ہی۔ لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے دبائے رکھنا ناممکن ہی۔

انقلابِ فرانس اور اسلام

البتہ یہ امر حیرت انگیز ہی کہ جو کام اسلام کے پیام پر یقین رکھنے والوں کو کرنا چاہیے تھا، اُسے یورپ نے سرانجام دیا۔ لیکن یہ بات حیرت انگیز سہی، مگر غیر منطقی نہیں ہی۔ بلاشبہ اگر یورپ پاپائی عیسائیت کے اسی بوجھ کے نیچے دبا رہتا جو مارٹن لوتھر کے وقت تک اُسے دبائے ہوئے تھا، تو انقلاب فرانس کے تصور کی پرچھائیں بھی اُس کے دل و دماغ پر نہ پڑتی۔ اخلاقی و معاشرتی اعتبار سے پاپائیت نے اُسے جن زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، ان کی وجہ سے وہ ترقی کا ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکتا تھا۔ مگر اصلاحِ مذہب کی تحریک نے اس کی یہ زنجیریں ایک ایک کرکے توڑ دیں، اب نہ وہ مذہبی بزرگوں کے بتوں کو پوجتا تھا اور نہ شراب میں بھیگی ہوئی روٹی میں حضرت عیسیٰ کا جسم اُسے نظر آتا تھا، اب نہ وہ پادریوں کا محتاج تھا اور نہ اربابِ کلیسا کے اقتدار کے جنگل میں اس کی روح پھنسی ہوئی تھی۔ اب وہ آزاد تھا: اس کا جسم آزاد تھا اور اس کی روح آزاد تھی۔ قسطنطنیہ سے آئے ہوئے نو وارد حاملین علم و فضل نے اس کی اس آزادی کو اور نکھار دیا۔ اب کیا تھا کامیابی کی ایک منزل طے ہو چکی تھی۔ اب آگے بڑھ کر صرف دوسری منزل تک پہنچنا تھا۔ پاپائیت

کا بوجھ جھٹک کر پھینک دیا گیا تھا۔ اب ایک جھٹکے کی اور ضرورت تھی کہ مطلق العنان شاہی کا بوجھ بھی دور جا پڑے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں یورپ اس جھٹکے کے لئے بھی تیار ہو گیا اور اگرچہ اس جنبش میں اُسے بڑی کشتم پچھاڑ کرنی پڑی مگر بالآخر کامیابی کا سہرا اسی کے سر رہا اور تمام مخالف طاقتیں صرف تاریخ کے اوراق کی زینت بن کر رہ گئیں اور بس۔

لیکن ارباب اسلام کی حالت اس کے برعکس رہی۔ یورپ نے سولھویں صدی عیسوی کے بعد اصلاح مذہب کے نام سے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ اسلام کے نام لیواؤں کو ایک ہزار سال پہلے ہی حاصل ہو چکا تھا۔ وہ نہ کسی مذہبی بزرگ کی پوجا کرتے تھے، نہ کسی شراب یا شوربے کی بھیگی ہوئی روٹی میں انھیں خدا یا خدا کا اوتار نظر آتا تھا اور نہ اپنی روح اور خدا کے مابین کسی پروہت یا پادری کے محتاج تھے ـــــــ مگر اس کے باوجود حقیقت یہ ہو کہ امیر معاویہ کی بغاوت کے بعد جو مطلق العنان شہنشاہتیں قائم ہوئیں انہوں نے ان عقائد پر زنگ چڑھانا شروع کر دیا۔ اس لئے ٹھیک اُس وقت جب کہ یورپ منزل مقصود کی روشنی دیکھ کر اس کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، ارباب اسلام کا قدم اسی منزل سے پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ وہ موحد ضرور تھے، مگر اس موحدیت کی روح مضمحل ہو چکی تھی، وہ عہد سعادت و خلافت کے زمانے کو معجزات سمجھنے لگے تھے اور اس زمانہ کی ہر نقل و حرکت کو صرف مبہوت ہو کر سُن تو سکتے تھے، مگر اس پر عمل کرنے کا تصور نہ کر سکتے تھے۔ ان کو یہ سمجھایا گیا تھا کہ اس زمانے میں جو کچھ ہوا تھا، فرشتوں کی مدد سے ہوا تھا، اِس لئے اب جبکہ فرشتے مدد کے لئے نہیں آسکتے، کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ مہدی اور عیسیٰ کی آمد کے منتظر تھے۔ اور اپنے عمل کی طاقتوں پر بھروسہ کرنا بھول گئے تھے۔ انہوں نے خندقیں کھودنے اور قلعے بنانے کے بجائے، خانقاہیں اور صومعے بنانے شروع کر دیئے تھے اور حال و قال کی مجلسوں ہی میں اپنی نجات کا سامان دیکھنے لگے تھے۔ حکومت و فرمانروائی

کے مسائل کی بابت اُن کا تصور یہ ہو گیا تھا کہ وہ عوام کا نہیں خواص ہی کا حصہ ہیں اس لئے ان پر غور کرنا عام انسانوں کا کام نہیں۔

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش (حافظؔ)

اُن کو یہ سمجھایا گیا تھا کہ بادشاہ اگرچہ خدا تو نہیں مگر خدا کا سایہ ضرور ہی، اللہ نہیں مگر ظلِ اللہ ہی، اس لئے اس ظلِ اللہ کی بے چون وچرا اطاعت ان کی رگ وپے میں اس طرح سرایت کرنے لگی تھی کہ اس کی تعریف وتوصیف میں بڑے سے بڑا مبالغہ کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ایک نے کہا کہ

نُہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے
تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلاں دھد (ظہیر فاریابی)

تو دوسرا اس سے بھی دس ہاتھ آگے بڑھ کر بولا:

چیست کاں بر تو روا نیست مگر عز وجل (انوری)

اسلام نسل ونسب کا امتیاز مٹانے آیا تھا، مگر ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں نے اہلِ بیت اور سادات کے نام سے ایک نیا امتیاز پیدا کر دیا۔ چنانچہ اسلام کی تاریخ میں لاکھوں انسانوں کے خون صرف اس لئے بہائے گئے کہ خلافت وپادشاہی اولادِ رسول کا حق ہی

پھر یہ صحیح ہی کہ مسلمانوں میں بڑے بڑے صاحبِ کمال پیدا ہوئے، رزم وبزم کے میدانوں میں مسلمانوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے بیش بہا جوہر دکھلائے اور آنیوالی نسلوں کے لئے قیمتی یادگاریں چھوڑیں۔ لیکن حقیقت یہ ہی یہ سب کچھ "چند" خواص" کی کارفرمائیاں تھیں، عام مسلمان ظلمت وتاریکی اور جہالت وپس ماندگی کے غار میں پڑے رہے۔ اس لئے جو ترقی ہوئی وہ ایک خاص طبقے تک محدود رہی: عام عالمِ اسلام اس کی اثرات سے یکسر محروم

رہا۔ عام مسلمان بظاہر مسلمان ضرور تھے، مگر ان کی زندگیاں خودداری و خود اختیاری کے زیور سے عاری تھیں اور ان کے دل و دماغ علم و یقین کے نور سے بے بہرہ۔ وہ امیروں اور جاگیرداروں کے بندۂ بے دام تھے، اور ان کے شب و روز، بندگی و چاکری میں بسر ہوتے تھے۔ ان کو سمجھایا گیا تھا کہ قدرت کا کارخانہ بھی ایک شہنشاہی کارخانہ ہے جہاں خود مختار بادشاہوں، مطلق العنان رئیسوں اور آمریت پسند امیروں کی مدد سے من مانی کارروائیاں ہوتی ہیں اور اس کائنات ہستی کا نظم و نظام بھی ایک سلطانِ علے الاطلاق کے نظامِ حکومت کی طرح اس نوع کا ہے کہ :-

بہ تہدید گر برکشد تیغ حکم — بمانند کرّوبیاں صمّ و بُکم
وگر در دہد یک صلائے کرم — عزازیل گوید نصیبے برم — سعدیؒ

اس قسم کی تعلیمات نے عام مسلمانوں کے دل و دماغ میں قدرتاً پژمردگی و افسردگی کے وہ تمام جذبات پیدا کر دیئے جو انسانی قوتِ تخلیق اور فطری جوہر ترقی کے لئے زہر ہلاہل کا حکم رکھتے ہیں اور جن کے نتیجے میں ایمان و اخلاق کی پاکیزگی کو گوشہ نشینی و ترکِ دُنیا کے آئینے میں دیکھنا شروع ہو جاتا ہے۔

اِن حالات میں ظاہر ہے کہ اسلام کے پیام کو ماننے والوں سے یہ توقع کرنا فضول تھا کہ وہ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے پھر کمر باندھ کر اُٹھیں گے۔ جنھیں امیر معاویہ کی بغاوت نے ادھورا چھوڑ دیا تھا، اس کے برعکس وہ تو ان اصولوں کو بھی بھولتے جا رہے تھے جو عملی جامہ پہن چکے تھے اور جن کی بدولت روئے زمین میں ان کا مدمقابل کوئی باقی نہ رہا تھا۔ اکبر مرحوم نے خوب کہا ہے:-

صبر، خودداری، دلیری، حق پرستی اب کہاں
رکھ لیا اچھا سا اک نام اور مسلماں ہو گئے!

مختصر یہ کہ مسلمانوں کی جو حالت امیر معاویہ کے بعد تھی، یورپ کی وہی حالت

اصلاحِ مذہب کی تحریک کے بعد ہو گئی تھی۔ مگر مسلمانوں نے شہنشاہیت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے، لیکن یورپ نے اپنی ان تھک جد وجہد جاری رکھی، پھر یہ دنیا میں کب ہوا ہے کہ ان تھک جد وجہد کرنے والوں کو کامیابی نہ ہو؟ یورپ کو کامیاب ہونا چاہیئے تھا اور وہ کامیاب ہوا، شاہیت کو مٹنا چاہیئے تھا اور وہ مٹی، چند افراد کے مفاد کے بجائے عوام کے مفاد میں حکومت کرنے کا اصول رائج ہو جانا چاہیئے تھا اور وہ ہوا۔ چند انسانوں کے امتیازی حقوق کو مٹ کر سب انسانوں کے مساوی حقوق کا اعلان ہونا چاہیئے تھا اور وہ ہو کر رہا۔ ——— قدرت عمل کو دیکھتی ہے، نام یا لقب کو نہیں دیکھتی۔ اس لئے داعی اسلام کے پیرو جب انسانیت کی فلاح وبہبود کا پیام بھول گئے تو قدرت نے اس پیام کی اشاعت کے لئے دوسروں کو منتخب کر لیا۔

عوام کے حقوق کی تفصیل اور ان کو محفوظ رکھنے کے اصول

انقلابِ فرانس کا کارنامہ دراصل یہ نہیں ہے کہ اس نے عوام کو حکمران بنانے کا اصول طے کیا یا یہ اصول دنیا کو بتایا کہ حقوق کے لحاظ سے سب انسان برابر ہیں، اس لئے کہ یہ سب اصول انقلاب اسلام کے بعد دنیا کو معلوم ہو چکے تھے لیکن ان پر عمل کرنے اور عمل کرانے کے طریقے معلوم نہیں تھے، بالفاظِ دیگر وہ مشینری لامعلوم تھی جس کی مدد سے ان اصولوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا۔ انقلابِ فرانس نے دراصل یہ مشینری ہی دنیا کو دی۔ اس انقلاب کے بعد یہ طے ہوا کہ حکومت کا ایک دستور و آئین مرتب ہونا چاہیئے جس سے انحراف کرنے کی اجازت کسی کو نہ ہو خواہ وہ بادشاہ ہو یا عوام کا منتخب کیا ہوا پریزیڈنٹ۔ پھر اس آئین کو بنانے اور اس پر عمل پیرا رکھنے کی طاقت عوام کے ہاتھ میں دی گئی۔ یہ حقیقت تو اسلام نے بتا دی تھی کہ اجماعِ امت کو ہر مسئلہ میں آخری فیصلہ دینے کا حق ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اجماع امت کو معلوم کیسے کیا جائے؟ انقلابِ فرانس کے بعد اسے معلوم کرنے کے لئے رائے یا ووٹ دینے کے

مبسوط و مفصل اصول بنائے گئے اور یہ طے ہوا کہ ایک تو بلا استثنا ہر بالغ انسان کو ووٹ کا حق دیا جائے اور دوسرے بیرونی اثرات سے بچانے کے لئے ووٹ خفیہ لئے جائیں ان ووٹوں کے ذریعہ عوام جن افراد کو منتخب کریں وہی حکومت کی مسند پر متمکن ہوں عوام کے ہاتھ میں حکمرانی کی طاقتیں محفوظ کرنے اور حکومت کے منتخبہ افراد کو بے راہ روی سے روکنے کے لئے بہت سے اصول وضع ہوئے مثلاً عاملانہ و عادلانہ اختیارات کی علیحدگی سیاسی اختیارات کی تقسیم میونسپل، لوکل بورڈ اور صوبوں وغیرہ میں، لکھا ہوا آئین جن میں ردّ و بدل نہ کیا جا سکے، اس آئین میں ترمیم و تنسیخ کا حق تاکہ اسے ہمیشہ عوام کی رائے اور مرضی کے ماتحت رکھا جائے، دو منتخبہ ایوانوں (اپر، لوئر) کا قیام تاکہ قوانین و احکام پر کافی غور ہو سکے، ہر بالغ کو ووٹ کا حق، مجلس قانون ساز کے علاوہ براہِ راست ووٹروں کو بھی قانون بنانے کا اختیار (Initiative) کسی خاص اور اہم مسئلے میں مجلس قانون ساز کا کل ووٹروں سے براہ راست فیصلہ چاہنا (Referendum) حکومت کی کسی اہم پالیسی کو طے کرنے کے لئے ووٹروں کا اپنے نمائندوں کی وساطت کے بغیر رائے دینا (Plebiscite) ملک کی سیاسی جماعتوں کو باضابطہ طور پر تسلیم کرنا ——— وغیرہ وغیرہ

پھر عوام کے حقوق کی بھی تفصیل کر دی گئی اور حکومت کو ان حقوق کی حفاظت کا ذمّہ دار قرار دیا گیا تاکہ اگر وہ اس ذمہ داری کی کماحقہ، بجا آوری میں غفلت برتے تو اُسے مسندِ اختیار سے ہٹایا جا سکے۔ عوام کے ان حقوق کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی کہ ہر شخص کو ترقی کے یکساں مواقع دیئے جائیں۔ اور کم عمر بچّوں کے سوا ہر شخص کو آزاد و مختار سمجھا جائے اور کسی ایک شخص کو بھی کسی دوسرے انسان کا غلام بننے کی اجازت نہ دی جائے۔

چنانچہ اس اصول کی بنا پر نہ صرف عوام کے جان و مال کا تحفظ اور امن و اطمینان

کے ساتھ نقل وحرکت کرنے کی آزادی کا تحفظ ہی حکومت کے فرائض میں داخل کیا گیا بلکہ حکومت کا فرض یہ بھی قرار دیا گیا کہ

۱- بلا استثنا ہر ایک کو اتنی تعلیم ضرور دی جائے کہ وہ بآسانی لکھ پڑھ سکے اور معمولی اخبارات و رسائل کا مطالعہ کر سکے۔

۲- ہر شخص کی گذر اوقات کا کم از کم اتنا انتظام ضرور کر دیا جائے کہ وہ معمولی طور پر زندگی بسر کر سکے۔

۳- تحریر و تقریر پر کسی قسم کی کوئی روک نہ ہو اور نہ جماعت بنانے پر کسی قسم کی کوئی پابندی ہو۔ ہر عقیدے اور ہر خیال کے انسان کو آزادی کے ساتھ اپنے عقائد وخیالات کی اشاعت کی اجازت دی جائے بجز ایسی صورت کے کہ وہ کھلے طور پر فحش و مخرب اخلاق ہوں۔

تحریر و تقریر کی آزادی اور سیاسی جماعتوں کے بحث و مباحثے چونکہ رائے عامہ کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں اس لئے عوام کے اس حق کی حفاظت کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی حتیٰ کہ فرانس اور بلجیم میں تو اُسے دستور اساسی کا ایک اہم جزو بنا دیا گیا ہے۔

۴- عوام کی صحت وسلامتی کی حفاظت نہ صرف بیرونی حملہ آوروں یا اندرونی قانون شکنوں سے کی جائے بلکہ امراض کے حملے سے بچانے کے لئے حفظانِ صحت کے تمام لوازم کو بھی ہر انسانی بستی میں فراہم کیا جائے۔[1]

---

[1] دیکھو "مختلف سیاستوں کا تقابلی مطالعہ" از فری مین اور "عوامی حکومت" از ایچ۔ ایس۔ مین اور "یورپ میں جمہوریت"

1. Comparative Politics : Freeman ;

2. Popular Government : Maine.

Democracy in Europe : May

قومیت یا نیشنل ازم کی پیدائش

نپولین بوناپارٹ کی شکست کے بعد ۱۸۱۵ء میں آسٹریا کے پایۂ تخت ویانا میں یورپ کی اقوام کی ایک کانگرس منعقد ہوئی تھی۔ اس کانگرس میں پہلی بار اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا کہ ہر وہ انسانی بستی جو نسل، مذہب، تہذیب اور زبان وغیرہ کے اعتبار سے ایک ہو وہ ایک قوم ہے اور ہر قوم کو سیاسی اعتبار سے آزاد و مختار ہونے کا حق ہے اور کسی دوسری قوم کو حق نہیں کہ وہ اپنے علاوہ کسی دوسری قوم پر حکمرانی کرے۔ لیکن اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے باوجود ہر قوم کو سیاسی خود اختیاری سے بہرہ مند کرنا اس وقت عملاً ممکن نہ تھا۔ اوّل تو یورپ کی تمام قوتیں اتنی منظم اور طاقتور نہ تھیں کہ اپنے اس حق کو منوا سکتیں اور دوسرے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آسٹریا ہنگری، جرمنی، روس، ترکی اور اٹلی وغیرہ کی شہنشاہتیں اس کے لئے تیار نہ ہو سکتی تھیں کہ ان کی مملکت کے حدود میں جو دوسری قومیں آباد ہیں ان کو آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقعہ دے سکیں۔ تاہم انقلاب فرانس کے بعد یورپ میں قومی خود اختیاری کا جو جذبہ شدت کے ساتھ پھیل رہا تھا اس کو جس حد تک ممکن تھا مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر چونکہ یہ کوشش پوری طرح کامیاب نہ تھی اس لئے غیر مطمئن قوموں نے تلوار کے زور سے اپنے حق کو منوانے کی کوشش شروع کی چنانچہ اس کانگرس کے بعد یورپ میں جتنی جنگیں ہوئیں ان سب کا بنیادی نقطہ یہی تھا کہ ہر قوم اپنے جذباتِ آزادی و سروری کو آسودہ کرنا چاہتی تھی۔

صنعتی انقلاب اور قوموں کے درمیان رقابت و مسابقت کا آغاز

اسی زمانے میں یورپ میں بھاپ کی طاقت کا علم لوگوں کو ہوا تھا جس کی مدد سے بڑی بڑی مشینیں اور بڑے بڑے کارخانے بنائے جا رہے تھے۔ اب تک صنعت و حرفت کا تمام کام

گھروں پر ہاتھ سے کیا جاتا تھا، مگر اب بھاپ کے انجنوں اور مشینوں کی آمد نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جو چیز انسانی ہاتھ سے دن بھر کی محنت کے بعد تیار ہوتی تھی، اُسے مشینی ہاتھ نے منٹوں میں تیار کرنا شروع کر دیا۔ مشینوں اور انجنوں کی اس طاقت نے صنعت و حرفت کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ بڑے بڑے سرمایے سے کارخانے تیار ہونے لگے اور اس میں پہلے سے کہیں زیادہ مقدار میں سامان تیار ہونے لگا۔ مگر مشینوں سے تیار ہونے والے سامان کی اس زیادتی نے دو نئے سوال کھڑے کر دیئے۔ ایک تو یہ کہ اتنا بہت سا سامان بیچا کہاں جائے اور دوسرے یہ کہ اتنے بہت سے سامان کو تیار کرنے کے لئے ابتدائی مواد کہاں سے لایا جائے۔ مثلاً کل تک جب کہ ہاتھ سے کام ہوتا تھا پورا یورپ مل کر جتنا کپڑا بنتا تھا وہ یورپ والوں کے لئے بمشکل کافی ہوتا تھا، مگر اب مشینوں کی مدد سے اس نے اتنا کپڑا تیار کرنا شروع کر دیا کہ وہ ایک یورپ کیا اس جیسے کئی ملکوں کیلئے کفائت کر سکتا تھا۔ اس لئے اس فالتو سامان کو فروخت کرنے کے لئے یورپ کے علاوہ دنیا کے دوسرے بازاروں اور منڈیوں کی احتیاج کارخانہ داروں کو محسوس ہوئی۔ پھر دوسرا سوال ابتدائی مواد یعنی روئی کا تھا۔ کپڑا بغیر روئی کے کیسے تیار ہو سکتا ہے، لیکن اتنے کثیر مقدار کپڑے کے لئے جتنی روئی کی ضرورت ہے وہ صرف یورپ میں تو پیدا نہیں کی جا سکتی۔ زمین تو صرف اتنی ہی چیز پیدا کرے گی جتنی اُس میں فطری طاقت ہے۔ اس لئے نہ صرف تیار شدہ مال بیچنے کے لئے دنیا کی دوسری منڈیوں کی ضرورت یورپ کو ہوئی بلکہ روئی وغیرہ کی قسم کے کچے سامان کو خریدنے کے لئے بھی ان منڈیوں کی شدید احتیاج لاحق ہوئی۔ اس احتیاج سے مجبور ہو کر اس نے دنیا کی طرف نظر اٹھائی اور جگہ جگہ اپنی تجارت کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ بدنصیبی سے یورپ کے سوا باقی دنیا ابھی مشینوں سے بے خبر تھی۔ اس لئے مغربی تاجروں کی آمد اُسے ناگوار نہ گذری، بلکہ اس نے بڑی خوشی سے ان کا خیر مقدم کیا، اُسے

اپنے کچے سامان کے لئے ایک مالدار گاہک ہاتھ آیا اور اس کے معاوضے میں اُسے ایسا سامان ملنا شروع ہوا جسے وہ خود تیار نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ نئی اور پُرانی دونوں دنیاؤں کے بازاروں میں یورپ کے تاجروں کی اہمیت بڑھنے لگی۔ مگر اب خود یورپ کی مختلف قوموں میں گھوڑ دوڑ شروع ہوئی۔ اس گھوڑ دوڑ میں ہر قوم نے اپنے بازاروں کو اپنے لئے محفوظ کرنے کی غرض سے اُن پر سیاسی تسلّط جمانا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے آخر تک افریقہ کے ایک کروڑ پندرہ لاکھ مربع میل رقبے میں سے لائبیریا اور مصر کی برائے نام آزادی کے علاوہ باقی پورا خطّہ براہِ راست یورپ کے سیاسی اقتدار میں آگیا۔ نئی دنیا میں امریکہ اور آسٹریلیا میں چونکہ یورپ کے مہاجرین بہت کافی تعداد میں بس گئے تھے، اس لئے انہوں نے یورپ کے اقتدار سے آزادی تو حاصل کرلی مگر وہاں کے اصلی باشندوں کی محنت اور وہاں کی زمینوں کی پیداوار سے فائدہ اٹھانے میں انہوں نے بھی اپنے یورپی بھائیوں سے ساز باز کرلیا۔ ایشیا میں ہندوستان تو انگریزی اقتدار ہی میں آگیا۔ لیکن اس کے علاوہ مشرقی و مغربی ایشیا کا جو علاقہ بظاہر آزاد تھا، اُسے بھی تجارتی معاہدوں کی دفعات میں یورپ نے جکڑ لیا۔[۱]

غرض اٹھارویں صدی کے آخر سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل تک ساری دنیا کے بازار یورپ کے قبضے میں تھے، جہاں کارخانے دار کچا سامان خریدتے تھے اور تیار شدہ سامان بیچتے تھے۔ اس تجارت میں نفع زیادہ تر یورپ ہی کو تھا اس لئے کہ اوّل تو سیاسی اقتدار کی وجہ سے کچا سامان اُسے معمولی قیمتوں پر حاصل ہو جاتا تھا اور دوسرے مشینوں کی مدد سے اس سامان کی شکل و صورت بدل

---

[۱] دیکھو "تاریخ نو آبادیات" از سر جانسٹن اور دی پارٹیشن اینڈ کالونائزیشن آف افریقہ مصنفّہ سر لوکس۔

کر اصل قیمت سے کہیں زیادہ میں وہ اُسے بیچ دیتا تھا۔ اس تجارت نے ساری دنیا کی دولت کا بہاؤ یورپ کی طرف کر دیا اور ساری دنیا یورپ کے معاشی دام میں گرفتار ہو کر رہ گئی۔

مگر اس تجارت میں قدرتاً یورپ کی بعض قومیں زیادہ فائدے میں تھیں اور بعض کم فائدے میں جن قوموں نے ذرا پہلے سے توجہ کرکے بڑے بڑے بازاروں پر قبضہ جما رکھا تھا ان کے مقابلے میں دوسری قومیں خسارے میں رہتی تھیں۔ اس لئے اس نابرابری پر یورپ کی قوموں میں باہمی رشک و رقابت کا جذبہ پیدا ہوا اور باہمی بداعتمادی کی فضا بڑی شدت سے پھیلنے لگی۔ سیاسی خودمختاری فضول ہے۔ اگر معاشی حالت اچھی نہ ہو، اس لئے یورپ کی ہر قوم میں سیاستاً آزاد ہونے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا اولین اقتضا یہ تھا کہ معاشی اعتبار سے بھی وہ مالدار ہو لیکن معاشی اعتبار سے ہر قوم مالدار کیسے ہو سکتی تھی؟ دنیا کے بازاروں پر قوموں نے جس طرح تسلط جما رکھا تھا۔ اس کا اقتضا ہی یہ تھا کہ کچھ قومیں تو نفع میں رہیں اور کچھ نقصان میں جنوبی افریقہ میں سونا بہت پیدا ہوتا ہے، مگر چونکہ جنوبی افریقہ ایک خاص قوم کے قبضے میں ہے، اس لئے سونے کی ان کانوں پر ایک خاص قوم کے سرمایہ داروں کے مقابلے میں دوسرے لوگوں کا گذر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح دوسرے ملکوں کا حال تھا۔ پھر درآمد برآمد کا محصول تھا جس کی مدد سے دوسروں کی خرید و فروخت کو روکا جا سکتا تھا۔ الف نہیں چاہتا کہ جاوا میں ب کا مال بکے، وہ یہاں صرف اپنا مال بیچنا چاہتا ہے۔ اس لئے ب جو مال جاوا میں لاتا ہے اس پر الف بھاری محصول لگا دیتا ہے۔ اس محصول کی وجہ سے قدرتاً ب کو اپنے مال کی قیمت بڑھانا پڑتی ہے تاکہ وہ خسارے میں نہ رہے۔ مگر قیمت کے بڑھانے سے جاوا کے بازار میں اس کا سامان الف کے مقابلے میں گراں ہو جاتا ہے۔ پھر جب سستا سامان موجود ہے تو گراں کوئی کیوں خریدے؟ نتیجہ یہ کہ ب پر جاوا کا بازار بند ——— یہی صورت کچے سامان کی خریداری پر ہے۔ ب جاوا کی شکر خرید

کر باہر لے جانا چاہتا ہے تو سرحد پر اُس سے برآمد کا محصول طلب کیا جاتا ہے محصول دینے کے بعد جو شکر اس نے ایک میں خریدی تھی وہ سوا یا ڈیڑھ کی ہو جاتی ہے لیکن "الف" جو جاوا پر قابض ہے، اُس نے خود اپنے مال پر چونکہ کوئی محصول نہیں لگایا اس لئے اُسے شکر مہنگی نہیں پڑتی۔

پھر راستوں کا سوال تھا۔ مثلاً جاوا تک پہنچنے کے لئے جو راستہ سب سے نزدیک ہے اس پر الف کا قبضہ ہے۔ اس لئے ب نقصان میں رہتا ہے کیونکہ اُسے آمد و رفت کا کرایہ جتنا دینا پڑتا ہے اتنا الف کو نہیں دینا پڑتا۔ اور پھر بھی ب کو وہ آسانیاں حاصل نہیں ہوتیں جو الف کو ہیں۔ علاوہ ازیں الف جب چاہے یہ راستہ بند کر سکتا ہے ——

راستوں پر قبضہ کرنے کی صورتیں دو ہیں: ایک تو یہی کہ جس زمین سے راستہ جاتا ہے اس پر قبضہ ہو اور دوسرا یہ کہ راستے کے خاص خاص اڈّوں اور ناکوں پر قبضہ کر لیا جائے، خصوصاً سمندری راستوں پر قبضہ رکھنے کی صورت یہی ہے۔ مثلاً نہر سویز جس کے قبضے میں ہے۔ اسی کے قبضے میں بحرِ روم سے بحرِ ہند میں جانے کا راستہ بھی ہے۔ نہر پناما جس کے پاس ہے، وہ بحر اطلانٹک اور بحر الکاہل کے درمیانی راستے پر حکمراں ہے۔ دردانیال اور باسفورس کے ناکوں پر قبضہ رکھنے والا بحر مارمورا اور بحر روم کی درمیانی شاہراہ پر تسلط رکھتا ہے۔

غرض اس تجارتی و معاشی سوال نے یورپ کی قوموں کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا۔ ہر قوم سیاسی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ معاشی اعتبار سے بھی دوسری قوم کے ہم پلہ ہو کر جینا چاہتی تھی، مگر حالات اس قسم کے بنا دئے گئے تھے کہ یہ ممکن نہ رہا تھا۔ اِس لئے وہ قومیں جو سیاستاً آزاد تھیں لیکن معاشاً دوسروں کی دست نگر تھیں اور وہ جو سیاستاً اور معاشاً ہر طرح محکوم تھیں دونوں میں جبر و طاقت کی مدد سے فوقیت و برتری حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور اس جذبے نے رفتہ رفتہ نسل و قومیت کے سوال میں

جارحانہ وحملہ آورانہ رنگ پیدا کر دیا۔ ہر قوم نے اپنے عوام کو یہ درس دینا شروع کیا کہ دنیا میں ان کی نسل جسمانی وروحانی اور تہذیبی وتمدنی ہر لحاظ سے ساری دنیا پر بھاری ہے اس لئے دنیا کی سرداری کا حق صرف ان ہی کو پہنچتا ہے۔ نسلی برتری کے اس درس سے عوام کے دل میں مقابلہ ومقاومت کے جذبات مشتعل کئے جاتے تھے تاکہ وہ جبر وطاقت کی مدد سے معاشی وسیاسی برتری حاصل کر سکیں۔ اس سے قبل عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر بادشاہ اپنی مقصد براری کیا کرتے تھے، مگر اب مذہب کا سوال اس لئے نہ رہا تھا کہ سارا یورپ عیسائی تھا اور عقیدتاً ایک قوم دوسری قوم سے بہت کم اختلاف رکھتی تھی، اس بناء پر اب اپنے حریف کے خلاف جذبات کو مشتعل کرنے کا ذریعہ لے دے کے یہی رہ جاتا تھا کہ قومی اور نسلی تفاخر سے کام لیا جائے۔ اس لئے آہستہ آہستہ قومیت کے جذبے نے یورپ میں مذہب کی سی شدّت اختیار کر لی اور اگرچہ پاپائی اقتدار کے چنگل سے آزاد ہونے پر مذہب کا جُوا یورپ نے اپنے کندھوں سے اتار دیا تھا، مگر اب قومیت کے نام سے ایک نئے مذہب کا بھوت اس پر سوار ہو گیا۔ پاپائیت کے زوال اور انقلاب فرانس کے آغاز سے پہلے افراد میں غلبہ واقتدار اور دولت وتمول کے حصول کی جو رقابتیں اور چشمکیں تھیں اور جن کی وجہ سے شاہیاں بنتیں اور بگڑتی تھیں اب وہ جذبہ افراد کے بجائے قوموں میں منتقل ہو گیا۔ اب قوموں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہنے کا جذبہ پیدا ہوا اور ہر قوم نے خود کو ساری دُنیا سے ارفع واعلیٰ ثابت کرنا شروع کر دیا ——————

باب ۱۵

اشتراکیت و اشتمالیت

قومیت

انقلاب فرانس سے پہلے انسانوں کی تقسیم عموماً شریف و کمین یا امیر و غریب کے دو حصوں میں تھی، یا پھر مذہبی عقائد کے لحاظ سے کئی مذہبوں میں، نسل یا قوم کے اعتبار سے جو انسانی تقسیمیں تھیں ان کا تصور بہت دھندلا تھا لیکن انقلابِ فرانس کے بعد قومی تقسیم کا یہ تصور اُبھرنا شروع ہوا اور صنعتی انقلاب کے آغاز نے اسے مذہبی جذبے کی سی حیثیت دیدی۔ ہر وہ انسانی گروہ جو رنگ و نسل، زبان و تاریخ، عقائد و روایات اور تہذیب و معاشرت کی لحاظ سے بالکل یکساں تھا، یا تقریباً یکساں تھا، اس نے خود کو ایک قوم یا نے شن کہنا شروع کیا، اور ہر قوم یا نے شن نے اپنے مفاد کو دنیا کی تمام دوسری قوموں پر مقدم رکھنے کے فلسفے پر عمل کرنا شروع کیا۔ جس طرح مذاہب کے ماننے والے اپنے مذہب ہی کو مذہب حقہ سمجھ کر دوسرے تمام مذاہب پر اُسے فوقیت دیتے ہیں، اسی طرح قومیت یا نیشنل اِزم کا جذبہ بھی اپنی قوم کو دنیا کی ساری اقوام پر فوقیت دیتا ہے، اور اپنی نسل زبان تاریخ اور تہذیب و معاشرت کو ساری دنیا سے افضل و اعلیٰ سمجھتا ہے۔

قومیت کا یہ تصور دراصل انفرادی آزادی اور جمہوریت کی براہ راست پیداوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب فرانس سے پہلے تک کی دنیا اس تصور سے قطعاً ناآشنا تھی انقلاب فرانس سے پہلے پورا یورپ ایک مرکزی کلیسا کے ماتحت تھا یعنی آج کل کی اصطلاح میں دنیا، بین الاقوامی اصولِ سیاست پر عامل تھی۔ یہی اصول دنیا کے دوسرے علاقوں میں کارفرما تھا۔ لیکن جمہوریت نے چونکہ افراد کی آزادی پر زور دیا اور شاہی اختیارات ایک فرد سے لے کر عوام کو سونپنے کا اصول طے کیا اس لئے اس خیال سے کہ کہیں زیادہ تعداد والے گروہ، کم تعداد والے گروہوں پر ظلم نہ کرنے لگیں، قومی گروہ بندی کا تصور پیدا ہوا۔ سنہ ۱۴۳۱ء میں جب فرانس کی مشہور خاتون جون آف آرک کے خلاف "کفر و ارتداد" کا مقدمہ پادریوں کی عدالت میں چلایا گیا تو فرانس کے قومی وحدت ہونے کے سلسلے میں آزادیٔ فرانس کی نسبت جن خیالات کا اظہار جون نے کیا وہ کسی کی سمجھ میں نہ آسکے، حتیٰ کہ خود فرانس کے باشندے بھی اس بات کو نہ سمجھ سکے اور اُسے آگ میں ڈال دیا گیا۔ لیکن بعد میں جب قومیت کا تصور شباب پر پہنچا تو جس جون آف آرک کو "کافر و مرتد" قرار دے کر جلایا گیا تھا، اسی کو فرانسیسی قومیت کی سب سے بڑی ہیروئن بنا کر سینٹ (پیغمبروں) کی صف میں شامل کیا گیا۔[۱]

چونکہ جمہوری اور صنعتی دونوں انقلابات کا گہوارہ یورپ ہی تھا۔ اس لئے قوم پرستی کے جذبات وہیں شدت کے ساتھ پیدا ہوئے، انیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ جذبات اپنے پورے شباب پر پہنچ چکے تھے اور مقابلہ و مسابقت کی دوڑ دھوپ قوموں کے درمیان بڑی قوت کے ساتھ شروع ہو گئی تھی ——— قومیت بجائے خود بری چیز

---

[۱] برنارڈ شاہ نے "سینٹ جان" کے نام سے جون آف آرک کی زندگی کا جو معیاری ڈراما لکھا ہے اس میں قومیت کے اس تصور سے اس عہد کے لوگوں کی ناواقفیت کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ "ب"

نہیں۔ ہر قوم کو اپنی مشترک لسانی، تہذیبی جغرافیائی اور مذہبی اتحاد کی وجہ سے اپنی تنظیم آپ کرنے میں بہت آسانی ہوتی ہے اور اس لئے اپنے سیاسی معیشی اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے میں ہر قوم کو خود مختار ہونا چاہیئے۔ جس طرح ہر گھر اپنے خانگی معاملات کو خود ہی بخوبی طے کر سکتا ہے اور کسی غیر کو اس میں مداخلت کا حق نہیں، اسی طرح دنیا کی وسیع تر ہئیت اجتماعیہ میں ہر قوم کی مثال ایک گھر کی سی ہے، اس لئے ہر قوم کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے "گھر کے معاملات" کو خود ہی طے کرے اور کوئی دوسری قوم اس کے اندرونی مسائل میں دست اندازی نہ کرے۔ پھر جس طرح کسی قوم کی آزادی و خوشحالی کا دار و مدار اس کے خوشحال و آزاد گھرانوں پر ہے، اسی طرح کل دنیائے انسانیت کی خوشی و خرمی کا انحصار مختلف قوموں کی آزادی و خوش حالی پر ہے۔

اس حد تک قومیت کا تصور یقیناً انسانی فلاح کا موجب ہے۔

جارحانہ قومیت

لیکن جب اس تصور میں فوقیت طلبی کا جذبہ بھی شامل ہو گیا اور ہر قوم خود کو ساری دنیا پر بھاری سمجھنے لگی، تب یہ تصور بھی لامحالہ دنیا کے امن کے لئے خطرناک بن گیا۔ شخصی حکومتوں میں افراد کی ذاتی امنگیں اور حوصلے دنیا کے لئے خطرہ تھے لیکن اب قوم پرستی کے وجود نے افراد کی امنگیں قوموں میں منتقل کر دیں اور اب افراد کے بجائے قومیں دنیا کے امن کے لئے خطرہ بن گئیں، کل تک چنگیز و تیمور اور سکندر و سیزر اپنی شان و شوکت بڑھانے اور اپنے دوستوں اور رفیقوں کو خوش کرنے کے لئے دنیا بھر کو قبضے میں لانے کی کوششیں کرتے تھے۔ اب سکندر و سیزر نہیں رہے مگر ہر قوم بحیثیت مجموعی سکندر و سیزر بن گئی۔ اب پورا جرمنی سکندر تھا اور پورا انگلستان سیزر۔ بالفاظ دیگر: انفرادی شہنشاہیت ختم ہوئی، مگر اب اس کی جگہ قومی شہنشاہیت نے لے لی۔ چنانچہ انیسویں کے آغاز سے یورپ کی تمام جنگیں اسی قومی شہنشاہیت کو منوانے کے لئے لڑی گئیں اور قومیت کے تصور میں جارحانہ و حملہ آورانہ شان پیدا ہوگئی۔

بدنصیبی سے قومیت کا یہ جارحانہ تصور دنیا میں آج بھی ابتری پھیلا رہا ہے چنانچہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے "اسٹیٹسمین" اپنے ایک افتتاحیے میں لکھتا ہے "—— تاریخ وعمرانیات کے فاضل اس امر پر متفق ہیں کہ انیسویں صدی میں سائنس نے جو شاندار کامیابی حاصل کی، اس کا صحیح ثمرہ دنیا کو نہ مِل سکا اس لئے کہ قومیت (نیشنل ازم) کا جو تصور گذشتہ صدی میں پیدا ہوا اس نے سائنس کے انکشافات سے بھائی بندوں کی طرح مِل جُل کر فائدہ نہیں اُٹھایا، بلکہ ان انکشافات کو قومی مسابقت ومقابلے کے لئے استعمال کیا جس نے جنگ کو روز بروز یقینی اور تباہ کُن بنا دیا۔ نیشنل ازم کا فلسفہ انسانی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے وضع ہوا تھا مگر جلد ہی یہ فلسفہ "قومی ملوکیت" میں تبدیل ہو گیا اور اس طرح عوامی آزادی کے جس مقصد کو لے کر قومیت کی تحریک نے جنم لیا تھا، "قومی ملوکیت" نے اس آزادی کی ہی نفی کرنی شروع کر دی، انسانی زندگی میں جو متناقص لذات کیفیتیں پائی جاتی ہیں" قومی ملوکیت" اس کی ایک مثال ہے۔ انسان کی انفرادی آزادی کی خواہش کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ دنیا نے قوم کے نام سے گروہ بندی کرنا ضروری سمجھا لیکن رفتہ رفتہ یہ قومی گروہ بندیاں آپس میں ٹکرانے لگیں۔ اس طرح ہر قوم انسانی برادری کا ایک جارحانہ عنصر بن گئی۔ آخر کار نسل ونسب کی اس جتھے بندی کے نام پر جو "قومی ملوکیت" پیدا ہوئی، اس نے وہ تمام مطلق العنانی حاصل کر لی جو کسی زمانے میں صرف بادشاہوں کے لئے مخصوص تھی —— اصل یہ ہے کہ نوآبادیاں قائم کرنے کے غیر مساوی مواقع ہی، گذشتہ ایک صدی میں دنیا کی بیسیوں جنگوں کا باعث ہوئے ہیں جب تک کمزور قومیں تیزی کے ساتھ اپنے اندر صنعتی انقلاب پیدا نہ کریں گی وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی توقع نہیں کر سکتیں، خواہ حالات کا تقاضا ان کی آزادی کے حصول میں کتنا ہی مددگار کیوں نہ ہو۔"[۵]

۵۔ اسٹیٹسمین۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۴۵ء (دہلی ڈاک ایڈیشن)

محنت و سرمایہ کی ایک نئی کشمکش

صنعتی انقلاب نتیجہ تھا مشینوں کی ایجاد کا۔ اس ایجاد نے پیداوار کو تو یقیناً بہت زیادہ بڑھا دیا لیکن اسی کے ساتھ انسانی محنت کی قیمت گرادی، کل تک کپڑے کے دس ہزار تھانوں کو تیار کرنے کے لئے، دس ہزار آدمیوں کی محنت درکار تھی اور محنت کرنے والا جس قیمت میں چاہتا تھا اپنی محنت کے نتیجے کو بیچنے کا اختیار رکھتا تھا۔ مگر اب مشینوں کی ایجاد کے بعد دس ہزار تھانوں کی تیاری کے لئے صرف چند آدمیوں کی محنت کافی ثابت ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ بقیہ آدمی بیکار ہو گئے۔ پھر جو آدمی کام پر لگ گئے وہ بھی خود مختار نہ تھے۔ بلکہ کارخانہ دار کے نوکر تھے۔ اُن کا کام صرف یہ تھا کہ وہ مشین کی کسی مقررہ کل کو چلاتے رہیں یا اس کی نگرانی کرتے رہیں۔ مگر مشین کی پیداوار کی فروخت یا نفع پر اُنھیں کوئی اختیار نہ تھا۔ وہ تو صرف اپنی اُجرت پائیں گے اور بس۔ اور اُجرت بھی اتنی ہی جو مالک کارخانہ دینا چاہتا ہے۔ وہ زیادہ اُجرت کے لئے لڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ مشینوں نے بے شمار محنت کش انسانوں کو بیکار بنا دیا تھا جس کے نتیجے میں قدرتاً محنت کی قیمت گر گئی ۔ جب کام کرنے والے زیادہ ہوں گے اور کام کم ہوگا تو ظاہر ہے کہ کم سے کم اُجرت پر مزدور مل جائیں گے۔ کارخانے داروں نے اس صورت حالات سے خوب فائدہ اٹھایا اور بہت ہی معمولی اُجرتوں پر مزدوروں سے کام لینا شروع کر دیا۔ اس چیز نے مفلس و نادار مزدوروں (Proletariate) کی تعداد میں بے حد اضافہ کر دیا۔

مشینوں سے پہلے چیزوں کے تیار کرنے میں کسی خاص سرمائے کی ضرورت نہ تھی بلکہ صرف محنت درکار تھی۔ جس شخص کو بھی کپڑا بُننا آتا تھا، وہ چند پیسوں کا سوت لے کر اور کرگھہ تیار کر کے کپڑا بن سکتا تھا۔ مگر مشین خریدنا اور کارخانہ کھولنا بہت ہی بڑے سرمایہ دار کا کام ہے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کارخانے داروں کے پاس تو ہر طرف سے دولت سمٹ سمٹ کر پہنچنے لگی لیکن مزدور اور محنت کش ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھنے لگے یا بہت ہی معمولی اجرتوں پر کام کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ پھر چونکہ مشین کے پرزوں کو چلانے میں زیادہ کاری گری کی بھی ضرورت نہیں ہوا اس لئے بہتر صناعوں اور اعلیٰ کاریگروں کی اہمیت بھی ختم ہوگئی، جس نے صنعت و دست کاری کو نہ دولت ہی سے محروم نہ کیا بلکہ اس کی خودداری و عزت کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔ کل تک ایک کپڑا بُننے والا یا ایک قالین بنانے والا خود کو ایک خاص ہنر کا مالک سمجھتا تھا اور یہ خیال کرتا تھا کہ وہ اپنے اس ہنر کی بدولت ہمیشہ باعزت طور پر روزی پیدا کر سکے گا۔ لیکن اب یہ شانِ استغنا باقی نہ رہی۔ اب ہر مزدور سرمائے دار کا دست نگر بن گیا وہ اگر اُسے اپنے کارخانے میں نوکر رکھے تو خیر، ورنہ کسی کا کیا بس ہے؟

انیجلز کہتا ہے: کارخانہ داری کے اس انتظام نے مزدوروں کے جتھے کو کارخانہ دار کا غلام بنا کر رکھدیا اور کاریگروں کی تمام آزادی قانونی اور حقیقی دونوں طرح ختم ہو کر رہ گئی۔ اگر کوئی کاریگر دس منٹ بھی دیر سے آئے، تو نہ صرف اس کی اجرت ماری جاتی ہے بلکہ اُسے "مالک" سے سینکڑوں باتیں بھی سُننی پڑتی ہیں۔ علاوہ ازیں، وہ غریب نہ اپنی مرضی سے کھا سکتا ہو نہ اپنی مرضی سے سو سکتا ہے۔ اس کا سارا انتظام زندگی کارخانے کی اس "گھنٹی" پر موقوف ہو جاتا ہے جس کے تار کارخانے دار کے ہاتھ میں رقص کرتے ہیں[1]"

اس صورتِ حالات کے قدرتی نتیجے کے طور پر ایک طرف تو بڑے بڑے سرمایہ دار پیدا ہوئے اور دوسری طرف بے شمار ہلاکت زدہ انسان —— اسی بنا پر بہت سے لوگ جن میں گاندھی جی بھی شامل ہیں، مشینوں کو ایک لعنت سمجھتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اب

---

[1] کیپٹل از مارکس: جلد اول: صفحہ ۴۶۴۔ فٹ نوٹ۔ مطبوعہ نیویارک

اس "نعمت" کو مٹا کر پرانی ہاتھ کی صنعت کی طرف عود تو نہیں کیا جا سکتا تھا ——!!

انارک ازم یا نراج

اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی تحریک پاپائیت کے اقتدار کا بند توڑنے کے بعد بہک گئی تھی، اس لئے کہ عیسائیت کے جو اصول پاپائیت نے بنا رکھے تھے، وہ عقل کی ترازو پر پورے نہیں اترتے تھے، مگر ان اصولوں کے سوا، یورپ کے پاس کوئی دوسرے اصول نہ تھے، اسلام کے اصولوں پر مسلمانوں کی شہنشاہیت نے زنگ چڑھا کر انھیں بے رونق بلکہ بد رونق بنا دیا تھا۔ ان حالات نے یورپ میں مذہب سے ایک عام بیگانگی پیدا کر دی اور اگرچہ پہلے پروٹسٹنٹ پیدا ہوئے لیکن پروٹسٹنٹ آہستہ آہستہ دہریت و الحاد کی طرف جھکنے لگے اور پوپ کے اقتدار کے ساتھ مذہب و کلیسا کا اقتدار بھی ٹوٹنے لگا۔ لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ نہ صرف پاپائیت کی پابندیاں بیکار ہیں بلکہ ہر اخلاقی، سیاسی، معاشرتی یا قانونی پابندی بھی فضول ہے۔ ہر انسان آزاد پیدا ہوا ہے، اس لئے وہ اپنے ہر فعل میں بھی آزاد ہے پس نہ حکومت کی ضرورت ہے، نہ قانون کی اور نہ کسی اور اخلاقی گرفت کی۔ اس قسم کے تصورات نے نراج یا انارک ازم کا نام اختیار کیا۔ جس کا لغوی ترجمہ ہے "حکومت یا راج نہ ہونا"۔ عربی میں اسے "فوضویت" کہتے ہیں۔

نراج (انارک ازم) میں معصیت و بدکاری کا کوئی مستقل تصور نہیں، ہر شخص آزاد ہے، جو چاہے کر سکتا ہے، نہ حکومت کی ضرورت ہے، نہ فوج، نہ پولیس یا قانون کی۔!!

اشتراکیت یا سوشل ازم

نراج یا انارکزم کے اس تصور میں اخلاق و مذہب کی قسم کی تمام پابندیوں سے بے نیاز ہو جانا سب سے بڑا اصول ہے۔ لیکن اس کا زبردست محرک دراصل "حد سے بڑھی ہوئی سرمایہ داری کے مقابلہ میں حد سے بڑھی ہوئی غربت و بیروزگاری" ہے مقصد یہ ہے کہ سرمایہ دار کو حکومت و قانون کی جو امداد حاصل ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے وہ غریبوں کی محنت سے من مانا فائدہ اٹھا سکتا ہے،

اس کا سدباب ہو۔ مگر انارک ازم میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ کمزور کا والی ووارث کوئی نہیں رہتا تھا۔ کیونکہ اگر حکومت و قانون کو مٹا دیا جائے تو پھر دنیا میں صرف طاقتور ہی فائدے میں رہ سکتا ہے اور کوئی کمزور انسان آزاد نہیں رہ سکتا۔ بہرحال انارکزم کا تصور تو زیادہ مقبول نہ ہوا، البتہ سوشل ازم یا اشتراکیت کا تصور بیحد مقبول ہوا۔ سوشل ازم نے بھی مزدوروں اور محنت کشوں کی فریاد کو سنا، مگر حکومت سے بے نیاز ہونے کے بجائے انھیں یہ بتایا کہ حکومت دراصل مزدوروں ہی کا حق ہے۔ سوشل ازم کے اصول کے مطابق پیداوار کے مالک صرف محنت کش افراد ہیں۔ اس لئے محنت کے نتیجے میں جو کچھ پیدا ہو، اُسے محنت کرنے والوں ہی پر تقسیم ہونا چاہیئے۔ جو شخص محنت نہیں کرتا اسے پیداوار میں سے کوئی حصہ لینے کا مطلق حق نہیں۔" جو محنت نہیں کرے گا، اُسے کھانے کو کچھ نہ دیا جائے گا۔"

کارل مارکس

سوشل ازم یا اشتراکیت کے تصور کا کھوج یوں تو صدیوں پہلے سے ملتا ہے اور سینٹ سموں (St. Simon)، فوری اے (Fourier)، لوئی بلان (Louis Blanc) اور رابرٹ اوون (Robert Owen) وغیرہ کو اس کا متقدم کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کی منظم و منقح شکل دراصل انیسویں صدی کے نصف آخر میں کارل مارکس کی دماغی کاوشوں کی رہین منت ہے۔

کارل مارکس، جسے سوشل ازم کا "پیغمبر" کہا جاتا ہے، ۵ رمئی ۱۸۱۸ء کو جرمنی میں پیدا ہوا۔ یہ ایک یہودی باپ کا بیٹا تھا مگر بعد میں عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ بان اور برلن کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی۔ اس کے زمانے میں مشینوں سے پیدا کی ہوئی بیروزگاری کا بڑا چرچا تھا اور مزدور و محنت کش طبقے میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی، ان حالات نے مارکس کے دل پر بہت اثر کیا اور اس نے مزدوروں کی حمایت اور سرمایہ داری کی مخالفت میں ایک اخبار نکالا۔ مگر چونکہ اس وقت تک اس نئی صورتِ حالات کا کوئی

معقول علاج دنیا کی سمجھ میں نہ آیا تھا اور اس مشکل کا کوئی جامع و مانع حل تجویز نہ ہو سکا تھا اس لئے مارکس کے خیالات کو منافرانہ اور احمقانہ قرار دے کر اُسے جلا وطن کر دیا گیا جرمنی سے نکل کر وہ پیرس آیا اور یہاں سے اپنے خیالات کی اشاعت کرنے لگا۔ مگر یہاں سے بھی اس کے اخراج کا حکم صادر ہوا۔ اتفاق سے ۱۸۴۸ء میں جرمنی میں حکومتِ وقت کے خلاف ایک بغاوت کے آثار رونما ہوئے۔ مارکس نے سمجھا کہ شاید اس سے کچھ فائدہ اُٹھایا جا سکے، اس لئے بھاگا ہوا جرمنی آیا۔ مگر جب یہ بغاوت بارآور نہ ہوئی تو لندن چلا گیا اور آخر عمر تک یہیں رہا۔ ۱۸۸۳ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

لندن میں کارل مارکس اپنے ایک بہت گہرے اور مخلص دوست فریڈرک این جلز (Fredrich Engles) کا مہمان رہا جس کی دوستانہ مہمان نوازی نے اُسے غربت جلا وطنی کی مصیبتوں سے نجات دلا دی اس لئے کہ مارکس غریب الدیار ہی نہ تھا بلکہ مفلس و تنگ حال بھی تھا، لیکن اس کا دوست این جلز ایک مالدار مالک کارخانہ دار کا بیٹا تھا۔ این جلز بھی فلسفی دل و دماغ رکھنے والا انسان تھا اور محنت و سرمایہ داری کے سلسلے میں سو فی صدی اپنے دوست کا مؤید تھا۔

مارکس کا فلسفہ بظاہر ایک معاشی فلسفہ ہے، لیکن چونکہ معاشیات کا دامن انسانی زندگی کے ہر گوشے سے وابستہ ہے، اس لئے قدرتاً مارکس کا فلسفہ انسان کی پوری زندگی کا فلسفہ حیات ہو کر رہ گیا۔ اس کے زمانے میں جرمنی کے مشہور فلسفی ہیگل کے خیالات کا بہت زور تھا ہیگل مادے کا قائل نہ تھا۔ اس کے نزدیک کائنات کا وجود محض تصورات پر مبنی تھا۔ ہر تصور میں ایجابی و سلبی یا اثبات و نفی کی دو متصادم طاقتیں ہیں۔ ان طاقتوں کے تصادم و تخالف کا نام ہی کائنات ہے۔ مارکس نے ہیگل کے اس فلسفے کے طرزِ استدلال کو توجوں کا توں باقی رکھا، البتہ اس کی روح بالکل بدل ڈالی[1]۔ یعنی اس نے تصور کے بجائے "مادے" کو

---

[1] مارکس نے اس حقیقت کا اعتراف خود اپنے قلم سے "سرمایہ" میں کیا۔ دیکھو جلد اول دیباچہ صفحہ ۲۵

اصل الاصول قرار دیا اور یہ ثابت کیا کہ مادہ ہی ہر وجود کا باعث ہی اور مادے ہی کے باہمی تصادم و تخالف سے نئی نئی شکلیں بنتی ہیں۔ مارکس روح کا قائل نہ تھا اور نہ اس محسوس ظاہری دنیا کے سوا کسی ماورائے احساس و ادراک عالم کا معتقد تھا۔

مارکس سے پہلے سوشل ازم کے جو تصورات تھے ان میں بھی دولت کی مساوی تقسیم پر زور دیا جاتا تھا، اس لئے جہاں تک سوشل ازم کے معاشی نظریوں کا تعلق ہی، مارکس نے کوئی نئی چیز دنیا کے سامنے پیش نہیں کی۔ البتہ اس نے ان تمام نظریوں کو یکجا کر کے ایک مربوط و قابل عمل فلسفۂ زندگی کی شکل میں پیش کیا۔ یہی اس کی عظمت و بزرگی کا اصلی راز ہی۔ مارکس کے زمانے میں سرمایہ داری کا جو نظام یورپ میں رائج تھا، اس کی پشت پر مذہب و کلیسائی طاقتیں بھی تھیں، اس لئے سوشل ازم کے معاشی نظریوں کو خلافِ مذہب قرار دیا جاتا تھا یہ چیز سوشلزم کے مبلغوں کو سخت نقصان پہنچاتی تھی اور سرمایہ داری کے ہاتھوں کو بے پناہ طور پر مضبوط بناتی تھی۔ کلیسا کا فیصلہ تھا کہ سرمایہ فراہم کرنا خدائی قانون کے عین مطابق ہی، امیر و غریب کا فرق بالکل قدرتی ہی، کسی کو خدا نے امیر بنایا ہی کسی کو غریب، غریب کو چاہیئے کہ وہ صبر و شکر سے زندگی کے دن کاٹے اور جتنا کچھ اُسے ملتا ہی، اُسی پر قانع رہی۔

مارکس نے محسوس کیا کہ جب تک زندگی کے اس فلسفے کو نہ بدلا جائے گا، اُس وقت تک معاشی اصولوں میں خاطر خواہ انقلاب بپا کرنا ممکن نہیں ہی۔ اس لئے اُس نے "تصور مطلق" سے انکار کر کے مادے ہی کو ازل وابد مان لیا۔ اس کے اِس فلسفہ کا نام متصادم مادیت Dialectic Materialism ہی جس میں یہ ثابت کیا گیا ہی کہ دنیا میں مادے کی کشمکش اور معاشی مفادوں کے تصادم و تخالف کے سوا اور کچھ نہیں ہی، اور سوسائٹی اخلاق، معاشرت اور مذہب سب اسی کا نتیجہ ہیں۔

اشتمالیت یا کمیونزم

برسیلز کی بڑی اشتراکی کانفرنس ۱۸۴۸ء میں مارکس اور این جلز دونوں نے مل کر ایک اشتراکی منشور

(اعلانِ حقوق) جاری کیا جس میں دنیا کا نیا معاشی نظام بتایا گیا ہے اس منشور کو اشتراکی دنیا میں وہی اہمیت حاصل ہے جو مذہب کے ماننے والوں میں الہامی کتاب کو ہوتی ہے اس منشور کی اشاعت کے بعد سے مارکسی اشتراکیت کا نام بجائے سوشلزم کے کمیونزم (اشتمالیت) پڑگیا اس لئے کہ اگرچہ سوشلزم بھی دولت کی مساوی تقسیم اور یکساں معاشی حالت پر زور دیتا تھا مگر اس میں بہت سے فرقے اور گروہ پیدا ہوگئے تھے جن کی وجہ سے اس کی مختلف تعبیریں رواج پاگئی تھیں۔ اس سبب سے سوشلزم کی انتہا پسندانہ شکل کو کمیونزم کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

مذکورہ بالا منشور کے بعد اشتراکیت کا مفصل و مدلّل فلسفہ مارکس کی مشہور کتاب سرمایہ (کیپٹل) کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کتاب کی تین جلدیں ہیں جن کی اشاعت پہلی بار ۱۸۶۷ء میں ہوئی۔ یہ تین جلدیں "اشتراکیوں کا قرآن" سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں جو اصول بتائے گئے ہیں، اُن کا خلاصہ یہ ہے۔

تمام دولت مزدور پیدا کرتے ہیں، مگر سرمایہ دار مفت کھاتے ہیں۔ اس لئے سب دولت مزدوروں کو ملنا چاہیئے۔ پھر چونکہ سرمایہ دار لازماً اپنی حفاظت کریں گے اس لئے ان کو مٹا کر ایک ایسی معاشرت (سوسائٹی) قائم کی جائے جس میں معاشی لحاظ سے سب کا درجہ یکساں ہو اور امیر و غریب اور متوسط الحال کے نام سے جو تین انسانی طبقات قائم ہیں ان سب کو گڈمڈ کر کے ایک کر دیا جائے اس مقصد کے حصول کے لئے (۱) حکومت عوام کی منتخبہ ہو (۲) محنت و مزدوری کا تعلق براہِ راست حکومت سے ہو نہ سرمایہ داروں سے (۳) ہر بوڑھے اور بیمار آدمی کی کفالت حکومت کرے (۴) مفادِ عامہ کے تمام اداروں کی مالک حکومت ہو (۵) دولت کی پیداوار اور اس کی فروخت اور کھپت سب حکومت ہی کے ہاتھ میں ہو تاکہ سب کی معاشی ضروریات کی پوری پوری تکمیل ممکن ہوسکے (۶) تجارت میں باہمی مقابلہ (کمپیٹیشن)

کا جو رواج ہے اور جس کی وجہ سے چھوٹی پونجی والوں کو سخت نقصان پہنچتا ہے اُسے حکومت کی مداخلت سے ختم کیا جائے اور اس کی جگہ باہمی اشتراک وتعاون (کوآپریشن) کے عمل کو رائج کیا جائے تاکہ زندگی کے بہترین مواقع اور محنت کے زرین منافع سب میں برابری کے ساتھ تقسیم ہوں (۷) قومیت یا وطنیت کا اصول انسانیت کے معاشی اور سیاسی مفاد کے سخت خلاف ہے اس لئے قومیت کو ختم کر کے "بین الاقوامیت" کو اس کا قائم مقام بنایا جائے۔

خدا یا خدا کا قانون کوئی چیز نہیں۔ مادّہ ہی سب کچھ ہے۔ اس لئے مذہب وکلیسا جو سرمایہ داری کا حامی ہے اُسے بھی مٹا دینے کی ضرورت ہے۔ مذہب ایک افیم ہے جو غریبوں کو ذلت ومسکنت پر قانع رہنا سکھاتا ہے۔ دنیا کا نظام کسی روحانی یا خدائی طاقت کے ماتحت نہیں چلتا بلکہ یہ نتیجہ ہے صرف مادّی ذرّات کے تصادم وتخالف اور معاشی طبقات کی باہمی کشاکش کا۔ دنیا کا مستقل امن صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب نہ صرف سیاسی دنیا میں جمہوریت قائم ہو بلکہ معاشی دنیا بھی جمہوری حکومت کے قبضہ واختیار میں ہو۔

مارکس کا یہ فلسفہ دراصل مندرجہ ذیل انسانی مشکلات کا ردّ عمل تھا۔

۱۔ حد سے بڑھی ہوئی جارحانہ قوم پرستی جس کی وجہ سے ہر قوم دُنیا کے وسائل دولت خود ہی استعمال کرنا چاہتی ہے اور دوسروں کو اُس سے محروم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ قدرت کی طرف سے اس قسم کی حدبندی ممکن نہیں ہے، اس لئے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔

۲۔ انفرادیت: یعنی ہر شخص کا یہ تصور کہ جہاں تک ہو اُسے "چھیڑو مت" خصوصاً دولت وسرمائے کے معاملے میں حکومت کی کوئی نگرانی کسی پر نہ ہو۔ جو شخص جتنا سرمایہ چاہے جمع کرے اور جس طرح چاہے اپنا کاروبار چلائے، مزدوروں کی اُجرت وغیرہ یا مال کی فروخت وغیرہ کے معاملے میں صرف سرمایہ دار ہی کی انفرادی ذات کو مختار مطلق ہونا چاہئے حکومت کو اس کے اختیار میں کسی قسم کی کوئی مداخلت ہرگز نہ کرنی چاہیئے۔

۳- انارک ازم یا نراج (جسے وضویت بھی کہتے ہیں) یعنی تمام اخلاقی، قانونی اور سیاسی بندھنوں کو توڑ کر آزاد مطلق ہونے کی خواہش،

۴- صنعتی انقلاب یعنی کوئلے، بھاپ اور بجلی کی طاقتوں کی دریافت سے محنت و مزدوری کو جو نقصان پہنچا اور جس کی وجہ سے ایک طرف تو حد سے بڑھی ہوئی سرمایہ داری وجود میں آئی اور دوسری طرف حد سے بڑھی ہوئی غربت و فاقہ کشی کا ظہور ہوا۔

یہ تمام خرابیاں اتنی مصائب انگیز تھیں کہ دنیا کی غریب و بدحال آبادی نے جب مارکس کے نظریات کو سنا تو بڑی گرمجوشی کے ساتھ ان کی طرف جھک پڑی۔ پھر اگرچہ ان نظریات مذہب کی قربانی چڑھانی پڑتی تھی، مگر مشکلات کے ہجوم اور سرمایہ داری و کلیسا کے باہمی اتحاد نے اس کڑوے گھونٹ کو بھی گوارا بنا دیا۔ اور دنیا کے غریبوں میں اشتراکیت کا نیا مادی مذہب بڑی تیز رفتاری کے ساتھ پھیلنے لگا[1]۔

اشتراکیت یا سوشلزم چونکہ قومیت کے مخالف ہو اس لئے اس کے پرچار کے لئے جتنی جماعتیں بنیں وہ سب بین الاقوامی تھیں۔ اسی لئے اس سلسلے کی سب سے پہلی جماعت کو پہلی بین الاقوامی (یا) فرسٹ انٹرنیشنل کہا جاتا ہو جو ۱۸۶۴ء میں بنی تھی۔ چند سال کے بعد کچھ تو باہمی اختلافات اور کچھ ناکامیوں کی وجہ سے یہ جماعت ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد دوسری انٹرنیشنل ۱۸۸۹ء میں قائم ہوئی۔ لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں اس کے بہت سے ممبروں

---

[1] دیکھو (۱) "سرمایہ" از مارکس۔ ترجمہ انگریزی

(۲) سوشل ازم از W. Liehknecht

(۳) تاریخ سوشلزم از Kirkup

(۴) Karl Marks: Boudin Louis

(۵) Recent Political Thoughts: Coker.

لئے بین الاقوامی نصب العین کے خلاف اپنی اپنی قوموں کی طرف سے جنگ میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس بے راہ روی کی وجہ سے یہ بھی ٹوٹ گئی اور پھر تیسری انٹرنیشنل انقلاب روس کے بعد ۱۹۱۹ء میں بنی۔ لیکن بہت سے اشتراکیوں کو اعتراض ہوا کہ اس میں بھی اہلِ روس کی قوم پرستی شامل ہو گئی ہے۔ اس لئے غیر روسی دنیا نے اس کے بالمقابل ۱۹۲۳ء میں اپنی انٹرنیشنل الگ بنالی۔ لیکن دعوےٰ دونوں کا یہی رہا کہ اُن کی کوششوں کا تعلق ساری دُنیا سے ہے اور اسی لئے دونوں نے اپنی شاخیں ساری دنیا میں قائم کیں۔

ان بین الاقوامی (انٹرنیشنل) جماعتوں کے علاوہ انگلستان میں ٹریڈ یونین (مزدور سبھا) کے نام سے اور فرانس وغیرہ میں سنڈیکیٹ (مزدوروں کی اشتراکی تنظیم) کی قسم سے بھی مزدوروں کی جماعتیں قائم کی گئیں، انگلستان کے علمی حلقوں نے سوشلزم کے اصول کی بتدریج رائج کرنے کی غرض سے فے بین سوسائٹی (Fabian Society) کے نام سے ایک جماعت بنائی جس کے ممبروں میں برنارڈ شا اور ایچ جی ویلز جیسی ذی علم ہستیاں شامل ہوئیں ہیں۔ یہ لوگ رسالوں، کتابوں اور علمی مضمونوں کے ذریعے سے اشتراکی خیالات کو عام کرنے کے قائل ہیں اور سرمایہ داروں کے مقابلے میں مزدوروں کی حمایت کی فضا پیدا کرنے کی تدریجی کوششیں کرتے ہیں۔

باب ۱۶

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم

اگر دنیا کی معاشی تنظیم ایسی ہوتی کہ ہر قوم کو اپنی تجارت کے فروغ اور معاشی حالت کی اصلاح کے لئے یکساں مواقع حاصل ہوتے۔ علیٰ ہذالقیاس اگر محنت و دولت کی تقسیم اس طرح ہوتی کہ غربت و افلاس کا بے پناہ طوفان بپا نہ ہوتا تو بلاشبہ نہ تو جارحانہ قوم پرستی کا جذبہ وجود میں آتا اور نہ اشتراکیت کا نیا مذہب پیدا ہوتا۔ لیکن صورتِ حالات چونکہ اس کے برعکس تھی اس لئے ان جذبات کا پیدا ہو جانا بالکل قدرتی امر تھا۔

پھر ممکن ہے کہ قومیت و اشتراکیت کی یہ کشمکش دنیا کے مصائب کا حل جلد کر دیتی لیکن بدنصیبی سے اس کش مکش کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا دینے کی ذمے داری ایشیا، و افریقہ میں بسنے والی اس انسانی بھیڑ پر عائد ہوتی ہے جو اب تک نہ تو جمہوری انقلاب سے واقف ہوئی اور نہ صنعتی انقلاب سے۔ اُن میں نہ تو ابھی سیاسی شعور پیدا ہوا تھا! ورنہ اصلاح مذہب کی کسی تحریک نے اُن کی اخلاقی و معاشرتی حالت کو سدھارا تھا۔ نہ مشینوں اور انجنوں کی طاقت کا استعمال ابھی انہوں نے سیکھا تھا، لیکن اس کے باوجود قدرتی پیداوار

کے لحاظ سے دنیا کے یہ حصے دولت کے بہترین خزانوں سے مالا مال ہیں۔ ایشیا، اور افریقہ کی زمین جتنی زرخیز ہے اور یہاں کی مٹی میں سونا اگلنے کی جو صلاحیت ہے یورپ کی سرزمین اس سے محروم ہے، ان حالات میں روئے زمین کے ان وسیع علاقوں کی دولت و ثروت سے مالا مال ہونے کی خواہش یورپ کی ہر قوم میں پیدا ہو جانا یقینی تھا۔ پھر خود ان ممالک کے عوام ابھی تک مطلق العنان شاہی سے آزاد نہ ہوئے تھے۔ اس لئے یورپ کے تجارتی حوصلوں اور امنگوں کو روکنے کی نہ ان میں طاقت تھی اور نہ عقل۔ یورپ کی ان اقوام کے مقابلے میں جن میں جمہوری طرز حکومت نے زبردست قوت و تنظیم پیدا کر دی تھی اور جن کے ہاتھوں میں بھاپ اور کوئلے کی طاقتیں تھیں، ایشیا، وافریقہ کی حیثیت ایک ایسے قیمتی خزانے کی سی ہو کر رہ گئی جس کے مالکوں میں اس کی حفاظت کی قوت باقی نہ رہی ہو۔ اس لئے دولت کے ان گراں بہا خزینوں کے حصول کی کوشش یورپ کی ہر قوم کرنے لگی۔ اس کوشش کا سب سے پہلا خوفناک منظر وہ تھا جو ۱۹۱۴ء کی ہولناک لڑائی میں دنیا نے دیکھا اور دوسرا خوفناک منظر ۱۹۳۹ء میں سامنے آیا۔

۱۹۱۴ء کی جنگ کا اعلان بظاہر اس لئے کیا گیا کہ آسٹریا کے شہزادے فرڈیننڈ کو سربیا کے پایۂ تخت سراجیو میں کسی نے قتل کر دیا تھا، لیکن حقیقت میں اس جنگ کا باعث ایشیائی تجارت پر قبضہ حاصل کرنے اور تجارتی رسل و رسائل کی شاہراہوں پر قبضہ کرنے کی خواہش کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ شاہزادہ فرڈیننڈ کے قتل کو بہانہ بنا کر جنگ چھیڑ دی گئی[۱]۔ ترکی اپنے محل وقوع اور اپنی اندرونی حالت

---

[۱] دیکھو

Recent Revelations of European Diplomacy: Gooch

دونوں اعتبار سے جرمنی اور آسٹریا کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ لیکن خود ترکی کو اُن منصوبوں کا علم بہت کم تھا جو جرمنی اور آسٹریا کے نہاں خانۂ دل میں چھپے ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ، بقول ڈکنسن " اس جنگ کا ایک بہت بڑا سبب ترکی کی وسیع و عریض مگر غیر ترقی یافتہ، غیر منظم اور غیر محفوظ سلطنت پر قابو حاصل کرنا تھا[۵]"۔ اگر جرمنی اور آسٹریا کو فتح حاصل ہو گئی ہوتی، تب ترکی کو معلوم ہوتا کہ اس کے حلیف اس سے کیا چاہتے ہیں پھر یہ تو ممکن ہے کہ سیورے کی قسم کا معاہدہ ترکی سے نہ کیا جاتا، لیکن یہ ناممکن ہے کہ ترکی سلطنت کا وہ وسیع و عریض علاقہ جو جنگ سے قبل اس کے اقتدار میں تھا، اس پر آسٹریا اور جرمنی ہاتھ صاف نہ کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے حلیفوں کی فتح کی صورت میں بھی ترکی کی حالت شاید اس سے زیادہ بہتر نہ ہوتی جو آج ہے۔

جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہا ہے
بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہا ہے

جنگ سے قبل کی دُنیا

۱۹۱۴ء کی جنگ سے پہلے یورپ کی حالت یہ تھی کہ ایک طرف تو وہ تمام قومیں، جو دوسروں کے زیرِ نگین تھیں اپنی آزاد و خود مختار حکومتیں قائم کرنے کے لئے مضطرب تھیں اور دوسری طرف حکمراں قومیں اپنے ملک کی معاشی حالت کو سدھارنے اور امن و اطمینان کی فضا پیدا کرنے کے لئے تجارتی منڈیوں کی شدید ضرورت محسوس کر رہی تھیں۔ مگر تجارتی منڈیوں کے اس مسئلے میں انگلستان اور فرانس کے بعد بہت کم قومیں ایسی تھیں جو خود کو خوش نصیب کہہ سکتیں، آسٹریا ہنگری ایک وسیع سلطنت تھی جس کی حدود میں مختلف قوموں اور نسلوں کے پانچ کروڑ سے زائد نفوس بستے تھے مگر اس کے پاس ایک بھی نو آبادی نہ تھی جہاں سے کچا مال خرید کر صنعت و حرفت کو ترقی دے سکے۔ جرمنی کے پاس کچھ نو آبادیات

---

[۵] انٹرنیشنل انارکی از سنہ ۱۹۰۴ء تا سنہ ۱۹۱۴ء صفحہ ۲۲۴

ضرور تھیں مگران تک پہنچنے کے راستے پر اس کا مطلق کوئی اختیار نہ تھا۔ بحر روم کے اہم ترین ناکے جبرالٹر یا جبل الطارق سے لیکر مالٹا نہر، سوئز، عدن، خلیج فارس، سنگاپور اور ہانگ کانگ تک کا راستہ انگریزی اقتدار میں تھا اور ادھر نئی دنیا میں بھی انگلستان کے بعد جمہوریۂ امریکہ نے قبضہ جما رکھا تھا، روس کی بھی یہی حالت تھی جس کے نتیجے میں وہاں زبردست بے چینی پھیل رہی تھی اور زار روس کے لئے اپنی شہنشاہیت کو محفوظ کرنے کا طریقہ صرف یہ رہ گیا تھا کہ ترکی، ایران اور چین کے ساحلوں تک اپنی حکومت کا دائرہ وسیع کرے۔ ادھر ان ممالک کی اندرونی حالت اتنی ردی ہو چکی تھی کہ ہر طاقتور قوم انھیں "لوٹ کا مال" سمجھ رہی تھی۔ سلطان ترکی ایک مطلق العنان فرمانروا کی طرح حکومت کے تخت پر متمکن تھا، لیکن ملک کی تمام تجارتی منڈیوں پر یورپ کے سرمایہ داروں نے تسلط کر رکھا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ میں جتنی چیزیں پیدا ہوتی ہیں تقریباً اُن سب کے ٹھیکے یورپی تاجروں نے لے رکھے تھے، سکے اور زرِ تبادلہ کی پوری مشین بھی یورپ کے مہاجنوں کے ہاتھ میں تھی۔ جتنے بڑے بڑے بینک تھے ان سب میں یورپ کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ تمام کچا سامان ڈھل ڈھل کر یورپ جا رہا تھا اور وہاں سے مختلف شکلیں بدل کر پھر ترکوں اور عربوں کے ہاتھ بیچا جا رہا تھا۔ خود سلطنتِ ترکی میں کارخانے مفقود تھے اور جو تھے وہ یورپی اقوام کے سرمایہ پر قائم تھے۔ ان حالات کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ مملکتِ عثمانی کے پورے طول و عرض میں انتشار و پراگندگی کا منظر نظر آتا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں "نوجوان ترکوں" نے اس بدحالی کو دیکھ کر "جمعیت اتحاد و ترقی" کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی جس نے سلطان سے دستوری سلطنت کا مطالبہ کیا اور ملکی حالت کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ اس جماعت کے مطالبے پر سلطان نے دستورِ حکومت دینے کا اقرار کر لیا مگر ظاہر ہے کہ اگر عوام کی معاشی حالت ٹھیک نہ ہو اور ان کی تعلیمی و ذہنی سطح بلند نہ کی جائے تو دستوری حکومت بیکار رہی، اس لئے یہ دستورِ حکومت ترکی کو نجات دلانے میں

کامیاب نہ ہو سکا، ادھر ترکی کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے یورپی مقبوضات کے باشندے یورپ کی طاقتوں کے اشاروں پر دھڑا دھڑ علم بغاوت بلند کر کے اپنی آزادی کا اعلان کر رہے تھے۔ جس کی وجہ سے بلقان و یونان میں میدان کارزار برپا تھا۔ ادھر افریقہ کے شمال میں مراکش، الجزائر، طرابلس، ٹیونس اور مصر کے جو علاقے ہیں اُن پر یورپی اقوام قبضہ کر چکی تھیں یا کرتی جا رہی تھیں —— غرض یورپ کے مدبرین سیاست کا یہ قول بالکل صحیح تھا کہ ترکی سلطنت کی حیثیت ایک "مردِ بیمار" کی سی ہو کر رہ گئی تھی جس کی حالت دیکھ کر علامہ شبلی مرحوم بے اختیار پکار اٹھے تھے کہ:-

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

پھر یورپ کے وسطی اور مشرقی علاقے میں ایک سے زائد قومیں آباد ہیں یہ قومیں اپنی آزاد و خود مختار حکومتیں قائم کرنے کے لئے بے تاب تھیں اور اپنی حکمراں سلطنتوں کے خلاف جو کچھ ان سے ممکن تھا، کرتی رہتی تھیں۔

ترکی اور ترک

ان تمام حالات کا قدرتی مطالبہ یہ تھا کہ یا تو اِن حکومتوں کو اپنی عوام کی معاشی حالت درست کر کے انھیں مطمئن کرنا چاہیئے اور یا پھر اپنی ناگہانی موت کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اس صورت حالات سے بچنے کے لئے جرمن نے بغداد تک خشکی کا ایک نیا راستہ نکالنے کی کوشش کی تاکہ ایشیار کی تجارت کا راستہ اس کے لئے کھل جائے۔ ۱۸۹۹ء میں سلطان ترکی نے اس راستے کو بنانے کی باقاعدہ منظوری دی جس کے بعد جرمنی نے زبردست پیمانے پر ریل کی پٹریاں بچھانا شروع کر دیں، یہ چیز برطانیہ کو خصوصیت سے بہت کھٹکی۔ اگر جرمنی کو یہ راستہ حاصل ہو جاتا ہے تو چند گھنٹوں کے اندر اس کا سامان برلن سے خلیج فارس تک آسکتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف بلادِ عرب اور ترکی کے تجارتی میدان میں جرمنی کو غلبہ حاصل ہو جائے

گا بلکہ ایران سے لے کر ہندوستان وچین تک بھی اس کی پہنچ بہت آسان ہو جائے گی پھر چونکہ تجارتی ومعاشی حوصلے اپنے ساتھ سیاسی امنگیں بھی لاتے ہیں اس لئے کچھ تعجب نہیں کہ کل کو موقعہ پاکر جرمنی ان علاقوں پر سیاسی غلبہ بھی حاصل کرلے اور رفتہ رفتہ مشرق میں برطانوی اقتدار کو چیلنج کرنے لگے۔

ادھر جرمنی اور فرانس کی سرحدیں ایسی غیر قدرتی اور غیر محفوظ واقع ہوئی ہیں کہ دونوں کو ہمیشہ ایک دوسرے کی دست درازیوں کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ اس لئے جرمنی کی ہر ترقی کو فرانس شک وشبہ کی نظر سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا، اسی طرح فرانس کی ہر حرکت پر جرمنی کی آنکھیں لگی رہتی ہیں۔ پھر انیسویں صدی کے نصف آخر سے جرمنی میں نسلی برتری کا جذبہ بہت عام ہوتا جا رہا تھا اور وہاں کے حکیم وفلسفی یہ ثابت کر رہے تھے کہ جرمنی نسل، دنیا کی منتخب وبرگزیدہ نسل ہے اس کی تہذیب سب تہذیبوں سے بلند اور اس کا تمدن سب تمدنوں سے بالاتر ہے، اس لئے جرمنی کا فرض ہے کہ وہ تہذیب وتمدن کا درس ساری دنیا کو دے۔ یوں تو "تہذیب وتمدن کے مقدس درس" کے نام پر یورپ کی ہر قوم ہی دنیا میں اپنا اقتدار جما رہی تھی۔ مگر جرمنی نے اپنی برتری کا اعلان کچھ اس بلند آہنگی سے کیا کہ خود یورپ کی طاقتور قومیں ٹھٹک کر رہ گئیں اور انھیں اندیشہ پیدا ہونے لگا کہ اگر ان جذبات کو ابھرنے اور پھیلنے کا موقعہ دیا گیا تو پھر ان کی خیر نہیں۔

جنگ کے خارجی محرکات: مراکش اس جنگ کے داخلی محرکات تو وہی تھے جو اس سے پہلے کی تمام جنگوں کے رہے ہیں۔ البتہ خارجی محرکات کی نوعیت بدلی ہوئی تھی۔ بجلی اور بھاپ کی طاقت نے انسانی حوصلوں اور امنگوں کی دنیا میں جو نیا آب ورنگ پیدا کر دیا تھا، اس کی وجہ سے "قابلیت" کی نگاہیں اب کسی ایک محدود خطے کے بجائے پوری دنیا پر اٹھ رہی تھیں — ۱۹۱۴ء کی جنگ کا سب سے پہلا خارجی محرک مراکش کے واقعہ کو سمجھا جاتا ہے۔ افریقہ کا یہ

شمالی مغربی گوشہ مندرجہ ذیل چھ وجوہ کی بنا پر یورپ کی تمام بڑی بڑی طاقتوں کا مرکز نگاہ بنا ہوا تھا۔ بلکہ اب تک بنا ہوا ہے۔

۱۔ جبل الطارق (جبرالٹر) کے عین بالمقابل واقع ہونے کی وجہ سے برطانیہ کے بحر روم والے راستے میں رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے۔

۲۔ اس کا ساحل چونکہ بحر روم کے علاوہ بحر اقیانوس پر بھی واقع ہے اس لئے برطانیہ کے جنوبی افریقہ جانے والے جہازوں کے لئے بھی خطرہ بن سکتا ہے۔

۳۔ اس کی مشرقی سرحد، الجزائر (الجیریا) سے ملتی ہے جو ۱۸۳۰ء سے فرانس کے زیر اثر ہے، اس لئے فرانس اگر چاہے تو الجزائر میں بیٹھ کر مراکو میں ہر قسم کی گڑبڑ اپنی اغراض کو پورا کرنے کے لئے پیدا کرا سکتا ہے۔

۴۔ مراکش میں خدا کی بے شمار مخلوق بستی ہے جس کو فوجی رنگروٹوں کے طور پر کام میں لایا جا سکتا ہے۔

۵۔ اس کی تجارتی ترقی لا معلوم حد تک ترقی کر سکتی ہے۔

۶۔ اس میں لوہے کی کانیں ہیں جو موجودہ مشینی عہد میں سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔[1]

ان وجوہ کی بنا پر انیسویں صدی کے اواخر تک برطانیہ کی زبردست خواہش تھی کہ کسی طرح مراکش اس کے قبضے میں آ جائے۔ کیونکہ اس وقت تک برطانیہ کے قدم مصر میں مضبوط نہیں ہوئے تھے اس لئے ہندوستان جانے کے لئے اس کے پاس محفوظ ترین صرف جنوبی افریقہ کا ہی راستہ رہ جاتا تھا۔ برطانیہ کو اندیشہ تھا کہ اگر مراکش کا ساحل اغیار کے ہاتھوں میں پہنچ گیا تو اس کی تجارتی شاہراہ دوسروں کے رحم و کرم پر منحصر ہو کر رہ جائیگی فرانس کے خیالات بھی یہی تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں ڈی کلاسی فرانس کا وزیر خارجہ ہوا تو اس نے

---

[1] دیکھو The International Anarchy : Dickenson

سب سے پہلا کام ہی یہ کیا کہ مراکو پر قبضہ کرنے کی مکمل اسکیم بنائی اس مقصد کے لئے فرانس نے اسپین اور انگلستان سے معاہدے کئے۔

جب یہ رقابت بہت بڑھی تو انگلستان اور فرانس کے درمیان یہ طے ہوا کہ مصر کو "چرانے" میں برطانیہ کی فرانس مخالفت نہیں کرے گا۔ اس لئے ظاہر میں انگلستان نے مراکو "چرانے" کا موقع فرانس کو دے دیا اور دونوں قوموں نے مراکو کی آزادی کا احترام کرنے کا اصول تسلیم کر لیا۔ لیکن خفیہ طور سے "پُرامن قبضے" کی تدبیروں پر عمل شروع ہو گیا جرمنی[1] اس سازش کو بھانپ گیا۔ اس نے جب دیکھا کہ فرانس، مراکو کو نگل لینا چاہتا ہے تو سخت چراغ پا ہوا۔ فرانس نے جرمنی کی اس مخالفت کو محسوس کر کے اس پر بھی ڈورے ڈالنے شروع کئے اور آخر دونوں کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو گیا جس کی رو سے طے ہوا کہ اگر مراکش کے سلطان کو سڑکیں، ریلیں، تار گھر اور ڈاک خانے وغیرہ بنوانے کے لئے غیر ممالک سے قرض لینے کی ضرورت ہو تو جرمنی اور فرانس دونوں کے مشورے سے یہ قرض لیا جائے گا اور ان کاموں کے ٹنڈر بھی ان کی مشترک مجلس ہی سے پاس کئے جائیں گے۔ جو شخص سب سے بہتر شرائط پیش کرے گا اسی کا ٹنڈر منظور کیا جائے گا۔[2]

لیکن یہ سمجھوتہ کچھ پائدار ثابت نہ ہوا اور آخر ۱۹۰۹ء میں فرانس اور جرمنی کے درمیان ایک ہلکی سی جھڑپ مراکش کے سوال پر ہوگئی۔ ۱۹۱۰ء میں یہ اختلاف بظاہر ختم ہو گئے مگر دل کی کدورتیں نہ مٹیں اور آخر ۱۹۱۴ء میں جنگ کا ایک سبب یہ کدورت بھی ثابت ہوئی۔

دوسرا سبب ٹیونس اور طرابلس

مراکش کے بعد جنگ کا دوسرا سبب ٹیونس اور طرابلس تھا۔ ٹیونس پر انگریزوں کے

---

[1] The International Anarchy : Dickenson صفحہ ۱۱۸

[2] Do. صفحہ ۱۸۷-۱۸۸

خفیہ اشارے سے فرانس نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنا پورا پورا اثر قائم کر لیا تھا۔[1] اور آہستہ آہستہ طرابلس کی طرف قدم بڑھا رہا تھا مگر یہاں اٹلی حائل ہو گیا۔ ۱۸۷۰ء کے بعد سے اٹلی نے اپنی طاقت کو منظم کر لیا تھا۔ اور اسی وقت سے بحرِ روم میں اثر و اقتدار جمانے کے خواب وہ دیکھ رہا تھا۔ اس لئے سب سے پہلا قدم وہ طرابلس کی طرف بڑھانا چاہتا تھا۔ اس لئے فرانس کے اثر کا مقابلہ کرنے کے لئے اس نے جرمنی سے یہ معاہدہ کیا کہ اگر مراکش یا طرابلس میں فرانس کی طرف سے اثر و اقتدار بڑھانے کی کوشش کی گئی تو جرمنی اور اٹلی دونوں مل کر فرانس کا مقابلہ کریں گے۔ اور اگر ضرورت ہوئی تو فرانس کے خلاف اعلان جنگ سے بھی باز نہ رہیں گے۔[2]

اس کے علاوہ اٹلی نے برطانیہ سے بھی ایک خفیہ معاہدہ کیا جس میں یہ یقین دلایا کہ اگر برطانیہ طرابلس میں اٹلی کی مداخلت پر خاموش رہے تو اٹلی اس کے صلے میں مصر میں برطانیہ کی مداخلت پر کچھ نہ بولے گا۔ اسی قسم کا خفیہ معاہدہ فرانس سے مراکش کے معاملہ میں کیا گیا۔[3] ان معاہدوں کے بعد اپنے طاقتور ہمسایوں کی طرف سے مطمئن ہوتے ہی ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر دھاوا بول دیا۔ طرابلس اس وقت سلطان ترکی کے قبضہ میں تھا مگر یہ زمانہ سلطنت عثمانیہ کی ڈھلتی چھاؤں کا زمانہ تھا۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد طرابلس میں اطالوی جھنڈا لہرانے لگا اور ترکوں کو شکست ہو گئی۔

لیکن جرمنی، آسٹریا ہنگری اور روس کو اٹلی کا یہ قبضہ پسند نہ آیا اور حسد و رقابت کی

---

1. دیکھو Memoirs of Crispi صفحہ ۹۹
2. Empires and Commerce in Africa: Woolf. صفحہ ۹۵
3. آسٹریا ہنگری کے خفیہ سمجھوتے (انگریزی) از Pribram جلد دوم صفحہ ۷۹
4. انٹرنیشنل انارکی صفحہ ۲۲۳ سے ۲۲۴

آگ اندر ہی اندر سلگنے لگی۔

تیسرا سبب: ریاستہائے بلقان کئی صدیوں سے ریاستہائے بلقان کا سوال یورپ کی سیاست کا ایک پھوڑا بنا ہوا ہے۔ اس علاقے کا رقبہ کچھ زیادہ بڑا نہیں۔ لیکن دنیا کی تاریخ میں اس کی اہمیت، اس کے رقبے سے کہیں زیادہ رہی ہے۔ یہاں ایک طرف تو مختلف قومیں برسر پیکار ہیں اور دوسری طرف اس کے پاس کی طاقتور قومیں اس کمزوری اور انتشار سے فائدہ اٹھانے کے لئے بے قرار ہیں ۱۹۱۴ء تک تین عظیم الشان سلطنتوں کی نگاہیں ان ریاستوں کی طرف تھیں —— ایک روس، دوسرا ترکی، تیسرا آسٹریا ہنگری چنانچہ ۱۹۱۳ء میں ایک روسی مدبر نے کہا تھا کہ "معاہدوں اور سمجھوتوں کے ان بیسیوں بندھنوں کی بدولت جو ریاستہائے بلقان کے درمیان طرح طرح سے پیدا کر دئے گئے ہیں، ان ریاستوں کو یورپ کا بارود خانہ بنا دیا گیا ہے اس لئے اگر کسی ایک سلطنت نے بھی اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا تو یورپ میں لڑائی چھڑ جائے گی"[۵]

بلقان جس علاقے کا نام ہے، اس کا مجموعی رقبہ ساڑھے تین لاکھ مربع میل سے زائد نہیں ہے۔ ہندوستان کا صرف پانچواں حصہ۔ لیکن اس میں کوئی درجن بھر قومیں اور نسلیں بستی ہیں اور ہر قوم و نسل اپنی مستقل ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے ایک جداگانہ حکومت قائم کرنے کے منصوبے باندھتی ہے، لیکن چونکہ ہر قوم کمزور ہے، اس لئے اس کے پاس کی طاقتور حکومتیں قدرتاً ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں مصروف رہتی ہیں۔ اس چیز نے گذشتہ کئی صدی سے اس علاقے کو داخلی و خارجی رقابتوں کا اکھاڑہ بنا

---

[۵] Memoirs of Isvolsky (Eng. Tr. by Leager II) صفحہ ۲۰

رکھا ہو۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ سے پہلے فرانس، روس، جرمنی، آسٹریا ہنگری اور ترکی کی رقابتیں یہاں انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں، اس رقابت میں روس اور آسٹریا ہنگری سب سے آگے تھے۔ تجارتی مقابلے کے لئے ان دونوں ملکوں کے پاس کوئی سمندری ساحل نہ تھا، اسلئے بلقان کے کسی حصے پر قبضہ کر کے اس مشکل کو حل کرنا ان کی اقتصادی ترقی کے لئے ناگزیر ہو کر رہ گیا تھا۔ اقتصادی مفاد کے اس تصادم نے روس اور آسٹریا ہنگری کو ایک دوسرے کا زبردست حریف بنا دیا، دونوں اپنی سازشوں میں لگے ہوئے تھے اور اپنے باہمی تعلقات روز بروز خراب کرتے چلے جا رہے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں آسٹریا ہنگری نے موقعہ پا کر بوسنیا اور ہرزیگوینا کے صوبوں پر حملہ کر دیا۔ یہ صوبے ترکی کے قبضے میں تھے لیکن ان کی آبادی زیادہ تر عیسائیوں پر مشتمل تھی، مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی سے زیادہ نہ تھی۔ اس لئے آسٹریا ہنگری نے فوراً ہی اس جنگ کو عیسائیت کی "مقدس جنگ" قرار دے دیا اور سلطنت عثمانیہ کی کمزوری اور عیسائیوں کے مذہبی جذبات دونوں سے فائدہ اٹھا کر فتح حاصل کر لی۔ لیکن روس کو یہ فتح سخت ناگوار گزری۔ روس کے علاوہ بلقان کی دوسری قومیں بھی آسٹریا ہنگری کی دستار سلطنت میں اس نئے طرے کے اضافے کو برداشت نہ کر سکیں، خصوصاً سربیا اور رومانیہ کے باشندے تو سخت آگ بگولا ہوئے، قریب تھا کہ جنگ کے شعلے اسی وقت بھڑک اٹھیں۔ لیکن انگلستان نے بیچ میں پڑ کر معاملے کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی جس میں صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ جنگ ملتوی ہو گئی۔ مگر حسد و رقابت کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگتی رہیں، اور اس کے بعد سے روس مسلسل اپنی طاقت بڑھانے میں مصروف ہو گیا تاکہ مناسب وقت آنے پر بزورِ شمشیر اپنے مفاد کا تحفظ کر سکے۔[۵] ۱۹۱۰ء میں روس نے اپنی فوجی طاقت میں زبردست اضافہ کیا اور فرانس کے ساتھ معاہدے کر کے اس سے

۵؎ "اسباب جنگ" (انگریزی) از B. Keith صفحہ ۲۲

بے اندازہ قرض لیا اور اپنی مغربی سرحدوں پر خالص جنگی اغراض کو پیش نظر رکھ کر طول طویل ریلوے لائنیں بچھا دیں[1]

غرض جنگ اگرچہ ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی، لیکن جنگ کی تیاریاں بوسینا اور ہرزی گو دینا کے مذکورہ بالا الحاق کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ سربیا کے ایک وزیر نے مارچ ۱۹۰۹ء میں صاف صاف لفظوں میں کہا تھا: سربیا نے ہمیشہ کہا ہو کہ وہ ابھی جنگ کے لئے تیار نہیں ہو لیکن اگر کسی نے ہمیں دبانے کی کوشش کی تو یورپ میں جنگ کی بھٹی بھڑک اٹھے گی اور ہم بھی اس میں جو کچھ کر سکتے ہیں، اس سے دریغ نہ کریں گے۔[2]

سربی وزیر نے یہ الفاظ روس کے پایہ تخت لینن گراڈ (سنیٹ پیٹرس برگ) میں کہے تھے۔ جس سے یہ نتیجہ نکالنا بہت آسان ہو کہ ان الفاظ کی تہ میں روسی عزائم و حوصلے بول رہے تھے۔

چوتھا سبب: برلن بغداد ریلوے ۱۸۹۹ء میں ترکی نے قسطنطنیہ سے بغداد تک پندرہ سو میل لمبی ریلوے لائن تیار کرنے کی منظوری دی اور جرمنی، فرانس اور برطانیہ تینوں نے مشترک طور پر اس کو بنانے اور چلانے کا بیڑہ اٹھایا۔ لیکن بعد میں برطانیہ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ بغداد سے قسطنطنیہ اور پھر قسطنطنیہ سے برلن تک جو مسلسل سلسلہ قائم ہو جائے گا، وہ ہندوستان تک جرمنی کا اثر پھیلا دے گا۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں برطانیہ اس کاروبار میں حصہ لینے سے دستبردار ہو گیا

---

[1] ورلڈ کرائسس از ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۴ء از چرچل صفحہ ۳۶

[2] Is Germany Guilty? جلد دوم صفحہ ۳۲

اسی سال برطانوی پارلیمنٹ میں اس پر بحث ہوئی تو ایک ممبر گبسن بادیلز Gibson Bowels نے تقریر کرتے ہوئے کہا "یہ ریلوے نہیں ہی بلکہ ایک مکمل فریب ہی جس سے برطانوی مفاد کو نقصان پہنچا کر جرمنی مفاد کو ترقی دینا مقصود ہی اس کا مطلب یہ ہی کہ جرمنی اس راہ سے ایشیائے کوچک میں اپنا فوجی اور تجارتی اقتدار قائم کرنا چاہتا ہی"[۱]

برطانیہ کے علیحدہ ہوجانے کے بعد اس ریلوے کا تعلق صرف فرانس اور جرمنی سے رہ گیا۔ لیکن چونکہ فرانس کا حصہ جرمنی سے بہت کم تھا اس لئے دراصل یہ پوری اسکیم جرمن اسکیم بن کر رہ گئی۔

برطانیہ کے علاوہ روس کو بھی اس ریلوے سے سخت خطرہ لاحق ہوا۔ اس لئے کہ ایران و توران کے جو علاقے روس کے مفاد کا آماجگاہ تھے، اُن پر بھی جرمنی اثرات کے پھیل جانے کا قوی اندیشہ اس ریلوے سے پیدا ہو سکتا تھا۔ ان رقابتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اچھی خاصی مفید تجویز جنگ عظیم کا سبب بن کر رہ گئی۔[۲]

پانچواں سبب: ایران

براؤن نے خوب کہا ہی کہ "جب تک ایران کا ساحل سے بحرِ ہند کا پانی ٹکراتا رہے گا، اس وقت تک روس اپنی ترقی کے لئے اس پر قبضہ رکھنا ضروری سمجھے گا"[۳]

یہی وجہ ہی کہ بغداد ریلوے سے روس کو بھی خطرہ پیدا ہوا۔ مگر جرمنی نے فوراً ہی روس سے ایک معاہدہ کرکے شمالی ایران کو اس کا "حلقۂ اثر" مان لینے کا اعلان کر دیا۔ اور یہ وعدہ کیا کہ جرمنی کبھی اس امر کی کوشش نہ کرے گا کہ ایران میں کسی قسم کی کوئی تجارتی

---

[۱] دیکھو رودادِ پارلیمنٹ Hansard سنہ ۱۹۰۳ء جلد نمبر ۶، صفحہ ۱۰۹

[۲] دیکھو انٹرنیشنل اناٹرکی۔ بغداد ریلوے۔ باب نہم

[۳] "انقلاب ایران" (انگریزی) از براؤن صفحہ ۱۰۲

مراعات حاصل کرے۔ نیز روس کا یہ حق تسلیم کیا کہ وہ طہران سے خانقین تک ریلوے لائن بنا کر اپنی تجارتی سہولتوں کے لئے میدان ہموار کرلے[۱]۔

اس معاہدے نے روس کو تو مطمئن کر دیا مگر برطانیہ کی تشویش اس سے اور بڑھ گئی۔ ہندوستان کی وجہ سے برطانیہ کی نگاہ میں ایران کی جو اہمیت ہے اس نے ایک پیچیدہ صورت حال پیدا کر دی جو آخر کار ۱۹۱۴ء کی جنگ پر منتج ہوئی۔

چھٹا سبب: چین میں "پُرامن مداخلت"

کمزور ممالک پر قبضہ کرنے کے لئے یورپ کے صنعتی ممالک نے فوجی حملہ آوری کے مقابلے میں "پُرامن مداخلت" کا ایک نیا طریقہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں وضع کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ریلوے، ڈاک خانہ، تارگھر، بینک وغیرہ کے ذریعہ کسی ملک میں قدم جمائے جائیں، پھر اُن کی حفاظت کے لئے تھوڑی سی فوج رکھنے کی اجازت مقامی حکومت سے حاصل کر لی جائے اور رفتہ رفتہ سارے ملک کو اپنے اقتصادی جال میں اس طرح پھانس لیا جائے جس طرح قرض دینے والا ساہوکار اپنے قرض دار کو پھانس لیتا ہے اور خاموشی سے اس کی ساری دولت پر قابض ہو جاتا ہے۔

اس "پُرامن مداخلت" کا سب سے بڑا شکار بلاد اسلامیہ کے بعد چین تھا۔ مگر مختلف طاقتوں کی موجودگی نے یہاں بھی حسد و رقابت کا وہی بازار گرم کر دیا جس کا نظارہ مراکش وغیرہ میں پیش آیا۔ یہ رقابتیں آہستہ آہستہ بڑھتی رہیں اور آخر ۱۹۱۴ء کے آتش زار میں ایندھن کے کام آئیں۔

---

[۱] The Strangling of Persia; Shuster: page 226

ساتواں سبب: ترکی کمزوری دنیا میں سب سے بڑا جرم ہی اور صنعتی انقلاب کے بعد کسی قوم کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہی کہ وہ صنعت اور کارخانوں کے میدان میں دوسروں کی محتاج ہو۔ یہی وہ کمزوری تھی جس نے اٹھارویں صدی سے سلطنت عثمانیہ کو یورپ کی طاقتوں کے مقابلے میں ہیچ بنانا شروع کر دیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ترکی کا انحطاط حد سے گزر چکا تھا۔ اور یورپ کی ہر قوم اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے بیتاب تھی۔ اسلئے ڈکنس کی یہ رائے بہت معقول ہی کہ "اس جنگ کا ایک بہت بڑا سبب ترکی کی وسیع غیر ترقی یافتہ منظم سلطنت پر قابو حاصل کرنے میں بھی مضمر تھا۔"[1]

آٹھواں سبب: خفیہ معاہدے خفیہ معاہدوں کا رواج یوں تو بہت پرانا ہی لیکن ۱۸۷۰ء کے بعد جب فرانس کی جمہوریت کو استقلال نصیب ہوا خفیہ معاہدوں کی مصیبت بلائے بے درماں کی طرح دنیا پر ٹوٹ پڑی۔ ۱۸۷۰ء کے بعد دنیا کی جو تقسیم عمل میں آئی تھی، اس سے کوئی ملک بھی مطمئن نہ تھا لیکن کسی ملک میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ تلوار کے زور سے اپنی مطالبات منوا سکے۔ اس لئے قومی جتھے بندی کی فضا تیزی سے پھیلنے لگی اور ہر قوم دوسری قوم سے خفیہ سرگوشیوں میں مصروف ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ان خفیہ معاہدوں کا ایک نہایت ہی پیچیدہ جال اندر ہی اندر تیار ہو گیا جس میں بالآخر سب کے سب الجھ کر رہ گئے۔[2]

. . . .

---

[1] انٹرنیشنل انارکی صفحہ ۲۳۴

[2] تفصیل کیلئے دیکھو

Recent Revelations of European Diplomacy : Gooch

Secret Treaties : Pribram

یہ تھی ۱۹۱۴ء سے قبل دنیا کی حالت۔ جرمنی کا ایک پروفیسر جس نے سرکاری دستاویزوں کی بنیاد پر جرمن وزارتِ خارجہ کی نگرانی میں جنگ کے اسباب کی تاریخ لکھی ہے، بے شمار مستند شہادتیں پیش کرنے کے بعد لکھتا ہے: "اس جنگ کو شروع کرنے کی ذمے داری سے کوئی حکومت پوری طرح بری قرار نہیں دی جاسکتی، اور نہ کسی حکومت پر پوری طرح اس کی ساری ذمے داری عائد کی جاسکتی ہے، اصل یہ ہے کہ سب پر مشترک ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کے حالات کا اقتضا ہی اس وقت یہ تھا کہ جنگ ہو۔"[1]

گوچ لکھتا ہے: "—— دنیا کی حالت ایک بارود خانے کی طرح ہو چکی تھی جو ذرا سی چنگاری سے بھڑک کر شعلہ زار بن سکتا تھا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ یہ قیامت خیز جنگ ناگہانی طور پر آگئی۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ مختلف حکومتیں اس جنگ کے لئے سالہا سال پہلے سے اپنے فوجیوں اور شہریوں کو ترتیب دے رہی تھیں۔ آسٹریا ہنگری، جرمنی اور روس کی شہنشاہتیں ہوسِ اقتدار کے نشے میں مست تھیں اور کسی معقول مشورے پر کان دھرنے کو تیار نہ تھیں۔ اگرچہ جنگ کا واحد مجرم ان شہنشاہیتوں کو قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ اس میں شک نہیں کہ اس جنگ کو برپا کرنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس کا اصل سبب وہ بدنظمی و ابتری ہے جو ان شہنشاہیتوں کو ورثے میں ملی تھی اور جس کو ختم کرنے کی کوئی خاص کوشش اُنہوں نے نہ کی۔"[2]

مختصر یہ کہ یہ تمام حالات ایسے تھے جنہوں نے یورپ کے جسدِ سیاست کو پھوڑا

---

[1] ریسنٹ ریویلیشنز: از گوچ صفحہ ۲۰

[2] " " صفحہ ۲۱۳-۲۱۴

بنا رکھا تھا اور دانشمند سیاست دانوں کو وہ وقت قریب نظر آرہا تھا جب یہ پھوڑا پھوٹ پڑے ——— چنانچہ یہی ہوا کہ جولائی ۱۹۱۴ء کو شہزادہ فرڈیننڈ کے قتل کا بہانہ پاکر یہ پھوڑا پھوٹ گیا اور چار سال تک دنیا اضطراب و بےچینی کی خوفناک کروٹیں بدلتی رہی۔

خیال تھا کہ یہ جنگ بالکل آخری اور فیصلہ کن جنگ ہوئی اور اس کے بعد وہ تمام چیزیں طے ہو جائیں گی جو باعث فساد بنی ہوئی ہیں۔ لیکن کیا ایسا ہوا؟ اس کا جواب یوں تو بہت سے سیاسی تدبر عرصے سے نفی میں دے رہے تھے مگر اس نفی کی شدید دکریہہ آواز دنیا نے اس وقت سُنی جب اگست ۱۹۳۹ء میں جرمنی آسٹریا اور چیکوسلوواکیہ کے بعد پولینڈ میں فوجیں داخل کیں اور جس پر بالآخر ستمبر ۱۹۳۹ء میں فرانس اور برطانیہ کو بھی جرمنی سے گتھم گتھا ہونا پڑا۔

یہ سوال کہ ایسا کیوں ہوا؟ مجلس اقوام، امن کانفرنسیں اور تمام میثاق و مواعید سب کے سب ناکام کیوں رہ گئے؟ اس کے جواب کے لئے ضروری ہے کہ ۱۹۱۹ء کے صلحناموں کے بعد سے ۱۹۳۹ء کے اعلان جنگ تک کی دنیا پر ایک سرسری مگر جامع نظر ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس دوران میں دنیا کی حالت کیا رہی۔ اب تک دنیا کی سیاسی رفتار پر انتہائی اجمالی نظر ڈالی گئی، مگر اب ان حالات کی روشنی میں گذشتہ جنگ عظیم کے بعد کے واقعات کسی قدر تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ۱۹۱۸ء میں "جنگ عظیم" درا صل ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ ملتوی ہوئی تھی، البتہ یہ التوا ایک غیر معین مدت تک کے لئے تھا۔ یہ تو ہر سیاسی بصیر ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء کے صلح ناموں کے بعد ہی تاڑ گیا تھا کہ جنگ ہو کر رہے گی اور جلد رہے گی۔ پھر جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا تھا، جنگ کی کالی گھٹا دنیائے سیاسی افق پر پھیلتی جاتی تھی۔ لیکن جب تک ہٹلر نے اپنے ہمسایہ ملکوں

پر لگاتار حملے کرکے پرانے صلحناموں کو علی الاعلان چاک کرڈالنے کا خونی عمل شروع نہ کیا تھا، اُس وقت تک یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ نومبر ۱۹۱۸ء کی ملتوی شدہ ہولناک جنگ عظیم کا احیائے جدید ۳/ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہونے والا ہے۔

باب ۱۷

ملکوں اور قوموں میں جدید حد بندی

۱۔ شام اور عراق میں آزاد حکومتیں قائم کی جائیں گی اور یہاں کے عوام جس طرح چاہیں گے ان حکومتوں کو چلانے کے مجاز ہوں گے، اور ان پر کسی قسم کا کوئی دباؤ مطلق نہیں ڈالا جائے گا ——— (برطانیہ و فرانس کا مشترکہ اعلان۔ ۹ر نومبر ۱۹۱۸ء)

۲۔ ۳۷ درجے عرض البلد کے جنوب کا پورا عرب علاقہ آزاد قرار دیا جائیگا، البتہ بصرہ اور بغداد میں برطانیہ کے مفاد کی حفاظت کے لئے برطانیہ کا تھوڑا کنٹرول رہے گا اور اسی طرح فرانس کے مفاد کے تحفظ کے لئے ایک آدھ مقام پر فرانس کی نگرانی رہے گی (شریف حسین سے برطانیہ کا معاہدہ۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء)

۳۔ وہ تمام عرب علاقے اور عرب ریاستیں جو اس جنگ میں ہمارے ساتھ شریک ہوں گی کلی طور پر آزاد ہوں گی (شام کے وفد کو برطانیہ کا بیان۔ ۱۱ر جون ۱۹۱۷ء)

۴۔ "ہم ملک گیری کے خیال سے جنگ نہیں کر رہے ہیں"

(لائڈ جارج۔ وزیر اعظم برطانیہ۔ فروری ۱۹۱۷ء)

۵- ہمارے کندھوں پر مقبوضات کا جو بوجھ ہے اس میں کوئی اور نیا علاقہ یا نئی ذمہ داری شامل کر کے اضافہ کرنا نہیں چاہتے" (مسٹر ایسکوئتھ۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء)

۶- اس جنگ میں ہمارے ذاتی غرضمندانہ مفاد برائے نام ہیں"
(مسٹر ایسکوئتھ۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء)

۷- ہم نئے مقبوضات حاصل کرنے کے لئے ہرگز نہیں لڑ رہے ہیں"
(بونرلا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء)

۸- ہم ایسی فتح کے لئے جنگ نہیں کر رہے ہیں جس سے ہمیں نئے مقبوضات حاصل ہوں یا جس سے ہماری سلطنت کی حدود میں اضافہ ہو جائے (مسٹر لونگ۔ فروری ۱۹۱۷ء)

۹- برطانیہ کا یہ خیال قطعی نہیں ہے کہ آسٹریا ہنگری کے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔
(لارڈ سیسل ۱۹۱۷ء اور لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ۔
(ٹریڈ یونین کانگرس کے ایک وفد کے جواب میں ۱۹۱۸ء)

۱۰- ہم اس لئے جنگ نہیں کر رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے پایہ تخت قسطنطنیہ سے محروم کر دیں یا ایشیائے کوچک اور تھریس کے زرخیز علاقے اس سے چھین لیں"۔[۱]
(لائڈ جارج۔ وزیر اعظم۔ ۵ جنوری ۱۹۱۸ء)

یہ ہیں وہ چند اعلانات ومواعید جو برطانیہ وفرانس کے ذمے دار عہدیداروں نے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک اپنے "مقاصد جنگ" کو بیان کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً شائع کئے تھے اور جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو پورا عرب برطانیہ وفرانس کا حامی ہو گیا اور دوسری طرف بلقان وآسٹریا ہنگری کی تمام چھوٹی چھوٹی محکوم قوموں کو فرانس برطانیہ کی فتح میں اپنی آزادی کے خواب نظر آنے لگے۔

---

[۱] منقول از پوسٹ وار ورلڈ از جیکسن امریکہ

لیکن یہ تو صرف ظاہری اعلانات تھے۔ اندرونی طور پر خفیہ معاہدوں اور باہمی سرگوشیوں کا ایک بالکل دوسرا ہی جال بچھا ہوا تھا۔ چنانچہ جرمنی کی شکست کے بعد (مگر صلحناموں کی ترتیب سے پہلے) شاہی کابینۂ جنگ (امپیریل وار کیبنٹ) کے ایک مشہور و باثر ممبر جنرل اسمٹس (Smuts) نے "مقاصدِ جنگ" کا جو خاکہ کابینہ میں باقاعدہ مگر بالکل خفیہ طور پر پیش کیا تھا، اس میں حسب ذیل امور کو صلحناموں کی بنیاد قرار دینے پر زور دیا گیا تھا۔

"(الف) جرمنی کے نوآبادیاتی نظام کی تباہی تاکہ مستقبل میں آمد و رفت اور رسل و رسائل کے ان تمام ذرائع کو محفوظ کر دیا جائے جو سلطنتِ برطانیہ کے لئے بیحد ضروری ہیں یہ مقصد ہم حاصل کر چکے ہیں جو ہماری بڑی بیش قیمت کامیابی ہے۔ اس لئے صلح کی گفت و شنید میں کوئی بات ایسی نہ ہونی چاہئے جس سے اس کامیابی پر کوئی آنچ آسکے"۔

"(ب) ترکی سلطنت سے ان تمام مقبوضات کو توڑ کر الگ کر دینا جو جرمنی کو مشرق بعید میں پھیلنے کا موقعہ دے سکتے تھے اور جو سلطنت برطانیہ کے ایشیائی اقتدار کو خطرے میں مبتلا کر سکتے تھے۔ یہ مقصد بھی بنیادی طور پر حاصل ہو گیا البتہ اس کی مزید تکمیل کے لئے فلسطین کو فتح کرنے کی احتیاج غالباً ابھی باقی ہے"۔

اس جنگ میں جو خفیہ معاہدے کئے گئے تھے، وہ اگرچہ اس وقت پردۂ راز میں تھے مگر جنگ کے چند سال بعد منظر عام پر آ گئے۔ لیکن یہاں ان کی تفصیل کا موقعہ نہیں[1]۔ البتہ ۱۹۱۷ء میں یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ جب روس میں زار کی شہنشاہیت کو اشتراکی انقلاب نے ختم کر دیا تو نئی انقلابی حکومت کے ارکان نے برطانیہ و فرانس کے مدلل و نی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو ریسنٹ ریولیشن از گوچ (لندن) اور سیکریٹ ٹریٹیز مرتبہ پروفیسر پری برام (آسٹریا) مرتبہ ایف۔ ایس۔ کاکس (Cocks)

عزائم کو بے نقاب کرنے کے لئے روس کے شاہی دفتر سے اس خفیہ عہدنامے کو نکال کر شائع کر دیا جو برطانیہ اور فرانس کے درمیان مئی ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا اور جو عہدنامہ سائکس پی کاٹ (Psyks-Pickot) کے نام سے موسوم تھا۔ اس عہدنامے میں فرانس اور برطانیہ نے بلادِ عرب کو آپس میں تقسیم کیا تھا۔ عراق اور فلسطین کے دو بندرگاہ برطانیہ کو دیئے گئے تھے اور شام کا پورا ساحل جس میں دمشق، حلب اور موصل بھی شامل تھے، فرانس کے "حلقۂ اثر میں" دیا جانا طے ہوا تھا۔

ولسن کے چودہ نکات

روس کی "انقلابی حکومت" کے اس افشائے راز نے بڑی کھلبلی مچائی۔ مگر برطانیہ و فرانس نے ایک فریب کو دوسرے فریب سے دبانے کی کوشش کی اور عربوں کو مطمئن کرنے کے لئے متعدد اعلانات شائع کئے جن میں عرب کی مکمل آزادی کا وعدہ انتہائی زوردار لفظوں میں کیا گیا ——— لیکن جس اعلان نے دنیا کو سب سے زیادہ مطمئن کیا اور جس کا خیر مقدم نہایت جوش و مسرت کے ساتھ کیا گیا وہ جمہوریۂ امریکہ کے پریزیڈنٹ کا وہ اعلان تھا جو "چودہ نکات" کے نام مشہور ہے۔ ان چودہ نکات کی "شانِ نزول" یہ ہے کہ ولسن نے ۱۹۱۷ء کے آخر میں "مقاصد جنگ" کے بارے میں ایک بیان دیا اور پھر ۸ر جنوری ۱۹۱۸ء کو اسی بیان کو چودہ نکات کی شکل میں ترتیب دے کر پیش کیا۔ فروری میں ان چودہ نکات پر چار "اصولوں" کا اور اضافہ کیا گیا، اور پھر چند دن کے بعد پانچ کلیات اور پیش کئے گئے

جب یہ نکات و کلیات شائع ہوئے تو دنیا کے ہر گوشے سے ولسن کے لئے تحسین و مرحبا کی آوازیں بلند کی گئیں، البتہ وہ قومیں جنہوں نے خفیہ عہدنامے کر رکھے تھے اور جو بہت کچھ مال غنیمت کی آس لگائے بیٹھی تھیں وہ ان نکات پر سخت چراغ پا ہوئیں اور ان پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کرنے لگیں۔ تاہم چونکہ اس وقت امریکہ دنیا کی سب

سے بڑی طاقت تھی، اور اسی کی مداخلت نے لڑائی کا پلّہ اتحادیوں کے حق میں جھکا رکھا تھا، اس لئے اتحادی کسی قیمت پر بھی امریکہ کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی بنا، پر بظاہر ولسن کی آواز پر سب نے لبیک کہا، اور سب نے اس بات میں ولسن سے اتفاق کیا کہ اس جنگ کے خاتمے پر جو صلحنامہ مرتب ہوگا اس میں حق و انصاف کو پیش نظر رکھا جائے گا اور اقتصادی اعتبار سے ہر قوم کو سرسبز و خوش حال ہونے کے مساوی مواقع فراہم کئے جائیں گے لیکن کیا ولسن کی یہ خواہش پوری ہوئی؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے قبل چودہ نکات کو جان لینا ضروری ہے۔

مختصر طور پر ولسن کے چودہ نکات یہ تھے :۔

۱۔ کوئی معاہدہ خفیہ نہ کیا جائے، ہر معاہدہ علانیہ ہو اور علانیہ گفت و شنید کے ذریعہ مرتب کیا جائے۔

۲۔ امن اور جنگ دونوں حالتوں میں ہر ملک کو اپنے اردگرد کے سمندروں کے علاوہ دنیا کے تمام سمندروں میں جہازرانی کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہو۔

۳۔ اُن تمام موانع کو حتی الامکان دور کیا جائے جو دنیا کی آزاد تجارتی و معاشی ترقی کی راہ میں حائل ہو سکتے ہیں۔

۴۔ ہر قوم اس بات کی پابندی قبول کرے اور قبول کرائے کہ اسلحہ بندی کو کم کیا جائے گا اور ہر قوم صرف اتنے ہی اسلحہ بنائے گی جو ملک کے اندرونی امن کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔

۵۔ نوآبادیات کا تصفیہ کامل وسیع النظری اور غیر جانبداری کے ساتھ کیا جائے اور اس تصفیہ کی بنیاد اس امر پر ہو کہ ان علاقوں پر کسی قوم کو اس وقت تک تسلط نہ دیا جائے جب تک وہاں کے باشندوں کے مفاد و حقوق کا پورا پورا لحاظ نہ کر لیا جائے۔

۶۔ روس کے جو علاقے دوسروں نے فتح کر لئے ہیں اُن سے فوجی چھاؤنیاں ہٹالی جائیں

اور یہ مفتوحہ علاقے روس کو واپس کئے جائیں ۔ روس کو آزاد اور بے روک موقع دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی سیاسی ترقی اور قومی پالیسی کے مسئلے کو طے کر سکے۔ روس میں جو نظام حکومت بھی قائم ہو اُسے تسلیم کر کے جمعیت اقوام میں اُسے خوش آمدید کہا جائے اور اُسے ہر قسم کی امداد دی جائے ۔

۷۔ بلجیم سے تمام فوجیں ہٹالی جائیں اور اُس کے تمام چھینے ہوئے علاقے انکو واپس کئے جائیں۔

۸۔ فرانس کے علاقوں میں جو غیر ملکی فوجیں ہیں وہ سب ہٹالی جائیں۔ مفتوحہ علاقے فرانس کو واپس کئے جائیں اور السامس اور لارین کے علاقے بھی فرانس کو دیئے جائیں ۔

۹۔ قومیت کے صاف، واضح اور مسلّمہ اصول کے مطابق اٹلی کی سرحدوں کا دوبارہ تصفیہ کیا جائے ۔

۱۰۔ آسٹریا ہنگری کے باشندوں کو خود مختارانہ طور پر ترقی کرنے کا زیادہ سے زیادہ آزادانہ موقعہ دیا جائے۔

۱۱۔ رمانیہ، سرابیا اور مانٹی نیگرو سے تمام بدیسی فوجیں ہٹالی جائیں۔ مفتوح علاقے واپس کئے جائیں اور سربیا کو سمندر تک جانے کے لئے ایک آزاد گذرگاہ دی جائے ۔

۱۲۔ سلطنتِ عثمانیہ کے جس علاقے میں ترک آبادی ہو اس میں ترکوں کو آزاد و خود مختار حکومت بنانے کا موقعہ دیا جائے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے ماتحت جو دوسری قومیں (عرب وغیرہ) ہیں ان کو کامل آزادی دی جائے ۔ اور کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ یا مداخلت کیئے بغیر آزادی و خود مختاری کے ساتھ ترقی کرنے کا موقعہ انھیں دیا جائے۔

۱۳۔ پولینڈ کی آزاد حکومت قائم کی جائے جس میں وہ تمام علاقے شامل ہوں جو مُسلّمہ طور پر پولستانی اکثریت رکھتے ہیں۔ اس آزاد حکومت کو سمندر تک جانے کے لئے

کے لئے آزاد و محفوظ گذرگاہ دی جائے۔

۱۴۔ قوموں کی ایک عمومی انجمن بنائی جائے جس کا مقصد یہ ہو کہ دنیا کی تمام حکومتیں مل کر اس امر کی ضمانت دیں کہ تمام چھوٹی بڑی حکومتوں کو یکساں طور پر سیاسی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے علاقے دوسروں کی دستبرد سے محفوظ رہیں گے۔

ان چودہ نکات کو عملی شکل میں لانے کے لئے جو چار اصول بنائے گئے تھے، ان کا مطلب یہ تھا کہ مذکورہ بالا نکات کو مندرجہ ذیل اصولوں کی روشنی میں حل کیا جائے گا۔

۱۔ ہمارا آخری فیصلہ مجموعی اور کلی حیثیت ہی سے منصفانہ نہ ہوگا بلکہ انفرادی اور جزئی حیثیت سے بھی ہر قوم اور ہر مسئلے کے ساتھ پورا پورا انصاف ملحوظ رکھا جائیگا۔

۲۔ صوبوں اور قوموں کو ایک سلطنت سے دوسری سلطنت میں اس طرح منتقل نہیں کیا جائے گا گویا وہ تجارتی مال و اسباب ہوں۔

۳۔ ہر علاقے کا تصفیہ اس علاقے کے باشندوں کے مفاد میں کیا جائے گا، نہ کہ حریف سلطنتوں کے مابین سمجھوتہ کرنے کے لئے۔

۴۔ تمام مشہور و معروف قوموں کو جس حد تک ممکن ہو مطمئن کیا جائے گا اور ان میں نہ تو نفاق و شقاق کے لئے عناصر پیدا کئے جائیں گے اور نہ اس قسم کے پرانے عناصر کو ابھارا جائے گا۔

ولسن کے نکات کا خیر مقدم

ان نکات و اصول میں دو خاص باتیں ایسی تھیں جنہوں نے ساری دنیا میں دھوم مچا دی اور مخالف و موافق سب ان کی تائید پر مجبور ہو گئے۔ اول یہ کہ ہر قوم کو خود ارادیت (Self-determination) کا حق دیا جائے اور کوئی بیرونی طاقت کسی کے معاملات میں مداخلت کرنے کی مجاز نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ کوئی خفیہ معاہدہ قابل تسلیم نہ سمجھا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ولسن نے دنیا کی مشکلات کی صحیح رگ پکڑ لی تھی۔ اس نے ان مشکلات کا جو حل پیش کیا وہ یقیناً اسی قابل تھا کہ دنیا اس کا خیر مقدم کرتی چنانچہ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں اس کے

نکات کی گونج دنیا کے کونے کونے سے سنائی دے رہی تھی، ہر قوم مطمئن تھی اور یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا۔ روس کی بالشویک حکومت نے اگرچہ عہد نامۂ سائکس پی کاٹ کو نہاں خانۂ اسرار سے نکال کر طشت از بام کر دیا تھا، جس نے عربوں میں سخت ہراس و سراسیمگی پھیلا دی تھی، مگر جب یہ نکات و اصول سامنے آئے تو ہر عرب مطمئن نظر آنے لگا۔ عرب کہتے تھے: ولسن اور ولسن کے حلیف عربوں کے ساتھ بے انصافی نہیں کر سکتے اور بے انصافی ہو بھی کیسے سکتی ہے جبکہ صلحناموں کی ترتیب ان نکات و اصول پر ہوگی؛ یہی احساسات جرمنی میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ جرمنی کے بادشاہ ولیم نے شہزادے میکس آف بیڈن کے ہاتھ میں عنانِ وزارت سونپ کر اسے یہ اختیار دیا کہ ولسن کے نکات کی بنیاد پر صلح کی درخواست کرے لیکن جب گفت و شنید نے طول پکڑا تو جرمن عوام کو یہ خیال پیدا ہوا کہ قیصر ولیم کی موجودگی میں اتحادیوں سے کامیاب مصالحت نہیں ہو سکتی۔ اس احساس نے فوراً ہی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ بحری بیڑے نے اطاعت سے انکار کر دیا اور شمالی و جنوبی امریکہ میں زبردست انقلاب رونما ہو گیا اس انقلابی سیلاب میں شاہ جرمنی کا تخت و تاج خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ اور پرانی شاہی حکومت کی جگہ جمہوری حکومت قائم ہوئی جس نے ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو التوائے جنگ کے عہد نامے پر دستخط کیے۔ التوائے جنگ کی شرائط غیر متوقعہ طور پر بہت سخت تھیں لیکن جرمنوں نے اس کی مطلق کوئی پروا نہ کی۔ ولسن کے چودہ نکات اور چار اصول ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ کہنے لگے: التوائے جنگ کی شرائط عارضی ہیں اگر یہ سخت ہوئیں تو کیا اور نرم ہوئیں تو کیا! اصل چیز آخری صلحنامہ ہے جس پر دنیا کے مستقل امن کا انحصار ہے، پھر جب آخری صلحنامہ اور مستقل امن کا فیصلہ ولسن کے نکات و اصول کے مطابق ہوگا تو فکر کی کیا بات ہے؟

یہی احساسات آسٹریا ہنگری، ترکی اور دیگر اقوام کے تھے۔ سرب، کروٹ سلاوی اور چیک اقوام نے انہی نکات سے مطمئن ہو کر آسٹریا ہنگری کی شہنشاہیت کے خلاف بغاوت کی، تو آسٹریا ہنگری نے یہ دیکھا تو ہتھیار ڈال دیئے۔ ترکی نے ہتھیار ڈال دیئے، بلغاریہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔—

اور وہ بھی غیر مشروط طور پر ـــــ اس لئے کہ شرائط کی ضرورت ہی کیا ہی جب کہ دنیا کا امن ولسن کے نکات پر قائم کیا جا رہا ہی ـــــ؟

ولسن کے نکات کا حشر التوائے جنگ پر دستخط ہونے کے ایک ماہ بعد پریزیڈنٹ ولسن یورپ آیا مگر یہاں آکر اس نے ایک نیا نظارہ دیکھا۔ انگلستان میں لائڈ جارج اپنی پارٹی کی اکثریت سمیت انتخاب میں کامیاب ہو چکا تھا اور اسکا انتخاب اس نعرے کی گونج میں لڑا گیا تھا کہ

"جنگ نے ہمیں جو گزند پہنچایا ہی جرمنی سے اسکی تلافی کراؤ۔"

فرانس میں بھی پریزیڈنٹ پوئن کارے اپنے پرانے ساتھیوں کے ساتھ دوبارہ منتخب ہو چکا تھا، گویا انگلستان و فرانس دونوں جگہ قدامت پسند پارٹی کا طوطی بول رہا تھا جمہوریہ فرانس کے صدر پوئن کارے کے جذبات کا عالم تو یہ تھا کہ وہ جرمنی کو روئے زمین سے مٹا دینا چاہتا تھا۔ البتہ فرانس کا وزیر اعظم کلی مانسو اتنا انتہا پسند نہ تھا پوئن کارے کی نسبت وہ بہت زیادہ آزاد خیال اور وسیع النظر تھا۔ مگر ولسن کے چودہ نکات اسے بھی کھٹک رہے تھے اُن کو ماننے کیلئے وہ بھی تیار نہ تھا۔

فرانس کے علاوہ اٹلی، یونان اور رومانیہ بھی ان نکات سے کھٹک رہے تھے۔ ان حکومتوں نے جو خفیہ معاہدے کئے تھے، اب ان کے زیر عمل آنے کا وقت تھا اس لئے ولسن کے نکات ان کو کیسے بھا سکتے تھے؟ وہ اس مالِ غنیمت میں سے حصہ بٹانا چاہتے تھے۔ لیکن ولسن ان معاہدوں سے بے خبر تھا یا بے خبر رہنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب اٹلی کے نمائندے نے یہ اصرار کیا کہ ۱۹۱۵ء کے لندن کے خفیہ معاہدے کی بنا پر اُسے ٹرین ٹی نو اور ٹیلی رول کے علاقے اور ڈیل ماشین ساحل کا پورا علاقہ دیا جائے تو ولسن نے اسے ماننے سے انکار کیا اور کہا کہ مجھے اس قسم کے کسی معاہدے کا علم نہیں اسی طرح جاپان کو شان ٹنگ (چین) کا صوبہ دینے کے معاملے میں ولسن نے خفیہ معاہدوں سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا لیکن سمجھا گیا کہ ولسن غلط بیانی سے کام لے رہا ہی اور جان بوجھ کر انجان بن رہا ہی تاکہ خفیہ معاہدہ کرنے والوں کی

حق تلفی کرے۔[۱]

ولسن کے نکات مجروح ہونا شروع ہوتے ہیں

التوائے جنگ کے عہد نامے پر دستخط ہونے کے بعد تقریباً سوا سال تک یہی کھچڑی پکتی رہی۔ بالآخر ۱۸ر جنوری ۱۹۱۹ء کو وہ وقت آیا جب صلح کانفرنس کا بھرا اجلاس پیرس میں منعقد ہوا۔ لیکن اس میں جرمنی اور جرمنی کے حلیفوں کا کوئی نمائندہ نہ تھا حالانکہ "خود ارادیت" کے اصول کے مطابق جرمنی کے نمائندوں کو اپنے ملک کے مستقبل کے فیصلے میں شریک کرنا بہت ضروری تھا۔ گویا یہ سب سے پہلی ضرب تھی جو چودہ نکات کی روح کو پہنچائی گئی۔ اس کانفرنس میں طے ہوا کہ صلحنامے کا مسودہ تیار کرنے کا کام دس آدمیوں کی ایک کونسل کے سپرد کر دیا جائے جس کے ممبر امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی اور جاپان کے وزرائے اعظم اور وزرائے خارجہ ہوں۔ یہ کونسل جب مسودہ تیار کرے تو پھر کانفرنس کا بھرا اجلاس طلب کر کے اس میں اسے منظور کرا لیا جائے۔ ولسن کے چودہ نکات میں سے پہلا نکتہ ہی یہ تھا کہ ہر معاہدہ اور ہر گفت و شنید بالکل علانیہ اور کھلم کھلا ہو۔ مگر اب یہ گفت و شنید صرف دس آدمیوں کے خفیہ اجلاسوں تک محدود کر دی گئی چودہ نکات کی روح پر یہ دوسری ضرب تھی۔

مین ڈیٹ: انتداب

ولسن نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ امن کا راستہ جنگ سے بھی زیادہ دشوار گذار ہے۔ اس کے چودہ نکات واصول کی خوبی سے کسی کو انکار نہ تھا۔ مگر پھر بھی بعض قوموں کے اغراض و مفاد ان کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ سب سے زیادہ فرانس ان کا مخالف تھا، اُسے جرمنی سے خطرہ تھا، وسطِ یورپ کی طاقتوں سے خطرہ تھا، ان خطرات کو مٹانے کے لئے وہ ہر موثر و کارگر حربے

---

[۱] ریسنٹ ریوی لیشن۔ از گوچ۔ صفحہ ۴۴

کو استعمال کرنا چاہتا تھا مگر چودہ نکات اس کے راستے میں حائل تھے۔ ولسن اس مشکل کو جلد ہی بھانپ گیا۔ اس نے دیکھا کہ یہ بیل آسانی سے منڈھے چڑھنے والی نہیں۔ اس لئے اب اُس نے آخری نکتے کو سب پر مقدم کرنے کی تجویز پیش کی۔ یعنی جمعیت اقوام کو پہلے بنا لیا جائے اور پھر دوسرے مسائل پر یہ جمعیت غور کرے بمقصد یہ تھا کہ کم ازکم اس نقطے پر سب متحد ہو جائیں کہ دنیا کی تمام قوموں کی۔ خواہ وہ مسیحی ہوں یا غیر مسیحی، چھوٹی ہوں یا بڑی اور فاتح ہوں یا مفتوح، ایک جمعیت بنائی جائے جو متحدہ طور پر دنیا کے مستقل امن وسلامتی کا پروگرام تیار کرے۔ ولسن کے اس خیال کو تھوڑی سی بحثا بحثی کے بعد سب نے مان لیا۔ مگر اب سوال اٹھا کہ اس جمعیت کا دستورِ اساسی کیا ہو۔ بہت سے دستور بنائے گئے۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہ پڑی کہ اس کی ممبری کا حق کس کس قوم کو دیا جائے۔ کیا عراق، شام مصر اور افریقہ کے نیم محکوم علاقے بھی اس کے ممبر ہوں؟ ولسنی نکات کی اسپرٹ کا تقاضا تو یہی تھا۔ مگر اغراض ومفاد کا تقاضا اس کے خلاف تھا۔ پھر کیا کیا جائے؟ کیا ان سب کمزور قوموں کو طاقتور قومیں آپس میں بانٹ لیں؟ مگر یہ چیزیں ولسن کے نکات ہی کے لحاظ سے غلط نہ تھی، بلکہ خطرناک بھی تھیں سب جانتے تھے کہ اس طرح جنگ ختم نہ ہو گی۔ بلکہ اس سے تو محکوم قوموں میں بغاوت کے جراثیم پرورش پائیں گے اور طاقتور قوموں میں رشک وحسد کی آگ بھڑکے گی۔ پھر کیا ہو؟ بالآخر جنرل اِسمٹس نے اس کا ایک حل پیش کیا جس پر سب نے صاد کیا۔ سب سے مراد یورپ کی قومیں ہیں۔ یہ حل کیا تھا۔ اس حل کا تعلق دراصل فلسفۂ امن سے زیادہ فلسفۂ لغت سے تھا۔ مین ڈیٹ (Mandate) کا لفظ انجیل سے ڈھونڈھ کر نکالا گیا اور اس کی تشریح یہ کی گئی کہ —— جمعیت اقوام کی ایک کونسل بنائی جائے اور اس کے سپرد یہ کام کیا جائے کہ مفتوح قوموں کی مفتوحہ علاقوں میں جو قومیں اور اقلیتیں بستی ہیں ان کو ذمہ دار حکومت کے فن سے واقف بنانے کے لئے انھیں کسی تجربہ کار ومہذب قوم کی نگرانی میں دیدیا جائے۔ کیوں؟ اس لئے کہ

ابھی ان قوموں میں اتنی تمیز، اتنی تہذیب اور اتنی ترقی نہیں آئی ہو کہ انھیں آزادی کے ساتھ حکومت کرنے کا موقعہ دیا جا سکے۔ ابھی تو یہ قومیں طفولیت کے عالم میں ہیں۔ انھیں ایک سرپرست و ولی کی ضرورت ہو اور یہ سرپرست و ولی یورپ کی فاتح قوموں میں سے کسی کو ہونا چاہیے۔

انگلستان کی لبرل (آزاد خیال) جماعت کے لیڈر لارڈ رابرٹ سیسل نے جنرل اسمٹس کی یہ تجویز سُنی تو پھڑک اُٹھے۔ مگر اسی کے ساتھ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ غیر مہذب یا نیم مہذب قوموں کی ولایت و سرپرستی کی اس کونسل میں بڑی طاقتوں کے ممبر اکثریت میں ہوں۔ "بڑی طاقتوں" سے ان کی مراد برطانیہ کے علاوہ فرانس، امریکہ، جاپان اور اٹلی تھے۔ لارڈ صاحب کی یہ تجویز بھی منظور کی گئی اور آخر کار مین ڈیٹ کے اس اصول کی روشنی میں ۱۴ار فروری ۱۹۱۹ء کو جمعیت اقوام کا دستور اساسی صلح کانفرنس نے منظور کر لیا۔

جمعیت اقوام تو قائم ہو گئی۔ یا کم از کم اس کا تصور سب نے مان لیا اور اس کا دستور اساسی تیار ہو گیا۔ لیکن ابھی صلحنامے مرتب کرنے کا کام باقی تھا اور دراصل یہی کام اہل کام تھا۔ صلح ناموں کا مسودہ تیار کرنے کے لئے دس ممبروں کی جو کونسل بنائی گئی تھی، اس نے کچھ اجلاس کئے تھے مگر چند دن کے بعد اس کونسل کے دس ارکان کو بھی زیادہ سمجھا گیا اور اسے بھی کانٹ چھانٹ کر مختصر کرنے کی کوشش شروع ہوئی بالآخر یہ تعداد دس کے بجائے چار کر دی گئی۔ گویا اب صلح کانفرنس کے لئے صلحنامے کا مسودہ تیار کرنے کا کام لائڈ جارج (انگلستان)، کلی مانسو (فرانس)، آرلینڈو (اٹلی) اور ولسن (امریکہ) کے سپرد ہوا۔

چار ممبروں کی اس کونسل میں ولسن کے نکات کا کسی نہ کسی حد تک حامی اگر کوئی تھا تو صرف لائڈ جارج تھا، ۲۵ مارچ ۱۹۱۹ء کو اس نے ایک یادداشت تیار کی

جس میں ان نکات کے مطابق صلح کی تجویز پیش کی گئی۔ اس یادداشت کا خلاصہ یہ تھا کہ کہ اسلحہ میں عام تخفیف کی جائے تاکہ مستقبل میں جنگ کے امکانات کم سے کم ہو جائیں آسٹریا ہنگری کی میگیار قوم کو پوری آزادی و خود مختاری دی جائے، جرمنی کو جمعیتِ اقوام کا ممبر بنایا جائے اور اس کے ساتھ ایک ایسی صلح کی جائے جسے جرمن قبول کر سکیں اور جو منصفانہ ہو ——— مگر کلی مانسو (فرانس) ان تجویزوں کے ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔

پرانی دُنیا کے مسائل سے امریکہ کی علیحدگی پسندی

لیکن اگر لائڈ جارج اور ولسن ایک طرف ہو گئے تو فرانس کی آواز کمزور ہو جائے گی۔ ممکن ہے اٹلی بھی انہی کی طرف جھک جائے۔ اس خیال نے فرانس کے نمائندے کلی مانسو کو سخت الجھن میں مبتلا کر دیا۔ مگر جلد ہی اُسے ایک چارہ کار نظر آ گیا۔ یہ چارہ کار اصولِ مان رو تھا۔ ولسن مجبور تھا کہ اصولِ مان رو کی خلاف ورزی نہ کرے۔ اس لئے اگر کلی مانسو اس مشکل میں ولسن کا ساتھ دے گا تو ولسن اس کے بدلے میں کلی مانسو کی مدد کرنے پر مجبور ہو گا۔

اصولِ مان رو کیا ہے؟ مان رو دراصل امریکہ کا پریزیڈنٹ تھا جو ۱۷۵۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۱ء میں آخری نیند سو گیا۔ ۱۸۲۳ء میں اس نے نئی دُنیا کے بارے میں یہ اصول وضع کیا تھا کہ شمالی یا جنوبی امریکہ کی کسی آزاد حکومت کے معاملات میں کسی یورپی طاقت کو کسی قسم کی مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے۔ اسی طرح امریکی حکومتیں یورپ کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گی۔ ۱۸۲۳ء سے آج تک یہ اصول امریکہ کی سیاست میں زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ امریکہ نہ تو اپنے نصف کرۂ غربی میں کسی دوسرے کا اثر و اقتدار برداشت کرنے پر تیار ہے اور نہ پرانی دنیا کے کاروبار میں اپنے پاؤں پھنسانے کو روادار ہوتا ہے۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہ کر اپنی ترقی کرنا چاہتا ہے اور دوسری قوموں اور ملکوں سے صرف اُسی

حد تک تعاون واشتراک رکھ سکتا ہی جو بیحد ضروری ہی۔

ولسن جانتا تھا کہ اس اصول کی رو سے وہ مجبور ہی کہ امریکہ کو یورپ کے معاملات میں نہ پھنسائے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مان رو اصول امریکی دماغوں پر اس بُری طرح قابض ہی کہ ولسن کی سیاست وقیادت کی تمام کوششیں اہلِ امریکہ کے دماغ سے اس کی اہمیت کو کم کرنے میں قاصر رہیں گی۔ اس لئے اب سوال یہ تھا کہ یا تو "جمعیت اقوام" بنانے کا خیال ترک جائے یا "اصول مان رو" کو خیرباد کہا جائے کیونکہ جمعیت اقوام اگر بنتی ہی تو پھر مان رو اصول کو نظر انداز کئے بغیر امریکہ اس کا ممبر کیسے ہو سکتا ہی۔

ولسن کے لئے یہ مشکل بڑی سخت مشکل تھی۔ یا تو وہ اپنے چودہ نکات کو الوداع کہہ دے اور جمعیت اقوام کے خیال کو اپنے دل سے نکال دے اور یا پھر مان رو اصول کے ماننے والوں کی مخالفت مول لے ——— فرانس نے اس مشکل میں ولسن کی دستگیری کی۔ اس نے آگے بڑھ کر ولسن سے کہا کہ صلحناموں کی تمام ترتیب وتدوین میں مان رو اصول کی رعایت ملحوظ رکھنے کو تیار ہوں۔ یعنی میں اس پر تیار ہوں کہ امریکہ کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور اُسے یورپ کے معاملات میں اپنا پاؤں پھنسانے پر مجبور نہ کیا جائے مگر اس کے معاوضے میں فرانس اپنے بعض معاملات میں امریکہ کی اخلاقی ہمدردی کا خواہاں تھا۔

ولسن کے نکات پر تیسری ضرب

فرانس کے سوا باقی دوسرے ممبر اس کے لئے تیار نہ تھے کہ امریکہ کو الگ تھلگ چھوڑ دیں وہ چاہتے تھے کہ دنیا کے امن کا جو نقشہ تیار ہو، اس کے قائم وبرقرار رکھنے کی ذمے داری میں امریکہ بھی دوسری قوموں کے ساتھ برابر کا شریک ہو یعنی دوسروں کی طرح وہ بھی یہ وعدہ کرے کہ جمعیت اقوام کے ہر ممبر کی حفاظت وہ کرے گا اور اگر کسی نے کسی پر جارحانہ حملہ کیا تو اس کی مدد کرنے میں امریکہ بھی کسی سے پیچھے نہ رہے گا۔ ——— ولسن کا دل تو اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے تیار تھا، مگر ولسن کی قوم اس کے لئے تیار نہ

ہو سکتی تھی۔ اس لئے فرانس کی مذکورہ بالا ہمدردی کو ولسن نے بہت غنیمت جانا۔ مگر اب فرانس کی اس ہمدردی کا بدلہ ولسن پر واجب تھا۔ ولسن جو چاہتا تھا فرانس نے اس کی تائید کر دی اب فرانس جو کچھ چاہتا ہے، ولسن بھی اس کی تائید کرے۔ ولسن مجبور تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ولسن نے فرانس کی حمایت کی، فرانس چاہتا تھا کہ جرمنی کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے جو اس کے جذبۂ انتقام کو تسکین پہنچا سکے۔ فرانس اور جرمنی میں قریبی پڑوسی ہونے کی وجہ سے جو پرانی عداوتیں چلی آرہی تھیں ان کا اقتضا بھی یہی تھا۔ اس کے مقابلے میں لائڈ جارج کا رویہ اتنا انتقام پسندانہ نہ تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ لائڈ جارج نے اس سلسلہ میں جو اسکیم پیش کی تھی وہ بہت معقول تھی لیکن فرانس اس اسکیم کو نہ مان سکا، بالآخر فرانس نے جو کچھ چاہا، ولسن کی مدد سے اس میں کامیابی ہوئی اور لائڈ جارج کی تیار کی ہوئی تجویز پس پشت ڈال دی گئی۔

یہ گویا تیسری ضرب تھی۔ جو چودہ نکات کی جانِ حزیں پر لگائی گئی۔

معاہدۂ ورسیلز ان اندرونی کارروائیوں کے بعد صلح کانفرنس کا بھرا اجلاس طلب کیا گیا۔ مفتوح قوموں کے سوا باقی تمام قوموں کے نمائندے پیرس کے قریب ایک عالیشان محل میں جمع ہوئے۔ سب سے پہلے جرمنی کے نمائندے طلب ہوئے، ۷ مئی ۱۹۱۹ء کو یہ نمائندے کانفرنس میں اس طرح لائے گئے جیسے قیدی عدالت کے کٹہرے میں لائے جاتے ہیں جب وہ آگئے تو کلی مانسو فرانس، کھڑا ہوا اور اس نے اپنی تیز، مضبوط اور غضبناک آواز میں ایک مختصر مگر سخت خوفناک تقریر کی جس میں جنگ کا سارا الزام جرمنی پر ڈالا گیا۔ جب یہ تقریر ختم ہو چکی تو جرمن وفد کے لیڈر نے نرم مگر مضبوط لہجے میں جواباً کہا۔

"۱۱ نومبر کو التوائے جنگ کے عہدنامے پر دستخط ہو گئے تھے اور مخالفوں کو اپنی فتح و نصرت کا یقین ہو گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود ہمارا معاشی محاصرہ جاری رکھا گیا اور زندگی

کی لازمی ضروریات کو ہم تک پہنچنے سے برابر روکا جاتا رہا۔ اس لئے ٹھیک اس وقت جب کہ آپ لوگ ہماری سزا اور ہمارے جرم پر غور کرتے ہو، ان لاکھوں نہتے اور غیر فوجی انسانوں کا بھی تصور کرو جو صلح ہو جانے کے باوجود آپ کے معاشی محاصرے کی وجہ سے موت کے منہ میں دھکیلے گئے ہیں"۔

جرمن وفد کے لیڈر کی یہ تقریر گستاخانہ سمجھی گئی، اور اس کے جواب میں سفید جلد والی ایک ضخیم کتاب جس میں چار سو سے کچھ زیادہ دفعات تھیں اس کے ہاتھ میں دے دی گئی اور کہا گیا کہ یہ ہے معاہدۂ صلح۔ اسے دیکھو اور اس پر اپنی رضا مندی کے دستخط ثبت کرو۔ اور اس وقت یہ کسی نے نہ سوچا کہ آیا جرمن نمائندوں کے لئے چار سو صفحات کی اس ضخیم کتاب کو پڑھنے کے لئے کچھ مہلت بھی درکار ہے یا نہیں۔

ان حالات میں جرمن نمائندے کیا کر سکتے تھے۔ وہ خاموشی کے ساتھ چپ چاپ گردن جھکائے ہال سے باہر چلے گئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد سب فاتحوں نے مل کر اس عہد نامے کو پاس کر دیا۔

یہی عہد نامہ ہے جو عہد نامۂ ورسیلز کے نام سے مشہور ہے۔ ورسیلز دراصل پیرس کے سواد میں ایک چھوٹا سا خوبصورت مقام ہے جو شہر سے گیارہ میل فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں ایک نہایت عظیم الشان اور نہایت خوبصورت ایک محل ہے۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں جب جرمنی نے فرانس کو شکست دی تھی اور نپولین ثالث بھاگ کر انگلستان پہنچا تھا تو اسی محل میں قیصر ولیم کے جرمن شہنشاہ ہونے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس لئے ۴۸ سال بعد سنہ ۱۹۱۹ء میں اسی تاریخی مقام پر بیٹھ کر فرانس اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے کا کام سرانجام دیا۔

اس صلحنامے کی دفعہ ۲۳۱ میں جرمنی اور اس کے حلیفوں کو جنگ کا مجرم قرار دیا گیا اسی کے ساتھ ان تمام نقصانوں اور معاشی تباہیوں کا ذمے دار بھی جرمنی ہی کو قرار

دیا گیا ....

......۔ جو دوران جنگ میں اتحادیوں کو برداشت کرنی پڑیں۔ معاہدے کی دوسری دفعات کی رو سے جرمنی کی تمام نوآبادیاں چھین لی گئیں اور یورپ میں بھی اس کا بہت سا علاقہ کاٹ کر دوسری حکومتوں میں شامل کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں جرمنی کو ۲۷ ہزار دو سو پچاس مربع میل رقبے سے یورپ میں اور ۱۱ لاکھ ۲۸ ہزار مربع میل رقبے سے بیرونِ یورپ میں ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے علاوہ جنگ چھیڑنے کے نقصانات کی تلافی کے لئے مناسب رقم ادا کرنا بھی جرمنی پر لازم کیا گیا۔[1]

آسٹریا ہنگری کے ٹکڑے

جرمنی کا مسئلہ طے ہو جانے کے بعد آسٹریا ہنگری کی باری آئی۔ شاہی خاندان کو معزول کیا گیا اور شاہی کے بجائے جمہوریت نافذ کی گئی لیکن آسٹریا اور ہنگری کی حکومتیں الگ الگ کر دی گئیں۔ کچھ علاقے کاٹ کر دوسری حکومتوں کو دیئے گئے۔ آسٹریا نے ۱۱ ستمبر ۱۹۱۹ء کو صلحنامہ سینٹ جرمین پر دستخط کئے۔ اس عہد نامے کی رو سے آسٹریا کو پابند کیا گیا کہ اگرچہ اُس میں ۹۷ فیصدی جرمن بستے ہیں مگر وہ جرمن کے ساتھ کسی قسم کا اتحاد نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں ہنگری ...... سے صلحنامے ہوئے۔ ہنگری میں میگیار قوم بستی ہے۔ اس لئے صلحنامہ ٹرائی نان کی رو سے اس کی ایک مستقل آزاد حکومت بنایا جانا طے ہوا مگر علاقہ جاتی بانٹ کچھ اس طرح کی گئی کہ ایک تہائی میگیار قوم تقریباً ۳۳ لاکھ ہنگری کے باہر دوسری حکومتوں میں جا پڑی۔ اس کے علاوہ ہنگری کو پابند کیا گیا کہ وہ نہ تو آسٹریا سے کسی قسم کا ناطہ جوڑ سکتا ہے اور نہ ہیپس برگ کے شاہی خاندان کے کسی فرد کو واپس بلا کر تخت نشین کر سکتا ہے۔

---

[1] تاریخ صلح کانفرنس از ٹیمپرلی (Temperley)

ترکی کا خاتمہ ترکی کے ساتھ معاہدۂ سیورے مرتب ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے ایشیائے کوچک کے سوا باقی تمام علاقے سلطنتِ عثمانیہ سے علٰیحدہ کئے گئے۔ اور ایشائے کوچک کی تقسیم یوں کی گئی کہ شمال میں بحرِ اسود کا ساحلی علاقہ اتحادیوں کے ایک کمیشن کے سپرد کیا گیا، مغرب میں سمرنا اور سمرنا کے ارد گرد کا ایک وسیع رقبہ یونانیوں کو دینا طے ہوا اور جنوبی ساحل پر ادالیہ کے چاروں طرف کا زرخیز خطہ اٹلی کی حکمرانی میں دیا گیا قسطنطنیہ جو ترکی کا پایۂ تخت تھا اُسے چاروں طرف سے اتحادیوں کے زیرِ کمیشن علاقوں سے گھیر دیا گیا اور تھریس کا پورا رقبہ یونان میں شامل کر دیا گیا۔ اس کے بعد جو چٹیل میدان بچتا تھا اُسے سلطنتِ عثمانیہ کے حوالہ کیا گیا کہ بھیڑ بکریاں چراؤ اور زندگی کے دن کاٹو۔

بلادِ عرب کی تقسیم عرب کا مسئلہ یوں طے کیا گیا کہ عراق اور مصر برطانیہ کے زیرِ اثر شام فرانس کے زیرِ اثر، مگر فلسطین کا ٹکڑا شام سے کاٹ کر برطانیہ کے زیرِ اثر رکھا گیا اور اسے یہودیوں کا وطن بنانا طے ہوا۔ حجاز کی ساحلی پٹی پر "شریف حسین" کو "سلطان" بنایا گیا، وسطِ عرب میں نجد کا علاقہ بدستور ابنِ سعود کے قبضے میں رہنا تسلیم کیا گیا۔ اور عرب کے مشرقی ساحل پر عمان و کویت کے علاقے برطانیہ کے زیرِ اثر رکھے گئے۔

یورپ کا نیا نقشہ یورپ کی "قومی تقسیم" یوں کی گئی کہ مغربی ساحل پر روس کے جو صوبے تھے انھیں چار آزاد ریاستوں میں تقسیم کیا گیا: ایک فن لینڈ دوسری ایسٹونیا، تیسری لیٹویا اور چوتھی لتھوانیا۔ ان چاروں ریاستوں کے علاوہ بہت سا علاقہ روس سے اور کچھ علاقہ جرمنی سے لے کر پولینڈ کے نام سے ایک پانچویں آزاد حکومت قائم کی گئی۔ آسٹریا ہنگری کی سابق سلطنت کو دو ٹکڑوں میں منقسم کرنے کے علاوہ چون ہزار مربع میل کا ایک علاقہ اس سے علیحدہ کر کے چیکوسلوواکیہ کے نام سے ایک جداگانہ آزاد حکومت بنائی گئی ——— یہ چھ حکومتیں تو بالکل نئی قائم کی گئیں اور اگر ان میں آسٹریا اور ہنگری کو بھی شامل کر لیا جائے تو نئی حکومتوں

کی تعداد آٹھ ہوجاتی ہی۔ لیکن ان کے علاوہ رومانیہ کی سابق حکومت کو آسٹریا ہنگری، بلغاریہ اور روس کا اتنا علاقہ دیا گیا کہ اس کی وسعت پہلے سے دگنی ہو گئی۔ رومانیہ کے علاوہ سربیا کی سابق سلطنت کو بھی آسٹریا ہنگری کے کچھ صوبے دیئے گئے اور مانٹی نیگرو کی سابق حکومت بھی اس میں ضم کی گئی۔ اس طرح یوگوسلاویا کے نام سے ایک نئی ریاست قائم ہوگئی، اس کے علاوہ بلغاریہ کا کچھ علاقہ یونان کو بھی عطا کیا گیا۔

دو تین سال کی "محنت شاقہ" کے بعد دنیا کا یہ نقشہ تیار کیا گیا تھا یعنی التوائے جنگ کے بعد ۱۹۱۸ء سے لے کر ۲۱-۱۹۲۰ء تک ——— لیکن فاتح اقوام کا بنایا ہوا یہ نقشہ دنیا قبول نہ کرسکی اور ابھی صلحناموں کی سیاہی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس تقسیم کے خلاف غم و غصہ کا ہنگامہ برپا ہونے لگا۔

پریزیڈنٹ ولسن کو بھی جلد ہی اپنے چودہ نکات کی ناکامی کا احساس ہوگیا تھا تاہم شروع میں اس کا خیال تھا کہ رفتہ رفتہ حالات کی اصلاح ہوجائے گی۔ مگر آنے والے واقعات نے اُس کا یہ حسن ظن غلط ثابت کیا جس نے اُسے سیاسیات سے بہت برداشتہ خاطر بنا دیا اور آخر عمر میں تو وہ بہت ہی ملول و مخزدل نظر آنے لگا۔[1]

ان ہی حالات کی بنا پر ایک مشہور انگریزی مورخ ڈکنسن نے، جنگ کے محرکات و نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہی[2]:-

"سبحان اللہ! کیا دنیا میں جمہوریت کو محفوظ کیا گیا ہی۔ کیا حریت و آزادی کو فتح نصیب ہوئی ہی!! کیا انصاف کی جیت ہوئی ہی اور کیا کمزور قوتوں کے حقوق

[1] کولمبیا انسائیکلوپیڈیا

[2] انٹرنیشنل انارکی صفحہ ۴۹۲

کی حفاظت کی گئی ہے!!"

باب ۱۸

ترکی اور ترک

نومبر ۱۹۱۸ء میں ترکی نے مدروس میں التوائے جنگ کے جس عارضی صلحنامے پر دستخط کئے تھے، اس کی شرائط اگرچہ عارضی تھیں مگر پھر بھی ان کے آئینے میں ترکی کا تاریک مستقبل صاف نظر آرہا تھا۔ قسطنطنیہ جو اس وقت ترکی کا پایۂ تخت تھا، اتحادی فوجوں کے تسلط میں تھا اور سلطان ترکی کی حکومت محض برائے نام تھی۔ جنگ کے فاتحین جو احکام چاہتے تھے، سلطان سے جاری کرا رہے تھے اور ملک میں ہر طرف غربت و افلاس فاقہ کشی بے چینی اور ابتری و بدحالی کے بھوت ناچ رہے تھے۔ ترکی کے جو پبلک لیڈر یا فوجی افسر اتحادی فاتحین کی نظروں میں مشکوک تھے، وہ گرفتار کر کے محبوس کئے جا رہے تھے۔ ان ہی مشکوک افراد میں ایک فوجی افسر مصطفےٰ کمال بھی تھا۔ مصطفےٰ کمال نے جس کی شخصیت اس وقت ایک معمولی فوجی افسر سے زیادہ نہ تھی اپنی گرفتاری کے خطرے کو محسوس کر کے سلطان سے اجازت چاہی کہ مجھے مشرقی اناطولیہ (جو ایشیائے کوچک کی وسطی پہاڑیوں کے بیچ میں واقع ہے) بھیج دیا جائے تاکہ وہاں پہنچ کر ترکی افواج کی تھپائی

کھلوا سکوں اور انھیں مفتوح قوم کی حیثیت سے بے اسلحہ ہو جانے پر مجبور کر سکوں۔ سلطان نے اس درخواست کو منظور کر لیا اور مصطفےٰ کمال اناطولیہ چلا گیا، مگر یہاں پہنچ کر کمال نے ترک سپاہیوں کو ہتھیار کھولنے کی تلقین کرنے کے بجائے پوری گرمجوشی کے ساتھ اتحادیوں کا مقابلہ کرنے کی تلقین شروع کر دی۔ یہ خبر جب سلطان کو پہنچی تو بابِ عالی سے فوراً فرمان نافذ ہوا کہ واپس چلے آؤ۔ مگر اب مصطفےٰ کمال بابِ عالی کے فرمانوں کو ماننے والا نہ تھا۔ اب اس کے سامنے صرف ترک قوم کا فرمان تھا اور بس۔ اُس نے سلطان کے فرمان کے جواب میں کہلا بھیجا کہ "جب تک قوم آزاد نہیں ہو جائے گی میں اناطولیہ ہی میں رہوں گا۔"

مصطفےٰ کمال کے اس جواب کو اس وقت جس نے سُنا، ایک احمقانہ شیخی سمجھا۔ سارا ملک اتحادی فوجوں کے نرغے میں ہے، ترکی کے تمام صوبے باغی ہو چکے ہیں، ترکی کے حلیف بُری طرح ہار چکے ہیں، خود ترکی اپنی شکست کا اعتراف کر چکا ہے ــــــ ان حالات میں ایک معمولی فوجی افسر کی اس اولوالعزمی کو احمقانہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر اتحادی اس حماقت کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے سلطان کو مجبور کیا کہ اس سرکشی کی سرکوبی فوراً کی جائے۔ سلطان ڈرا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بہانے کو آڑ بنا کر اس کی رہی سہی سیادت و سروری بھی ختم ہو جائے اور اتحادی فوجیں اُسے معزول کر دیں، یا پورے ترکی پر براہِ راست اپنا قبضہ جما لیں۔ اس ڈر سے سلطان نے ایک عدالت قائم کر کے مصطفےٰ کمال، علی فواد پاشا، ڈاکٹر عدنان اور خالدہ ادیب خانم وغیرہ کے لئے سزائے موت کا حکم نافذ کیا اور ادھر شیخ الاسلام کے نام سے شریعت اسلامیہ کی تعبیر و تشریح کرنے والا جو اقتدار اعلیٰ تھا، اس نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ مصطفےٰ کمال کے سات ساتھیوں میں سے جن میں خالدہ ادیب خانم اور ڈاکٹر عدنان وغیرہ شامل تھے، ہر ایک کو قتل کرنا باعثِ ثواب ہے اور جو شخص بھی اس "کارِ خیر" کو انجام دے

گا، وہ بلاشبہ جنت الفردوس میں جگہ پانے کا مستحق ہوگا۔

لیکن ترک قوم پر نہ تو سلطان کے فرمان کا کوئی اثر ہوا اور نہ شیخ الاسلام صاحب کے فتوے کا ——— کیوں؟ اس کی وجہ معلوم کرنے کے لئے ترکی کی پچھلی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

خلافتِ عثمانیہ کا زمانہ عروج پندرھویں صدی کے آخر سے سترھویں صدی کے اوائل تک ترکی سلطنت کا آفتاب اقبال پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اسی زمانے میں سلیمانِ اعظم (از ۱۵۲۰ تا ۱۵۶۶ء) کی فرمانروائی میں ترکوں کا فاتحانہ سیلاب ریاست ہائے بلقان سے گذرتا ہوا آسٹریا کے پایۂ تخت ویانا تک پہنچا اور جرمنی کی سرحدوں کو عبور کرکے ہر طرف ایک تہلکہ برپا کر دیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے مصر بھی فتح ہو چکا تھا جس کے بعد ترک سلاطین کو "خادم الحرمین الشریفین" کا وہ لقب بھی مل چکا تھا، جو دنیائے اسلام کی اطاعت و وفاداری حاصل کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔ اب ترک سلاطین، سلاطین نہ تھے بلکہ خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین تھے اگرچہ یہ خلافت و امامت اپنی ظاہری و باطنی خصوصیات کے اعتبار سے امیر معاویہ کے نقشِ قدم پر چلنے والی تھی نہ کہ خلفائے راشدین کے اسوۂ حیات پر

تاہم سلطنت و کشورکشائی اور تدبر و دانائی کے لحاظ سے ترکوں کا نظم و نسق یورپ کی عیسائی حکومتوں سے اتنا بہتر تھا کہ یونان وغیرہ کے عیسائی باشندوں نے ترک فاتحوں کا استقبال بڑی گرمجوشی کے ساتھ کیا۔[۱]

سلطان سلیم اول کے زمانے تک جتنے سلاطین گزرے وہ سب کے سب اولوالعزم جری، بہادر اور جنگجو تھے جو نظم و نسق پر براہِ راست نگرانی رکھتے تھے اور کوئی چیز اُن

---

[۱] چیمبرس انسائکلوپیڈیا۔ جلد دہم صفحہ ۲۶۹

کی مرضی و منشاء کے خلاف نہ ہوتی تھی۔ وہ ایک طرف تو ایوانِ خاص و عام میں بیٹھ کر ملکی انتظامات کے لئے فرمان نافذ کرتے تھے اور وزراء و امراء کی رپورٹیں سنتے تھے اور دوسری طرف میدانِ جنگ میں بذاتِ خود فوجوں کی کمانڈ کرتے تھے۔ اس زمانے میں ان کی بود و باش بھی پُرشان و شوکت نہ ہوتی تھی اور عادات و خصائل یا لباس و غذا میں بھی عام انسانوں سے بہت زیادہ ممتاز نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ سلطان محمد ثانی جس نے سلطنت بزنطینیہ کے پرخچے اڑا کر قسطنطنیہ پر ترکی جھنڈا لہرا دیا تھا، اس کے متعلق مذکور ہے کہ ایک بار وہ اپنے وزیروں کے ساتھ بیٹھا گفتگو کر رہا تھا کہ ایک دیہاتی کچھ فریاد لے کر آیا۔ اوّل تو یہی کیا کم بات تھی کہ ایک دیہاتی کو یہ موقع حاصل تھا کہ وہ بادشاہ کے حضور میں بے تکلف پہنچ جائے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جب وہ اندر پہنچا تو سب کا لباس اور سب کی وضع قطع ایک سی دیکھ کر وہ یہ نہ پہچان سکا کہ ان میں کہ بادشاہ کون ہے۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ "آپ لوگوں میں بادشاہ کون ہے؟" یہ صورتِ حالات اگرچہ عہدِ سعادت و خلافت کے عین مطابق تھی، مگر امیر معاویہ کے بعد سے مسلمانوں میں شہنشاہی شان و شوکت کا جو مذاق پیدا ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے دیہاتی کا یہ سوال سلطان اور سلطان کے وزیروں دونوں کو آدابِ شاہی کے خلاف معلوم ہوا۔ چنانچہ اس کے بعد سے سلطان ایک ممتاز جگہ پر ممتاز انداز سے بیٹھ کر وزیروں سے بات چیت کرنے لگا۔[1] پھر رفتہ رفتہ شان و شوکت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بعد کے سلاطین کے درباروں تک گنوار تو کیا بڑے بڑے امراء و رؤسا کی رسائی تک دو بھر ہو گئی، اور رفتہ رفتہ آدابِ شاہی اور رعبِ سلطانی کے وہ تمام لوازم جو بادشاہوں کے لئے دنیا نے مخصوص کر رکھے ہیں، سب کے سب ان سلاطین کے محلات میں نظر آنے لگے

---

[1] ترکوں کی اسلامی خدمات (لیکچر) مطبوعہ انجمن ترقی اردو

عیش پسندی و آرام طلبی

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمانِ اعظم (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) کے بعد جو سلاطین تخت پر بیٹھے وہ محض محل کی شان و شوکت کی نذر ہو کر رہ گئے اور فوجی مہمات میں شریک ہونے اور امن و جنگ کے مسائل پر براہِ راست نگرانی رکھنے کے بجائے تمام معاملات میں وزیروں، امیروں، جلیسوں اور ندیموں کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ ان کی ساری زندگی خواجہ سراؤں اور دوسرے غیر ذمہ دار جلیسوں کی صحبت میں گذرتی تھی۔ اس لئے ان میں سلطنت کا بارِ گراں اٹھانے کی اہلیت مطلق باقی نہ رہی تھی سلاطین خائن عہدیداروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں تھے۔

عوام کی بے چینی اور بیداری

انیسویں صدی کے اوائل میں سلطان محمود ثانی جب تخت نشین ہوا تو صورت حالات بہت انحطاط پذیر ہو چکی تھی۔ اس نے اصلاح کی کوشش کرنی چاہی، مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ ہر طرف سے بغاوت و سرکشی کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، فوجی افسروں اور سپاہیوں میں جنگِ یانو کی شکست کے بعد سے بد دلی و شکست خوردگی کی ذہنیت پیدا ہو چکی تھی، ڈسپن اور ضبط و نظم کی بندشیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں۔ نظم و نسق کی حالت بد تر تھی، رعایا مفلوک الحال، فوج سرکش، عہدیدار رشوت خوار اور صوبے باغی تھے۔ ان حالات میں اصلاح کا کام سخت دشوار تھا۔ پھر انقلابِ فرانس نے ملک میں ایک نئی لہر دوڑا رکھی تھی، آزادی اور مساوات کے خیالات کا چرچا ہونے لگا تھا اور سلطان کی مطلق العنانی کے خلاف آوازیں اُٹھنے لگی تھیں۔ ان حالات میں سلطان نے یہ مناسب سمجھا کہ ایک طرف تو "جاں نثاری"[1] کے نام سے جو باغی فوج تھی

[1] "جاں نثاری" دراصل اس فوج کا نام تھا جس کی بنیاد چودھویں عیسوی کے اوائل میں ڈالی گئی تھی اس کی ہیئت ترکیبی یہ تھی کہ ہر سال کچھ نوجوان لڑکے ان کے سرپرستوں سے مطلقاً لے لئے جاتے تھے اور پھر شاہی اہتمام میں فوجی طریقے سے ان کی تربیت کی جاتی تھی۔ یہ لوگ "جاں نثاری" کہلاتے تھے اور ہر لحاظ سے سلطان پر انحصار رکھتے تھے رفتہ رفتہ اس فوج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گئی۔ [illegible]

اُسے نیست ونابود کیا جائے، اور دوسری طرف عوام کو کچھ حقوق دیئے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء میں "جاں نثاری" قتل کئے گئے اور اس کے بعد ایک فرمان اصلاحات جاری ہوا۔ جو "فرمانِ گل خانہ" کے نام مشہور ہوا۔ اس فرمان میں عوام کے مساوی حقوق کا اعلان کیا گیا اور ملک کی حالت درست کرنے کے لئے ابتدائی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ مگر عوام جاہل تھے وہ ابھی تک توہمات کی سطح سے اوپر نہ اُٹھے تھے۔ نیم جاہل ملّاؤں اور خودغرض واعظوں نے اسلام کی نرالی تصویریں ان کے سامنے پیش کر رکھی تھیں، اس لئے یہ اصلاحات ان کی سمجھ میں نہ آئیں، بلکہ اس تبدیلی کو انہوں نے شک وشبہ کی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ یہ سمجھے کہ شاید اس طرح انھیں مذہب سے بیگانہ بنایا جا رہا ہے اور یورپ کے عیسائیوں کی تقلید کی جا رہی ہے۔ چنانچہ جب رشید پاشا نے تعلیم عام کا کام شروع کیا تو ان کا خیر مقدم کرنے کے بجائے انھیں قتل کی دھمکیاں دی گئیں پھر چونکہ رشید پاشا داڑھی منڈاتے تھے اور یورپ میں عرصے تک رہے تھے، اس لئے

(بقیہ ۲۹۷) زمانہ امن میں ان کو باقاعدہ تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ صرف جنگ کے وقت ملتی تھی۔ البتہ شاہی طور سے ان کے بہت سے حقوق ایسے تھے جو امن کے زمانہ میں ان کی گذر اوقات میں کافی مدد دیتے تھے۔ چودھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے اوائل تک ترکی کی فوج انہی جاں نثاریوں پر مشتمل تھی۔ ان کے علاوہ کوئی باقاعدہ منظم فوج نہ تھی۔ اس چیز نے قدرتاً ان کے حوصلے بیحد بڑھا دیئے اور یہ خود کو سلطنت کا مالک سمجھنے لگے۔ اور آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ سلطان بھی ان سے ڈرنے لگے یہ حالت دیکھ کر سلطان محمد ثانی نے ایک باقاعدہ منظم فوج بھرتی کرنے کے احکام نافذ کئے۔ یہ چیز جاں نثاریوں کو بہت ناگوار ہوئی اور اب انہوں نے کھل کر بغاوت کر دی۔ سلطان نے بھی اُن کے خلاف "جہاد" کا اعلان کیا اور آخر کئی مہینے کی قتل و غارتگری کے بعد ان کا قلع قمع ہو گیا (بزمی)

سلطنت عثمانیہ کے عوام قدرتاً ان سے مشتبہ تھے۔ جب اسکولوں میں طالب علموں کو جغرافیے کی تعلیم کے سلسلہ میں نقشہ کشی سکھائی گئی تو شور اٹھا کہ رشید پاشا بچوں کو تصویر بنانا سکھا رہا ہے جو اسلام میں حرام ہے۔ اسی زمانہ میں یہ کوشش بھی کی گئی کہ نوجوانوں کو یورپ بھیجا جائے تاکہ وہ جدید فنونِ حرب سے واقف ہو کر آئیں مگر کوئی شریف ترک یا عرب اس کے لئے تیار نہ ہوا کہا گیا کہ ہم اپنے بچوں کو کافر بنانے کے لئے یورپ نہیں بھیجتے۔[۱]

تاہم اصلاحات کا یہ اثر ضرور ہوا کہ ملک میں اخبارات جاری ہوئے جن کی وجہ سے پرانی مقفیٰ و مسجع یا ادق عبارت کے بجائے عام فہم زبان مقبول ہونا شروع ہوئی اور سیاسیات میں دلچسپی لینے کا ایک عام ذوق پیدا ہونے لگا۔ لیکن چونکہ تعلیم عام نہ تھی اور ۹۵ فی صدی سے زیادہ لوگ جاہل تھے اس لئے انقلابِ فرانس کے خیالات نے عوام میں ایک عجیب انتشار پیدا کر دیا۔ پھر قومیت کے نام سے ہر صوبے میں بغاوت پھیلنے لگی۔ چنانچہ ۱۸۳۰ء میں سربیا نے ترکی اقتدار کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے علیحدگی اختیار کی۔ پھر رومانیہ نے اس کی تقلید کی، پھر یونان نے، پھر بلغاریہ نے۔ ادھر مصر بھی قومی آزادی کے جذبات پرورش پانے لگے۔ اور آہستہ آہستہ یہ آگ عرب میں بھی پھیلنے لگی۔

استبداد کا نیا دور

ان حالات میں سلطان عبدالحمید (از ۱۸۷۶ تا ۱۹۰۹ء) تخت نشین ہوا اس نے شروع میں اصلاحات دینا چاہیں مگر دوسرے ہی سال جب روس سے جنگ چھڑ گئی تو اس کا خیال بدل گیا، اب ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح تمام اندرونی تحریکات کو دبانے کے لئے سخت کارروائیاں شروع کی گئیں، نوجوان ترکوں کی اصلاحی تحریکوں اور جماعتوں کو سختی کے ساتھ دبایا گیا۔ نظامِ حکومت براہِ راست اپنے ہاتھ میں لیا گیا اور کامل مطلق العنانی کے ساتھ

[۱] ترکوں کی اسلامی خدمات (ترجمہ) مطبوعہ انجمن ترقی اردو

حکومت کا نظم و نسق چلانا شروع کیا گیا۔ بات یہ ہے کہ سلطان جانتا تھا کہ ترکی سلطنت میں ایک قوم یا ایک مذہب نہیں بستا، بلکہ یہ سلطنت مختلف عناصر کا مرکب ہے، اس لئے اگر یہاں قومیت و وطنیت کے جذبات کو پرورش پانے کا موقعہ دیا گیا تو پھر سلطنت کی خیر نہیں۔ اس لئے اس نے سلطنت ہی کو مرکز بنانے کی کوشش کی تاکہ سب عناصر اس ایک مرکز پر متحد ہو سکیں۔ پھر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سلطان عبدالحمید بہت باہمت اور باتدبیر انسان تھا اور جہاں تک خیرخواہی کا تعلق ہے اس کا نظریہ بالکل صحیح تھا، اس نے عدل و انصاف اور رحمت و شفقت کے ساتھ عوام پر حکومت کرنا چاہی تاکہ سلطنت و شہنشاہیت کے پرانے اصول کے مطابق رعایا کے تمام افراد بلا امتیاز مذہب و ملت، بادشاہ کو اپنا "روحانی باپ" سمجھیں اور سب اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں، مگر مساوات و حریت کے خیالات کے جس سیلاب کا بند انقلابِ فرانس نے توڑ دیا تھا، اب وہ اس قسم کے پشتے باندھنے سے رکنے والا نہ تھا، دوسرے یورپ کی قومیں سلطنتِ عثمانیہ کے یورپی صوبوں کے عیسائی باشندوں کو خفیہ و اعلانیہ طور پر اکسا رہی تھیں اور ادھر روس کا شہنشاہ، ترکی کی عیسائی رعایا کی حمایت کے بہانے ترکی صوبوں کو نگلتا جا رہا تھا۔

سلطان عبدالحمید کی مشکلات روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ محل کی حالت اور ترک افسروں کا طرزِ عمل چونکہ شاہانہ تھا اس لئے جہاں ایک طرف یورپ کی تعلیم پائی ہوئی نوجوان دستوریت و جمہوریت کے نام سے اس کے خلاف صف آرا تھا، وہاں دوسری طرف راسخ العقیدہ مسلمانوں میں بھی سلطان کے طرزِ حکومت کو اسلام کے خلاف کہنے والے پیدا ہو گئے تھے۔ سلطان نے بہت کوشش کی کہ مسلمان اس کے روحانی اقتدار کو خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے محسوس کریں مگر اس کے باوجود عرب میں وہابیت کے نام سے اور سوڈان میں مہدیت کے نام سے حقیقی اسلامی پاکیزگی کو واپس لانے اور سلطانِ ترکی اور سلطانِ ترکی کے مقرر کئے ہوئے افسروں اور حاکموں کے غلبۂ اسلامی

طرزِ عمل کا مقابلہ کرنے کے لئے دو زبردست تحریکیں اٹھیں۔ پھر یہ صحیح ہے کہ ان کو آہنی ہاتھ سے دبا دیا گیا، مگر اس سے وہ جذبۂ بغاوت نہ دب سکا جو عوام میں پیدا ہو گیا تھا ترکی افسروں اور امیروں میں، یورپ کی معاشرت آہستہ آہستہ گھر کر رہی تھی جو عوام کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ دوسرے اقتصاد و معیشت کے تمام ذرائع و وسائل پر یورپی سرمایہ دار چھاتے جا رہے تھے جس کی وجہ سے عوام پر فقر و افلاس کی کالی گھٹا بری طرح منڈلا رہی تھی اور زمانہ شناس انسان کو وہ وقت قریب نظر آ رہا تھا جب یہ گھٹا ٹوٹ کر برس پڑے اور اس کے سیلاب میں سلطنت و شہنشاہیت کے ٹکڑے اُڑ جائیں۔

مختصر یہ کہ انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل تک ترکی میں تین قسم کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ ایک تو مذہب کی پاکیزگی کے نام پر قرآن و حدیث کی ہدایت کی روشنی میں، دوسری وطنیت و قومیت کے نام پر یورپ کے اثرات سے متاثر ہو کر اور تیسرے عیسائی رعایا کی تحریکِ آزادی۔ آخر الذکر تحریک کی امداد پر یورپ کی طاقتیں بھی تھیں اس لئے اُسے کامیابی ہو رہی تھی۔ مگر سلطنتِ عثمانیہ کو اس کا مقابلہ کرنے میں اپنی بے شمار نوجوانوں کا خون میدانِ جنگ میں قربان کرنا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر جنگِ عظیم تک ترکی کو مسلسل کئی خوفناک جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جنہوں نے سلطنت کو سخت نقصان پہنچایا۔ خصوصاً جنگِ بلقان و طرابلس (۱۹۱۲ء۔ ۱۹۱۳ء) نے تو معاشرت و معیشت کی جڑوں کو بہت بُری طرح کھوکھلا کر کے رکھ دیا اور تخت و حکومت کی شیرازہ بند طاقت بہت بڑی حد تک کمزور ہو کر رہ گئی۔

مذہبی تعلیمات کے احیائے جدید کی جو تحریک چل رہی تھی وہ بھی دراصل ترکی شہنشاہیت کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی جو مذہب کی روشنی میں بلند کی جا رہی تھی، ترکی شہنشاہیت میں وہ تمام معائب جمع ہو چکے تھے جو ایک کمزور و پراگندہ مطلق العنان شاہی میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ پھر چونکہ ترک فطرتاً سخت مزاج اور جنگجو واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے ترک

حکام کے طرزِ عمل سے عوام کو شکایت پیدا ہو جاتا کچھ تعجب خیز نہیں، انھیں شکایتوں نے مہدی سوڈانی اور وہابیت کی تحریکوں کو طاقت پہنچائی تھی لیکن یہ تحریکیں چونکہ زمانے کی نبض کو دیکھ کر اور حالات کا صحیح جائزہ لے کر نہیں چلائی گئی تھیں اس لئے انھیں تھوڑی سی کوشش سے دبا دیا گیا لیکن اس طرح صرف آواز دب سکی، جذبات نہ دب سکے سلطان عبدالحمید ثانی اس صورتِ حالات کو پوری طرح محسوس کرتا تھا، مگر حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ خود وہ بھی ان کو بدل ڈالنے پر قادر نہ تھا ——— تاہم اُس نے اپنی تخت نشینی کے بعد ہی اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ ترکی حکومت کے بچاؤ کی شکل اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ "خلیفۃ المسلمین" کی مذہبی و روحانی عظمت کا سکہ مسلم عوام پر بٹھایا جائے۔ چنانچہ جہاں اس نے اصلاحی تحریکات کو آہنی ہاتھ سے دبایا، وہاں دنیائے اسلام کو متاثر کرنے کے لئے بہت سی تدبیریں کیں۔ اُس نے اپنے منصبِ خلافت کی مقدس حیثیت پر زور دینا شروع کیا، قسطنطنیہ سے مدینہ تک ریل بنائی تاکہ حاجیوں کو آسانی ہو اور اسی قسم کی بہت سی کوششیں کیں۔ ان ہی کوششوں کے ذیل میں عالمگیر اتحادِ اسلامی (پان اسلام ازم)

جمال الدین افغانی

کے اس شہرۂ آفاق لیڈر کو بھی بلایا گیا جسے دنیا جمال الدین افغانی کے نام سے جانتی ہے جمال الدین افغانی انیسویں صدی کے نصف آخر میں دنیائے اسلام کی روحِ رواں بنے ہوئے تھے اور عالمگیر اخوتِ اسلامی کے نیم مردہ قالب میں جان ڈالنے کے لئے ساری دُنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ان کے پیام نے مسلم عوام کے دماغوں پر بالعموم اور مسلم نوجوانوں کے دماغ پر خاص طور سے بہت گہرا اثر کیا تھا۔ خصوصاً مصر میں ان کی آواز کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ چنانچہ مصری تحریکِ آزادی کے قائدِ اعظم سعد زاغلول پاشا اور مصری حریتِ خیال کے زعیمِ اکبر مفتی عبدہٗ اور اسی قسم کی بہت سی دوسری ممتاز مصری ہستیاں جمال الدین افغانی ہی کی فیضِ صحبت کی تربیت یافتہ ہیں۔ ترکی میں

بھی آپ کی مقبولیت کا یہی عالم تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ہر جگہ آپ کو رجعت پسند اُمراء پرست علماء سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا ترکی میں یہی صورت پیش آئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا، دوسری طرف سلطان ترکی سے کہا گیا کہ یہ شخص مطلق العنان شہنشاہیت کا مخالف اور جمہوریت کا حامی ہونے کی وجہ سے آپ کے غیر مسئول اقتدار کا بھی دشمن ہے۔ شیخ الاسلام (جو اس زمانہ میں محکمۂ دینیات کا سب سے بڑا سرکاری عہدہ تھا) خصوصیت سے جمال الدین افغانی سے بہت کھٹکنے لگا۔ جمال الدین کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر اُسے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ شیخ الاسلامی کا منصب ہی کسی دن اُس سے نہ چھین لیں۔ بہرحال آپ کے خلاف اتنا شور و شر بپا کیا گیا کہ آخر سلطان نے قسطنطنیہ سے آپکے اخراج کا حکم نافذ کر دیا۔[۵]

ترکی سے نکالے جانے کے بعد آپ مصر چلے آئے اور چند ہی دنوں میں مصر کی سیاسی تحریکات کا مرکز بن گئے۔ جامعہ ازہر کے علمی حلقوں میں تو ان کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ جس کی حد نہیں، یہ مقبولیت بڑھتے بڑھتے اتنی پھیلی کہ وزیر اعظم ریاض پاشا بھی اُن کے معتقدوں میں شامل ہو گئے۔

ڈبلیو۔ ایس۔ بلنٹ، جو مصر کی تحریک آزادی کا بہت بڑا حامی تھا اور جس نے لندن میں جمال الدین کو اپنا مہمان بنایا تھا اور جس کے قلم نے دُنیائے اسلام کی اس شخصیت پر بہت کچھ لکھا ہے، وہ آپ کی تعلیمات کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

پچھلے دو سو سال کے زمانے میں متعدد مسلمان گزرے ہیں جنہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے شریعت اسلامیہ پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے، اور اُن روایات و رسوم سے کنارہ کش ہو گئے ہیں جو قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں

---

[۵] جمال الدین افغانی: سعید یامر ۳۵

کا شعار تھیں۔ مصر اور ترکی میں ایسے بہت سے مصلح پیدا ہوئے جنہوں نے یورپ کو سامنے رکھ کر سیاسی تحریکات چلائیں۔ لیکن اس قسم کے مصلحوں کی تمام اصلاحات شاہی احکام یا علماء کے فتووں کی شکل میں اوپر سے نافذ کی جاتی تھیں اور عوام کو حکماً ان پر عمل کرانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن اس کی کوشش کبھی نہ کی گئی کہ عوام کے دل و دماغ پر ان اصلاحات کو نقش کیا جاتا اور انھیں سمجھایا جاتا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ قرآن و حدیث کے عین مطابق ہے اس کے برعکس اصلاحات کو اونچے طبقے کے سربرآوردہ افراد نے نافذ کیا اور عوام کو بے سوچے سمجھے ان پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اصلاحات نے عوام کے دلوں میں گھر نہ کیا۔ جمال الدین ایسا شخص ہے جس کی ذہانت و فطانت نے اس حقیقت کو محسوس کر کے عوام کی اصلاح کی کوشش کی اور عوام کو یہ سمجھایا کہ آج کل دنیا میں اسلام پر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ جمال الدین قرآن و حدیث کے زبردست عالم تھے۔ اس لئے انہوں نے دنیائے اسلام کو بتلایا کہ اگر اسلام کے مقصد و منشاء کو ٹھیک ٹھیک طور پر سمجھا جائے اور اگر شریعت اسلامیہ کے احکام اور سیاسی اصلاحات کے پروگرام کا مقابلہ و موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام ترقی کا مخالف نہیں ہے بلکہ اس کے دائرے میں رہ کر مسلمان اپنی زندگی میں زبردست تغیرات پیدا کر سکتے ہیں اور بمشکل کوئی اصلاح ایسی ہوگی جو اسلام کے منافی ہو۔[1]

جمال الدین افغانی کی تعلیمات کا لب لباب یہ تھا کہ دنیا کے تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں، نسل و نسب اور رنگ و قوم کا کوئی امتیاز ان کے اس رشتۂ اخوت و اتحاد کو نہیں توڑ سکتا، حکومت عوام کی ہونی چاہیئے، شہنشاہیت و آمریت اسلام کے منافی

---

[1] تفصیلات کے لئے دیکھیے حاضر العالم اسلامی از شکیب ارسلان جمال الدین افغانی از سعید پاشا مس اور مصری محکومیت کی تاریخ مبلنٹ History of the Occupation of Egypt

ہے، عوام کو سیاسیات سے بے تعلق نہ رہنا چاہیے بلکہ بے انصافیوں اور زیادتیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر ممکن جد وجہد کرنا چاہیے اور اس مقصد کے لئے نہ تو جیل کی کال کوٹھری سے ڈرنا چاہیے اور نہ پھانسی کے تختے سے، عزت واطمینان کی زندگی بلا تخصیص ہر انسان کا حق ہے اور دولت وثروت کی یہ تقسیم کہ چند افراد کے عیش وراحت پر عوام فاقہ کشی کی زندگی گزاریں اسلامی نقطۂ نظر سے سراسر غلط ہے۔

جمال الدین افغانی کے اس پیام نے دنیا کے مسلمانوں میں ایک زبردست ہلچل پیدا کردی۔ خصوصاً مصر میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات پیدا کرنے میں تو ان کا زبردست ہاتھ تھا۔ اسی طرح ایران میں مطلق العنان شاہی کے خلاف آپ نے زبردست فضا پیدا کی حتّٰی کہ ۱۸۹۶ء میں ایک ایرانی نوجوان مرزا رضا خاں نے شاہِ ایران کو قتل کردیا۔ قسطنطنیہ میں بھی ترکی یونیورسٹی کے صدر اعظم (چانسلر) خواجہ تحسین آفندی اور محکمۂ تعلیمات کے وزیر آپ کے گرویدہ ہوگئے۔

جمال الدین نسلاً افغانی تھے، مگر بعض مورخ آپ کو ایرانی ثابت کرنے کی کوشش کرتے کچھ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ ہندوستان آپ کی جائے پیدائش ہے۔ سنہ پیدائش ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۹ء) ہے۔ ابتدائی تعلیم ہندوستان میں پائی اور افغانستان میں عرصے تک وزارت کے عہدے پر مامور رہے جہاں حکومت میں آپ کا زبردست اثر واقتدار تھا۔ مگر مطلق العنان شاہی میں کسی اصلاح پسندی کی گنجائش کیسے ہوسکتی ہے خصوصاً جب کہ اصلاح پسندی میں عوام کے حقوق کا سوال بھی شامل ہو۔ اس لئے کچھ دنوں کے بعد آپ کو افغانستان چھوڑنا پڑا۔ قسطنطنیہ آئے۔ مگر یہاں سے بھی نکالے گئے۔ پھر مصر پہنچے۔ لیکن چند سال میں وہاں کی حکومت نے بھی اخراج کا حکم صادر کیا۔ ہندوستان آئے تو برطانیہ

نے کلکتہ میں نظر بند کر دیا۔ جب بلادِ اسلامیہ میں کہیں جگہ نہ رہی تو پیرس پہنچے اور وہاں سے عروۃ الوثقیٰ نام کا ایک اخبار نکالا جو تھوڑے ہی عرصے میں اتنا طاقتور ہو گیا کہ فرانس کی حکومت بھی اُسے ناپسند کرنے لگی۔ یہاں سے آپ لندن پہنچے۔ اور لندن سے اپنا کام جاری کیا۔ مگر یہ جگہ دنیائے اسلام سے دور تھی۔ اس لئے روس گئے اور وہاں کوشش کر کے زارِ روس سے قرآنی تعلیمات کی اشاعت کی اجازت حاصل کر لی۔ لیکن یہاں سے ایران کی بدتر حالت نظر آئی تو ایران چلے گئے۔ شاہِ ایران سے ملاقات کی بادشاہ نے بڑی آؤ بھگت کی لیکن جب ان کے خیالات کا علم ہوا اور عوام میں انھیں زبردست مقبولیت حاصل ہونے لگی اور ایران کے طول و عرض میں سیاسی بیداری کی لہر پیدا ہو گئی تو ان کی گرفتاری کا حکم جاری ہوا۔ کچھ روز کے بعد یہاں سے قسطنطنیہ پہنچے۔ اور یہی وہ وقت تھا جب سلطان عبدالحمید نے ان کی زبردست مقبولیت اور مقناطیسی شخصیت کا عالم دیکھ کر انھیں اپنی مصاحبت و ہم نشینی سے سرفراز کیا، لیکن سلطان جو کچھ چاہتا تھا۔ اس کی تکمیل کسی ایسے انسان سے ممکن نہ تھی جو جمال الدین افغانی کی قسم کے خیالات رکھتا ہو۔ جمال الدین عوام کے حامی تھے، لیکن سلطان شہنشاہیت کو بچانا چاہتا تھا کہ جمال کی مدد سے اپنی روحانی سلطنت و آمریت کا لوہا دنیائے اسلام سے منوالے، لیکن جمال الدین چاہتا تھا کہ مسلم عوام کی اہمیت و برتری کا سکہ سلطان پر بٹھا دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں سلطان کو یہ شبہ ہوا کہ ترکی کی سیاسی تحریکات میں جمال الدین خفیہ طور سے شریک ہیں سلطان کے سامنے ایران کے شاہ ناصرالدین قاچار کے قتل کا واقعہ تازہ تھا جس کی نسبت عام طور سے یہ مشہور تھا کہ جمال الدین افغانی کا ہاتھ اس قتل میں ہے۔ سلطان نے سوچا کہ جس شخص کے اثر و رسوخ کا یہ عالم ہو کہ شاہِ ایران بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اُس سے شاہِ ترکی بھی کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ بہرحال سلطان کے ان اندیشوں اور وسوسوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمال الدین افغانی قسطنطنیہ میں نظر بند کر دیئے گئے۔ بظاہر وہ کسی جیل خانے

ہیں نہ تھے۔ لیکن ان کی نقل وحرکت پر پولیس کی کڑی نگرانی تھی اور وہ قسطنطنیہ سے باہر نہ جا سکتے تھے۔ اب چونکہ عمر ساٹھ کے قریب پہنچ چکی تھی اور مسلسل جد وجہد کی طویل زندگی نے قوی میں ضعف واختلال بھی پیدا کر دیا تھا اس لیے قید خانے میں مرض سرطان کا شکار ہوئے اور چند دن بعد ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گئے۔ لیکن چونکہ سلطان کے معتوب تھے اس لئے عام مقبولیت وہر دلعزیزی کے باوجود جنازے میں شریک ہونے والوں کی تعداد چند نفوس سے زیادہ نہ تھی[1]۔ ایک کچی قبر میں دفن کر دیئے گئے جو چند سال میں برابر ہوگئی۔ مگر جنگ عظیم کے بعد "جمہوریہ ترکی" میں اس کے نشانات کا کھوج نکالا گیا اور ۱۹۲۰ء میں اس پر سنگ مرمر کا ایک خوبصورت مقبرہ بنوا دیا گیا لیکن تاریخ عالم کی یہ ستم ظریفی بھی کتنی عجیب ہے کہ یہ مقبرہ بنانے والا نہ کوئی ترک تھا، نہ عرب نہ ایرانی نہ افغانی، بلکہ دنیائے اسلام سے ہزاروں میل دور امریکہ کی سرزمین کا باشندہ کرین نامی ایک امریکن تھا جس نے محض دور سے افغانی کا نام سن رکھا تھا۔ اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اتنا عجیب ہے کہ خود ترک بھی اس سے شرمندہ ہوئے بغیر نہ رہے، چنانچہ اس زمانہ میں ترکی اخبارات نے اس پر جو لکھا تھا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"جمال الدین افغانی اور ایک امریکن میں کس قدر فاصلہ ہے، دین کا فاصلہ، زبان کا فاصلہ حیات کا فاصلہ، محیط وماحول اور ان کے بے پایاں تاثرات کا فاصلہ، ان میں سے ہر ایک ایک لمبی منزل ہے جو مسٹر کرین کو جمال الدین سے دور رکھتی ہے، مگر مسٹر کرین نے ان سب مسافتوں کو طے کیا، اور جس محترم کو ہم سب بھول گئے تھے اس کا مزار بنوایا[2]۔"

لیکن امریکن سیاح کے ہاتھوں اس مزار کے پختہ بنوائے جانے سے زیادہ حسرتناک چیز یہ ہے کہ اکثر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی موت طبعی نہیں تھی بلکہ سلطان ترکی نے زہر دے کر مروا ڈالا تھا[3]۔

---

[1] بعض وقائع نگاروں کا بیان یہ بھی ہے کہ جنازہ بہت شان وشکوہ سے اٹھایا گیا لیکن یہ بیان زیادہ قرین قیاس نہیں۔ "بزمی"

[2] آثار جمال الدین افغانی از قاضی عبد الغفار صفحہ ۲۹۵

[3] آثار جمال الدین افغانی از قاضی عبد الغفار صفحہ ۲۹۵

خلافتِ اسلامیہ کے پایۂ تخت میں خلیفۃ المسلمین کے زیر سایہ زندگی کی متاعِ عزیز کی قربانی دینے والی اس ہستی نے جو اسلامی تعلیمات کو حیات تازہ دینا چاہتی تھی، نظر بندی کے گھٹے ہوئے ماحول سے اپنے ایک ایرانی دوست کو جو آخری خط لکھا تھا اس کے الفاظ یہ تھے:۔

اپنے ایک مخلص کے ہاتھ یہ خط بھجوا رہا ہوں۔ جیل میں ہوں اور دوستوں کے دیدار سے محروم ہوں۔ اب نہ مجھے رہائی کی تمنا ہو نہ زندگی کی آس، نہ قید پر رنجیدہ ہوں اور نہ قتل کر دئے جانے کا اندیشہ ہی مجھے ستاتا ہو۔ جس الزام میں قید کیا گیا ہوں اس پر خوش ہوں اور اگر اسی الزام میں میرا خون بھی بہا دیا جائے تو اور زیادہ خوش ہوں گا۔ میری جان دنیائے انسانیت کی خدمت کے لئے ہو۔ اور میرا خون ملت کی آزادی پر قربان ہو جانے کے لئے۔ البتہ یہ غم ضرور ہو کہ جو آرزو دل میں رکھتا تھا، اُسے پوری طرح نہ پا سکا افسوس کہ بلادِ مشرق کا گلا جہالت نے اتنا گھونٹ رکھا ہو کہ آزادی کی آواز اس سے نہ سُن سکا کاش میں اپنے افکار کے یہ بیج کسی فرض شناس قوم کے دل و دماغ میں بو سکتا لیکن وائے بدنصیبی کہ مجھے شہنشاہیت و سلطنت کی بنجر زمین سے واسطہ پڑا۔[۵۲]

لیکن دنیائے اسلام کی اس حیرتناک شخصیت کو اپنی زندگی میں اگرچہ خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی مگر مرنے کے بعد اس کے پیغام کی گونج مشرق سے مغرب تک مسلمانوں کے دل میں پیدا ہونے لگی، حتےٰ کہ افغانستان نے اپنے وطن کے اس بین الاقوامی ہیرو کی آخری آرام گاہ کا ترکی میں ہونا گوارا نہ کیا اور ۱۹۴۵ء میں اس کے پورے مزار کو کھود کر ترکی سے افغانستان میں بڑے تزک و احتشام سے منتقل کر دیا گیا، جہاں یہ زیارت گاہ خلائق بنا ہوا ہو۔

ترکوں میں قوم پرستی کے جذبات کا زور

غرض سلطان عبد الحمید کی یہ کوشش کہ دنیائے اسلام میں

---

[۵۲] دیکھو مصری محکومیت کی تاریخ از ڈبلیو۔ ایس بلنٹ۔ و آثار سید جمال الدین از مرزا لطف اللہ ایرانی۔

اس کی خلافت کی عظمت و تقدیس خلفائے راشدین کی طرح ہو سکی، کامیاب نہ ہوئی اور اس کے لئے قدرتاً ہر جگہ قومیت و وطنیت کی تحریکیں زور پکڑنے لگیں ——— پھر چونکہ عربوں اور ترکوں میں صرف نسلی اختلاف ہی نہیں بلکہ وہ معاشرت کے اعتبار سے بھی عربوں سے مختلف ہیں۔ اس لئے ایک طرف تو عرب ترکوں کو ننگ اسلام سمجھنے لگے اور دوسری طرف ترکوں میں عربوں سے علیحدہ ہو کر اپنی قومی ترقی کرنے کا جذبہ شدت سے ابھرنے لگا۔ چنانچہ نامق کمال، ضیا الکمال نوری اور رفعت اور عبدالحق حامد جیسے ادیبوں نے ترکوں کی ان جذبات کی ترجمانی کی اور قومی و وطنی جذبات کی نشو و نما ہونے لگی۔

مدحت پاشا

ترکی کی تحریک قومیت و حب الوطنی کے بانی اول اور ملہم اعلیٰ مدحت پاشا تھے یہ اوائل عمر میں بڑے بڑے عہدوں پر فائض رہے لیکن قوم و وطن کی جو آگ دل میں سلگ رہی تھی اس نے چین سے نہ بیٹھنے دیا اور آخر ملازمت سے مستعفی ہو کر سیاست کے میدان میں آ گئے۔ اپنی جماعت کو منظم کیا اور شیخ الاسلام کو اپنا ہمنوا بنا کر پہلے سلطان عبدالعزیز کو معزول کرایا اور پھر سلطان عبدالحمید کو تخت پر بٹھا کر اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ عبدالحمید نے مدحت پاشا اور اس کی جماعت کی طاقت کو محسوس کیا اور مدحت کو اپنا وزیر اعظم بنا لیا اور کچھ اصلاحات بھی نافذ کیں۔ لیکن جب عوام کا زور بڑھتا ہوا دیکھا تو اُسے تشویش لاحق ہوئی اور آخر مدحت پاشا کے خلاف حکومت کے خلاف سازش کرنے کا الزام عائد کر کے جلا وطن کر دیا گیا اور اسی کے ساتھ آئینی اصلاحات کو بھی معطل کر دیا، لیکن ترک عوام میں مدحت پاشا کی مقبولیت اتنی زیادہ تھی کہ تھوڑے ہی دن بعد سلطان کو انھیں واپس بلوانا پڑا۔ اور اب انھیں قتل کرڈانے کی تجویز ہوئی۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری چنانچہ سلطان عبدالعزیز کے قتل کا الزام ان پر لگا کر سزائے موت دیدی گئی، مگر برطانوی قونصل جنرل سے مدحت کے تعلقات بہت اچھے تھے، اس لئے سلطان نے اس کے کہنے سُننے سے سزائے موت کو دائمی نظر بندی میں تبدیل کر دیا۔ اور عرب میں نظر بند رہنے کا حکم نافذ

ہوا لیکن بعد میں سلطان کو یہ چیز بھی پسند نہ آئی اور مدحت کو اسی نظر بندی کی حالت میں قتل کرا دیا گیا۔

لیکن مدحت پاشا کے قتل نے محب وطن نوجوانوں کو ٹھنڈا کرنے کے بجائے اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ سلطان نے ان جذبات کو دبانے کی بہت کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی، آخر بہت سے سیاسی نسخوں کی ناکامی کے بعد مرض اتنا بڑھا کہ ۱۹۱۹ء میں سلطان موصوف کو تاج و تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور ان کی جگہ سلطان محمد خامس خلیفۃ المسلمین مقرر ہوئے۔[۱]

لیکن اب ترک عوام کو مطلق العنان شہنشاہیت پر قانع رکھنا بہت مشکل تھا، وطن پرستی کے سوئے ہوئے جذبات زبردست جوش و خروش کے ساتھ جاگ اٹھے تھے۔ ترکی کی تباہی پر جو آنکھیں عرصے سے رو رہی تھیں اب اُن کو اس کا حل صرف ترکی قومیت کی شیرازہ بندی کرنے میں نظر آنے لگا تھا۔ اب تک ترک خود کو صرف مسلمان کہتے تھے اور صرف مسلمان ہونے ہی پر فخر کرتے تھے، ترک کا لفظ حقیر سمجھا جاتا تھا اور خود کو ترک کہنا کوئی فخر کی بات نہ تھی۔ مگر اب ترک کہنا اور "تورانی" نسل سے تعلق رکھنا فخر کی بات سمجھی جانے لگی، اور قدیم نسلی و قومی تاریخ کے گڑے مردے اُکھاڑ کر ان پر قومی عزت و شان کی عمارت کھڑی کی جانے لگی، ترکی کے ایک مشہور قومی شاعر محمد امین کا یہ مصرعہ ترکوں کے زبان زد ہو گیا کہ

"میں ترک ہوں۔ میرا دین اور میری نسل اعلیٰ ہے"[۲]

---

[۱] دیکھو (۱) فاؤنڈیشن آف آٹومن ایمپائر" از گبن (۲) "ٹرکش ایمپائر" از لارڈ ایورسلی (۳) "ٹرکی" از

ترکوں کی قوم پرستی کا ردِ عمل بلادِ عرب پر

ترک قومیت کے ان جذبات کی ترجمان اتحاد و ترقی کے نام سے ایک انجمن تھی جو روز بروز زبردست طاقت پکڑتی جا رہی تھی، یورپ کی قوموں نے یہ صورتِ حالات دیکھی تو انھیں سخت خطرہ لاحق ہوا، انجمن اتحاد و ترقی کے لیڈر قومیت کے علمبردار ضرور تھے مگر اسی کے ساتھ وہ اسلام کی عالمگیر برادری پر بھی زبردست زور دیتے تھے، جس کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر یہ تحریک کامیابی کے ساتھ چلتی رہی تو سلطنت عثمانیہ کے تحت جو مسلمان بستے ہیں ان میں ایک زبردست اتحاد پیدا ہو جائے گا۔ اس اندیشے کی بنار پر عربوں میں ترکوں کے جذبۂ قومیت کے خلاف نفرت پھیلانے کا کام یورپ کے معلموں نے شروع کیا، چنانچہ جیسے ہی انجمن اتحاد و ترقی کی کوششوں سے دوبارہ دستوری حکومت ملی، عربوں میں قومی آزادی حاصل کرنے کے جذبات بھڑک اٹھے، بغداد میں عراقی افسروں نے خفیہ انجمنیں بنانا شروع کیں، اسی قسم کی انجمنیں شام کی آزادی کے لئے دمشق میں بننا شروع ہوئیں۔ حجاز میں شریف اعظم جو اپنے "سید" ہونے کی وجہ سے خود کو مسلمانوں کی امارت و سرداری کا "قدرتی حقدار" سمجھتا تھا، اس نے بھی کروٹ بدلی اور اپنی سلطنت کے خواب دیکھنے لگا۔ ادھر وسطی عرب میں نجد کے نخلستان میں ابن سعود نے اسلام کی صحیح تعلیمات کو دوبارہ زندہ کرنے اور دنیا میں سعودی حکومت کا سکہ قائم کرنے کے منصوبے باندھنا شروع کئے

سلطنت عثمانیہ کے خلاف مختلف عناصر کا یہ زور و شور روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور یہی وہ حالات تھے جن سے مجبور ہو کر ترکی سلطان نے سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں جرمنوں سے مل کر برطانیہ فرانس اور روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس وقت عوام میں جو ابتری اور انتشار پھیلا ہوا تھا، اس کے پیش نظر انجمن اتحاد و ترقی اور سلطان وقت دونوں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ جنگ سلطنت کے مختلف مسلم عناصر کو متحد کرنے والی ثابت ہو سکے

گی۔ انہوں نے خیال کیا کہ اس جنگ کی وجہ سے ایک طرف تو سب مسلمان جہاد کے نام پر عثمانی جھنڈے کے نیچے جمع کئے جا سکیں گے اور دوسری طرف جرمنی کے حلیف جنگ ہونے کی وجہ سے جرمنی کی مدد سے ترکی فوج کو جدید آلات حرب سے آراستہ کرنے کا موقع حاصل ہو سکے گا ——— جہاں تک دوسری توقع کا تعلق تھا۔ ترکی کو بہت بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ لیکن پہلی توقع میں انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ عراق میں عربوں نے ہندوستان کی انگریزی فوج کے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ نہ کیا اور بڑی آسانی سے ہتھیار ڈال دیئے۔ شام میں بھی عرب ترکوں سے باغی ہو گئے اور انہوں نے ترکوں کی مدد کرنے کے بجائے اور الٹی برطانیہ کی حمایت شروع کر دی۔ نجد میں ابن سعود برطانیہ کی حوصلہ افزائی سے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ مکہ معظمہ میں شریف حسین نے قاہرہ کے برطانوی ہائی کمشنر سے یہ عہد و پیمان کیا کہ اگر برطانیہ اُسے بلادِ عرب کی سلطانی دلا دے تو وہ عرب قبائل کو ترکوں کے خلاف آمادۂ جنگ کرنے میں اتحادیوں کی مدد کرے گا۔

ابتدا میں شریف حسین کی یہ پیشکش برطانوی سپہ سالاروں کو کچھ زیادہ دلکش نہ معلوم ہوئی، ان کا خیال تھا کہ وہ درِ دانیال کے راستے سے قسطنطنیہ پر براہِ راست حملہ کر کے ترکی حکومت کو تہ و بالا کر سکتے ہیں۔ لیکن ۱۹۱۵ء میں پورے سال بھر تک ترکی فوجوں نے بڑی بہادری اور انتہائی بے جگری سے جزیرہ نمائے گیلی پولی کو دشمن کے ہاتھ میں جانے سے بچائے رکھا، آخر میں ترکی فوج کی کمانڈ مصطفےٰ کمال کو دی گئی جس نے ایک فیصلہ کن جنگ میں انگریزی فوج کے حوصلے پست کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گیلی پولی میں شکست کھانے کے بعد درِ دانیال کی راہ سے براہِ راست قسطنطنیہ پر دھاوا بولنے کا منصوبہ خاک میں مل گیا اور مجبوراً اتحادیوں نے شریف حسین سے ساز باز کر کے عرب و عراق کی راہ سے ترکوں پر یلغار بولنے کا پروگرام بنایا

کرنل لارنس شریف حسین نے پہلے ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا، اس بغاوت کا مقابلہ کرنے کے لئے ترکی فوج نے مدینہ پر تسلط جما رکھا تھا۔ مگر عربوں میں یہ افواہ بڑے زور شور سے پھیلائی گئی کہ مدینہ کی ان ترک فوجوں نے مکہ معظمہ پر بم باری کی ہے۔ اس بم باری کی خبر نے قدرتاً عرب کے تمام قبائل میں غم و غصّے کی لہر دوڑا دی اور سب کے سب متحد ہو کر ترکوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ عربوں کی رہنمائی اس وقت شریف حسین کے لڑکے فیصل اور اس مشہور و معروف انگریز کے ہاتھ میں تھی جو کرنل لارنس کے نام سے مشہور ہے اور جو اگرچہ نسلاً انگریز اور مذہباً عیسائی تھا مگر عرب میں سالہا سال رہنے کی وجہ سے عربی زبان، عربی معاشرت اور عربی رسم و رواج سے اتنا واقف تھا کہ سارا عرب اُسے عرب سمجھتا تھا۔ شریف حسین کو اس کا انگریز ہونا معلوم تھا، مگر چونکہ اس وقت شریف کا دماغ بلادِ عرب کی شہنشاہی کے خواب دیکھ رہا تھا، اس لئے اس نے عرب عوام سے اس راز کو چھپایا اور لارنس کو اپنا بیٹا مشہور کیا۔ لارنس عربوں میں ابن حسین کے نام سے مشہور تھا، وہ عربوں کی مجلسوں میں عربی لباس پہن کر شریک ہوتا تھا۔ انھیں اسلام کی گذشتہ تاریخ کی روائتیں سُنا سُنا کر ترکوں کے خلاف بھڑکاتا تھا اور ان میں گھلا ملا رہتا تھا۔[۱]

غرض عربوں کی مدد سے انگریزی فوج حجاز کے شمال سے شام کو طے کرتی ہوئی ترکی کی سرحد تک پہنچ گئی اور اس طرح چاروں طرف سے گھر کر بالآخر نومبر ۱۹۱۸ء میں ترکوں نے مدروس میں التوائے جنگ کے عارضی صلحنامے پر دستخط کر دیئے۔ اس صلحنامے کی رو سے ترکوں نے یہ اعلان کیا کہ مصر اور بلادِ عرب کی حکومت سے وہ دستبردار ہوتے ہیں۔

یہ تھے وہ حالات جب مصطفےٰ کمال سلطان کی اجازت لے کر اناطولیہ آیا۔ لیکن یہاں

---

[۱] "وِدھ لارنس ان اریبیا" از Lowell Thomas (لارنس کے ساتھ عرب میں) مطبوعہ امریکہ

آکر اس نے امیر المومنین اور شیخ اسلام دونوں کے فرمانوں کی اطاعت کرنے سے انکار کردیا ترک دیکھ رہے تھے کہ عثمانی خاندان کو جنگ عظیم نے بالکل برباد کردیا ہے اس لئے اب یہ خاندان ترکوں کی شیرازہ بندی نہیں کرسکتا۔ ادھر عربوں نے بغاوت کرکے ترکی کی دستار قتل کو تیار کرنے میں اتحادیوں کی بے دریغ امداد کی تھی، ان حالات میں اگر نجات کا کوئی راستہ رہ جاتا تھا تو وہ صرف ترکی قومیت کا راستہ تھا۔ اسلام کے جوش کو عربوں کی بغاوت نے ختم کردیا تھا۔ اس لئے اب آخری چارہ کار یہی رہ گیا تھا کہ ترکوں کو ترکی قومیت کے نام پر اُبھار کر عظمتِ رفتہ واپس لانے کی کوشش کی جائے۔[1]

غازی مصطفےٰ کمال

مصطفےٰ کمال یونان کے ایک شہر سالونیکا میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ ماں باپ معمولی حیثیت رکھتے تھے، مگر کمال کی ذہانت وفطانت اپنے گھر اور خاندان سے بہت بلند تھی اس کی ماں چاہتی تھی کہ کمال کو مذہبی تعلیم دلا کر ایک جید عالم بنائے، مگر کمال میں بچپن ہی سے فوجی اسپرٹ کام کررہی تھی، اس لئے اپنے بزرگوں کی رائے کے خلاف اس نے اپنے لئے فوجی زندگی کو پسند کیا اور فوجی اسکول میں داخل ہوگیا۔ یہاں اس کی ذہانت وصلاحیت کے جوہر کھلے، ایک طرف تو طالب علموں میں اسے غیر معمولی ہردلعزیزی حاصل ہوئی اور دوسری طرف استادوں پر بھی اس کی ذہانت وقابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ بالآخر ۱۹۰۵ء میں ایک معمولی سی فوجی افسری اس کو دی گئی۔ اس سال کے بعد سے ترکی نے جتنی جنگیں لڑیں۔ اُن سب میں مصطفےٰ کمال شریک رہا۔ جبل الدروز کی جنگ میں، بلغاریہ کی جنگ میں، اٹلی کے خلاف طرابلس کی جنگ میں، برطانیہ کے خلاف گیلی پولی میں، روس کے خلاف کاکیشیا میں اور پھر ۱۹۱۸ء

---

[1] دیکھو (۱) ری برتھ آف ٹرکی از پرائس (۲) ٹرکی یسٹرڈے، ٹوڈے اینڈ ٹو مارو از Waugh (۳) میمائرس آف جمال پاشا (۴) کمال اتاترک از محمد محمد توفیق مصری۔

میں شام کے محاذ پر ـــــــ اسی بنا پر فوجی حلقوں اور سپاہیوں میں مصطفےٰ کمال کی ہمت وجرأت اور اصابتِ رائے کی بڑی تعریف کی جاتی تھی اور اس کی پاک وصاف سیرت کو بہت زیادہ سراہا جاتا تھا۔ لیکن اگرچہ فوجی اعتبار سے کمال کو بہت زیادہ ہردلعزیزی حاصل تھی۔ مگر اس کی فطرت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی تھی کہ ترکی کے سیاسی مدبروں اور لیڈروں کی صف میں اُسے پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اس کی غیر ہردلعزیزی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انجمن اتحاد وترقی کی ہوائی اسکیموں اور ناقابل عمل خواہشوں سے نفرت وبیزاری کا اظہار کرنے میں مصطفےٰ کمال ہمیشہ انتہائی بیباکی سے کام لیتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مصطفےٰ کمال چونکہ ایک معمولی گھرانے کا چشم وچراغ تھا۔ اس لئے آداب وشائستگی کے اعلیٰ معیار سے وہ نابلد تھا۔ اس کے مزاج میں وہ تصنع وریاکاری نہ تھی جو تہذیب کا مایۂ کمال سمجھی جاتی ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا صاف صاف کہتا تھا، ہیر پھیر کا بناوٹی انداز اُسے نہ آتا تھا، اس لئے اس کے آداب واطوار میں امرار ورؤسار کو گنوارپن نظر آتا تھا۔ اور اس کے طرزِ عمل میں رعونت وخود بینی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اگرچہ کمال بہادری وشجاعت میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا اور سخت سے سخت جنگوں میں اس نے بےمثال کامیابیاں حاصل کی تھیں لیکن اس کے مزاج کی بدولت اس کی خدمات کا اعتراف ہمیشہ پیشانی پر شکن ڈال کر بادلِ ناخواستہ کیا جاتا تھا۔ اسی بنا پر کمال کو فوجی افسری کے علاوہ کبھی کوئی سیاسی خدمت نہ دی گئی۔ البتہ سلطان وحید الدین نے اس کی طاقت وہمت کا صحیح اندازہ کیا تھا اور بہ نسبت دوسروں کے وہ کمال سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں جب وہ ایک فوجی وفد لے کر جرمنی گیا تو کمال کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ گویا کمال کی سیاسی حیثیت کا پہلا اعتراف تھا جو کیا گیا۔ لیکن کمال کی فطرت میں جو بدھڑک پن تھا اور جس کی وجہ سے سیاسی حلقوں میں اُسے ناپسند کیا جاتا تھا وہ اپنا رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ چنانچہ اس وفد کے دورانِ قیام میں آپ نے ایک

تو جرمنی کے مشہور و معروف جنرل لڈن ڈراف سے ایسی گفتگو کی جو صاف طور سے اہانت آمیز تھی اور دوسرے ہنڈن برگ جیسی زبردست شخصیت کے ساتھ، جو اس وقت جرمنی کا معنوی شہنشاہ بنا ہوا تھا، آپ نے ایسا برتاؤ کیا گویا آپ اسکے سرپرست و ولی ہیں اور اس کی معلمی فرما رہے ہیں، لیکن جس چیز نے سلطان وحیدالدین کے دل میں کمال کی طرف سے سخت کھٹکا پیدا کر دیا وہ انجمن اتحاد و ترقی کی کھُلی مخالفت تھی۔ کمال بار بار سلطان کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اس انجمن کے خلاف کوئی موثر کاروائی کر کے اسے ختم کر دے، لیکن یہ انجمن اتنی طاقت پکڑ چکی تھی کہ اُسے ختم کرنے کی کوشش کرنے کے یہ معنی تھے کہ سلطان سلطنت ہی سے اپنی معزولی کا خطرہ مول لے لے

یہی وجہ ہے کہ جب نومبر ۱۹۱۸ء میں ترکی نے التوائے جنگ کے عارضی صلحنامے پر دستخط کئے، تو ملک میں مصطفےٰ کمال کا کوئی دوست نہ تھا۔ مزید براں اتحادیوں نے جن فوجی افسروں اور سیاسی لیڈروں کو مشکوک سمجھ کر گرفتار کرنا شروع کر رکھا تھا ان میں مصطفےٰ کمال کا نام بھی تھا۔ اس کا نام اتحادیوں کی "کالی فہرست" میں درج تھا اور اُسے مالٹا میں نظربند کیا جانا طے ہو چکا تھا

ان حالات میں مصطفےٰ کمال کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ جس قدر جلد ہو سکے قسطنطنیہ سے نکل جائے۔ چنانچہ وہ سلطان کی اجازت لے کر اناطولیہ کی ترک افواج کو نہتا کر دینے کے بہانے سے نکل کھڑا ہوا اور اناطولیہ پہنچ کر اس نے اتحادیوں کے خلاف ترک قوم کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

اناطولیہ ایک پتھریلا علاقہ ہے جس کے ہر طرف دشوار گذار پہاڑ کھڑے ہیں، اس لئے قدرتی طور پر یہ ایسا مقام تھا جہاں اتحادی اور سلطانی دونوں فوجوں سے مصطفےٰ کمال محفوظ تھا۔ سلطان نے کردوں کو اس کے خلاف اُکسایا، لیکن اس چیز نے ترکوں میں اور زیادہ اتحاد پیدا کر دیا۔ اس لئے کہ ترکوں میں قومی بلندی و برتری کا جو

احساس پیدا ہو چکا تھا، وہ اسے روانہ رکھ سکتا تھا کہ کرد جیسی "ذلیل و حقیر" قوم ترکوں کے منہ آئے۔

۱۱ رمئی ۱۹۱۹ء میں اتحادیوں کا بحری بیڑا امیر البحر کال تھروپ کی کمانڈ میں سمرنا میں داخل ہوا اور اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ جس کے نتیجے میں ہر طرف زبردست مار دھاڑ مچ گئی۔ اس مار دھاڑ کی دردناک تفصیلات جب ملک میں مشہور ہوئیں تو ترکوں میں اور زیادہ جوش پھیلا اور مصطفےٰ کمال کو اتحادیوں کے خلاف فوج اکٹھا کرنے کا ایک نہایت کامیاب حربہ ہاتھ آ گیا۔

ترکوں کا پہلا قومی اجتماع

غرض ترکوں کی بدحالی کی وجہ سے مصطفےٰ کمال کی آواز پر لبیک کہنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ جون ۱۹۱۹ء میں اناطولیہ کے پہاڑی علاقے کے ایک چھوٹے سے شہر ارض روم سے سینکڑوں ترک لیڈروں کے نام دعوت نامے جاری کئے گئے تاکہ وہ قومی مجلس میں آکر شریک ہوں اور آئندہ کے پروگرام پر غور و خوض کریں۔ یہ دعوت نامے اس وقت جاری ہوئے تھے جب قسطنطنیہ میں "سلطان السلطین" کی طرف سے مصطفےٰ کمال کی مخالفت میں فرمان پر فرمان نافذ کئے جا رہے تھے اور اتحادی فوجیں اُسے کچل ڈالنے کی ہر ممکن جد و جہد میں مصروف تھیں۔ مگر اس کے باوجود "قومی مجلس" کے دعوت ناموں پر ملک کے ہر ہر گوشے سے بھیس بدل بدل کر لوگ شریک ہوئے اور اس اجتماع میں سب نے متفقہ طور پر مصطفےٰ کمال کو اپنا صدر منتخب کیا۔ اس کے تین چار مہینے بعد ستمبر میں دوسرا اجتماع سواس (Siuas) میں منعقد ہوا جس میں ترک عوام کی طرف سے عملی کارروائیاں کرنے کے لئے ایک انتظامیہ کونسل بنائی گئی۔ وہ وقت تھا جب ترکوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ قسطنطنیہ کی حکومت اغیار کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہے۔ اس لئے اب ترکی کی نجات صرف ترک قوم کی

جد و جہد ہی پر منحصر ہے۔ چنانچہ یہ انتظامیہ کونسل دراصل قسطنطنیہ کی حکومت کے مقابلے میں ایک قومی حکومت تھی جسے ترکی کی آزادی کے حصول کے لئے ہر قسم کے عملی اختیارات دیئے گئے تھے۔ اس کونسل کا صدر بھی مصطفےٰ کمال کو منتخب کیا گیا جس نے اپنا مستقر ارضِ روم کی بجائے انگورہ منتقل کر لیا۔ انگورہ اپنی جائے وقوع کے اعتبار سے بہت اچھی جگہ تھی۔ یہ اناطولیہ کے چٹیل میدان کے وسط میں ایک نہایت مضبوط و خوشگوار قلعہ تھا جو ہر طرف سے محفوظ تھا۔ پھر قسطنطنیہ سے جو ریل آتی تھی اس کا آخری اسٹیشن بھی یہی تھا، اس لئے بیرونی دُنیا سے بالکل بے تعلق بھی نہ تھا۔

چند دن کے بعد انگورہ سے اس انتظامیہ کونسل نے ایک میثاق ملّی شائع کیا۔ یہی میثاق دراصل بعد میں ترکی کی موجودہ حکومت کی بنیاد قرار پایا۔ اس میثاق کی رو سے ترکوں نے یہ اعلان کیا کہ ہم عرب قوم کی ہر سرزمین سے دستبردار ہوتے ہیں۔ "لیکن جن علاقوں میں عثمانی مسلمانوں کی اکثریت ہے اور جو مذہب، نسل اور نصب العین کے لحاظ سے ایک لڑی میں منسلک کئے جا سکتے ہیں وہ سب ایک قوم اور ایک ملک ہیں جن کو کسی اصول یا کسی قانون سے بھی ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔"

اتحادیوں کی تین غلطیاں

جب یہ میثاق ملی شائع ہوا تو دنیا میں اس پر ہنسی اڑائی گئی اور قسطنطنیہ کے "دربارِ خلافت" سے اس میثاق سے تعلق رکھنے والے ہر فرد بشر کو باغی قرار دے کر گردن زدنی ٹھہرایا گیا لیکن ترکوں کی خوش نصیبی سے اتحادیوں نے ٹھیک اس زمانے میں تین ایسی غلطیاں کیں جنہوں نے ترکوں کی آتشِ غیرت و حمیت کو بھڑکا دیا اور جس کی وجہ سے بالآخر وہ ایک آزاد و خود مختار قوم بننے کے منصوبے میں کامیاب ہو گئے۔

(۱) معاہدہ سیورے

ان سب غلطیوں میں سب سے پہلی غلطی معاہدہ سیورے تھا جو ٹھیک ان ہی دنوں میں شائع کیا گیا۔ اس

معاہدے کا ماحصل مختصراً پچھلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس کی اصل حقیقت کو جاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایشیائے کوچک کے جغرافیے کو پیش نظر رکھا جائے بات یہ ہے کہ ایشیائے کوچک کا وسیع علاقہ جہاں ترک قوم بستی ہے اس کا وسطی حصہ ایک بلند چٹیل میدان ہے جس کے ہر طرف اونچے اونچے پہاڑ کھڑے ہیں۔ یہ پہاڑ سمندر کے کناروں تک پھیلے ہوئے ہیں لیکن صرف تین اطراف میں ان کا پھیلاؤ سمندر تک نہیں ہے۔ اور یہی تین طرفیں ایسی ہیں، جو سمندر کے ساحل کے برابر واقع ہیں اور بے حد زرخیز ہیں۔ ان کے علاوہ باقی سارا علاقہ چٹیل میدان ہونے کی وجہ سے بالکل بنجر ہے جہاں صرف بھیڑ بکریاں چرانے اور چراگاہیں بنانے کا کام کیا جا سکتا ہے ——— مذکورہ بالا تین زرخیز علاقوں میں ایک علاقہ تو بحر مارمورا کے کنارے کنارے بحر اسود کے جنوب تک واقع ہے۔ دوسرا علاقہ مغرب میں سمرنا کے اردگرد ہے جہاں کی زمین انگور اور زیتون کی پیداوار کے لئے بہت اچھی ہے۔ تیسرا علاقہ جنوبی ادالیہ (Adalia) کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ یہاں روئی اور غلے کی پیداوار بہت اچھی ہوتی ہے۔

معاہدۂ سیورے کی رو سے پہلے علاقے کی نسبت تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ اتحادیوں کے ایک کمیشن کے ماتحت رہے گا۔ سمرنا کا دوسرا علاقہ یونان میں شامل کرنا طے کیا گیا اور ادالیہ کا تیسرا علاقہ اٹلی کے حوالے کیا گیا ——— اس طرح ترکی کے لئے جو علاقہ بچتا تھا وہ صرف چٹیل میدانوں اور بنجر پتھریلی زمینوں کا علاقہ تھا۔

پھر اسی پر بس نہ کیا گیا بلکہ اس کے علاوہ ایک چیز یہ بھی معاہدے کی شرائط میں داخل کی گئی کہ جو علاقہ ترکوں کو دیا جانا طے ہوا ہے اس میں آرمینی (عیسائی) اور کرد کے نام سے جو دو قومیں بستی ہیں ان کو اس چٹیل میدان کے مشرق کا علاقہ دیا جائے تاکہ وہاں وہ اپنی آزاد ریاستیں قائم کر سکیں، گویا اس طرح ترکوں کے سر پر دو مخالف

قومیں ہمیشہ کے لئے مُسلط کردی گئیں۔

مزید براں قسطنطنیہ جو ترکی حکومت کا پایۂ تخت تھا اُسے چاروں طرف سے اتحادیوں کے زیرِ نگیں علاقوں سے گھیر دیا گیا اور تھریس کا پورا علاقہ یونان کے سپرد کردیا گیا، نیز طے ہوا کہ ترک ۱۵ ہزار سے زائد فوج نہیں رکھ سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک امریکن مورخ کے الفاظ میں ——— "یہ صلحنامہ شہنشاہی حرص و آز کی ایک شرمناک ترین مثال تھی جو آج کل کی مہذب و تجدد پسند حکومتوں کی جانب سے پیش کی گئی۔ اس کے مقابلے میں روس کے معاہدۂ بریسٹ لٹافسک کی شرائط بھی بہت نرم معلوم ہوتی ہیں اور وارسیلز کی شرائط تو یقیناً اس کے مقابلے میں فیاضانہ کہی جاسکتی ہیں۔"

اس معاہدے کی اشاعت نے ترکوں کو یقین دلایا کہ اب اگر ان کی نجات کا کوئی ذریعہ ہوسکتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ وہ ترک قوم کے جذبۂ قومیت کو ابھار کر ترکی کی آزادی کے لئے آخری جد وجہد کر ڈالیں۔

یا تن رسد بجاناں، یا جاں زتن برآید!

اس غلطی کے بعد اتحادیوں کی دوسری زبردست غلطی جس نے ترکوں

(۲) بد عہدی کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا یہ تھی کہ مذکورہ بالا میثاقِ ملی کی اشاعت کے بعد انگورا میں یہ خبر بھیجی گئی کہ اتحادی اس قومی پارلیمنٹ کو تسلیم کرنے پر تیار ہیں بشرطیکہ اُسے باضابطہ طریقہ سے قسطنطنیہ میں منعقد کیا جائے۔ مصطفٰے کمال اور اس کے چند دوستوں کے سوا باقی سب اس دامِ فریب میں مبتلا ہوگئے، اور بہت سے ترک لیڈر بڑی بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ ریلوں میں بیٹھ بیٹھ کر قسطنطنیہ پہنچے۔ جہاں جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو پارلیمنٹ کے بھرے اجلاس میں میثاقِ قومی کی تمام دفعات ایک ایک کرکے منظور کرلی گئیں۔ ترکی نمائندے مارے خوشی کے پاگل ہورہے تھے مگر دو مہینے بھی نہ

ہونے پائے تھے کہ اچانک جنرل ملنے کی کمانڈ میں اتحادی فوجوں نے قسطنطنیہ کی تمام سرکاری عمارتوں پر چھاپہ مارا اور تمام ترکی مکانوں اور محلوں پر حملہ کرکے چالیس ترک لیڈروں کو گرفتار کرلیا جو بعد میں مالٹا میں نظر بند کر دئے گئے۔

اس واقعہ نے تمام ترکی کی آنکھیں کھول دیں۔ سب نے کہا کہ واقعی مصطفےٰ کمال سچ کہتا تھا: اتحادیوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا

تیسری غلطی یہ تھی کہ ۱۹۲۰ء میں اتحادیوں کی امداد اور

(۳) یونانیوں کا حملہ

شہ پاکر یونان نے ترکی پر حملہ کردیا۔ اس حملے کا مطلب یہ تھا کہ یونان کا قبضہ سمرنا پر کرادیا جائے تاکہ اس علاقے کو یونان کے سپرد کرنے کی وجہ جواز بھی پیدا ہوسکے اور انگورہ کی "قومی مجلس" کو بھی درہم برہم کیا جاسکے۔

مصطفےٰ کمال کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ یونان کو شکست دے، یونان کو شکست دینے کے معنے یہ تھے کہ وہ اتحادیوں سے اپنی طاقت وقوت کا لوہا منوالے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اسلحہ کی تعداد کافی نہ تھی، آدمی جوق در جوق قومی فوج میں بھرتی ہونے کے لئے آرہے تھے۔ مگر وہ نہ تو تربیت یافتہ تھے اور نہ انھیں پوری طرح مسلح کیا جاسکتا تھا۔

تاہم جو کچھ ہوسکا کیا گیا اور بمشکل تمام ۲۵ ہزار سپاہیوں کی ایک فوج تیار ہوئی مگر یہ فوج ایسی تھی کہ سپاہیوں کے پاس کپڑے تک صحیح سالم نہ تھے، پھٹے ہوئے کپڑے ٹوٹے ہوئے جوتے اور ناقص اسلحہ لگائے کچھ نیم تربیت یافتہ اور کچھ ناتربیت یافتہ ترک نوجوان تھے جنھیں دیکھ کر یورپ کا ایک معمولی سپاہی بھی قہقہہ لگا دیتا۔ مگر ان کے اس ظاہری بھونڈے پن کے نیچے جوش و ولولے کا ایک بے پناہ سمندر موجیں مار رہا تھا۔ ہر سپاہی یہ سمجھ رہا تھا کہ ترکی کی آزادی کا محافظ و نگہبان آج صرف وہ ہی ہے۔ پھر مصطفےٰ کمال جیسے باکمال جنرل کی بے مثال رہنمائی نے اس جوش و ولولے کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال کی خونبابہ فشانی

جنگ وجدال کے بعد آخر ۱۹۲۲ء میں یونان ہار گیا۔ اور یونانی فوجوں کو نہ صرف سمرنا سے بلکہ تھریس سے بھی باہر دھکیل دیا گیا۔ چند مٹھی بھر ترکوں کی اس بہادری کو دیکھ کر نہ صرف اتحادی بلکہ ساری دنیا دنگ رہ گئی!

کس قدر بیباک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نورد اک مشتِ خاکستر میں تھا!

لیکن مصطفےٰ کمال نے ابھی صرف جنگ جیتی تھی۔" امن جیتنا ابھی باقی تھا سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ دنیا کی طاقتوں سے ترکی کے استقلال و آزادی کو منوا لیا جائے۔ اس شکست کے بعد اتحادیوں نے یہ تو سمجھ لیا تھا کہ اب صلحنامۂ سیورے کو باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ مگر سوال یہ تھا کہ پھر کس قسم کا صلحنامہ کیا جائے۔ اس لئے ۱۹۲۳ء میں لوزان میں برطانیہ اور ترکی کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہونا طے پایا تاکہ ترکی کی حدود کو متعین کیا جا سکے۔ اب اتحادیوں نے ایک نئی چال چلی یعنی انگورہ کی "قومی مجلس" کے علاوہ قسطنطنیہ کے کٹھ پتلی سلطان کا نمائندہ بھی اس کانفرنس میں طلب کیا گیا۔ یہ خبر جب انگورہ پہنچی تو ترکی لیڈر غصے سے تلملا اٹھے اور "قومی مجلس" کی اس اہانت کو وہ کسی طرح برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ سلطان کے پردے میں ترکی قوم میں انتشار و افتراق ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ فوراً "قومی مجلس" کا اجلاس طلب کیا گیا جس میں بڑی تیزی کے ساتھ دو قانون پاس کئے گئے۔ ایک قانون کی رو سے یہ اعلان ہوا کہ سلطنت اور خلافت دو الگ الگ منصب ہیں اس لئے سلطانِ ترکی خلیفہ نہیں۔ دوسرے قانون کی رو سے اس سلطنت کو بھی منسوخ کیا گیا

سلطان وحید الدین کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اُسے اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا اُسے یقین ہو گیا کہ وہ ترک لیڈر جو دنیا کی فاتح قوموں کو شکست دے چکے ہیں اور جن کی سزائے موت کے فرمان پر وہ دستخط کر چکا ہے۔ اب وقت آیا ہے کہ وہ سب مل کر اس کی

سزائے موت کی دستاویز تیار کریں۔ چنانچہ وحید الدین ایک برطانوی ایمبولینس ــــــــ میں بیٹھ کر ایک برطانوی جہاز میں پہنچا اور اس طرح جان بچا کر قسطنطنیہ سے بھاگ نکلا۔ اس کے جانے کے بعد سلطان عبدالمجید آفندی نے منصب خلافت و سلطنت کا مطالبہ کیا، اور اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان بھی کر دیا، مگر اب اس کی کوئی گنجائش نہ تھی سلطنت اور خلافت دونوں کا جنازہ سلطان وحید الدین کی فراری کے ساتھ نکل چکا تھا۔ چنانچہ اب اتحادیوں نے بھی "دربارِ خلافت" سے کسی نمائندے کے طلب کرنے پر اصرار نہ کیا۔

اب لوازن میں صلح کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ترکی کی طرف سے عصمت انونو بھیجے گئے، جو مصطفےٰ کمال کے ہم خیال، ہمدرد اور دوست تھے اور جو شروع ہی سے "قومی مجلس" کے لئے ہر قسم کی قربانیاں کر رہے تھے اور برطانیہ کی طرف سے لارڈ کرزن کو روانہ کیا گیا۔ عصمت پاشا نے لارڈ کرزن کے سامنے وہ تمام مطالبات رکھ دیئے جو "قومی مجلس" نے اپنے "میثاق قومی" میں شائع کئے تھے۔ کرزن ان میں سے بعض مطالبات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا، مگر عصمت اُڑ گئے کہ ان میں سے کسی مطالبے کا ایک ہزارواں حصہ بھی کم نہیں کیا جا سکتا۔ چار مہینے مسلسل اس پر گرما گرم بحث رہی، مگر عصمت نے کرزن کی ایک نہ سُنی اور اپنی ہی کہتے رہے۔ آخر چار مہینے کے بعد کرزن تنگ آکر واپس چلا گیا اور صلح کی گفت و شنید ناکام رہی۔

لیکن اس ناکامی پر ترکوں میں سخت برہمی پھیلی۔ وہ ڈرے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سارا کیا کرایا غارت ہو جائے اور اتحادی پھر لڑائی چھیڑ دیں یا اور کوئی ناگوار صورت درپیش ہو جائے۔ ترک چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ہو "قومی مجلس" کی اہمیت کو اتحادیوں سے منوا لیا جائے۔ چنانچہ عصمت انونو کے خلاف انگورہ میں سخت بُری فضا پیدا ہو گئی اور قومی مجلس کے بہت سے ممبروں نے تو یہاں تک کیا کہ ان کے خلاف ملامت کا ووٹ پاس کیا جائے، رؤف پاشا کی سرکردگی میں عصمت کی مخالفت روز بروز بڑھ

رہی تھی۔ لیکن مصطفےٰ کمال پوری طاقت کے ساتھ عصمت کا حامی تھا اور اس نے اپنا پورا اثر و نفوذ استعمال کر کے تجویز ملامت کو گرا دیا۔ چند دن کے بعد پھر صلح کانفرنس کی دوسری نشست لوازن ہی میں منعقد ہوئی۔ اب پھر عصمت ہی گئے۔ لیکن اس مرتبہ اتحادیوں کی طرف سے کرزن کے بجائے سر ہوریس رَمْ بولڈ (Horace Rumbold) آئے تھے جنہوں نے چند دن کی گفت و شنید کے بعد بالآخر عصمت کے تمام مطالبات مان لئے ۲۰ جولائی ۱۹۲۳ء میں صلحنامۂ لوازن پر دستخط ہو گئے۔

یہ صلحنامہ ترک قوم کی سب سے بڑی کامیابی تھی، ترک مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے۔ پورے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک مسرت و شادمانی کے شادیانے بج رہے تھے اس لئے کہ اب دنیا نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ معاہدہ سیورے ہمیشہ کے لئے منسوخ ہو کر ردی کی ٹوکری کی نذر کیا گیا، آرمینیا کی عیسائی قوم کو جو خود مختاری دی گئی تھی وہ منسوخ ہوئی یورپی طاقتوں نے ترکی کی تجارت و مالیات پر جو پہرے بٹھا دئے تھے وہ بھی منسوخ، قسطنطنیہ اور اس کے اطراف سے اتحادی کمیشن واپس، تھریس واپس، ترکی فوج کی تعداد پر جو پابندی لگائی گئی تھی وہ واپس۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ دس لاکھ یونانی جو اناطولیہ میں بستے تھے ان کی بابت طے ہوا وہ مشترکہ مصارف پر یونان واپس کئے جائیں گے۔

خلافت کا خاتمہ اور سر آغا خاں

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوا کہ حکومت کس قسم کی بنائی جائے؟ کچھ لوگوں کی رائے ہوئی کہ خلافت کو دوبارہ قائم کیا جائے بعض نے کہا کہ روس کی اشتراکی حکومت سے اتحاد کر لیا جائے اس لئے کہ ترکی کی اس جنگ آزادی میں روس نے زبردست اخلاقی امداد ترکی کو پہنچائی تھی، کچھ نے یہ رائے دی کہ یورپی انداز پر آئینی و دستوری شاہی قائم کی جائے، مگر مصطفےٰ کمال نے اپنی شخصیت کے اثر و رسوخ اور عملی حکمت و تدابیر سے ان

تینوں تجویزوں کو گرا دیا۔۔۔۔۔۔ خلافت کی تجویز کو گرا دینا سب سے مشکل کام تھا اس لئے کہ یہاں مذہب کا سوال بیچ میں آ جاتا تھا، مگر کمال کی خوش نصیبی سے ٹھیک اسی زمانے میں سر آغا خاں اور امیر علی مرحوم نے ترکی کی قومی مجلس کے نام ایک بیان جاری فرما دیا جس میں خلافت کو دوبارہ قائم کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اس بیان کو استامبول (قسطنطنیہ) کے ان اخبارات نے بڑی آب و تاب سے شائع کیا جو اب تک خلافت و سلطنت کے حامی تھے۔ لیکن سر آغا خاں اور امیر علی مرحوم کو جو تعلق برطانوی حکومت سے تھا۔ اس سے مصطفےٰ کمال نے پورا فائدہ اُٹھایا اور بڑی آسانی سے ترکوں کو سمجھا دیا کہ آغا خاں کے پردے میں دراصل انگریز بول رہے ہیں اور اتحادیوں کی یہ خواہش ہو کہ خلافت کو دوبارہ قائم کر کے ایک کٹھ پتلی قسم کا خلیفہ دوبارہ ہم پر مسلط کر دیا جائے

انگریزوں کے لئے ترکوں کے دل میں اب کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ معاہدۂ سیورے، قسطنطنیہ کی بدعہدی اور یونانی حملے کی درپردہ امداد کے واقعات نے ترکوں کو اتحادیوں کے خلاف سراپا غم و غصہ بنا رکھا تھا۔ اس لئے انگریزوں کے محکوم ہندوستان کے لیڈروں کی طرف سے جب خلافت کو از سر نو قائم کرنے کا مطالبہ ہوا تو قدرتاً ترک عوام کھٹک گئے اور مصطفےٰ کمال نے تحریکِ خلافت کو اتحادیوں کی ایک سازش قرار دے کر بڑی بڑی مذہبی افراد کی مخالفت پر بھی اوس گرا دی۔ اب ترکوں کی نگاہ میں خلافت کے سوال کی نوعیت ہی بدل گئی تھی۔ پھر چونکہ خلیفۃ المسلمین کی مطلق العنان حکومت کی سختیوں کی یاد ہر ایک کے دل میں تازہ تھی اور خلیفہ کے ساتھ اتحادیوں نے جو ساز باز کر رکھا تھا وہ بھی سب کے سامنے تھا۔ اس لئے ان سب محرکات کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کے حامیوں کی آواز بالکل بے اثر ہو کر رہ گئی۔ اور "مجلس وطنی" نے زبردست اکثریت سے خلافت کے منصب کو

شکست دے کر اس کی جگہ جمہوریت کو نافذ کیا۔ اس کے بعد اُن اخباروں کے ایڈیٹروں پر مقدمہ چلایا گیا جنہوں نے سر آغا خاں اور امیر علی کا بیان شائع کیا تھا۔

شیخ الاسلام بھی رخصت

خلافت کی تنسیخ کے بعد شیخ الاسلام کے منصب کا سوال آیا۔ ترکی میں ایک عرصے سے یہ دستور قائم ہو گیا تھا کہ بادشاہ کی طرح علماء کے بھی خاندان تھے۔ "اس چیز کی ابتداء اوّلاً اس وجہ سے ہوئی کہ علما کے عزل و نصب میں سلطان مداخلت نہ کر سکے۔ لیکن بعد میں علم نے مستقل ایک ذات یا پیشے کی حیثیت اختیار کر لی اور علم و فضل بھی خاندانی وموروثی چیز ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ علماء کے خاندان کے گھر کا گود کا بچہ بھی "علماء" (جسے ترکی میں پشک علمالی غی کہتے تھے) کہلانے لگا" اس مذموم طریقے نے جس کی ابتدا محض حفاظت خود اختیاری کے طور پر اور عمال سلطنت کی مداخلت بیجا کو روکنے کے لئے کی گئی تھی آگے چل کر علما کی علمیت اور اعزاز کو بہت کچھ نقصان پہنچایا۔[1] پھر چونکہ یہ علما حکام وقت کے ہر بات میں حامی و ناصر بھی ثابت ہوتے تھے اس لئے قدرتاً جب ترک عوام کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار آیا تو وہ اس طبقے کو برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ خلافت کی تنسیخ کے ساتھ ساتھ "شیخ الاسلام" کے منصب کو بھی منسوخ کیا گیا۔

ترکی اور روسی اشتراکیت

خلافت کے قیام کی تجویز کو مسترد کر دینے کے بعد اشتراکی روس سے اتحاد کی تجویز کو مسترد کر دینا بہت معمولی بات تھی۔ اوّل تو اس کے حامی بھی کم تھے، دوسرے روس کے تمام ارباب اقتدار غیر مسلم تھے، تیسرے آزادی میں جو لذت ہے وہ ہر قسم کی ماتحتی سے کہیں زیادہ ہے۔ مصطفےٰ کمال

---

[1] ترکوں کی اسلامی خدمات (ترجمہ) انجمن ترقی اردو

نے کہا کہ ہم نے ترکی کی آزادی کو اپنے خون سے اس لئے نہیں خریدا ہے کہ اسے اتحادیوں کے پنجے سے چھڑا کر اشتراکیوں کے سامنے ڈال دیں۔

خلافت کے استرداد کے بعد در اصل آئینی شاہی کے قیام کے حامیوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے اس تجویز کو رد کرادینا ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ تاہم مصطفےٰ کمال کے اثر و اقتدار سے یہ مشکل بھی حل ہوگئی اُس نے کہا کہ شاہی کو دوبارہ زندہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ترک قوم اپنی آزادی کو پھر غاصبوں کے چنگل میں پھنسا دینا چاہتی ہے۔ بادشاہ بہر حال بادشاہ ہے۔ آئین ہو یا نہ ہو، وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آسکتا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جس دولت و قوت کو ترکی قوم کے استحکام پر صرف ہونا چاہئیے وہ یا تو محل کی آرائش و زیبائش کی نذر ہو جائے گی اور یا پھر محل سے مقابلہ کرنے پر صرف ہوگی۔

ترکی کا پہلا جمہوری آئین

اسی دوران میں عصمت اور کمال دونوں نے مل کر ایک دستور اساسی کا مسودہ تیار کیا جسے کچھ تو حکمت عملی سے اور کچھ تخویف و دہشت انگیزی سے قومی مجلس سے پاس کرالیا گیا اس دستور اساسی کی بنیاد جمہوریت پر قائم کی گئی تھی اور سلطنت و شہنشاہیت کے تصور کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا تھا۔ لیکن اگرچہ قومی مجلس نے اس دستور کو پاس کر دیا اور مصطفےٰ کمال کو جمہوریت کا پہلا صدر منتخب کر کے اسے نافذ بھی کر دیا گیا، مگر ابھی اس کے مخالفوں کی تعداد کافی تھی اور وہ شاہی اور خلافت دونوں کی تنسیخ کو پسندیدہ نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں پروپیگنڈا ہوا کہ ترک اسلام سے منحرف ہوگئے ہیں۔ اس پروپیگنڈے نے سب سے زیادہ اثر کردوں پر کیا، اول تو اس لئے کہ کرد بہت زیادہ مذہبی واقع ہوئے ہیں اور دوسرے اس لئے کہ ترکوں کے قومی و نسلی جذبات سے انھیں ہمدردی کیسے ہو سکتی تھی۔ کُرد اور ترک اسلام کے رشتے

سے تو منسلک ہو سکتے ہیں، لیکن نسل وقوم کے لحاظ سے تو وہ ایک نہیں ہو سکتے۔ پھر چونکہ کرد غیر معمولی طور پر دلیر مضبوط اور جنگجو بھی ہوتے ہیں اس لئے اس پروپیگنڈے کے کان میں پڑتے ہی انہوں نے ہتھیار سنبھال لئے۔ اور ترکی افسروں اور سپاہیوں کو بیدریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔ کردوں کی اس بغاوت کی درپردہ حمایت وہ ترکی جماعت بھی کر رہی تھی جو ترقی پسند پارٹی کے نام سے جمہوریت کے دستور اساسی اور مصطفےٰ کمال کے اقتدار سیاسی کی مخالف تھی۔ مگر چونکہ یہ جماعت اقلیت میں تھی اور عوام پر اس کا اثر زیادہ نہ تھا اس لئے کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔

یہ بغاوت کچھ دن تک چلتی رہی۔ لیکن بالآخر سے انتہائی سختی کے ساتھ مصطفےٰ کمال نے کچل دیا اور جب کردوں کو کچلا جا چکا تو پھر ترقی پسند پارٹی کے لیڈروں کو بھی چن چن کر یا تو قتل کر دیا گیا یا جلاوطن ——— اس واقعے نے سارے ملک میں مصطفےٰ کمال کی دھاک بٹھادی اور ہر قسم کی مخالفت موت کی نیند سو گئی[1]۔

مصطفےٰ کمال اور تہذیبِ مغرب

حکومت و نظم ونسق کو قائم کردینے کے بعد سب سے بڑا سوال ترکی کی معاشرتی اور معاشی اصلاح کا تھا۔ اس سلسلہ میں مصطفےٰ کمال نے آنکھیں بند کر کے مغرب کی تقلید کی۔ اس کے دماغ میں یہ بیٹھ گیا تھا کہ ترک جب تک پوری طرح یورپ کے رنگ میں نہ رنگے جائیں۔ ترقی نہیں کر سکیں گے۔ اسلامی تعلیمات اور مشرقی تہذیب کا اثر ابتدائی عمر میں اس کے دل و دماغ پر کچھ کم نہ تھا۔ لیکن عربوں کی بغاوت نے ترکی کو جو شدید نقصان پہنچایا۔ نیز خلافت اسلامیہ کے نام پر سلاطینِ عثمانیہ نے

---

[1] دیکھو "ٹرکی: یسٹرڈے۔ ٹوڈے اینڈ ٹومارو" از Waugh (۲) پوسٹ وار ورلڈ از جیکسن (۳) واری برتھ آف ٹرکی: از پرائس

اور شیخ الاسلام کے نام پر علمائے ترکی نے ترقی پسندی کی راہ میں جو رکاوٹیں پیدا کیں، اُن کی بنا پر اس کا دل مشرقیت اور اسلامیت دونوں سے بیزار ہو گیا، وہ ترکی کے انقلابی عہد کی پیداوار تھا اور یورپ کی نیشنلزم کی طاقت وقوت کے کھلے ہوئے مظاہر اس کے سامنے تھے ——— اس لئے اس نے ترکی میں جو اصطلاحات کیں ان میں ماضی سے وابستگی، مشرق سے وابستگی یا اسلام سے وابستگی کا کوئی خاص خیال نہ کیا گیا۔ وہ ظاہری و باطنی اور اندرونی و بیرونی ہر طریقے سے ترکی کو مغربی وضع کی "قومیت" کے قالب میں ڈھال کر اُسے ایک مغربی قوم بنا دینے کا آرزومند تھا۔ اِس بنا پر سب سے پہلے اُس نے ترکی ٹوپی کے خلاف احکام جاری کئے۔ اس نے کہا کہ یہ دورِ جہالت و غلامی کی نشانی ہے، اس لئے اس کے بجائے انگریزی ہیٹ استعمال کیا جائے۔ اس تبدیلی پر اُسے اتنا اصرار تھا کہ اسے بجبر نافذ کیا گیا، اور عدول حکمی کرنیوالوں کے لئے سزا تجویز کی گئی۔

لیکن جس چیز نے ترکوں کو اپنی ماضی اور اپنے اسلاف سے بالکل بے تعلق سا کر دیا، وہ رومن رسم الخط کا اجرا تھا۔ کمال کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ ترک قوم اپنے عرب بھائیوں کی طرح سیدھی طرف سے لکھے، اس لئے اس نے ۱۹۲۶ء میں انگریزی حروف کو حکماً جاری کر کے بائیں طرف سے لکھے جانے والی تحریر کو ترکی میں نافذ کر دیا۔ اوّل اوّل یہ رسم الخط صرف سرکاری محکمات میں نافذ کیا گیا لیکن دو سال بعد ۱۹۲۸ء میں سارے ملک کا سرکاری و غیر سرکاری خط بنا دیا گیا۔

عورتوں کا نقاب اور برقعہ بھی اُسے ناپسند تھا، اس لئے اسے بھی ختم کیا گیا۔ ترک عورتیں بے پردہ پھرنے کی عادی نہ تھیں، مگر کمال کے حکم کی خلاف ورزی کون کر سکتا تھا؟ اس لئے جن خواتین کی فطرت اس جدت کو قبول نہ کر سکی انہوں نے خودکشی کر لی۔ اگرچہ خودکشی کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی تاہم کافی تھی۔

"محکمۂ دینیات، دینی تعلیم کے مکاتب و مدارس اور درویشوں کی خانقاہیں سب بند کر دی گئیں۔ صرف مسجد کے امام کا ایک دینی منصب باقی رکھا گیا۔ اوقاف کی آمدنی کو محض دینی امور میں خرچ کرنے کے بجائے، دنیوی امور میں صرف کرنے کا قانون بنایا گیا۔ ۸ راپریل ۱۹۲۴ء کو تمام شرعی عدالتیں ختم کر دی گئیں اور ان کی جگہ جدید مغربی قوانین کے مطابق نئے محکمات عدالت بنائے گئے۔"

"اسلامی تعلیم کے نام پر جو دینی درسگاہیں سرکاری یا غیر سرکاری طور پر قائم تھیں، اُن سب کو ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ایک قانون کے ذریعہ بند کر دیا گیا۔"

"یکم جنوری ۱۹۲۶ء سے ہجری سنہ بھی منسوخ کیا گیا اور اس کی جگہ عیسوی سنہ نافذ ہوا۔[۱]

"اس کے بعد زبان کی طرف توجہ ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں انگورہ کے مقام پر نئے انشاء پردازوں" کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے ترکی زبان سے فارسی و عربی کے تمام الفاظ نکال کر ان کی جگہ ترکی الفاظ کو رائج کرنے کا کام شروع کیا۔"[۲]

غرض ہر لحاظ سے ترک قوم کو مشرقی روابط سے بیگانہ بنا کر مغرب کی ایک قوم بنانے کی کوشش کی گئی۔

معیشی حالت

لیکن ترکی کا اصل سوال معاشی ترقی کا سوال تھا۔ یہاں کی زمین میں معدنیات بہت ہیں، مگر ان کو نکالنے کے لئے بڑی فنی مہارت اور فنی تنظیم کی ضرورت تھی، علاوہ ازیں کاشت کا طریقہ بھی بہت

---

۱ چیمبرس انسائکلو پیڈیا جلد دہم صفحہ ۲۶۸

۲ " " صفحہ ۲۷۰

پرانے قسم کا رائج تھا، تجارت بھی اعلیٰ پیمانے پر نہ تھی ــــــ کمال نے ان تمام باتوں کی طرف توجہ کی، مگر قدرت کے نام نادری احکام نافذ نہیں کئے جاسکتے تھے۔ اس لئے جس طرح رسم الخط آناً فاناً بدل دیا گیا اور ٹوپیاں اتار کر ہیٹ پہنا دیئے گئے۔ اس طرح زمین سے معدنیات و زرعیات کو نہیں اگلوایا جاسکتا تاہم اس سلسلہ میں کافی ترقی کی گئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشی اعتبار سے ترکی کی حالت پہلے سے بدرجہا بہتر ہوگئی۔

ترکی کی معاشی بدحالی کا سب سے بڑا بلکہ واحد سبب یہ تھا کہ "صنعتی انقلاب" کے لحاظ سے وہ بالکل صفر تھا۔ اس لئے جن قوموں نے بجلی اور بھاپ کی طاقتوں پر قبضہ پاکر صنعت دکاری گری کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا، انہوں نے سلطنتِ عثمانیہ کے وسیع وعریض علاقے کو اپنی نفع اندوزی کا بہترین مقام پایا اور مختلف کاروبار یہاں شروع کر دیئے، ترکی حکومت نے ریلوے وغیرہ بنانے کے جتنے کام شروع کئے، ان کا ٹھیکہ غیر ممالک کے کارخانے داروں ہی کو دیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو ملک کی دولت کھنچ کھنچ کر باہر جانے لگی اور دوسری طرف خزانۂ شاہی پر بیرونی قرضوں کا دباؤ روز بروز بڑھنے لگا۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ قرض اتنا بڑھ گیا کہ ۲۰ دسمبر ۱۸۸۱ء کو ایک شاہی فرمان کے ذریعے سلطنت عثمانیہ کے مایئے پر قرضخواہ ممالک کی ایک کمیٹی کو رسیور بنانا پڑا۔ لیکن جمہوریت کے قائم ہو جانے کے بعد مصطفیٰ کمال نے اس نظام کو بالکل منسوخ کر دیا، البتہ قرضے کی ادائگی کے لئے یہ طے ہوا کہ سالانہ بجٹ کا نصف قرض میں لگا دیا جائے۔ اسوقت ترکی کے کُل قرضے کا اندازہ پونے نو کروڑ گنی کے قریب تھا۔[۱]

---

[۱] ایضاً صفحہ ۲۶۸

اس کے علاوہ کارخانوں کے قیام اور جدید آلات کی مدد سے کاشتکاری کرنے کا پروگرام بھی بنایا گیا اور جس حد تک محدود آمدنی نے اجازت دی، اس کام میں ترقی دی گئی۔

حزب الاختلاف: اپوزیشن

۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک مصطفےٰ کمال ایک ڈکٹیٹر کی طرح حکومت کرتا رہا۔ بظاہر ایک منتخبہ پارلیمنٹ اور ایک جمہوری دستور اساسی ضرور تھا، مگر در اصل مصطفےٰ کمال جو کچھ چاہتا تھا، وہی ہوتا تھا، ہر قانون اور ہر مسئلہ پارلیمنٹ میں پیش ہوتا تھا اور وہاں سے باقاعدہ طور پر منظور ہوتا تھا۔ لیکن اس پارلیمنٹ میں اپوزیشن پارٹی (حزب الاختلاف) کو قائم کرنے کی اجازت نہ تھی، بس جو تجویز حکومت کی طرف سے آئے اُسے مان لو۔ زیادہ سے زیادہ معمولی اعتراض کر سکتے ہو لیکن یہ نہیں کر سکتے کہ باقاعدہ ایک مخالف جماعت بنا کر حکومت کی مخالفت کی جائے۔

جمہوری حکومتوں کا طریق کار یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ منتخبہ مجلس یعنی پارلیمنٹ یا اسمبلی میں جس پارٹی کے ممبروں کی اکثریت ہو وہ تو حکومت (یا بالفاظ دیگر: وزارت) کے شعبوں پر قابض ہو کر حکمرانی کرے۔ لیکن جس پارٹی کے ممبر اقلیت میں ہوں اور جو اپنے سیاسی عقائد کے لحاظ سے حکمراں پارٹی سے اتحاد عمل نہ کر سکیں، ان کی جماعت اپوزیشن پارٹی یا حزب الاختلاف کے طور پر کام کرے۔ یہ پارٹی بھی باقاعدہ منظم اور تسلیم شدہ ہوتی ہے۔ اس پارٹی کے ممبر اپنا ایک لیڈر منتخب کر لیتے ہیں جو اسمبلی میں ان سب کی نمائندگی کرتا ہے۔ اپوزیشن کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ حکمراں جماعت کی طرف سے جو قوانین یا تجاویز پیش کی جائیں ان پر نکتہ چینی کرے۔ اگر اس نکتہ چینی کے اثر سے یا کسی اور وجہ سے حکمراں جماعت کے ممبر ٹوٹ کر اپوزیشن سے آملیں اور حکمراں پارٹی اقلیت میں رہ جائے تو پھر وہ اپوزیشن میں تبدیل ہو جاتی ہے اور نئی پارٹی

وزارت سنبھالتی ہے۔

مصطفیٰ کمال کی ڈکٹیٹرشپ

مصطفیٰ کمال کو یہ تسلیم تھا کہ یہ چیز جمہوریت کے اصول کے بالکل خلاف ہے کہ ترکی پارلیمنٹ میں کوئی اپوزیشن نہیں ہے، مگر اس کا خیال تھا کہ ابھی ترک قوم اتنی ترقی یافتہ نہیں ہوئی ہے کہ جمہوریت کے آداب کے مطابق اپوزیشن کا قیام یہاں کامیاب ہو سکے۔ تاہم ۱۹۳۰ء میں اس نے اس کمی کی طرف توجہ کی اور فتحی پاشا کی قیادت میں ایک اپوزیشن پارٹی بنانے کی منظوری دی۔ لیکن کمال کا خیال صحیح ثابت ہوا اس پارٹی نے جیسے ہی حکومت کی مخالفت شروع کی ملک میں ادھم مچ گئی، عوام چونکہ جمہوریت کے اصول سے پوری طرح باخبر نہ تھے اس لئے وہ سمجھے کہ اب شاید مصطفیٰ کمال کمزور ہو گیا اور فتحی پاشا طاقت پکڑ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جگہ جگہ سے دبی دبائی مخالفتوں نے سر اٹھایا اور ملک کے طول و عرض میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ لیکن اس ہنگامے میں اگرچہ عوام کی جمہوریت سے ناواقفیت کو دخل ضرور ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ کمال نے جس شدت و سختی کے ساتھ معاشرتی اصلاحات نافذ کی تھیں ان سے عوام کے دل مطمئن نہ تھے اور کم از کم ایک تھوڑی تعداد ابتدا ہی سے ایسی رہی ہے جو ان اصلاحات کی سخت مخالف ہے مگر کچھ تو بے اقتدار ہونے اور کچھ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اس کی آواز بے اثر ثابت ہوتی تھی۔ یہ لوگ اقتدار و قوت کی وجہ سے ان اصلاحات کو مان تو گئے تھے مگر ان کے دل ان کے خلاف بھرے بیٹھے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی فتحی پاشا کی نکتہ چینی ان کے کانوں میں پڑی، وہ بے اختیار پھوٹ پڑے اور چونکہ ان کے دل بری طرح متاثر تھے اس لئے مخالفت نے سختی اور ناگواری کی شکل اختیار کر لی۔

ترک چونکہ جنگجو قوم ہے اس لئے اطاعت اور ڈسپلن کا مادہ بھی ان میں فطری ہے۔ وہ اگر اکٹھے کھڑے ہوں گے تو بلا اختیار صف باندھ لیں گے، اور اکٹھے چلیں

گئے تو بیاختہ ان کے قدم ساتھ ساتھ پڑ گئے، پھر سالہا سال سے وہ مطلق العنان شاہی میں رہنے کے عادی تھے اس لئے بحث و تمحیص کے اس اختلاف زار کا صحیح مطلب اُن کی سمجھ میں نہ آیا اور ایک عجیب خلفشار مچ گیا ——— مجبوراً کمال کو حزب الاختلاف توڑنا پڑا اور ایک بار پھر آہنی ہاتھ سے مخالفت کو دبایا گیا۔

ترکی میں "مجلس عوام" کے نام سے صرف ایک پارٹی ہے۔ ترکی پارلیمنٹ میں سارے ممبر صرف اسی کے ہوتے ہیں، کسی دوسری پارٹی کو بنانے اور اس کے نام پر الکشن لڑنے کی اجازت نہیں۔ اس جماعت کا صدر غازی مصطفےٰ کمال تھا جو ہر چوتھے سال پھر منتخب کر لیا جاتا تھا۔ کمال ہی ترکی جمہوریت کا صدر بھی تھا۔ یہاں بھی ہر نئے انتخاب کے موقعہ پر اُسے دوبارہ صدر بنایا جاتا تھا۔ چنانچہ جمہوریت کے قیام سے لے کر اپنی وفات ۱۹۳۸ء تک مصطفےٰ کمال ہی "مجلس عوام" اور جمہوریت دونوں کا صدر رہا ۱۹۳۸ء میں ترکی کے اس محسن عظیم اور دنیا کی اس عظیم الشان ہستی نے اس جہاں کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہا جس کے بعد صدارت کا عہدہ عصمت پاشا کو سپرد کیا گیا۔

عام حالت

ترکی سے پچیس تیس اخبار نکلتے ہیں جن میں دو تین کی زبان انگریزی یا فرانسیسی ہے، باقی سب کی ترکی۔ عربی کا کوئی اخبار نہیں۔

ترکی کا رقبہ تین لاکھ مربع میل کے قریب ہے اور آبادی تقریباً ڈیڑھ کروڑ۔ ترکی تاریخ میں سب سے پہلی مردم شماری ۱۹۲۷ء میں ہوئی تھی۔

خاص پیداوار میں پھل، کھجور، مصالحے، غلہ، تیل، افیم، اور اُون شامل ہیں جنگ کے بعد کھجور اور سنترے کی پیداوار کو بہت ترقی دی گئی ہے۔

صنعت و حرفت میں قالین سازی کو خاص اہمیت حاصل ہے، کارخانے بھی کھولے جارہے ہیں اور یورپ سے مشینیں منگوائی جارہی ہیں۔ شکر سازی کے کارخانے خصوصیت کے ساتھ کافی تعداد میں بن گئے ہیں، ماہی گیری کی طرف بھی خاص توجہ

کی جا رہی ہے اور مچھلیوں کی تجارت آہستہ آہستہ ترکی کی معاشیات کا اہم جز دبنتی جا رہی ہے
ماہرین کا خیال ہے کہ ترکی میں معدنیات بہت ہیں۔ تانبا، جست، چاندی مینگنیز اور سرمہ وغیرہ یہاں کی زمین میں اتنا دفن ہے کہ اگر اس سب کو نکالا جا سکے تو ترکی کی دولت بے اندازہ ہو سکتی ہے۔ ترکی اس طرف توجہ کر رہا ہے۔ لیکن چونکہ معدنیات کو حاصل کرنے کے لئے فنی مہارت، تجربے اور سرمائے کی ضرورت ہے اس لئے ابھی پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اور یہ چیز ترکی گوارا نہیں کرتا کہ یورپ کے سرمایہ داروں کے ہاتھ اپنی معدنیات بیچ دے۔

نیا ترکی

ترکی سلطنت کو ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے مٹا دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس پر بڑے بڑے مرثیے پڑھے اور آج تک پڑھ رہے ہیں، عربوں کی غداری اور اتحادیوں کی بدعہدی پر بڑی نوحہ خوانی ہوتی رہی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطنت ترکیہ کو نہ تو ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم نے مٹایا، نہ عربوں کی غداری نے اور نہ اتحادیوں کی دغابازی وجعلسازی نے۔ یہ سب باتیں تو محض سطحی اور نمائشی ہیں، اس کے مٹنے کا اصلی راز تو خود اسی سلطنت کے اندر پوشیدہ تھا۔ دنیا کی آفرینش سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ شاہی وشہنشاہی کی تعمیر ہی میں تخریب کے جراثیم چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسلام نے جو ہیئت سیاسیہ پیش کی تھی اس میں تخریب کے ان جراثیم کو پہلی بار فنا کیا گیا تھا۔ مگر شہنشاہی ٹھاٹ باٹ میں کچھ ایسی لذت ہے کہ امیر معاویہ نے اس کے نیم مردہ جسم میں پھر روح پھونکی اور دمشق کی سرسبز وادیوں میں "خلافت اسلامیہ" کے نام سے "اسلامی شہنشاہیت" کی نئی تعمیر اٹھائی، مگر نتیجہ وہی ہوا جو شہنشاہیتوں کا ہوتا ہے۔ ایک صدی میں اس کی زندگی کا چراغ بھی گل ہو گیا اور پھر اس کے اجڑے ہوئے کھنڈر پر نئی نئی شاہیاں قائم ہوئیں اور اپنا اپنا وقت پورا کر کے

ختم ہوتی رہیں۔ ان ہی میں سے ایک ترکی کی "خلافت و سلطنت" بھی تھی اور اب وقت آگیا تھا کہ خود اسی کے تخریبی جراثیم اس کی بنیادیں اکھاڑ کر پھینک دیں۔ جنگِ عظیم اس کا بہانہ بن گئی۔ اگر جنگ نہ ہوتی تو انقلاب بپا ہوتا اور اس کے سیلاب میں ترکی سلطنت کے پرخچے اڑ جاتے۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ اس سلطنت کے مٹنے پر جو نئی ہیئت سیاسیہ ترکی میں قائم ہوئی وہ اسلام کی بتائی ہوئی ہیئت سے قریب تر ہے اور اس میں تخریب کے بجائے تعمیر و ترقی کے جراثیم چھپے ہوئے ہیں۔ کل تک صرف چند ترک آزاد تھے، صرف چند ترک فرمانروا تھے، صرف چند ترک تعلیم یافتہ تھے اور صرف چند ترک آشنائے سیاست تھے۔ لیکن آج ہر ترک آزاد ہے، ہر ترک فرمانروا ہے، ہر ترک تعلیم یافتہ ہے اور ہر ترک آشنائے سیاست ہے۔ آج ہر ترک یہ سمجھتا ہے کہ پوری ترکی قوم کی عزت و حرمت کا محافظ و نگراں وہی ہے اور آج اگر ترکی پر کوئی ٹیڑھی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے تو ترک قوم کا بچہ بچہ اپنی جان کی بازی لگا دے گا۔ کل تک ترکوں کو خود اپنی طاقت کا علم نہ تھا مگر آج اُن میں اس کا شعور ہے آج وہ اپنی "خودی" کو پہچانتے ہیں اور ساری دنیا کے سامنے سینہ تانے اور سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ پھر یہ صحیح ہے کہ ترکوں میں قومیت کے انتہا پسندانہ بلکہ جارحانہ جذبات پیدا ہوگئے ہیں۔ مگر یہ محض پچھلے مستبد و مطلق العنان دور کا قدرتی ردِ عمل ہے۔ لیکن آج بھی ترک اپنی قوم کا وطن صرف ایشیائے کوچک ہی کو نہیں بلکہ توران کو قرار دیتے ہیں، اور توران سے ان کی مراد قسطنطنیہ سے لے کر چین کی سرحد تک کا وہ علاقہ ہے جو کوہ قاف سے ہوتا ہوا پامیر تک پھیلا ہوا ہے اور جس میں اوزبک تاجیک، بخارجی اور چینی، اور چینی ترکستان کی تمام نسلیں شامل ہیں، بلکہ افغانستان کا خطہ بھی اس تورانی نسل میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایشیائے کوچک کی یہ ترک حکومت دراصل ایک وسیع ترکمانی حکومت کا "بنیادی نقطہ" ہے۔ بالفاظِ دیگر

ترکی کے موجودہ قومی جذبات محض مدافعانہ ہیں اور ان میں آج بھی عالمگیر پھیلاؤ کی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں، آج کے نئے ترکی میں ترکی نوجوانوں کے عزائم یہ ہیں کہ انگورا سے لے کر سمرقند و کاشغر تک ایک ترکی یا ترکمانی وفاق (فیڈریشن) کا جھنڈا لہراتا نظر آئے اور پھر یہ وفاق دنیا کے عالمگیر وفاق کا ایک حصہ ہو جس میں دنیا کی تمام قومیں اور نسلیں امن و اطمینان کی زندگی بسر کر کے انسانیت کی اس غایت کبریٰ کو حاصل کر سکیں جس کی تعبیر قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے: وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون!

یہ تھی ترکی سیاست، معیشت کی عام حالت جب ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے ہولناک طوفان نے ایک بار پھر قابلیت و اہلیت کو میدان کارزار میں لا کھڑا کیا۔

اس دوسری جنگ کے نتیجے میں ترکی کو جن حالات سے گزرنا پڑا اس کی تفصیل اُن ابواب میں مذکور ہے جن میں اس جنگ کے اسباب و نتائج پر بحث کی گئی ہے۔

باب ۱۹

مصر

دامِ غلامی اور کشمکشِ آزادی

مصر ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جس کے تین لاکھ ۸۲ ہزار مربع میل رقبے میں سے صرف ساڑھے تیرہ ہزار مربع میل علاقہ قابلِ کاشت ہے اور باقی ساری سرزمین بے آب و گیاہ ریگستان ہے مگر اس کے باوجود مصر آج کل کی دنیا کا اہم ترین ملک ہے اور دنیا کی ہر قوم اس پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتی ہے۔ پھر اس کی وجہ مصر کی دولت صنعت و حرفت یا تجارت و زراعت نہیں، مصر سے بہت زیادہ مالدار و زرخیز علاقے دنیا میں موجود ہیں اور خود افریقہ ہی کی نو آبادیوں میں اس سے کہیں زیادہ دولتمند زمینیں پڑی ہوئی ہیں۔ پھر اس اہمیت کی وجہ کیا ہے؟ اس اہمیت کی واحد وجہ مصر کا محلِ وقوع ہے۔ مصر ایک ایسے مقام پر واقع ہے جو آج کل کی صنعتی دنیا میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اور جنگ و امن دونوں زمانوں میں اس کی اہمیت حد سے زیادہ ہے، اسی بنا پر جرمنی کے ایک ماہرِ جنگ، ڈاکٹر پال روربیک نے سنہ ۱۹۰۲ء میں کہا تھا کہ "یورپ میں صرف ایک جگہ ہے جہاں سے انگلستان پر

حملہ کرکے اُسے سخت نقصان پہنچایا جاسکتا ہے اور وہ جگہ مصر ہی ہے۔"

مصر کی اہمیت انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب سے قبل کچھ نہ تھی۔ دنیا اسے محض ایک قدیم ترین تہذیب کے گہوارے کی حیثیت سے جانتی تھی اور فراعنۂ مصر اور اہرام مصری کے نام ہی اس سرزمین کا تعارف دنیا میں کراتے تھے۔ لیکن جب یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہوا، اور دنیا کے بازاروں پر قبضہ جانے کی فکر ہر قوم کو لاحق ہوئی تو معلوم ہوا کہ مصر ہی ایک ایسا مقام ہے جسے یورپ اور ایشیا کا درمیانی دروازہ کہا جاسکتا ہے اور جہاں سے ہوکر مشرق و مغرب کا راستہ گذرتا ہے۔ اس حقیقت کو سب سے پہلے نپولین بوناپارٹ نے محسوس کیا اور ۱۷۹۸ء میں اس پر حملہ کردیا۔ ۱۷۹۸ء سے مسلسل کئی سال تک نپولین کی فوجیں مصر پر قابض رہیں، اس دوران میں نپولین نے مصری زبان، مصری معاشرت اور مصری رسوم و رواج سے یورپ کو پہلی بار روشناس کرایا اور خود مصر کو یورپ کی ترقیوں کا براہ راست علم پہلی بار ہوا۔ لیکن یورپ کی الجھنوں کی وجہ سے نپولین کو اتنا موقعہ نہ مل سکا کہ وہ مصر پر اپنا تسلط قائم رکھ سکے۔ چنانچہ تین چار سال کے بعد فرانس کا غلبہ یہاں سے اٹھ گیا اور ۱۸۰۵ء میں محمد علی پاشا نے سلطان ترکی کے نام پر اسے فتح کرکے اپنے قبضہ میں کرلیا۔ جس پر "بارگاہ خلافت" سے اُسے مصر کا "والی" بنایا گیا اور "پاشا" کے ترکی خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

لیکن محمد علی پاشا کی حکمرانی کے باوجود، یورپ کی طاقتیں اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں برابر مصروف رہیں۔ شروع میں صرف فرانس کے قدم یہاں آئے تھے۔ لیکن بعد میں برطانیہ نے بھی اپنا اثر بڑھالیا۔ برطانیہ و فرانس کی یہ کشمکش ایک عرصے تک شدید قسم کی رقابتیں پیدا کرتی رہی۔ اٹلی کے لئے بھی مصر کی اہمیت کچھ کم نہ تھی۔ آخر ۱۸۹۰ء میں انگلستان نے اٹلی سے ایک خفیہ معاہدہ کرکے یہ طے کیا کہ اگر

مصر پر انگریزی اقتدار کو اٹلی برداشت کرے تو برطانیہ اس کے معاوضے میں طرابلس پر اطالوی قبضہ گوارا کرے گا۔[۱] اس معاہدہ کے بعد اٹلی اور برطانیہ کی رقابت تو ختم ہو گئی لیکن فرانس و برطانیہ کی چشمک باقی رہی۔ آخر انیسویں صدی کے اوائل میں اسی قسم کا ایک خفیہ معاہدہ فرانس و برطانیہ کے درمیان بھی ہو گیا۔ جس کی رو سے فرانس نے مصر سے اس شرط پر ہاتھ اُٹھا لیا کہ مراکش کے معاملے میں برطانیہ کچھ نہ بولے گا۔[۲]

لیکن یہ سب معاہدے اندرونی طور پر ہوتے رہے۔ ظاہر میں سب ہمیشہ بڑے زور شور کے ساتھ مصر کی آزادی کا اعلان کرتے رہے۔[۳]

محمد علی پاشا کے زمانہ میں یورپ کے قدم مصر میں نہ جم سکے۔ لیکن بعد میں بڑی تیزی سے جمنے لگے۔

محمد علی پاشا

محمد علی پاشا دراصل البانیہ کا رہنے والا تھا جو ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوا۔ وہ ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور شروع شروع میں تمباکو کی تجارت کر کے پیٹ پالتا تھا۔ لیکن قدرت نے دراصل اُسے رہا ہپانہ جوہر عطا کئے تھے اور جنگ و سپہ گری کیلئے بنایا تھا چنانچہ جلد ہی اُسے اس میدان میں اپنے کمالات دکھانے کا موقعہ مل گیا اور سپاہی کے ادنیٰ درجہ سے درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا ترکی فوج کا ایک افسر بن گیا پھر جب مصر میں نپولین کی فوجیں داخل ہوئیں تو اس نے ایسی بہادری اور دانائی سے ان کا مقابلہ کیا کہ نپولین کو مصر سے دستبردار ہونا پڑا اور سلطان ترکی نے اس شجاعت و

---

[۱] دیکھو انٹرنیشنل انارکی۔ از ڈکنسن صفحہ ۹۹

[۲] ″ ″ ″ صفحہ ۱۴۱۔۱۵۱

[۳] ″ ″ ″ صفحہ ۲۵

جوانمردی کے صلے میں اُسے مصر کا "والی" بنا دیا۔ محمد علی پاشا کے وقت تک مصر کی حکومت پر مملوک خاندان (خاندانِ غلامان) چھایا ہوا تھا اور ترک گورنروں کا اقتدار برائے نام تھا۔ نپولین نے مملوک کی طاقت کو کافی حد تک توڑ دیا تھا، مگر پھر بھی وہ نپولین کے مقابلے پر ڈٹے رہے۔ لیکن محمد علی پاشا نے فوجی حکمت عملی اور سیاسی تدبیر آرائی سے کام لے کر اس خاندان کے تمام سربر آوردہ افراد کو ایک ایک کر کے تہِ تیغ کر دیا۔

محمد علی پاشا مصر کے لئے بہت اچھا فرمانروا ثابت ہوا۔ وہ اگرچہ نسلاً البانی تھا مگر اس نے مصر کے ساتھ جو کچھ کیا، اس سے زیادہ کوئی مصری بھی نہ کر سکتا تھا، اُس نے سودان کو فتح کر کے مصر کی حکومت میں شامل کیا اور عرب کا کچھ علاقہ بھی مصر کی حدود میں داخل کر لیا، مصر کی مالی ترقی اور خوشحالی کے لئے بھی اس نے بہت کوشش کی اور اسے پہلے سے زیادہ مالدار بنا دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یونانیوں کے خلاف ترکوں کو جو جنگیں لڑنا پڑیں ان میں ترکوں کی زبردست امداد کی۔ غرض ۱۸۴۸ء تک اس کی حکومت میں مصر نے کافی ترقی کی۔ لیکن اس کے بعد اس کا دماغ کچھ خراب ہو گیا اور اس کے دوسرے ہی سال ۱۸۴۹ء میں وہ مصر اور مصریوں کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گیا[۱]۔

مگر مصر میں اُس نے آزادی و خود اختیاری کے جو جذبات پیدا کر دیئے تھے وہ بدستور زندہ رہے اور اب تک زندہ ہیں۔ لیکن مطلق العنان شاہی میں سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ ملک کی ترقی و سرسبزی، اور عوام کی فلاح و بہبودی محض ایک شخصیت پر منحصر ہوتی ہے۔ اب اگر وہ اتفاق سے اچھے دل و دماغ کی مالک

---

[۱] دیکھو تاریخ مصر (۱۷۶۳ء تا ۱۹۱۴ء) از Weigall

اور سیاسی داؤ پیچ سے واقف ہو تو فہو المراد ورنہ پھر مصیبت ہی مصیبت کا سامنا ہو، اسی بنا، پر ابن خلدون نے لکھا ہو کہ کسی بلند سے بلند اور زبردست سے زبردست "شاہی" کا عروج بھی ایک صدی سے زیادہ نہیں ہوتا اس لئے کہ شروع میں جو فرمانروا سلطنت کے بانی ہوتے ہیں وہ واقعی زبردست دل و دماغ رکھتے ہیں اور اس دل و دماغ کی بدولت وہ بڑے بڑے علاقوں پر چھا جاتے ہیں، پھر ان کے بعد اُن کی جو جانشین آتے ہیں وہ مقبوضہ علاقوں کی شان و شوکت سے فائدہ اٹھاتے ہیں یہاں تک کہ بعد کی نسلیں عیاشی و آرام طلبی میں پڑ کر کسی دوسرے فاتح کے لئے راستہ صاف کر دیتی ہیں۔[1]

رفت و منزل بہ دیگرے پرداخت!

اقبال نے اسی حقیقت کو اپنے ایک شعر میں یوں پیش کیا ہو:

آ، تجھ کو بتاؤں میں، تقدیر اُمم کیا ہو
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

نہر سوئز

مصر میں محمد علی پاشا اگرچہ سلطان ترکی کا والسرائے تھا، مگر یہ تعلق محض برائے نام تھا، دراصل وہ مصر کا خود مختار والی و حاکم تھا۔ اسی بنا، پر اُس کے بعد اُس کے سب سے بڑے بیٹے ابراہیم پاشا کو مصر کے تختِ حکومت پر بٹھایا گیا۔ ابراہیم پاشا کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ بہت بڑی حد تک اپنے پیشرو کا صحیح جانشین ثابت ہوگا۔ مگر ابھی اُسے تخت نشین ہوئے دو مہینے ہی ہوئے تھے کہ اس کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا عباس پاشا والیٔ مصر بنایا گیا۔ مگر غلام خاندان (مموک) کے بچے کھچے لوگوں نے اس کے دادا محمد علی پاشا سے بدلہ لینے کی خاطر چار سال بعد اسے قتل کر دیا۔

---

[1] مقدمہ تاریخ ابن خلدون

اب قرعۂ فال محمد علی پاشا کے سب سے چھوٹے لڑکے سعید پاشا کے نام پڑا، نہر سویز بنانے کی منظوری پہلی بار اسی نے وانس کو دی۔ سعید پاشا کے بعد ۱۸۶۳ء میں اس کا بھتیجا (ابراہیم پاشا کا لڑکا) اسمٰعیل پاشا جانشین ہوا، اس نے سلطان ترکی کو خوش کرنے کے لئے خراج کی رقم دوگنی کردی اور اس کے معاوضے میں سلطان کی طرف سے خدیو کا لقب "والیانِ مصر" کو عطا کیا گیا، نہر سویز کا کام اسی کے عہد میں ۱۸۶۹ء میں انجام پذیر ہوا اور اس سال ۱۷؍ نومبر کو پہلا جہاز یہاں سے گزرا۔

نہر سویز بنانے کا خیال سب سے پہلے نپولین ثالث کو آیا تھا جس نے مصر کی حکومت سے گفت و شنید کرکے فوراً اس کام کو شروع بھی کرایا تھا، نہر سویز کے نہ ہونے سے ایشیا جانے والے بحری جہازوں کو پورے افریقہ کے گرداگرد ہزاروں میل کا چکر لگانا پڑتا تھا جس سے وقت اور روپیہ دونوں کا نقصان تھا، لیکن نہر سویز کے بعد مشرق تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ ہاتھ آجاتا تھا۔ چنانچہ دس سال کی مسلسل محنت کے بعد ۹۹ میل لمبی ۱۹۸ فٹ چوڑی اور ۳۳ فٹ گہری یہ نہر کھد کر تیار ہوئی جس سے بڑے بڑے جہاز مہینوں کا راستہ گھنٹوں میں طے کرلیتے ہیں۔

اس نہر کی تیاری میں فرانس کے انجینئروں نے کام کیا تھا مگر اس کی لاگت میں مصر اور فرانس دونوں شریک تھے اور مصری حکومت کے حصوں کی تعداد اس میں اتنی زیادہ تھی کہ حقِ ملکیت میں مصر ہی کو ترجیح حاصل تھی۔

۱۸۷۳ء میں سلطانِ ترکی نے اسمٰعیل پاشا کو غیر ممالک سے معاہدے کرنے اور فوج رکھنے کا اختیار دیا جس نے عملاً خدیو مصر کو مصر کا "آزاد فرمانروا" بنادیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب والیٔ مصر محض ایک گورنر نہ رہا بلکہ عملاً مصر کا خودمختار فرمانروا بن گیا۔ تخت و تاج وراثت میں منتقل ہوچکا تھا اور داخلی و خارجی تمام سیاسی معاملات کا تصفیہ کرنے میں "خدیو مصر" پوری طرح آزاد تھا۔ خودمختاری کے اس

اونچے منصب پر بیٹھنے کے بعد اسمٰعیل پاشا نے مصر کی اندرونی ترقی کے لئے بہت سے کام کئے۔ ریلیں بنائیں، تار گھر بنائے، ڈاک خانے کھولے۔ پختہ سڑکوں میں اضافہ کیا بہت سے نئے پل تعمیر کئے، سمندروں میں جہازوں کی رہبری کے لئے روشنی کے مینارے "لائٹ ہاؤس" کھڑے کرائے، پورٹ سعید، سوئیز اور اسکندریہ کی بندرگاہوں کی مرمت کرائی۔ تعلیم کا بجٹ بڑھایا، مصری اور غیر مصری (یورپین) ججوں پر مشتمل ملی جلی عدالتیں بنائیں ان اصلاحات کے علاوہ اس نے مقبوضات کی وسعت بڑھانے کی طرف بھی توجہ کی اور مختلف علاقوں پر فوج کشی کی گئی۔

ان تمام کاموں کے لئے قدرتاً روپے کی شدید ضرورت تھی۔ مزید برآں شاہی شان وشوکت کو برقرار رکھنے کے لئے بھی روپے کی کچھ کم احتیاج نہ تھی۔ اسمٰعیل پاشا نے بجٹ بنانے میں آمد وخرچ کے توازن کا خیال بالکل نہ رکھا اور دونوں ہاتھوں سے روپیہ لٹانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں قرض لینے کی نوبت آگئی برطانیہ وفرانس وغیرہ تو اس "مبارک موقع" کی تاک ہی میں بیٹھے تھے۔ چنانچہ خدیو نے قرض لینا شروع کیا لیکن خدیو کی اسکیموں کا دائرہ اب اتنا بڑھ چکا تھا کہ گنجِ قارون بھی تھوڑا تھا۔ ادھر سے ھل من مزید کی صدا اٹھ رہی تھی اور ادھر سے مغربی مہاجن بڑی نیازمندی کے ساتھ تھیلیوں پر تھیلیاں پیش کر رہے تھے۔ آخر ۱۸۷۵ء میں انگلستان کے وزیراعظم لارڈ بیکنز فیلڈ نے اسمٰعیل پاشا سے کہا کہ نہر سوئیز میں مصر کے جو حصے ہیں وہ انگلستان کے ہاتھ بیچ دو، خدیو کو روپیہ چاہیئے تھا چنانچہ ایک لاکھ ۷۷ ہزار حصوں کا فیصلہ صرف چالیس لاکھ گنی میں ہو گیا۔

جیمس لکھتا ہے: "انگلینڈ کے لئے یہ تجارت حد سے زیادہ قیمتی اور نفع بخش ثابت ہوئی"[1] اور حقیقت بھی یہ ہے کہ نہر سوئیز کے یہ حصے انگلستان کے لئے

---

[1] دیکھو جلد ۲ صفحہ ۲۰۹

مصر پر اپنا اقتدار قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئے۔ اب اس نہر کی حفاظت ونگرانی کے بہانے سے انگریزی فوجیں بڑی آسانی سے مصر میں داخل ہونے لگیں

برطانوی تجارت وخوشحالی کے لئے نہر سوئیز ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتی ہے اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نہر سے گذرنے والے برطانوی جہازوں کی تعداد ساری دنیا کے جہازوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ۱۹۳۳ء میں ہر سو جہازوں میں ۵۵ جہاز برطانوی تھے۔[۱]

غرض نہر سوئیز کی ملکیت نے برطانیہ کی سیاسی واقتصادی سربلندی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ لیکن خدیو مصر نے قرضوں کا اتنا بوجھ اپنی جان پر لاد لیا تھا کہ نہر سوئیز بیچ ڈالنے کے باوجود اس کی گلو خلاصی نہ ہو سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین سال بعد مصر کی آمدنی کے خاص خاص شعبے انگلستان اور فرانس کے ہاتھوں گرو ہو گئے۔ یعنی ان دونوں حکومتوں نے ایک کمیٹی بنا کر مصر کے پورے مایئے کو اپنے قبضے میں لے لیا اور خدیو کو صرف ایک مقررہ رقم دی جانے لگی۔

اسی چیز نے ایک طرف تو مصر کے عوام میں غم وغصے کی آگ پھیلائی اور دوسری طرف سلطان ترکی کو سخت برافروختہ کیا۔ اسی کے ساتھ فرانس وبرطانیہ نے بھی اندر ہی اندر سازشوں کا جال پھیلا۔ اسمٰعیل پاشا نے اس دلدل سے نکلنے کی بہت کوشش کی، مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ۱۸۷۹ء میں فرانس وبرطانیہ کی درپردہ کوششوں سے سلطان ترکی نے اسمٰعیل پاشا کو معزول کر دیا۔ اور اس کی جگہ اس کے بڑے بیٹے توفیق کو تخت نشین کیا۔[۲] ——— اب کہیں جاکر اسمٰعیلی پاشا کو

---

[۱] اسٹیٹسمین ایر بک ۱۹۴۴ء

[۲] دیکھو ایجپٹ (ماڈرن ورلڈ سیریز) ازینگ مطبوعہ لندن ۱۹۲۷ء

پتہ چلا کہ

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن خبر اصلا نہ تھی
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن!

یہ ہی مصر پر انگلستان کے تسلط کی ابتدا ـــــــ مگر ابھی اس تسلط نے زیادہ پاؤں نہ پھیلائے تھے۔ مصر ابھی تک خلافت عثمانیہ کا صوبہ تھا اور مصر کا فرمانروا خلیفۃ المسلمین کی اطاعت کا دم بھرتا تھا۔ مگر انگلستان کی خوش نصیبی سے دو موقعے ایسے آئے جن سے فائدہ اٹھا کر اس نے خوب مضبوطی کے ساتھ مصر کی سرزمین پر اپنے قدم جمائے۔

مرغ گرفتار کی پہلی ناکام تڑپ

(۱) پہلا موقعہ ۱۸۸۲ء میں پیش آیا۔ جب مصر کے وزیر جنگ عربی پاشا کی قیادت میں مصری عوام نے ترکی اور فرنگی دونوں اقتداروں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔

مغربی ممالک کے خلاف مصر کے جذبات مشتعل تو تھے ہی، لیکن جس چیز نے عربی پاشا کی "تحریک آزادی" کو آگ کی طرح سارے ملک پھیلا دیا، وہ "قانون ادائگی قرضہ" Law of Liquidation جو پانچ مغربی حکومتوں کی اثر اندازی سے توفیق پاشا کی حکومت نے پاس کیا۔ اس چیز نے مصریوں کو یقین دلایا کہ اب یورپ کے ساہوکار و مہاجن مصر کو ہضم کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی کے ساتھ مصری عوام کو خلافت عثمانیہ کی کمزوری و بے بسی کا احساس بھی ہوتا جا رہا تھا، وہ دیکھ رہے تھے کہ سلطان ترکی میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اس مغربی مداخلت کو روک سکے، اس لئے وہ مصریوں کی مدد کرنے کے بجائے، یورپی اقوام ہی کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ ان حالات میں ترک قوم کی اطاعت و فرمانبرداری مصریوں کے لئے روز بروز ناقابلِ برداشت ہونے لگی۔

مزید براں، اب چونکہ ترکوں میں قومیت (نیشنلزم) کا جذبہ بھی پیدا ہونے لگا تھا اور اب وہ صرف مسلمان ہونے ہی پر فخر نہ کرتے تھے، بلکہ یہ نعرہ بھی لگاتے تھے کہ

——— میں ترک ہوں، میرا دین اور میری نسل اعلیٰ ہے ——— اس لئے قدرتاً مصریوں میں ترکوں کے خلاف جذبات پھیلنے شروع ہوئے۔ وہ کہنے لگے اگر قومیت باعثِ فخر ہے تو پھر مصریوں کی قوم ترکوں سے کہیں زیادہ اعلیٰ ہے، مصری دنیا کی سب سے پرانی تہذیب کے امانتدار ہیں، علم و فضل کے سرمایہ دار ہیں، بہادر ہیں، جری ہیں۔ غرض کس بات میں وہ ترکوں سے کم ہیں، پھر وہ ترکوں کے ماتحت کیوں رہیں؟

احمد عربی پاشا

مصریوں کے ان جذبات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۲ء میں احمد عربی پاشا کی قیادت میں مصر نے ترکی و فرنگی دونوں کے خلاف علم بغاوت کر دیا۔ یہ تحریک دراصل مصر کی پہلی تحریک قومیت تھی۔ عربی پاشا اس تحریک کے لیڈر تھے جو اگرچہ ایک معمولی گھرانے کے چشم و چراغ تھے، لیکن خداداد ذہانت و فطانت اور فطری صلاحیت و لیاقت کی بدولت مصر کی وزارت جنگ کے منصب تک پہنچ گئے۔ ۱۸۸۲ء میں ان کو یہ منصب ملا اور اسی سال انہوں نے انگریزی و ترکی دونوں کے اقتدار سے مصر کو آزاد کر دینے کا اعلان کر دیا۔ عربی پاشا نے خدیو مصر سے مطالبہ کیا کہ وزارت کو فوراً بدل دیا جائے اور فوج کی تعداد بڑھا کر ۱۸ ہزار کر دی جائے۔ عربی پاشا چونکہ وزیر جنگ تھے۔ اس لئے مصر کی تقریباً پوری فوج ان کے ساتھ ہو گئی اور وہ ایک فوجی ڈکٹیٹر بن گئے اور مستقل جنگ شروع کر دی گئی۔ اس موقعہ پر برطانیہ نے فرانس، ترکی اور خدیو مصر تینوں کے سامنے اس بغاوت کا بھیانک نقشہ کھینچ کر پہلے تو ان کی امداد حاصل کی اور پھر پوری طاقت سے تحریک کو کچل ڈالنے کے

لئے فوجی اقدامات شروع کر دیئے، عربی پاشا اور برطانوی فوجوں میں باقاعدہ ٹھن گئی۔ شروع میں مصری فوجیں غالب رہیں مگر برطانیہ کی امداد کے لئے تازہ دم فوجوں کی کمک پر کمک آنی شروع ہوئی جن میں خیریت سے ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد بھی کافی تھی۔[۱]

برطانیہ نے اپنی جنگ کا آغاز اسکندریہ کے خوبصورت شہر پر بیدریغ بم برسا کر کیا، آخر دو مہینے کے جدول وقتال کے بعد طل الکبیر کے مقام پر عربی پاشا کے آدمیوں کو شکست ہوئی اور اس طرح انگریزی اقتدار کے لئے مصر میں میدان صاف ہوگیا۔ عربی پاشا گرفتار ہوئے اور ان کے خلاف سزائے موت کا فیصلہ صادر ہوا۔ مگر مصری عوام میں ان کو جو مقبولیت و ہر دلعزیزی حاصل تھی اس کی وجہ سے یہ فیصلہ منسوخ کر دیا گیا اور انھیں لنکا میں صرف نظر بند کر دینے پر اکتفا کیا گیا، جہاں ۱۹ سال محبوس رکھنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں واپس مصر جانے کی اجازت دی گئی۔ مگر اب ان کے قوی بھی جواب دے چکے تھے اور مصر پر انگریزی تسلط بھی مکمل ہوچکا تھا۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۱۱ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ مگر مصری تحریک آزادی کے بطلِ جلیل کی حیثیت سے آج تک مصر ان کی عزت کرتا ہے۔[۲]

انگریزی شہنشاہیت کا مستبد ترین ایجنٹ لارڈ کرومر جس نے مصری تحریک آزادی کو کچلنے میں بہت نمایاں کام کیا ہے۔ عربی پاشا کے متعلق یہ رائے ظاہر کرتا ہے۔ عربی پاشا کی تحریک کی نوعیت ہماری نظر میں جو کچھ بھی ہو وہ مصری تظلم و

---

[۱] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صفحہ ۲۴۴

[۲] دیکھو انڈیپنڈنٹ ایجپٹ، از یوسف بے ہسٹری آف ایجپٹ از ڈیگال۔ لینڈ آف ایجپٹ از فیڈن Fedden)

نسق کی ابتری اور عام قومی انتشار و برہمی کے خلاف ایک موثر اور حقیقی احتجاج کا مجسمہ تھے۔[۱]

عربی پاشا کی تحریک کے ناکام ہو جانے کے بعد برطانیہ کا ایک ایجنٹ مصر میں رہنے لگا جو دراصل مصر پر فرمانروائی کرتا تھا تاہم بظاہر مصر کی آزادی کو برقرار رکھا گیا۔ اور قسطنطنیہ سے بھی اس کا برائے نام تعلق باقی رہا۔

مہدی سوڈانی عربی پاشا کی شکست کے بعد مصر پر قبضہ جمانے کا دوسرا نادر موقعہ مہدی سوڈانی کے مقابلے کے وقت برطانیہ کو ہاتھ آیا۔ مسلمانوں میں یہ عقیدہ کہ مہدی آکر انھیں نجات دلائیں گے بہت پرانا ہے۔ اس عقیدہ کے نام پر بہت سے حوصلہ مند اولوالعزم انسانوں نے مسلمانوں کی طاقت و قوت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے، اسی قسم کی ایک حوصلہ مند ہستی سوڈان میں ڈنکولہ کے ایک معمولی کشتی ساز کے گھر میں ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئی تھی۔

ان کا نام محمد احمد تھا: سوڈان کے پایۂ تخت خرطوم کے ایک مدرسہ میں تعلیم پائی اور پھر جزیرۂ ابا میں گوشہ نشین ہو کر پندرہ سال ریاضت و چلہ کشی میں گزارے اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں یہ اعلان کر دیا کہ جس مہدی کی آمد کا وعدہ کیا گیا ہے، وہ میں ہی ہوں، مصر اس زمانے میں بغاوت و انقلاب کے جذبات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جب عربی پاشا کی تحریک ناکام ہوئی تو لوگ قدرتاً محمد احمد کے گرد جمع ہونے لگے۔ انہوں نے خیال کیا کہ چونکہ محمد احمد کے ساتھ خدائی تائید شامل ہے۔ اس لئے جو تحریک عربی پاشا کی قیادت میں ناکام ہو چکی ہے وہ "مہدی" کی قیادت میں کامیاب ہو جائے گی۔ ان احساسات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصری تحریکِ قومیت

---

[۱] ماڈرن ایجپٹ از لارڈ کرومر (مطبوعہ ۱۹۰۸ء)

کے تمام عناصر سمٹ سمٹ کر مہدی کے گرد جمع ہونے لگے اور اس کی آواز پر لبیک کہنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔ چند دن بعد اُس نے ایک اچھی خاصی فوج تیار کر لی اور خدائے قدوس کے نام پر سوڈان کو فتح کرنا شروع کر دیا۔

مہدی سوڈانی کی یہ جدوجہد مصری، ترکی اور برطانوی تینوں حکومتوں کو سخت ناگوار گذری، سوڈان ابھی تک مصر کے زیر حکومت تھا، اس لئے اس بغاوت کو وہ کیوں برداشت کرتا؛ ترکی کا تسلط بھی ابھی مصر اور سوڈان پر تھا، خواہ وہ برائے نام ہی سہی مگر تھا۔ اس لئے اس علانیہ بغاوت پر "باب عالی" سے بھی نفرت و ملامت کا اظہار کیا گیا، لیکن نہ تو "باب عالی" میں طاقت تھی اور نہ "دربارِ مصر" میں؛ اس لئے برطانیہ نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور مہدی کی بغاوت کو دبانے کی غرض سے ۱۸۸۹ء میں مصر کی حکومت سے سوڈان کے پورے علاقے کی نگرانی اپنی طرف منتقل کرالی، ۱۸۸۵ء میں مہدی کا انتقال ہو چکا تھا مگر اس کا بیٹا "خلیفہ" کی حیثیت سے سوڈان کے مفتوحہ علاقے پر قابض تھا اور مزید فتوحات کا سلسلہ جاری تھا، لیکن جب انگریزوں کو عربی پاشا کی بغاوت میں کامیابی ہو گئی اور مصر کی حکومت عملاً ان کے قبضے میں آگئی تو اب سوڈان کی طرف پوری قوت کے ساتھ انہوں نے اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ ۱۸۹۶ء میں لارڈ کچنر کی کمانڈ میں انگریزوں اور مصریوں کی متحدہ فوجوں کی مدد سے مہدی سوڈانی کے جانشینوں کے خلاف جنگی کارروائی شروع ہوئی جو دو سال تک جاری رہی آخر ۱۸۹۸ء میں یہ طاقت بالکل ٹوٹ گئی اور کچنر کی فوجیں پورے سوڈان پر قابض ہو گئیں، عوام کے دل سے مہدی سوڈانی کی عظمت کو دور کرنے اور اپنی آتشِ غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لئے انگریزوں نے ان کی قبروں کو پامال کیا اور قبر سے ان کی ہڈیاں نکال ان کی توہین و تذلیل کی[۵]

---

۵ فٹ نوٹ دیکھئے صفحہ ۳۵۲ پر

قسطنطنیہ اور قاہرہ نے یہ سُنا تو خوش ہوئے کہ ایک "دغا باز" کا اچھا حشر ہوا۔ مگر انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ اگرچہ "مہدی سوڈانی" سے اُن کا پیچھا چھوٹ گیا ۔ مگر اب برطانوی سلطنت کی شکل میں اس سے کہیں زیادہ زبردست و طاقتور مہدی اُن پر مُسلط ہو گیا۔

مرا از دستِ گُرگے در ربودی
چو دیدم عاقبت خود گرگ بودی

مہدیت کی شکست کے بعد ۱۸۹۹ء میں برطانیہ و مصر کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جن کی رو سے سوڈان کی تو تقریباً پوری حکومت برطانیہ کے حوالے کردی گئی اور مصر میں حکومت کی نگرانی کے لئے ایک گورنر جنرل کا رہنا طے ہوا، پہلا گورنر جنرل لارڈ کچنر ہی کو بنایا گیا۔

مہدی سوڈانی کو مہدیت کا مدعی ہونے کی وجہ سے کافی بدنام کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے مذہبی عقائد خواہ کچھ ہوں لیکن اس کی تحریک کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ مصری عوام نے اسے آزادیٔ مصر کی تحریک سمجھا۔ خصوصاً سوڈان کے باشندوں میں یہ جذبہ پوری قوت سے اُبھر آیا۔ لیکن مصری ترکی اور برطانوی تینوں شاہی اقتدار، عوام کی اس تحریک کو کچلنے میں مختلف عنوانات سے متحد ہو گئے جس نے تحریک کا خاتمہ کر دیا۔

مصر کی حالت برطانوی اقتدار کے ماتحت لیکن اگرچہ مصر اور سوڈان کی اصلی حکمرانی برطانیہ کے اثر و اختیار میں تھی، اگر ظاہر

بقیہ صفحہ ۲۵۱

لہ الحاضر العالم الاسلامی جلد دوم از امیر شکیب ارسلان و دی میکنگ آف ماڈرن ایجپٹ از سر آک لینڈ کالون۔ ایجنٹ از زینگ اور The Lost Oasis از حسنین بے

میں کہا بھی جاتا تھا کہ مصر ترکی کا ایک صوبہ ہے جہاں ترکی کے ایک حاکم اعلیٰ کے تحت خدیو حکومت کرتے ہیں۔ برطانیہ نے علانیہ طور پر کبھی اس امر کا اقبال نہ کیا کہ مصر پر وہ حکمراں ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ عہدِ عثمانی کے آئین وضوابط کی پابندی کرتے تھے حتیٰ کہ بہت سے انگریز ترکی ٹوپی پہنتے تھے اور "باب عالی" سے انھیں "پاشا" کا جو خطاب دیا جاتا تھا اُسے بڑے فخر کے ساتھ اپنے ناموں کے ساتھ لکھتے تھے ـــــ لیکن یہ سب محض ظاہرداری کے طور پر ہوتا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت اس کا موقعہ نہ تھا کہ سلطان ترکی سے کھلی جنگ مول لے لی جائے، اندرونی طور پر مصر کا "خدیو" انگریزی ایجنٹ ہی ہوتا تھا۔ اس انگریزی ایجنٹ کے ماتحت مصر میں جس قسم کی حکومت ہوتی تھی اس کی ایک جگر شگاف شہادت آئرلینڈ کے ایک مشہور ومعروف ادیب وفلسفی برنارڈ شا نے اپنی ایک تمثیل (John Bull's Other Islands) کے دیباچے میں پیش کی ہے، جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

۱۳ر جون سنہ ۱۹۰۶ء کو پانچ انگریزی افسر خاکی لباس پہنے ایک گاؤں میں پہنچے اور کبوتروں کا شکار کرنا چاہا۔ مصر میں یہ دستور ہے کہ کچی اینٹوں کے گنبد گاؤں کے اطراف میں بنا لیتے ہیں اور ان میں کبوتر پالتے ہیں۔ یہ کبوتر گاؤں والوں کی گذر بسر کا بہت بڑا ذریعہ ہوتے ہیں، اسی بناء پر انگریزی افسروں کو حکم تھا کہ وہ گاؤں کے "عمدہ" (چودھری) کے مشورے بغیر کبوتروں کا شکار نہ کیا کریں۔ یہ حکم اس لئے دیا گیا تھا تاکہ گاؤں کا چودھری انھیں بتا سکے کہ فلاں حد تک جو کبوتر ہیں وہ کاشتکاروں سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے اس حد کے اندر کسی کبوتر پر گولی نہ چلائیں یا اگر وہ اسے بھی نامناسب سمجھے تو شکار کی اجازت ہی نہ دے۔

جب یہ انگریز افسر گاؤں میں پہنچے تو اتفاق سے اُس وقت "چودھری" موجود نہ تھا۔ اس لئے "نائب چودھری" کے پاس گئے اور اس سے ڈانٹ ڈپٹ کر اجازت

چاہی۔ اس بیچارے نے ڈر کر کہا کہ گاؤں کے اندر تو نہیں، البتہ گاؤں کے حدود سے کافی فاصلے پر آپ شکار کر سکتے ہیں، یہ اجازت پاکر انہوں نے گاؤں سے صرف سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر پہنچ کر دنادن بندوقیں چلانا شروع کر دیں، قدرتاً اتنی دور تک کبوتر اڑتے ہی رہتے ہیں اور اگر نہ بھی اُڑیں تو گولی ان تک اڑ کر جا سکتی ہے۔ گاؤں کے غریب کسانوں نے جب اپنی جائداد کو اس طرح گولیوں کا نشانہ بنتے دیکھا تو پہلے تو بہت کچھ چیخ و پکار مچائی، مگر جب ان کی کسی نے نہ سُنی تو انہوں نے ایک نوجوان افسر کے ہاتھ سے بندوق چھیننا چاہی۔ اس چھینا جھپٹی میں بندوق چل گئی جس سے تین مصری فلاح (کسان) اور ایک نوجوان لڑکی زخمی ہو گئے۔ مگر لڑکی کا زخم چونکہ ٹھیک چھاتی پر تھا، اس لئے وہ جانبر نہ ہو سکی اور کچھ دیر بعد مر گئی، ادھر اس لڑکی کے نوجوان شوہر مسمی عبدالنبی کے غلہ گاہنے کے فرش میں آگ لگ گئی، اس پر سارا گاؤں بھڑک اٹھا اور تمام چھوٹے بڑے اور بوڑھے جوان اکٹھے ہو گئے۔ عبدالنبی نے مشتعل ہو کر اپنی بیوی کے قاتل پر لاٹھی سے حملہ کیا۔ ایک اور شخص مسمی حسن محفوظ نے بھی جس کی عمر ساٹھ سال تھی اور جو کبوتروں کے شکار اور انگریزوں کے طرزِ عمل سے تنگ آچکا تھا، اس نے بھی لاٹھی سنبھالی، لڑکوں نے پتھر اور اینٹیں پھینکیں، ان افسروں میں دو آئرلینڈ کے رہنے والے تھے اور ایک انگلستان کا۔ جب ہجوم بہت ہو گیا تو دو افسر بھاگ گئے تاکہ مدد لے کر آئیں، مگر چونکہ سخت گرمی کا موسم تھا اس لئے ایک افسر کو تو لُو لگ گئی اور وہ قریب کے ایک گاؤں تک جاتے جاتے مر گیا۔ دوسرا پولیس کی چوکی تک پہنچا اور مدد لے کر روانہ ہوا ——— اس عرصے میں بقیہ تین افسروں کو گاؤں کے چودھری اور بعض دوسرے بوڑھے مصری کسانوں نے ہجوم کے نرغے سے چھڑا کر اپنے گھر میں پناہ دے دی تھی، البتہ اس وقت ہجوم نے ان کی خوب مرمت کر دی تھی جس کی وجہ سے ایک افسر کی ہڈی پہنچے کے قریب سے ٹوٹ گئی تھی۔ مگر جب ان

کو چھڑا لیا گیا تو فوراً ہی بحفاظت تمام ایک گاڑی میں بٹھا کر ان کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔

لیکن انگریزی ایجنٹ لارڈ کرومر کو جب اس واقعہ کی خبر ملی تو وہ سخت غضبناک ہوا۔ فوراً تمام گاؤں والے گرفتار کئے گئے اور سرسری تحقیقات کے بعد جو سزائیں دی گئیں ان کی تفصیل یہ ہے:۔

عبد الغنی کو عمر بھر کی قید سخت۔ اس کے ساتھ ایک اور بیس سالہ نوجوان کو بھی یہی سزا۔ ساٹھ سالہ حسن محفوظ کو پھانسی اور وہ بھی اس کے گھر کے سامنے جہاں اس کے عزیزوں نے چھت پر کھڑے ہو کر یہ جگر شگاف منظر دیکھا۔ اس کے علاوہ تین اور گاؤں والوں کو پھانسی کی سزا دی گئی جن کی عمریں پچاس، بائیس اور بیس تھیں۔ پھر پھانسی دینے کا طریقہ یہ رکھا گیا کہ ہر پھانسی پانے والے کو آدھ گھنٹے تک لٹکا رہنے دیا جاتا تھا اور اس آدھ گھنٹے کے دوران میں بقیہ کسانوں کو پچاس پچاس کوڑے مارے جاتے تھے، پھانسی اور عمر قید کی ان سزاؤں کے علاوہ ایک کو پندرہ سال قید سخت، چھ کو سات سال قید سخت، تین کو ایک سال قید سخت، مع پچاس پچاس کوڑے، اور پانچ کو صرف پچاس پچاس کوڑے۔

یہ تھی وہ سزا جو ایک انگریز کے لُو سے مر جانے اور چار کے مشتعل ہجوم سے پیٹے جانے پر صادر کی گئی ——!!

اس سزا کو نافذ کرنے کے بعد مصر کے ایجنٹ لارڈ کرومر کی طرف سے برطانوی پارلیمنٹ کو جو رپورٹ بھیجی گئی اس کے الفاظ یہ تھے: "——سزاؤں کے نافذ کرنے میں مناسب عظمت وشان کو قائم رکھا گیا۔ .... "انسانیت" کے پورے احساسات کو ملحوظ رکھا گیا۔ .... انتظام قابلِ تعریف تھا اور جن جن انگریزی حکام نے اس انتظام میں حصہ لیا وہ اس پر بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں۔ ..... ان تمام

سزاؤں کو مصریوں نے شاندار صبر و استقلال کے ساتھ کلمہ پڑھتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے قبول کیا.....“

لیکن واقعہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس کا تتمہ یہ ہے کہ ایک ۲۶ سالہ نوجوان مسمی حسن زک زوک نے انگریزی عدالت کے سامنے شہادت دیتے وقت بیان دیا کہ ——

”جب نوجوان لڑکی کے گولی لگ چکی تھی تو انگریزی افسروں نے ہجوم پر دوبارہ گولی چلائی“

لیکن یہ شہادت چونکہ مخالف پڑتی تھی اس لئے اس سے پوچھا گیا:۔

”کیا تم کو یہ کہتے ہوئے کوئی خوف نہیں ——؟“

اس سوال کے جواب میں اس نے کہا:۔

”دنیا کی کوئی طاقت مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتی۔ سچ بہر حال سچ ہے“

اس جواب کو سن کر اس سے کہا گیا: ”چلے جاؤ“ اور اس کے بعد اس ”مجرم“ کی پاداش میں کورٹ آف ڈسپلن کے سامنے اس پر مقدمہ چلایا گیا جس نے اسے دو سال کی سزا دی اور پچاس کوڑے اس پر مزید۔

ان تمام سزاؤں پر انگریزی ایجنٹ لارڈ کرومر نے ارشاد فرمایا کہ

”قیدیوں کے مقدمے کی کارروائی کامل غیر جانبداری کے ساتھ کی گئی“

برٹش پارلیمنٹ میں جب یہ تمام قصہ پیش ہوا تو سر ایڈورڈ نے لبرل (آزاد خیال) گورنمنٹ کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے ان تمام کارروائیوں کو نہ صرف حق بجانب قرار دیا بلکہ انتہائی جوش و جذبے کے ساتھ ایوان سے اپیل کی گئی کہ وہ اس پر نکتہ چینی یا اظہار ملامت نہ کریں اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ عبد النبی اور حسن محفوظ وغیرہ نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام پر عیسائیت کے خلاف ایک زبردست سازش شروع کی تھی اور وہ افریقہ اور ایشیا سے عیسائی مذہب کا اسی طرح قلع قمع کر دینا چاہتے تھے جس طرح غدر ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے چاہا تھا۔

سر ایڈورڈگی اس گل افشانی پر برنارڈشا نے لکھا ہے:-

یہ احمقانہ افسانہ طرازی جو طلسم ہوش رُبا کی داستانوں کی طرح لغو، بے سروپا اور مضحکہ خیز ہے، تعجب ہے کہ اس سے سمجھدار اور سیاسی تجربہ کار انسانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش کی گئی ...... اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ اس قسم کی کوئی سازش موجود بھی تھی تو انگلستان کو باعزت طور پر بہادری سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے تھا، بجائے اس کے کہ چند غریب کسانوں کا گلا گھونٹ کر اور کوڑوں سے ان کے بدن کو خونا خون کر کے اسلام کو دبانے کی کوشش کی جاتی ......"

برنارڈشا نے ان واقعات کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ تمام تفصیلات کسی اخبار یا رسالے سے ماخوذ نہیں ہیں بلکہ پارلیمنٹ کی سرکاری روئداد نمبر ۳، اور ۴ (مصر سنہ ۱۹۰۶ء) سے اخذ کی گئی ہیں۔

لیکن اس ایک واقعہ کے علاوہ جس کی گونج پارلیمنٹ تک پہنچی بہت سے واقعات ایسے ہیں جو مصر تک محدود رہے ان واقعات کو بھی ایک انگریز ڈبلیو ایس بلنٹ (W. S. Blunt) نے ایک پمفلٹ میں جس کا نام "مصر میں برطانوی حکومت کی سختیاں" ہے، بیان کیا ہے لیکن اس کے اقتباسات کو یہاں درج کرنا باعث طوالت ہوگا۔

آخر میں یہ جان لینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ لارڈ کرومر صاحب جب اپنے بڑھاپے اور ضعف قوئی کی بنا پر ریٹائر کئے گئے تو ان کی شاندار خدمات کا اعتراف اس طرح کیا گیا کہ پچیس ہزار گنی کا نقد انعام ان کی خدمت میں پیش ہوا۔ اور "لندن ٹائمز" نے ان کی شان میں قصیدہ پڑھتے ہوئے لکھا "—— مصر کی تاریخ میں اتنی انصاف پسند، روشن خیال اور منظم حکومت اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی جس کا سہرا صرف لارڈ کرومر کے سر ہے۔"[1]

---

[1] افتتاحیہ لندن ٹائمز ۱۳ اپریل ۱۹۰۷ء

جمال الدین افغانی کی آمد مصر کی سیاسی ابتری و بدحالی کا یہی زمانہ تھا جب عالمگیر اتحاد اسلامی کے قائد اعظم سیّد جمال الدین افغانی مصر پہنچے۔ اسمعیل پاشا کی فضول خرچیوں اور عیش پرستیوں سے پورا ملک انگریز مہاجنوں کے ہاتھ رہن ہو چکا تھا، غربت و افلاس کے بھوت ہر طرف ناچ رہے تھے، حکومت کے شعبوں میں رشوت ستانی و سفارش گردی کا زور تھا، عوام بے چین تھے، نوجوان خفیہ انجمنیں بنا رہے تھے اور مصر کی حکومت سخت سے سخت قوانین نافذ کر کے انھیں دبا رہی تھی، ان حالات میں جمال الدین جیسی شخصیت کا خیر مقدم جتنا بھی کیا جاتا کم تھا۔ چنانچہ ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ چند ہی دن کے قیام میں مصر کی اپاہج حکومت کے وزیر اعظم ریاض پاشا اور ولیعہد حکومت شہزادہ توفیق تک سید صاحب کے حلقہ معتقدین میں داخل ہو گئے۔ جامعہ ازہر جو نہ صرف مصر کی بلکہ کل دنیائے اسلام کی سب سے بڑی اور سب سے پرانی دینی درسگاہ ہے اس کے نوجوان طلبا میں سید موصوف کی ہر دلعزیزی غیر معمولی حد تک پہنچ گئی چنانچہ آپ نے یہاں ایک سیاسی جماعت بنائی جس کے تین سو کے قریب ممبر تھے۔ اس کے علاوہ مصر کی دوسری انجمنوں اور جماعتوں میں بھی آپ کی اسپرٹ کام کرنے لگی اور جمال الدین کے پیام نے مصر میں ایک حیاتِ تازہ پھونک دی، مگر جب اسمعیل پاشا کے بعد اس کا بیٹا توفیق جانشین ہوا، تو جمال الدین کا معتقد ہونے کے باوجود اس نے اپنی بیدست و پا حالت کو محسوس کیا اور جلد ہی اسے یہ یقین ہو گیا کہ اگر سیاسی تحریک یونہی چلتی رہی تو اُسے بھی اپنے باپ اسمعیل کی طرح تخت سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس اندیشے سے اس نے اتحاد اسلامی کے اس بطلِ جلیل کے اخراج کا حکم صادر کر دیا[1]

---

[1] الحاضر العالم الاسلامی جلد دوم صفحہ ۲۹۱-۲۹۲

مگر مصر کی حالت ایسی نہ تھی کہ اس اخراج سے سنبھل جاتی۔ نوجوانوں میں بے اطمینانی و بے چینی نے زبردست جوش پیدا کر دیا تھا اور وہ سخت سے سخت بغاوت کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ چنانچہ سید جمال الدین کے اخراج کے چند ہی دن بعد مصر کی ایک غیر معمولی شخصیت مفتی عبدہٗ کو دیس نکالا دیا گیا، ان کے علاوہ اور بہت سے مصریوں کو مصر کی حدود سے باہر ڈھکیلا گیا، مگر یہ لوگ مصر سے نکل کر مصر کی تحریکِ آزادی کو جاری رکھتے تھے۔ چنانچہ جب سید جمال الدین نے پیرس سے العروۃ الوثقیٰ کے نام سے ایک اخبار نکالا تو مصر کے بہت سے لیڈروں نے اس میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ اس اخبار کے ذریعے جس قسم کے خیالات کی اشاعت کی جاتی تھی اُس کا اندازہ کرنے کے لئے ذیل میں اس کے دو اقتباس درج کئے جاتے ہیں:۔

"—— انسانی فطرت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ ایک حد تک تو ظلم و زیادتی کو برداشت کر سکتی ہے لیکن جب ظلم و زیادتی حد سے متجاوز ہو جاتا ہے تو پھر بزدل سے بزدل میں بھی شیر کی سی صفات پیدا ہو جاتی ہیں اور لومڑی بھی بھیڑیا بن جاتی ہے اور بالآخر ظلم سے نجات کا راستہ دریافت کر لیتی ہے۔

آجکل مشرقی قوموں پر ظلم و زیادتی کی حد ہو چکی ہے۔ ہر بیکس و بے بس قوم غربت و افلاس کا شکار بنی ہوئی ہے، خاص کر مسلمانوں کی حالت تو انتہائی المناک ہے۔ ان کے بادشاہوں کا اقتدار و اختیار چھینا جا چکا ہے۔ عوام کے حقوق غصب ہو چکے ہیں، عزت والے اپنی عزتوں سے محروم بنائے جا چکے ہیں، جو دولت مند تھے، وہ فقیر ہو چکے ہیں، کل تک جو تندرست و توانا تھے، آج وہ اپاہج اور کمزور ہیں۔ کل تک جو شیر تھے، آج وہ گدھوں سے بدتر ہیں۔ خصوصاً پچھلے پانچ چھ سال کے دوران میں سرزمینِ مصر میں مذکورہ بالا مصائب و آلام کی جو بارش ہوئی ہے وہ تو حد سے فزوں ہے۔ لیکن یاد رہے

کہ وہ، جو مصائب و آلام کی اس بارش کے ذمہ دار ہیں، انشاء اللہ اس کا ایسا پھل پائینگے کہ باید و شاید، یعنی انہوں نے جو پودا یہاں بویا ہے اس کا نہایت کڑوا پھل ان کے نصیب میں لکھا ہے۔

یورپ کی قوموں کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

یہ قومیں جو حرص و آز کا مجسمہ ہیں، جہاں پہنچتی ہیں دوست بن کر پہنچتی ہیں اور بڑی میٹھی میٹھی باتیں بناتی ہیں لیکن آہستہ آہستہ انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑنا شروع کر دیتی ہیں۔ کہیں وہ اپنی آمد کا باعث بادشاہ کے اختیار و اقتدار کی حفاظت بتاتی ہیں، کہیں دشمنوں کے نرغے سے ملک کو بچانے کے نام سے وارد ہوتی ہیں، کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ حکومت کی مالی حالت کو مستحکم و مضبوط بنانے کے لئے آئے ہیں، کہیں حکومت کے باغیوں کی سرکوبی کے لئے مہمان بنتی ہیں۔ غرض جہاں جاتی ہیں اسی طریقے سے جاتی ہیں۔ مگر زیادہ دن گزرنے نہیں پاتے کہ نظم و نسق پر غلبہ پالیتی ہیں۔"

جمال الدین افغانی کے ان خیالات نے مصری نوجوانوں کو بے حد متاثر کیا اور ان میں زبردست سیاسی بیداری، سیاسی شعور اور سیاسی احساس پیدا کرنے میں بہت مدد دی۔ چنانچہ سعد زاغلول پاشا جنھیں مصری تحریک آزادی کا ناخدائے اعظم کہنا چاہیئے اور اسی قسم کے دوسرے ممتاز مصری رہنما اس اخبار کے مقالہ نگاروں میں داخل تھے۔

انگلستان میں مسٹر بلنٹ[1] مصری تحریک آزادی کے حامیوں میں سے تھے اور

---

[1] مسٹر بلنٹ نے مصر پر برطانوی تسلط کے اندرونی رازوں کا پردہ اپنی ایک کتاب میں فاش کیا ہے جس کا نام Secret History of the English Occupation of Egypt ہے اور جسمیں بہت دلچسپ حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے۔ اس کتاب نے انگلینڈ میں بڑی ہلچل مچائی تھی اور اس کی تردید میں خوب خوب گل افشانیاں کی گئی تھیں۔

اس سلسلے میں کافی بدنام تھے۔ جمال الدین کو اُن سے کچھ آس بندھی تو پیرس سے لندن پہنچے انگلستان میں اس وقت گلیڈ اسٹون وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر متمکن تھے اور لبرل پارٹی کی آزادی سندی اور انسانیت نوازی کی دھوم مچی ہوئی تھی جو وزیر اعظم آئرلینڈ کی غلامی کو برداشت نہیں کرسکتا تھا اور اُسے ہوم رول دینے کے لئے بیقرار تھا۔ اس سے یہ توقع بیجا نہ تھی کہ مصر کی حالتِ زار پر بھی نگاہِ کرم سے دیکھے گا چنانچہ بلنٹ کی وساطت سے جمال الدین نے پارلیمنٹ کے ممبروں سے ملاقاتیں کیں، مگر مصر کو خالی کر دینا، برطانیہ کیسے گوارا کرسکتا تھا، خالی کر دینا تو درکنار لارڈ کرومر صاحب سے بھی کسی نے یہ نہ پوچھا کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں اور وہ مسلسل تیس سال تک اپنی ایک ہی پالیسی کے ساتھ مصر کے جزو کل پر چھائے رہے۔ البتہ جب عام بے چینی بڑھ جاتی تھی تو خدیو یہ نزلہ گر جاتا تھا۔ ۱۸۷۹ء میں اسمٰعیل پاشا معزول ہوئے اور توفیق پاشا مسند نشین ہوئے لیکن بارہ تیرہ سال بعد اُنھیں بھی معزول کیا گیا اور ۱۸۹۲ء میں عباس ثانی کو گدی پر بٹھایا گیا۔

جنگِ عظیم اور مصر

غرض مصر کے یہ حالات تھے جب ۱۹۱۴ء میں جنگ کا اعلان ہوا۔ آغازِ جنگ کے چند دن بعد برطانیہ کی طرف سے مصر کی بابت یہ اعلان کیا گیا کہ ——— مصر کو ملک معظم کی حمایت میں لیا جاتا ہے۔ آج کے بعد اسے برطانیہ کا زیر حمایت علاقہ سمجھا جائے گا۔

اس اعلانِ سرپرستی کے بعد مصر کے خدیو عباسِ ثانی کو معزول کیا گیا اور اُس کی جگہ حسین کامل کو سلطانِ مصر کا لقب دے کر مصر کا تخت سونپا گیا۔

اس اعلان کا مطلب صرف یہ بتایا گیا کہ اگر مصر پر کسی نے حملہ کیا تو برطانیہ مصر کی حمایت کرے گا، مصر کے اندرونی نظم و نسق کو بالکل نہ چھیڑا گیا بلکہ خدیو کو سلطان کا لقب دیا گیا اور پُر زور طور پر یہ سمجھایا گیا کہ برطانیہ کی یہ حمایت و سرپرستی محض

جنگ کے زمانے کی مصلحت اندیشی کی بنا پر ہی۔ یہ خیال ہرگز نہیں ہی کہ مصر کو برطانوی سلطنت کا جزو بنالیا جائے۔ مصر جیسا آزاد ہی، ویسا ہی آزاد رہے گا۔ اسی بنار پر مصر کو اس امر پر مجبور نہیں کیا گیا کہ وہ اتحادیوں کی حمایت میں جنگ میں شریک ہو لیکن یہ محض دکھادے کی بات تھی۔ جنگ کے زمانے میں مصر کی جو کچھ حالت تھی وہ اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج کے ان الفاظ سے بخوبی ظاہر ہوتی ہی:۔

"مصر نہ تو لڑ رہا تھا اور نہ غیر جانبدار تھا۔ وہ جنگ کی ہماہمی کے بیچ میں تھا مگر پھر بھی اس میں شامل نہ تھا۔۔۔۔ انگلستان کی نظر میں مصر جنگ کا تھیٹر اور عظیم ترین اہمیت کا مسلح جنگی کیمپ بنا ہوا تھا۔ لیکن خود مصری اپنی اندرونی مشکلات ومصائب میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہ مشکلات ومصائب ایسے تھے کہ مصریوں کو جنگ کے سوال پر سوچنے کا موقعہ شاذونادر ہی مل سکتا تھا۔"

لیکن حقیقت یہ ہی کہ اس صورتِ حالات نے مصریوں کو سخت ترین مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ جنگ کے پورے چار سال کے طویل زمانے میں جس بُرے برتاؤ کا نشانہ وہ بنائے گئے اس کا تصور بھی آپ نہیں کر سکتے۔ اگرچہ برطانیہ نے صاف طور سی یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ مصریوں کو جنگ کے لئے بھرتی نہیں کرے گا، مگر اس کے باوجود "امدادی فوج" کے نام سے مصری نوجوانوں کی ایک فوج تیار کی گئی جو ترکوں کے خلاف میدانِ جنگ میں لڑائی گئی۔ اس کے علاوہ ہزاروں کسانوں کو ناقص اجرتیں دے کر جبراً کام لیا گیا۔ دریائے نیل کے دہانے کے پورے علاقے میں مارشل لا نافذ تھا۔ اور مصری عوام برطانوی فوج کے لئے لکڑیاں چیرنے والے اور پانی ڈھونے والے رہ گئے تھے۔

خراں را کسے در عروسی نہ خواند
مگر وقت آں کاب د ہیزم نماند

غلے کی تمام پیداوار فوجی ضروریات کے سلسلے میں ضبط کی جاچکی تھی اور روئی کی پوری کی پوری فصلیں بھی بہت ہی معمولی نرخ پر خرید لی جاتی تھیں، اونٹ اور خچر جو مصریوں کی گرانمایہ ترین پونجی ہیں اور جن سے وہ ویسی ہی محبت کرتے ہیں جو ایک فوجی اپنے گھوڑے سے کرسکتا ہے وہ سب فوجی ضروریات کے لئے طلب کرلئے گئے تھے۔ غرض قاہرہ اور اسکندریہ کے ہوٹل والوں کو چھوڑکر، جنہوں نے خوب نفع کمایا، باقی سارا مصر جنگ کے دوران میں سخت مصیبت میں مبتلا رہا۔ مصری انگریزوں کے سخت شاکی تھے اور گڑ گڑا کر اس دن کی دعا مانگا کرتے تھے جب جنگ ختم ہوگی اور انگریزی چھاؤنیاں مصر سے واپس جائیں گی۔ چنانچہ مصری کسانوں (فلّاحین) میں یہ گیت اُس زمانے میں عام طور سے گایا جاتا تھا۔

وائے برما ونگیٹ![1]
جو سارا غلہ لے گیا۔
جو تمام مویشی لے گیا
جو سب بچے لے گیا
بس ہماری جانیں رہ گئیں
خدایا! اب تو ہمیں نجات دلا![2]

جب جنگ ختم ہوئی اور التوائے جنگ کے صلحنامے پر دستخط ہوئے تو مصر نے سمجھا کہ اب اس کی مصیبتوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ پھر ولسن کے چودہ نکات بھی فضا میں گونج رہے تھے اور ہر طرف سے یہ آواز اٹھ رہی تھی کہ انہی نکات کو دنیا کے امن کی

---

[1] یعنی سر ریجی نالڈ ونگیٹ جو سنہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۹ء تک مصر میں برٹش ہائی کمشنر تھا۔

[2] منقول از پوسٹ وار ورلڈ: جیکسن۔

بنیاد دبنا یا جائے گا۔ مصری بہت خوش تھے اور سمجھ رہے تھے کہ اب وہ بھی مکمل طور سے آزاد و خود مختار ہو کر دنیا کی ممتاز و باعزت قوموں کی صف میں کھڑے ہو سکیں گے۔ مگر ان کی امیدوں اور آرزوؤں کی ساری عمارت دفعتہً زمین پر آ پڑی جب پیرس کی صلح کانفرنس میں مصری نمائندہ کو طلب کرنے سے انکار کیا گیا۔ حجاز اور حبشہ کے نمائندوں کو قبول کیا گیا۔ مگر مصر کو یہ اجازت نہ دی گئی۔ برطانیہ کے اس طرز عمل سے مصر کو پہلی بار اس حقیقت کا علم ہوا کہ اب وہ برطانیہ کے اقتدار کے نیچے دبا دیا گیا ہے اور آزادی کی نعمت سے وہ علانیہ طور پر محروم کر دیا گیا ہے۔

عوام کی بے چینی اور آزادی کی جد و جہد

اب تک مصر خود کو آزاد سمجھتا تھا۔ ترکوں کا برائے نام جو اقتدار تھا، اس کی نسبت اس کا خیال تھا کہ چند دن کا مہمان ہے لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی ترکی کا سلطان بہر حال خلیفۃ المسلمین تھا اور مذہب و معاشرت اور آداب و روایات کے لحاظ سے ترک بہر صورت مصریوں سے بہت قریب تھے۔ لیکن برطانیہ میں ایسی کوئی بات نہ تھی مصر اور انگلستان، زبان، مذہب، رسوم و رواج، آدابِ معاشرت یا تاریخ و روایات کسی لحاظ سے بھی باہم قریب نہ تھے۔ پھر لارڈ کرومر اور لارڈ کرومر کے بھائی بندوں کی ایجنسی کا زمانہ بھی مصر کو یاد تھا اور زمانۂ جنگ کے مصائب کا نقشہ بھی دماغوں سے محو نہ ہوا تھا، اس لئے برطانیہ کے اس طرزِ عمل کو معلوم کرتے ہی۔ مصر میں غیظ و غضب کی ایک آگ لگ گئی سعد زاغلول پاشا اس وقت سب سے زیادہ نمایاں، ممتاز اور ہر دلعزیز رہنما تھے جو کئی بار مصر کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ انہوں نے مصر کے مطالبۂ آزادی کو منوانے کے لئے ایک جماعت بنائی جو وفد کے نام سے موسوم ہے اس جماعت میں جوق در جوق لوگ شامل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مصر میں ایک تہلکہ برپا کر دیا۔ برطانیہ نے جب یہ حالت دیکھی تو مارچ ۱۹۱۹ء میں

زاغلول پاشا کو ان کے تین ہر دلعزیز رفیقوں سمیت گرفتار کر کے جلا وطن کر دیا۔

برطانیہ کے اس عمل نے آگ پر تیل کا کام دیا۔ اب مصریوں کا غم و غصہ قابو سے باہر تھا۔ پھر چونکہ لیڈر گرفتار ہو چکے تھے اس لئے عوام کے جذبات پر کنٹرول کرنے والا بھی کوئی نہ رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ توڑ پھوڑ کا جہاد انتہائی سختی کے ساتھ شروع ہو گیا، ٹیلیگراف کے تمام تار کاٹ دیئے گئے، قاہرہ کے چاروں طرف جتنی ریلیں جاتی تھیں ان سب کی پٹریاں اکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔ سوڈان سے جو ریلوے لائن آتی تھی اُسے ایک نہ دو پورے دو سو مقامات سے توڑ ڈالا گیا، غرض ہر برطانوی مستقر کو دنیا سے منقطع کر دیا گیا: نہ ریل باقی رہی نہ تار، نہ وائرلیس، توڑ پھوڑ کے اس جہاد میں خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ نہایت امن و سکون سے عمل میں لایا گیا اور خونریزی و قتل و غارتگری سے بالکل کام نہ لیا گیا البتہ ایک اور صرف ایک گاؤں کی چوکی میں عوام کا جوش قابو سے باہر ہو گیا تھا جہاں اٹھارہ انگریز مارے گئے تھے لیکن اس کے علاوہ پورے مصر میں نہ تو خون کا ایک قطرہ گرایا گیا اور نہ لوٹ مار مچائی گئی

برطانیہ نے جب یہ دیکھا تو لارڈ ایلن بائی کو ہائی کمشنر بنا کر بھیجا گیا تا کہ بغاوت کو کچلا جائے، لارڈ ایلن بائی جنگ عظیم میں کامیاب کمانڈر ثابت ہوا تھا اور اسی کی کمانڈ میں ترکوں کو فلسطین میں شکست ہوئی تھی۔ جنگ عظیم کے دوران میں عرصے تک اس کا مستقر قاہرہ رہا تھا اور اس نے مصریوں سے بہت کچھ کام لیا تھا۔ اس لئے یہ سمجھا گیا کہ لارڈ مذکور چونکہ مصریوں کی ذہنیت سے بخوبی واقف ہے اور فوجی جنرل ہونے کی وجہ سے تشدد و سختی کرنا بھی خوب جانتا ہے، اس لئے وہ مصریوں کو راہ راست پر لے آئے گا۔ لیکن ایلن بائی جب آیا تو اُس نے دیکھا کہ معاملہ بیڈھب ہے۔ مصر کا بچہ بچہ جوش و جذبات سے لبریز

ہے اور آزادی کے مقابلے میں جان کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس حالت میں جتنا تشدد بھی کیا جائے گا، اشتعال بجائے کم ہونے کے اور بڑھے گا۔ یہ حالت دیکھ کر اس نے تشدد کی پالیسی کے بجائے مفاہمت کی پالیسی اختیار کی۔ زاغلول پاشا اور اُن کے تینوں رفیق جلاوطنی سے واپس بلائے گئے اور لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تاکہ امن و امان قائم کیا جائے، ایلن بائی نے اپیل کی کہ موجودہ جدوجہد کو ختم کیا جائے۔ برطانیہ مصر کے مطالبہ آزادی پر غور کرنے کے لئے تیار ہے۔

مشروط آزادی کا اعلان

اس اپیل پر توڑ پھوڑ کا جہاد واپس لے لیا گیا۔ اب اس کی جگہ زیادہ پُر امن حربے یعنی ہڑتالیں اور پکیٹنگ اختیار کئے جانے لگے۔ جوش نہیں دبا، صرف جوش کے اظہار کا راستہ بدل دیا گیا۔ رفتہ رفتہ برطانیہ کی سمجھ میں آگیا کہ "حمایت و سرپرستی" کے اعلان کو منسوخ کئے بغیر مصر مطمئن نہ ہوگا۔ لیکن یہ سوال سخت مشکل تھا۔ مصریوں کو آزاد کر دینا کوئی بڑی بات نہ تھی، لیکن خشکی، تری اور ہوائی راستے کے لحاظ سے مصر کی جو زبردست اہمیت ہے، اُس سے بے تعلق ہو جانا برطانوی مفاد کے سخت خلاف تھا۔ اِس سوال پر برطانوی مدبروں نے سر کھپایا اور بالآخر ۲۸ فروری ۱۹۲۲ء کو ایک اعلان کیا جس میں مصر کو مختارِ مطلق آزاد ریاست تسلیم کیا گیا ——— مگر اس کے ساتھ ایک بہت بڑا "لیکن" بھی تھا اور اسی "لیکن" میں برطانوی مدبروں نے اپنے قومی مفاد کو پوشیدہ کیا تھا، وہ "لیکن" یہ تھا:-

> "جب تک وہ وقت آئے کہ جانبین کی آزادانہ گفت وشنید اور دوستانہ مصالحت جوئی سے کوئی سمجھوتہ ہو، مندرجہ ذیل اُمور کلیۃً برطانوی اختیار میں رہیں گے:-

۱۔ سلطنتِ برطانیہ کے مصری ذرائعِ آمد و رفت کی نگرانی۔

۲۔ مصر پر حملہ یا مداخلت کرنے والی ہر بدیسی طاقت کا مقابلہ، خواہ یہ حملہ یا مداخلت براہِ راست ہو یا بالواسطہ۔

۳۔ اقلیتوں کی حفاظت اور مصر کے خارجی معاملات کا تصفیہ

۴۔ سوڈان کی حکومت

اعلانِ آزادی کی ان شرائط پر مصریوں میں سخت ہنگامہ اٹھا، خصوصاً پہلی اور دوسری شرط پر بہت شور مچایا گیا۔ پہلی شرط کی توضیح لارڈ لائڈ کے الفاظ میں یہ تھی:۔

"برطانوی ذرائع آمدرفت سے صرف نہر سوئز ہی مراد نہیں بلکہ وہ تمام راستے مراد ہیں جو ہندوستان اور آسٹریلیا تک جانے کے لئے نیز ایران، عراق اور چین تک پہنچنے کے لئے سمندر، ہوا، یا زمین سے گذرتے ہیں اور جن سے ہمارے تجارتی اور سیاسی مفاد زبردست طور پر وابستہ ہیں۔ علاوہ ازیں اس شرط میں وہ راستے بھی شامل ہیں جو ہماری افریقی مقبوضات تک جاتے ہیں"

مصر اس امر کو تسلیم کرتا تھا کہ برطانیہ کے تجارتی و سیاسی مفاد کے لئے "مصری راستہ" واقعی بہت ضروری ہے اور ان راستوں پر برطانیہ کے مفاد کا حد سے زیادہ انحصار ہے۔ مگر اس کا مطالبہ یہ تھا کہ ان راستوں کی ملکیت و حفاظت کو مصر کے حوالے کر دیا جائے اور پھر مصر اور برطانیہ کے درمیان ایک ایسا سمجھوتہ کر لیا جائے جس سے برطانیہ کے مفاد کی کامل حفاظت ہو جائے بالفاظِ دیگر مصر غیر مشروط آزادی چاہتا تھا۔

چوتھی شرط، جو سوڈان کی حکومت سے متعلق تھی، اس کی صورت یہ ہے کہ دریائے نیل کا سرچشمہ سوڈان ہے اور چونکہ مصر کی آب پاشی کا واحد انحصار اسی دریا پر ہے

اس لئے سوڈان گویا مصر کے پانی پر اختیار رکھتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنے علاقے میں کسی جگہ نیل پر بند باندھ کر سارے مصر کو خشک کر سکتا ہے۔ اس معاشی اہمیت کے علاوہ سوڈان اور مصر میں لسانی، معاشرتی اور مذہبی یکسانیت ہے، دونوں کی زبان عربی ہے، دونوں کا مذہب اسلام ہے، دونوں کی معاشرت ایک ہے اور انیسویں صدی سے برابر دونوں سیاسی اعتبار سے بھی ایک ہیں۔ محمد علی پاشا جو مصر کا حاکم تھا اس نے سوڈان کے پایۂ تخت خرطوم کی بنیاد رکھی تھی غرض مصر کا یہ مطالبہ بہت قوی تھا کہ سوڈان کو مصر سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے جواب میں برطانیہ کہتا ہے کہ مہدی سوڈانی نے سوڈان کو مصر سے الگ کر دیا تھا، یہ ہم ہی تھے کہ سنہ ۱۸۸۳ء سے سنہ ۱۸۹۸ء تک مسلسل جنگیں کر کے اسے مہدی موصوف سے چھڑا سکے۔ پھر ہمارا اربوں روپیے کا سرمایہ یہاں لگا ہوا ہے۔ ہم ہی نے یہاں کی روئی کی پیداوار کو ترقی دی ہے۔ ہم ہی نے یہاں ریلوے لائن بچھائی ہے اور بندرگاہ بنائے ہیں۔ اس لئے ہم اس کی حکومت میں حصہ بٹائے بغیر نہیں رہ سکتے —— اس کے جواب میں مصری کہتے ہیں کہ سوڈان میں مہدی سوڈانی کی طاقت کو صرف برطانوی فوجوں ہی نے ختم نہیں کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ مصری فوجیں بھی شامل تھیں۔ علیٰ ہذا القیاس سوڈان کی زمینوں کو زرخیز بنانے اور وہاں نہریں کھودنے میں جو رقم صرف ہوئی ہے اُس میں مصر کا حصہ بہت زیادہ ہے —— مگر برطانیہ کی طاقت ان سب جوابات کو بیکار بنا دیتی ہے۔[1]

---

[1] پوسٹ وار ورلڈ از جیکبن اور ایچیٹ سسن کردہ از لارڈ لائڈ، مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۳۷ء

سعد زاغلول پاشا

مصریوں کی اس جنگِ آزادی میں سعد زاغلول پاشا مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ہٹلر، مسولینی، کمال یا گاندھی ہر ایک سے جدا اپنی ممتاز خصوصیات رکھتے تھے۔ مگر مصریوں میں ان کو جو ہر دلعزیزی اور جو اثر و نفوذ حاصل تھا، اس کے لحاظ سے وہ اِن میں سے کسی سے کم نہ تھے۔ مصری ان کے تدبر ہی کے قائل نہ تھے بلکہ اُن کی شخصیت سے والہانہ عقیدت و محبت بھی رکھتے تھے وہ نہایت بیدار مغز، عالی دماغ اور باہمت و باحوصلہ ہونے کے علاوہ وہ نہایت شیریں زبان، نرم مزاج اور خندہ رو انسان تھے۔ ان کی ان صفات نے عوام کے دلوں کو موہ لیا تھا حتیٰ کہ اگر مصری بُت پرست ہوتے تو اوتار سمجھ کر ان کی پوجا کیا کرتے۔

زاغلول پاشا مصر کے طبقۂ فلاحین (کسانوں) کے ایک خاندان میں ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ مصر کی سب سے پُرانی قومی و دینی درسگاہ جامعہ ازہر میں تعلیم پائی عربی پاشا نے ۱۸۸۲ء میں جب برطانوی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو آپ اس میں پیش پیش تھے۔ یہ بغاوت چونکہ ناکام ہوئی اس لئے آپ گرفتار کر لئے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد رہا ہوئے اور وکالت کی سند حاصل کر کے وکالت شروع کر دی، مگر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے چند ہی دن بعد پہلے جج ہوئے اور مصر کے محکمۂ تعلیمات کے وزیر بنائے گئے۔ اس کے بعد عدل و انصاف کی وزارت کا قلمدان آپ کو سونپا گیا۔ نہایت وجیہ، خوبصورت، شاندار انسان تھے اس لئے ظاہری و باطنی اعتبار سے مصریوں کی آنکھ کا تارا بنے ہوئے تھے۔

"پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پرانی پالیسی کے مطابق برطانیہ نے مصر میں بھی قبطی عیسائیوں کے سوال کو کھڑا کیا تھا۔ قبطی مصر میں ۹ فیصدی کے قریب ہیں۔[۵]

---

[۵] اسٹیٹسمین ایر بک ۱۹۴۷ء

برطانیہ نے قبطی اقلیت کی حمایت میں آواز اٹھائی مگر زاغلول پاشا نے دو قدم آگے بڑھ کر قبطیوں سے سمجھوتہ کرلیا جس کے بعد سے مصر میں اقلیتوں کا کوئی سوال باقی نہ رہا اور برطانیہ کو مجبوراً اپنی گرفتیں ڈھیلی کرنا پڑیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد حب الوطنی کے جرم میں برطانیہ نے دو مرتبہ زاغلول کو جلا وطن کرایا۔ پہلی بار ۱۹۱۹ء میں اور دوسری بار ۱۹۲۱ء میں، لیکن جلا وطنی کی اس سزا نے ان کی مقبولیت و ہر دلعزیزی میں اتنا اضافہ کردیا کہ جب تک وہ زندہ رہے، اُن کی "وفد پارٹی" کا مقابلہ مصری پارلیمنٹ کے انتخابات میں کوئی دوسری پارٹی نہ کرسکی اور ہر مرتبہ وزارتِ عظمیٰ کی کرسی انہی کو دی گئی۔ مگر ہر مرتبہ برطانوی مداخلت سے یہ کرسی ان سے جبراً چھینی گئی اور انھیں استعفا دینے پر مجبور کیا گیا۔[۵]

۱۹۲۲ء میں برطانیہ کی طرف سے جو آزادی مصر کو دی گئی، اس کے مطابق اسمٰعیل پاشا کے بیٹے فواد کو "آزاد" مصر کا آزاد بادشاہ بنایا گیا (حسین کامل ۱۹۱۷ء میں انتقال کر گئے تھے) فواد اپنی ذہنیت کے اعتبار سے انگریزی مفاد کے عین مطابق اور اپنے باپ اسمٰعیل پاشا کا صحیح جانشین تھا۔ باپ نے نہر سوئز کے حصے بیچ کر اور مصر کو بدیسی قرضے کے بوجھ میں لاد کر مصر کی غلامی خریدی تھی۔ لیکن فواد نے محض اپنی مرعوب و ماؤف ذہنیت سے یہ کام انجام دینا چاہا۔ اس نے اٹلی میں تعلیم و تربیت پائی تھی اور مصریوں کے جذبات واحساسات اور رسوم وروایات سے بالکل ناواقف تھا۔ مصری اُس سے نفرت کرتے تھے، مگر برطانیہ کی سنگینوں کی چھاؤں میں وہ مصر کا بادشاہ بنا ہوا تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مصر کی معنوی بادشاہت سعد زاغلول اور سعد زاغلول

---

[۵] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا اور ڈائجسٹ آف نالج۔

کی وفد پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۹۲۲ء کی "مشروط آزادی" کے بعد اپریل ۱۹۲۳ء میں ایک جمہوری دستورِ حکومت کا اعلان بادشاہ کی طرف سے کیا گیا جس کی رو سے دو ایوان بنائے گئے۔ ایک مجلس الشیوخ (اپر چیمبر) اور دوسرا مجلس النوّاب (لوئر چیمبر) دونوں مجلسوں کے ممبر عوام کے منتخبہ تھے۔ البتہ مجلس الشیوخ میں چالیس فیصدی ممبر بادشاہ نامزد کر سکتا تھا۔ اس دستورِ حکومت کے مطابق مصری پارلیمنٹ کا جو پہلا انتخاب ہوا اُس میں وفد پارٹی کے نمائندے زبردست اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ اور سعد زاغلول پاشا نے وزیر اعظم کی حیثیت سے وزارت بنائی۔ مصر کے سامنے اصل سوال یہ تھا کہ اُسے آزادی کامل دی جائے۔ عوام کا جوش و خروش روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ زاغلول پاشا نے برطانیہ کے سامنے بہت سے ایسے عارضی حل پیش کیے جس سے مصری عوام کی بے چینی کا کچھ علاج ہو سکتا تھا۔ مگر برطانیہ نے ایک نہ سُنی۔ اس صورتِ حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کا جوش لیڈروں کے بس سے باہر ہو گیا۔ ایک تند و تیز سیلاب کی طرح قومیت و وطنیت کے جذبات ہر پشتے اور بند کو بہائے لئے چلے جا رہے تھے۔ خفیہ انجمنیں بننا شروع ہوئیں اور ملک میں دہشت انگیزی پھیلانے والے جگہ جگہ سے پیدا ہو گئے۔ انگریز افسروں کی قتل کی وارداتیں کثرت سے ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۴ء میں مصری افواج کا کمانڈر ان چیف اور سوڈان کا گورنر جنرل بھی قتل کر دیا گیا۔ اس قتل پر برطانیہ میں بڑا شور و شغب مچا اور سارا الزام زاغلول پاشا کے سر رکھا گیا۔ کہا گیا کہ ان ہی کی ہمت افزائی سے نوجوان یہ تمام ہنگامہ بپا کر رہے ہیں۔ چنانچہ زاغلول کو مجبور کیا گیا کہ وہ وزارتِ عظمٰے سے استعفا دیدیں۔ مجبوراً انھیں استعفا دینا پڑا۔ لیکن ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ تھوڑے دن بعد مصری پارلیمنٹ نے انھیں اپنا صدر منتخب کر لیا۔ صدر کی حیثیت سے حکومت کے عاملانہ اختیارات پر انھیں کوئی قابو نہ تھا۔ تاہم اس طرح مصری عوام نے یہ ثابت کر دیا

کہ زاغلول اُن کا صحیح نمائندہ ہے

استبداد کا دور اس کے بعد شاہ فواد نے حکومت براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنی فطرت و ذہنیت کے مطابق نظم و نسق چلانا شروع کیا۔ اس خود مختارانہ دور نے مصر میں ظلم و تشدد کا ایک نیا دور شروع کیا، بادشاہ کے حوالی موالی وزارت کی کرسیوں پر بٹھائے گئے اور برطانیہ نے اس صورت حالات کو انتہائی مسرت و اطمینان کی نگاہ سے دیکھا۔

سنہ ۱۹۲۶ء تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد پھر الیکشن آیا۔ اس بار پھر وفد پارٹی کے ممبر غیر معمولی اکثریت کے ساتھ منتخب ہوئے۔ مگر لارڈ لائڈ نے جو مصر کا ہائی کمشنر تھا، زاغلول پاشا کے وزیر اعظم بننے پر اعتراض کیا۔ ہائی کمشنر کے اس اعتراض کے بعد شاہ مصر زاغلول کو وزارت مرتب کرنے کی دعوت کیسے دے سکتا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر "سرکاری وزارت" بنائی گئی اور مصری آئین کے بالکل خلاف وفد پارٹی کو حکومت کی مسندوں سے دور رکھا گیا۔ اس کے ایک سال بعد سنہ ۱۹۲۷ء میں سعد زاغلول پاشا کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۶۷ سال کی تھی۔

مصر کے اس قائد اعظم کی وفات پر ملک کے گوشے گوشے سے ماتم و شیون کی آواز بلند ہوئی وہ لوگ جو وفد پارٹی سے اختلاف رکھتے تھے ان کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں اور مشکل سے کوئی مصری ایسا ہوگا جس نے اس ہر دلعزیز مدبر سیاست کی بے وقت وفات پر نوحہ نہ کیا ہو۔ آج تک مصر کا بچہ بچہ زاغلول کو روتا ہے اور ہمیشہ روتا رہے گا۔ یہ صحیح ہے کہ زاغلول، مصطفےٰ کمال کی طرح مصر کو مکمل آزادی نہ لا سکا۔ لیکن جن حالات میں وہ گھرا ہوا تھا ان میں یہ ممکن نہ تھا۔ تاہم ان مشکلات کے ہجوم میں جو کچھ اور جتنا کچھ ممکن تھا وہ زاغلول کی قربانیوں اور کوششوں نے حاصل کیا اور آئندہ کے لئے مصریوں کے سامنے فکر و عمل کی ایک شاہراہ کھول دی۔ اس نے مصر کے عوام میں اتنا زبردست سیاسی احساس و شعور پیدا کر دیا کہ اس کی موت

کے باوجود وہ نہ دب سکا۔ اور اسی شدت کے ساتھ برابر چلتا رہا۔ برطانیہ نے شاہ فواد کی معاونت و دستگیری سے اس احساس و شعور کو دبانے کے بہتیرے جتن کئے، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ۱۹۲۹ء میں جب انگلستان میں ریمزے میکڈانلڈ کی مزدور گورنمنٹ آئی تو اس نے مصر سے ایک اور مفاہمت کی مگر یہ مفاہمت بھی "شرائط" کے خارزار میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ مہمل ہو کر رہ گئی۔ اس لئے مصری پارلیمنٹ نے اسے مسترد کر دیا۔ اس چیز نے برطانیہ کو بہت غصہ دلایا، فواد نے یہ دیکھ کر ۱۹۲۳ء کے آئین کو اپنے فرمان خاص سے منسوخ قرار دے کر پارلیمنٹ کو بالکل معطل کر دیا اور اب عوام کا کوئی دخل حکومت کے ایوان میں باقی نہ رہا۔

شاہ فواد نے اپنے ایک وفادار اہم جلیس صدقی پاشا کو وزیر اعظم بنایا جو در اصل مصر کا حاکم علی الاطلاق تھا۔ صدقی پاشا نے اپنی وفاداری کا اظہار اس طرح کیا کہ مصری آئین میں ترمیم کر کے بادشاہ کو اختیار دیا گیا کہ وہ جب چاہے پارلیمنٹ کو معطل یا شکست کر دے اور پارلیمنٹ کے سو ممبروں میں سے ساٹھ کو نامزد کر سکے اخبارات کا گلا گھونٹا گیا، جلسوں اور جلوسوں پر پابندیاں لگائی گئیں۔ لیکن مصری عوام کے سیاسی شعور کی ترقی کا عالم یہ تھا کہ ان تمام سختیوں کے باوجود جب ۱۹۳۱ء کا الیکشن آیا تو صدقی کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ وفد پارٹی پھر اکثریت میں آجائے گی۔ اس خطرے کے سدباب کے لئے وفد پارٹی کے تمام سربرآوردہ لیڈروں کو گرفتار کر کے قاہرہ میں نظر بند کیا گیا۔ پھر اسی پر بس نہ کیا گیا بلکہ الیکشن کے دوران میں غیر سرکاری ممبروں کو ناکام کرنے کے لئے جتنی تدابیر ہو سکتی ہیں اختیار کی گئیں۔ پولیس نے پکڑ دھکڑ کی، سختیاں کیں، دھمکیاں دیں۔ لاٹھی چارج ہوئے جس نے سینکڑوں کو زخمی کیا ـــــــ غرض ان تمام کوششوں کے بعد حسب توقع صدقی پاشا کے کھڑے کئے ہوئے "سرکاری ممبر" اکثریت کے ساتھ کامیاب ہو گئے اور "جمہوریت" کے پرنے

میں کامل مطلق العنانی کا دور شروع ہوا۔

مصر کی آزادی کا دوسرا اعلان مگر مصر کی جد وجہد آزادی بدستور جاری رہی سعد زاغلول پاشا کے بعد وفد پارٹی کی قیادت نحاس پاشا کو دی گئی، اور حکومت کی تمام مخالفتوں کے باوجود اس پارٹی کی ہر دل عزیزی میں مطلق کوئی کمی نہ آئی۔ بالآخر ۱۹۳۵ء کے اوائل میں شاہ فواد نے ۱۹۲۳ء کے منسوخ شدہ جمہوری آئین کو دوبارہ نافذ کرنے کا اعلان کیا جس نے پھر ایک دم وفد پارٹی کو مصر کی واحد طاقتور جماعت بنا دیا۔ اس پر سرکار پرستوں اور وطنیت پرستوں کے درمیان بڑے معرکے ہوئے۔ بلوؤں تک نوبت پہنچی۔ آخر ایک "غیر جانبدار وزارت" بنائی گئی تاکہ وہ مصر کی آزادی کے بارے میں برطانیہ سے گفت وشنید کرے۔ اس گفت وشنید کے نتیجے میں ۱۹۳۶ء میں برطانیہ نے ایک دوسرا معاہدہ مصر سے کیا جس پر اگست ۱۹۳۶ء میں لندن میں دستخط ہوئے۔ اس کے بعد دوسرا معاہدہ نومبر ۱۹۳۷ء میں مانترو میں ہوا۔ ان معاہدوں کی رو سے یہ طے ہوا کہ (۱) برطانیہ اپنی فوجیں مصر سے نکال لے گا (۲) البتہ نہر سوئز کی حفاظت کے لئے کچھ برطانوی فوج رہے گی لیکن جب مصری فوج اتنی طاقتور ہو جائے گی کہ اس کی حفاظت بطور خود کر سکے، تو پھر برطانوی فوج بھی واپس بلالی جائے گی (۳) سودان کی حکومت ۱۸۹۹ء کے سمجھوتے کے مطابق بدستور انگریزوں کے ہاتھ میں رہے گی (۴) یورپی باشندوں کے ساتھ جو امتیازی سلوک کیا جاتا ہے، اُسے ختم کر دیا جائے گا اور مصری قانون کا اطلاق تمام دیسی بدیسی باشندوں پر یکساں ہوگا، اسی کے ساتھ مالی قوانین کے سلسلے میں مصر پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ حکومت مصر کوئی ایسا قانون پاس نہیں کر سکے گی جس کا اطلاق صرف غیر مصریوں پر ہو۔[۱]

---

[۱] دیکھو انڈیپنڈنٹ ایجپٹ از یوسف بے مطبوعہ لندن ۱۹۴۰ء

۱۹۳۹ء کا نعرۂ جنگ اور مصر

۱۹۳۶ء میں شاہ فواد کا انتقال ہو گیا اور اُن کے بیٹے شاہ فاروق کی تخت نشینی کا اعلان ہوا۔ لیکن چونکہ وہ نابالغ تھے اس لئے ۱۹۴۱ء تک حکومت کا نظم و نسق چلانے کے لئے مجلسِ وصایہ یعنی ریجنسی قائم کی گئی جس کے تین ممبر تھے: امیر محمد علی، شریف صبری پاشا اور عزت عزیز پاشا۔ ۱۹۳۹ء میں جب برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو مصر کو مجبور کیا گیا کہ اس معاہدے کے بموجب وہ جرمنی سے اپنے تعلقات ختم کرے۔ اس کے بعد جب اٹلی بھی جرمنی کا حلیف بن گیا تو اٹلی سے بھی مصر کے تعلقات منقطع کرا دیئے گئے۔ مصری اور اطالوی سرمایہ جو مصر میں لگا ہوا تھا۔ بحق سرکار ضبط ہوا، اور ستر ہزار کے قریب جرمنی اور اطالوی جو مصر میں مقیم تھے نظر بند کئے گئے۔

اس کے بعد مصر میں فوجی قانون نافذ کیا گیا اور اسکندریہ اور قاہرہ میں ہوائی حملوں سے بچنے کے لئے خندقیں کھودی گئیں، لیکن یہ خندقیں بہت ناکافی تھیں۔ قاہرہ میں جہاں تیرہ لاکھ انسان بستے ہیں وہاں تیس چالیس سے زیادہ حفاظتی خندقیں نہ تھیں۔ ان کی صورت بھی یہ تھی کہ گڑھے کھود کر ان کو لکڑی کے تختوں سے ڈھک دیا گیا تھا اور پھر ان پر تھوڑی سی ریت ڈال دی گئی تھی۔ ان گڑھوں میں صرف کھڑے رہنے کی جگہ تھی، روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اور فضا اس قدر عفونت ناک تھی کہ ان حفاظتی تہ خانوں میں جتنے حادثے ہوئے اتنے باہر نہیں ہوئے۔

۱۹۳۹ء کے اعلان جنگ کے بعد برطانیہ کی طرف سے یہ ظاہر کیا گیا کہ مصری عوام جرمنی کے سخت خلاف ہیں اور برطانیہ کے حلیف کی حیثیت سے خود بھی میدانِ جنگ میں اُترنا چاہتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود مصر نے اختتام جنگ سے چند ماہ پیشتر تک اپنی غیر جانبداری کو باقی رکھا ——— لیکن دوسری جنگ کے نتائج

مصر پر جو کچھ مرتب ہوئے اس کی تفصیل آئندہ ابواب میں دیکھئے۔

مصر اور ترکی

آبادی اور رقبے کے لحاظ سے مصر، ترکی سے کسی قدر بڑا ہی لیکن اگر سوڈان کو بھی مصر کے ساتھ شامل کر دیا جائے تو مصر اپنی وسعت آبادی اور آمدنی میں ترکی سے دوگنا ہو جاتا ہی۔ لیکن اگرچہ ترکی و مصر عرصۂ دراز تک ایک دوسرے سے قریب تر رہے ہیں اور مذہباً بھی ایک ہیں مگر پھر بھی معاشرت و ذہنیت کے اعتبار سے آج ان دونوں میں زبردست فرق نظر آتا ہی، ترکی میں قومیت و نسل پرستی کے جذبات یورپ کی اقوام کی طرح ترقی کر چکے ہیں جنہوں نے مذہبی احساسات کو دبا لیا ہی، مگر مصر میں یہ حالت نہیں ہی، قومیت و وطنیت کا احساس ایک حد تک وہاں بھی ہی، مگر ترکی کی طرح وہ پہلے مصری اور بعد میں مسلمان نہیں ترکی نے اپنی "ترکی وطنیت" کو ابھارنے کے لئے ٹوپی چھوڑی، رسم الخط چھوڑا عربی الفاظ و تراکیب چھوڑیں، عربوں کے ساتھ خلط ملط ہونا چھوڑا، حتیٰ کہ تین سال تک حج کی ممانعت کی گئی۔ یورپ کے رواج کے مطابق پیدائشی ناموں کے ساتھ "خاندانی نام" چسپاں کرنا شروع کئے، شہروں، قصبوں اور انسانوں کے ناموں کو ترکی بنانا شروع کیا —— غرض سر سے لے کر پاؤں تک خود کو قومیت و وطنیت کے سانچے میں ڈھال کر سو فیصدی یورپ کی تقلید شروع کر دی۔ یہی وجہ ہی کہ آج یورپ کے ہر گوشے سے یہ صدا اٹھتی ہی کہ "ترکی بہت مہذب ہی" —— لیکن اس کے برخلاف مصر اگرچہ اپنی تہذیب و معاشرت اور سیاسی شعور و بیداری کے اعتبار سے ترکی سے کچھ کم نہیں۔ لیکن چونکہ اس نے ابھی تک ہیٹ کو قومی ٹوپی قرار نہیں دیا، عربی رسم الخط کو نہیں چھوڑا، عربی زبان کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر قدیم مصری رنگ میں نہیں رنگا، نام نہیں بدلے، اور مذہب کو وطنیت پر موخر نہیں کیا۔ اس لئے یورپ کے مدبروں کی نظر میں ابھی وہ "پوری طرح مہذب

نہیں ہوا۔

لیکن یورپ کی اس رائے سے قطع نظر حقیقت یہ ہو کہ آج کا مصر ہر اعتبار سے ایک ترقی یافتہ ملک ہو اور اگر وہ اپنی جائے وقوع کی بنار پر یورپ کی نظروں میں بُری طرح کھُبا ہوا نہ ہوتا اور جاپان کی طرح آزادی و بے فکری کے ساتھ خاموشی سے اُسے اپنے معاملات کو فیصل کرنے کا موقعہ ملتا تو آج دنیا کے طاقتور ترین ممالک میں اُس کا شمار ہوتا۔ لیکن بحالاتِ موجودہ مصر کا نقشہ یہ ہو کہ ایک طرف تو تمام تجارتی کاروبار میں یورپی سرمایہ لگا ہوا ہو اور بینکوں، تجارتی کوٹھیوں، انشورنس کمپنیوں اور زراعتی فارموں میں پردیسی حصہ دار شرکت کئے ہوئے ہیں، دوسری طرف اسمٰعیل پاشا کی فضول خرچیوں اور عیاشیوں کی بدولت نہر سوئز پر اغیار کا قبضہ ہو اور حکومت پر قرضوں کا بوجھ ہو، جس کی مجموعی تعداد ۹ کروڑ پونڈ یعنی ڈیڑھ ارب روپے کے قریب بتائی جاتی ہو ——— مگر اس کے باوجود بھی یہ حقیقت ہو کہ مصر اپنی قومی دولت و فارغ البالی کے اعتبار سے جاپان کے علاوہ غالباً ایشیا کے ہر ملک سے زیادہ مالدار ہو۔ اس کا سالانہ بجٹ عموماً ایک ارب روپیہ سے کم نہیں ہوتا اور اس کے کاشتکار کبھی بھوکے نہیں مرتے۔ تعلیم کا اوسط اگرچہ ابھی بہت کم ہو لیکن ایشیائی ممالک سے پھر بھی بہت زیادہ ہو۔ وہاں سیاسی شعور اور ترقی پسندی کا جذبہ روز بروز بڑھ رہا ہو اور یورپ سے قریب تر ہونے کی وجہ سے وہ ان تمام شاطرانہ چالوں سے خوب واقف ہو گیا ہو۔ جن کی ناواقفیت ہی کی وجہ سے عموماً مشرقی اقوام نے بندگی و بیچارگی کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈالا ہو۔ اُس کے قدم روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں اور ایک سیاسی پیشین گوئی کرنیوالا یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہو کہ اگر یہی رفتار جاری رہی تو چند سال کے بعد مصر نہ صرف یورپ کی ہر ماتحتی سے آزاد ہی ہو جائے گا بلکہ وہ اتنی طاقت و قوت بھی حاصل

کرے گا کہ اپنا بچاؤ خود کر سکے جس کے بعد دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کا پنجۂ حرص و آز بھی اس کی آزادی میں دست اندازی کرنے کی قدرت نہ رکھے گا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ترکی نے یورپ کے سیاسی و معاشی اقتدار کے خلاف بڑا کامیاب مقابلہ کیا اور انتہائی بہادری، دلیری اور جوانمردی کے ساتھ ہر سیاسی و معاشی تسلط سے خود کو آزاد کر لیا لیکن یورپ کے تہذیبی اقتدار کا مقابلہ ترکی سے نہ ہو سکا اور اس میدان میں بالکل مرعوب و مغلوب ہو کر اُس نے یورپ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس لئے اگرچہ ترکی سیاستاً اور معاشاً آزاد ہے لیکن تہذیباً اور معاشرتاً وہ یورپ کا غلام ہے، اس نے اپنے ماضی، اپنے اسلاف اور اپنی تاریخ و روایات کو یورپ کی جگمگاتی ہوئی قومیت و وطنیت کے جارحانہ تصورات سے لبریز تہذیب کے ہاتھ بیچ دیا اور آج اُس کا سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ وہ بھی "یورپ میں سے ایک ہے"۔ لیکن مصر کی حالت اس کے برعکس ہے۔ مصر نے سیاسی اور معاشی دنیا ہی میں یورپ کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ تہذیبی و معاشرتی میدان میں بھی وہ یورپ کے حملوں سے اپنی مدافعت کر رہا ہے۔ مصر کی اس مدافعت کا ثبوت وہاں کی ہزار سالہ یونیورسٹی جامعہ ازہر کے علاوہ وہاں کے نظامِ حیات کے ہر شعبے سے مل سکتا ہے۔ چنانچہ ٹھیک اس وقت جب کہ ترکی میں رسم الخط بدلا جا رہا تھا اور مصطفےٰ کمال کے عربی نام کو "اتاترک" کے ترکی نام میں تبدیل کیا جا رہا تھا مصر میں "شبّان المسلمین" کے نام سے ایک جماعت بن رہی تھی جس کے ممبروں میں عوام سے لے کر خواص تک مصر کے مقامی عالموں سے لے کر لندن، جنیوا، برلن اور وائنا کے سند یافتہ فاضلوں تک اور تاجروں اور کسانوں سے لے کر یونیورسٹی کے پروفیسروں اور حکومت کے وزیروں تک سب شامل تھے۔ اس جماعت کے بنیادی جلسے میں بحث چھڑی کہ اس کا نام "شبان المصر" (مصری نوجوانوں کی انجمن) رکھا جائے۔ مگر

اکثریت نے اسے نامنظور کر دیا اور اس کے بجائے شبان المسلمین (مسلم نوجوانوں کی انجمن) اس کا نام قرار پایا۔ پھر اگرچہ اس انجمن کی عمارت اپنی شان و شوکت کے اعتبار سے یورپ کی کسی "جماعت گاہ" سے کم نہیں، اس میں کلب، باغ، ورزش گاہ، کھیل کے میدان، کھیل کے کمرے، کتب خانے اور دار المطالعے سب کچھ ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس کے ہر ممبر کو جو حلفنامہ لینا پڑتا ہے وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے خالص مشرقی شان رکھتا ہے۔ اس حلفنامے میں ہر ممبر اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ

اسلامی عقائد و اخلاق اور احکام و ہدایات کو نیز عربی زبان کو زندہ رکھنے کی کوشش کروں گا اور مذہب کے خلاف جو سیلاب اٹھے گا اسے جہاں تک ممکن ہوگا، روکوں گا،

خدا کی شریعت اور اسلام کی امامت کو زندہ کر کے اسلام کی عظمت و شان کو قائم کروں گا اور اس مقصد کے لئے ہر قربانی کے لئے تیار رہوں گا۔

مسلمانوں کے درمیان محبت و آشتی پیدا کرنے اور آپس کے اختلاف کو مٹانے کی کوشش کروں گا،

میں خدا کے حضور میں یہ عہد کرتا ہوں اور حلف لیتا ہوں کہ اپنے اس عہد کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرے اس قول پر خدا گواہ ہے

فلسطین کے عربوں کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے برطانوی پالیسی کے خلاف اس جماعت نے نومبر ۲۹؁ء میں ہائی کمشنر کو جو خط لکھا تھا وہ مصر کی تہذیبی و مذہبی حمیت کا پورا آئینہ دار ہے۔ اس میں مسطور تھا:

"ہر مسلمان خدا کا سپاہی ہے۔ چاہے وہ عرب میں بستا ہو یا عجم میں، اس لئے دنیا کے تمام مسلمان فلسطین کے عربوں کے ساتھ یہودیوں کی مخالفت میں یک آواز

ہیں۔ جب تک دُنیا میں ایک مسلمان بھی باقی ہی اور جب تک اُس مسلمان کی رگوں میں زندگی کا خون موجود ہی، یہ ہرگز نہ ہو سکے گا کہ مسلمانوں کے ایک متبرک مقام کو یہودیوں کے نسلی پروپگنڈے کا اڈا بنا دیا جائے۔"

علاوہ ازیں یہ مصر ہی تھا جس نے ۱۹۳۸ء میں تمام دُنیا کے مسلمانوں کو فلسطین کے مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے مدعو کیا تھا اور جس کے جلسے میں عوام ہی نے نہیں بلکہ مصر کے وزرا اور عمال حکومت نے علانیہ حصّہ لیا تھا۔

مراکش میں فرانس نے جب بربر نسل کے درمیان تفریق پیدا کرنی چاہی اور بربروں میں قانون اسلام کے بجائے رواجی قانون نافذ کرنا چاہا تو مصر کے اخبارات اس پر چلّا اٹھے اور "شبان المسلمین" نے ایک نہایت مضبوط و مدلّل "استغاثہ" تیار کر کے تمام مسلم فرمانرواؤں، مسلم لیڈروں، اخباروں، انجمنوں اور جماعتوں کے پاس اسے بھیجا جس نے فرانس کے لئے سخت مشکلات پیدا کر دیں[۱]۔

غرض مصر اپنی ماضی، اپنے اسلاف، اپنی تاریخ، اپنی روایات اور اپنے مذہب کی بنیادوں پر خالص اسلامی مشرقی پس منظر میں ترقی کر رہا ہی اور اسی بنا پر آج اگر کسی ملک کو دنیائے اسلام کا "مرکز" ہونے کا درجہ مل سکتا ہی تو وہ مصر ہی ہی، لیکن ترکی نے خلافت کو منسوخ کرنے کے بعد دنیائے اسلام سے بھی اپنا زندہ رشتہ منقطع کر لیا۔ کیوں؟ اس کی وجہ ظاہر ہی، ترکی نے ایک طویل عرصے تک خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کے مذہبی نام سے مطلق العنان شہنشاہیت کے سخت ترین مصائب سہے ہیں، مذہب کے نام پر ہزاروں نوجوانوں نے قید و بند کی تکلیفیں برداشت کیں اور ہزاروں ہی گھر سے بے گھر ہوئے، علماء کے نام

---

[۱] تفصیل کیلئے دیکھو "انڈیپنڈنٹ ایجپٹ" از یوسف بے۔ "ایجپٹ" از ینگ۔ "دی لینڈ آف ایجپٹ" از فیڈن۔

سی جو طبقہ تھا اس نے ایک "نسلی ذات" کی شکل اختیار کر لی تھی کہ عالم باپ کے بعد اس کا بیٹا لازماً عالم ہوگا۔ گویا ایک طرف خلیفہ کی نسلی شہنشاہیت تھی تو دوسری طرف علمار نے اپنی نسلی شہنشاہیت جدا قائم کر رکھی تھی۔ علمار کے گھرانے کا ہر چھوٹے سے چھوٹے شیر خوار بچہ بھی "عالم" (ترکی زبان میں: بِشِک علما لی غی) کہلاتا تھا اور خلیفہ کے گھرانے کا ہر بچہ خلافت کا حق دار سمجھا جاتا تھا ـــــــ پھر شیخ الاسلام کے فتووں کا چھرا بے طرح چلتا رہتا تھا جس نے ذرا اصلاح پسندی کا کلمہ منہ سے نکالا کُفر کے فتوے کا تیر اس پر چلا دیا گیا، مصطفےٰ کمال اور مصطفےٰ کمال کے ساتھی جو یونانیوں اور اتحادیوں سے سر سے کفن باندھ کر خون کا کھیل کھیل رہے تھے، اُن کی ان خدمت کا صلہ بارگاہِ خلافت سے قتل کے فرمان کی صورت میں اور دربارِ شیخ الاسلام سے کفر و الحاد کے فتوں کی شکل میں نافذ ہو رہا تھا ـــــــ پھر ان حالات میں کوئی تعجب کی بات نہیں اگر ترکوں نے اس ماضی کی یاد کے ہر ہر نشان کو مٹانے کی کوشش کی اور اپنے ماضی اور اپنی روایات میں انھیں کوئی کشش و جاذبیت نظر نہ آئی۔ لیکن مصر کی حالت اس سے بالکل مختلف رہی اس لئے مصر کے لئے اپنے ماضی کی یاد سوہانِ روح نہیں۔

مگر ترکی کی یہ حالت بھی عارضی تھی جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے۔

. . . .

سیاسی اور معاشی حالات

انیسویں صدی کے نصف آخر سے ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم تک مصر و سوڈان کی سرزمین، یورپ کی مختلف قوموں کے درمیان موضوعِ رقابت بنی رہی۔ لیکن جب برطانیہ نے خفیہ سمجھوتے کر کے، فرانس کو مراکش میں اور اٹلی کو طرابلس میں اپنی من مانی کارروائیاں کرنے کی کھلی چھٹی دے دی تو مصر عملاً برطانیہ کا ہو کر رہ گیا۔ تاہم

۱۹۱۸ء سے پہلے تک روس، جرمنی، ترکی اور آسٹریا ہنگری کی رقابتیں باقی تھیں لیکن "اتحادیوں" کی فتح نے یہ مشکل بھی ختم کردی اور ۱۹۱۹ء میں برطانیہ نے اسے براہِ راست اپنی سرپرستی میں لینے کا اعلان کردیا۔ لیکن مصریوں نے اِس سرپرستی کو نہ مانا جس کے نتیجے میں پہلی بار ۱۹۲۲ء میں اور پھر دوسری بار ۱۹۳۶-۳۷ء میں جدید معاہدے کئے گئے۔ ان معاہدوں میں مصر کی کامل آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ کامل آزادی مختلف قسم کی شرطوں اور پابندیوں میں الجھی ہوئی ہے، اس لئے مصر کی تحریکِ آزادی برابر جاری ہے۔ خصوصاً سوڈان کا معاملہ انتہائی تلخ صورت اختیار کرچکا ہے۔

مصر کی اس تحریک آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی کمزور فوجی اور معاشی حالت ہے۔ مصر میں بیرونی قرضوں کا آغاز ۱۸۶۲ء سے ہوتا ہے جب حکومت مصر نے ۲۳ لاکھ گنی کے قریب قرض لیا۔ اس کے بعد تیزی کے ساتھ اس مقدار میں اضافہ ہوتا رہا۔ آخر ۱۸۷۹ء میں فرانس اور انگلستان نے مل کر اس کے مالیہ پر نگرانی قائم کرلی۔ اب اس "نگرانی" کی پرانی شکل یقیناً بدل چکی ہے۔ لیکن قرض اب بھی باقی ہے جس کی تعداد ۱۹۴۲ء میں ۹ کروڑ ۲۷ لاکھ پونڈ سے کچھ زائد تھی۔[۱]

قرض کی یہ رقم مصر کی سالانہ آمدنی سے بہت زائد ہے۔ ۱۹۴۳-۴۴ء میں یہاں کا بجٹ ۶ کروڑ ۲۲ لاکھ پونڈ کے قریب تھا۔ لیکن جنگ شروع ہونے سے قبل ۱۹۳۹-۴۰ء میں بجٹ کا تخمینہ صرف چار کروڑ ۱۲ لاکھ پونڈ تھا۔[۲]

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے: ایجپٹ اینڈ سوڈان از بیڈیکر مطبوعہ لندن ۱۹۲۹ء دی لاسٹ اویسس The Lost Oasis از حسنین بے

[۲] ایربک اسٹیٹسمین: ۱۹۴۴ء صفحہ ۸۶

سوڈان کا علاقہ مصر کا زرخیز ترین علاقہ ہے۔ لیکن اس پر مصری حکومت کو کوئی اختیار نہیں۔ اس لئے مصری سیاست و معیشت میں سوڈان کے سوال نے بے حد اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ مصر کی طرح سوڈان بھی روئی کی بہت بڑی منڈی ہے اگر یہ دونوں علاقے ایک حکومت کے تحت آ جائیں تو روئی کی پیداوار کے لحاظ سے مصر کا درجہ دنیا میں اوّل ہو سکتا ہے۔

مصر کی دوسری بدنصیبی یہ ہے کہ ابھی وہ اتنے کارخانے نہیں بنا سکا ہے کہ اپنی دیسی روئی کا سامان خود تیار کر سکے، اس لئے مجبوراً اُسے برآمد کرتا ہے اور پھر کپڑے کی شکل میں کئی گنی زیادہ قیمت دیکر سے واپس خریدتا ہے۔

لیکن ان مشکلات کے باوجود مصر نے گذشتہ پچاس ساٹھ سال میں حیرتناک طور پر ترقی کی ہے۔ تعلیم عامہ کے لئے یہاں دو بڑی درسگاہیں ہیں ایک سرکاری یونیورسٹی اور دوسری جامعہ ازہر۔

جامعہ ازہر کا شمار دنیا کی قدیم ترین درسگاہوں میں کیا جاتا ہے۔ اس کا قیام ۹۷۲ء میں ہوا۔ لیکن اس کے نصابِ تعلیم میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے یہاں کے طلبار ملکی سیاست میں ہمیشہ ایک زبردست طاقت بنے رہے۔ آج بھی اس کے تعلیم یافتہ طلبار یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے فاضلوں سے کسی طرح سے کم نہیں سمجھے جاتے۔ اس جامعہ کے طلبار کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ اور ابھی تک مصر کی سیاست پر ان کو زبردست غلبہ و اثر حاصل ہے۔

۱۹۳۳ء میں سات سے لے کر بارہ سال کی عمر تک کے بچوں اور بچیوں کے لئے تعلیم جبری کی جا چکی ہے۔[۱] ۱۹۴۰-۴۱ء میں ابتدائی مکاتیب کی تعداد ۹۶ ہزار

---

[۱] اسٹیٹسمین ایر بک صفحہ ۸۶۲

تھی جن میں ۴۲ ہزار لڑکیوں کے مکاتیب تھے اور ۷۲ ہزار لڑکوں کے۔ یہ مکاتیب قومی چندے سے چلائے جاتے ہیں، حکومت بھی تھوڑی سی امداد دیتی ہے

اس اعلیٰ تعلیم میں لڑکوں اور لڑکیوں کا جو تناسب مصر میں ہے اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ سالہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں سرکاری یونیورسٹی کے گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ درجات میں لڑکے لڑکیوں کی تعداد حسب ذیل تھی۔

		لڑکے	لڑکیاں
۱۔ قانون	(= ایل ایل بی)	۲۴۰۸	۳۴
۲۔ سائنس	(= بی۔ ایس سی و ایم، ایس سی)	۶۹۳	۵۵
۳۔ آرٹس	(= بی اے و ایم اے)	۱۱۹۳	۲۰۴
۴۔ تحقیقاتِ آثارِ قدیمہ (آرکیالوجی)		۵۱	۶
۵۔ معالجات	(= ایم بی بی ایس)	۸۲۸	۷۲
۶۔ نرسنگ		۰	۳۵۲
۷۔ دنداں سازی		۵۶	۳
۸۔ دوا سازی		۱۵۷	۲

یہ تو اعلیٰ تعلیم کا حال ہوا جس میں لڑکیوں کی تعداد یقیناً لڑکوں سے کم ہے، لیکن ابتدائی تعلیم میں لڑکوں، لڑکیوں کا تناسب تقریباً برابر ہے۔ چنانچہ جبری ابتدائی مدارس میں اسی یونیورسٹی کے مذکورہ بالا طلباء کی تعداد یوں تھی:-

لڑکے	لڑکیاں
۲۴،۲۹۵	۱۹،۳۲۵

ریلوے کا محکمہ حکومت کی ملکیت ہے اور ۱۹۴۰-۴۱ء میں ۳۶۸۶ میل کی ریلوے لائن موجود تھی۔ اس کے علاوہ کارخانوں کی ضرورت کے لئے ۹ سو میل

کے قریب چھوٹی لائن بھی ہے جو کارخانہ داروں کی ذاتی ملکیت سمجھی جاتی ہے اور صرف سامان لے جانے کا کام کرتی ہے۔[۱]

سیاسی اور معاشی حالت کسی ملک کی سیاسی زندگی کا ایک اندازہ وہاں کے اخبارات بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے مصر کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بیس سے زائد ایسے اخبارات شائع ہوتے ہیں جن کی اشاعت پانچ ہزار سے لے کر پچاس ہزار تک ہے۔ سب سے کثیر الاشاعت اخباروں میں الاہرام و البلاغ ہیں۔ البلاغ شروع میں وفد پارٹی کا آرگن تھا۔ لیکن اب سالہا سال سے "وفد" کا شدید مخالف ہے۔ الاہرام ایک قسم کا نیم سرکاری اخبار ہے اور جو حکومت برسر اقتدار ہوتی ہے زیادہ تر اس کی تائید کرتا ہے اور اگر کبھی تنقید بھی کرتا ہے تو نہایت نیازمندانہ طور پر۔ آج کل وفد پارٹی کے خاص آرگن "المصری" اور "الوفد المصری" ہیں۔

یورپ کے مفادوں کو محفوظ کرنے کے لئے یہاں سے فرانسیسی، یونانی اور انگریزی میں بھی اخبارات نکلتے ہیں اور چونکہ مصر کے کافی باشندے ان زبانوں سے واقف ہیں اس لئے ان کی اشاعت بھی کافی ہے۔ المقطم عربی کا اخبار ہے مگر برطانیہ کا حامی ہے۔

مصر کی آبادی ۱۹۳۷ء کی مردم شماری کی رو سے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے[۲] زبان عربی ہے اور خاص پیداوار اعلیٰ قسم کی وہ روئی ہے جو دنیا بھر میں صرف مصر وسوڈان میں پیدا ہوتی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں ۲ کروڑ پونڈ (گنی) سے زائد کی روئی

---

[۱] ایئر بک اسٹیٹسمین: ۱۹۴۴ء۔
[۲] ایئر بک: اسٹیٹسمین ۱۹۴۴ء

مصر نے بیرونی ممالک کو فروخت کی تھی۔ روئی کے علاوہ دوسرا سامان تجارت بہت کم ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی سال ۱۹۳۱ء میں دوسری اشیاء کی برآمد کی قیمت ۳۴ لاکھ گیارہ ہزار پونڈ سے زیادہ نہ تھی۔[1] لیکن روئی کے علاوہ غلے کی پیداوار بھی اتنی ہوتی ہے جو مصر کی پرورش کے لئے بالکل کافی ہے۔ مویشی بھی بہت ہوتے ہیں۔

---

[1] اسٹینڈرڈ سائکلو پیڈیا مرتبہ (Alington) صفحہ ۴۳۴

باب ۲۰

شام

نئی گرفتاری اور نئی بیداری

مصر کی طرح شام اور عراق کے علاقے بھی وسائل آمد و رفت کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتے ہیں خصوصاً ہوائی جہازوں کی ایجاد کے بعد سے تو شام و عراق ہر اُس یورپی مُلک کے لئے ناگزیر ہو گئے ہیں جو ایشیا اور آسٹریلیا سے تجارتی یا سیاسی تعلقات رکھتا ہے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم سے پہلے یہ علاقے پوری طرح سلطان ترکی کے ماتحت تھے۔ لیکن اس جنگ کے دوران میں یہاں کے باشندوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ اگر وہ ترکوں کی شہنشاہیت توڑنے میں اتحادیوں کا ساتھ دیں گے تو اختتامِ جنگ پر اُن کی کاملاً آزاد حکومت تسلیم کر لی جائے گی۔ آزادی و خود مختاری کے اس سبز باغ نے عربوں میں وہ تمام جذباتِ بغاوت اُبھار دیئے جو ترکی حکومت کے خلاف اُن کے دل میں عرصے سے پرورش پا رہے تھے۔ جنگ کے آغاز کے وقت ترکوں کا اندازہ تھا کہ وہ دس لاکھ سپاہی میدان جنگ میں لا سکیں گے۔ دس لاکھ کی اس تعداد میں نصف کے قریب عرب شامل تھے۔ مگر جب عربوں نے اپنی آزادی و خود مختاری کے

خواب دیکھنا شروع کئے اور اُن میں بغاوت کی وُبا پھیلی تو چار لاکھ سے زائد عرب سلطان ترکی کی اطاعت سے منحرف ہو کر اتحادیوں کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ امریکہ کے ایک مورخ لاول ٹامس کا بیان ہی کہ "عربوں کی بغاوت کی وجہ کسی نہ کسی حد تک یہ ضرور تھی کہ وہ ترکوں سے نفرت کرتے تھے۔ لیکن زیادہ تر اس کی وجہ آزادی و خود مختاری کی وہ توقعات تھیں جو اتحادیوں کے اور خصوصاً برطانیہ کے پروپیگنڈی سے ان میں پیدا ہو گئی تھیں[1]"۔

خفیہ معاہدہ اگرچہ بظاہر برطانیہ اور فرانس دونوں نے متفقہ طور پر بار بار عربوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے خاتمے پر تمام بلادِ عرب کو آزاد کر دیا جائے گا لیکن اندرونی طور پر ان دونوں طاقتوں کے درمیان سائکس پی کاٹ کے نام سے ایک خفیہ معاہدہ ہو چکا تھا جس کی رو سے یہ طے کیا گیا تھا کہ

(۱) فلسطین کے علاقے کو بین الاقوامی بنا دیا جائے گا، یعنی یورپ کی سب حکومتیں یا بالفاظ دیگر، برطانیہ و فرانس دونوں مل کر اس پر تسلط رکھیں گے۔

(۲) حیفہ کا فلسطینی بندرگاہ اور بغداد اور بصرہ کے علاقے خلیج فارس کے ساحل تک برطانوی اقتدار میں رہیں گے۔

(۳) شام کا ساحلی علاقہ فرانس کے اقتدار میں رہے گا۔

(۴) البتہ ساحل شام کے مشرق کا علاقہ، حلب اور دمشق سے لے کر موصل تک، آزاد عرب ریاست بنا دیا جائے گا۔ لیکن اس "آزاد ریاست" کے جنوب میں برطانیہ کا اثر و نفوذ رہے گا اور یہاں کی حکومت کو برطانیہ سیاسی مشیر فراہم کیا کرے گا اور

---

[1] دیکھو:۔ ووِدھ لارنس ان عرب۔

شمال کے علاقے میں فرانس یہی حق رکھے گا۔[1]

لیکن عربوں کو اس معاہدے کا کوئی علم نہ تھا۔ عرب بغاوت کے لیڈر حسین (شریف مکہ) سے مصر کے برطانوی ہائی کمشنر سر ہنری میکموہن نے یہ وعدہ کیا تھا کہ "شریف مکہ نے عرب سلطنت کی جو حدود متعین کی ہیں ان کی آزادی کو تسلیم کیا جائے گا اور عربوں کی جنگِ آزادی میں شریف موصوف کی امداد کی جائے گی۔"[2]

روس کا افشائے راز

شریف نے عدن کا علاقہ برطانوی قبضے میں رہنے دینا تسلیم کر لیا تھا، نیز بصرہ و بغداد اور حلب و بیروت کے اضلاع پر بھی اتحادیوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے اتحادیوں کا عارضی تسلط منظور کیا تھا۔ مگر اتحادیوں نے عرب کی جو تقسیم ۱۹۱۶ء کے سائکس پی کاٹ معاہدے کی رو سے خفیہ طور پر طے کر لی تھی اس کا وہم و گمان بھی حسین کو نہ تھا۔ ۱۹۱۷ء میں جب روس میں انقلاب آیا اور زار کی شہنشاہیت ختم ہو کر اس کی جگہ عوام کی اشتراکی حکومت قائم ہوئی تو اس نئی حکومت نے برطانیہ و فرانس کا یہ خفیہ معاہدہ بے باکانہ طور پر شائع کر دیا اسی سال برطانیہ کی وزیر خارجہ لارڈ بالفور نے فلسطین کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ اسے یہودیوں کا "قومی وطن" بنایا جائے گا۔ ان چیزوں نے قدرتاً عربوں میں سخت گھبراہٹ پھیلائی۔ اس پر ۹ نومبر ۱۹۱۸ء کو برطانیہ و فرانس کا ایک متفقہ اعلان شائع ہوا جس میں عربوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی اور انھیں یقین دلایا گیا کہ بلادِ عرب کی آزادی میں دست اندازی کا کوئی ارادہ ہم نہیں رکھتے ہیں۔[3]

---

[1] وِدھ لارنس اِن ارابیا۔ از لاول ٹامس — With Lawrence In Arabia: Thomas

[2] " " " " " [3] ایضاً

سیاسیاست کے داؤ پیچ سے ناواقفیت رکھنے والے عرب اس قسم کے اعلانات سے مطمئن ہو گئے اور جب التوائے جنگ کا اعلان ہوا اور ولسن کے چودہ نکات کی آوازیں ان کے کان میں پڑیں تو انھیں اپنی آزادی کا زمانہ بالکل قریب نظر آنے لگا۔ دنیا کے قومی مفاد اور سیاسی و معاشی اغراض سے ناواقف، یہ سیدھے سادے لوگ سمجھ رہے تھے کہ ادھر صلح کانفرنس منعقد ہوئی اور ادھر "آزاد عرب" کا فرمان اتحادیوں نے نافذ کیا۔ اگرچہ روس نے ایک خفیہ معاہدے کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا اور اگرچہ عراق میں برطانوی فوجیں حکومت کر رہی تھیں اور مقامی باشندوں کو حکومت میں مطلق شریک نہ کیا گیا تھا، پھر بھی عربوں کی خوش گمانی کا عالم یہ تھا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ تو ہوتا ہی ہے کہ جنگ کی ہماہمی میں بعض اوقات وعدے بھلا دیئے جاتے ہیں لیکن جب جنگ کی یہ حالت ختم ہو جائے گی تو پھر یقیناً ہر فیصلہ وعدوں کے مطابق ہی ہوگا۔ وہ کہتے تھے ولسن کے نکات ہمارے سامنے ہیں جنھیں دنیا کے آئندہ امن کی بنیاد بنایا جائے گا، ایسی صورت میں ہمارے ساتھ بے انصافی کیسے ہو سکتی ہے ——؟

لیکن جب مصر کو صلح کانفرنس میں نہ بلایا گیا اور نہ برطانوی تسلط ہٹایا گیا تو عربوں کی آنکھیں کچھ کھلنی شروع ہوئیں۔ صلح کانفرنس میں صرف حجاز کے ایک نمائندے کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ شریف حسین کے بجائے اُس کے بیٹے فیصل کو بلایا گیا جو کھلے طور پر اپنے باپ سے اختلاف رکھتا تھا اور سارے عرب کی آزادی کے بجائے صرف شام پر حکمراں ہونے کو غنیمت سمجھتا تھا۔

۹ نومبر ۱۹۱۸ء کو برطانیہ اور فرانس کا ایک مشترکہ اعلان شائع ہوا جس میں بیان کیا گیا کہ "برطانیہ اور فرانس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ —— جو قومیں ایک عرصے سے ترکوں کے پنجۂ ظلم میں دبی ہوئی ہیں انھیں مکمل اور غیر مبہم آزادی

دی جائے اور ان کی ایسی حکومتیں قائم کی جائیں جن کا اقتدار اعلیٰ اور جن کا نظم و نسق وہیں کے باشندوں کی آزاد خواہش و مرضی پر منحصر ہو اور ہر مسئلے میں اپنی ہی رائے سے وہ جو چاہیں کر سکیں[1]

لیکن اب یہ سوالات پیدا ہوئے کہ نہر سوئز پر کس کا غلبہ رہے گا، فرانس کے جو مفادات و مطالبات ان علاقوں میں ہیں ان کا کیا ہوگا۔ شام کے بندرگاہوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا کیا ہوگا۔ عراق کے پیٹرول کے چشموں پر کون قابض ہوگا۔ بصرہ و بغداد کے ہوائی اڈوں پر کن کا تصرف ہوگا، مشرق سے گذرنے والے ہوائی راستے پر کس کی نگرانی ہوگی ——؟

انتداب یا مینڈیٹ

جب یہ سوالات سامنے آئے اور برطانیہ و فرانس کی تجارتی، سیاسی اور معاشی مفادوں پر ضرب پڑنے کا امکان پیدا ہوا تو سارے اعلانات و مواعید دھواں بن کر فضا میں غائب ہونے لگے اور بڑے غور و خوص کے بعد مینڈیٹ (Mandate) یا انتداب کی نئی اصطلاح وضع کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ ——— وہ نو آبادیاں اور علاقے جو اس جنگ کے نتیجے میں ترکی و جرمنی کی حکومت سے آزاد ہو گئے ہیں اور جن میں ایسے افراد بستے ہیں جو موجودہ دنیا کی کشمکش میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہیں، اُن کو ترقی یافتہ قوموں کی سر پرستی میں دے دیا جائے تاکہ وہ انھیں تہذیب کی مقدس امانت کے طور پر محفوظ رکھیں اور اپنے وسائل و ذرائع اور عقل و تجربے کی مدد سے انجمن اقوام کی طرف سے ان پر حکومت کریں[2]

---

[1] ووڈ لارنس ان اریبیا از ٹامس لاول

[2] لیگ آف نیشن کا ضابطہ (کووینینٹ)، دفعہ ۲۲

اس انتداب کے سلسلے میں عربوں کے متعلق خاص طور سے یہ طے کیا گیا کہ
——— ترکی سلطنت کی بعض قومیں ترقی کے ایسے درجے پر پہنچ چکی ہیں کہ اُن کی آزادی کو مشروط طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ کوئی سرپرست طاقت ——— Mandatory ——— ان کو مشورہ وامداد دیتی رہے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں۔[1]

انتداب کے بارے میں ایک اصول یہ بھی طے ہوا کہ جس قوم کو زیر انتداب لایا جائے گا، اس کو خود اس بات کا اختیار دیا جائے گا کہ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں سے جس کسی کی سرپرستی کو پسند کرے، اسی کی انتداب میں چلی جائے اس اصول کا مدعا یہ تھا کہ عرب عوام کے مشورے کے بغیر کسی قوم کا انتداب جبراً ان پر ٹھونسا نہ جائے گا۔

اس آخری شرط کی رو سے "نیم مہذب" عربوں کو کم از کم یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنی "سرپرست طاقت" کا انتخاب خود کریں۔ چنانچہ عربوں کی اس خواہش کو معلوم کرنے کے لئے طے کیا گیا کہ ایک بین الاقوامی کمیشن ان ممالک میں بھیجا جائے۔ مگر فرانس نے اس کمیشن کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے سے انکار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمیشن بھیجنے کی یہ اسکیم پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئی۔

اب اتحادیوں نے انتداب کے سوال کو بطور خود یورپ میں بیٹھ کر طے کرنا شروع کیا۔ لیکن یورپ کے مدبرانِ سیاست کی نظر میں عرب ممالک کا مسئلہ یورپ کے مسائل کے برابر اہم نہیں ہو سکتا تھا اس لئے جب تک یورپ کے معاملات طے ہوتے رہے، عراق وشام پر فوجی حکومت قائم رہی، التوائے جنگ کے دو سال بعد ۱۹۲۰ء

---

[1] لیگ آف نیشن کا ضابطہ (کوونینٹ)، دفعہ ۲۲

کے اوائل میں جب یورپ کے تمام قضیوں کا فیصلہ ہو گیا۔ تب کہیں جاکر یہ اعلان ہوا کہ عراق پر برطانیہ کا انتداب رہے گا۔ شام کا ساحل (جس میں لبنان اور لبنان کے شمال کا علاقہ شامل ہے) فرانس کے زیر انتداب رہے گا۔ لیکن شام سے فلسطین و مشرق اُردن کے علاقے کاٹ کر علیحدہ کئے جائیں گے اور ان علاقوں پر برطانیہ کو تسلط دیا جائیگا۔ حسین کو سلطانِ حجاز بنایا جائے گا۔ حسین کے ایک بیٹے عبداللہ کو عراق دیا جائے گا اور دوسرے بیٹے فیصل کو شام کا سلطان قرار دیا جائے گا۔

پیرس کی "صلح کانفرنس" میں فیصل نے بہت شور مچایا کہ فلسطین کو شام سے علیحدہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ جہاں تک یہودیوں کے مفاد کا تعلق ہے۔ ہم اُن کے تحفظ کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ اس نے اس امر پر نہایت شدت کے ساتھ زور دیا کہ عرب جس خطے کا نام ہے اُس میں حجاز سے لے کر شام، فلسطین اور عراق سب شامل ہیں اور اس پورے علاقے کے رہنے والے ہر اعتبار سے ایک ہیں اس لئے اتحادیوں نے جس آزاد عرب حکومت کے قیام کا وعدہ کیا ہے اس میں حجاز سے لے کر شام، عراق اور فلسطین سب شامل ہونا چاہیے۔ لیکن صلح کانفرنس کے نقارخانے میں طوطی کی آواز کون سن سکتا تھا۔ پھر فیصل بذاتِ خود کچھ نہ تھا وہ نہ تو انگریزی یا فرنچ میں بلا تکلف گفتگو کر سکتا تھا اور نہ یورپ کے سیاسی ٹھگوں کے مقابلے میں "الفاظ کی جنگ" میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ کرنل لارنس جس نے عرب بن کر عربوں کی بغاوت کی رہنمائی کی تھی وہی اس گفت و شنید میں بھی فیصل کا ترجمان تھا اور وہی فرانس اور انگلستان کے نمائندوں کے سامنے عربوں کے مطالبات جس طرح سے چاہ رہا تھا پیش کر رہا تھا۔

غرض مذکورہ بالا فیصلے کے مطابق شام کے ساحل پر فرانس نے قبضہ کر لیا شام کے اندرونی علاقے پر فیصل کو حاکم بنا دیا گیا۔ حجاز شریف حسین کے سپرد کیا گیا فلسطین کو یہودی نو آبادکاروں کے لئے کھول دیا گیا تاکہ وہ اسے اپنا "قومی وطن"

بنا سکیں اور بصرہ و بغداد کے اضلاع پر برطانیہ نے اپنا تسلط جمانا شروع کر دیا۔

شام پر فرانس کی فوج کشی

لیکن فرانس صرف شام کے ساحل پر قانع نہ تھا وہ پورے شام پر غلبہ چاہتا تھا، وہ کہتا تھا کہ صلیبی جنگوں کے زمانے سے شام پر فرانس کا حق ہے۔ فرانس نے شام کے متعدد شہروں میں تعلیمی ادارے قائم کر رکھے ہیں، یہاں جو ریلیں ہیں ان میں فرانس کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ غرض مختلف معاشی ذرائع سے فرانس کو شام میں بہت کچھ دخل حاصل ہے۔ مزید براں فرانس کا دعویٰ تھا کہ شام میں جو عیسائی بستے ہیں، فرانس صدیوں سے ان کا محافظ رہا ہے اور اب بھی وہ اپنے اس فرض سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ المختصر بظاہر اسی قسم کے دلائل کی بنا پر لیکن بباطن شام کی فوجی، سیاسی اور معاشی اہمیت کے پیش نظر فرانس یہ گوارا نہ کر سکتا تھا کہ شام کا خطہ اس کے براہ راست حلقۂ اثر سے باہر رہے۔ مگر چونکہ برطانیہ نے دمشق میں امیر فیصل کو تخت نشین کر دیا تھا، اس لئے امیر فیصل کے خلاف درپردہ طور پر فرانس نے عوام کی شکایات کو ابھارنا شروع کیا، در آخر اگست ۱۹۲۰ء میں یہ بہانہ کر کے کہ فیصل کی حکومت منصفانہ نہیں ہے اور سیاسی ابتری و بدنظمی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، فرانس کی فوجیں دمشق میں دندناتی ہوئی داخل ہو گئیں اور فیصل کو معزول کر کے تمام شام پر قابض ہو گئیں۔

شام کے باشندے پہلے ہی غیر مطمئن تھے، فرانس کے اس عمل کے بعد اُن میں زبردست اضطراب پیدا ہو گیا، شامیوں کو فرانس کے رویّے سے سالہا سال سے شکایت رہی ہے اس لئے کہ شام میں جو تھوڑی سی عیسائی آبادی ہے، فرانس نے ہمیشہ اُن کو اُکسا کر ملک کی سیاسیات کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ فرانس کا ایک نہایت مذموم اصول حکومت یہ ہے کہ وہ اپنے مقبوضات کے باشندوں کے دل سے بغاوت اور آزادی کے جذبات کو ختم کرنے کے لئے انھیں اپنی تہذیب و

معاشرت میں رنگنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان لوگوں کی زبان کو بگاڑ کر اس کی جگہ فرانسیسی زبان عام کر دی جائے۔ علیٰ ہذا القیاس ان کی تمام تمدنی خصوصیات کو تباہ کرنے کی سعی کی جاتی ہے[1]۔ شام میں بھی اس کا یہ حربہ بیسویں صدی کے اوائل سے مسلسل استعمال ہو رہا تھا اس بنا پر شام کے عوام فرانس سے اتنی نفرت کرتے تھے کہ اگر انتداب کے اصول کو وہ مان بھی لیتے تب بھی فرانس کے مقابلے میں برطانیہ کا انتداب پسند کرتے۔ چنانچہ اسی زمانے میں امریکہ کے ایک تحقیقاتی کمیشن نے شامیوں کے ان احساسات کو دریافت کرکے دنیا کو اصل حقیقت سے باخبر کیا۔ "ظالم کی نیت" جب بگڑتی ہے تو "دلیل وحجت" کام نہیں آتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شامیوں کے احساسات وجذبات کے بالکل خلاف شام میں فرانس کی حکومت قائم ہو گئی۔ مگر شامی اس حکومت کو قبول نہ کر سکے اور فوراً ہی ہر طرف سے بغاوت شروع ہو گئی۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے جتنی سختیاں ممکن تھیں کی گئیں۔

شام پر فرانس کا یہ قبضہ صلح کانفرنس کے فیصلوں کے صریحاً خلاف تھا لیکن فاتح اقوام میں سے کسی نے بھی فرانس کی اس حرکت پر باز پرس نہ کی آخر دو سال کے بعد ۲۴ جولائی ۱۹۲۲ء کو جمعیۃ اقوام (لیگ آف نیشنز) نے صلح کانفرنس کے سابقہ فیصلے کو رد کرکے شام پر فرانس کا انتداب تسلیم کر لیا۔ مگر یہ فیصلہ محض ضابطے کی خانہ پری کے لئے تھا، ورنہ عملاً فرانس پہلے ہی خود کو شام کا حاکم سمجھ چکا تھا۔

لیکن جمعیۃ اقوام کے اس فیصلے کے باوجود، شام کے عوام فرانسیسی اقتدار کے خلاف بدستور بغاوت کرتے رہے، شام کی ایک مشہور عالم شخصیت امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں فرانس نے ستر ہزار مسلح فوج اہل شام کو مرعوب کرنے کے لئے بلا رکھی تھی، لیکن عوام میں حریت طلبی کے جذبات اتنی شدت کے ساتھ مشتعل تھے کہ اس فوجی جمعیت کا مطلق کوئی اثر ان پر نہ پڑا اور وہ برابر فرانس سے لڑتے رہے[2]۔

---

[1] حاضر العالم الاسلامی جلد دوم صفحہ ۳۵۳ تا ۳۵۹

[2] ایضاً صفحہ ۳۴۹

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کے مطابق شام کے اس چھوٹے سے علاقے کو جس میں سے فلسطین اور شرقِ اُردن کے ٹکڑے کاٹ کر الگ کر دیئے گئے تھے اور جس کا رقبہ اب صرف ساٹھ ہزار مربع میل رہ گیا تھا۔ ایک نہ دو پورے پانچ "صوبوں" میں تقسیم کیا گیا۔ یعنی لبنان لطاکیہ، اسکندرونہ، جبل الدروز اور دمشق "ہر صوبے" میں جدا نظم و نسق، جدا حکومت، جدا بجٹ، جدا جھنڈا اور جُدا حکام تھے۔ ان سب کو متحد کرنے والی اگر کوئی چیز تھی تو صرف یہ کہ سب پر فرانس حاکم تھا اور ہر جگہ فرانسیسی افسر اعلیٰ عہدوں پر قابض تھے۔

شام کی یہ تقسیم مذہبی فرقوں کی بنا پر کی گئی تھی۔ لبنان میں عیسائی زیادہ ہیں اس لئے انھیں الگ کیا گیا، جبل الدروز میں اگرچہ مسلمان بستے ہیں مگر ان کے عقائد چونکہ عام مسلمانوں سے کچھ مختلف ہیں اس لئے انھیں بھی ایک جدا حکومت میں تبدیل کیا گیا، اسکندرونہ میں ترکوں کی آبادی زائد ہے، اس لئے یہاں نسلی سوال کھڑا کر کے اس خطے کو علیحدہ نظم و نسق دیا گیا، ——— دمشق کی صورت بھی یہی ہے کہ یہاں بھی کچھ معمولی سے اختلافات ہیں، ان اختلافات کو ابھار کر دمشق کو بھی الگ کیا گیا، گویا اس طرح فرانس نے ولسن کے اس چوتھے اصول کی خوب مٹی پلید کی کہ:۔

"تمام مشہور و معروف قوموں کو جس حد تک ممکن ہے، مطمئن کیا جائے گا اور ان میں نہ تو نفاق و شقاق کے نئے عناصر پیدا کئے جائیں گے اور نہ اس قسم کے پرانے عناصر کو اُبھارا جائے گا۔"

شام کے زعیم اکبر، امیر شکیب ارسلان، فرانس کی اس پھوٹ ڈالنے والی پالیسی پر ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔۔۔۔۔ ۱۹۱۸ء کی جس تاریخ سے فرانس نے یہاں قدم رکھا ہو، اس کی کوشش برابر یہ رہی ہو کہ شام میں مسلمانوں، اور عیسائیوں کو درمیان اور لبنان میں عیسائیوں اور "دروز" کے درمیان نئے نئے اختلافات کھڑے کئے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ آج شام کی حالت حد سے زیادہ خراب ہو، مگر فرانس محض اس لئے کہ شام پر اس کا اقتدار باقی رہے، نفاق وشقاق کی اس آگ کو ہوا دیتا رہتا ہو۔[1]

فرانس نے اپنی اس شہنشاہی حکمت علی کو کامیاب بنانے کے لئے شام و عرب کے درمیان بھی تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی اور شامیوں کو یہ سمجھایا کہ وہ نسلاً عرب نہیں ہیں بلکہ آرمینی اور فنیقی ہیں، اس موضوع پر بیسیوں علمائے فرانس نے کتابیں لکھیں اور مقصد ان کا صرف یہ تھا کہ شام کا علاقہ بلادِ عرب کی ہمدردیوں سے محروم ہو جائے۔[2]

فرانس کی یہ اسکیمیں ایک حد تک ضرور کامیاب ہوئیں لیکن پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں۔ فرانس نے چاہا تھا کہ اس طرح ایک طرف تو شامیوں کو باہم گلخپ کرکے اور دوسری طرف شامیوں اور عربوں میں غیریت پیدا کرکے اپنی شہنشاہیت کو محفوظ کرے۔ لیکن شامی عوام اس جال میں نہ پھنسے اور ان کے باہمی اختلافات فرانس کی مخالفت پر غالب نہ آسکے، عربوں نے بغاوتوں پر بغاوتیں کیں اور فرانس کی پُرامن حکومت کو ناممکن بنا دیا۔ تاہم ایک عرصے تک بموں اور مشین گنوں کے زور سے فرانس، شام پر حکومت کرتا رہا، مگر جب اس سے کام نہ چلا اور عربوں

---

[1] حاضر العالم الاسلامی۔ جلد دوم (قاہرہ ۱۳۵۲ھ: ۱۹۳۲ء) صفحہ ۴۰۳ تا ۴۰۴

[2] 〃 〃 〃 〃 صفحہ ۴۰۴

کا جوش و خروش روز بروز بڑھتا رہا تو ۱۹۲۵ء میں کچھ لیڈروں کو باہمی سمجھوتے کی غرض سے بلایا گیا۔ مگر جب یہ لیڈر حکومت کے ایوان میں پہنچے تو سمجھوتے کی بات چیت کرنے کے بجائے انھیں گرفتار کرکے قید کر دیا گیا۔

دمشق پر کامل ۴۸ گھنٹے بم باری

اس بدعہدی و فریب دہی نے شامی عوام کے جوش میں اور زیادہ شدت پیدا کر دی اور بڑے زور شور کے ساتھ مار دھاڑ کا بازار گرم ہو گیا۔ اس پر فرانس نے انتہائی بے رحمی کے ساتھ دمشق پر بموں کی بارش کی جس کا اندازہ "لندن ٹائمز" کے ایک عینی شاہد کے اس بیان سے ہو سکتا ہے:۔ —— دمشق پر مسلسل ۴۸ گھنٹے بم باری ہوتی رہی۔ اسی کے ساتھ لوٹ مار کا بازار بھی گرم رہا، دمشق کی وہ شاندار سڑکیں جو حمیدیہ اور مستقیم کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے درمیان کا کل علاقہ برباد ہو گیا۔ خصوصاً مستقیم کی حالت تو نہایت ابتر ہو گئی ان دونوں بازاروں میں جتنی دکانیں تھیں، سب ٹینکوں، مشین گنوں اور بموں سے ستیاناس کر دی گئیں"[۱]

یہ حالت اس شہر کی گئی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دنیا کا قدیم ترین شہر ہے اور جس کی نسبت خود یورپ کے مورخین یہ کہتے ہیں کہ اتنا خوبصورت اور سرسبز ہے گویا زمرد کی انگوٹھی میں ہیرا جڑ دیا گیا ہو[۲]

لیکن اس دہشت انگیزی کے باوجود بھی بغاوت نہ دبی۔ اس لئے چند ماہ بعد افریقہ کے ایک ساحلی علاقے سینی گال کے خونخوار حبشیوں کی مسلح فوج بھیجی گئی۔ جس کے بعد فرانسیسی فوج کی تعداد پچاس ہزار ہو گئی، ان پچاس ہزار مسلح سپاہیوں

---

[۱] لندن ٹائمز۔ ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء

[۲] دوھ لارنس ان اریبیا۔ از لاول ٹامس

نے شام کے تیس لاکھ نہتے عوام پر جن جن طریقوں سے ممکن ہوا تباہی وغارتگری کی مشق ستم کی، جس مقام، جس خطے، جس محلے یا جس گاؤں پر یہ شبہ بھی ہوا کہ یہاں کچھ باغی چھپے ہوئے ہیں، یا یہاں سے باغیوں کی امداد ہوتی ہے اُسے جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا گیا جس کسی شامی پر شبہ ہوا کہ یہ باغیوں سے سازش رکھتا ہے اُسے گولی ماردی گئی۔ جس گھر میں چاہا فوج گھس گئی اور جس دکان کو چاہا لوٹ لیا گیا۔

آزادی کا وعدہ

اس طرح یہ بغاوت فرو کی گئی۔ مگر راکھ کے اس ڈھیر کے نیچے دہکتی ہوئی چنگاریاں اب بھی سلگ رہی تھیں اس لئے اب فرانس کو یقین ہو گیا کہ پالیسی میں تبدیلی کئے بغیر کام نہ چلے گا۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں اعلان کیا گیا کہ ایک نمائندہ مجلس (کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی) بنائی جائے گی جس کے ممبر عوام کے آزاد انتخاب کے ذریعے منتخب کئے جائیں گے اور پھر یہ منتخبہ نمائندے اپنی مرضی سے ایک دستورِ اساسی بنائیں گے۔ جب یہ دستور بن جائے گا اور اس کے مطابق شامی حکومت کا قیام عمل آجائے گا تو پھر شام کے ساتھ فرانس ایک معاہدہ کرے گا۔

اس اعلان نے شامیوں میں کچھ سکون پیدا کیا۔ مگر اس اعلان کو دو سال گذر گئے اور فرانس خاموش بیٹھا رہا: نہ "نمائندہ مجلس" کے انعقاد کی تاریخ مقرر ہوئی اور نہ ممبروں کے الکشن کے متعلق کوئی اعلان ہوا، آخر دو سال کی طویل خاموشی کے بعد اس کی تاریخ متعین ہوئی۔ انتخاب ہوا اور یہ مجلس معرضِ وجود میں آئی۔ اس اسمبلی کے ممبروں نے مذکورہ بالا اعلان کے بموجب ایک دستورِ اساسی تیار کیا۔ فرانس کا خیال تھا کہ اس نے شام کو پانچ ٹکڑوں میں بانٹ کر باہمی نفاق و شقاق کا جو بیج بو دیا ہے وہ برگ و بار لائے بغیر نہ رہے گا، مگر اس کی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ شامیوں کی اس نمائندہ مجلس نے جو قانون بنایا، اس میں شام

کی "سرپرستی" کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ فرانس کو اس پر سخت غصہ آیا اور اپنے صاف وصریح اعلانات کے باوجود اس قانون کو منظور کرنے سے اس نے انکار کر دیا۔

اس انکار کے بعد شام میں پھر بے چینی واضطراب کی فضا پھیل گئی، لیکن چھ سات سال تک پھر جبر وطاقت کے زور سے حکومت ہوتی رہی۔ مگر جبر وطاقت نے مشتعل جذبات پر پانی کے بجائے تیل کا کام دیا۔ آخر مجبوراً ۱۹۳۳ء میں فرانس نے ایک معاہدہ مرتب کر کے شامیوں کے سامنے پیش کیا جس وقت یہ معاہدہ تیار کیا گیا تھا اس وقت شام کی "اپاہج اسمبلی" کے ساٹھ ممبروں میں سے ۵۳ ممبر اعتدال پسند تھے اور فرانسیسی حکومت کے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے یا کم از کم بہت زیادہ بری رائے نہ رکھتے تھے۔ اس کے مقابلے میں وطن پرست ممبروں کی تعداد صرف ۲۷ تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب یہ صلحنامہ اسمبلی کے سامنے پیش ہوا تو سب نے متفقہ طور پر اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔[1]

اس صلحنامے میں شام کی مذکورہ بالا پانچ تقسیمیں باقی رکھی گئی تھیں اور کہا گیا تھا کہ شام میں فرانس کی جو فوجی چھاؤنیاں، فوجی عمارتیں، ہوائی اڈے اور فوجی طاقتیں ہیں وہ سب بدستور یہاں رہیں گی؛ البتہ اندرونی نظم ونسق میں تھوڑے سے اختیارات شامیوں کو حاصل ہوں گے۔ اس کی ایک دفعہ کی رو سے یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ چار سال کے بعد انتداب اٹھا لیا جائے گا۔

شام کی آزادی اور فرانس کی "دائمی دوستی"

اس صلحنامے کو نامنظور کر دینے کے بعد شام کی تحریک آزادی پر امن طور پر چلتی رہی۔ آخر ۱۹۳۶ء میں فرانس نے دوسرا صلحنامہ کیا

---

[1] پوسٹ وار ورلڈ از جیکسن

جس میں شام کی آزادی کو تسلیم کیا گیا اور ایک آزاد جمہوریت کی حیثیت سے اُسے انجمنِ اقوام کا ممبر بنایا گیا۔ لیکن اس صلحنامے کی شرائط میں ایک نرالی دفعہ یہ بھی شامل کی گئی کہ فرانس اور شام کے درمیان "دائمی دوستی" رہے گی اور جبل الدروز اور لطاکیہ میں فرانس کی مسلّح فوجیں رہا کریں گی۔

"دائمی دوستی" کا لفظ بھی اُسی قسم کے الفاظ میں سے ہے جو عہدِ حاضر کی ڈپلومیسی نے پیدا کئے ہیں اور جن کی نسبت اقبال مرحوم نے کہا ہے:-

طبِ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری!

شمالی شام کے دو ضلعے، اسکندرونہ اور انطاکیہ، ترک آبادی کی اکثریت پر مشتمل ہیں اس لئے ترکی کا ایک عرصے سے مطالبہ تھا کہ انھیں حکومت ترکی کو واپس کیا جائے مگر فرانس نے کبھی اس پر توجہ نہ کی۔ لیکن جب شام کی "آزادی" کا اعلان ۱۹۳۶ء میں کیا گیا تو فوراً ترکی کے اس مطالبے کے ساتھ فرانس کو ہمدردی ہو گئی۔ آخر جولائی ۱۹۳۹ء میں فرانس و ترکی کے درمیان اس بارے میں ایک سمجھوتہ ہو گیا اور شام کے یہ زرخیز ترین علاقے ترکی کو واپس کر دیئے گئے[۱]۔

ان علاقوں کی واپسی سے شام کی معاشی حالت پر بہت بُرا اثر پڑتا تھا اس لئے شام نے فرانس کے اس فیصلے کے خلاف سخت نکتہ چینی کی اور یہ الزام لگایا گیا کہ اُس نے ترکی کو خوش کرنے کے لئے اُن اختیارات کا غلط استعمال کیا ہے جو انتداب کی رو سے اُسے حاصل تھے، لیکن چونکہ شام کی حکومت کی حیثیت بہت کمزور تھی اس لئے فرانس کے فیصلے کو بادلِ ناخواستہ برداشت کر لیا گیا۔ مگر دوسری جنگ کے بعد جب

۱؎ اسٹیٹس مین ایربک ۱۹۴۲ء۔ نیز دیکھو "صحرائے شام" از گرانٹ "از گارڈن اور

شام کی آزادی زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہوئی تو دسمبر ۱۹۴۲ء میں ان علاقوں کی واپسی کے لئے ہنگامہ شروع کر دیا گیا۔[۱]

سیاسی اور معاشی حالت شام جس سرزمین کا نام ہے اس میں شرقِ اُردن اور فلسطین بھی شامل ہیں، لیکن جیسا اوپر بتایا جا چکا ہے ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد یہ دونوں علاقے شام سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ اس "نئے شام" کی مجموعی آبادی ۱۹۳۵ء کی مردم شماری کی رو سے ۳۶ لاکھ ۳۰ ہزار ہے: ۲۷ لاکھ نفوس شامِ خاص میں بستے ہیں اور بقیہ لبنان میں۔ لبنان میں عیسائیوں کی اکثریت ہے اسی لئے اسے ایک علیحدہ جمہوریت بنایا گیا، کیونکہ اگر شام کے ساتھ اسے وابستہ رکھا جاتا تو عیسائی اکثریت باقی نہ رہتی۔

لیکن تمدن و معاشرت کے لحاظ سے شامیوں اور لبنانیوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کی زبان بھی عربی ہے اور لباس و طرزِ بود و ماند بھی ایک سا ہے

تعلیم کا معیار شام میں کافی بلند ہے۔ ۱۹۳۸ء میں چھوٹے بڑے تمام مدارس کی تعداد ۳۲ سو تھی جن میں تین لاکھ کے قریب طالب علم تعلیم پاتے تھے۔ لیکن طالب علموں میں مسلمانوں کی تعداد، عیسائیوں سے ہمیشہ کم رہتی ہے۔

وسعت و رقبے کے لحاظ سے شام ۵۸ ہزار مربع میل سے زائد نہیں مگر یہ کافی زرخیز ہے اور اگر پوری طرح خود مختار ہو جائے تو ہر لحاظ سے خود کفالتی ہو جائے لیکن اب تک یہ صرف ایک زراعتی ملک ہے اور خام سامان پیدا کر کے یورپ کے صنعتی ممالک کو بھیجتا ہے۔ یہاں غلہ، پھل، تمباکو، شہتوت، ریشم اور زیتون کے تیل کی پیداوار کافی ہوتی ہے۔ اور مویشی، ریشم، بھیڑ بکری ———

---

[۱] ہندوستان ٹائمز دہلی، ۲۶ دسمبر ۱۹۴۲ء بحوالہ رائٹر

پھل، تمباکو اور اُون بڑی مقدار میں یہاں سے باہر جاتا ہے۔

معدنیات کے لحاظ سے شام کو بہت غریب ملک سمجھا جاتا ہے۔ لیکن طبقات الارض کے ماہروں کا خیال ہے کہ اس غربت کی وجہ صرف یہ ہے کہ ابھی تک شام کی زمین کی تفتیش معدنیات کے نقطۂ نظر سے کی ہی نہیں گئی، تاہم اب تک جو کچھ کام ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوہے، پیٹرول، فاسفیٹ، تانبہ، سیسہ، سرمہ، نکل اور کروم وغیرہ کے ذخیرے یہاں پائے جاتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں یہاں کا سالانہ بجٹ ۹۵ کروڑ فرانک یا تقریباً دس کروڑ روپیہ تھا۔

مالی لین دین کے سارے کاروبار پر فرانسیسی بینکوں کا قبضہ ہے۔ اسی قسم کے ایک بینک کو کرنسی نوٹ بنانے کا واحد اختیار بھی حاصل ہے اور سنہ ۱۹۳۷ء کے ایک معاہدے کی رو سے یہ اختیار پچیس۲۵ سال تک نافذ العمل رہنا چاہیئے۔

اب تک شام کا شمار بھی انہی بدنصیب ملکوں میں ہے۔ جو مال کی درآمد زیادہ کرتے ہیں اور برآمد کم۔ یعنی "توازن تجارت" کے لحاظ سے گھاٹے میں رہتے ہیں۔[1]

سنہ ۱۹۳۹ء کی جنگ بعض وجوہ سے شام کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ لیکن اس کی تفصیل بعد کے ابواب کا موضوع ہے۔

---

[1] مذکورہ بالا تمام اعداد و شمار "اسٹیٹس مین کی ایئر بک" (سنہ ۱۹۴۴ء) سے ماخوذ ہیں۔

باب ۲۱

عراق

گرفتاری کے بعد نیم رہائی

آج کل کی دنیا میں عراق کی اہمیت تین خاص اسباب کی بنا پر ہی۔ (۱) یہاں تیل کے چشمے ہیں اور آج کل کی صنعتی دنیا میں تیل ایک بیش بہا نعمت ہی (۲) یورپ اور ایشیا نیز یورپ اور آسٹریلیا کے درمیان جو ہوائی راستہ جاتا ہی، وہ عراق ہی سے گذرتا ہی۔ جس کی وجہ سے بصرہ و بغداد بہت بڑے ہوائی اسٹیشن ہیں، اور ہوائی رسل ورسائل میں ان مقامات کی اہمیت بالکل وہی ہی جو بحری دُنیا میں نہر سوئز کی ہی۔ (۳) چونکہ خلیج فارس کا ساحل، عراق سے ملا ہوا ہی، اس لئے ایران، عرب اور ہندوستان کی تجارت پر یہاں سے کنٹرول کیا جا سکتا ہی

یہ تو ہوئی عراق کی اہمیت دنیا کی نظر میں —— لیکن برطانیہ کے لئے اس کی اہمیت کا ایک خاص سبب اور بھی ہی اور وہ ہی ہندوستان کی حفاظت ہندوستان کو سیاسی، معاشی اور فوجی ہر قسم کی بیرونی مداخلت سے محفوظ کرنے کے لئے مشرق قریب پر برطانوی تسلط بہت ضروری ہی۔ ہندوستان کے مغرب میں برطانیہ

کا خط دفاع (ڈیفنس لائن) عراق سے لے کر نہر سوئز تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۱۴ء کی جنگ سے پہلے جرمنی نے "بغداد ریلوے" بنا کر برلن کو خلیج فارس سے ملا دینا چاہا تو سب سے زیادہ فکر برطانیہ ہی کو لاحق ہوئی تھی۔ لارڈ کرزن نے، جو اس زمانے میں ہندوستان کا وائسرائے تھا، اس ریلوے کے خلاف بڑے زور شور سے احتجاج کیا اور کہا: "اگر برطانیہ کا کوئی وزیر خلیج فارس میں کسی پرائی طاقت کے قدم جمانے کی حمایت کریگا تو میں اسے بلا تامل اپنی قوم سے غداری کرنے والا کہوں گا"[۱۵] علاوہ ازیں ۱۹۰۳ء میں بغداد ریلوے پر پارلیمنٹ میں جو بحث ہوئی تھی اس میں بھی صاف صاف کہا گیا تھا کہ اگر عراق میں کسی غیر برطانوی طاقت کا عمل دخل ہو گیا تو پھر ہندوستان کی خیر نہیں ہے[۱۶]

۱۹۱۴ء کی جنگ تک عراق، سلطنتِ عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ لیکن جنگ کے دوران میں برطانیہ نے "آزاد عرب حکومت" قائم کرنے کا جو سبز باغ عربوں کو دکھایا اس نے عراق کو بھی "اتحادیوں" کا ہمدرد بنا دیا۔ چنانچہ جب ہندوستان کی برطانوی فوج عراق میں داخل ہوئی تو عراقیوں نے بہت ہی معمولی سی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیئے، اور نہایت صبر و استقلال کے ساتھ اس دن کا انتظار کرتے رہے جب جنگ ختم ہو گی اور برطانیہ عراق کو ایک آزاد ریاست میں تبدیل کرے گا۔

۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہو گئی۔ لیکن عراق کو آزادی کے بجائے۔ انگریزوں کی "فوجی حکومت" کی ماتحتی نصیب ہوئی، عراقیوں نے اس پر شور مچایا تو جواب ملا کہ

---

[۱۵] انٹرنیشنل انارکی ڈکنسن، صفحہ ۲۴۱

[۱۶] دیکھو روئداد پارلیمنٹ (۱۹۰۳ء جلد ۱۲۰، تا ۷۰)

گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ہم تمہیں آزاد ضرور کریں گے۔ لیکن ابھی ذرا یورپ کے مسائل تو طے ہو جانے دو۔ آخر دو سال کے انتظار کے بعد عراق کا مسئلہ طے ہوا لیکن کیسے؟ وہی انتداب!

انتداب کا نام سنتے ہی عراق میں آگ لگ گئی۔ عراق کے باشندے بلادِ عرب میں بہت دلیر و جنگجو مشہور ہیں۔ اگر جنگ عظیم میں وہ واقعی جی چھوڑ کر برطانیہ کا مقابلہ کرتے تو برطانوی افواج کو عراق میں فتح پانا ناممکن ہو جاتا۔ لیکن وہ تو اپنی قومی آزادی کے خواب دیکھ رہے تھے اور اسی میں مگن ہو کر انہوں نے نہ صرف برطانیہ کی فاتحانہ فوجوں کو اپنے ملک میں گھس آنے دیا بلکہ مسلسل پانچ چھ سال تک مارشل لا کی حکومت برداشت کی۔ مگر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ اس سب کا صلہ برطانوی انتداب کی شکل میں دیا جانے والا ہے تو پہلی بار ان کی آنکھیں کھلیں اور انہیں معلوم ہوا کہ اغراض و مفاد کا وزن مواعید و میثاق سے بہت زیادہ ہوتا ہے

انتداب کا اعلان ہوتے ہی عراق میں بغاوت شروع ہو گئی۔ اس بغاوت کے وقت عراق کی جو کچھ حالت تھی اور عراقیوں کے جو کچھ احساسات تھے اس کا اندازہ کرنل لارنس کے ان الفاظ سے ہوتا ہے ——— کوئی تعجب نہیں کہ (التوائے جنگ کے بعد) دو سال کی انگریزی حکومت سے عربوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ہے ہماری حکومت انگریزی فیشن کی حکومت ہے اور اس کی زبان عربی کے بجائے انگریزی ہے۔ ہماری اس حکومت کے ساڑھے چار سو افسروں میں سے ایک بھی عراقی نہیں حالانکہ ترکی حکومت کے زمانے میں ستر فی صدی شہری افسر عراقی ہوتے تھے۔ اس وقت ہمارے اسی ہزار آدمی پولیس کا کام کر رہے ہیں تاکہ امن و امان قائم رکھ سکیں۔ ان لوگوں کا کام صرف یہ ہے کہ عوام کو دباتے رہیں۔ لیکن ترکی کے زمانے میں فوج میں ساٹھ فیصدی عراقی افسر تھے اور سپاہیوں اور چھوٹے عہدیداروں میں عراقیوں کی تعداد ۸۵ فی صدی سے

کم نہ تھی۔ اپنے ملک کے فوج اور سول کے شعبوں میں عراقیوں کی یہ کس مپرسی بلاشبہ عراقیوں کے لئے سوہان روح ہونی چاہئے۔ یہ صحیح ہو کہ ہم نے عراق کی سرسبزی وخوش حالی میں اضافہ کر دیا ہو مگر خالی سرسبزی و خوشحالی سے کیا ہوتا ہو جب کہ آزادی و خود مختاری کی نعمت سے وہ محروم ہیں[۵۱]۔"

کرنل لارنس ہی ایک ایسا شخص تھا جو عرب کے جغرافیے اور عربوں کی ذہنیت سے صحیح طور پر واقف تھا، اس لئے عربوں کے ساتھ جنگ کے زمانے میں جو سلوک ہوئے، اُن کے بارے میں اگر کسی انگریز کی رائے وقیع ہو سکتی ہو تو وہ کرنل لارنس ہی کی رائے ہو سکتی ہو پھر جب لارنس انگریز ہونے کے باوجود ایسے خیالات کا اظہار کرے تو اصل حقیقت جو کچھ ہو سکتی ہو، اس کو سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ جب فرانس کی فوجوں نے دمشق کے اُس خوبصورت شہر پر بمباری کی تھی جس سے زیادہ پرانا شہر آج دنیا میں کوئی نہیں اور جو اپنی فطری خوبصورتی اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے بے مثل ہو۔ تب بھی لارنس نے عراق کا حوالہ دے کر یورپ کے اس طرز عمل پر اظہار افسوس کیا تھا، اس نے کہا تھا:۔ "ٹھیک اس زمانے میں جب کہ برطانیہ بغداد کے قریب بڑھ رہا تھا اور رہر اُس سر کو بیدریغ کچل رہا تھا جس میں ذرا بھی سودائے سربلندی پایا جاتا تھا اور اس طرح عراق کو اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کے ناقابل رہا تھا، اُسی زمانے میں فرانس نے فیصل کو شام سے نکال باہر کیا اور اس لئے فرانس نے محض اس مثال کی تقلید کی جو برطانیہ نے قائم کر دی تھی[۵۲]۔"

---

۵۱ لنڈن ٹائمز: ۲۲ جولائی سنہ ۱۹۲۰ء

۵۲ ایضاً اکتوبر سنہ ۱۹۲۵ء

عراق کی جدوجہد آزادی اور ہندوستانی فوج

عراق کے ساتھ برطانیہ کے اس طرز عمل کے نتیجے میں جولائی ۱۹۲۰ء سے اکتوبر تک تین مہینے میں بغاوت کا جو طوفان اُٹھا اُس میں دو ہزار برطانوی سپاہی مجروح و مقتول ہوئے جن میں ہندوستانیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ عربوں کے مجروحین و مقتولین کی تعداد آٹھ ہزار چار سو پچاس بتائی جاتی ہے[۵]۔

آزادی کا اعلان

عربوں کی اس قربانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ کو جلد ہی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ عراق کے باشندوں سے تعاون و اشتراکِ عمل کئے بغیر اُن پر حکومت کرنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں چند سربرآوردہ عراقی لیڈروں کو ہائی کمشنر نے طلب کیا اور ان کی وزارت بنائی اور انھیں یقین دلایا کہ عراق کا بادشاہ بھی کسی عراقی ہی کو بنایا جائے گا۔ عراق کے وطن پرست حلقوں نے اپنے ایک آدمی کو نامزد کیا۔ لیکن برطانیہ کی خواہش تھی کہ فیصل جسے فرانس نے شام سے نکال دیا تھا اور جس کی وفاداری پر برطانیہ کو بیحد بھروسہ تھا اُسے عراق کے تخت پر بٹھا دیا جائے، مگر عراق کے وطن پرست حلقوں نے فیصل کی بادشاہت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اس اختلاف کا فیصلہ یوں کیا گیا کہ ایک دن دفعتہً عراقیوں نے یہ سُنا کہ اُن کے نامزد کئے ہوئے امیدوار کو برطانیہ نے جلاوطن کردیا ہے اور اب چونکہ میدان میں صرف فیصل ہی رہ جاتا تھا۔ اس لئے وہ بلا مقابلہ "شاہِ عراق" منتخب ہوگیا۔ ۲۳ر اگست ۱۹۲۱ء کو باضابطہ طور سے فیصل کی بادشاہت کا اعلان کردیا گیا۔

انگریزی حکومت کے مقابلے میں فیصل ہی کو عراقیوں نے غنیمت سمجھا لیکن جب فیصل

---

[۵] پوسٹ وار ورلڈ از جیکسن

کی تخت نشینی کی باقاعدہ رسم ادا کرنے کا وقت آیا تو لندن سے نوآبادیات کے وزیر نے اُسے تار دیا کہ تاجپوشی کے وقت تم جو خطبہ پڑھو اس میں یہ ظاہر کرو کہ عراق کا اقتدارِ اعلیٰ برطانوی ہائی کمشنر ہے۔ فیصل کو جب یہ تار پہنچا تو وہ سخت پریشان ہوا اس نے محسوس کیا کہ اگر خطبے میں اس قسم کا اعلان کر دیا گیا تو عراقی اس کی طرف سے بدظن ہو جائیں گے اور اُسے انگریزوں کا پٹھو سمجھ کر ممکن ہے اس کے خلاف بغاوت کر ڈالیں اس لئے اس نے برطانیہ کی اس ہدایت کے جواب میں لکھا کہ مجھے ایک آزاد بادشاہ بنانے کا وعدہ کیا گیا ہے اس لئے ایک آزاد بادشاہ کی طرح میں برطانیہ سے معاہدہ تو کر سکتا ہوں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ہائی کمشنر کی ماتحتی قبول کر لوں۔ فیصل کی اس بحث و تکرار پر برطانیہ نے اس حکم کو واپس لے لیا اور پھر اکتوبر ۱۹۲۲ء میں ایک معاہدے کی رو سے عراق سے برطانیہ کا محکومانہ نہیں، دوستانہ تعلق تسلیم کیا۔

دستورِ اساسی

اس معاہدے کے بعد عوام کے منتخبہ نمائندوں پر مشتمل ایک "نمائندہ اسمبلی" طلب کی گئی جس نے عراق کے لئے "دستورِ اساسی" (کانسٹی ٹیوشن) بنانے کا کام شروع کیا جون ۱۹۲۴ء میں یہ دستور تیار ہوا جس میں "محدود شاہی" کے ساتھ عوام کی ذمے دار حکومت کو اساسِ آئین تسلیم کیا گیا۔ یعنی برطانوی نظامِ حکومت کی تقلید میں بادشاہ کا وجود تو برقرار رکھا گیا، البتہ اس کے اختیارات کو آئینی حدود میں جکڑ بند کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس آئین کی رو سے عراق کی مجلسِ قانون ساز دو ایوانوں پر مشتمل ہے: مجلس النواب (لوئر ہاؤس) اور مجلس الاعیان (اپر ہاؤس) اس آئین کے مطابق عراقی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس ۱۹۲۵ء میں ہوا۔[۵]

---

[۵] تفصیل کے لئے دیکھو "کانسٹی ٹیوشنل لاآف عراق" از ہوپر مطبوعہ بغداد (۱۹۲۸ء)

لیکن عراق کو یہ آزادی صرف داخلی معاملات میں تھی۔ خارجی معاملات کا سررشتہ پوری طرح برطانیہ کے ہاتھ میں تھا۔ اور اس سلسلے میں برطانیہ و فرانس کی باہمی رقابت بڑے زور وشور سے چل رہی تھی۔ فرانس جس نے فیصل کو شام سے نکال دیا تھا، عراق میں بھی اسکی حکومت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا، وہ سمجھتا تھا فیصل برطانیہ کا آدمی ہے، اس لئے فیصل کی آڑ میں خود برطانیہ ہی عراق پر حکومت کررہا ہے۔ دراصل برطانیہ نے فرانس کے ان ہی شکوک کو رفع کرنے کے لئے فیصل پر زور دیا کہ دستور اساسی بنا کر عوام کی جمہوری حکومت کا اعلان کرو تاکہ فرانس کے اس اعتراض کا جواب دیا جاسکے کہ فیصل کے پردے میں برطانیہ حکومت کر رہا ہے اس کے علاوہ برطانیہ نے کچھ اور طریقوں سے بھی فرانس کو رام کرنے کی کوشش کی۔ اور آخر ۱۹۲۵ء میں فرانس سے فیصل کی حکومت کو جائز حکومت منوا لیا گیا۔

لیکن عراقی عوام کو فرانس کے اس فیصلے سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ وہ عراق کی آزادی چاہتے تھے اور جب تک برطانوی انتداب کا جوا ان کی گردن پر رکھا تھا، کسی طرح مطمئن ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ آزادی طلبی کی ایک زبردست جدوجہد شروع ہو چکی تھی۔ اس جدوجہد میں فرانس، روس اور ترکی کی ہمسایہ حکومتوں کی اخلاقی ہمدردیاں، برطانیہ کی رقابت کی وجہ سے، عراقیوں کے ساتھ تھیں۔ آخر عراق سے فائدہ صرف برطانیہ ہی کیوں اٹھائے، دوسرے بھی اس میں حصے دار کیوں نہ بنیں؟ اس صورت حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۶ء میں برطانیہ نے عراق سے دوسرا معاہدہ کیا جس میں اسے ایک "آزاد ریاست" تسلیم کیا گیا اور یہ وعدہ کیا گیا کہ جمعیت اقوام کے نام سے آزاد اقوام کی جو انجمن ہے، عراق کو بھی اس کا ممبر بنانے کی سفارش برطانیہ کی طرف سے کی جائے گی۔ لیکن یہ "سفارش" پانچ سال تک لیت و لعل میں پڑی رہی اور ۱۹۳۲ء سے پہلے عراق، انجمن اقوام کا ممبر نہ بن سکا۔

۱۹۳۲ء میں عراق کو یہ ممبری مل گئی گویا اب دُنیا نے اُسے ایک "آزاد حکومت" تسلیم کر لیا۔ لیکن برطانیہ نے اس سے جو معاہدہ کیا تھا، اس کی رو سے برطانیہ کو عراق میں ہوائی جہاز کے اسٹیشن بنانے اور ان کی حفاظت کے لئے تھوڑی سی فوج رکھنے کا اختیار دیا گیا۔ مزید براں یہ بھی طے ہوا کہ عراقی حکومت کچھ انگریزوں کو بطور مشیر رکھے گی تاکہ نیم مہذب عراقی، حکومت کرنا سیکھ سکیں"۔ چنانچہ فوجی وزارت کے سر پر ایک "برٹش ملٹری مشن" آج تک مسلط ہے خفیہ پولیس کے محکمہ میں بھی دو تین اعلیٰ عہدیدار، انگریز رہتے ہیں۔[1]

تیل عراق کی سب سے بڑی دولت جس نے اسے عہدِ حاضر کا بہت اہم ملک بنا دیا ہے، تیل کے چشمے ہیں جو عرصے تک برطانیہ و فرانس کے درمیان موضوع بحث بنے رہے۔ آخر ایک سمجھوتے کی رو سے برطانیہ نے فرانس کو بھی اس "مالِ غنیمت" میں شریک کر لیا۔ چنانچہ اس تیل کو بحر روم کے بندرگاہ تک پہنچانے کے لئے جو "پائپ لائن" بنائی گئی ہے، اس کی دو شاخیں ہیں۔ ایک کا سرا فرانس کے انتدابی علاقے، شام میں ختم ہوتا ہے اور دوسرا برطانیہ کے انتدابی علاقے فلسطین میں۔ تیل نکالنے بنانے اور بیچنے کے تمام اختیارات اینگلو ایرانین کمپنی کو حاصل ہیں۔ اِس کمپنی کے نام میں ایران کے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ ایرانی تیل کے چشموں کا ٹھیکہ بھی اسی کو حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ایک برٹش آئل کمپنی بھی ہے۔ جس کو دریائے اصل کے مغربی اور شمالی نواح میں تیل کے چشمے ڈھونڈھنے اور اگر مل جائیں تو اُن سے فائدہ اٹھانے کی واحد اجارے داری حاصل ہے۔

---

[1] دیکھو: عراق فرام مین ڈیٹ ٹو انڈپنڈنس از Main مطبوعہ لندن (۱۹۳۵ء) اور "عراق" از پی ڈبلیو آئرلینڈ (لندن) ۱۹۳۶ء

۱۹۴۴ء میں عراقی تیل کی مقدار ۲۵ لاکھ ٹن (۷۰۲ کروڑ من) تھی[1] جو اربوں روپے میں فروخت ہوا۔ لیکن عراق کا حصّہ اس آمدنی میں مشکل سے پانچ فی صدی ہوگا

مذہب آبادی اور زبان

عراق کی آبادی ۱۹۳۵ء کی مردم شماری میں ۳۶ لاکھ تھی جس میں ۳۱ لاکھ سے کچھ زائد مسلمان ہیں۔ شیعوں کی تعداد سنیوں سے زائد ہے۔ مردم شماری میں شیعہ سُنی کی تخصیص نہیں کی جاتی۔ لیکن بظاہر اندازہ یہ ہے کہ سنیوں کے مقابلے میں شیعہ آبادی ساٹھ فی صدی کے قریب ہوگی۔[2] زبان عربی ہے۔ لیکن کُرد قوم کی جو تھوڑی سی تعداد شمالی حصّے میں بستی ہے۔ اس کی زبان عربی سے کچھ مختلف ہے اور کردی زبان کہلاتی ہے۔ مگر رسمِ خط، عربی اور کردی دونوں زبانوں کا ایک ہے۔

معاشی حالت

عراق کی زمین دجلہ و فرات کے پانی سے سیراب ہوتی ہے اور ان دریاؤں کی وجہ سے شمالی پہاڑوں کے بے شمار قیمتی معدنی اجزا اس میں شامل ہیں جس نے اسے بے حد زرخیز بنا دیا ہے ——— "اتنا زرخیز کہ لوگ یقین بھی مشکل سے کریں گے"[2] لیکن چونکہ جگہ جگہ دلدلیں واقع ہیں اور پانی کی نکاسی اور زمین کی سیرابی کے جدید آلات سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے، اس لئے آب و ہوا اچھی نہیں ہے۔

معیشی اعتبار سے عراق بھی مصر و شام کی طرح ایک زراعتی ملک ہے جہاں لوگ صرف کاشت کر کے روزی پیدا کرتے ہیں۔ صنعت و انڈسٹری ابھی عالمِ طفولیت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی برآمدی تجارت کے مقابلے میں درآمدی تجارت زیادہ ہے

---

[1] اسٹیٹسمین ایر بک ۱۹۴۴ء

[2] چیمبرس انسائکلوپیڈیا۔ جلد ششم صفحہ ۲۶

۱۹۴۲ء میں عراق نے ایک کروڑ دینار کا مال باہر سے درآمد کیا، لیکن برآمد صرف ۷۰ لاکھ دینار کا مال ہوا۔[1]

برآمد کی جانے والی اشیا میں جو، جئی، اون، چمڑے، کھالیں، روئی اور مویشی شامل ہیں۔ سب سے بڑی تجارت کھجوروں کی ہی۔ ۱۹۴۱ء میں ایک لاکھ ۳۲ ہزار ٹن (۳۶ لاکھ من) کھجوریں یہاں سے باہر بھیجی گئیں۔ کھجوروں کا سب سے بڑا گاہک ہندوستان ہی۔ پھر برطانیہ، امریکہ، ایران، جاپان، جزائر شرق الہند اور ترکی وغیرہ[2]

سکہ اور مالیہ

پہلے عراق میں روپیہ بھی چلتا تھا لیکن اپریل ۱۹۳۱ء سے عراقی حکومت نے اپنا قومی سکہ نافذ کر رکھا ہی۔ سونے کا سب سے بڑا سکہ دینار ہی جو قیمت میں انگریزی پونڈ کے برابر کر دیا گیا ہی۔ ایک دینار میں ایک ہزار فلوس ہوتے ہیں۔ فلوس سب سے چھوٹے سکے ہیں۔ ایک فلس ہمارے ایک پیسے کے برابر ہوتا ہی۔ پچاس فلوس کا ایک چھوٹا سا چاندی کا سکہ درہم کے نام سے بنایا گیا ہی۔ یہ انگریزی شلنگ کے برابر ہی اور ہندوستانی حساب سے تقریباً بارہ آنے کا ہوتا ہی۔ درہم اور دینار کے بیچ میں ایک اور سکہ بھی ہی جسے ریال کہتے ہیں اور جس میں دو سو درہم ہوتے ہیں۔

سکے اور شرح تبادلہ کو قوموں کے معاشی و سیاسی نظام میں جو اہمیت حاصل ہی اس کا ذکر تو آئندہ کسی باب میں آئے گا۔ یہاں عراق کی سکہ سازی کے بارے میں صرف یہ بتا دینا ضروری ہی کہ انگریزی اقتدار کی وجہ سے یہاں کے سکہ کا دامن انگلستان کے ساتھ بندھا ہوا ہی۔ چنانچہ "ایرانی کرنسی بورڈ" جو زر تبادلہ وغیرہ کے سیاہ و سفید کا

---

[1] اسٹیٹسمین ایربک ۱۹۴۴ء

[2] " "

مالک ہے، اس کے اجلاس لندن ہی میں ہوتے ہیں۔

عراقی سکوں کی ایک دلکش خصوصیت یہ ہے کہ ان کے نام وہی رکھے گئے ہیں جو پرانے زمانے میں رائج تھے اور جو آج بھی ہارون و مامون کے عہد کا رومانی نقشہ پردۂ خیال پر کھینچ دیتے ہیں۔ دینار و درہم کے نام اب صرف عراق ہی میں لئے جاتے ہیں باقی تمام بلادِ اسلامیہ میں یہ نام رائج نہیں ہیں۔ ایران میں دینار و ریال کے نام موجود ہیں، لیکن دینار کو ریال سے کمتر بنا کر پرانے تصوّر کو اُلٹ دیا گیا ہے حجاز میں بھی ریال سب سے بڑا طلائی سکہ ہے۔ لیکن درہم کا تو نام بھی عراق کے سوا کسی ملک میں آپ نہیں سُنیں گے۔ عراق کی تجارت پر امپیریل بینک آف ایران کا تسلط ہے جو خاص انگریز سرمایہ داروں کی ملکیت ہے اور ایران و عراق دونوں کی تجارت و صنعت پر چھایا ہوا ہے۔ ترکی کا "عثمانیہ بینک" بھی یہاں کا کام کرتا ہے لیکن اس کا کاروبار امپیریل بینک سے بہت کم ہے۔

عراق میں آمد و رفت کا بجٹ عموماً ایک کروڑ دینار کے لگ بھگ رہتا ہے۔ عام لوگوں کا معیارِ زندگی ہندوستان سے نسبتاً بہتر ہے، لیکن ترکی اور مصر دونوں سے کم ہے۔

رسل و رسائل اور تعلیم

بغداد ریلوے جس نے ۱۹۱۴ء کی جنگ کے شعلوں کو بھڑکانے میں بہت کام کیا ہے اور جس کی تیاری کا کام جنگ کے دوران میں بڑی تیزی سے جاری رہا، اب ایک پرانی چیز ہو کر رہ گئی جس کی پرانی تاریخ کی یاد بھی بہت کم دلوں میں باقی ہوگی۔ آج بصرہ سے لیکر بغداد تک اور پھر بغداد سے ترکی ہوتے ہوئے یورپ کے دور دراز گوشوں تک ریل کا جال بچھا ہوا ہے اور مہینوں کے سفر گھنٹوں میں طے ہوتے ہیں۔

عراق میں یونیورسٹی کے معیار کی کوئی درسگاہ نہیں ہے۔ البتہ کالج کئی ایک ہیں ابتدائی تعلیم کے لئے جبری قانون پاس کیا جا چکا ہے۔ مگر اس کے نفاذ میں سختی نہیں برتی جاتی

جس کی وجہ سے عام تعلیمی معیار بہت پست ہے۔

انجنیری، ملٹری اور فزیکل ایجوکیشن کے کالجوں کے علاوہ باقی تمام کالجوں میں لڑکوں لڑکیوں کی مخلوط تعلیم نافذ ہے۔ یعنی پردے کا جو نقشہ ہندوستان میں نظر آتا ہے، عراقی اس سے ناآشنا ہیں، تاہم ترکی کے مقابلے میں مردوں عورتوں کا اختلاط کم ہے اس لحاظ سے ترکی کے بعد مصر کا نمبر آتا ہے۔[1]

فیصل عراق کا پہلا بادشاہ فیصل بڑی ضبط و برداشت اور بڑے تدبر و حکمت و عمل کا آدمی تھا۔ عراق اُس کی فرمانروائی برطانوی اقتدار کی رہینِ منت تھی اور قوم پرست حلقے اس کے خلاف تھے، دوسری طرف فرانس مخالف تھا۔ تیسری طرف عراق کی شیعہ آبادی اور ایران کے پڑوسی شیعہ اُسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے چوتھے برطانوی اقتدار و تسلط سے بھی اُسے عہدہ برآ ہونا تھا، پانچویں ابن سعود کی نجدی حکومت سے بھی اس کی مخالفت عرصے سے چلی آرہی تھی۔ لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود اُس نے بڑی حکمت و دانائی سے کام لیا اور بڑی حد تک ہر ایک کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ نجدی قبائل جنوبی عراق پر برابر مار دھاڑ مچا رہے تھے۔ اس کے انسداد کے لئے ۱۹۳۰ء میں فیصل نے ابن سعود سے ملاقات کی اور معاملات رو باصلاح ہو گئے۔

فیصل عقیدۃً پکا مسلمان تھا۔ مگر لباس انگریزی پہنتا تھا، اس نے اپنے بیٹے شاہ غازی کو اپنے بھائی زید سمیت تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا تھا۔ پھر بھی اس کی ترقی پسندی مصطفےٰ کمال کے مقابلے میں بہت معتدل تھی۔ اس نے نہ تو جبراً اصلاحات نافذ کیں اور نہ اپنے گھر کی خواتین کو بے پردہ کیا۔

---

[1] دیکھو انڈپنڈنٹ عرب از ینگ (مطبوعہ لندن ۱۹۳۳ء) اور عربس آف سنٹرل عراق شکاگو ۱۹۳۵ء از فیلڈ

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں حرکت قلب بند ہو جانے سے زندگی کے گوناگوں تجربات رکھنے والی یہ ہستی ہمیشہ کے لئے اس جہاں سے رخصت ہوگئی اور اس کی جگہ شاہ غازی تخت پر بیٹھا۔ غازی اگرچہ انگلستان کے مشہور اسکول ہیرو Harrow کا تعلیم یافتہ تھا اور اس لحاظ سے ہمارے ہندوستانی لیڈر جواہر لعل نہرو کا "ہم مکتب" ہوا۔ مگر یہ یورپ کی تہذیب کا دلدادہ بالکل نہ تھا، اس نے اس تہذیب کے گنبد کو اندر سے دیکھا تھا، اس کی چمک دمک کے نیچے جو خامیاں اور کمزوریاں تھیں اُن سے اس کی نگاہ ناآشنا نہیں رہی۔ لیکن ابھی اس کی حکومت عہد طفولیت ہی میں تھی کہ ایک ناگہانی حادثے میں ۴ راپریل ۱۹۳۹ء کو اس کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا فیصل دوم تخت و تاج کا وارث قرار پایا۔ لیکن اس کی عمر صرف چار سال تھی اس لئے فیصل اول کے بھائی امیر عبد اللہ (والی شرق اُردن) کی نگرانی میں ایک ریجنسی قائم کی گئی جو نابالغ بادشاہ کے بالغ ہونے تک حکومت کا نظم ونسق چلائے گی۔

یہ تھا عراق کا سیاسی و معیشی نقشہ جب ستمبر ۱۹۳۹ء کی جنگ کا آغاز ہوا اس جنگ نے عراق پر جو کچھ اثر ڈالا، وہ جلد دوم کے ایک مستقل باب کا موضوع ہے

باب ۲۲

فلسطین اور شرقِ اُردن

برطانیہ کے متضاد وعدے

دنیا کا سب سے زیادہ مظلوم علاقہ

فلسطین، دنیا کا وہ بدنصیب ترین علاقہ ہے جو ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد برطانیہ اور برطانیہ کے اتحادیوں کی شہنشاہی سیاست کا سب سے زیادہ شکار ہوا ہے۔ جغرافیائی، نسلی، مذہبی، لسانی، تاریخی، روایتی اور تمدنی ہر لحاظ سے فلسطین شام کا ایک ضلع ہے۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں جب پہلی جنگ عظیم کے بعد عرب کی نئی تقسیم کی گئی تو ایک ظلم تو یہ کیا گیا کہ چھ سات لاکھ انسانوں کی اس مختصر سی بستی کو شام سے جدا کر دیا گیا اور دوسرا ستم یہ ڈھایا گیا کہ ساری دُنیا کے یہودیوں کو یہاں لا کر بسا دینے کا اعلان کیا گیا۔ شام سے الگ کر دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خود کفالتی اور طاقتور عرب قومیت کا جز ہونے کے بجائے فلسطین برطانیہ کا دستِ نگر ہو کر رہ گیا اور "وطن الیہود" بنا دینے کی پالیسی کا انجام یہ ہوا کہ (۱)، اس کی اقتصادی حالت سخت خراب ہو گئی کیونکہ جو علاقہ ۱۹۱۸ء میں صرف چھ سات لاکھ نفوس کی کفالت کرتا تھا وہ یہودیوں کی بے تحاشا آمد کی وجہ

سے ۱۹۴۵ء میں یعنی صرف ۲۵ سال کے اندر اندر سولہ لاکھ سے زائد انسانوں کا بارِ کفالت اٹھانے پر مجبور کیا گیا (۲) معاشرتی حالت بیحد ناقص ہوگئی اس لئے کہ یہودیوں نے یہ کوشش کی کہ عربوں کی موجودہ تہذیب و مدنیت کا قلع قمع کرکے ہزاروں سال پہلے کی بنی اسرائیلی معاشرت کو از سرِ نو زندہ کیا جائے (۳) لسانی یکجہتی برباد ہوگئی کیونکہ یہودیوں نے عربی کے بجائے پرانی عبرانی زبان کے مردہ ڈھانچے میں جان ڈال کر اپنے علاقوں میں عربی کے بجائے عبرانی کو دفتری و تعلیمی زبان بنانے کی منظوری برطانیہ سے حاصل کی (۴) قومی اتحاد و یکدلی کا خاتمہ ہوا اور یہودیوں اور عربوں کے درمیان ایک ایسی خوفناک کشمکش کا آغاز ہوا جس نے مذہبی، لسانی، معاشرتی اور تاریخی ہر لحاظ سے فلسطینی آبادی کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا (۵) یہودی چونکہ دنیا کی سب سے زیادہ دولتمند قوم ہی اس لئے تمام روئے زمین کے یہودیوں نے مل کر مقامی عربوں کی جائدادیں خریدنی شروع کردیں جس نے قدیم باشندوں کو سخت مصیبت میں ڈال دیا (۶) دنیا بھر کے یہودیوں کی آمد کی وجہ سے چیزوں کی قیمتیں بے تحاشا بڑھ گئیں اور معیارِ زندگی اونچا ہوگیا لیکن عرب مفلس سے مفلس تر ہوتے چلے گئے جس نے یہودیوں و عربوں کی سوال کو سرمایہ دار و فاقہ کش کی خوفناک کشمکش میں تبدیل کردیا (۷) یہودیوں کی پشت پر چونکہ ساری دُنیا کے یہودیوں کی دولت اور برطانیہ اور برطانیہ کے اتحادیوں کی طاقت کارفرما تھی اس لئے عربوں کی بے کسی و بے بسی کے اس احساس نے جنونِ یوسی کی وہ شکل اختیار کرلی جو قدرتاً دہشت انگیزی پر منتج ہوتی ہی اور جو ملکی سیاست کا ستیاناس کرکے رکھ دیتی ہی۔

یہ ہیں وہ انعامات جو ۱۹۱۴ء کی جنگ میں ترکوں کے خلاف برطانیہ کی مدد کرنے کے صلے میں فلسطین کے عربوں کو عطا کئے گئے اور یہ ہی اُن بے شمار سرکاری اعلانوں اور ذمہ دارانہ بیانوں کا مآل کار جن میں عربوں کو ایک آزاد خود مختار سلطنت میں

تبدیل کر دینے کے دعدے کئے گئے تھے۔

ہائے خطاب کیا کیا، دیکھے عتاب کیا کیا
دل کو لگا کے ہم نے کھینچے عذاب کیا کیا

شہنشاہیت کے ہاتھوں دنیا پر بڑے بڑے ظلم ڈھائے گئے ہیں۔ لیکن فلسطین جن انوکھے مظالم کا شکار رہا ہے، اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

جنرل ایلن بائی نے فلسطین کو عربوں کی مدد سے ۱۹۱۷ء میں فتح کیا تھا اسوقت عربوں کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس سرزمین کی نسبت اتحادیوں کے منصوبے کیا ہیں اُن سے جو وعدے کئے گئے تھے ان کے مطابق وہ یہی سمجھتے تھے کہ جس طرح یہ علاقہ ہمیشہ سے شام کے صوبے میں شامل رہا ہے، اسی طرح آگے بھی رہے گا۔ لیکن ۲ر نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانوی وزیر خارجہ لارڈ بالفور نے یہ اعلان شائع کیا کہ فلسطین کو یہودیوں کا "قومی وطن" بنایا جائے گا عرب یہ سُن کر ہکّے بکّے رہ گئے انہوں نے برطانیہ کے اس اعلان کے خلاف پوری طاقت سے احتجاج کیا۔ مگر برطانیہ کا یہ اعلان بدستور باقی رہا۔ اگرچہ حالات سے مجبور ہو کر وقتاً فوقتاً اس میں خفیف ترمیمیں ہوتی رہیں۔

یہودیوں کی تحریک قومیت

فلسطین دس ہزار مربع میل کا ایک چھوٹا سا علاقہ ہے لیکن چونکہ اس میں بیت المقدس (یروشلم) واقع ہے۔ اس لئے مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں تینوں کے لئے مذہبی تقدس رکھتا ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جو گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر چودہویں صدی تک صلیبی جنگوں کا آماجگاہ رہا ہے اور جس کے لئے یورپ کے گوشے گوشے سے سرفروش و جانباز عیسائی سمٹ سمٹ کر آتے تھے۔ لیکن اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی تحریک کے بعد جب پاپائیت کا اقتدار ختم ہوا اور قومیت و وطنیت کا دور شروع ہوا تو عیسائیوں کی توجہ دوسرے مسائل کی طرف مبذول ہو گئی اور صلیبی جنگوں کی ہماہمی ختم ہو گئی۔ لیکن قومیت و وطنیت کو

اس دور میں یہودی ایک ایسی نسل ہو کر رہ گئے جو ہر جگہ بستی ہو مگر کسی جگہ کو بھی اپنا وطن یا اپنی قوم نہیں سمجھتی۔ وہ سب جگہ ہو اور کہیں نہیں ہو۔ بات یہ ہو کہ یہودی کسی مذہب کا نہیں بلکہ ایک نسل کا نام ہو۔ جو لوگ بنی اسرائیل کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو حضرت موسیٰ نے فرعون کے پنجۂ ظلم و استبداد سے نجات دلائی تھی، وہ سب یہودی کہلاتے ہیں۔ یہودیوں کا عقیدہ یہ ہو کہ نہ تو کوئی یہودی، غیر یہودی بن سکتا ہو اور نہ کسی غیر یہودی کو یہودی بنایا جا سکتا ہو۔ وہ نہ تبلیغ کرتے ہیں نہ تبلیغ سے متاثر ہوتے ہیں، علاوہ ازیں یہودی چونکہ کسی خاص ملک میں نہیں بستے۔ اس لئے قومیت و وطنیت کی تحریکات سے بھی انہیں دلچسپی نہیں ہو سکتی ہر جگہ وہ بین القومی طور پر آباد ہیں۔ اس لئے قدرتاً ان کی دلچسپیاں قومی نہیں بین القومی ہیں۔ لیکن یورپ میں تحریک قومیت کے نشو و نما کے بعد، یہودیوں کی یہ بین الاقوامیت ہر قوم کو سخت ناگوار گذری۔ پھر اگرچہ اصلاحِ مذہب (ریفارمیشن) نے عیسائی یورپ کے مذہبی احساسات کو کمزور کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی یہودیوں نے حضرتِ عیسےٰ کے ساتھ جو مظالم کئے تھے ان کو سولی کے تختے تک لے جانے کی جو کوششیں یہودیوں کی طرف سے کی گئی تھیں اور جن کی دردناک تفصیلات انجیل میں درج ہیں ان کے نیم شعوری اثرات نے قومیت کے شعوری محرکات کے ساتھ مل کر یہودی کے خلاف ایک عام نفرت پھیلا دی۔ ان حالات میں قدرتاً یہودیوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ انھیں بھی کسی جگہ کو وطن بنا کر رہنا چاہیئے مگر یہ جگہ کونسی ہو؟ دنیا کے کسی ملک میں وہ اکثریت میں نہیں ہیں، لیکن اپنے تجارتی کاروبار اور سرمائے کے لحاظ سے دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں وہ موجود نہ ہوں۔ افریقہ کے دسیع و عریض براعظم کے نئے نئے علاقے جب دریافت ہوئے تو برطانیہ نے تجویز کیا کہ مشرقی افریقہ کے کسی اچھے سے برطانوی علاقے کو یہودی اپنے لئے پسند کر لیں۔ مگر اپنے جمے جمائے کاروبار کو چھوڑ کر سکونت منتقل کرنا بہت مشکل ہوتا ہو اور جب تک کوئی بہت ہی بڑا محرک نہ ہو،

کوئی آدمی بھی اس دردِ سر کو مول لینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہودیوں کے لئے اس پیشکش میں کوئی دلکشی نہ تھی پھر کیا کیا جائے؟ یہودیوں کا کوئی وطن تو ضرور ہونا چاہیئے، بآخر ۱۸۹۷ء میں یہودیوں کی جماعت نے یہ طے کیا کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس مقصد کے لئے ساری دنیا کے یہودیوں کو ایک مرکزی جماعت میں منسلک کرنے کی کوشش کی گئی، اور یروشلم کی ایک پہاڑی "صہیون" کے نام پر اس تحریک کا نام "صیہونیت" رکھا گیا۔ اس صیہونی انجمن کا ممبر ہر وہ عاقل بالغ یہودی ہو سکتا ہے جو ایک شلنگ سالانہ چندہ دے سکے۔[۱]

فلسطین یہودیوں کے لئے بہت بڑی تاریخی عظمت و تقدیس رکھتا ہے اور مسلمانوں کے نزدیک مکۂ معظمہ کو جو اہمیت حاصل ہو سکتی ہے وہی یہودیوں کے نزدیک فلسطین کو ہے۔ اس لئے یہودی عوام کے لئے یہ خیال بہت ہی خوشگوار تھا کہ وہ موسیٰ و ہارون ؑ کی اس پاک سرزمین میں منتقل ہوں۔ مگر منتقل کیسے ہوں؟ فلسطین پہلے سے بہت گنجان آباد ہے اور یہاں ۱۰ لاکھ سے زائد عرب بستے ہیں، پھر جو مسلمان اور عیسائی یہاں بستے ہیں خود وہ بھی تو اس سرزمین کو مقدس سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر مقدس نہ سمجھیں تب بھی آخر اپنے آبائی وطن کو باہر سے آنے والے نوواردوں کے لئے کیوں خالی کر دیں اور اگر خالی کر دیں، تو خود کہاں جائیں؟۔

ان مشکلات کی بنا پر، یہودیوں کا یہ منصوبہ عملی جامہ نہ پہن سکا، تاہم چونکہ

---

[۱] صیہونی تحریک کی تفصیلی تاریخ کے لئے دیکھو "تاریخ صیہونیت" (Zionism) از Sokolow (مطبوعۂ لندن ۱۹۱۹ء) اور "صیہونیت" از اسٹین (مطبوعہ لندن ۱۹۳۲ء) یہ دونوں مصنفین صیہونی تحریک کے بہت بڑے لیڈر ہیں۔ اس لئے ان کی کتابوں میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہودی عزائم کی صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔

فلسطین کو وطن بنانے کا محرک بہت قوی تھا، اس لئے آہستہ آہستہ یہودیوں نے یہاں زمینیں خریدنی شروع کیں، لیکن عوام اور حکومت دونوں میں سے کسی کی ہمدردی واعانت بھی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے انھیں کوئی خاص کامیابی نہ ہو سکی، اور جنگ ۱۹۱۴ء کے اختتام تک بیس بائیس سال کے عرصے میں بہت ہی تھوڑے سے یہودی فلسطین میں آکر بس سکے۔

یہودیوں سے برطانیہ کا وعدہ

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو یہودیوں نے اتحادیوں سے سازباز شروع کی اور اُن سے یہ درخواست کی کہ اگر فلسطین کو "یہود کا وطن" بنا دینے کا وعدہ کیا جائے تو ہم جنگ کے فنڈ میں روپیہ بھی دیں گے اور میدان میں لڑنے کے لئے آدمی بھی مہیا کریں گے۔ اس وقت اتحادیوں کے سامنے صرف فتح تھی۔ اس لئے یہودیوں کی اس پیشکش کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا گیا۔ آدمی تو یہودی زیادہ نہ دے سکے اس لئے کہ وہ جنگجو قوم نہیں ہیں۔ بڑی مشکل سے جنگ کے آخری سال میں برطانیہ و امریکہ کے یہودیوں کی مشترک کوشش سے صرف ایک فوجی دستہ فلسطین کے میدان میں میں بھیجا جا سکا۔ لیکن فرانسیسی یہودی تو اتنا بھی نہ کر سکے[1] البتہ روپے کی یہودیوں کے پاس کیا کمی ہے۔ دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم اگر کوئی ہے تو وہ یہودی ہیں۔ اس لئے روپیہ بیدریغ دیا گیا۔ پھر چونکہ وہ مالدار ہیں اس لئے تعلیمی اور فنی لحاظ سے بھی ان کا رتبہ بہت بلند ہے، ڈاکٹر، انجنیئر، پروفیسر اور ماہرینِ سائنس یہودیوں میں بہت اچھے اچھے ہیں، ان لوگوں نے بھی جنگ میں اپنی خدمات پیش کیں۔ ان ہی میں سے ایک شخص ڈاکٹر ویزمین

---

[1] وِدھ لارنس اِن اریبیا۔ از لاول ٹامس (مطبوعہ یو، ایس، اے)

بھی تھا جو یہودی "وطنی تحریک" کا لیڈر بھی تھا اور بہت بڑا سائنٹسٹ بھی۔ جنگ کے دوران میں اس نے لکڑی سے الکحل (شراب کا جوہر) نکالنے کا طریقہ دریافت کیا اور برطانیہ کو بتایا، جنگ کے زمانے میں الکحل بڑی ضروری چیز ہوتی ہے۔ لائڈ جارج نے اس ایجاد پر ڈاکٹر ویزمین کو کچھ انعام دینا چاہا۔ مگر ڈاکٹر نے روپیہ یا جاگیر کی شکل میں کچھ لینے سے انکار کیا، وہ خود اتنا مالدار تھا کہ اُسے اس کی ضرورت نہ تھی، اُس نے لائڈ جارج سے کہا کہ میری اس خدمت کے معاوضے میں یہودیوں کا یہ حق تسلیم کر لیا جائے کہ فلسطین اُن کا وطن ہے اور جنگ کے خاتمے پر انھیں وہاں بسا دیا جائے گا۔ لائڈ جارج نے اس مطالبے کو منظور کر لیا۔ لیکن اس وقت یہ وعدہ خفیہ تھا جب فلسطین فتح ہو گیا تو اعلان بالفور کی شکل میں اس کا اظہار کر دیا گیا۔

عربوں کی بغاوت

لیکن یہ اعلان حسب دستور "سیاسی زبان" میں تھا۔ اس میں فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنا دینے کا وعدہ تو تھا۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی مذکور تھا کہ عربوں کے معاشی و سیاسی مفاد کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، عرب جو ابھی سیاست کے گُرگھاٹ سے ناواقف تھے اس شرط سے مطمئن ہو گئے۔ پھر ۱۹۲۰ء تک عراق و شام کی طرح فلسطین میں بھی مارشل لا کی فوجی حکومت رہی اور دنیا کی توجہ یورپ کے مسائل کی طرف لگی رہی، مگر ۱۹۲۰ء میں انگلستان سے جو شخص فلسطین کا ہائی کمشنر بنا کر بھیجا گیا وہ سر ہربرٹ سموئیل تھا جو نہ صرف مذہباً یہودی تھا بلکہ تحریک صہیونیت کا بہت پرجوش لیڈر بھی سمجھا جاتا تھا اس کے ہائی کمشنر ہونے پر یہودیوں نے بڑی خوشیاں منائیں اور کہا کہ نبی ہیمیہ کے بعد اب ڈھائی ہزار سال گزرنے پر یہودیوں کی قسمت پلٹی ہے اور فلسطین کا حاکم ایک یہودی بنایا گیا ہے۔ عربوں نے یہ آوازیں سنیں تو ان کے کان کھڑے ہوئے تاہم ابھی چونکہ فلسطین کے بارے میں کوئی مستقل فیصلہ نہ ہوا تھا اس لئے وہ خاموش رہے

لیکن جب دو سال بعد ۲۴ر جولائی ۱۹۲۲ء کو فلسطین کو شام سے الگ کر کے برطانوی انتداب میں دیئے جانے کا اعلان ہوا تب تو عربوں کو یقین ہو گیا کہ برطانیہ سے انہوں نے جو کچھ امیدیں باندھ رکھی تھیں وہ محض خواب و خیال تھیں۔ انہوں نے برطانوی انتداب کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور عراق و شام کی طرح فلسطین میں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی، خصوصاً یروشلم اور جافہ میں (جہاں یہودی کافی تعداد میں آ کر بس گئے تھے) بکثرت بلوے ہوئے اور زبردست لوٹ مار مچ گئی، سر سموئیل نے اس فضا کو دبانے کی بہت کوشش کی، مگر ہر کوشش بیکار رہی۔ ۱۹۲۳ء اس نے اعلان کیا کہ فلسطین کے باشندوں کی ایک وزارت بنائی جائے گی، جس کے لئے عام انتخاب کیا گیا، مگر عربوں نے اس انتخاب کا مکمل بائیکاٹ کیا اور کسی ایک نے بھی اس میں ووٹ نہ دیا، جس کی وجہ سے یہ کوشش بھی بار آور نہ ہوئی۔

بغاوت کا نتیجہ

۱۹۲۵ء میں سر سموئل کو واپس بلایا گیا اور اس کی جگہ دوسرا ہائی کمشنر لارڈ پلومر آیا۔ یہ یہودی نہ تھا۔ اس تبدیلی نے عربوں پر اچھا اثر کیا، انہوں نے اس نئے کمشنر کی ذات سے اچھی توقعات وابستہ کیں۔ لیکن لارڈ پلومر کیا کر سکتا تھا، برطانیہ نے جو پالیسی بنائی تھی اس سے تجاوز کرنا اس کے اختیار میں نہ تھا، حقیقت یہ ہے کہ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان کوئی ایسی مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی تھی جو اعلان بالفور کی شرائط کی تکمیل کر سکتی۔ لارڈ پلومر نے عربوں اور یہودیوں دونوں کو خوش کرنے کی کوشش کی، مگر وہ کسی کو بھی خوش نہ رکھ سکا۔ ۱۹۲۶ء میں اس نے ایک آرڈی نس جاری کر کے یہودیوں کو بحیثیت قوم کے فلسطین میں اپنی تنظیم کرنے کا حق دیا، نیز جہاں یہودیوں کی اکثریت تھی وہاں داخلی خودمختاری بھی دے دی گئی اور ٹیکس لگانے کے کچھ محدود اختیارات بھی عطا ہوئے، اس آرڈی نس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسطین میں یہودیوں

کی حیثیت بہت طاقتور ہو گئی لیکن عربوں پر اس کا اثر بہت برا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سخت قسم کے بلووں اور ہنگاموں کی فضا پیدا ہونے لگی اور بغاوت کی چنگاریاں ہر طرف اُڑنے لگیں۔ ۱۹۲۹ء میں بلور نے تنگ آکر استعفا دے دیا۔ اس وقت برطانیہ نے اپنی گرفت بہت مضبوط کر رکھی تھی اور آہنی ہاتھ سے بغاوتوں کو کچلنے کی سعی کی جا رہی تھی۔ مگر اب پالیسی بدلنی پڑی۔ برطانیہ نے محسوس کیا کہ عربوں کی بہت سی شکائتیں معقول ہیں جن کو دور کئے بغیر امن و امان کو بحال نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ایک تحقیقاتی کمیشن بھیجا گیا۔ اس کمیشن نے جو تحقیقات کی اس کے نتیجے میں پارلیمنٹ نے ایک اعلان (وھائٹ پیپر) شائع کیا۔ اس اعلان کا خلاصہ یہ تھا کہ ——— اعلانِ بالفور کی اسپرٹ کے مطابق عربوں کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہودیوں کی آمد کو محدود کر دیا جائے گا یعنی ان کا جو سیلاب بے روک ٹوک چلا آ رہا ہے اس پر ایک روک قائم کر دی جائے گی۔

اس اعلان پر یہودی ناراض ہو گئے اور چونکہ وہ دولت مند بھی ہیں اور انگلستان میں بڑے بڑے عہدوں پر فائض ہونے کی وجہ سے برطانوی سیاست پر اثر بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے اس اعلان پر انہوں نے جو ایجی ٹیشن کیا اُس سے حکومت دب گئی اور اس وقت کے وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے مزدو پارٹی کے انقلاب پسند اور سوشلسٹ لیڈر ہونے کے باوجود اس اعلان کی توضیح و تشریح ایسے الفاظ میں کر دی جس سے یہ کالعدم ہو کر رہ گیا۔[۱]

دنیا بھر کے یہودیوں کی صیہونی انجمن Zionist

یہودیوں کا ٹڈی دل

Organisation ——— کو برطانیہ کی طرف

---

[۱] پوسٹ وار ورلڈ: جیکسن

سے یہودی قوم کی" واحد نمائندہ جماعت" تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اس لئے اس جماعت کی امداد و اعانت سے یہودیوں کے غول کے غول فلسطین میں آکر بسنے شروع ہو گئے ۱۹۲۲ء میں پہلی بار مردم شماری ہوئی تو کُل آبادی ساڑھے سات لاکھ تھی جس میں یہودی ایک لاکھ سے بھی کم تھے۔ لیکن جب ۱۹۳۱ء میں دوسری مردم شماری ہوئی تو آبادی دس لاکھ ہو گئی اور یہودیوں کی تعداد دو لاکھ تک پہنچ گئی۔ لیکن اب نوواردوں کا سلسلہ بڑی تیزی کے ساتھ چل پڑا۔ چنانچہ تین سال بعد ۱۹۳۴ء کے آخر میں تین لاکھ کے قریب یہودی سرکاری رجسٹر میں درج کئے گئے۔ جون ۱۹۴۲ء میں یہ تعداد پانچ لاکھ سے بھی زیادہ ہو گئی۔ یعنی فلسطین کی کُل آبادی سولہ لاکھ جس میں پانچ لاکھ سے زائد یہودی۔

۱۹۲۲ء کی مردم شماری میں یہودیوں کا تناسب چھ فی صدی تھا۔ لیکن بیس سال کے بعد ۱۹۴۲ء میں ۳۳ فیصدی ہو گیا ——— ساڑھے پانچ سو فی صدی کا اضافہ![1]

تقسیم فلسطین ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فلسطین کے عربوں کی خفیہ و علانیہ دونوں قسم کی تحریکیں شروع ہو گئیں اور پورے علاقہ میں دہشت انگیزی کی فضا پھیل گئی آخر ۱۹۳۷ء میں حالات کی تحقیقات کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر ہوا جس نے اپنی رپورٹ میں صاف طور سے یہ تسلیم کیا کہ فلسطین کی اقتصادی حالت کو سامنے رکھتے ہوئے، یہودیوں کی بے روک آمد پر بند باندھنے کی اشد ضرورت ہے اور ایک محدود تعداد کے بعد مزید نو آباد کاروں کو اس سرزمین میں بسنے کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن کمیشن کی یہ سفارش عربوں کو تو اس لئے پسند نہ آئی کہ وہ یہودیوں کا داخلہ فوراً بند کر دینا چاہتے تھے، اور یہودیوں کو اس لئے ناگوار ہوئی کہ وہ اپنے داخلہ پر مطلق کسی قسم کی پابندی گوارا نہ کرتے تھے۔ عربوں کا مطالبہ

---

[1] ۵ اپریل ۱۹۴۷ء اسٹیٹسمین

یہ تھا کہ فلسطین کو فوراً آزاد کر دیا جائے اور یہود و عرب کے مسئلے کو طے کرنے کا اختیار جمہوری اصول کے مطابق مقامی عوام کے سپرد کیا جائے۔ لیکن مجموعی طور سے یہودی اقلیت میں تھے، اس لئے انہوں نے آزادئ فلسطین کی شدید مخالفت کی۔ جب عربوں کا مطالبہ بہت بڑھا تو یہودیوں نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر فلسطین کو آزاد کرنا ہی ہے تو یہودی اکثریت کے علاقوں کو کاٹ کر ایک جداگانہ حکومت میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس چیز نے عربوں کو بے حد مشتعل کیا۔ فلسطین پہلے ہی شام اور شرقِ اُردن کی وجہ سے کیا رہ گیا تھا جو اب اس کے بھی حصّے بخرے کئے جا رہے ہیں۔ لیکن برطانیہ نے یہودیوں کی اس آواز کو اہمیت دی اور ۱۹۳۶ء میں اس قضیے کو حل کرنے کے لئے ایک شاہی کمیشن بھیجا گیا۔ اس کمیشن نے حسب توقع اپنی رپورٹ میں یہودیوں کے مطالبۂ تقسیم کو حق بجانب قرار دینے کی کوشش کی۔[۱]

لیکن اتنے مختصر سے علاقے کو دو آزاد حکومتوں میں تبدیل کر دینے کا تصور اتنا مضحکہ خیز اور اتنا ناقابلِ عمل تھا کہ برطانیہ کی طرف سے اس کی تائید سخت دشوار تھی۔ اس لئے پرانے دستور کے مطابق ایک گول مول پالیسی کا اعلان کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب جنگ کا آغاز ہوا تو عربوں کی تحریک پورے زور شور سے چل رہی تھی۔ لیکن برطانیہ اور اتحادیوں کی اخلاقی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اس تحریک کے لیڈر امین الحسینی نے اعلان کیا کہ جنگ کے دوران تک ہر جدوجہد بند رکھی جائے گی۔ چنانچہ فلسطین میں کامل سکون و خاموشی چھا گئی۔

---

[۱] دیکھو رپورٹ فلسطین رائل کمیشن ۱۹۳۷ء اور رپورٹ فلسطین پارٹیشن کمیشن ۱۹۳۸ء۔

سیاسی نظم ونسق

فلسطین بھی شام وعراق کی طرح ایک انتدابی ملک ہی لیکن یہاں کا نظم ونسق اپنی ان ہمسایہ حکومتوں سے مختلف رہا ہی یعنی داخلی آزادی اگرچہ ایک حد تک دی گئی لیکن عملاً حکومت برطانوی ہائی کمشنر کے ہاتھ میں رکھی گئی۔ ۱۹۴۲ء میں جو بیس میونسپل کمیٹیاں یہاں قائم تھیں، مگران کے اختیارات وہی ہیں جو ہندوستان کی کمیٹیوں کو ہیں۔ بجٹ کی منظوری ٹیکس لگانے یا قرضہ جاری کرنے کی منظوری اور بائی لا بنانے کی منظوری ہائی کمشنر سے لینی پڑتی ہی۔

اوقاف اور طلاق وخلع وغیرہ کے مسائل کے لئے ایک محکمہ شرعیہ قائم ہی جس میں قاضی کام کرتے ہیں۔ قاضیوں کی اپیل عدالت العالیہ کے صدر کے سامنے ہوتی ہی۔ جس کو مفتی اعظم کہا جاتا ہی —— مفتی کا یہ عہدہ اب تک امین الحسینی کو حاصل تھا مگر جنگ (۱۹۳۹ء) کے آغاز کے بعد جب انگریزوں نے انھیں گرفتار کرنا چاہا تو وہ خاموشی کے ساتھ روپوش ہوگئے۔ اس روپوشی کے بعد انگریزی حکام نے بہت چاہا کہ مفتی اعظم کے منصب پر کسی دوسرے آدمی کو مقرر کر دیا جائے لیکن امین الحسینی کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے یہ صورت ممکن نہ ہوسکی اور یہ عہدہ خالی پڑا رہا۔

یہودیوں کے مذہبی معاملات کو طے کرنے کا کام ان کے علماء ربّی کرتے ہیں۔ ایک ربّی اشیار کی کالی آبادی کے لئے ہی؛ اور دوسرا گوری نسل کے نوآبادکاروں کے لئے —— گورے اور کالے کا امتیاز یہاں بھی موجود ہی۔

مذہبی معاملات کے علاوہ باقی تمام فوجداری اور دیوانی مسائل کے لئے انگریزی قوانین کے مطابق عدالتیں قائم ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۳۷ء تک مسلمانوں کے لئے سلطنت عثمانیہ کا پرانا اسلامی قانون نافذ تھا مگر اس تاریخ کے بعد اسے منسوخ کرکے اس کی جگہ انگریزی قانون جاری کیا گیا

عدالتی اور دفتری زبانیں تین ہیں: انگریزی، عربی اور عبرانی

۱۹۲۵ء میں حقوق وطنیت حاصل کرنے کا جو قانون بنایا گیا ہی اس کی رو سے فلسطین کا باشندہ بننے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ دو سال کی مسلسل سکونت ہو اور عبرانی انگریزی یا عربی میں سے کوئی ایک زبان جانتا ہو۔ اس قانون کی تحت ۱۹۴۱ء میں گیارہ ہزار ایک سو گیارہ نوواردوں کو وطنی حقوق عطا کئے گئے۔ ان میں غیر یہودی صرف ۹۳ تھے۔ باقی سب یہودی تھے[۵]۔

۱۹۴۲ء کے اعداد وشمار کی رو سے سولہ لاکھ کی کل آبادی میں ایک لاکھ عیسائی ہیں، لیکن یہود و عرب کی اس کشمکش میں عیسائی پوری طرح عربوں کے ہم آواز ہیں انگریزوں اور یہودیوں نے ایک عرصے تک عیسائیوں کو ایک قومی جداگانہ اقلیت کی حیثیت دینے کی کوشش کی۔ لیکن جب عیسائیوں نے اس کوشش کی حوصلہ افزائی کرنے سے صراحتاً انکار کر دیا، تو مجبوراً اس حربے کو نظر انداز کرنا پڑا۔ عربوں کی کوشش شروع ہی سے یہ رہی ہی کہ اس جد وجہد کو مذہبی رنگ نہ دیا جائے بلکہ عربوں کی ایک جد وجہد ثابت کیا جائے جس میں عیسائی عرب اور مسلمان عرب کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ یہ کوشش سو فیصدی کامیاب ہی۔ اس کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہی کہ عیسائی اور مسلمان معاشرتی اور اقتصادی مفاد کے لحاظ سے ایک ہیں۔ زبان بھی ان دونوں کی عربی ہی چنانچہ عیسائی اور مسلمان دونوں کے مدارس و مکاتب میں ذریعہ تعلیم عربی ہی لیکن یہودیوں نے اپنا ذریعہ تعلیم عبرانی کو قرار دے رکھا ہی۔

معاشی حالت بجٹ اوسطاً اسی لاکھ سے ایک کرڑ پونڈ تک رہتا ہی پانچ لاکھ کے قریب برطانوی خزانے سے گرانٹ ملتی ہی۔ بینک اور سکے کا سارا کاروبار انگریزوں کے ہاتھ میں ہی۔

---

[۵] اعداد و شمار کے لئے دیکھو اسٹیٹسمین کی ایر بک ۱۹۴۴ء

فلسطین ایک زراعتی ملک ہی لیکن اب کچھ دنوں سے بحرۂ مردار کے پانی سی بہت سے عمدہ قسم کے نمک مثلاً میگنیشیا اور برومائڈ وغیرہ نکالنے کی صنعت چلائی جارہی ہی۔ یہاں گرم پانی کے کچھ صحت بخش چشمے بھی ہیں جو بعض امراض کے لئے بیحد مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ان کا استعمال کرنے والوں سے کچھ رقم وصول کی جاتی ہی جو آمدنی کا ایک ذریعہ ہی۔

بعض شہر خالصاً یہودی آبادی پر مشتمل ہیں: مثلاً تل ابیب، حیفہ، جافہ۔ ان یہودی شہروں کا معیارِ زندگی عالمگیر صہیونی تحریک کی امداد واعانت کی بدولت عرب علاقوں سے بہت بلند ہی۔

شرق اُردن

فلسطین، شام اور لبنان کی مستقل نگرا یا بیج حکومتوں کی طرح شرق اُردن بھی ۱۹۱۴ء کی جنگ کے اُس بے رحمانہ مذاق کا نتیجہ ہی جو برطانیہ وفرانس نے اپنے "مقدس وعدوں" اور سرکاری اعلانوں کو عملی شکل دیتے وقت عربوں کے ساتھ روا رکھا۔ جب عربوں کی مدد حاصل کرکے ترکوں کو شکست دی جارہی تھی تو یمن سے لے کر موجودہ ترکی کی جنوبی سرحد تک کا پورا علاقہ عرب قرار دیا گیا تھا اور سارے عرب یہی سمجھ رہے تھے کہ جنگ کے بعد یہ پوری وسیع وعریض سرزمین ایک آزاد وطاقتور عرب سلطنت میں تبدیل کردی جائے گی۔ لیکن جب ۱۹۲۰ء میں پیرس کی "صلح کانفرنس" برپا ہوئی تو اس عرب سرزمین کے پیٹ سے بیسیوں بچے پیدا ہونے لگے اور ہر بچے کو نابالغ قرار دے کر کسی یورپی طاقت کی سرپرستی میں دیئے جانے کے فیصلے کئے گئے۔ فیصل جس نے جنگ کے دوران میں اتحادیوں

کی بیحد مدد کی تھی، یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس نے اپنے منافق دوست کرنل لارنس کی مدد سے بلادِ عرب کے اس ظالمانہ آپریشن کے خلاف بہت شور و غوغا مچایا لیکن خفیہ معاہدوں اور برطانیہ و فرانس کے شہنشاہی مفادوں کے سامنے اس کی ایک پیش نہ گئی اور تہذیب کے مقدس امانتداروں کے ہاتھوں جمہوریت وانسانیت کے نام پر پوری سیاسی بیحیائی کے ساتھ یہ آپریشن شروع کر دیا گیا۔ پہلے "صلح کانفرنس" میں یہ طے ہوا تھا کہ صرف لبنان کا علاقہ فرانس کے انتداب میں رہے گا اور باقی پورا شام اور عراق آزاد کر دیا جائے گا۔ چنانچہ دمشق میں فیصل کی تاجپوشی بھی کرائی گئی تھی لیکن جب فرانس نے یہ دیکھا کہ عراق میں برطانوی فوجیں پوری طاقت کے ساتھ دندنا رہی ہیں اور "ہر اُس سر کو کچل رہی ہیں جو صلح کانفرنس کے مطابق خود مختار حکومت قائم کرنے کے لئے اُٹھتا ہے اور اس طرح عراق کی آزادی کو ناممکن بنا دینے کے درپے ہیں"[1] تو قدرتاً اس نے بھی شام میں پاؤں پھیلانے شروع کر دیئے اور جب سیاسی بدنظمی وابتری کے بہانے سے برطانوی فوجیں بغداد میں عراقیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر رہی تھیں، اسی کی آڑ لے کر فرانسیسی فوجیں بھی دمشق میں گھس گئیں اور شاہ فیصل کو معزول کر کے اپنی حکومت قائم کر لی چنانچہ کرنل لارنس نے ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے "لندن ٹائمز" میں لکھا تھا:

"فرانس نے فیصل کو شام سے بے دخل کر کے ٹھیک اسی نمونے کی تقلید کی ہے جو برطانیہ نے عراق میں پیش کیا ہے"[2]

اس شہنشاہی ڈرامے کا سب سے دلچسپ منظر یہ ہے کہ اصول تو پیش کئے جا رہے تھے جمہوریت کے نام پر عرب عوام کو مطمئن کرنے کے لئے۔ لیکن کوشش ہو رہی تھی صرف

---

[1] دوھ لارنس ان ایریبیا: لاول ٹامس

[2] لندن ٹائمز ۱۹۲۰ء دوھ لارنس ان ایریبیا: لاول ٹامس

فرانس، برطانیہ حسین اور حسین کے لڑکوں کو راضی کرنے کی۔ چنانچہ عرب عوام کو ایک جائداد کی طرح انہی چند مدعیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ فیصل کی مدد نے جنگ کو جیتنے میں زیادہ کام کیا تھا، اس لئے اُسے عراق دے دیا گیا۔ حسین کو حجاز عطا ہوا اور اس کے دوسرے بیٹے عبداللہ کو حجاز و فلسطین کے بیچ میں صحرائے عرب اور بحرِ احمر کا درمیان والا ادہ کوچہ دیا گیا جہاں زیادہ تر خانہ بدوش بستے ہیں۔ عمان کے "شاندار پایۂ تخت" میں جس کی آبادی صرف بارہ ہزار مفلسوں پر مشتمل ہے، اپریل ۱۹۲۱ء میں عبداللہ کی رسم تاجپوشی ادا کی گئی۔ لیکن اب سوال پیدا ہوا کہ اس علاقے کا نام کیا رکھا جائے کیونکہ تاریخ میں آج تک اس ریگستانی علاقے کو جداگانہ حکومت کی حیثیت حاصل نہ ہوئی تھی، آخر دریائے اُردن نے یہ مشکل بھی حل کر دی۔ طے ہوا کہ چونکہ یہ نئی حکومت اس دریا کے مشرق میں واقع ہے اس لئے اسے شرقِ اُردن کے نام سے پکارا جائے اس دریا کے اِس پار فلسطین اور اس پار شرقِ اُردن — چلئے فیصلہ ہوا۔

قصہ کوتہ گشت، ورنہ دردِ سر بسیار بود!

اپریل ۱۹۲۳ء میں لندن کے ایوانِ حکومت سے ایک شاہی اعلان شائع ہوا کہ لیگ آف نیشن کی منظوری سے شرقِ اُردن کی مکمل آزادی تسلیم کی جاتی ہے بشرطیکہ یہ حکومت آئینی ہو اور برطانیہ کی جو "ذمے داریاں" اس سے وابستہ ہیں، اُن کے متعلق کوئی سمجھوتہ دونوں حکومتوں کے درمیان ہو جائے۔ لیکن پانچ سال گذر گئے اور اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ بڑی کوشش کے بعد ۱۹۲۸ء میں یہ مبارک دن آیا مگر اس کے بعد بھی "آئینی حکومت" کی شرط باقی تھی۔ بھلا جب تک یہاں آئینی حکومت قائم نہ ہو، عرب عوام کو ایک مطلق العنان بادشاہ کے بیرحم ہاتھوں میں چھوڑ کر برطانیہ کیسے جا سکتا ہے —— !! چنانچہ ۱۹۲۹ء میں برطانوی ہائی کمشنر کی ہدایات کے مطابق ایک دستورِ اساسی بنایا گیا۔ مگر ابھی اس دستور کو کامیاب

بنانے کے لئے کافی وقت درکار تھا، اس لئے طے ہوا کہ انتداب کے اصول کے مطابق برطانوی ہائی کمشنر اُس وقت تک حکومت کی نگرانی کرتا رہے گا، جب تک عوام واقعی حکومت خود اختیاری کے اہل نہ ہو جائیں۔ ہائی کمشنر کی ماتحتی میں ریزیڈنٹ کے نام سے بھی ایک انگریزی عہدیدار رہتا ہے اور تقریباً وہی خدمات سرانجام دیتا ہے جو ہندوستان میں ریاستوں کے ریذیڈنٹ بجا لاتے ہیں۔

شرقِ اُردن کی آدھی آبادی خانہ بدوش قبائل پر مشتمل ہے جو ریگستانی اور چٹیل میدانوں میں بھیڑ، بکریاں اور اونٹ پال کر زندگی کے دن گذارتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ دریائے اُردن کے جنوب میں صرف تیس مربع میل کا علاقہ ایسا ہے جہاں زراعت و کاشتکاری ہو سکتی ہے۔ اس لئے خانہ بدوش قبائل کے علاوہ اس "آزاد سلطنت" کی باقی ساری آبادی یہیں سمٹی ہوئی ہے۔ کل آبادی چار لاکھ کے قریب ہے جس میں اسّی فیصدی سے زائد مسلمان ہیں۔ باقی عیسائی، یہودی برائے نام ہی بستے ہیں۔

آبادی کے ان اجزائے ترکیبی کو جان لینے کے بعد، یہ دریافت کرنا فضول ہے کہ یہاں عوام کی کوئی سیاسی تحریک کیوں نہیں ہے، چند لاکھ جاہل، مفلس اور آوارہ قبائل کے اس گروہ میں کیا سیاسی تحریک چل سکتی ہے۔

۴۰-۱۹۳۹ء میں آمد و صرف کا بجٹ پانچ لاکھ ۱۳ ہزار پونڈ تھا۔ گرانٹ کے طور پر تھوڑی سی امداد برطانوی خزانے سے بھی دی جاتی ہے۔

تعلیم کے لئے کالج کی قسم کی کوئی درسگاہ نہیں ہے، البتہ اسکول ہیں۔ سرکاری اور عام زبان عربی ہے مصر، حجاز، فلسطین اور عراق کے بیچ میں واقع ہونے کی وجہ سے ان تمام ممالک کو جانے والے وسائل رسل و رسائل کا خاص مرکز ہے۔ قاہرہ سے بغداد جانیوالی ہوائی ڈاک کا راستہ بھی یہیں سے ہو کر گذرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ شرقِ اُردن خود مفلس ہے لیکن مشرق و مغرب کی تجارت پیشہ اقوام کو دولت مند بنانے میں

ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔[1]

اپریل ۱۹۲۳ء میں شرق اُردن کو برطانیہ کے "سایۂ حمایت" میں لیتے وقت اس کی کامل آزادی کے جس حق کو تسلیم کیا گیا تھا اور جس کے ایفا کی تاریخ ہماری شاعری کے معشوقوں کے وعدوں کی طرح برابر ٹلتی رہتی تھی۔ وہ آج تک ٹل رہی ہے۔ البتہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر جب برطانیہ کی مزدور پارٹی نے چرچل کی "دقیانوسی الخیال" وزارت کو شکست کر کے نئے انداز سے دربار سجایا تو کچھ تو اپنے بلند بانگ دعوؤں کی لاج رکھنے کے لئے اور کچھ روس و امریکہ کے جذبۂ رقابت سے متاثر ہو کر ۱۹۴۶ء کے اوائل میں عراق کی قسم کی آزادی کا تحفہ شرق اردن کو بھی عطا کر دیا گیا۔ یعنی شرق اُردن کا فرمانروا جب تک "والی" کہلاتا تھا۔ اب "سلطان" کے لقب سے نوازا گیا۔ اور ضابطے میں ایک "آزاد بادشاہ" تسلیم کیا گیا۔۔۔۔ لیکن عراق کی طرح یہاں بھی برطانیہ کو ہوائی اڈے بنانے اور کچھ فوجیں رکھنے کا اختیار حاصل ہے۔۔۔۔ عملاً اس اختیار کی نوعیت حاکمانہ ہی ہے لیکن بظاہر کہا یہی گیا ہے کہ ہم نے محض ایک دوستانہ معاہدہ کر کے یہ حق حاصل کیا ہے۔

---

[1] دیکھو: دی ٹرانس جارڈن ڈیزرٹ از Rees۔ لجسلیشن آف ٹرانس جارڈن از [illegible] اور اسٹیٹسمین کی ایئر بک ۱۹۴۷ء

باب ۲۳

حجاز

حرم اور پاسبانِ حرم کی نیرنگیاں

عرب کا وہ علاقہ جس میں حجاز و نجد وغیرہ شامل ہیں اور جسے "اصلی عرب" کہنا چاہئے ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم سے قبل ترکی خلافت کے زیرِ اثر تھا۔ مگر امیر معاویہ کے بعد سے اسلامی خلافت پر مطلق العنان شہنشاہیت کا جو رنگ چڑھنا شروع ہوا، وہ ترکی خلافت کے زمانے تک بالکل مکمل ہو چکا تھا اور خلیفۃ المسلمین کو نبی کریم یا خلفائے راشدین سے کوئی نسبت نہ رہی تھی۔ شہنشاہیت و آمریت کے وہ تمام لوازم جو دُنیا نے بادشاہوں کے لئے بنا رکھے تھے، وہ سب ترکی خلیفہ کے محلات میں جمع تھے اور مسلم عوام کی آواز کو کوئی موثر دخل حکومت کے کاروبار میں نہ تھا۔ خلیفۃ المسلمین کے نام کا خطبہ ضرور پڑھا جاتا تھا اور اُسے داعیِ اسلام کا جانشین بھی قرار دیا جاتا تھا مگر دراصل یہ نسبت محض برائے نام تھی اور اس کے ذریعے سے صرف مسلم عوام کی اطاعت و فرمانبرداری حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اسی بنا پر جہاں سلطنتِ ترکیہ کے مختلف گوشوں میں بغاوتیں پھیلیں، وہاں صحرائے عرب کا

خطہ بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہا۔ خلافت و حکومت کے بعد از اسلام ہو جانے سے مسلم عوام کی اخلاقی و معاشی اور معاشرتی حالت میں جو ابتری پیدا ہو گئی تھی اور زندگی ہر شعبے میں جو عفونت و گندگی سرایت کرتی جا رہی تھی، اس کی روک تھام کے لئے مختلف مصلحین پیدا ہوئے۔ مگر ان مصلحوں میں سب سے زیادہ قوت و طاقت کے ساتھ جس نے اپنی آواز کو اُٹھایا وہ محمد ابن عبدالوہاب تھا۔

محمد ابن عبدالوہاب

محمد ابن عبدالوہاب سترھویں صدی کے عشرۂ آخر میں عرب کے ایک قریے میں پیدا ہوئے اور مدینہ منورہ، بصرہ اور دمشق کے علمار سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ جب سن شعور کو پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی حالت کو اُن کی تاریخی روایات سے کوئی دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ مسلمانوں کی اس حالت پر رنج و افسوس کرنے والے اور اس کی اصلاح کی آرزو کرنے والے بہت سے تھے، مگر چونکہ یہ تمام خرابیاں، مسلم شہنشاہیت کے دامن میں پل رہی تھیں اس لئے ان کے خلاف علانیہ طور پر آواز اٹھانے کی جرأت کسی کو نہ ہوتی تھی۔ محمد ابن عبدالوہاب نے یہ جرأت پیدا کی اور اس بات کا خیال کئے بغیر کہ ان کے اقوال و اعمال کی زد بارگاہِ خلافت پر پڑے گی یا نہیں، اپنا کام شروع کر دیا۔ انہوں نے نہایت موثر طور سے مسلمانوں کی حالت کا نقشہ پیش کیا اور بتایا کہ عیاشی و نفس پرستی کی وہ تمام صفات جن کو مٹانے ہی کا دوسرا نام اسلام تھا، وہ سب ایک ایک کر کے مسلمانوں میں عود کر آئی ہیں۔ شراب پینے والے ان میں پیدا ہو گئے ہیں، قمار بازی کی لت ان کو لگ گئی ہے، ریشم و حریر کے نرم و نازک لباس وہ پہننے لگے ہیں، چاندی سونے کا استعمال وہ کرنے لگے ہیں، توہم پرستی و ضعیف الاعتقادی اُن میں آ گئی ہے، ساحری و جادوگری کے ٹوٹکے انہوں نے سیکھنا شروع کر دیئے ہیں، داڑھی وہ منڈانے لگے ہیں، تمباکو

وہ پینے لگے ہیں   غرض ابن عبدالوہاب نے مسلمانوں کے تمام خلاف اسلام اعمال کو نہایت اثر انگیز طور پر بتایا اور مسلمانوں کو کتاب وسنت کی تعلیمات پر چلنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے بتایا کہ خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمانوں میں بہت سے فتنے پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اسلام کی صحیح تعلیمات کو مسخ کرکے رکھدیا ہے۔ اور مسلمان قرآن و حدیث پر عامل ہونے کے بجائے اپنے بزرگوں پیروں اور مرشدوں کے اقوال سے چپٹے ہوئے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ کتاب وسنت کی پیروی کی ۔ ۔ ۔ ۔ طرف توجہ کی جائے اور اس کے علاوہ جتنی نئی باتیں پیدا ہوگئی ہیں انھیں ترک کیا جائے۔

محمد ابن عبدالوہاب چونکہ بہت پرجوش، باہمت اور باعمل انسان تھے، اور اسی کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث کے بہترین فاضل بھی تھے۔ اس لئے ان کی اس آواز پر لبیک کہنے والے بڑی تیزی سے پیدا ہونے لگے۔ سنہ ۱۷۴۲ء میں محمد ابن سعود بھی (جو اس وقت عرب کے ایک چھوٹے سے خطے کا والی تھا) اس کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگیا اور اس نے اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرکے اس آواز کو سارے عرب میں پھیلانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۸۰۴ء تک سارا عرب ابن عبدالوہاب کے اس پیام پر عامل ہوگیا اور سلطان ترکی کی خلافت کو ماننے سے انکار کردیا گیا۔ اصل یہ ہے کہ محمد ابن سعود کے لئے ابن عبدالوہاب کی "کتاب وسنت کی مذہبی اصلاح کی تحریک میں سب سے بڑی کشش بھی یہی تھی کہ اس میں خلافت عثمانیہ کی مذہبی تقدیس کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

ترکی کی طرف سے اس "بغاوت" کو دبانے کے لئے مسلسل کوششیں ہو رہی تھیں مگر ابھی تک ترکی نے اس کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہ کیا تھا۔ مگر جب پورا عرب اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور محمد ابن سعود کے خاندان کی مستقل حکومت یہاں قائم ہوگئی اور تحریک وہابیت کے نام سے ترکی خلافت کے خلاف ایک مستقل و موثر احتجاج کی شکل پیدا ہوگئی تو "باب عالی" کو اس کے استیصال کی طرف پوری قوت سے

متوجہ ہونا پڑا۔ چنانچہ محمد علی پاشا خدیو مصر کو اس "بغاوت" کو دبانے پر مامور کیا گیا۔
۱۸۱۱ء میں طوسون پاشا کی کمانڈ میں سلطانی افواج نے عرب پر حملہ کیا۔ ابن عبدالوہاب اس سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے مگر ان کے معتقدوں اور پیرووں کی طاقت اور تعداد اتنی بڑھ چکی تھی کہ سلطانی افواج کو سخت ترین مقابلہ کرنا پڑا اور کئی سال تک جنگ ہوتی رہی۔ آخر پانچ چھ سال کے بعد "باغیوں" کی طاقت توڑ دی گئی اور عبداللہ کو (جو اس وقت اس جماعت کا امیر تھا) گرفتار کر کے قسطنطنیہ بھیجا گیا۔ بارگاہِ خلافت کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو سزائے موت کا فرمان نافذ ہوا۔ اور ترکی شہنشاہیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والی جماعت کے اس لیڈر کا خون قسطنطنیہ کی سب سے بڑی مسجد ایا صوفیہ کے صحن میں بہا دیا گیا۔

مگر اس خونریزی سے یہ تحریک نہ دبی۔ البتہ اب اس کا مستقر صرف عرب کا ایک نخلستانی علاقہ نجد رہ گیا۔ سلطانِ ترکی نے اسے بے حقیقت سمجھ کر نظر انداز کر دیا مگر اب والیٔ نجد کے دل میں ابن عبدالوہاب کی تحریک کتاب و سنت ہی نہ تھی بلکہ اس میں ترکوں کے خلاف نفرت و انتقام کی تلخی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں ابن عبدالوہاب کی وفات کو چونکہ کافی عرصہ ہو چکا تھا اور اس کے پُرجوش و باعمل معتقدین سب قتل کئے جا چکے تھے، اس لئے اب اس تحریک کی صحیح روح بھی مفقود ہونے لگی تھی اور صرف نام ہی نام زبان پر رہ گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ تو بارگاہ خلافت کی مخالفت کی وجہ سے اور کچھ خود اندرونی خرابیوں کے پیدا ہو جانے سے، وہابیت نے ایک اصلاحی تحریک ہونے کے بجائے ایک ایسی گروہ بندی کی شکل اختیار کر لی جسکے ارکان قرآن و حدیث کے سوا باقی ہر فقیہ و عالم کے قول کو ماننے سے انکار کرنے لگے۔ اور اس انکار میں اتنا غلو برتا جانے لگا کہ بڑے بڑے ائمہ و فقہا کی توہین و تحقیر تک کو روا رکھا گیا۔ اس صورت حالات نے سلطان ترکی کے ہاتھ بہت مضبوط

کر دئیے، اور خود عرب قبائل ہی والئ نجد کے خلاف لڑنے لگے۔ آخر ۱۸۸۵ء میں نجدی حکومت کا بالکل خاتمہ ہوگیا اور اس کے آخری فرمانروا کو ترکی افواج نے موت کی نیند سلادیا۔[۱]

عبدالعزیز ابن سعود

مگر اس فرمانروا کا ایک پانچ سالہ بیٹا بچ گیا جسے خاندان کے لوگ چھپا کر عمان لے آئے اور یہاں ایک غریب الوطن یتیم کی حیثیت سے اس کی پرورش ہوئی۔ یہ لڑکا جب بڑا ہوا تو اس میں قائدانہ خوبو تھی، شکل وصورت میں بھی بہت وجیہہ تھا اور اپنے قد میں عام انسانوں سے ایک ہاتھ اونچا تھا، ساڑھے چھ فٹ کا قد رکھنے والا یہ حوصلہ مند نوجوان ابھی بیس بائیس سال ہی کا تھا کہ آبائی شان وشوکت کو واپس لانے کی چبھن اس کے دل میں پیدا ہونے لگی، آخر اس نے اپنے پیرووں کی ایک خاصی تعداد پیدا کر کے ایک دن نجد کے سرسبز شہر ریاض پر حملہ کر دیا اور سلطان ترکی کی جو فوج یہاں تھی اس پر اچانک چھاپہ مار کر بے بس کر دیا۔ اس کے بعد دس سال کے اندر اندر اس نے خود کو وسطِ عرب کا ایک اچھا خاصا سردار بنا لیا، ترک اس زمانہ میں دوسری مہمات میں مصروف تھے تاہم ۱۹۱۲ء میں حسین (شریف مکہ) کو کچھ روپیہ دے کر نجد کے اس نئے والی کے خلاف (جس کا نام عبدالعزیز ابن سعود تھا) حملہ کرایا گیا۔ حسین نے ابن سعود کو شکست دے کر اس سے ترکی کی اطاعت منوا لی، مگر اس کی حکومت وسرداری کو بدستور قائم رکھا گیا۔

غرض جب ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑی تو عرب کی سیاسی ہیئت یہ تھی کہ حجاز اور حجاز کے نواحی علاقے پر ترکوں کی طرف سے حسین حاکم تھا جسے "شریف" کہا جاتا تھا

---

[۱] دیکھو الثورۃ الوہابیہ تالیف عبداللہ علی القصیمی اور "وہابیوں کا عرب" از فلبی وحاضر العالم الاسلامی از امیر شکیب ارسلان جلد اول صفحہ ۳۰

حجاز کے علاوہ وسطی عرب کا تقریباً پورا علاقہ عبدالعزیز ابن سعود کے قبضے میں تھا یہی دو طاقتیں دراصل عرب کی اصلی طاقتیں تھیں۔ جنوب میں عدن، یمن اور حضرموت کے علاقے اور مشرق میں خلیج فارس کے ساحل پر مسقط و عمان اور بحرین وغیرہ کے مقامات بھی اگرچہ عرب کا جزو تھے لیکن بیسیوں قبائلی ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہونے کی وجہ سے ان کی طاقت کوئی طاقت نہ تھی۔ نجد کا ابن سعود بھی اسی قسم کا ایک کمزور قبائلی سردار تھا۔ مگر چونکہ اس میں قائدانہ صفات موجود تھیں، اس لئے آس پاس کے بہت سے چھوٹے موٹے قبیلوں سے اس نے اپنی اطاعت کا لوہا منوا رکھا تھا، یہ قبیلے جنگجوئی اور مضبوطی میں مشہور تھے، اس لئے ان قبیلوں کا امیر اعلیٰ ہونے کی وجہ سے عرب کی طاقت کا توازن ابن سعود کے ہاتھ میں تھا، ابن سعود اگرچہ مغربی تہذیب سے بالکل ناواقف تھا اور یورپ کے جدید سیاسی پینتروں کی تعلیم بھی اس نے نہ پائی تھی۔ لیکن قدرتی طور پر وہ بہت زیرک اور ذہین واقع ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں جب برطانیہ و فرانس نے آزاد عرب سلطنت کے نام پر عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کیا تو ابن سعود کو بھی اس دام میں لانے کی کوشش کی گئی، مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ تاہم چونکہ ترکی خلافت سے بھی اُسے شکایتیں تھیں، اس لئے ترکوں کی طرف سے لڑنے کا سوال بھی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مگر عین ممکن تھا کہ اس کشمکش میں وہ ترکوں ہی کا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتا، لیکن ایک طرف چالاک اتحادیوں نے ترکوں کی ناعاقبت اندیشی سے فائدہ اٹھا کر خود عرب میں ترکی خلافت کے خلاف بغاوت پھیلا رکھی تھی، اور دوسری طرف ان کے ایجنٹوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ ابن سعود کی طرف دوستی کی پینگیں بڑھانی شروع کیں اوپر کی سطور میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ ترکوں سے ابن سعود کی آبائی مخالفت چلی آ رہی تھی اس لئے برطانیہ نے اس رگ پر ہاتھ رکھ کر ابن سعود کو غیر جانبدار رہنے پر راضی کر لیا اور اس غیر جانبداری کے معاوضے میں جنگ کے اختتام

تک پانچ ہزار پونڈ (۷۵ ہزار روپیہ) ماہوار کا نذرانہ ابن سعود کو پیش کیا جاتا رہا۔

حجاز کی طرف سے یورپ کی لاپرواہی

۱۹۱۶ء کی جنگ میں عربوں کی بغاوت کی قیادت و سیادت حسین، شریف مکہ اور اس کے بیٹے فیصل اور عبداللہ کے ہاتھ میں تھی اور ان تینوں کی باگ کرنل لارنس کے ہاتھ میں جنگ کے خاتمے پر جب "ایفائے وعدہ" کا وقت آیا تو فیصل کو عراق دے کر مطمئن کیا گیا اور عبداللہ کو شرق اردن کی حکومت، زیر حمایت برطانیہ دی گئی حسین چونکہ ترکوں کے زمانہ ہی سے شریف مکہ تھا اس لئے اُسے حجاز کا "سلطان" بنا دیا گیا۔ حجاز کو شروع ہی سے ایک آزاد حکومت تسلیم کیا گیا اور اس میں کسی قسم کی دست اندازی نہ کی گئی۔ اس کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہ کہ مسلمانوں کی مقدس ترین مقامات اسی سرزمین پر واقع ہیں، اس لئے فرانس و برطانیہ اس سرزمین میں مداخلت کر کے اپنے مقبوضات و نوآبادیات کی کروروں مسلم رعایا کی بداعتمادی و بددلی مول لینا نہیں چاہتے تھے، دوسرے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حجاز فوجی یا معاشی لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، بحر قلزم کے شمالی سرے پر نہر سویز ہے اور جنوبی سرے پر عدن یہ دونوں جس ملک کے قبضے میں ہوں اُسے ضرورت نہیں کہ حجاز کا ساحل بھی اس کے پاس ہو، اس لئے سویز اور عدن لے لینے کے بعد انگریز مطمئن تھے اور انہوں نے بڑی خوشی سے حجاز کو "آزاد و خود مختار" بنا دینا منظور کر لیا۔ پھر یہ بھی اطمینان کر لیا گیا تھا کہ حجاز اپنی زرعی یا معدنی پیداوار کے لحاظ سے اتنا مالدار نہیں ہے کہ وہ کسی وقت بھی کوئی خاص طاقت بن سکے، شمال کے جو علاقے زرخیز و زرپاش ہو سکتے تھے وہ سب حجاز سے علیحدہ کئے جا چکے تھے، مشرقی اور وسطی علاقے پہلے ہی سے دوسرے عرب سرداروں کے قبضے میں تھے۔

حسین (شریف مکہ) کا دورِ سلطنت

حسین ترکوں کے زمانے میں بھی حجاز کا حاکم تھا اب بھی یہی صورت رہی، اس لئے اُسے سخت مایوسی ہوئی، فرق صرف اتنا ہوا تھا کہ پہلے وہ شریف کہلاتا تھا اور اب "سلطان" کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ مگر یہ سلطانی محض نام ہی نام کی تھی، طاقت وقوت یا دولت وثروت کے اعتبار سے حجاز پہلے سے بھی زیادہ مفلس ہوگیا تھا، ترکی سلطنت کے زمانے میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے لئے لاکھوں کے اوقاف تھے اور لاکھوں روپیہ دوسرے طریقوں سے دیا جاتا تھا، مگر اب یہ سب دروازے بند ہوگئے اور کوئی نیا دروازہ کھُلا نہیں، لازماً مفلسی و بدحالی بڑھنے لگی اور وہی عرب جو کل تک ترکوں کے خلاف بغاوت کرکے "جنتِ ارضی" پانے کے لئے ہوائی قلعے بنا رہے تھے، اب ترکی دورِ حکومت کو یاد کرنے لگے اور حسین کے خلاف ایک عام بددلی پھیلنے لگی۔

پھر حسین اپنی ذہانت ودانائی کے اعتبار سے بھی کچھ بلند نہ تھا، وہ سمجھتا تھا کہ میرا یہی فخر وشرف کیا کم ہے کہ میں آلِ رسول ہوں۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کو چاہئے کہ محض میرے آلِ رسول ہونے کی وجہ سے مجھے اپنا امیر وسردار سمجھیں اور کٹھ پتلیوں کی طرح میرے اشاروں پر ناچیں، حکومت ومملکت کا تصور اس کے دماغ میں صرف یہ تھا کہ بادشاہ، حاکم علی الاطلاق ہوتا ہے وہ جو چاہے کرے اس پر کسی کو گرفت کرنے کا حق نہیں۔ البتہ اس کا عمل احکام اسلام کے مطابق ہونا چاہیئے لیکن یہ کون بتائے کہ کونسا عمل احکام اسلام کے مطابق ہے اور کونسا مخالف؟ اس بارے میں وہ خود اپنے ہی کو آخری اقتدار سمجھتا تھا۔

ان تصورات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریف حسین کو جب حجاز کی حکومت ملی تو اُس نے سارے اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کر لئے۔ حکام اور وزراء مقرر ضرور

کیئے گئے مگر محض سلطانی شان وشوکت قائم رکھنے کے لئے ان کو کوئی خاص ذمہ داری نہ دی گئی، ان وزیروں اور افسروں کے ساتھ شریف کا سلوک بالکل گھر کے نوکروں کا سا ہوتا تھا، پھر تنخواہیں یا تو دی ہی نہ جاتی تھیں اور یا کبھی دی بھی جاتی تھیں، تو بہت ہی تھوڑی۔ شریف کا قول تھا کہ جب یہی لوگ مال گذاری وصول کرتے ہیں اور ان ہی کے ذریعہ تمام محاصل جمع ہوتے ہیں تو یہ اپنا حق خود ہی لے مرتے ہوں گے۔ پھر تنخواہ دینے کی کیا ضرورت ہے؟ ٹیلی گراف، ٹیلی فون، وائرلیس وغیرہ جو جنگ کے زمانے کی یادگار کے طور پر باقی رہ گئے تھے وہ سب جائداد عامہ ہونے کے بجائے شریف کی ذاتی ملکیت قرار پائے، تمام موٹریں اور گاڑیاں بھی شریف کی ذاتی جائداد سمجھی گئیں، غرض حجاز میں جو کچھ پیدا ہوتا تھا یا جس کے ذریعے سے بھی کچھ حاصل ہو سکتا تھا وہ سب شریف کا تھا۔ لیکن چونکہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا علم اُسے نہ تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ صنعت و مشین سازی کی لائن میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے، اس لئے پرانے زمانے کے ٹوٹے پھوٹے ہوائی جہازوں کو یارانِ طریقت نے اس کے سر منڈھ دیا اور اس نے بڑی خوشی سے ان کو خرید لیا پھر جب ان کے کسی خراب پرزے کو بدلنے کے لئے اس سے کہا جاتا تو سمجھتا کہ حکام نے چرا لیا ہے اور اس لئے اس کی خریداری کی رقم دینے سے انکار کر دیا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ جہاز صرف کباڑ خانے کی زینت بنے پڑے رہے۔ فوج کے نام سے جو عرب ملازم تھے۔ ان کو کھانا ملتا تھا، مگر یہ بھی پابندی سے روزانہ پیٹ بھر کر نہیں اور تنخواہ ملنے کی باری تو کبھی شاذ و نادر ہی آتی تھی۔

غرض شریف کا نظم ونسق اتنا بدترین تھا کہ عربوں کو رہ رہ کر ترکوں کا زمانہ یاد آتا تھا اور شریف کے خلاف سخت بُرے جذبات پھیل رہے تھے۔ لیکن اس کے

باوجود جب مصطفےٰ کمال نے خلافت کو منسوخ کیا تو آپ خلیفۃ المسلمین بننے کی خواب دیکھنے لگے۔

ابنِ سعود جو نجد میں بیٹھا حکومت کر رہا تھا اور جو اپنی فطری لیاقت اور حکمرانی کی استعداد کے لحاظ سے شریف سے بدرجہا بہتر تھا اس نے یہ حالت دیکھی تو موقعہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش شروع کی، علاوہ اس کے کہ حجاز پر قبضہ کر لینے سے ابنِ سعود کی شان وشوکت میں اضافہ ہوتا اور "خادم الحرمین الشریفین" بن جانے سے مسلمانانِ عالم میں اس کی زبردست عزت پیدا ہو جاتی، خود شریف سے اسے ذاتی نفرت بھی تھی۔ یہ شریف ہی تو تھا جو ۱۹۱۲ء میں سلطان ترکی کے حکم سے اُس کے خلاف صف آرا ہوا تھا، اور اُسے شکست دے کر ترکی کا مطیع ومحکوم بنایا تھا، اس لئے اب موقعہ تھا کہ اس کا بدلہ لیا جائے۔ شریف حسین سے حجاز کے عرب ہی بددل نہ تھے بلکہ بدنظمی وابتری چونکہ عام ہو چکی تھی اس لئے دنیا کے گوشے گوشے سے جو حجاج ہر سال آتے تھے وہ بھی ڈاکوؤں اور لیٹروں کا شکار ہوتے تھے اور ان حالات وواقعات کی تلخی اپنے اپنے ممالک میں لے جاتے تھے، جس کی وجہ سے شریف کے خلاف کُل دنیائے اسلام میں سخت بُری فضا پیدا ہو گئی تھی، علاوہ ازیں غیر عرب مسلمانوں کو عربوں کی یہ حرکت بھی پسند نہ تھی کہ انہوں نے ایک غیر مسلم حکومت کی اُکسانے اور ابھارنے پر ترکی کی مسلم حکومت کے خلاف ہتھیار اُٹھائے۔ پھر جب جنگ کے خاتمے پر عربوں کی تمنائیں بھی پوری نہ ہوئیں تو خود عربوں میں بھی اپنے اس عمل پر پچھتانے والے پیدا ہو گئے۔

حجاز پر ابن سعود کا کامیاب حملہ

یہ تمام حالات ابن سعود کے لئے بہت موزوں تھے۔ ادھر برطانیہ نے پانچ ہزار گنی ماہوار کا نذرانہ بھی بند کر دیا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد اب اس کی کیا

ضرورت تھی؟ لیکن ابن سعود کو تو اس کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے ماتحتوں کو روپیہ کہاں سے دے اور اس زبردست کمی کو کیسے پورا کرے؟ ۱۹۲۴ء میں ابن سعود نے مکّے پر حملہ کر دیا۔ شریف نے پہلے تو مقابلہ کرنا چاہا، مگر جلد ہی اس نے اپنی بے بسی کو محسوس کر لیا، کیونکہ برطانیہ نے مداخلت کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا برطانیہ کے اس انکار کی وجہ خود شریف کا طرزِ عمل تھا۔ اصل یہ ہے کہ جنگ کے بعد جب برطانیہ نے اُسے صرف حجاز کا علاقہ دینے پر اکتفا کیا، تو اُسے سخت ناگوار ہوا۔ جنگ کے دوران میں وہ واقعی یہ سمجھتا تھا کہ برطانیہ اپنے قول کے مطابق اُسے شام و عراق سے لیکر یمن و حضرت تک کا سلطان بنا دے گا۔ لیکن جب برطانیہ نے اُسے صرف حجاز کی حکومت دے کر بہلا دیا تو وہ اس بدعہدی پر سراپا اشتعال بن گیا، پھر چونکہ اپنے بیٹے فیصل و عبداللہ کی طرح دور اندیش نہ تھا، اس لئے برطانیہ کے خلاف اظہارِ رائے کرنے میں بھی مطلق کسی جھجک سے کام نہ لیتا تھا۔ حتّٰی کہ برطانیہ کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس کا یہ غم و غصہ اتحادیوں کے خلاف کسی نئی تحریک کی شکل میں نمودار ہو کر رہے گا۔ ظاہر ہے کہ برطانیہ اس ذہنی رفتار کو پسند نہیں کر سکتا تھا

ایسی حالت میں جب اچانک ابن سعود کا حملہ ہوا تو شریف کچھ نہ کر سکا۔ مجبوراً اس نے اپنی "سلطانی" سے خود ہی دست برداری دیدی اور ابن سعود کی حدودِ مملکت حجاز تک پھیل گئیں مگر جب ابن سعود مکّے میں داخل ہوا: تو احرام باندھے ہوئے، ننگے پاؤں، آنکھیں نیچی اور خشوع و خضوع کے ساتھ خدا کی تحمید و تقدیس کرتے ہوئے۔

ابنِ سعود نے حجاز کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی حجاج کے فائدے کے لئے جدے، مکّے اور مدینے وغیرہ تک موٹر سروس قائم کی اور جابجا ہوٹل کھولے۔ لٹیروں اور ڈاکوؤں کو انتہائی بیرحمی کے ساتھ کچلا گیا اور ایک

سال کے اندر ہی اندر ملک میں کامل امن وسکون قائم کر دیا گیا۔ اس پر ساری دنیا خوش ہوئی، مگر نجدی قبائل جن کی مدد سے ابن سعود نے فتوحات کی تھیں، وہ اس صورتِ حالات سے ناخوش ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ موٹریں شیطانی سواریاں ہیں جو جادو کے زور سے جادوگروں نے تیار کی ہیں۔ ابن سعود وہابیت کو بھول گیا ہو اور عیش و راحت میں پڑ کر ان ساحرانہ اعمال میں کھو گیا ہو۔ وائرلیس، ٹیلی فون اور ٹیلی گراف سے بھی وہ سخت ناخوش تھے اور ان سب کو جادوگری سمجھ کر انھیں توڑ پھوڑ کر پھینک دینا چاہتے تھے لیکن ابنِ سعود ان کے مقابلے میں زیادہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ تھا، اس کی رائے یہ تھی کہ مسلمان آجکل خواب سے بیدار ہو رہے ہیں۔ انھیں وہ تمام ہتھیار استعمال کرنا چاہئیں جو ان کی ترقی و بیداری میں مدد دیں۔ وہ مذہبی عبادت و خدا پرستی کو ہوائی جہازوں اور موٹر کاروں کی قسم کے مادی ہتھیاروں کے استعمال کے منافی نہیں سمجھتا تھا۔ حقیقت یہ ہو کہ وہ اگرچہ رنگ و نسل کے لحاظ سے اپنے نجدی ہموطنوں کی طرح تھا لیکن دل و دماغ میں اُن سے بدرجہا بلند واقع ہوا تھا۔

شروع شروع میں ابن سعود کے یہ "نئے خیالات" نجدیوں کی سمجھ میں نہ آئے اور وہ باغی ہو گئے۔ لیکن ان باغیوں کو جلد ہی علم ہو گیا کہ اب ان کے سردار کی طاقت اتنی زیادہ ہو چکی ہو کہ اس سے بازی لے جانا ناممکن ہو۔ ابن سعود نے ایک خاص ہوشیاری یہ کی کہ بڑی حکمت عملی سے کام لے کر ان باغیوں کو فیصل کی عراقی حکومت کے خلاف ابھار دیا چنانچہ عراق کی جنوبی سرحد پر لوٹ مار مچنے لگی، ابنِ سعود جانتا تھا کہ عراق میں کسی بدنظمی کو انگریز برداشت نہ کر سکیں گے، دنیا کا سب سے بڑا ہوائی راستہ یہیں سے جاتا ہو اور بغداد دنیا کے بڑے بڑے ہوائی اسٹیشنوں میں سے ایک ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمال سے انگریزی بموں نے اور جنوب سے سعودی تلواروں نے مل کر ان باغیوں کا صفایا کر دیا۔

وسط عرب اور نجد کے قبائل کا پیشہ عرصے سے لوٹ مار چلا آتا تھا۔ یہ لوگ خانہ بدوشی کی زندگی لبسر کرتے تھے اور جب ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہتا تھا تو ہر کسی پر جا پڑتے تھے۔ ابنِ سعود نے اخوان الصفا کے نام سے ایک جماعت بنائی اور خانہ بدوش قبائل کو زمینیں دے کر ایک جگہ بود و باش کرنے پر مائل کیا۔ اس کوشش میں اُسے بڑی کامیابی ہوئی اور جس جگہ کاشت کی مدد سے روزی پیدا کرنا ممکن تھا، وہاں یہ خانہ بدوش قبائل بس گئے جس سے ان کے اعمال میں نرمی و شائستگی اور اُن کی کی معاشرت میں تہذیب و مدنیت کی خو بو پیدا ہو گئی۔ اس کے علاوہ ابن سعود کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ حجاز میں جو لوٹ مار مچی ہوئی تھی اور حج کے زمانے میں عرب بدو حاجیوں کے مال و دولت پر موقع پاکر جو دھاوے بولا کرتے تھے وہ ختم ہوئے جدّہ سے مکّہ معظمہ تک پہلے دو دن کا راستہ تھا۔ سنسان اور چٹیل میدانوں سے گذرنا ہوتا تھا، چور اور ڈاکو ہر طرف گھات میں بیٹھے رہتے تھے، مگر اب موٹر سروس قائم ہوئی اور دو گھنٹے میں آدمی جدے سے مکّے تک پہنچنے لگا۔ راستے میں پانچ چھ مقامات پر سرکاری چوکیاں بنائی گئیں جہاں چائے اور قہوہ وغیرہ تیار ملتے پولیس کے ملازمین چوکیوں اور موٹروں پر تعینات کیے گئے تاکہ وہ اس بات کی جانچ کرتے رہیں کہ کوئی ڈرائیور مقررہ تعداد سے زیادہ سواریاں نہ بٹھا سکے لیکن اگر کوئی شخص موٹر کے بجائے پیدل سفر کرنا چاہے تب بھی راستے میں اُسے کوئی خطرہ نہیں۔ حتیٰ کہ حاجیوں نے ایسے قصے بیان کیے ہیں کہ وہ اگر اپنا قیمتی سامان کسی جگہ بھول گئے ہیں تو وہ سرکاری چوکی میں محفوظ کر دیا گیا ہے اور طلب کرنے پر انھیں واپس مل گیا ہے۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۶ء تک ابن سعود نے عرب کے مختلف علاقوں پر حملہ کرکے تقریباً پورا عرب اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ مشرقی ساحل پر عمان و بحرین وغیرہ کا علاقہ اور

جنوب میں حضرموت کی پہاڑی ساحلی پٹی اور جنوب مغربی ساحل پر صرف یمن کا علاقہ باقی رہ گیا ہے۔ عمان و بحرین وغیرہ چونکہ خلیج فارس پر واقع ہیں اور عراق و ایران کی گذرگاہ پر ہونے کی وجہ سے زبردست تجارتی اہمیت رکھتے ہیں، اس لئے برطانیہ نے وہاں کے قبائلی شیوخ کو اپنی "حمایت و سرپرستی" میں لے رکھا ہے۔ یہی حال حضرموت کا ہے، ابن سعود برطانیہ کی طاقت کو جانتا ہے، اس لئے اُس نے برطانیہ کے ان زیر حمایت علاقوں میں دست اندازی کرنے کی کوشش کبھی نہ کی، البتہ ۱۹۱۴ء میں عرب کے جنوب مغربی گوشے (یمن) میں اس نے اپنے جنگی گھوڑے دوڑائیے۔ بنائے جنگ عسیر کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی جو حجاز و یمن کے بیچ میں واقع ہے اور جہاں ایک شیخ حاکم تھا جو ابنِ سعود کا وفادار تھا اور اُسی کے زیر اثر رہتا تھا۔ مگر ۱۹۳۴ء میں یمن نے چاہا کہ اس پر اپنا قبضہ جمالے۔ اس جنگ میں یمن نے اٹلی اور جرمنی کی اخلاقی مدد حاصل کرکے اِن ممالک سے جدید آلاتِ حرب منگوائے اور کئی مہینے خوب میدان گرم رہا، مگر آخرکار یمن کو شکست ہوئی اور عسیر بدستور حجازی حکومت کی حمایت میں رہا۔ یمن سے صلح ہوگئی۔ ۱۹۲۷ء میں ابن سعود اور برطانیہ کے مابین بھی جدے میں ایک صلحنامے پر دستخط ہوئے، جس کی رو سے برطانیہ نے ابن سعود کی اس وقت تک کی تمام فتوحات کو تسلیم کیا اور اُسے ایک "آزاد ریاست" مانا گیا، اس معاہدے کے بعد سے ابن سعود کی مملکت کو "سعودی عرب" کا نام دیا گیا اور یہاں کے فرمانروا کو باقاعدہ بادشاہ سمجھ کر ہزمیجسٹی (جلالۃ الملک) کے لقب کا "جائز حقدار" سمجھا گیا۔

سیاسی نظم ونسق نجد میں، ابن سعود ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح حکومت کرتا ہے۔ نہ کوئی مجلسِ شوریٰ ہے نہ کابینۂ وزارت، نہ کوئی دستور اساسی۔ عوام کو حکومت کے کاروبار میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، ابن سعود

کا سب سے بڑا لڑکا ولی عہد ہے اور عموماً نجد میں رہتا ہے، اپنے باپ کے معتمدِ خاص کی حیثیت سے نجد کا نظم و نسق چلاتا ہے۔ نجدی فوج کا سپہ سالار بھی یہی ہے۔

مگر حجاز کی حالت نجد سے مختلف ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں حجاز کے لئے ایک دستور اساسی بنایا گیا ہے جس کی رو سے حکومت ہوتی ہے۔ اس دستور میں وقتاً فوقتاً ترمیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ابھی تک اسے جمہوری دستور کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ انتخاب کے بجائے زیادہ زور نامزد ممبروں پر دیا جاتا ہے۔ ایک کابینۂ وزارت بھی ہے جس کی صدارت ابن سعود کے دوسرے لڑکے فیصل کو سونپ دی گئی ہے معاملات خارجہ کی وزارت اور اندرونی نظم و نسق کا قلمدانِ حکومت بھی اسی کے ہاتھ میں رہتا ہے، قانون سازی کے لئے ایک اسمبلی اور حکومت کو مشورہ دینے کے لئے ایک کونسل بھی ہے۔ لیکن ان کی حیثیت صرف مشیروں کی ہے، وزرائے حکومت چاہیں تو ان کا مشورہ مانیں اور چاہیں تو نہ مانیں، کابینۂ وزارت صرف بادشاہ کو جوابدہ ہے اور بادشاہ کو غیر محدود اختیارات حاصل ہیں۔ قصبوں اور شہروں میں حفظانِ صحت کے لئے کچھ میونسپل کمیٹیاں بھی ہیں۔ جو محدود اختیارات کے ساتھ کام کرتی ہیں۔

معاشی حالت

نجد و حجاز کی معاشیات کا دار و مدار اُن چند نخلستانوں پر ہے جو تپتی ہوئی ریت کے لق و دق بیاباں میں کہیں کہیں پائے جاتے ہیں اور کھجور، پھل اور شہد کے علاوہ کچھ غلّہ اور ترکاریاں بھی فراہم کرتے ہیں، ریگستانی علاقے میں بسنے والے خانہ بدوش قبائل یا بدّو بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کو ذریعہ معاش بناتے ہیں اور اون، کھال، چمڑا اور گھی اُن کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

چند سال ہوئے یہ معلوم ہوا ہے کہ ریگستان عرب کے بعض علاقوں میں تیل کے

ذخیرے بھی پائے جاتے ہیں۔ تیل کے علاوہ کچھ معدنیات کا پتہ بھی چلا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت حجاز نے دو تین بدیسی کمپنیوں کو کام کرنے کا ایک میعادی ٹھیکہ دیدیا ہے۔ نجد میں کچھ تیل نکلنا بھی شروع ہو گیا ہے۔ اس تجارت کا زیادہ تر نفع تو غیر ملکی کمپنیوں ہی کو ملتا ہے، تاہم حکومت حجاز کو بھی رائلٹی کی شکل میں کافی رقم مل جاتی ہے۔

ایک زمانے میں گھوڑوں کی تجارت عربوں کی خاص تجارت تھی۔ لیکن اب اس کا زور گھٹ گیا ہے، اونٹوں کا کاروبار بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ موٹریں اور ریلیں بڑی تیزی سے اونٹ کی ضرورت کو یادگار پارینہ بناتی چلی جا رہی ہیں[۱]۔

مطلق العنان حکومت کے نتائج

لیکن یہ تمام ذرائع آمدنی مل کر بھی مقامی آبادی کی کفالت کا بار نہیں اٹھا سکتے، ترکی حکومت کے زمانے تک یہ کمی خلافت اسلامیہ کے بیت المال سے پوری کی جاتی تھی۔ اب سارا انحصار اُن محصولوں پر ہے جو ہر سال حاجیوں پر لگائے جاتے ہیں۔ ان محصولوں کے علاوہ مقامی بازاروں سے حاجی لوگ جو سامان خریدتے ہیں، وہ بھی عربوں کے معاشی نظام میں بھاری اہمیت کی چیز ہے، حکومت حجاز ہر حاجی سے اوسطاً سوا سو روپیہ مختلف قسم کے ٹیکسوں کی شکل میں وصول کرتی ہے۔ اس میں سے مشکل سے نصف کے قریب حاجیوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں صرف ہوتا ہوگا۔ باقی نصف رقم، جس کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے، شاہی خزانے میں جمع ہوتی ہے —— وہ شاہی خزانہ جس پر ابن سعود کو بحیثیت بادشاہ کے پورا پورا اختیار حاصل ہے اور جس پر عوام کا کوئی زور نہیں۔

نجد و حجاز دونوں جگہ عوام کا معیارِ زندگی بہت گرا ہوا ہے۔ لیکن ابنِ سعود

[۱] ماخوذ از ایریک: اسٹیٹسمین ۱۹۴۷ء

کی ذاتی شان وشوکت کو عوام کی مُفلسی سے کوئی نسبت نہیں - ریاض میں ایک نہایت خوبصورت وشاندار محل بنا ہوا ہے جو بہترین فرنیچر سے آراستہ ہے، ذاتی سواری کے لئے اس کے پاس کئی موٹرین بھی ہیں، اسی طرح دوسرے لوازمِ عیش بھی اسے حاصل ہیں، بیویاں ہمیشہ چار رکھتا ہے۔ لیکن جب کسی نئی شادی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ان چار میں سے کسی ایک کو طلاق دے دی جاتی ہے۔

ابن سعود میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک زیرک وفہیم قسم کے مطلق العنان فرمانرواؤں میں ہونی چاہئیں - وہ اپنی غیر مسئول فوقیت کو ہر قیمت پر باقی رکھنے کی کوشش کرتا ہے - وہ عوام کی نکتہ چینی اور اعتراض کو برداشت نہیں کرسکتا دوٹوک فیصلہ ہے: کامل اطاعت یا موت، چنانچہ بدو قبائل کی لوٹ مار کو روکنے کے لئے ان کے معاشی اسباب کی اصلاح سے زیادہ اس نے اپنی تلوار پر بھروسہ کیا اور بے دریغ بزن بول دیا گیا۔ اس حکمت عملی نے لوٹ مار کی فضا تو یقیناً ختم کردی۔ لیکن اس کی جگہ فاقہ کشی اور گداگری نے لے لی۔ ابن سعود کے عہد میں حاجیوں کو لٹیروں سے سابقہ نہیں پڑتا، لیکن بھوک کے ستائے ہوئے بھکاریوں کے غول کے غول ہر طرف ان کا پیچھا کرتے پھرتے ہیں اور دسترخوان سے پھینکی ہوئی ہڈی پر بھی نعمت سمجھ کر ٹوٹ پڑتے ہیں [1]

افلاس وگداگری

جب حسین (شریف مکّہ) کے خلاف ابن سعود نے فوج کشی کی تھی تو حجاز کے باشندوں کی اخلاقی تائید اس کی پشت پر بھی وہ سمجھتے تھے کہ شاید اس انقلاب سے حسین کی بدنظمی وابتری کا کچھ سدباب ہوسکے۔ ابن سعود نے ان توقعات کو ایک حد تک پورا بھی کیا

[1] دیکھو ابن سعود از ریحانی اور لارڈ آف اریبیا از آرمسٹرانگ

لیکن ملک کی مفلسی و تنگدستی نے شاہی مطلق العنانی کے ساتھ مل کر پھر وہی بے چینی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں اس کے ولی عہد کو قتل کرنے کی ناکام کوشش بھی کی گئی تھی۔

نجد و حجاز کے عوام پر ایک تو شاہی اقتدار بہت سخت ہے، دوسرے تعلیم بہت کم ہے۔ اس لئے کوئی منظم قسم کی تحریک آئینی سیاست کے لئے ابھی تک نہیں چل سکی ہے، لیکن ابن سعود کی موجودہ حکومت کے خلاف اضطراب و بے چینی کے جذبات پوری طرح اندر ہی اندر سلگ رہے ہیں۔ ابن سعود بھی اس کو محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں یہ تجویز کیا گیا کہ "آئینی حکومت" قائم کر دی جائے مگر پھر یہ چیز معرض التوا میں پڑ گئی۔ اپنے ہاتھ سے اختیارات چھوڑنا گوارا بھی کون کر سکتا ہے۔

قبہ شکنی ۱۹۲۹ء میں اپنے نجدی پیرووں کو خوش کرنے کے لئے (جو مذہبی عقائد میں بے حد شدید ہیں) ابن سعود نے بہت سے مزاروں کے قبے تڑوا ڈالے اور دلیل یہ پیش کی کہ پختہ قبر بنانے کی اجازت اسلام میں نہیں ہے اور ان مزاروں کو مسلمانوں نے بت بنا لیا ہے، ابن سعود کی یہ دلیل اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح تھی کہ اسلام میں پختہ مقابر بنانے کی اجازت نہیں، لیکن بنے بنائے مقابر کو توڑنے کا یہ عمل ایک دو دھاری تلوار کے مانند تھا جس نے ایک طرف نجدی قبائل کو تو ضرور خوش کر دیا۔ لیکن دوسری طرف دنیا کے مسلمانوں کی رائے عامہ کو سخت مشتعل بنا دیا۔

چونکہ آمدنی کا ایک بہت بڑا شعبہ حاجیوں کے محاصل سے وصول ہوتا ہے، اس لئے ابن سعود کو دنیا کے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی فکر بہت دامنگیر رہتی ہے۔ ہر اسلامی ملک میں اس کے پروپیگنڈا ایجنٹ چھوٹے رہتے ہیں جو رائے عامہ

کو اس کے خلاف ہونے سے روکتے ہیں۔ اس لئے جلد ہی قبہ شکنی کی یہ مہم ختم کردی گئی

مستقبل کے امکانات

عرب، دنیا کی سب سے بڑی جغرافیائی وحدت ہی جس کے رہنے والے زبان، معاشرت، طریق بود و ماند، مذہب وعقائد اور تاریخ و روایات میں کامل ہم آہنگی و ہمرنگی رکھتے ہیں۔ روئے زمین پر کوئی علاقہ ایسا موجود نہیں ہی، جس کے باشندے دس لاکھ مربع میل کے لق و دق بیابانوں میں پھیلے ہوئے ہوں اور جہاں ایک سرے کا رہنے والا دوسرے سرے کے رہنے والے سے دو ہزار میل دُور ہو، مگر پھر بھی اُن کی معاشرت میں اتنی یکرنگی ہو کہ مذاقِ طبیعت کا فرق بھی مشکل سے پہچانا جاسکے۔ عرب قومیت کی یہ یکسانیت مغربی مورخوں کے لئے ایک ناقابل حل معمہ ہی کیونکہ آج کل رسل و رسائل کی کی ترقی کے زمانے میں بھی اتنے بڑے علاقے میں، زبان و معاشرت کی یکسانیت پیدا کرنا ممکن نہیں ہوسکا ہی۔ لیکن عرب کے باشندے آج ہی نہیں، آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے بھی زبردست معاشرتی و لسانی یکرنگی رکھتے تھے، حالانکہ خشک ریگستان ہونے کی وجہ سے وہاں آمد و رفت کے وسائل دوسرے مقامات سے بھی کہیں زیادہ دشوار گذار ہیں

عرب، ایک ریگستانی علاقہ ہی۔ لیکن جس طرح معاشرتی یکرنگی کے لحاظ سے دُنیا کے تمام ممالک میں اسے ایک غیر معمولی خصوصیت حاصل رہی ہی، اسی طرح اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے روئے زمین کے تمام ریگستانی علاقوں میں بھی اسے ایک منفرد حیثیت حاصل ہی: مثلاً (۱) اس میں نخلستانوں (یعنی ریگستان کے بیچ میں سرسبز و شاداب علاقوں) کی تعداد دنیا کے تمام ریگستانوں سے زیادہ ہی (۲) سمندر کا ساحل بہت قریب ہی جو آب و ہوا کو معتدل بنانے کے علاوہ بحری تجارت میں بہت مدد دیتا ہی (۳) ساحلی علاقوں پر بہت خوشگوار پہاڑی علاقے واقع ہیں۔

(۴) کھجور اپنی قسم کے لحاظ سے یہاں بہترین ہوتی ہے

عرب کی آب و ہوا میں ایک خصوصیت یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ یہاں دق کا مرض نہیں ہوسکتا، بلکہ جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہو چکے ہوں، وہ بھی اچھے ہوجاتے ہیں فیصل اوّل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خلافت عثمانیہ کے زمانے میں جب وہ قسطنطنیہ میں نظر بند تھا، تو دق کا شکار ہوگیا تھا، مگر ۱۹۱۴ء کے بعد سے جب اُسے عرب کے ریگ زار میں گھومنے کا موقعہ ملا تو یہ مرض بالکل غائب ہوگیا، یہ چیز غالباً آب و ہوا کے خشک ہونے کا نتیجہ ہے۔ لیکن ابھی یہ مسئلہ زیر تحقیق ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خصوصیت صرف ریگستانِ عرب ہی میں پائی جاتی ہے یا دنیا کے دوسرے ریگستان بھی اس خصوصیت میں عرب کی طرح ہیں

عرب کی اس جغرافیائی کیفیت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کے باشندے محنتی جفاکش حوصلہ مند اور سیاحت پسند ہوتے ہیں۔ دراصل عربوں کی یہی وہ نسلی صفات ہیں جن کو داعی اسلام نے قبائل کی باہمی رقابتوں کے خودتباہ کُن خار زار سے نکال کر انسانی زندگی کے ایک بلند ترین نصب العین سے ہمکنار کر دیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اُس وقت تک عرب دنیا کی بلند ترین قوم شمار ہوتے رہے، جب تک صنعتی انقلاب کی نئی ایجادات نے یورپ کے باشندوں کو ایک نئی طاقت عطا نہ کر دی عرب آج بھی اُنہی صفات کے حامل ہیں جنہوں نے ساڑھے تیرہ سو سال قبل ان کو دنیا کی سب سے ممتاز قوم بنا کر ساری دنیا کے لئے انسانیت و تہذیب کا معلم بنا دیا تھا، لیکن آج چونکہ ان کے ہاتھ میں بجلی اور بھاپ کی طاقتیں نہیں ہیں اور قوائے فطرت کو تسخیر کرنے والے نئے علوم کی چاشنی ان تک نہیں پہنچ سکی ہے، اس لئے یورپ کی دنیائے صنعت کے مقابلے میں ہیچ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج برطانیہ نے ان کی طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھدیا ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں سے صحیح استفادہ کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں، حجاز و یمن کو چھوڑ کر باقی سارا یورپ کسی نہ کسی طرح برطانیہ کی صنعتی طاقت کے

نیچے دبا ہوا ساری دنیا سے "غیر مہذب" ہونے کا طعنہ سن رہا ہے حالانکہ یہی وہ "غیر مہذب" قوم ہے جو سترھویں صدی تک موجودہ یورپ کے داعیانِ تہذیب کو زندگی کے ہر شعبے میں درس دیتی رہی تھی اور جس کے لکھے ہوئے علوم و فنون یورپ کی بڑی بڑی درسگاہوں میں بڑے فخر کے ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔

لیکن آج اس کا حال کیا ہے؟ آج اس کا حال یہ ہے کہ دس لاکھ مربع میل رقبے میں سے صرف تین لاکھ کے قریب "سعودی عرب" کے نام سے اور ۷۵ ہزار میل کے لگ بھگ یمن کے نام سے آزاد ہے۔ باقی سات لاکھ سے زائد علاقے پر برطانوی ایجنٹوں کا اثر و اقتدار چھایا ہوا ہے۔

سیاسی اعتبار سے عرب کی حالت اس وقت یہ ہے کہ حضر موت کا ایک لاکھ بارہ ہزار مربع میل رقبہ پچیس چھوٹے چھوٹے قبائلی شیوخ کی ماتحتی میں ہے، اور یہ سب شیوخ برطانیہ کی سرپرستی میں زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔

۱۹۳۸ء و ۱۹۳۹ء میں یہاں کے بعض شیوخ نے برطانوی اقتدار کو نظر انداز کرنے کی کچھ کوشش کی تھی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تہذیب و انسانیت کے محافظوں نے لاکھوں من بموں کی بیدریغ بمباری کرکے ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے اور پھر اپنی مرضی کے مطابق عہدنامے تیار کرا کے ان پر دستخط حاصل کر لئے۔

عدن کا بہترین تجارتی اڈا پوری طرح برطانیہ کا محکوم ہے۔ مشرقی ساحل پر مسقط و عمان کا ۸۲ ہزار مربع میل رقبہ بظاہر ایک آزاد سلطان کے ماتحت ہے لیکن عملاً اس کے سلطان کی حیثیت ہندوستان کے والیانِ ریاست سے کچھ بہتر نہیں۔ ایک برطانوی ایجنٹ اور ایک ریزیڈنٹ اس کے سر پر مسلط ہے اور سلطان ان کی مرضی کے خلاف انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اسی طرح اسی مشرقی ساحل پر قطار اور بحرین کے سلاطین بھی برطانیہ کے جھنڈے تلے اپنی آزادی سے قطعاً محروم ہیں۔ بحرین کا ساحلی

سمندر دنیا میں موتی پیدا کرنے والا بہترین مقام ہے اور کسی زمانے میں یہاں کے عرب تاجروں کے ہاتھ میں آدھی دنیا کی موتیوں کی تجارت تھی۔ لیکن آج اس پر انگریزوں کا غلبہ ہے۔ بحرین کے پہلو میں سات اور چھوٹے چھوٹے "سلطان" ہیں جن کے مقبوضات کا مجموعی رقبہ ۱۲ ہزار مربع میل ہے یعنی پنجاب سے کچھ ہی کم۔ مگر یہ سب بھی برطانوی ایجنٹ کے ماتحت ہیں اور سنہ ۱۸۹۲ء کے ایک معاہدے کی رو سے اس امر پر مجبور ہیں کہ ـــــ برطانیہ کے سوا کسی دوسری طاقت سے کسی قسم کی کوئی گفت و شنید نہیں کر سکتے، نہ کسی اور حکومت کے ایجنٹ کو اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دے سکتے ہیں، نہ برطانیہ کے سوا اپنے ملک کا کوئی علاقہ کسی کو بیع یا ہبہ کر سکتے ہیں اور نہ ٹھیکے پر دے سکتے ہیں[۱]۔

عربوں کی اس بدنصیبی کی وجہ بعض لوگ ان کی اخلاقی گراوٹ کو قرار دیتے ہیں اور بعض اسی قسم کی کوئی اور بات کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ لوگ اب بھی ویسے ہی ہیں، جیسے کل تھے، ان کے زوال کا سبب نہ تو ان کی اخلاقی پستی ہے اور نہ اسلام سے دوری، بلکہ صرف یہ کہ ان کے پاس بجلی اور بھاپ کی تسخیر کا وہ حربہ نہیں ہے۔ جس سے یہ مغربی حریفوں کا مقابلہ کر کے، اُن سے اپنی طاقت کا لوہا منوا سکیں۔ لیکن اب چند سال سے یہ احساس ان میں بڑی تیزی سے پیدا ہوتا جا رہا ہے مگر چونکہ آنکھ بہت دیر میں کھُلی ہے، اس لئے خوابِ غفلت کے زمانے میں جو قومیں ان کے گھر بار پر چھا چکی ہیں، ان کو بے دخل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے سب سے بڑی کوشش ممالک عربیہ کے اتحاد کے نام پر کی جا رہی ہے۔ عراق، مصر اور شام و فلسطین کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہو رہی ہے اور سائنس

[۱] دیکھو "پرشین گلف" از ولسن اور تاریخ عرب از ہٹی

کے نئے علوم سے عوام کو آشنا کرنے کی مساعی جاری ہیں، ان مساعی میں عرب خاص یعنی جزیرۃ العرب ہی نہیں بلکہ الجزائر و مراکش کے تمام عربی بولنے والے ممالک شامل ہیں ——— بہرحال شاندار ماضی رکھنے والے عربوں کا حال اگرچہ بہت زنگ آلود ہے لیکن اس زنگار کے نیچے سے مستقبل کا وہ شفاف شیشہ چمکتا ہوا صاف نظر آرہا ہے جو عنقریب دنیا میں پھر آفتاب بن کر چمکے گا۔[1]

---

[1] اس باب کی ترتیب میں ذیل کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے: "بغاوتِ صحرا" از کرنل لارنس۔ نیو اسپرٹ ان اریبیا از کاتبہ (مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۴۰ء) "عرب" از ہوگارتھ۔ "عرب کا معمہ" از فیراگو "عرب کے جنوبی پھاٹک" از اسٹارک (مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۳۶ء) تاریخ عرب از ہٹی اور پوسٹ وار ورلڈ از جیکسن

باب ۲۴

الجزائر، تیونس، طرابلس اور مراکش

دنیا کے مظلوم ترین علاقے

مصر اور بلادِ عرب کے علاوہ تقریباً دو کروڑ عرب افریقہ کے شمالی ساحل پر مغربِ اقصیٰ میں بستے ہیں، یہاں کے تمام باشندے اپنی زبان، معاشرت، مذہب اور روایات ہر اعتبار سے عرب ہیں یا عربوں سے قریب تر۔ لیکن انیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد سے یہ علاقہ آہستہ آہستہ یورپ کے ہاتھ میں جانا شروع ہو گیا تھا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی جنگ طرابلس تھی جو ۱۹۱۱-۱۲ء میں لڑی گئی اور جس میں ترکوں کو شکست ہوئی اور شمالی افریقہ کی یہ آخری ولایت بھی یورپ کی نوآبادی بن گئی۔

یہ ساحلی علاقہ جس میں مراکش (یا مراکو)، الجزائر، طرابلس (یا لیبیا) اور تیونس کے ممالک شامل ہیں اپنی آب و ہوا کے لحاظ سے بہت خوشگوار اور پیداوار کے لحاظ سے بہت زرخیز ہے، یہاں بہترین قالین بنے جاتے ہیں، ریشم، اون، سیمرغ کے پر اور ہاتھی دانت کا نہایت نفیس کام ہوتا ہے۔ چمڑا بہترین طور پر تیار کیا جاتا ہے

پھل اور پھول کثرت سے ہوتے ہیں اور عطر کشی کا کاروبار بھی بڑے پیمانہ پر جاری ہی۔ معدنیات میں لوہا، فاسفیٹ، جست اور سیسا خاص طور سے بکثرت زمین میں مدفون ہی جو ابھی پوری طرح حاصل بھی نہیں کیا جا سکا ہی۔ بہترین رنگ مرمر کا بیش بہا خزانہ پہاڑوں کے دامن میں محفوظ ہی۔ سمندر کے ساحل پر بہت قیمتی مچھلیاں پائی جاتی ہیں اور زمین زراعت کے لئے کافی سازگار ہی اور ہر قسم کا غلہ خصوصاً گیہوں اور جو بہت پیدا ہوتا ہی۔

لیکن اس تمام زرخیزی کے باوجود یہاں کے عوام افلاس وغربت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور تہذیب وتمدن کے لحاظ سے ان کو پست وپسماندہ کہا جاتا ہی حالانکہ یہی پست وپسماندہ افراد تھے جنہوں نے ۷۱۱ء سے لے کر ۱۴۹۲ء تک آٹھ سو سال اسپین پر حکمرانی کی ہی اور جن کی حکمرانی کے آثار آج بھی اسپین سے محو نہیں ہو سکے ہیں، خصوصاً فن تعمیر میں تو آج بھی تہذیب حاضران سے آگے نہیں بڑھ سکی ہی۔ غرناطہ اور قرطبہ کی جو عمارتیں آج تک قائم وباقی ہیں وہ ماہرین فن کے لئے حیرت واستعجاب کا ایک زبردست نمونہ پیش کرتی ہیں۔ علم وفضل کی دنیا میں قرطبہ کی یونیورسٹی کے کارنامے آج تک مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں اور ابن رشد کی تصنیفات تو اب بھی یورپ کے علماء کے زیر مطالعہ رہتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود آج یہ علاقے نیم مہذب اور پست وپسماندہ ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ یورپ کی قومی شہنشاہیت کی گرفت نے ان کا خون چوس رکھا ہی جس کی وجہ سے دولت وثروت کے بیچ میں ہونے کے باوجود، یہ دولت وثروت سے محروم ہیں اور ان کی حیثیت صرف مزدوروں اور محنت کشوں کی سی ہو کر رہ گئی ہی جو اپنی محنت ومشقت کا پورا نتیجہ اپنے آقاؤں کے قدموں پر نثار کر دیتے ہیں اور خود کھڑے حسرت سے مُنہ تکتے ہیں اور اسی حسرت مآبی اور حرماں نصیبی کے طفیل پست وپسماندہ کہلاتے ہیں۔

۱۹۱۴ء کی جنگ کے زمانے میں یہ مقامات فوجی چھاونیاں بنے ہوئے تھے جنگ کے بعد سے ان کو مسلسل یورپ کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جارہی ہے اس سلسلے میں دو قسم کے پروگرام ہیں: ایک تو یورپ کے باشندوں کا یہاں آکر آباد ہونا اور دوسرے یہاں کے باشندوں کو اپنی قدیم تاریخ و مدنیت سے نفرت دلاکر یورپ کی ذہنی غلامی پر مجبور کرنا۔

تیونس اور مراکش فرانس کے "زیر حمایت" ہیں یعنی اگرچہ یہاں کی براہ راست حکومت کا تعلق عرب فرمانرواؤں سے ہے لیکن بالواسطہ نگرانی فرانس کی ہے مگر الجزائر کے علاقے پر براہ راست فرانس ہی کی حکمرانی ہے۔ اسی طرح طرابلس پر براہ راست اٹلی حکومت کرتا ہے، مراکش کے تھوڑے سے رقبے پر اسپین حاکم ہے، طنجہ کا ذرا سا علاقہ بین الاقوامی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک مراکو اور تیونس دونوں جگہ عربوں کی خود مختار و آزاد سلطنتیں قائم تھیں، مگر "صنعتی انقلاب" نے نئے بازاروں کی تلاش یورپ میں پیدا کی تو یہ دونوں سلطنتیں فرانس کے حلقۂ اثر میں آگئیں، طرابلس بیسویں صدی کے اوائل تک ترکوں کی حکومت میں رہا، لیکن ۱۹۱۲ء میں اٹلی نے اسے چھین لیا، اس سے کوئی اسّی سال پہلے ۱۸۳۰ء میں الجزائر کا علاقہ فرانس لے چکا تھا۔ اس اعتبار سے مغرب اقصےٰ میں سب سے پہلا یورپی مقبوضہ الجزائر ہے اور سب سے آخری طرابلس۔

فرانس کی "قومی تبلیغ" فرانس کی پالیسی اپنی ہر نوآبادی میں یہ رہتی ہے کہ مقامی باشندوں کو فکر و خیال کے لحاظ سے فرنچ بنا لیا جائے، اس کے لئے مسیحی تبلیغ کے علاوہ عہد جدید کے دوسرے وسائل بھی استعمال کئے جاتے ہیں، فرانس کی یہ پالیسی افریقہ کے دوسرے مقبوضات میں تو بہت کامیاب ہوئی اور غیر متمدن حبشی فرانسیسیوں کی اس "مہربانی" سے متأثر

ہونے لگے، لیکن تیونس، الجزائر اور مراکش میں یہ پالیسی کامیاب نہ ہوسکی۔ فرانس نے ان مقامات میں اپنا شہری قانون نافذ کرکے عربوں کو یہ حق دیا کہ اگر وہ چاہیں تو شہری حقوق کے لحاظ سے فرانسیسی بن سکتے ہیں۔ یہ گویا قومی تبلیغ کا ایک طریقہ تھا، مذہبی تبلیغ کسی عبادت گاہ میں کی جاتی ہے۔ لیکن قومی تبلیغ کیلئے عبادتگاہوں کی ضرورت نہیں۔

صنعتی انقلاب سے پہلے ان مقامات کی اہمیت کا بہت زیادہ احساس یورپ کو نہ تھا لیکن اس انقلاب کے دوران میں ان کی زرخیزی کے علاوہ ان کی تجارتی اور فوجی اہمیت کا احساس شروع ہوا، اس احساس کے ساتھ یورپ کی ہر حکومت کی نظریں اس طرف اٹھیں اور ہر طرف سے دولت بٹورنے کی کوشش میں بہت زیادہ شدت پیدا ہوگئی، پھر چونکہ یہ مقامات یورپ کے بہت قریب ہیں اور اپنی آب وہوا کے لحاظ سے یورپ کے باشندوں کے لئے موزوں بھی ہیں اس لئے تجارتی اور معاشی مفاد کے علاوہ بڑھتی ہوئی آبادی کو بسانے کے خیال سے بھی ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے، ان تمام علاقوں میں یورپ کے نوآبادکار کثیر تعداد میں ہر سال آ آکر بستے ہیں اور ان کی خواہش یہ ہے کہ یا تو عربوں کو پیچھے دھکیل کر یہ علاقے ان سے بالکل خالی کرائے جائیں یا پھر عربوں کو یورپین تہذیب و تمدن کے ساتھ اس طرح سازگار بنالیا جائے کہ وہ یورپ کے نوآبادکاروں میں ضم ہوکر رہ جائیں

الجزائر (الجیریا)

شمالی افریقہ میں مغربی ممالک کی سیاسی چالبازی یا ڈپلومیسی کا پہلا شکار الجزائر کو بننا پڑا۔ ساڑھے آٹھ لاکھ مربع میل کے اس علاقے کا بیشتر جنوبی حصہ اگرچہ ریگستانی

ہے۔ لیکن شمال کی ساحلی پٹی آب وہوا کی خوشگواری، قدرتی مناظر کی گل کاری اور زمین کی زرخیزی کی وجہ سے جنت کا ایک ٹکڑا ہے جو فرانس کے جنوبی ساحل کے بالکل سامنے واقع ہونے کی بنا پر اس کی حریص نگاہوں کو ہر وقت دعوت کشش دیتا رہتا ہے۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک اس پر ترکی کا قبضہ تھا مگر چونکہ ترکی کی طاقت روز بروز ٹوٹتی جا رہی تھی، اس لئے فرانس نے اندر ہی اندر یورپ کی طاقتوں سے ساز باز کر کے ۱۸۳۰ء میں اس پر حملہ کر دیا، خلافتِ عثمانیہ کی فوجوں نے کچھ مقابلہ کیا، لیکن نئے آلاتِ جنگ اور نئے فنونِ حرب میں فرانس بہت آگے تھا، اس لئے ترکوں کو شکست ہوئی اور وہ الجزائر کو فرانسیسیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

فرانس نے الجزائر پر حملہ کرنے کا سب سے بڑا سبب یہ ظاہر کیا کہ یہاں بحری قزاقوں کے غول بستے ہیں اور بحر روم سے گذرنے والے تمام پُرامن جہازوں پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ بات غلط نہ تھی اور اس سے فرانس کے علاوہ اسپین اٹلی اور انگلستان سب ہی نالاں تھے، یہ شکایت عثمانی سلطنت تک کئی بار پہنچائی گئی لیکن ترک اس کی اصلاح سے قاصر رہے، ترکی کی اس بے بسی کو دیکھ کر اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں فرانس اور انگلستان نے بڑے پیمانے پر بحری حملے کر کے ان قزاقوں کو زیر کرنا چاہا۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ الجزائر میں فرانس کا مفاد زیادہ تھا۔ اس لئے اُسے سب سے زیادہ فکر رہی۔ آخر چند سال کی جدوجہد کے بعد ۱۸۳۰ء میں اس کی فوجیں اس علاقہ میں اتار دی گئیں۔ لیکن ترکی نے اگرچہ الجزائر کی شکست تسلیم کر لی، مگر الجزائر کے باشندوں نے آزادی کی جدوجہد برابر جاری رکھی اور پچاس سال تک سخت قسم کی خوفناک بغاوتیں یہاں ہوتی رہیں۔

عبدالقادر الجزائر کی تحریکِ آزادی کا سب سے بڑا ہیرو سید عبدالقادر ہے۔ یہ مصر کے فاطمی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ فرانس کے حملے کے دو سال بعد ۱۸۳۲ء میں تمام قبائل نے مل کر اُسے امیر منتخب کیا اگرچہ دنیا کے بین الاقوامی حالات عبدالقادر کے لئے بالکل ناموافق تھے اور اُسے روئے زمین کے کسی گوشے سے بھی کسی قسم کی ہمدردی کی آس نہ تھی۔ پھر بھی اس نے جس حیرت ناک استقلال اور مدبرانہ دانائی کے ساتھ فرانس کے اقتدار کا مقابلہ کیا، وہ انقلاباتِ عالم کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ فرانس کی طاقت کھُلے طور پر عبدالقادر سے کہیں زیادہ تھی، اور کئی بار اُسے بری طرح شکست کھانی پڑی، لیکن ہر شکست کے بعد بددل ہو کر ہمت ہار بیٹھنے کے بجائے، اس نے نئے سرے سے اپنی ٹوٹی ہوئی طاقت کو مجتمع کر کے نیا محاذ بنانے کی کوشش کی، ہر شکست کے بعد فرانس سمجھتا تھا کہ شاید اب بغاوت نہ ہوگی لیکن ہر بار عبدالقادر ایک نئی شکل میں سامنے آجاتا تھا۔ اس کا حملہ اتنی تیزی کے ساتھ آناً فاناً ہوتا تھا کہ فرانس بدحواس ہو کر رہ جاتا تھا۔ یہ آیا، وہ گیا، وہ پکڑا اور فرانس کی فوجیں غائب ——— مگر فرانس کے پاس افریقہ و ایشیا کی نوآبادیوں کے اتنے بیشمار آدمی صدقے کے بکرے بننے کے لئے موجود تھے کہ الجزائر کی چھوٹی سی آبادی کہاں تک ان کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ پھر فرانس کے ساتھ دنیا کی تمام طاقتور حکومتوں کی ہمدردیاں شامل تھیں اور الجزائر بالکل تنہا تھا۔ آخر ۱۸۴۴ء میں فرانس بڑی زبردست تیاری کے ساتھ میدان میں آیا۔ اس مقابلے میں عبدالقادر کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی اور وہ مراکش کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوا۔ فرانس نے سلطانِ مراکش سے اس کی سپردگی کا مطالبہ کیا، سلطان اتنا طاقتور نہ تھا کہ اس مطالبے کو رَد کر سکتا۔ چنانچہ دو تین سال کی ردّ و قدح کے بعد ۱۸۴۷ء میں الجزائر کی تحریکِ آزادی کا یہ ہیرو ایک قیدی کی حیثیت سے فرانس لے جایا گیا اور اہل و عیال سمیت

وہیں نظر بند کر دیا گیا۔

لیکن عبدالقادر کی گرفتاری کے باوجود الجزائر کی تحریک نہ دبی۔ نئے عناصر نے نئے رہنما پیدا کر لئے اور فرانس کے خلاف غم و غصہ کی فضا بدستور قائم رہی۔ اس عرصے میں فرانس کے مدبّروں نے عبدالقادر کے دل و دماغ کو مغربی تہذیب اور فرانسیسی طاقت سے مرعوب کرنا شروع کیا۔ چند سال میں اس کوشش کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور عبدالقادر یہ سمجھنے لگا کہ الجزائر کے جاہل غیر منظم اور نیم مہذب باشندے فرانس جیسی حکومت کو مغلوب نہیں کر سکتے۔ عبدالقادر کے دل و دماغ کو اس طرح مغلوب کر دینے کے بعد ۱۸۵۲ء میں اُسے رہا کر دیا گیا۔ فرانس کا خیال تھا کہ شاید اس کی رہائی سے الجزائر کی تحریک آزادی کو دبانے میں کوئی مدد ملے گی، مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی اور عبدالقادر اپنے اس نئے رنگ میں عوام کو بالکل متاثر نہ کر سکا۔ تاہم فرانس نے عبدالقادر کی دل جوئی میں کوتاہی نہ کی، ایک لاکھ فرانک سالانہ اُس کا وظیفہ مقرر کیا گیا اور چند سال بعد ایک بڑا اعزازی خطاب بھی عطا کیا گیا۔ ان حالات نے اس کی ہر دلعزیزی کو بالکل ختم کر دیا۔ زندگی کا آخری زمانہ دمشق میں گذرا اور وہیں ۱۸۸۳ء میں زندگی کی آخری امانت سپرد خاک کر دی گئی۔[۱]

عبدالقادر کے بعد الجزائر کو کوئی بڑا لیڈر نہ مل سکا۔ تاہم جد و جہد جاری رہی۔ ۱۸۵۶-۵۷ء میں بڑی خوفناک جنگیں ہوئیں۔ یہ ٹھیک وہی زمانہ تھا جب ہندوستان میں بھی برطانیہ کے چنگل سے رہائی حاصل کرنے کے لئے خونیں بغاوت کا دروازہ کھولا گیا تھا۔ مگر جس طرح ہندوستان اپنی کوششوں میں ناکام رہا، اسی طرح الجزائر کی آگ بھی عارضی طور پر دبا دی گئی۔ لیکن احساسِ آزادی کی تمام چنگاریاں نہ یہاں

---

[۱] حیات عبدالقادر (انگریزی) از سی۔ اے۔ چرچل۔

ہمیشہ کے لئے بجھ سکیں اور نہ وہاں بجھیں۔ الجزائری عوام کی اس تحریک کو کچلنے کے لئے فرانس نے جس وحشت وبربریت کا ثبوت دیا۔ اس کی تفصیلات بتانے کا یہاں موقع نہیں۔ چیمبرس انسائکلوپیڈیا کا یہ مختصر سا جملہ رمز آشنا نگاہوں کے لئے پوری حالت کو سمجھنے کے واسطے کافی ہے کہ " دونوں طرف سے قتل وخونریزی اور وحشت ودرندگی کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا۔[1]"

نئی تدبیر: الجزائر فرانس کا جزو ہے ہندوستان میں برطانیہ کی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہندو مسلم اختلافات تھے لیکن الجزائر میں فرانس کو اس قسم کا کوئی موثر ہتھیار نہ مل سکا، وہاں تقریباً پوری آبادی صرف مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اُن میں کوئی ایسا تفرقہ نہ تھا جو فرانس کو ثالث بالخیر بننے کا موقع بہم پہنچا سکتا۔ اس مشکل کو سر کرنے کے لئے فرانس کے دوررس دماغ نے یہ ترکیب سوچی کہ الجزائر کے شمالی علاقے میں یورپ کے گرے پڑے انسانوں کو بسا کر اس میں ایک نئی اقلیت پیدا کر دی جائے اور پھر اس اقلیت کے نام پر الجزائر کو ایک جداگانہ ملک کے بجائے، فرانس کا جزو قرار دے لیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء میں اس تجویز کا پہلا بنیادی پتھر رکھا گیا اور نپولین ثالث نے ایک شاہی اعلان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ آج سے الجزائر کوئی نوآبادی نہیں ہے بلکہ فرانس ہی کا ایک صوبہ ہے۔ گویا اس اعلان کی رو سے فرانس کی سرحدیں رودبار انگلستان سے لے کر صحرائے افریقہ کے شمال تک پھیل گئیں۔ لیکن چونکہ جغرافیائی، معاشی، معاشرتی مذہبی اور لسانی کسی لحاظ سے بھی فرانس کی یہ منطق صحیح نہ تھی۔ اس لئے الجزائر کی شورش بدستور جاری رہی۔ ۱۸۷۰ء میں جب جرمنی نے فرانس پر حملہ کیا اور

---

[1] جلد اوّل صفحہ ۱۶۱

فرانس کو اپنی پوری طاقت اس جنگ میں لگا دینا پڑی تو الجزائر نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور پوری قوت سے آزادی کی لڑائی شروع کر دی۔ لیکن چونکہ یورپ کی کوئی طاقت ان کی پشت پر نہ تھی اور ترکی کی طاقت برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ اس لئے میدان پھر فرانس ہی کے ہاتھ رہا، الجزائر کی تحریک میں تیونس سے کچھ اخلاقی امداد ملتی تھی اس لئے ۱۸۸۱ء میں فرانس نے اس کانٹے کو بھی راہ سے ہٹا دینے کا فیصلہ کیا، لیکن ادھر تو فرانس کی فوجوں نے تیونس پر دھاوا بولا اور ادھر الجزائر کے مجاہدوں نے فرانس کی گردن مروڑنی شروع کر دی، مگر تیونس اور الجزائر دونوں کی مشکل یہ تھی کہ جدید قسم کے اسلحہ سے ان کا دامن خالی تھا اس لئے دونوں جگہ فرانسیسی ہتھیاروں کی جیت رہی۔

سختیاں

اب فرانس کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور تیونس و الجزائر دونوں کی طاقت بُری طرح ٹوٹ چکی تھی، اس لئے اب الجزائر کو فرانسیسی صوبہ بنانے کا کام پوری طاقت کے ساتھ شروع کر دیا گیا، بغاوت و سرکشی کے جرم میں ہزاروں آدمیوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ ہزاروں مربع میل اراضی سے زمینداروں کو بے دخل کیا گیا، ہر قسم کی داخلی خود مختاری ختم کر کے ہر شعبے پر فرانس کا مکمل اقتدار قائم کیا گیا اور مختلف قسم کے ٹیکسوں کے علاوہ زبردست تاوانِ جنگ عائد کر کے عوام کو ہمیشہ کے لئے مفلس و بے دست و پا بنا دینے کی کوشش کی گئی۔

ان بے پناہ سختیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر عرصے تک کوئی قابلِ ذکر تحریک الجزائر میں نہ ابھر سکی۔ لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ جب شروع ہوئی تو فرانس کو الجزائر کی مدد کی ضرورت لاحق ہوئی، اس لئے بڑی بلند آہنگی کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا کہ جنگ کے بعد الجزائر کو آزاد کر دیا جائے گا۔ فرانس اس وقت موت و زندگی

کی کشمکش میں مبتلا تھا اور جرمنی کی فوجیں اس کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر تلی ہوئی تھیں، اس پریشانی و آشفتہ حالی کے عالم میں اپنی نوآبادیوں کی امداد حاصل کرنے کے لئے اُس نے وہی تمام باتیں کہنی شروع کیں جو اس موقعہ پر کہی جا سکتی ہیں ——— ہم یہ جنگ صرف اس لئے لڑ رہے ہیں تاکہ طاقتوروں کو کمزوروں پر غلبہ پانے کا کوئی موقعہ نہ رہے اور جس کی لاٹھی، اس کی بھینس کا وحشیانہ اصول ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ ہم ہر چھوٹی سے چھوٹی قوم کو آزاد کرانے کا وعدہ کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ آئندہ کسی کو یہ حق نہ ہوگا کہ محض جبر و قوت کے زور سے دوسروں کو اپنا محکوم بنائے وغیرہ وغیرہ۔

فریبِ اصطلاحات

دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح الجزائر کے باشندے بھی اس فریب میں مبتلا ہو گئے اور فرانس کو جان و مال سے بے دریغ امداد دی جانے لگی۔ لاکھوں کی تعداد میں الجزائری نوجوان فوجوں میں بھرتی ہو کر محاذ جنگ پر گئے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس جنگ میں الجزائر کے ۶۲ ہزار آدمی میدان میں مارے گئے۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی تو الجزائر نے بھی وہی منظر دیکھا جو مصر و عراق وغیرہ کے باشندے دیکھ رہے تھے۔ الجزائر میں اتنی طاقت نہ تھی کہ منظم اور جاندار تحریک چلا سکتا۔ یورپین آبادی ایک طاقتور اقلیت کی حیثیت سے یہاں بس چکی تھی اور دولت و اقتدار کے شعبوں پر اسی کا قبضہ تھا، تاہم دوسرے بلادِ عرب کی تحریکوں سے متاثر ہو کر، الجزائر نے بھی اپنے حقوق کے لئے ایک "آئینی تحریک" شروع کی، آخر بڑی ذق ذق بق بق کے بعد تین قسم کی اصلاحات فرانس کی "جمہوری شہنشاہیت" کی بارگاہ سے عطا کی گئیں۔ (۱) قصبوں اور شہروں کی مقامی انتظام کے لئے محدود اختیارات رکھنے والی میونسپل کمیٹیاں (۲) فوج میں

چند ابتدائی درجے کے عہدوں تک الجزائریوں کو ترقی دینے کا حق اور (۳) فرنچ شہریت کے حقوق۔

اس آخری اصلاح کی رو سے ہر الجزائری فرانس کے شہری کے برابر حقوق کا مالک قرار دیا گیا بشرطیکہ اس کی عمر ۲۵ سال سے زائد ہو اور ایک سے زائد بیوی نہ رکھتا ہو اور (۱) فرنچ فوج میں ملازم رہ چکا ہو (۲) زمیندار ہو اور لکھ پڑھ سکتا ہو یا (۳) کوئی فرنچ خطاب رکھتا ہو۔

اسلام اور فرنچ شہنشاہیت

دراصل ان شرائط کا اصل مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو فرانس کی عیسائی تہذیب میں ضم کرنے کی کوشش کی جائے۔ الجزائریوں کو اسلام سے بدگمان کرنے کے لئے مختلف تدبریں اختیار کی گئیں، سب سے زیادہ زور ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کے خلاف صرف کیا گیا۔ اسی بنا پر فرنچ شہریت کے حقوق حاصل کرنے کے لئے "ایک سے زائد بیوی نہ رکھنے" کی شرط لازمی قرار دیا گیا۔ فرانس کا مطلب اس شرط سے عورتوں کی ہمدردی یا الجزائری معاشرتی زندگی کو بہتر بنانا ہرگز نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کی تعلیمی ترقی اور معاشی خوشحالی کے وسائل تلاش کرنے کی کوشش کرنا سب سے زیادہ ضروری تھا۔ اصل مطلب صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو اسلام و اسلامیات سے جتنا زیادہ بیگانہ بنایا جا سکے، بنا دیا جائے۔ تاکہ یہ کعبے کی طرف دیکھنے کے بجائے پیرس کی طرف دیکھیں اور عالم اسلامی کے ساتھ اُن کو جو وابستگی ہے اور جو فرانس کے شہنشاہی مقاصد کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ ختم نہ ہو تو کمزور ہی ہو جائے۔

بلادِ عرب کی سیاست کے مجاہد کبیر امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں: "——

الجزائر میں فرانس کی پالیسی یہ رہی ہے کہ عوام کی اسلامی روح کو جہاں تک ہو سکے کمزور کیا جائے۔ چنانچہ پہلے تو مختلف تدبیروں سے تمام بڑی بڑی درسگاہیں ختم

کی گئیں پھر ایسے قوانین جاری کئے گئے جن سے فائدہ اٹھانے کے لئے مسلمانوں کو فرانس کے نصرانی عقائد سے قریب تر ہونا پڑے۔ مزید براں، بہت سے انعامات و امتیازات کو صرف نصرانی ہونے پر موقوف رکھا گیا۔ چنانچہ جنرل یوسف کو جنرلِ اعلیٰ اس وقت تک نہ بنایا گیا، جب تک وہ نصرانی نہ ہوگئے۔ پھر فرانس نے اپنی اس اسلامیت کش پالیسی کو صرف انہی باتوں تک محدود نہیں رکھا، بلکہ کھلے طور پر مسجدیں بھی مسمار کی گئیں الجزائر کی فتح کے وقت وہاں ۱۷۶ مسجدیں تھیں لیکن بعد میں صرف ۳۷ رہ گئیں، یعنی ۱۳۹ مسجدیں یا توڑ ھادی گئیں یا انھیں گرجا بنا لیا گیا۔ چنانچہ الجزائر کی جامع مسجد آج بھی گرجا کی شکل میں مسلمانوں کو فرانسیسی غلبے کی یاد دلانے کے لئے موجود ہے۔ اسی طرح اور بہت سی مسجدوں کو گرجا گھروں میں تبدیل کیا گیا۔ مسجدوں کے علاوہ مسلمانوں کی موقوفہ جائدادیں بھی طرح طرح سے ضبط کی گئیں یا اُنکی آمدنی کو فرانس کی مرضی کے مطابق خرچ کرنے پر مجبور کیا گیا۔[1]

عربوں کو فرنچ تہذیب میں جذب کرنے کی کوشش

فرانس کا ایک نامور مورخ موسیو فینوں لکھتا ہے:

فرانس نے الجزائر کو اپنے لئے محفوظ کرنے کی غرض سے دو طریقے اختیار کئے (۱) اچھی اچھی زمینیں عربوں سے چھین لیں اور انھیں بے آب و گیاہ ریگستانوں میں بھیج کر ان کے سرسبز و شاداب علاقوں پر خود قابض ہو گئے اور پھر یہ قانون بنا دیا کہ جن زمینوں کو گوری نسل کی آبادی نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے وہاں کوئی "کالا آدمی" نہیں بس سکتا (۲) دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ عربوں کو مذہباً عیسائی بنا لیا جائے یا کم از کم فرانسیسی تہذیب ہی میں ضم کر لیا جائے۔[2]

---

[1] حاضر العالم الاسلامی: جلد دوم صفحہ ۱۷۹-۱۸۰، [2] حاضر العالم الاسلامی جلد دوم صفحہ ۱۸۷

لیکن فرانس کے ان طریقوں کا نتیجہ جو کچھ ہوا، اُسے فرانس ہی کے ایک مشہور مورخ و محقق گستاف لیبان کی زبان سے سُنئے۔ لکھتا ہے: "بہت کوشش کے باوجود برائے نام عرب مسلمان عیسائی ہوئے اور جو ہوئے وہ بہت ہی پست طبقے سے تعلق رکھتے تھے"[1]

امیر شکیب ارسلان کا بیان ہے کہ عربوں کو عیسائی تہذیب کا جزو بنا کر انھیں فرانسیسی حکومت پر صابر و شاکر رکھنے کے لئے ایک خاص ترکیب یہ کی گئی کہ چھوٹی عمر کے یتیم بچوں کو فرانس بھیجدیا جاتا تھا جہاں پادریوں کی نگرانی میں ان کی تربیت ہوتی تھی۔ لیکن فرانس کی یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ چنانچہ چار لاکھ یتیم بچے جو بالکل نصرانی طرز پر تربیت کئے گئے تھے، جب بڑے ہوئے تو شاذ و نادر ہی ان میں سے کسی نے عیسائی مذہب قبول کیا، ورنہ سب کے سب اپنے آبائی مذہب اسلام کی طرف لوٹ آئے۔[2]

الجزائر کی آبادی کو عام طور سے عرب کہا جاتا ہے، ان کی معاشرت اور زبان وغیرہ سب عربی ہے۔ لیکن خالص عربی النسل آبادی ایک تہائی ہے۔ باقی دو تہائی آبادی قدیم باشندوں کی ہے جو بربر کہلاتے ہیں۔ مگر ایک عرصے سے عربوں کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان میں اور عربوں میں امتیاز کرنا مشکل ہے——مذہباً یہ سب مسلمان ہیں اور عربی زبان بولتے ہیں۔ اسی بنا پر الجزائر کی آبادی کو ہمیشہ عرب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ مگر اب فرانس نے اختلافات کی آگ کو ہوا دینے کے لئے بربر اور عرب کا سوال کھڑا کیا۔ فرانس کا ایک مشہور مصنف "فیکتور بیکہ" اپنی کتاب "مراکش" میں لکھتا ہے "ہمارے لئے ضروری ہے کہ بربر قبائل میں ان کی مقامی بولی کی حوصلہ

---

[1] حاضر العالم الاسلامی: جلد دوم صفحہ

[2] " " " "

افزائی کریں اور عربی سے جو اسلامی اتحاد کا پیش خیمہ ہے۔ انھیں دور رکھیں"[1] چنانچہ بربر قبائل کی وہ گھریلو زبان جس کو علمی و ادبی زبان قرار دینے کا تصور بھی کبھی ان کو نہ آیا تھا، فرانس کی عنایت سے بربر قوم کی "قومی زبان" تسلیم کی گئی اور ان کے مکاتب و مدارس میں ذریعہ تعلیم بن کر عربوں اور بربروں کے صدہا سال پرانے تعلقات میں کشیدگی پیدا کرنے کا آلہ کار ثابت ہوئی۔

اکثریت کو اقلیت کیسے بنایا گیا؟ الجزائر کا رقبہ اگرچہ ساڑھے آٹھ لاکھ مربع میل کے لگ بھگ ہے، لیکن اس کا جنوبی علاقہ چونکہ صحرائے اعظم سے ملتا ہے، اس لئے بالکل غیر آباد ہے۔ آبادی کے لائق علاقہ صرف شمال میں ہے یا پھر چند نخلستانوں میں۔ اسی بنا پر یہاں کی آبادی صرف ۷۰ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے[2]۔ گوری نسل کے نو واردوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے۔ یعنی کل آبادی کا کوئی تیرہ چودہ فی صدی۔ لیکن اس فیصدی میں اضافہ کرنے کے لئے الجزائر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا: ایک شمالی اور دوسرا جنوبی۔ ان دونوں حصوں کا نظم و نسق بالکل علیحدہ ہے۔ یوروپین آبادی چونکہ زیادہ تر شمالی حصے ہی میں بستی ہے، اس لئے اس تقسیم کے نتیجے میں وہاں ان کا فی صدی تناسب ایک چوتھائی کے قریب ہو گیا۔ مگر ایک چوتھائی بھی بہرحال اقلیت ہی ہوتی ہے اس لئے اس اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کرنے کے لئے "حقوق شہریت" کے نام سے ایک نرالا قانون نافذ کیا گیا جس کی رو سے ووٹ دینے کی قابلیت کا معیار ایسا بنایا گیا کہ عربوں کا نام ووٹروں کی فہرست میں آہی نہ سکے۔ اور

---

[1] منقول از حاضر العالم الاسلامی جلد دوم، صفحہ ۱۸۰

[2] رپورٹ مردم شماری ۱۹۳۶ء

اگر آبھی سکے تو اقلیت کی حیثیت سے - فرانس کا یہ داؤ بہت کامیاب رہا اور الجزائر کی "جمہوریت" میں اصلی باشندوں کی اچھی خاصی ۸۵ فی صدی اکثریت، ایک بے جان اقلیت ہو کر رہ گئی۔

لیکن لطف یہ ہی کہ حقوق شہریت تو عربوں کو خال خال ہی حاصل ہیں مگر ٹیکس اُن سے تمام اتنے ہی لئے جاتے ہیں جو "گوری نسل" پر واجب ہیں۔ نیز ایک قانون کی رو سے گوری آبادی کی طرح عربوں کی کالی آبادی، جنگ کے موقع پر کم از کم دو سال تک فوجی نوکری کرنے پر بھی مجبور ہی۔ مگر اعلیٰ عہدوں تک ترقی کرنے کا حق پھر بھی اس محکوم آبادی کو حاصل نہیں۔

الجزائر کا جنوبی حصہ جو ایک جداگانہ نو آبادی شمار ہوتا ہی، خالص عرب آبادی پر مشتمل ہی اور گوری مخلوق صرف وہی ہی جو تجارتی کاروبار کے سلسلے میں پھیلی ہوئی ہی۔ اسی بنا پر اس علاقے کو خانہ بردوش بدوی اور صحرائی قبائل کا غیر مہذب علاقہ کہا جاتا ہی اور گورنر جنرل کے ماتحت فوجی قانون (مارشل لا) کے مطابق حکومت ہوتی ہی۔

شمالی الجزائر یا فرانس کا بچہ

لیکن شمالی حصے کو براہِ راست فرانس کے ساتھ ملا دیا گیا ہی، یعنی اسے فرنچ پارلیمنٹ کا حلقہ انتخاب قرار دے دیا گیا ہی جہاں سے دو تین ممبر منتخب ہو کر جاتے ہیں۔ اس لئے حکومت کے تمام شعبے براہِ راست فرنچ وزیروں کے ماتحت ہوتے ہیں۔ مقامی حکومت کی نگرانی کے لئے گورنر جنرل رہتا ہی جس کے ماتحت کلکٹر اور کمشنر قسم کے حکام ہوتے ہیں۔ عدالت، تعلیمات، دینیات اور خزانے کے محکموں کا افسر قانوناً کوئی مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔ خواہ وہ کتنا ہی وفادار و اطاعت شعار کیوں نہ ہو۔ سالانہ آمد و صرف کے بجٹ کو فرانس کا وزیر داخلہ، گورنر جنرل کے مشورے سے بناتا ہی جس

میں مقامی باشندوں کے ایک وفد کو بھی کچھ بولنے کا حق دیا گیا ہے۔ مگر اس وفد کے تین ممبروں میں سے ایک ممبر فرانسیسی نوآبادکاروں کا ہوتا ہے، ایک "دیگر یوروپین" نوواردوں کا اور صرف ایک عدد نمائندہ ۸۵ فی صدی اصلی باشندوں کا۔

شہروں اور قصبوں کے لئے میونسپل کمیٹی کی قسم کی جو جماعتیں ہیں اُن میں دو شعبے ہیں۔ جہاں یوروپین آبادی کی اکثریت ہے وہاں ممبروں کو اختیارات زیادہ ہیں، جہاں عربوں کی اکثریت ہے۔ وہاں اختیارات برائے نام ہیں۔

دیوانی و فوجداری کا قانون وہی ہے جو فرانس میں رائج ہے۔ البتہ مسلمانوں کے طلاق، اور وراثت و اوقاف کی قسم کے معاملات کیلئے "شرعی عدالتیں" قائم ہیں جن میں "قاضی" فیصلے کرتے ہیں مگر ان کے فیصلوں کا اپیل اُس ہائی کورٹ ہی میں ہوتا ہے جس کا جج ازروئے قانون کسی مسلمان کو نہیں بنایا جا سکتا۔

پایۂ تخت الجیرز ہے جہاں گورنر جنرل رہتا ہے۔ یہاں ایک یونیورسٹی بھی ہے جو خالص فرانسیسی زبان میں فرنچ طرز پر تعلیم دیتی ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تعلیم کے لئے پرائیویٹ مدارس و مکاتب کھول رکھے ہیں جو صرف ابتدائی تعلیم دیتے ہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے فرنچ یونیورسٹی کے سوا کوئی درسگاہ نہیں ہے[۱]۔

الجزائر کے ان حالات کو دیکھئے اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ یہ سب کچھ فرانس کی اُس حکومت کے تحت ہو رہا ہے جو جمہوریت کی داعی ہے اور جس نے الجزائر میں بھی جمہوریت ہی قائم کر رکھی ہے ——— مگر قابلیت کے چالاک ہاتھوں نے کن عیارانہ

---

[۱] اعداد و شمار اور دیگر تفصیلات کا ماخذ: (۱) "شمالی افریقہ" از براڈرک (نیویارک ۱۹۴۳ء) (۲) "شمالی افریقہ کی حکومت" (فلے ڈلفیا) ۴۳ء (۳) ایربک اسٹیٹسمین۔ ۱۹۴۴ء

چالوں سے غریب ہابیلیت کی روح کو کچل کر پھینک دیا ہے۔ لیکن ہابیل کی روح ظاہر میں کتنی ہی کچل دی جائے حقیقت میں کچلی نہیں جا سکتی ہے، فرعون نے سمجھا تھا کہ یہ کچل دی گئی، مگر موسیٰ نے اس کی تردید کردی، پھر موسیٰ کی قوم میں قابلیت نے حلول کرکے نئے ہتھکنڈوں سے اسے کچلنا چاہا، مگر عیسیٰ نے آکر پھر ایک نیا انقلاب کردیا ——— عیسیٰ کے لائے ہوئے اس انقلاب کو پادریوں نے تباہ کیا تو جمہوریت کے علمبرداروں نے پاپائیت کو شکست کرکے قابیلی غلبے سے نجات پائی۔ مگر اب اس جمہوریت کے نام پر پھر قابیلی ہاتھ حرکت میں آنے لگے ہیں۔ ——— اور ہابیلی روح کسی نئے انقلاب کے لئے کروٹیں بدل رہی ہے۔

تیونس (ٹیونشیا)

سازشیں — فرانس نے الجزائر پر قبضہ کرنے کے بعد اسے شمالی افریقہ کی فتوحات کا نقطۂ آغاز بنانا چاہا اور الجزائر کے مغرب میں مراکش اور مشرق میں تیونس کے زرخیز و زرپاش علاقوں کی طرف سیاسی حکمت عملی کے ساتھ دست درازی کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔ لیکن یورپ کی دوسری حکومتوں کو، خصوصاً اٹلی اسپین اور جرمنی کو فرانس کے یہ بڑھتے ہوئے حوصلے ایک آنکھ نہ بھا سکتے تھے۔ مراکش چونکہ بحر روم کے مغربی پھاٹک کا بھی مالک ہے اور جبل الطارق (جبرالٹر) بھی یہیں واقع ہے، اس لئے اس پر برطانیہ کی نظریں بھی جمی ہوئی تھیں۔ اس بنا پر فرانس نے مراکش کے معاملے میں تو زیادہ جلد بازی سے کام نہ لیا، البتہ تیونس پر ۱۸۸۱ء میں دھاوا بول دیا گیا حالانکہ اس سے ایک سال پہلے ہی پوری ذمے داری کے ساتھ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ فرانس کے سامنے تیونس پر قبضہ کرنے کا کوئی سوال نہیں ہے فرانس کے اس حملے نے یورپ میں ایک ہلچل سی ڈال دی۔ لیکن جلد ہی اس نے اندرونی

طور پر خفیہ معاہدے کرکے اپنے طاقتور حریفوں کو رام کرلیا۔ اٹلی کو رام کرنے کے لئے یہ رشوت پیش کی گئی کہ اگر وہ چاہے تو طرابلس پر حملہ کرکے اس پر اپنا قبضہ کرسکتا ہے۔ ہم بیچ میں نہ بولیں گے۔ برطانیہ کو مصر میں کھلی چھٹی دینے کا یقین دلایا گیا اور اسپین وجرمنی کو مراکش میں پاؤں پھیلانے کی آزادی دی گئی[1]۔

تیونس پر حملہ کرتے وقت یہ تمام سازشیں پردۂ راز میں تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ راز کا یہ پردہ ہٹنا شروع ہوا۔ ۱۸۹۳ء میں فرانس کے ایک وزیر ویڈنگٹن —— Weddington —— نے صاف صاف بتایا کہ ہم نے انگلستان سے ایک خفیہ معاہدہ کرکے تیونس کے تمام حقوق، فرانس کے لئے حاصل کرلئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم نے اس پر اپنا جھنڈا لہرایا تو یورپ میں کوئی خاص مخالفت نہ ہوئی[2]۔

اس کی تائید لارڈ سالسبری کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے جو اس نے ۱۸۷۸ء میں لارڈ لائنس (Lyons) کو لکھا تھا اور جس میں کہا گیا تھا کہ اگر فرانس کل ہی تیونس پر قبضہ کرلے تو ہمیں مطلق کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ البتہ —— اس خط میں یہ صراحت کی گئی تھی کہ —— ہم علانیہ طور پر یہ بات نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہمیں دُنیا پر یہ ظاہر نہ ہونے دینا چاہیے کہ ہم انسانی بستیوں کو ان کے علم و اطلاع کے بغیر جائداد کی طرح غیرملکی طاقتوں کو حوالے کردینے میں کوئی فریق بنتے ہیں[3]۔

یورپی طاقتوں کی اس اندرونی سانٹھ گانٹھ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کے حملے کے فوراً

---

[1] دیکھو Memories of my Life: Giolitte

[2] میمائرس آف کرسپی۔ صفحہ ۹۹۔ نیز دیکھو ایمپائر اینڈ کامرس ان افریقہ از دلف ص ۹۵ صفحہ ۹۵

[3] ایضاً صفحہ ۱۰۵

ہی بعد تیونس کے سلطان کو فرنچ "سرپرستی" میں دیا جانا سب نے تسلیم کرلیا، ترکی میں چون وچرا کرنے کی طاقت ہی نہ تھی، اس لئے مغربی ممالک نے آپس میں بیٹھ کر جو فیصلہ چاہا کرلیا۔ اس کے بعد سے ایک برائے نام سلطان یہاں اب تک حکمراں چلا آتا ہی۔ لیکن عملاً تمام اختیارات فرانس کے ہاتھ میں ہیں۔ فرانس کی طرف سے وائسرائے کی قسم کا ایک عہدیدار یہاں رہتا ہی اور عام نگرانی کے علاوہ "معاملاتِ خارجہ" کا وزیر بھی یہی ہوتا ہی۔

الجزائر میں عربوں کو زیر کرنے کے جو گُر ایجاد کئے گئے تھے، ان سب کو تیونس میں بھی استعمال کیا گیا ۱۸۸۱ء میں جب فرانس کی فوجیں یہاں داخل ہوئیں تو "گوری قوم" کی آبادی ایک ہزار سے بھی کم تھی، لیکن اس کے بعد تیزی کے ساتھ بڑھنی شروع ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء کی مردم شماری میں دو لاکھ ۱۳ ہزار تک پہنچ گئی۔ کُل آبادی ۲۶ لاکھ ہی۔ یعنی یوروپین آبادی، سات آٹھ فی صدی سے زیادہ نہیں۔ لیکن حکومت و اقتدار اسی سات آٹھ فیصدی کے ہاتھ میں ہی۔

فرانس نے تیونس میں مقامی سلطان کو کٹھ پتلی کی طرح باقی رکھ کر آزادی کی تحریک کو دبانے میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ سلطان اور سلطان کے حواریوں نے اپنے ذاتی عیش وعشرت کو باقی رکھنے کے لئے ہر تحریک کو بے رحمانہ سختی کے ساتھ دبا دینے میں فرانس کا پورا پورا ہاتھ بٹایا۔ چنانچہ جو نقشہ ہندوستانی ریاستوں میں نظر آتا ہی۔ اسی کا مظاہرہ تیونس میں بھی ہوتا ہی۔

اصطلاحات کا ڈھونگ

۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو فوجی بھرتی اور فوجی چندے کا کام یہاں بھی بڑے زور شور سے شروع ہوا اور دوسری علاقوں کی طرح یہاں کے باشندوں کو بھی یہ یقین دلایا گیا کہ یہ جنگ قوموں کی آزادی وخود مختاری کو واپس لانے اور

زیردستوں کو زبردستوں سے نجات دلانے کے لئے لڑی جارہی ہے۔ ان اعلانات میں تیونس کو بھی اپنی آزادی یا کم از کم نیم آزادی کے خواب نظر آنے لگے اور فرانس کو جی کھول کر جان و مال سے مدد دی گئی۔ لیکن جب جنگ ختم ہونیکے بعد وہی بے ڈھنگی رفتار باقی رہی تو عوام میں کچھ جھرجھری پیدا ہوئی، مصر میں آزادی کی جو زبردست تحریک اسی زمانے میں سعد زاغلول پاشا کی قیادت میں چل رہی تھی، اس نے بھی کچھ ہمت بندھائی اور تیونس میں شورش و احتجاج کا بازار گرم ہوگیا۔ فرانس نے یہ دیکھا تو سلطان کی گردن دبائی اور یہ دھمکی دی کہ اگر اس ہنگامے کو فوراً ہی ختم نہ کیا گیا تو تمھیں اس برائے نام فرمانروائی سے بھی معزول کردیا جائے گا۔ تاہم چونکہ عربوں کے جذبات بہت بھڑکے ہوئے تھے اور پریزیڈنٹ ولسن کے چودہ نکات ان کی اخلاقی امداد کر رہے تھے، اس لئے کچھ لیپا پوتی کی کوشش کی گئی، جمہوری اصلاحات کو نافذ کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ مگر ۱۹۲۲ء میں یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ نظم ونسق میں عوام کی آواز کو داخل کرنے کے لئے ایک ایسی "مجلس کبیر" بنائی گئی جس کی صدارت کے مستقل فرائض، فرانس کے ریزیڈنٹ جنرل (جو محکمۂ خارجہ کا باختیار وزیر بھی ہوتا ہے) کو حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ اس مجلس کے گیارہ ارکان میں سے آٹھ رکن تو سات فیصدی فرنچ آبادی سے لئے گئے اور تین رکن ۹۳ فی صدی عرب آبادی سے

نظم ونسق تیونس کو الجزائر کی طرح فرانس کا ایک صوبہ تو نہیں قرار دیا گیا، لیکن اس کا نظم ونسق براہِ راست فرنچ وزیر داخلہ کے محکمے سے تعلق رکھتا ہے۔

اس علاقے کو ۱۹ ضلعوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر ضلع کا گورنر، فرانسیسی ہوتا ہے۔ فرانسیسی باشندوں کے معاملات کو طے کرنے کے لئے عدالتیں بھی علیحدہ ہیں

مسلمانوں کے مقدمات کے لئے قاضیوں کا محکمہ قائم ہو مگر ان کے فیصلوں کی اپیل جس عدالت العالیہ کے سامنے ہوتی ہو، وہ صرف فرانسیسی ارکان ہی پر مشتمل ہوتی ہے۔

"شیخ الاسلام" کے ماتحت عشر و زکوٰۃ اور اوقاف و خیرات کی آمدنی سے مسلمانوں کے مدارس و مکاتب چلتے ہیں۔ یونیورسٹی کی قسم کی کوئی اعلیٰ درسگاہ نہیں ہو، تیونس کی جامع مسجد میں جو قدیم مدرسہ قائم ہو، وہی یہاں کا سب سے بڑا اعلیٰ تعلیمی ادارہ ہو، لیکن مصر کے جامعہ ازہر سے اسے کوئی نسبت نہیں

دولت و زرخیزی کے اعتبار سے تیونس اپنا کفیل آپ ہو سکتا ہو۔ ۱۹۴۰ء میں یہاں کا بجٹ ۱۸ لاکھ فرانک (تقریباً پچاس لاکھ روپیہ) تھا۔ زراعتی پیداوار بہت اچھی ہو۔ معدنیات میں فاسفیٹ کا ذخیرہ بہت ہو سیسہ، لوہا اور جست کی کانیں بھی ہیں۔ لیکن ابھی تک یہاں کے معدنی ذخائر سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہو۔ مچھلیوں کی تجارت یہاں کا بیحد نفع بخش کاروبار ہو لیکن اس پر پچاس فیصدی اٹلی والوں کا قبضہ ہو۔

ٹیونس کی بین الاقوامی اہمیت

فرانس کے لئے تیونس کی اہمیت جو کچھ ہو اُس کا اندازہ چیمبرس انسائیکلوپیڈیا کے ان الفاظ سے کیجئے: "فرانس کے تمام مقبوضات میں تیونس بیحد اہم ہو۔ تیونس کی وجہ سے فرانس کو ایک بہت اہم بحری ساحل حاصل ہو۔ جس کے بہت سے محفوظ بندرگاہوں کی بدولت، فرانس کو "شمالی افریقہ کی ملکہ" کا رتبہ مل گیا ہو۔ بحر روم میں تیونس کا محلِ وقوع اتنا اہم ہو کہ جبرالٹر اور مالٹا بھی اس کے آگے درجہ دوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔[1]

---

[1] جلد دہم، صفحہ ۲۵۰

طرابلس (لیبیا)

خفیہ معاہدے

(۱) "......آخر انگلستان اور فرانس نے اندرونی طور پر اٹلی کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا کہ طرابلس پر قبضہ کرنا اطالوی مفاد کے لئے بہت ضروری ہے۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ اگر اٹلی حملہ کر کے طرابلس کو ترکوں سے چھین لے سکتا ہے تو بڑی خوشی سے چھین لے۔ ہم کچھ نہ بولیں گے بشرطیکہ مصر اور مراکش کے معاملے میں اٹلی بھی کچھ نہ بولے۔ یعنی مصر پر انگلستان کو اور مراکش پر فرانس کو قبضہ کر لینے دے......"

یہ الفاظ اٹلی کے مشہور لیڈر جیولیتی (Giolitti) کی خود نوشت سوانح حیات سے ماخوذ ہیں۔[۱] جیولیتی وہ شخص ہے جو ۱۸۸۲ء سے ۱۹۲۱ء تک برابر اٹلی کی سیاست کا روح و رواں رہا اور بار بار وزیر اعظم بنایا گیا۔

(۲) ۱۹۱۲ء میں فرانس نے اٹلی سے خفیہ سمجھوتہ کیا کہ اگر تم مجھے مراکش میں آزاد چھوڑ دو تو میں تمہیں طرابلس میں کھلی چھٹی دیدوں گا۔ بعد میں برطانیہ بھی اس میں شامل ہو گیا کیونکہ اُسے بھی مصر میں اپنے لئے اسی قسم کی آزادی حاصل کرنی تھی۔[۲]

(۳) جب تیونس پر فرانس نے قبضہ کیا تھا تو جرمنی نے اٹلی سے خفیہ معاہدہ کر کے مراکو کو اپنے لئے اور طرابلس کو اٹلی کے لئے مخصوص کرنے کا عہد و پیمان کیا۔[۳]

یہ کسی کی ذاتی رائے نہیں بلکہ اُن خفیہ معاہدوں کے الفاظ ہیں جن کو پہلی جنگ

---

[۱] دیکھو ترجمہ انگریزی از Stores (مطبوعہ لندن ۱۹۲۳ء) صفحہ ۲۵۰

[۲] سیکریٹ ٹریٹیز آف آسٹریا ہنگری۔ ترجمہ انگریزی از کولج۔ جلد اول صفحہ ۹۷

[۳] " جلد دوم صفحہ ۷۹

عظیم کے بعد آسٹریا ہنگری کی مشہور شخصیت پروفیسر پری برام نے ترتیب دے کر شائع کیا اور جس کے نتیجے میں ۱۸۷۹ء سے ۱۹۱۸ء تک کی وہ تمام خفیہ دستاویزیں پہلی بار دنیا کے سامنے آئیں جو ایک قیمتی راز کی طرح سرکاری تہ خانوں میں بند تھیں۔ مگر جن کی نحوست ساری دُنیا کو تہ و بالا کر رہی تھی۔

ان دو تین شہادتوں کو پیش کر دینے کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ ۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے طرابلس پر فوجی یلغار بولی، تو اس کی تہ میں کونسے جذبات کام کر رہے تھے۔ البتہ ظاہر میں اس یلغار کے جو اسباب بتائے گئے اُن میں ایک دلچسپ سبب یہ بھی تھا کہ ایک نوجوان اطالوی لڑکی کو مسلمان بھگا کرلے گئے اور اس سے شادی کر لی۔[۱]

ترکی کی طاقت روز بروز زوال پذیر تھی پھر طرز حکومت اتنا ناقص تھا کہ پایۂ تخت ہی میں انقلاب پسند پیدا ہو رہے تھے۔ ایسی صورت میں طرابلس کے دور دراز صوبے کو اطالوی حملہ آوروں سے بچانا، ترکی کے لئے ناممکن تھا۔ تھوڑی سی معرکہ آرائی کے بعد خلافتِ عثمانیہ کی فوجیں پیچھے ہٹ گئیں۔ لیکن طرابلس کے مقامی باشندوں نے اتنی جلدی ہار نہ مانی۔ وہ اپنی آزادی کے لئے برابر لڑتے رہے لیکن جب ۱۹۱۴ء کی جنگ ختم ہوئی اور لوزان میں اتحادیوں نے ترکی سے معاہدہ کیا تو طرابلس کو سب نے متفقہ طور پر اطالوی مقبوضہ تسلیم کر لیا، مگر طرابلس کے آزادی پسندوں نے اس بین الاقوامی معاہدے کو بھی تسلیم نہ کیا اور اپنی جدوجہد جاری رکھی، طرابلس کی اس جدوجہد میں سنوسی تحریک کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۲۷ء میں اٹلی نے جدید اسلحہ کی تمام طاقت اور دنیا کی طاقتور

---

[۱] انٹرنیشنل انارکی ڈکنن صفحہ ۲۲۹

قوموں کی پوری ہمدردی کے ساتھ اس تحریک کو کچلنے کی مہم شروع کی۔ سنوسی جانبازوں کے پاس یہ دونوں طاقتیں نہ تھیں، تاہم چار سال تک مسلسل وہ مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن آخر کمزور و طاقتور کی یہ کشمکش کب تک چلتی بالآخر ۱۹۳۱ء میں سنوسیوں کو کامل شکست ہو گئی اور ان کے لیڈروں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔

اٹلی کی ہولناک سختیاں

لیکن ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک بیس سال کے دوران میں طرابلس کے جذبۂ آزادی کو کچلنے کے لئے اٹلی کی "قابیلی طاقت" نے جو کچھ کیا، اس کی نوعیت بالکل وہی تھی جو قابیلیت کے پجاریوں کی ہمیشہ سے رہی ہے۔ مصر کے مشہور لیڈر پروفیسر عبدالرحمان عزام ایک مضمون میں لکھتے ہیں" ——— لوگ اسپین کے حالات پر خواہ مخواہ بحث کرتے ہیں اور فضول یہ تحقیق کرتے پھرتے ہیں کہ ہسپانوی حکومت نے مسلمانوں پر کیا کیا مظالم ڈھائے اور یہ کہ قرونِ وسطیٰ میں لوگوں پر کیا بیتی حالانکہ ہماری آنکھوں کے سامنے طرابلس موجود ہے۔ جاؤ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ آؤ کہ آج کے زمانے میں، وہاں جو ظلم ڈھائے جا رہے ہیں، وہ اندلس سے کم نہیں۔"[1]

عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کا قتل عام

ایک انگریزی اخبار کا نامہ نگار، فرانسس ماکو، اس زمانے میں اطالوی افواج کے ساتھ تھا۔ اس نے یہاں کے حالات کی جو رپورٹ اپنے اخبار میں بھیجی اس میں لکھا: "لوگوں کو قتل کرنے، بیمار عورتوں اور بچوں کو سکرات موت کی حالت میں بے یار و مددگار چھوڑ دینے اور اسی قسم کے دوسرے مظالم کی مثال آج سے

۱؎ حاضر العالم الاسلامی۔ جلد دوم صفحہ ۶۵

پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی اور اس لحاظ سے اطالوی فوج کو فوج نہیں کہا جا سکتا، وہ ڈاکوؤں اور قزاقوں کا ایک گروہ ہیں۔"

اسی طرح ایک جرمن نامہ نگار نے لکھا: "دنیا میں آج تک کسی فاتح نے اپنے دشمن کے ساتھ اس قسم کی بے ایمانی و بے رحمی نہیں کی ہوگی جیسی اٹلی نے طرابلس میں کی۔ اٹلی کے فوجی جرنیلوں نے ہر فوجی قانون کی کھلم کھلا توہین کی۔ تمام قیدیوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا، حد یہ ہے کہ اس قتل عام میں ان قیدیوں کو بھی نہ بخشا گیا جو میدانِ جنگ میں نہ پکڑے گئے تھے بلکہ جنھیں گھروں میں گھس گھس کر محض شبہ میں گرفتار کیا گیا تھا اور جن کے خلاف جنگ میں شامل ہونے کا کوئی ثبوت نہ تھا۔"

آسٹریا کا جنگی نامہ نگار تو یہ حالات دیکھ کر اس قدر برافروختہ ہوا کہ اُس نے لکھا: "حقیقت یہ ہے کہ اٹلی نے نہ صرف یورپ کے جنگی اخلاق کی عزت افریقہ میں گرا دی بلکہ پوری دنیائے اسلام کی نظر میں عیسائیت کو بھی ذلیل و رسوا کر ڈالا۔"

اس نامہ نگار نے جو چشم دید واقعات لکھے ہیں، ان میں سے چند یہاں درج کیے جاتے ہیں: "—— ہر روز صبح چھ بجے ہسپتالوں میں پڑے ہوئے زخمی اور بیمار عرب زنجیروں میں جکڑ کر کشاں کشاں لائے جاتے تھے۔ باندھنے کا طریقہ یہ تھا کہ سیدھے ہاتھ اور بائیں پیر کو ایک زنجیر سے جوڑ دیا جاتا تھا۔"

آسٹروی نامہ نگار کے لئے یہ منظر اتنا دردناک تھا کہ وہ اس پر طنز کرتے ہوئے لکھتا ہے "—— سچ ہے! ان زنجیروں کے آپس میں ٹکرانے سے جو نغمہ فضا میں گونجتا تھا، وہ اس تہذیب کے عین مطابق تھا جو اطالیہ کی طرف سے طرابلس کے "غیر مہذب" عربوں میں لے جائی جا رہی تھی۔"

آگے چل کر یہی نامہ نگار لکھتا ہے: "اٹلی کی فوجوں نے شہروں میں گھس کر

غیر فوجی آبادی کے قتل عام کا جو فرمان نافذ کیا، اس میں چودہ سال سے زیادہ عمر کا ہر کس و ناکس موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اٹلی نے رومی بینک کے عقبی شہر کو بالکل جلا ڈالا، اور جو لوگ جان بچا کر بھاگے، انھیں گولیوں کی نذر کر دیا گیا۔ دو ڈاکٹروں نے دھوپ میں پڑے ہوئے کچھ زخمیوں کو ہسپتال لے جانا چاہا تو انھیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ صلیب احمر کے ایک پادری افسر نے کہا: "مرنے بھی دو ان کمبختوں کو"۔ چنانچہ دوسرے دن جب میں اسی جگہ سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں عرب وہیں سسک سسک کر دم توڑ چکے تھے اور ان کی لاشیں اکیلی پڑی ہوئی اپنی مظلومیت کا نوحہ رو رہی تھیں۔ جب میں نے اور میرے ایک جرمن ساتھی نے یہ منظر دیکھا تو ہم اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکے اور بے اختیار رو پڑے"۔

نیز لکھتا ہے: "—— ہم نے دیکھا کہ اطالوی فوجی، شہر میں بندوقیں لئے گھومتے پھرتے تھے اور جو عرب سامنے آجاتا تھا اُسے بیدریغ گولی سے اُڑا دیتے تھے"۔

قابیلی مظالم کے انوکھے طریقے

طرابلس کی مظلوم و محکوم آبادی کو قتل کرنے کے جو طریقے اختیار کئے گئے تھے اُن کا ایک منظر اسی نامہ نگار کی آنکھ سے دیکھئے: "—— ایک روز ہم نے دیکھا کہ کچھ فوجی پانچ عربوں کو گھسیٹے لئے جا رہے ہیں۔ ان عربوں کے دونوں ہاتھ لوہے کی زنجیروں سے پیٹھ کے پیچھے بندھے ہوئے تھے، اتنے میں کچھ چیخوں کی آواز آئی اور قریب کی بیرکوں سے کچھ اطالوی سپاہی نکلے۔ ان کے ساتھ بھی کچھ عرب قیدی تھے۔ پھر ان سب سپاہیوں نے مل کر زنجیروں میں بندھے ہوئے ان مجبور و معذور عربوں کو گولی سے اُڑا دیا۔ اس واقعہ کو دیکھنے کے بعد ہمیں یقین ہو گیا کہ یہاں نہ کوئی قانون ہے، نہ عدالت، نہ کورٹ مارشل۔ کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک

قتل گاہ ہی جو ہر طرف بنی ہوئی ہی"۔

اس نامہ نگار کا اندازہ یہ ہو کہ آخر کے چند دنوں میں اٹلی کی فوج نے چار سو عورتیں او ربچے اور چار ہزار مرد ہلاک کئے۔

اطالوی سپاہیوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے میں بھی بہت بے باک تھے حالانکہ فرعون و نمرود کے زمانے میں بھی بچوں اور عورتوں کو محفوظ رکھا جاتا تھا، لیکن بیسویں صدی کی اطالوی فوج کا عالم یہ تھا کہ نامہ نگار مذکور کے الفاظ میں "—— یہ کمبخت عورتوں کو مارنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے اور جب ان سے کہا جاتا تھا کہ یہ تم نے کیا کیا تو کہتے تھے: "اوہو! ہم سمجھے یہ مرد ہیں"۔

اس سلسلے میں نامہ نگار مذکور کا ایک بیان سنئے:"۔۔۔

دو دردناک مناظر

۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو میں ایک کنویں کے پاس سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان عرب عورت، ایک بچے کو گود میں لئے ہوئے پانی بھرنے کے واسطے آرہی ہی۔ لیکن ابھی یہ بیچاری راستے ہی میں تھی کہ دنادن تین فیروں کی آواز فضا میں گونجی اور اسی کے ساتھ اس عورت کی لاش زمین پر پھڑکنے لگی۔ بچہ چیخیں مار کر ایک طرف کو بھاگا۔ یہ منظر دیکھ کر میں ایک فوجی افسر سے ملا اور کہا کہ تمہارے سپاہیوں نے ابھی ابھی ایک عورت کو قتل کیا ہی۔ مگر میری اس اطلاع پر اس افسر نے مطلق کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ بڑی لاپرواہی سے بولا:" ہاں ہمارے سپاہی پہلی نظر میں یہ امتیاز نہیں کر سکتے کہ یہ مرد ہی یا عورت"۔

نامہ نگار مذکور لکھتا ہی کہ فوجی افسر کے اس جواب کو سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ "اطالویوں کے نزدیک ہر عرب کا خون حلال ہی، چاہے مرد ہو یا عورت"۔

"ایک اور منظر میں نے یہ دیکھا" ـــــ آسٹرڈی نامہ نگار اپنی رپورٹ میں مزید لکھتا ہے ـــــ "پچاس سپاہی چھ عربوں کو لے کر ایک ایسے گندے میدان کی طرف گئے جہاں لوگ قضائے حاجت کرتے ہیں اور پھر ان سب سپاہیوں نے مل کر ان نہتے عرب قیدیوں کو گولیوں سے اُڑا دیا۔ میں اس دردناک منظر کی تاب نہ لا کر بھاگنا چاہتا تھا کہ یکایک سامنے سے پچاس اور عرب، فوجیوں کی نگرانی میں آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان عربوں میں کئی ایک چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ مگر ابھی یہ راستے ہی میں تھے کہ ایک سپاہی پر خدا جانے کیا جنون سوار ہوا کہ اس نے دو عربوں کو ایک گولی سے ہلاک کر دیا اور پھر ان کی لاشوں کو پاؤں سے خوب روندا۔ اس کے بعد باقی عربوں کو آگے لے جا کر گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔"

عرب باشندوں کو مرعوب و دہشت زدہ بنانے کے لئے اٹلی نے کئی دن تک جو قتل عام جاری رکھا، اس کی تفصیل دیتے ہوئے لندن کے مشہور اخبار "ڈیلی کرانیکل" نے لکھا: "تین دن تک اطالوی فوجوں نے شہروں میں قتل عام جاری رکھا، جو عرب نظر پڑتا، گولی سے اڑا دیا جاتا۔ چنانچہ صرف ان تین دن کے اندر چار ہزار عرب موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔"

لاشوں سے دھواں اٹھتا تھا

اس قتل عام کے نتیجے میں شہروں کی حالت جیسی کچھ ہو گئی، اس کی ایک جھلک پیرس کے اخبار "ایکسلسیور" کے نامہ نگار خصوصی کی زبان میں یہ تھی ـــــ "ہم نے جو کچھ دیکھا، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، ہر طرف لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ جگہ جگہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں۔ پھر چونکہ جگہ جگہ آگ بھی لگا دی گئی تھی، اس لئے ان لاشوں

سے اس طرح دھواں اٹھتا تھا جیسے کسی زمانے میں قربانگاہوں کے آگے سے اٹھا کرتا ہوگا۔ میں نے سو کی تعداد میں ایسی لاشیں دیکھیں جن کے حلیے بگڑ چکے تھے۔ اس سے بھی زیادہ ایک دردناک منظر میں نے یہ دیکھا کہ ایک خاندان کے بچے بوڑھے اپنے گھر میں خاموش بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ یکایک کچھ اطالوی فوجی قریب سے گزرے اور فوراً ہی ان غریبوں کو گولیوں کی خوراک بنا دیا۔"

ان چشمدید شہادتوں کو بیان کرنے کے بعد نامہ نگار مذکور لکھتا ہے: "حقیقت یہ ہے کہ اطالویوں نے طرابلس میں وہ وہ مظالم ڈھائے، کہ معلوم ہوتا ہے اُن سے عقل اور انسانیت بالکل مفقود ہو گئی تھی"۔[1]

عورتوں کو ننگا کر کے پھانسی پر لٹکایا گیا

واقف کاروں نے اندازہ لگایا ہے کہ طرابلس میں اطالویوں کے نزول کے بعد بیس ہزار کے قریب آدمیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا جن میں سے اکثر کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا، صرف کمانڈر کا حکم ہی کافی سمجھا گیا، بہت سے واقعات ایسے ہوئے کہ عورتوں کے کپڑے اتار کر کئی دن تک بالکل ننگا رکھا گیا اور پھر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اسی طرح ظلم و ستم کی نئی نئی شکلیں اختیار کی گئیں۔ مثلاً ساٹھ ستر آدمیوں کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ بے رحمی سے، ایک زنجیر میں

---

[1] مذکورہ بالا تمام اقتباسات زعیم العرب امیر شکیب ارسلان کی تصنیف "حاضر العالم الاسلامی" (جلد دوم) سے ماخوذ ہیں۔ (از صفحہ ۷۴ تا صفحہ ۸۵) اٹلی کے مظالم پر تفصیلی اور محققانہ کتاب "الفظائع السود الاحمر" ہے اس کے علاوہ "فظائع الطلیان فی طرابلس الغرب" بھی اس موضوع پر بہت اچھی کتاب ہے، حقیقت یہ ہے کہ طرابلس میں اطالویوں کے ظلم و ستم کی داستان اتنی دردناک ہے کہ قصے کہانیوں کے مظالم کی داستانیں بھی اس کے آگے ہیچ ہیں۔ "ب"

باندھ دیا گیا اور پھر ان کو اسی حالت میں کسی ویران جگہ چھوڑ دیا گیا تاکہ بھوک پیاس کی تکلیف سے بلک بلک کر مر جائیں۔ بعض دفعہ یہ کیا گیا کہ کئی کئی آدمیوں کو ایک ساتھ باندھ کر پہاڑ کی ڈھلان سے سمندر کی طرف لڑھکا دیا گیا۔ غرض سینکڑوں ایسے مظالم کئے گئے جن کے آگے فرعون کے وہ روایتی مظالم بھی ہیچ ہیں جو بنی اسرائیل پر توڑے جاتے تھے۔[1]

خانماں برباد مخلوق کے غول

شمال کے ساحلی علاقے برقہ (سائرینے کا) کی سرزمین چونکہ بہت سرسبز و شاداب تھی، اس لئے جس طرح فرانس نے شمالی الجزائر کو فرانس کا صوبہ بنا رکھا ہے، اسی طرح اٹلی نے طرابلس کے اس حصے کو اٹلی میں ضم کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اسی مقصد کے لئے مقامی آبادی کو زمینوں، مکانوں اور جائدادوں سے بے دخل کر کے ان کی جگہ اٹلی والوں کو بسانے کی اسکیم بنائی گئی۔ اس اسکیم میں کچھ زیادہ چکر سے کام لینے کی ضرورت نہ تھی۔ کھلے طور پر عربوں کی اراضی پر قبضہ کر لیا گیا اور انھیں جنوب کے ریگستانی مقامات کی طرف ڈھکیل دیا گیا۔ اس مقصد کے لئے اسی ہزار مردوں، عورتوں اور بچوں کو صحرائے سرت میں بود و باش اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ لیکن اس انتقال مکانی کے لئے کسی قسم کی کوئی سہولت فراہم نہ کی گئی حتے کہ سواری کا انتظام بھی نہ تھا۔ خدا کی بے شمار مخلوق اپنے سروں اور کندھوں پر بوجھ لادے ہوئے اپنے گھر بار کو چھوڑ کر پیدل صحرائے سرت کی طرف بھیج دی گئی جو برقہ سے مسلسل دس دن کی مسافت ہے۔ پھر یہاں پہنچنے کے بعد نہ پینے کو پانی نہ کھانے کو غذا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر لوگ بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر

---

[1] حاضر العالم الاسلامی۔ جلد دوم صفحہ ۶۶

گئے۔ ان کے ساتھ جو تھوڑے بہت مویشی تھے۔ ان کا بھی یہی حشر ہوا۔ طرابلس کی مظلومیت کا یہ منظر اتنا دردناک تھا کہ اٹلی کے سخت سنسر کے باوجود جب اس کی خبریں بلادِ اسلامیہ میں پہنچیں تو ایک کہرام مچ گیا۔ دنیا کی اس رائے عامہ سے متاثر ہو کر اٹلی کی "مہربان" حکومت نے یہ طے کیا کہ برقہ کے جو خاندان اپنی اراضی سے بیدخل کر دیئے گئے ہیں لیکن جنھیں کوئی نئی جگہ نہیں مل سکی ہے۔ ان کی گذر بسر کیلئے دو فرانک (تقریباً سوا روپیہ) یومیہ دیا جائے گا۔ لیکن یہ رقم اتنی ناکافی تھی کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے خاندان کی ضروریات کو بھی پورا نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے شور و غوغا کو روکنے کی دوسری تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ نوجوان لڑکوں سے لے کر پینتالیس سال کی عمر تک کے ادھیڑ لوگوں کو فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ اس سے کم عمر کے جو بچے تھے ان میں چار سال سے بارہ سال تک کے بچوں کو جبراً والدین کی آغوش سے جدا کر کے اٹلی بھیج دیا گیا تاکہ عیسائی عقائد کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت کی جائے اور اس طرح نئی نسل کے دل و دماغ سے بغاوت و انقلاب کے جذبات کو فنا کر دیا جائے لیکن جب اس کارروائی کے خلاف دنیائے اسلام میں شور بپا ہوا تو اٹلی نے بہت واضح اعلانات کر کے دنیا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم نے ان بچوں کو صرف اس لئے اٹلی بھیجا ہے تاکہ طرابلس کی باغیانہ تحریک کے لیڈر عمر مختار کے فاسد اثرات سے ان کے دماغ کو محفوظ رکھ سکیں لیکن اٹلی کی یہ دلیل بہت کم لوگوں کو مطمئن کر سکی کیونکہ اس سے بہت پہلے عمر مختار کی پناہ گاہوں پر قبضہ کر کے ایک جم غفیر کے سامنے اُسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا اور عمر مختار کی سنوسی تحریک کا کوئی نام و نشان طرابلس میں باقی نہ رہا تھا۔

لیکن تمام تدبیروں کے باوجود اُن لوگوں کی تعداد بہت کافی تھی جو برقہ کی خوشگوار سرزمینوں سے صرف اس لئے جلاوطن کر دیئے گئے تھے تاکہ وہاں اطالوی

لاکر بسائے جائیں۔ ان لوگوں کے غول کے غول خانہ بدوش قبائل کی طرح جنگلوں اور بیابانوں میں آوارہ پھر رہے تھے اور جگہ جگہ ان کی لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں۔ ہزاروں آدمی مصر اور تیونس کی سرحدوں کو پار کرکے محنت مزدوری یا صدقہ و خیرات پر زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اٹلی کے مظالم کی داستان دنیا سے چھپائے نہ چھپ سکی، اور آخر بیرونی پروپگنڈے سے متاثر ہوکر یہ اعلان ہوا کہ اگر یہ لوگ چاہیں تو اپنی زمینوں میں واپس آ سکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ واپس گئے انھیں صرف کھیتوں میں مزدور بنانے کا کام دیا گیا۔ زمینوں پر قبضہ دینے سے انکار کر دیا گیا، کہا گیا کہ جو زمینیں بحق سرکار ضبط کی جا چکی ہیں، ان کی واپسی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اٹلی کے ان مظالم کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے جو اعلانات ہوتے تھے، ان میں سب سے زیادہ زور اس پر دیا جاتا تھا کہ ہم طرابلس پر ظلم نہیں کر رہے ہیں، ہم انھیں تہذیب سکھا رہے ہیں ——— گویا تہذیب سکھانے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ خدا کی مخلوق کو بستیوں اور کھیتوں سے نکال کر بنجر زمینوں اور چٹیل میدانوں میں بھوکا پیاسا چھوڑ دیا جائے۔

اٹلی کی اس غارت گری سے پہلے طرابلس کی آبادی پندرہ لاکھ تھی۔ لیکن بعد میں صرف سات لاکھ رہ گئی۔[1]

سنوسی تحریک طرابلس میں تحریک آزادی کو زندہ رکھنے کا سہرا سنوسی جماعت کے سر ہے۔ یہ جماعت انیسویں صدی کے نصف اول میں قائم ہوئی، اس کے اصول مختصراً یہ تھے کہ سنت و شریعت پر بغیر کسی کوتاہی اور بغیر

---

[1] حاضر العالم الاسلامی۔ جلد دوم صفحہ ۲۸ ؛ مذکورہ بالا تفصیلات کا ماخذ بھی یہی ہے۔

کسی شرط کے عمل کیا جائے۔ اس جماعت کے بانی سید محمد بن علی تھے جو اٹھارویں صدی کے آخر میں الجزائر کے ایک قصبے سنوس میں پیدا ہوئے لیکن جب الجزائر پر فرانس کی گرفت بڑھنے لگی تو وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں گھومنے کے بعد، آخر طرابلس کو اپنے قیام کے لئے منتخب کیا اور یہیں اپنی تحریک کی بنیاد رکھی جس کا آغاز ۱۸۳۱ء کے بعد سے ہوتا ہے۔

سنوسی کے کام کا طریقہ یہ تھا کہ عوام کی اصلاح کے لئے ایک "تربیت گاہ" قائم کی جاتی تھی جو صوفیوں کی خانقاہ، پروفیسروں کی یونیورسٹی اور انقلاب پسندوں کی جمعیتہ کے بین بین ایک ادارہ ہوتا تھا، یہ تربیت گاہیں قوم میں اتنی مقبول ہوئیں کہ چند ہی سال میں ان کا سلسلہ مصر و سودان اور حجاز تک پھیل گیا۔ اور طرابلس میں تو کوئی شہر اور کوئی قصبہ ان سے خالی نہ رہا۔ یہ تربیت گاہیں شہر سے ذرا فاصلے پر ایک وسیع میدان میں قائم کی جاتی تھیں اور ان میں ہر شخص کو اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی طرف مائل کیا جاتا تھا۔ عبادت کے علاوہ مذہبی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور فنِ حرب کی تعلیم پر بھی خاص زور دیا جاتا تھا۔ ظاہر و باطن کو ایک رکھنا اور ہر انسان کو بلا امتیاز عقیدہ و مذہب اپنا بھائی سمجھنا اس تحریک کا بنیادی اصول تھا۔ یہ لوگ یورپ کے اقتدار کے بیحد مخالف تھے لیکن ویسے زندگی میں عیسائیوں اور یہودیوں سے محبت کرنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہفتے میں ایک دن اس مقصد کے لئے مخصوص ہوتا تھا کہ ہر شخص ہر کام اپنے ہاتھ سے کرے تاکہ محنت مزدوری کو حقیر سمجھنے کا جذبہ ختم ہو اور جفاکشی کی عادت پیدا ہو۔

اس تحریک کے بانی محمد ابن علی ۱۸۶۰ء میں انتقال کر گئے لیکن تحریک کی بنیادیں اتنی مضبوط ہو چکی تھیں کہ لوگوں نے کام کو جاری رکھنے کے لئے ان کا جانشین منتخب کر لیا۔ ۱۹۰۲ء میں جب اس جانشین نے بھی کوچ کیا تو تیسرے جانشین کا انتخاب

کیا گیا۔

سنوسی تحریک کے اثرات

انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل تک مراکش سے لے کر مصر و سوڈان تک جتنی تحریکیں اٹھیں، وہ سب سنوسی رہنمائی کا یا تو براہِ راست نتیجہ تھیں یا اس سے بے اندازہ طور پر متاثر تھیں۔ مراکش میں فرانس و اسپین کے خلاف، الجزائر و تیونس میں فرانس کے خلاف، طرابلس میں اٹلی کے خلاف اور مصر و سوڈان میں برطانیہ کیخلاف سنوسی رہنما سراپا بغاوت بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں جب اٹلی کی فوجیں طرابلس میں داخل ہوئیں، تو یہی تحریک تھی جس نے فاتحوں کو اپنی من مانی کارروائیاں کرنے سے بہت بڑی حد تک باز رکھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر سنوسی تحریک نہ ہوتی تو اسلامی افریقہ پر انیسویں صدی ہی میں یورپ کا قبضہ ہو چکا ہوتا۔

۱۹۱۴ء کی جنگ میں سنوسیوں نے جنگ کر کے تقریباً پوری طرابلس کو اٹلی سے چھین لیا تھا۔ اس کے بعد ان کی فوجیں مصر کی طرف بڑھیں اور برطانوی فوجوں سے ٹکر لینی شروع کی۔ لیکن جدید اسلحے کے نہ ہونے کی وجہ سے کامیابی نہ ہو سکی۔ مگر طرابلس پر ان کا قبضہ تھا۔ لیکن جب ۱۹۲۳ء میں لوزان کانفرنس میں تمام اقوام نے طرابلس کو اٹلی کا جائز مقبوضہ تسلیم کر لیا تو مسولینی نے ایک لشکر جرار تیار کر کے سنوسی اثرات کو کچل ڈالنے کی مہم شروع کی۔ مگر عربوں نے بڑا کامیاب مقابلہ کیا۔ اطالوی فوجیں آج جس علاقے پر قبضہ کرتی تھیں، کل وہ اُن سے چھن جاتا تھا۔ یہ مد و جزر تین چار سال تک جاری رہا۔ اٹلی نے یہ دیکھ کر سنوسیوں کے خلاف یورپ میں سخت پروپیگنڈا کیا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ سنوسی تحریک دراصل دنیا سے عیسائیت کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ ان لوگوں کو جاہل، غیر مہذب، جنونی، وحشی اور سفاک و سنگ دل مشہور کیا گیا۔ اس پروپیگنڈے کو مقبول کرنے کے لئے برطانیہ و فرانس کے

دماغ بالکل تیار ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے اس میں مدد دی کیونکہ تیونس و الجزائر میں فرانس کو اور مصر و سوڈان میں برطانیہ کو بھی سنوسی انقلاب پسندوں سے سخت خطرہ لگا رہتا تھا۔ غرض ۱۹۲۷ء میں اٹلی نے اپنے ان حلیفوں کی درپردہ امداد سے طرابلس کے باشندوں پر جدید اسلحہ کی تمام طاقت پوری بے دردی کے ساتھ صرف کر دینے کا بیڑہ اٹھا لیا۔

—— اور اس کا خاتمہ

اطالوی فوجوں کی ہولناک سختیوں کے باوجود سنوسی لیڈروں کی حمایت میں طرابلس کے باشندے چار سال تک مسولینی کی فسطائی طاقت کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اٹلی کو تو یورپ کے تمام جنگی کارخانے بے تحاشا ہتھیار بھی بیچ رہے تھے اور تمام بڑے بڑے بینک اُسے قرضوں پر قرضے بھی دے رہے تھے، لیکن اس کے مقابلے میں سنوسیوں کو اس قسم کی کوئی امداد کسی طرف سے میسر نہ تھی، اوّل تو یورپ کے کارخانوں سے انھیں اسلحہ ملتے ہی نہ تھے اور اگر ملتے بھی تھے تو روپیہ ان کے پاس نہ تھا۔ ان مجبوریوں کا قدرتی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ اطالوی فوجیں ہر محاذ پر سنوسیوں کو شکست دیتی چلی جائیں۔ آخر ۱۳ر جنوری ۱۹۳۱ء کو اس تحریک کے مرکزی مقام کفرہ میں اطالوی فوج اُتر پڑی اور صرف جدید ہتھیاروں کی وجہ سے شہر پر قبضہ کر لیا گیا۔

اس قبضے کے بعد اس فوج نے جو کچھ کیا، اس کی تفصیل امیر شکیب ارسلان کے الفاظ میں سُنیے:

علمائے اسلام کے ساتھ اٹلی کا سلوک

"تین دن تک قتل عام جاری رہا۔ جو سامنے آیا، گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ وہ بوڑھے لوگ بھی چن چن کر قتل کئے گئے جو حجروں اور خانقاہوں سے باہر نکلنا بھی نہ

جاتے تھے۔ کسی کے خلاف کوئی مقدمہ چلانے کا سوال نہ تھا۔ ہر شخص کی جان صرف سپاہیوں کے رحم و کرم پر موقوف تھی۔ یہ اطالوی سپاہی کھیتوں اور باغوں میں گھس جاتے تھے اور فصلوں کو تباہ کر دیتے تھے۔ بوڑھے، بچے اور عورتیں، کوئی ان کے ظلم سے امان نہ پا سکتا تھا۔ شیخ مختار الغذاسی ایک بہت بڑے بزرگ تھے جن کی عمر ۹۳ سال کے قریب تھی اور بہت با عزت علماء میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن ان کے بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود ان کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا کہ ایک اونٹ پر بٹھا کر رسّیوں سے باندھ دیا گیا اور پھر اس اونٹ کو جنگل کی طرف بھگا دیا گیا۔ جس سے آپ راستے میں جاں بحق تسلیم ہو گئے۔"

عورتوں کی بیدریغ عصمت دری

یہ فوجی جہاں جاتے تھے عورتوں پر پل پڑتے تھے ان کی عصمت ریزی کرتے تھے اور جو عورتیں مزاحمت کرتی تھیں، انھیں موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ چنانچہ دو سو کے قریب شریف عورتیں اطالوی فوج کی ان وحشیانہ حرکتوں کو سن کر جنگلوں میں بھاگ گئیں۔ لیکن جب ان فوجیوں کو یہ معلوم ہوا تو یہ ظالم ان کے پیچھے دوڑے اور انھیں پکڑ کر لے آئے۔ پھر انھیں فوجیوں کے کیمپوں میں وحشیانہ زندگی کے ساتھ عصمت و عفت کی بربادی کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ یہ طرابلس کے ان شریف گھرانوں کی عورتیں تھیں جن کو کبھی آفتاب نے بھی بے پردہ نہ دیکھا تھا۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اطالوی اخباروں نے ان وحشیانہ افعال کا ذکر بڑے فخر سے کیا اور موٹے موٹے حروف میں یہ سرخیاں قائم کیں: "فوج نے طرابلسی لیڈروں کی دو سو عورتوں کو گرفتار کر لیا۔"

امیر شکیب ارسلان کہتے ہیں کہ "اطالوی اخباروں کی یہ سرخیاں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔"

"شہر کے جن ذمے دار لوگوں نے ان شریف خواتین کی عصمت ریزی پر اٹلی کے افسروں کو توجہ دلائی" ——— امیر موصوف لکھتے ہیں ——— "انھیں قتل کر دیا گیا۔ پھر جب اس پر عالم اسلامی میں شور مچا تو اعلان کیا گیا کہ ان عورتوں کو پکڑ کر ہم نے ان پر بڑا رحم کیا ہے، تاکہ انھیں جنگلوں میں بے آب و دانہ پھرنے کے بجائے ان کے گھر میں امن وسکون سے واپس لوٹا لائیں"۔

"کفرہ میں جو سنوسیہ خانقاہ تھی اور جہاں مذہبی عبادت کے فرائض سر انجام دیئے جاتے تھے، وہاں بھی فوجی گھس گئے اور بے عزتی کرنے کے لئے شراب کے قرابے بھر بھر کر فرش پر لنڈھائے گئے، دینی کتابوں کو شراب میں تر کیا گیا۔ قرآن مجید کی جلدوں کو اٹھا اٹھا کر زمین پر ٹپکا گیا اور پاؤں سے مسلا گیا"۔

"پھر سولہ بڑے بڑے علماء کو چن کر ہوائی جہازوں میں بٹھایا گیا اور بلندی پر پہنچ کر ان میں سے ایک ایک کو نیچے پھینکا گیا، جب یہ علماء نیچے گرتے تھے تو اطالوی فوجیں خوشی سے تالیاں بجاتی تھیں اور چیخ چیخ کر عربوں سے کہتی تھیں ——— وہ دیکھو تمہارا جنگلی نبی محمد آ رہا ہے جس نے تم کو جہاد کا حکم دیا تھا اور تمہیں ہمارے چنگل سے نجات دلانا چاہتا تھا"۔

مظلومیت کے آخری مناظر سنوسی تحریک کا یہ صدر مقام، کفرہ بیحد زرخیز و خوشگوار علاقہ ہے۔ اس لئے اٹلی نے یہاں اپنے آدمیوں کو لاکر بسانے کا فیصلہ کیا چنانچہ (۱) خام زمینیں، باغ اور کھیت ضبط کر لئے گئے اور سب پر اطالوی نوواردوں کو قبضہ دلا کر اصلی مالکوں کو نکال دیا گیا (۲)، اس طرح صرف جبل اخضر کے اسّی ہزار آدمی اپنی آبائی جائداد سے محروم ہو کر خانماں برباد ہو گئے اور انھیں صحرائے سرت میں جانے کا حکم ہوا جو جبل اخضر سے ۱۵ یوم کی مسافت ہے اور جہاں کھانے پینے کا کوئی سامان

نہ تھا جس کی وجہ سے آدھے سے زیادہ لوگ مر گئے۔ (۳) سو کے قریب سنوسی خانقاہیں ضبط کی گئیں اور ان کے ساتھ جو بڑے بڑے اوقاف تھے ان کو بھی غصب کیا گیا اور پھر یہ ساری دولت اطالوی نوآبادکاروں کے حوالے کردی گئی

دنیائے اسلام کی بے چینی

جب یہ خبریں شام و فلسطین وغیرہ پہنچیں ——— شکیب ارسلاں لکھتے ہیں ——— "تو عالم اسلامی تڑپ اٹھا اور بڑے بڑے احتجاجی جلسے ہر جگہ ہوئے اور جرائد و اخبارات نے مسولینی کے خلاف ایک شور مچا دیا، رفتہ رفتہ یہ آواز ہندوستان اور جاوا تک پہنچ گئی اور وہاں سے بھی احتجاج کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ یہ دیکھ کر اٹلی کے سفارت خانوں نے ہر جگہ ان کی تردیدیں کرنی شروع کیں اور لوگوں کو یقین دلانے کے لئے یہاں تک کیا گیا کہ جس کا جی چاہے خود جا کر دیکھ آئے کہ یہ واقعات جھوٹے ہیں لیکن یہ پیشکش محض برائے نام تھی ورنہ نہ تو طرابلس جانے والوں کو پاسپورٹ دیا جاتا تھا اور نہ وہاں سے آنے والوں کو۔"

"اٹلی نے عالم اسلام کو مطمئن کرنے کے لئے یہ اعلان بھی کیا کہ ان مظالم کی تحقیقات کے لئے ایک شاہی کمیشن، طرابلس بھیجا گیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی بالکل غلط تھی۔ کمیشن بھیجنا تو درکنار، کمیشن بھیجنے کے سوال پر غور بھی کبھی نہ کیا گیا۔ اس جھوٹ کا مقصد صرف یہ تھا کہ دنیا میں اٹلی کے مظالم کے خلاف جو شور مچ رہا ہے اسے کم کیا جائے۔"

"اٹلی کے ان مظالم کا نتیجہ یہ ہوا کہ قتل، جلا وطنی، قید و بند، ضبطی جائداد اور زمینوں سے بے دخلی وغیرہ کی وجہ سے دو تین لاکھ آدمی خانہ برباد ہو گئے ان میں سے بیس ہزار کے قریب نے تونس و الجزائر میں پناہ لی، ساٹھ ہزار کے لگ بھگ مصر میں داخل ہوئے۔ کچھ جنگلوں اور بیابانوں میں نکل گئے۔"

طرابلس کے قسطائی فاتحوں کے مظالم کی ان تفصیلات کو بیان کرنے کے بعد امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں: "ان کثیر التعداد لوگوں کا گھر بار چھوڑ کر خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرنا ہی، اس بات کا واضح ثبوت ہی کہ اٹلی کے مظالم کی نوعیت بالکل ناقابلِ برداشت تھی۔ ورنہ اپنا گھر چھوڑنے پر کون آمادہ ہوتا ہی"۔

پھر یہ ظلم صرف آدمیوں ہی پر نہیں ہوا بلکہ مسجدیں، خانقاہیں اور عبادت گاہیں بھی بے دریغ توڑ دی گئیں۔

مظالم کی ذمے داری صرف اٹلی ہی پر نہیں ہی

طرابلس میں اطالوی مظالم کی داستان بہت لمبی ہی لیکن اوپر کی سطور میں جو چند واقعات پیش کر دیئے گئے ہیں، وہ اصل تصویر کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہیں —— سوال یہ ہی کہ بیسویں صدی کے "مہذب" زمانے میں ان مظالم کو ساری دنیا خاموشی کے ساتھ بیٹھی کیوں دیکھتی رہی؟ یورپ کے اخبارات کے جو اقتباسات اوپر نقل کئے گئے ہیں، اُن سے صاف ظاہر ہی کہ وہ لوگ اصل حالات سے بے خبر نہ تھے۔ پھر اس کی اجازت کیوں دی گئی؟ اس کا جواب کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ "لندن ٹائمز" کے نامہ نگار نے اسی زمانے میں لکھا تھا"——

ہم کو یہ بھول نہ جانا چاہیئے کہ طرابلس پر اٹلی کی یہ لوٹ مار، محض اس سمجھوتے کا نتیجہ ہی جس کی رو سے یہ طے کیا گیا ہی کہ طرابلس پر اٹلی قابض ہو جائے اور مصر و مراکش پر انگلستان و فرانس چھا جائیں[۵]"۔

اٹلی کے مال کا بائیکاٹ

ان سازشوں کی وجہ سے دنیائے یورپ تو اٹلی کے ان مظالم پر خاموش رہی، لیکن دنیائے

---

[۵] بحوالہ حاضر العالم الاسلامی۔ جلد دوم صفحہ ۶۸

اسلام میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ مگر چونکہ یہ دنیا کمزوروں کی دنیا تھی، اس لئے اٹلی نے اسے کبھی توجہ کے قابل نہ سمجھا، مگر جب اطالوی مال کے بائیکاٹ کی تحریک مصر سے لے کر جاوا تک پھیل گئی اور اطالوی کارخانوں پر براہِ راست کاری ضرب پڑنی شروع ہوئی تو اٹلی کو مسلم رائے عامہ کی مخالفت کا احساس ہوا اور پروپیگنڈے کے فن کو پوری طاقت سے استعمال کرکے تمام ناگوار واقعات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ طرابلس کے چند جی حضوری قسم کے بوڑھے آدمیوں کو کرایہ دے کر بلادِ اسلامیہ میں بھیجا گیا اور ان سے کہلوایا گیا کہ ہمیں اٹلی سے کوئی شکایت نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی کہ لاکھوں انسانوں کی جو بھیڑ اپنی زمینوں سے بے دخل ہوکر آوارہ پھر رہی تھی، اُسے واپس بلا لیا جائے۔ لیکن جو لوگ واپس گئے، انھیں زمینیں واپس نہ کی گئیں، البتہ "گورے آقاؤں" کی ماتحتی میں زمینوں پر محنت مزدوری کرنے کا موقعہ عطا کیا گیا۔

طرابلس میں اطالوی باشندوں کو بسانے کی وجہ بظاہر یہ بتائی گئی کہ اٹلی کی آبادی اتنی بڑھ رہی ہے کہ اب وہاں اس کی سمائی ممکن نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ بات محض نمائشی تھی، اٹلی کی آبادی یقیناً بڑھ رہی تھی لیکن اگر صرف یہی وجہ ہوتی تو طرابلس پر حملہ کئے بغیر بھی اطالوی آبادی کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اٹلی کے ایک سابق وزیر اعظم نے اپنی ایک تصنیف میں صاف لکھا ہے کہ: "یہ غلط ہے کہ ہم محض اقتصادی مشکلات کی وجہ سے نئے ممالک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ فتوحات کے میدان میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں اور کسی سے گھٹ کر نہ رہیں۔"[۵]

---

[۵] بحوالہ حاضر العالم الاسلامی۔ جلد دوم صفحہ ۶۶

سیاسی نظم و نسق

طرابلس پر قبضہ کر لینے کے بعد مسولینی نے اسی نمونے کی تقلید کی جو فرانس نے الجزائر میں اختیار کر رکھا تھا، یعنی جنوب کے ریگستانی علاقے کو چھوڑ کر باقی سارا زرخیز علاقہ، اٹلی کا صوبہ بنا دیا گیا۔ اطالوی باشندوں کے علاوہ باقی سب پر مارشل لا کی فوجی حکومت قائم کی گئی۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے چار سال بعد اتحادی فوجوں نے اس پر قبضہ کر لیا پھر جو کچھ ہوا، وہ اُس باب کا موضوع ہے جس میں دوسری جنگِ عظیم کے اسباب و نتائج پر بحث کی گئی ہے۔

دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کی رو سے آبادی ۹ لاکھ ہے جس میں آٹھ لاکھ عرب ہیں۔ اور عربی زبان بولتے ہیں لیکن اٹلی کے اقتدار کی وجہ سے سرکاری زبان اطالوی کو قرار دیا گیا ہے۔

طرابلس اپنی قدرتی دولت کے لحاظ سے بہت مالدار ملک ہے، لیکن جس ملک کی سیاسی حالت وہ ہو جو اوپر بیان کی گئی، وہاں اس دولت سے فائدہ اٹھانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[۱]

مراکش (مغرب الاقصیٰ)

کل اور آج

مراکش آج ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کا برائے نام سلطان فرانس اور اسپین کے اشاروں پر رقص کرتا ہے۔ لیکن پچھلی صدیوں

---

[۱] اس باب کی تیاری میں زیادہ تر امداد حاضر العالم الاسلامی سے لی گئی ہے لیکن اس کے علاوہ حسب ذیل کتابیں بھی پیش نظر رہی ہیں (۱) ٹری پولی تانیا از کیسری (۲) مسٹریز آف دی لبیان ڈیزرٹ از کنگ (۳) اٹلی ان نارتھ افریقہ از میک کلیورد (۴) فورتھ شور از مور (۵) میجک گیٹ آف صحرا از کیمولی (۶) ہارٹ آف لبیا از بمین

میں اس نے تاریخ کے بڑے بڑے شاندار دور دیکھے ہیں۔ پندرھویں صدی عیسوی تک اس کا پرچم اقبال افریقہ کے جنوب مشرقی اور شمالی ساحل سے لے کر اسپین و پرتگال کے میدانوں تک لہرا رہا تھا، یورپ انھیں مور قوم کے نام سے پکارتا تھا اور اسی نسبت سے اس علاقے کو مراکو کا نام دیا گیا تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اسپین کی اسلامی حکومت تباہ ہوگئی۔ لیکن شمالی افریقہ میں مور خاندان کی دھاک انیسویں صدی کے اوائل تک بیٹھی رہی۔ اسلام یہاں پہلی صدی ہجری ہی میں پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد عرب یہاں آکر بسنے شروع ہوئے اور آبادی میں اس طرح گھل مل گئے کہ رنگ و نسل، زبان و معاشرت اور مذہب و عقیدے کا کوئی اختلاف باقی نہ رہا مصر و عراق کی طرح سارے ملک کی زبان عربی ہوگئی اور سارے باشندوں کا مذہب اسلام بن گیا۔ جب تک بغداد میں عباسی خلافت قائم رہی، یہاں کے سلاطین، خلیفۃ المسلمین کے ماتحت رہے۔ لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹ گیا اور ترکی خلافت سے اس کا کوئی خاص تعلق نہ رہا۔ المرابطین کے لقب سے جس خاندان نے یہاں حکومت کی، اس کے پہلے بادشاہ سلطان یوسف نے مراکش کے نام سے ایک شہر کی بنیاد ڈالی جو آج تک افریقہ کا ایک اہم ترین شہر ہے اور جس کے نام پر پورے ملک کو موسوم کیا جاتا ہے لیکن عربوں میں اس ملک کا زیادہ مشہور نام مغرب اقصیٰ ہے۔ آج کل یہاں سلطان سید محمد حکمراں ہے جو اپنے شجرۂ نسب کے لحاظ سے اٹھارویں پشت میں حضرت علی سے آبائی نسبت رکھنے کا مدعی ہے۔

یورپ کی سیاست میں مراکش کی اہمیت

اسپین میں اسلامی سلطنت کی تباہی نے مراکش میں بھی سیاسی ابتری پھیلادی تھی اور سوا سو سال تک خانہ جنگیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جگہ جگہ نئے نئے حوصلہ مند افراد اپنی حکومت کا جھنڈا لہرا رہے تھے اور ملک بیسیوں ٹکڑوں میں

بٹا ہوا تھا۔ لیکن سترھویں صدی عیسوی کے آخر میں مولائی اسمٰعیل کی زبردست شخصیت نے ان اختلافات پر ایک کاری ضرب لگائی اور سیاسی انتشار وابتری کی فضا کو ختم کیا یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں صنعتی انقلاب کے نام سے ایک نئی طاقت اُبھر رہی تھی جس سے افریقہ وایشیا کی دوسری اقوام کی طرح مور بھی ناواقف رہے، رفتہ رفتہ یورپ کی قوموں کے مقابلے میں مراکش کی حکومت کمزور ہوتی چلی گئی اور آخر وہ وقت آیا کہ ہر طرف سے اس پر حریصانہ نظریں پڑنی شروع ہو گئیں۔ فرانس چونکہ الجزائر وتیونس پر قابض ہو چکا تھا، اس لئے وہ مراکش کو اپنا حق شفع سمجھتا تھا، مگر برطانیہ، جرمنی اسپین اور اٹلی بھلا فرانس کی اس جوع الارضی کو خاموشی سے کیسے دیکھ سکتے۔ چنانچہ ——— انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر ۱۹۱۴ء کی جنگ تک یورپ کی سیاست میں مراکش، بے شمار پیچیدگیوں، تلخیوں اور رقابتوں کا سبب بنا رہا مراکش اپنے محل وقوع کی وجہ سے ایک طرف تو بحر روم کے پھاٹک پر قبضہ رکھتا ہے اور دوسری طرف بحر اوقیانوس کی لہریں بھی اس کے مغربی ساحل سے ٹکراتی ہیں اس لئے امریکہ، افریقہ اور ایشیا کی تجارتی شاہراہ کا یہ نکڑ قدرتاً یورپ کی حکومتوں کے درمیان زبردست رشک ورقابت کا موضوع گیا۔[۱]

اس رقابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ——— بیسویں صدی کے اوائل میں اسپین اٹلی، انگلستان اور فرانس کے درمیان جو خفیہ معاہدے ہوئے ان سب میں بظاہر اس امر پر زور دیا گیا کہ سلطانِ مراکش کی آزادی کو برقرار رکھا جائے گا۔ لیکن نجی طور پر اس کے معاشی مفاد میں حصے بخرے کر ناطے کر لیا تھا اور ہر ایک نے اپنا اپنا "حلقۂ اثر" بھی مقرر کر رکھا تھا۔ سوال صرف موقعہ کا تھا۔ برطانیہ نے اس سازش

لہ انٹرنیشنل انارکی ڈکنسن، صفحہ ۱۱۸ - ۱۱۹

ئیں صرف اس لئے شرکت کی کہ اس کے بغیر مصر میں آزادی کے ساتھ کھل کھیلنے کا موقعہ نہیں مل سکتا تھا۔

فرانسیسی تسلط کا ڈرامہ

اس سیاسی پس منظر میں مراکش پر فرانسیسی تسلط کا ڈراما یوں شروع ہوتا ہے کہ ـــــ ۱۹۱۴ء میں سلطان حسن کا انتقال ہوا اور اس کا تیرہ سالہ بیٹا عبدالعزیز تخت نشین ہو عبدالعزیز چونکہ نابالغ تھا، اس لئے چھ سال تک ایک ایجنسی کے ذریعہ نظام حکومت چلایا گیا۔ ۱۹۰۱ء میں زمام حکومت عبدالعزیز کو سونپی گئی۔ یہ نوجوان سلطان جس نے اٹھتی جوانی کی رنگین لہروں کے ہجوم میں تخت وتاج کے اختیارات پائے تھے، فرانس کے بوڑھے ہوس کاروں کے پرانے منصوبوں کی تکمیل کے لئے بہت موزوں تھا ویسے عبدالعزیز کافی ذہین اور بڑی سوجھ کا آدمی تھا۔ لیکن اپنی نوعمری کی وجہ سے موٹروں، تصویروں اور فوٹوؤں کا بہت شوقین تھا۔ پھر چونکہ مطلق العنان تھا اس لئے حکومت کے خزانے کو اپنا ہر شوق پورا کرنے کے لئے کمال بے دریغی سے استعمال کر سکتا تھا، مگر جب یہ فضول خرچی بہت بڑھی تو عوام میں بے چینی پھیلنی شروع ہوئی اور بعض قبائل میں اچھی خاصی شورش برپا ہونے لگی۔ فرانس اسی قسم کے موقعہ کی تاک میں تھا، اس نے فوراً ہی اسپین، برطانیہ اور اٹلی سے ساز باز کیا اور آخر فرانس کا ایک وفد سلطانِ مراکش کے دربار میں یہ پیام لے کر حاضر ہوا کہ: آپ کے ملک میں بدامنی پھیل رہی ہے جس میں فرانس کو آپ سے پوری پوری ہمدردی ہے اور اس سلسلے میں فرانس بڑی خوشی کے ساتھ اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار ہے جس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کچھ فرانسیسی افسر آپ کی پولیس کو جدید طریقوں کے مطابق تعلیم وتربیت دینے کے لئے بھیج دیئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ سڑکیں، اور تار برقی وغیرہ کا انتظام بھی مراکش میں نہیں ہے جس کی وجہ

سے بدامنی و شورش پسندی کو دبانے میں سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہو۔ اسی کے ساتھ ایک بینک کا ہونا بھی ضروری ہی، ان تمام مشکلات میں فرانس آپ کی مدد کرنے کے لئے بڑی خوشی سے حاضر ہی[۱]۔

یہ تھا پہلا منظر!

اس کے بعد ڈرامے کے دوسرے منظر کا پردہ یوں اُٹھا کہ سیاسی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے دو کروڑ بیس لاکھ فرانک (تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیہ) کا قرضہ سلطان کو دیا گیا اور اس قرضے کی ادائگی کے لئے مراکش کے درآمد برآمد کے محصول (چنگی) کو بطور ضمانت یا بطور رہن اپنے قبضے میں لے لیا گیا۔ اسی دوران میں فرانیسی پولیس کے افسروں کا ایک وفد بھی مراکش بھیجا گیا جس نے مراکش پولیس کو تربیت دینے کی راہ سے عملاً پولیس کے پورے محکمے پر قبضہ کرلیا۔ پھر سڑکوں، تارگھروں اور بینکوں کی اہمیت جتلا کر اس سلسلے میں بھی سلطان مراکش کو فرنچ امداد پیش کی گئی۔ مراکش میں "پرامن داخلے" کا یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا اور دوسری طاقتیں اپنی اپنی اغراض کی وجہ سے خاموش تھیں۔ لیکن جرمنی سے یہ نظارہ نہ دیکھا گیا کہ جس فرانس کو سنہ ۱۸۷۰ئہ میں شکست دے کر جرمنی نے اپنے سے فروتر بنایا تھا، وہی فرانس مراکش جیسے شاندار ملک پر قبضہ کرکے جرمنی پر سبقت لے جانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ جرمنی نے فرانس کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانے کی کوشش کی اور قیصر ولیم نے امریکہ کے صدر کو ایک خط میں لکھا: "فرانس اور اسپین مل کر مراکش کو اپنے درمیان تقسیم کرلینا چاہتے ہیں اور اپنے سوا باقی ساری دُنیا کو اس علاقے کی تجارتی منڈیوں سے بے دخل بنا دینے پر تلے ہوئے ہیں[۲]۔"

---

[۱] ہسٹری آف ماڈرن یورپ، از گوچ ۱۸۷۸ئہ تا ۱۹۱۹ئہ صفحہ ۳۴۸

[۲] انٹرنیشنل کی ڈکنسن عفحہ ۱۲۴

جرمنی کے اس شور و غوغا نے مراکش میں فرانس کے "پُرامن داخلہ" کی رفتار ذرا دھیمی کر دی، ورنہ انیسویں صدی ہی میں سب مراحل طے ہو جاتے - اس دوران میں جرمنی کو انگلستان و فرانس کے خفیہ معاہدہ کی بھی کچھ ہوا لگ گئی - اس چیز نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور جرمنی بھڑک اٹھا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں قیصر ولیم بذات خود طنجہ (ٹینجیر) میں اترا اور سلطان مراکش کو علی الاعلان اپنی حمایت کا یقین دلایا اور کہا: ہم تمہاری آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے سب کچھ کریں گے - قیصر موصوف نے کہا کہ ہم مراکش کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ کسی ایک قوم کی تجارت وصنعت کی واحد آماجگاہ نہ بن جائے بلکہ سب قوموں کو فائدہ اٹھانے کے یکساں مواقع حاصل ہوں[1]۔

لیکن جرمنی اور فرانس کی اس رقابت میں برطانیہ نے اپنی اغراض کی بناء پر فرانس کا ساتھ دینا پسند کیا - چنانچہ جون ۱۹۰۵ء میں ولیم قیصر نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا "—— میری رعایا کو یقین ہے کہ اگر جرمنی اور فرانس میں کبھی لڑائی ہوئی تو انگلستان کھُلے طور پر فرانس کی مدد کرے گا، اس کی یہ مدد صرف مراکو ہی کی خاطر نہ ہو گی بلکہ مشرقِ بعید میں جرمنی کی عام پالیسی کو وہ اپنے مفاد کے خلاف سمجھتا ہے، فرانس اور انگلستان مل کر اپنی متحدہ بحری طاقت سے جرمنی کو کچل کر رکھ دیں گے اور اس طرح انگلستان و فرانس کے علاوہ جاپان اور روس کو بھی مشرقِ بعید میں خوب کھُل کھیلنے کا موقعہ مل جائے گا[2]۔"

جرمن رقابت کا زور گھٹنا شروع ہوتا ہے

جرمنی کے اس شور و واویلا کا یہ اثر ہوا کہ فرانس نے اس کی طرف بھی ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ ۱۹۰۶ء میں الجیکراس کانفرنس ہوئی جس میں دونوں

---

[1] انٹرنیشنل انارکی (ڈکنسن) صفحہ ۱۲

[2] "ٹھیوڈر دور روز ولیٹ" از بشپ جے۔ بی۔ صفحہ ۴۷۶

طاقتوں کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو گیا جس کی رو سے یہ طے ہوا کہ اگر مقامی حکومت کو سڑکیں، ریلیں، تار گھر اور ڈاک خانے وغیرہ بنوانے کے لئے غیر ممالک سے قرض لینے کی ضرورت ہوگی، تو جرمنی اور فرانس دونوں کے مشورے سے یہ قرض لیا جائے گا۔ نیز قرض لینے کے بعد جو کام بھی کیا جائے گا، اس کے ٹنڈر بھی جرمنی و فرانس کی ایک مشترک کمیٹی کے سامنے پیش ہوں گے اور جس کی شرائط سب سے بہتر ہوں گی، اسی کا ٹنڈر منظور کیا جائے گا، کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا جائے گا۔[1]

مگر یہ سمجھوتہ محض ظاہری تھا ورنہ اندرونی طور پر دونوں اپنے اپنے داؤ گھات میں مصروف تھے۔ فرانس تیزی کے ساتھ مراکش میں اپنا اثر بڑھا رہا تھا اور فرانسیسی نوواردوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اس چیز نے قدرتاً عوام کو بہت مشتعل کیا اور ۱۹۰۷ء ان ناخواندہ گورے مہمانوں کے خلاف جگہ جگہ بلوے ہونے لگے فرانس نے ان بلووں کو مقامی حکومت کی کمزوری پر محمول کیا، اور فوراً ہی کاسا بلانکا میں فوجیں اتار کر اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔

فرانس کے اس عمل سے جرمنی کا ماتھا ٹھنکا۔ اور اس نے بھی مختلف بہانوں سے جگہ جگہ اپنے مسلح آدمی متعین کر دیئے۔ ۱۹۰۹ء میں فرانس اور جرمنی کی فوجوں میں ایک ہلکی سی جھڑپ بھی ہو گئی، اس کے نتیجے میں فرانس اور جرمنی دونوں نے مل کر اعلان کیا کہ ——— حاشا و کلا ہم دونوں میں سے کوئی بھی مراکش کی آزادی کو سلب کرنا نہیں چاہتا۔ ہم اس کی آزادی کا احترام کریں گے اور اس پر قبضہ جمانے کی کوئی کوشش کسی کی طرف سے بھی نہ ہوگی۔

لیکن مراکش کا فضول خرچ سلطان اور اس سلطان کے بے دریغ قرضے، آہستہ

---

[1] انٹرنیشنل انارکی (ڈکنسن) صفحہ ۱۸۷-۱۸۸

آہستہ فرانس کو پنجے جمانے کا موقع فراہم کر رہے تھے۔ اسی کے ساتھ فرانس کی طرف سے جرمنی کو مطمئن کرنے کی کوششیں بھی ہو رہی تھیں۔ آخر ۱۹۱۲ء میں بڑی ذق فدق بق بق کے بعد یہ طے پایا کہ مراکش کی جس حصے پر فرانس کا غلبہ ہو اُسے فرانس کی حمایت و سرپرستی میں دے دیا جائے، شمال مغرب کے چھوٹے سے ساحلی علاقے پر جہاں اسپین نے پنجے جما رکھے ہیں، اسپین کی "حمایت و سرپرستی" تسلیم کر لی جائے اور طنجہ (تنجیر) کا سواد ۲۲۵ دوسو مربع میل کا رقبہ ایک اہم تجارتی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے بین الاقوامی قرار دیا جائے۔

جرمنی نے اس فیصلے کو اسپین، اٹلی اور برطانیہ کے دباؤ سے مجبوراً مان تو لیا لیکن دل کی خلش بدستور باقی رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ جرمنی کے لئے یہ برداشت کرنا بہت مشکل تھا کہ مراکش کے سرسبز و شاداب علاقے پر اُس کے حریف قابض ہو جائیں یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۴ء کے اسباب جنگ میں مراکش کو بھی بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔

آزادی کی جدوجہد اگرچہ یورپ کی ان بین الاقوامی سازشوں سے مراکش کے لوگ مغلوب کئے جا چکے تھے، مگر انھیں پوری طرح مفتوح کرنا اسپین اور فرانس کسی کے لئے بھی ممکن نہ ہو سکا، یہ لوگ بہت زیادہ دلیر اور جنگجو ہیں خصوصاً کوہستانِ ریف کے باشندے تو ماں کے پیٹ ہی سے سپاہی پیدا ہوتے ہیں، یہاں بار بار بغاوتیں ہوئیں۔ پہلی بغاوت ۱۸۹۴ء میں ہوئی، پھر ۱۹۰۹ء میں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے موقع پر فرانس کو یقین ہو گیا تھا کہ اب مراکش سے ہاتھ دھونا پڑے گا، مگر اس کی خوش قسمتی سے بعض ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ معاملہ جوں کا توں رہا، مگر ۱۹۲۱ء میں جب اسپینی مراکش میں بغاوت کی آگ بھڑکی تو فرنچ مراکش بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ اسپین نے پوری طاقت صرف کرکے اس بغاوت کو کچلنے کی کوشش

کی مگر عبدالکریم جو کوہستان ریف کا ایک بہادر قومی لیڈر اور بڑا انڈر فوجی کمانڈر تھا، اپنے دشمن کی فوجوں کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہوگیا۔ اور لاکھوں کے سامانِ جنگ پر قبضہ کرلیا۔

غازی عبدالکریم غازی عبدالکریم کی شخصیت شمالی افریقہ کی جدوجہد آزادی میں غیر معمولی اہمیت کی مالک ہے۔ امیر شکیب ارسلان کی رائے میں "عبدالکریم کی دلیری عظمت، کمال اور تدبر کے سامنے مصطفےٰ کمال لینن، مارشل ہنڈن برگ اور مارشل فوش جیسی ہستیاں بھی ہیچ ہیں"۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ عبدالکریم نے اتنے ناسازگار حالات کے باوجود اسپین کی فوجوں کو شکست دی کہ ساری دنیا حیران ہوکر رہ گئی"۔ اس کی اور ہسپانوی فوج کی نسبت ایک اور چالیس کی تھی۔ اور سامان اسلحہ میں تو اسے ہسپانیہ سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ ہسپانیہ کے پاس کروروں انسانوں کی آبادی رکھنے والے مقبوضات کے وسائل و ذرائع تھے۔ اس کے مقابلے میں عبدالکریم کے وطن ریف کی کُل آبادی بوڑھے، بچے اور عورتوں سمیت چھ سات لاکھ سے زائد نہ تھی۔ اور پھر لطف یہ کہ انگلستان، فرانس اور اٹلی نے ریف کو سامانِ اسلحہ بیچنے سے بھی انکار کیا حالانکہ اسپین دھڑا دھڑ خریداری کررہا تھا۔ مزید براں، اسپین نے وہ تمام مظالم کئے جو بین الاقوامی قانون کی رو سے ناجائز قرار پاچکے ہیں۔ مثلاً پُرامن شہری آبادیوں پر بم برسانا، زہریلی گیس کا استعمال کرنا، ضعیفوں، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کا قتل کرنا[۲]

---

[۱] حاضر العالم الاسلامی۔ جلد نمبر ۳ صفحہ ۱۸۴

[۲] " " جلد نمبر ۳ صفحہ ۱۸۵۔ ۱۹۰

ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے غازی عبدالکریم کو قدرت کی طرف یہ امداد حاصل تھی کہ ریف ایک ایسا پہاڑی علاقہ ہے جہاں بہت سے محفوظ غار اور خندقیں پائی جاتی ہیں۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں غازی عبدالکریم کی فتح پورے یورپ کے لئے بم کا گولہ ثابت ہوئی، خصوصاً فرانس کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں اسپین و فرانس دونوں نے مل کر زبردست حملہ کیا۔ ظاہر ہے کہ چھ سات لاکھ نفوس کی آبادی رکھنے والا مختصر سا علاقہ ایسی دو طاقتور سلطنتوں کے حملے کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ مجبوراً غازی موصوف نے ہتھیار ڈال دیئے۔

بربر اور عرب میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش

مگر فرانس اور اسپین دونوں جانتے تھے کہ غازی عبدالکریم کی شکست کے باوجود مراکشی عوام سے جذبۂ بغاوت کو نکال پھینکنا ممکن نہیں ہو سکتا، اس لئے ان جذبات کی تیزی کو کُند کرنے کے لئے شہنشاہی اسلحہ خانہ کا وہی پرانا حربہ: "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" استعمال کیا گیا، یہاں کی آبادی میں پندرہ فی صدی سے کچھ زائد بربر نسل کے لوگ بستے ہیں، اگرچہ یہ زبان و معاشرت اور مذہب و عقائد ہر لحاظ سے عرب اکثریت کے مانند ہیں تاہم جو تھوڑے بہت نسلی امتیازات ان میں باقی تھے اُن کو ابھارنے کی کوشش کی گئی۔ عربی ان کی علمی و ادبی زبان تھی جو ایک مدت سے قومی زبان (لنگوا فرینکا) کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ تاہم ان کے گھروں میں پرانی بولی کے مختلف نمونے بولے جاتے تھے اسپین اور فرانس نے اس بولی کو اہمیت دینی شروع کی اس کی ڈکشنری تیار کی گئی، قواعد بنائے گئے، اور کتابیں لکھی گئیں۔ پھر چونکہ بربر نسل کے لوگ صرف مراکش ہی میں آباد نہیں ہیں؛ الجزائر و تیونس بلکہ

طرابلس تک پھیلے ہوئے ہیں، اس لئے یہ سمجھا گیا کہ اس حربے سے ہر جگہ کام لیا جاسکے گا اور اس طرح پورے افریقی ساحل کی سیاست کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے گا مزید براں چونکہ بربر اپنی سپاہیانہ شان میں پوری آبادی پر فوقیت رکھتے ہیں اس لئے اگر انھیں عرب آبادی سے توڑ لیا گیا تو گویا شمالی افریقہ کا بازوئے شمشیر زن توڑ لیا گیا، غرض ان وجوہ کی بنا، پر فرانس اور اسپین نے سیاسی عیاری کے تمام گر صرف کرکے بربر قوم کو عرب آبادی سے علیحدہ کرنے کی کوششیں شروع کیں۔

پھوٹ ڈالنے کے حربے

اس مقصد کے لئے سب سے بڑی اور کامیاب کوشش یہ کی گئی کہ قانونِ شریعت کے بجائے بربروں میں قانونِ رواج نافذ کیا گیا۔ قانون رواج کو نافذ کرنے کی کوششیں ایک عرصہ سے ہو رہی تھیں مگر برابر ہموار نہ ہوتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں جب غازی عبدالکریم کی طاقت کو آخری بار توڑا گیا اور ہولناک بموں کی لگاتار بارش سے "امن و امان" قائم کیا گیا تو بربروں کو عربوں سے جدا کرنے کی سر توڑ کوششیں شروع ہوگئیں۔ ۱۹۲۹ء میں قانونِ رواج کے مسودات شائع ہوئے۔ اس کا علم جب مصر اور دوسرے بلادِ اسلامیہ کو ہوا تو اس کے خلاف سخت احتجاج کئے گئے۔ مگر فرانس نے اس قسم کے تمام اخباروں، رسالوں اور پمفلٹوں کی اشاعت بربری علاقوں میں ممنوع قرار دیدی، رسل و رسائل کے تمام ذرائع سے بربر قوم کو دنیائے اسلام سے منقطع کر دینے کے بعد میدان صاف تھا۔ ۱۹۳۰ء میں قانون رواج نافذ کردیا گیا۔ جس کی رو سے قاضیوں کا تقرر ختم ہوا اور ان کی جگہ شیخ قبیلہ کو معاملات کے فیصل کرنے کا اختیار سونپا گیا۔ ان شیوخ کے تقرر اور تنظیم کا اختیار فرانس کی حکومت کے ہاتھ میں ہی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ قانونِ رواج کے نام سے بربر قوم کو نہ صرف عربوں سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا بلکہ

ان کے معاشرتی اعمال و افعال اور ان کی ذہنی و دماغی ترقی کی رفتار کو بھی فرانس کی حکومت کے دامن سے باندھ دیا گیا۔

اس کے علاوہ عربوں اور بربروں دونوں میں کچھ لوگوں کو خطابات و انعامات سے سرفراز کر کے فرانس کے زیر اثر رہنے کا حامی بنا لیا گیا۔ یہ لوگ اخبار بھی نکالتے ہیں اور لیڈری بھی کرتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے زمانے میں البلاغ کے نام سے اس جماعت کا ایک مشہور اخبار نکلتا تھا جس نے جی بھر کر فرانس کی شان میں قصیدے پڑھے اور عربوں اور بربروں کو ایک طرف تو فرانس کے تہذیبی محاسن سے متاثر کیا اور دوسری طرف اس کی طاقت و قوت سے مرعوب کیا۔ ایک شخص مسمی خیر اللہ اس جماعت کا ممتاز لیڈر تھا، جو فرانس کی تہذیب و مدنیت میں جذب ہو جانے ہی کو نجاتِ اسلامی کا واحد راستہ سمجھتا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ فرانس کی ان تمام شہنشاہی کوششوں کے باوجود اُسے سخت مایوسی ہوئی ہے۔ بربروں میں قانونِ رواج تو ضرور نافذ کر دیا گیا۔ جو قلم کی ایک جنبش سے کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ کسی اور مقصد میں مطلق کامیابی نہیں ہوئی۔ عربوں کا ایک بہت ہی محدود و مخصوص طبقہ ہے جو "فرانسیسیت" میں مدغم ہو گیا ہے۔ عوام اس سے بالکل متاثر نہیں ہیں۔ الشہاب جو یہاں کا قومی اخبار ہے بڑی آواز رکھتا ہے اور فرنچ پرست حلقوں کے تمام پروپیگنڈوں پر بھاری ہے۔

سیاسی و معاشی حالت

مراکش کا کل رقبہ ۲ لاکھ تین ہزار مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن زرخیز و خوشگوار علاقہ جو کوہِ اطلس کے مغرب میں واقع ہے صرف ۷۸ ہزار مربع میل ہے۔ اس کے علاوہ ۲۷ ہزار مربع میل کا علاقہ اگرچہ کاشت کے لئے موزوں نہیں لیکن مویشی کے لئے گھاس اچھی پیدا کرتا ہے اور ایک اچھے قسم کی چراگاہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئی

سوا لاکھ مربع میل کا جو وسیع علاقہ بچتا ہے، وہ زیادہ تر لق و دق ریگستان ہے جس میں کہیں کہیں سرسبز و شاداب نخلستانوں کے سوا اور کوئی آباد جگہ نہیں۔

فرانس کی سرپرستی میں سب سے زیادہ علاقہ ہے یعنی ڈیڑھ لاکھ مربع میل ——— اسپین کے اقتدار میں صرف ۱۸ ہزار مربع میل کا رقبہ ہے ——— طنجہ یا ٹینجیر کا بین الاقوامی ٹکڑا صرف ۲۲۵ مربع میل کی وسعت رکھتا ہے۔

نمائشی سلطان

فرانسیسی مراکش میں حکمرانی کی طاقت بظاہر ایک سلطان کے ہاتھ میں ہے۔ اسپینی مراکش کے لئے بھی یہی سلطان اپنا ایک نائب مقرر کرتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ سلطان کم از کم دو آدمیوں کو نامزد کر کے ہسپانوی حکومت کے پاس بھیج دے۔ ان میں سے جس نام پر ہسپانیہ صاد کر دے، وہی نائب السلطنت بنایا جاتا ہے۔ لیکن عملاً حکومت پر ہسپانوی ہائی کمشنر ہی کا قبضہ ہے۔ سلطان کا نائب محض ایک دکھاوے کی چیز ہے۔ علاوہ ازیں شہر افنی جو تجارت کا مرکز ہے، وہ براہِ راست ہسپانوی تسلط میں ہے اور سلطان کے نائب کو اس پر برائے نام اختیار بھی نہیں ہے۔

یہی کیفیت فرانسیسی مراکش کی ہے۔ یہاں تمام فوجی و غیر فوجی محکمے فرنچ ریذیڈنٹ جنرل کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ اس کی حیثیت ایک ایسے با اختیار وزیر اعظم کی سی ہے جو اگر چاہے تو سلطان کو بھی طاق میں بٹھا سکتا ہے۔ سلطان کی طرف سے غیر ممالک کے ساتھ گفت و شنید کرنے کا "محکمۂ خارجہ" بھی اسی کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے۔ داخلی انتظامات کے شعبوں میں بھی اسی کے مشوروں سے کام ہوتا ہے۔ ظاہر میں تمام احکام سلطان کے دستخط سے جاری ہوتے ہیں، لیکن ان کی پیشگی منظوری ریذیڈنٹ بہادر سے لینا ضروری ہوتا ہے۔

طنجہ (ٹینجیر) کا علاقہ بین الاقوامی نگرانی میں ہے۔ ۱۹۲۵ء کی ایک قرارداد

کی رو سے یہاں کوئی قوم بھی فوجی استحکامات نہیں کر سکتی، نظم و نسق کا کام ایک بین الاقوامی اسمبلی کے سپرد ہے جس میں ۲۷ ممبر ہوتے ہیں۔ ان میں خیر بیتہ سے ایک نمائندہ سلطان کا بھی ہوتا ہے اور اسی کو صدر بھی بنایا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر سنہ ۱۹۴۰ء میں اسپین نے طنجہ پر اپنا تنہا قبضہ جما لیا تھا اور سلطان کے نمائندے کو بھی لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۴۲ء میں اتحادیوں نے پھر پہلی صورت، بحال کر دی۔

آبادی سنہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے آبادی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

فرنچ حلقہ ——— کل آبادی اسی لاکھ۔ اس میں سے ۸۰ فیصدی مسلمان ہیں۔ باقی میں فی صدی یوروپین۔

ہسپانوی علقہ ——— کل آبادی آٹھ لاکھ۔ یوروپین ساٹھ ہزار

طنجہ ——— ایک لاکھ۔ یوروپین ۲۳ ہزار

زبان عام زبان عربی ہے۔ بربری قبائل میں گھریلو طور پر کچھ بربری بولیاں بھی رائج ہیں جنھیں عربی کے برابر لانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ سرکاری اور دفتری زبان فرانسیسی حلقے میں بظاہر عربی ہے لیکن عملاً سارا کاروبار فرنچ میں ہوتا ہے مگر اسپینی حلقے میں یہ ظاہرداری بھی ضروری نہ سمجھی گئی اور وہاں قانونی طور پر ہسپانوی زبان کو سرکاری و دفتری زبان قرار دیا گیا ہے۔ طنجہ میں فرنچ، عربی اور ہسپانوی تینوں زبانیں، سرکاری زبانیں تسلیم کی گئی ہیں۔

مالیات سنہ ۱۹۳۹ء میں تقریباً ایک ارب فرانک (۶۰ کروڑ روپیہ) کا بجٹ فرنچ مراکش نے بنایا تھا۔ فرانس کے قرضے کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے جس کا سود چار سے لے کر پانچ فی صدی تک وصول کیا جاتا ہے۔

معدنیات میں فاسفیٹ، جست، سیسہ، لوہا اور سرمہ خاص چیزیں ہیں

لیکن ابھی انھیں پوری طرح نکالا نہیں جا سکا ہی
سکہ اور زرِ تبادلہ کے لحاظ سے فرنچ حلقہ فرانس کا ماتحت ہی اور ہسپانوی حلقہ اسپین کا۔ ـــــ سلطان کا اپنا کوئی سکہ نہیں ہی

سیاسی بےبسی کے اسباب

مصر و عراق کی طرح افریقہ کے ان ساحلی مقامات کی اہمیت بھی تجارتی اور فوجی اعتبار سے بہت زیادہ ہی۔ بحرِ روم یورپ کا ایک ایسا سمندر ہی جو ہر یورپی قوم کی آمد و رفت کے لئے ضروری ہی اور یہ عرب علاقے اسی سمندر کے ایک بازو پر پھیلے ہوئے ہیں، اس لئے افریقہ، ایشیاء اور آسٹریلیا تینوں براعظموں سے سیاسی اور تجارتی تعلقات رکھنے والی اقوام کے لئے ان مقامات پر قبضہ رکھنا بڑی آسانیاں پیدا کرتا ہی۔ اسی بناء پر برطانیہ نے مصر اور جزیرۂ مالٹا اور جزیرہ سائپرس پر قبضہ کرنا ضروری سمجھا۔ اٹلی نے زبردست جنگی کوششوں سے طرابلس (یا لیبیا) کو فتح کیا اور اسی لئے فرانس اور اسپین کو اپنے اِن ساحلی مقبوضات پر تسلط قائم رکھنے کی اتنی زبردست فکر لاحق ہوئی۔

مصر چونکہ بڑی جگہ ہی اس لئے وہاں سیاسی بیداری کو دبانا مشکل تھا، لیکن دوسرے ساحلی مقامات پانچ چھ ٹکڑوں میں بٹ جانے کی وجہ سے بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ مزید براں یہ مقامات یورپ سے بہت قریب تر ہونے کی وجہ سے یورپی مہاجرین کا شکار بھی بن گئے اور الجزائر اور طرابلس میں یورپین آبادی رکھنے والا شمالی علاقہ تو علی الترتیب فرانس اور اٹلی کا جزو ہی بنا دیا گیا ہی۔

بدنصیبی سے تمام عرب ممالک اپنی جائے وقوع کے اعتبار سے ایسے واقع ہوئے ہیں کہ جب تک دنیا کا موجودہ اقتصادی و معاشی نظام قائم ہی، یورپ کی قوموں کے لئے ان پر تسلط رکھنا سخت ضروری ہی۔ عراق سے لے کر مراکش

تک اور ترکی سے لے کر عدن اور سوڈان تک کا پورا علاقہ موجودہ دنیا کی اقتصادی اور تجارتی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ علاقہ جس قوم کے پاس ہوگا وہ خوشحالی و سرسبزی میں ساری دنیا سے بازی لے جائیگی جنگ عظیم نمبرا و نمبر۲ دونوں میں ان علاقوں پر سب کی نظریں رہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ گذشتہ بیس بائیس سال کے عرصے میں یہاں کافی سیاسی شعور پیدا ہوگیا ہے اور اسی شعور کا نتیجہ ہے کہ شام، عراق اور مصر نے بہت بڑی حد تک آزادی حاصل کرلی۔ پھر یہ صحیح ہے کہ یہ آزادی، یورپ کے تسلط سے بالکل بے نیاز نہیں ہے بلکہ ان مقامات کے چھوٹے اور غیر متحد ہونے میں اس کمزوری کا راز پنہاں ہے۔ شام صرف تنتیس لاکھ کی آبادی کا ایک صوبہ ہے، عراق کی آبادی اس سے بھی کم ہے، مصر اگرچہ ڈیڑھ کروڑ کی بستی ہے مگر سوڈان اس سے علیحدہ ہے اور دوسرے نہر سوئز پر برطانوی قبضے اور حکومت پر برطانوی قرضے کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ ترکی البتہ پوری طرح آزاد ہے لیکن اپنی وسعت کے لحاظ سے وہ اتنا بڑا نہیں کہ معاشی اور سیاسی اعتبار سے یورپ کی قوموں کا مقابلہ کرسکے۔ عمان حضرموت اور یمن ذرا ذرا سے علاقے ہیں اور یہاں کے شیوخ پر برطانوی "حمایت و سرپرستی" کا ٹھینگا رکھا ہوا ہے۔

یہ سوال عموماً کیا جاتا ہے کہ جب عراق سے لے کر مراکش تک ایک زبان، ایک مذہب، ایک معاشرت اور ایک تہذیب و مدنیت ہے اور زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ یہ سارا علاقہ خلیفۃ المسلمین کی حکومت میں متحد بھی تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ یورپ کی قوموں کو یہاں اپنا تسلط قائم کرنے اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان کا زور توڑ دینے کا موقعہ حاصل ہوا ہے؟ وہ ترکی سلطنت جس نے آسٹریا ہنگری اور جرمنی کے علاقوں تک اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی اور جس کے نام سے

یورپ لرزا کرتا تھا، آخر کیا ہوا کہ یکایک وہ اتنی کمزور و بے طاقت ہو کر رہ گئی کہ ان علاقوں کو یورپ کی دستبرد سے بچا بھی نہ سکی؟ آخر کیا وجہ ہے کہ جنگ عظیم میں عربوں نے ترکوں سے بغاوتیں کیں اور مصر نے برطانوی اقتدار کا جُوا اپنی گردن پر رکھ لیا؟ تیونس، طرابلس، الجزائر اور مراکشی علاقے یورپ کے تسلط میں کیوں چلے گئے اور انہوں نے آزادی کی جد و جہد کیوں نہ کی——؟

مرض اور تشخیص مرض

ان سوالات کے جوابات مختلف دیئے جاتے ہیں کچھ لوگ اس کا سبب عربوں کی ناعاقبت اندیشی اور حماقت آبی کو قرار دیتے ہیں، کچھ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے قرآن و حدیث پر عمل کرنا چھوڑ دیا، اس لئے یہ تمام وبال نازل ہوا، بعض کا خیال ہے کہ عرب فریب کا جواب فریب سے نہ دے سکے۔ اس لئے غلبہ و تسلط کا شکار ہو گئے بعض کی رائے ہے کہ عرب بہت قدامت پسند اور ضعیف الاعتقاد ہو گئے ہیں اس لئے موجودہ دنیا میں ان کو زک اٹھانا پڑ رہی ہے وغیرہ وغیرہ

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی جواب بھی مکمل و حقیقی جواب نہیں عربوں کو ناعاقبت اندیشی کا الزام دینے والوں کو پہلے سوچنا چاہیئے کہ آخر وہ کونسے اسباب تھے جس نے خدا کی کروڑوں مخلوق کے دل میں اس ناعاقبت اندیشی کا میلان پیدا کیا؟ قرآن و حدیث پر عمل نہ کرنے کا طعنہ دینے والوں کو یہ بتلانا چاہیئے کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ اس بے عملی کی زبردست چیخ پکار کے باوجود عوام کی توجہ اس طرف نہیں ہوتی ہے؟ اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عرب سیدھے سادے تھے، اس لئے یورپ کے فریب میں آگئے، انھیں اس کا جواب دینا چاہیئے کہ پھر انہی سیدھے سادے عربوں نے اپنی آزادی کے لئے حیرتناک قربانیاں کس طرح کیں اور یورپ کی تمام ڈپلومیسی کو فیل کیوں

کر دیا جس کی بنا پر مجبوراً ان کی آزادی تسلیم کی گئی؟ علیٰ ہذا القیاس قدامت پسندی اور ضعیف الاعتقادی کا الزام لگانے والوں کو اس پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ مسلمان کتنا ہی ضعیف العقیدہ اور قدامت پرست ہو، وہ بہرحال بت پرستوں اور واہمہ پرستوں سے بدرجہا بلند رہتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ جاپان کی وہ آبادی جو بادشاہ کو خدا سمجھ کر پوجتی تھی وہ تو دنیا کی ایک بڑی طاقت بنی رہی لیکن عرب جن کے پیچھے تاریخ و روایات کا شاندار پشتارہ ہے، مغلوب و مقہور ہو کر رہ گئے

صرف دو بڑے سبب

اصل یہ ہے کہ عربوں اور ترکوں کی مغلوبیت کے یوں چھوٹے موٹے اسباب تو بہت سے ہو سکتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑے سبب دو ہیں، ایک تو صنعتی انقلاب سے نابلد رہنا اور دوسرے مطلق العنان شاہی کی وجہ سے عوام اور حکومت کے درمیان گہرا رابطہ نہ ہونا۔

مسلمانوں کی سلطنت امیر معاویہ کے زمانے ہی سے مطلق العنانی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ تاہم چونکہ اس وقت دنیا کی ہر قوم اسی مطلق العنانی کا شکار تھی اس لئے ایک سلطنت کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری قائم ہوتی رہی لیکن انقلاب فرانس کے بعد جب یورپ نے مطلق العنانی کا طوق گردن سے نکال ڈالا اور عوام کی طاقت و قوت کی تنظیم شروع ہوئی، تو پھر ہر مطلق العنان سلطنت عوام کی طاقت کے اس سیلاب کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہنے لگی۔ ترکی بلاشبہ ایک بڑی سلطنت تھی۔ مگر اس سلطنت کے نیچے خدا کی جو مخلوق بستی تھی، اس کی حیثیت بھیڑ بکریوں سے زیادہ نہ تھی اس کو کبھی یہ خیال پیدا نہ ہوا کہ سلطنت کے مفاد کے ساتھ اس کا مفاد وابستہ ہے۔ ترکی سلطنت میں رہنے والے یہ عوام اگر سلطنت کے لئے کچھ کرتے تھے تو ڈر کر یا لالچ سے۔

پھر جب ڈرانے والا کوئی دوسرا پیدا ہوگیا اور لالچ کسی اور طرف سے دیا گیا تو سیاسی شعور سے نا واقف نہیں بلکہ سیاسی اقتدار سے محروم، عوام قدرتی طور پر اس طرف ٹوٹ پڑے۔

اگر ترکی سلطنت اپنے ماتحت علاقوں کو سیاسی خود اختیاری دے سکتی، نظام حکومت جمہوری و وفاقی ہوتا اور بادشاؤں اور سرداروں کے بجائے عوام کے ہاتھ میں اختیار و اقتدار کی باگ ہوتی اور رعایا کا ہر فرد حکومت کی طرف سے مطمئن ہوتا تو نہ عرب عوام کسی فریب کا شکار ہوتے، نہ وہ قرآن و حدیث سے غافل نظر آتے اور نہ قدامت پسندی و ضعیف الاعتقادی کا الزام اُن پر عائد ہو سکتا۔ لیکن عوام کو جاہل رکھ کر، غریب و مفلس رکھ کر اور مجبور و لاچار بنا کر اگر جبر و تشدد سے اُن پر حکومت کی جائے گی تو پھر لازماً تمام معائب پیدا ہوں گے۔ اسلام کے بوڑھے شاعر فلسفی سعدی نے خوب کہا ہے

رعیت چو بیخ است و سلطاں درخت

درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

مگر شہنشاہیت کی ہئیت ترکیبی ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اُس میں اس فلسفے پر عمل ناممکن ہو جاتا ہے۔

عربی بولنے والے ممالک کا مستقبل

مختصر یہ کہ جس جمہوری و صنعتی انقلاب میں یورپ کی ترقی کا راز پنہاں ہے، اُسی سے روگردانی میں عربوں اور ترکوں کا زوال پوشیدہ ہے۔ لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ یہ صورت حالات اب ختم ہو رہی ہے، ترکی سلطنت کی تباہی عربوں اور ترکوں دونوں کے لئے رحمت ثابت ہوئی۔ اور

خدا شرے برانگیزد کہ خیرے اندراں باشد!

کے مصداق، اس سلطنت کے بعد ترکی اور عرب عوام میں زبردست سیاسی اور ملی شعور پیدا ہو گیا ہے۔ اور بلا شُبہ وہ وقت دُور نہیں جب یہ شعور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں سے اپنا لوہا منوالے۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں تمام بلادِ عرب کی ایک انجمن قائم کی گئی ہے جو روز بروز طاقت پکڑتی جارہی ہے۔ سیاسی مبصروں کی پیشین گوئی ہے کہ عربوں کی سیاسی بیداری کی رفتار جس تیزی سے بڑھ رہی ہے اور یورپ کی شہنشاہیت کے خلاف ان میں جو قوت مقابلہ پیدا ہو رہی ہے اس کا لازمی نتیجہ چند سال کے بعد یہ نکلنے والا ہے کہ دنیا کے تمام عربی بولنے والے ممالک مراکش سے لے کر مصر و سودان تک اور مصر و سودان سے لے کر عراق و عمان تک ایک اور صرف ایک فیڈریشن (وفاق) کے ماتحت ہوں گے اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کے اس وفاقِ مودّت کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔[۱]

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر، دیکھ!

اس باب کی تیاری میں حسب ذیل کتابیں پیشِ نظر رہی ہیں۔

مغرب الاقصیٰ از کننگھم گرہیم
فرانس، اسپین اور ریف از ہاوس (مطبوعہ لندن ۱۹۲۰ء)
کانکویسٹ آف مراکو دو ترجمہ Usborne
پریذیڈنٹ ڈے مراکو (مطبوعہ لندن ۱۹۳۷ء)
مراکو دیٹ واز
ماڈرن مراکو
Morocco as a French Economic Venture: Knight
اسٹیسمین ایربک ۱۹۴۴ء

باب ۲۵

ایران

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

انیسویں صدی کے نصف آخر سے ایران کی سلطنت میں عفونت وگندگی کے جراثیم بڑی شدت سے پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ بادشاہ عیاشیوں میں پڑا ہوا تھا اور بار بار یورپ کی رومانیت خیز و حسن خیز یاش فضا کے سفر کئے جا رہے تھے جن پر سلطنت کا کروروں روپیہ خرچ ہو رہا تھا اور ملک میں ابتری و بدنظمی الگ پھیل رہی تھی پھر چونکہ ایران میں تیل کے چشمے بھی ہیں اور تمباکو کی پیداوار کے لئے بھی زمین بہت موزوں ہے اس لئے یورپی سرمایہ دار یہاں آن دھمکے اور ان دونوں تجارتوں پر قبضہ کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں، بادشاہ کو روپیہ چاہیئے تھا، اس لئے ٹھیک اُسی زمانے میں جب کہ مصر کا خدیو اسمٰعیل نہر سوئز کے حصے بیچ رہا تھا اور حکومت کے شعبوں کو رہن رکھ کر قرض لے رہا تھا، ایران کا شاہ قاچار بھی اسی مرض میں مبتلا تھا۔ لیکن جب ۱۸۹۰ء میں تمام ایرانی تمباکو کی کاشت، فروخت اور برآمد کا ٹھیکہ ایک انگریزی کمپنی کو دیا گیا تو ملک میں سخت بے چینی پھیلی یہاں تک کہ لندن میں جو ایرانی

سفیر متعین تھا وہ بھی اس ناعاقبت اندیشی کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے کھل کر "شاہِ کجکلاہ" کے اس حکم پر نکتہ چینی کی۔ اس نکتہ چینی کا انعام حسب توقع "فرمانِ برطرفی" کی شکل میں دیا گیا لیکن اس برطرفی نے سفیر موصوف کی زبان بند نہ کی اور وہ لندن ہی میں بیٹھ کر اس کے خلاف ایران کی رائے عامہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے "قانون" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس میں ایران کی بدنظمی و بدحالی پر ماتم کیا جاتا تھا اور ایرانی عوام کو اصلاحِ حال کی طرف ابھارا جاتا تھا۔

اس وقت تک ایران میں دستوری و آئینی حکومت کا کوئی شائبہ بھی نہ تھا، ہر چیز بادشاہ کی ملکیت تھی اس لئے تمباکو کا یہ ٹھیکہ بھی بادشاہ کی ذاتی تجارت کی حیثیت رکھتا تھا جس کے منافع کا واحد حقدار صرف شاہِ قاچار تھا۔

جمال الدین افغانی اور ایران

اسی زمانے میں سید جمال الدین افغانی ایران پہنچے اور اصلاح حال کی کوشش شروع کی۔ پہلے تو بادشاہ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی لیکن جب دیکھا کہ ان کے خیالات شاہ کے مفاد سے میل نہیں کھا سکتے، تو گرفتار کر کے جلا وطن کر دیا۔ ایران میں آپ نے جو کچھ دیکھا اس کی دردناک داستان اپنے ایک خط میں بیان کی ہے جو حاجی مرزا حسن شیرازی مجتہد اعظم کو لکھا تھا، اس میں آپ لکھتے ہیں:۔

اے پیشوائے اعظم! اس میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ بادشاہ کا دل و دماغ کمزور ہے، اس کا کردار بدترین ہے۔ اس کا قلب ناپاک ہے، وہ ہرگز اس لائق نہیں ہے کہ ملک پر حکومت کرے اور رعایا کی اصلاح کر سکے۔ اس نے فاسق و فاجر اور جفاکار و بدباطن افراد کو اقتدار و اختیار کا مالک بنا رکھا ہے، وہ نبی کریم کا مذاق اڑاتا ہے اور قانونِ شریعت کی تحقیر کرتا ہے۔ وہ شریعت کے نافذ کرنے والوں کی اہانت کرتا ہے اور علمائے اسلام کو حقارت کے ساتھ یاد کرتا ہے، وہ نیک دستی لوگوں کی بے عزتی کرتا ہے اور ان افراد کی

نذلیل تک سے باز نہیں آتا جو آل رسول سے تعلق رکھتے ہیں، مزید براں جب سے وہ کفار کے ملک سے واپس لوٹا ہے، بالکل شتر بے مہار ہو گیا ہے، کھلم کھلا شراب نوشی کرتا ہے اور بے دینوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔

اس نے ایران کا ایک وسیع علاقہ اس کے تمام منافع سمیت کفار کو بیچ دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے سڑکیں، کارواں سرائے، باغ اور کھیت سب ہی ان کے حوالے کر دیئے ہیں۔ تمباکو کی تمام کاشت، کھیتوں سمیت، انگور کے تمام باغ اور صابن، موم بتیاں اور شکر بنانے کے تمام کارخانے اس نے کفار کو بیچ ڈالے ہیں حتیٰ کہ بینک بھی، میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ بینک کیا ہے؟ مختصراً اتنا کافی ہے کہ گویا اعدائے اسلام کو ساری سلطنت سپرد کر دی گئی اس کے بعد جو کچھ بچا اسے روس کے حوالے کر دیا گیا یعنی مندب رشت دریائے طبرستان انزال اور خراسان کی درمیانی سڑک جس کے ساتھ اس کے قرب وجوار کے تمام مکانات، کارواں سرائے اور قابل کاشت زمین بھی دے دی گئی۔ لیکن روس اب بھی مطمئن نہیں ہے وہ تو خراسان، آذربائیجان اور مازندران کے پورے صوبوں پر قابض ہونا چاہتا ہے۔

اس ملعون نے مجھے اس وقت گرفتار کرایا جب میں خانقاہ عبدالعظیم میں مقیم تھا اور سخت بیمار تھا مگر اس کے باوجود اس کے حکام نے جاڑے کے موسم میں طہران کی اس سڑک پر جو برف سے ڈھکی ہوئی تھی مجھے گھسیٹا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! اس کے حکام نے میری بیماری کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک لدو ٹٹو پر مجھے بٹھایا اور زنجیروں میں جکڑ دیا اور جب کہ جاڑے کی ٹھٹھرا دینے والی ہوائیں چل رہی تھیں اور ہر طرف برف ہی برف پڑ رہی تھی مجھے اس حال زار کے ساتھ خانقیں پہنچایا گیا اور یہاں سے مجھے بصرہ بھیج دیا گیا۔[1]

ایران سے جلا وطن ہو کر سید جمال الدین بھی لندن پہنچے اور معزول شدہ ایرانی

---

[1] "انقلاب ایران" از براؤن: صفحہ ۱۷، ۱۸ (ضمیمہ مقالات ایران)۔

سفیر کے ساتھ ایران کے لئے کام کرنے لگے۔ آپ نے لندن سے "ضیاء الخافقین" کے نام سے ایک سالہ جاری کیا جس کے اقتباسات مصر کے مشہور زعیم مفتی عبدہٗ کے عربی اخبار "المنار" میں بھی نقل کئے جاتے تھے اور اس طرح ایرانی عوام کی رائے عامہ کو تیار کیا جاتا تھا۔

غرض اس اندرونی و بیرونی شورش و ہیجان کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمائے ایران نے تمباکو نوشی کے خلاف ایک متفقہ فتویٰ شائع کیا اور "قلیان کشیدن حرام است" (حقہ پینا حرام ہے) کی آوازوں سے فضائے ایران گونج اٹھی۔ اس کا اتنا زبردست اثر ہوا کہ تاجدار ایران کے ملازموں تک نے بادشاہ کو حقہ بھر کر دینے سے انکار کر دیا۔ اس صورت حالات سے مجبور ہو کر شاہ کو تمباکو کا ٹھیکہ منسوخ کرنا پڑا لیکن اس منسوخی کی تلافی میں انگریزی کمپنی کو پانچ لاکھ پونڈ معاوضہ دینا پڑا جو انگریزوں کے امپیریل بینک سے چھ فیصدی سود پر قرض لے کر ادا کیا گیا۔[1]

مگر تمباکو کے ٹھیکے کی منسوخی نے عوام کی بے چینی ختم نہ کی، کیونکہ دوسرے وسائل معاش پر روسی اور برطانوی سرمایہ داروں کا تسلط برابر قائم رہا اور شاہِ ایران روپے کے لالچ میں خود کو ان کے نرغے میں پھنساتا رہا۔ آخر چند سال بعد ۱۸۹۶ء میں ایک شخص مرزا رضا خاں نے شاہ کو قتل کر دیا۔ مرزا رضا خاں نے گرفتاری کے بعد عدالت میں جو بیان دیا، اس میں کہا تھا۔

"......... سید جمال الدین نے سچی باتوں کے سوا اور کیا کہا تھا؛ مگر اس کی پاداش میں ان کی یہ درگت بنائی گئی کہ اسے جو آل رسول سے تھا، ایک مقدس خانقاہ کی چہار دیواری سے اس بیرحمی کے ساتھ گھسیٹ کر نکالا گیا کہ اس کے کپڑے تک پھٹ گئے۔

---

[1] "انقلاب ایران" از براؤن: صفحہ ۳۱ تا ۳۳

میں نے جن احساسات کی بنا پر قتل کیا ہو اُس میں میرے ساتھ ایران کے بے شمار افراد شریک ہیں جن میں علمار بھی ہیں، اُمرار بھی، تاجر بھی ہیں اور مزدور بھی۔

اب تو ہر شخص کے جذبات و احساسات وہی ہیں جو میرے ہیں لیکن میں اس خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں جو سید جمال کا اور تمام انسانوں کا پیدا کرنے والا ہو کہ سید جمال الدین کے سوا میں نے اپنے اس قتل کے ارادے کی اطلاع اور کسی کو نہ دی تھی۔ مگر سید صاحب تو اب قسطنطنیہ میں ہیں جو کچھ تم کر سکتے ہو کر دو"

انقلاب کی لہر

لیکن بادشاہ کے قتل کے باوجود حکومت کا نظم و نسق وہی رہا اس لئے حالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی، نیا بادشاہ بھی اپنے پیش رو کے رنگ میں رنگا گیا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ یورپ کی رنگین فضاؤں میں رنگ رلیاں منانے کا شوق ان بادشاہوں کو بار بار قرض لینے پر مجبور کرتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء میں روس سے دو کروڑ پچیس لاکھ روبل لیا گیا۔ پھر دو سال بعد ۱۹۰۲ء میں ایک کروڑ مزید کا اضافہ اس پر ہوا اس قرض کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ حکومت کے محکمے تو روسی کفالت میں بطور ضمانت چلے جاتے تھے اور قرضے کی رقم یورپ کے ہوٹلوں کی نذر ہو جاتی تھی۔ جہاں ایک ایک دن کے مصارف کا بل چھ چھ ہزار فرانک (تقریباً چار ہزار روپیہ) تک پہنچتا تھا۔"[1]

مطلق العنان شاہی کے ان مظالم نے ایرانی عوام میں بغاوت و انقلاب کی چنگاریاں روشن کرنی شروع کیں جو ۱۹۰۵ء میں بھڑک اٹھیں۔ بادشاہ سے دستوری و آئینی حکومت کا مطالبہ کیا گیا۔ اب بادشاہ میں اس مطالبے کو ٹالنے کی ہمت نہ تھی چنانچہ ۱۹۰۶ء میں عوام کی نمائندہ مجلس طلب کی گئی جس نے ایک دستور اساسی

---

[1] "انقلاب ایران" از پروفیسر براؤن صفحہ ۱۰۴

مرتب کیا۔ جس کی رو سے بادشاہ کے اختیارات کو آئین و دستور کا پابند بنانے کی کوشش کی گئی۔

اجنبی طاقتیں ایران و برطانیہ نے یہ دیکھا تو انھیں بڑی تشویش لاحق ہوئی انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں نئی حکومت اتنی طاقت نہ پکڑ لے کہ ان کے مفاد کو ضرب پہنچے۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء میں روس اور برطانیہ نے شاہِ ایران سے ایک معاہدہ کیا یا اُسے ایک معاہدہ کرنے پر مجبور کیا۔ جس کی رو سے ایران کے معاشی وسائل کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا: شمالی اور جنوبی ——— شمالی حصے کے تمام معاشی وسائل پر روس کو اختیار دیا گیا اور جنوبی حصے پر برطانیہ کو۔ لیکن برطانیہ کے حصے میں جو علاقہ آیا تھا وہ ایران کا تقریباً دو تہائی تھا جس کی حدود چھ سال قبل ۱۹۰۱ء میں "مراعات ڈی آرکی" کے وقت ہی متعین ہو چکی تھیں۔

اس معاہدے نے عوام کو بہت زیادہ مشتعل کیا اور چونکہ اب انھیں کچھ آئینی و دستوری اختیارات بھی حاصل تھے، اس لئے ان کے احتجاج نے موثر شکل اختیار کرنی شروع کر دی۔ اس کے علاوہ شاہ کی بے روک شاہی پر بندباندھنے کے لئے مختلف قسم کی کوششیں کی گئیں۔ شاہ کو عوام کی یہ باتیں پسند نہ آئیں ۱۹۰۸ء میں ایک مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت سے اس نے فوج کی مدد سے پارلیمنٹ کا محاصرہ کر لیا۔ اور لیڈروں کو گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکا دیا، ان کے گھر لوٹ لئے گئے اور ہر طرف خوف و دہشت کا ماحول پیدا کر دیا۔ ۱۹۰۷ء کا دستورِ اساسی بھی منسوخ کر دیا گیا اور اعلان ہوا کہ بادشاہ کے سوا اور کوئی حکمراں طاقت ایران میں نہیں ہے۔ مگر بادشاہ کی یہ مطلق العنانی زیادہ دیر تک باقی نہ رہ سکی۔ بغاوت و انقلاب کی چنگاریاں جگہ جگہ سے بھڑک اٹھیں آخر ۱۹۰۹ء میں شاہ کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا اور عنانِ حکومت اس کے بیٹے سلطان احمد کو سونپی گئی جس نے منسوخ شدہ

آئین کو بحال کیا اور عوام کو مطمئن کرنے کے لئے اپنے باپ کی بداعمالیوں کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔

روس، جرمن اور ایران

جب جرمنی نے بغداد ریلوے کی اسکیم بنا کر برلن سے خلیج فارس تک براہِ راست رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی تو روس نے اس خطرے سے کہ کہیں جرمنی کا ہاتھ ایران تک بھی نہ پہنچ جائے، اس ریلوے کی سخت مخالفت کی، اس مخالفت کے نتیجے میں پوٹسڈم کے مقام پر جرمنی اور روس کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس کی رو سے جرمنی نے شمالی ایران کو "روسی حلقۂ اثر" تسلیم کیا اور روس کو یہ یقین دلایا کہ ایران میں ریلیں بنانے کا کام اگر روسی سرمائے سے شروع کیا جائے تو جرمنی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا[1]۔"

جرمنی سے یہ سازباز کر لینے کے بعد روس کو برطانیہ سے نبٹنا تھا۔ داؤ گھات کی یہ پالیسی آہستہ آہستہ چلتی رہی اور دنیا کے حالات کے میں جو گتھیوں پر گتھیاں پڑتی رہیں، ان میں ایران کے قبضے کا بھی کافی ہاتھ رہا۔ آخر ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوگئی اور روس و برطانیہ دونوں کو جرمنی سے ٹکر لینی پڑی۔

۱۹۱۷ء میں جب زارِ روس کو شکست ہوئی اور روس میں بالشویک حکومت قائم کی گئی تو روس کی نئی حکومت کے پاس اتنا وقت تھا نہ اتنی طاقت کہ ایران پر قبضہ رکھ سکتی۔ اس لئے ایران سے روسی تسلط اٹھانے لینے کا اعلان کر دیا گیا، اس وقت برطانیہ کا وزیر خارجہ لارڈ کرزن تھا۔ اس نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر پورے ایران کے خاص خاص مقامات پر فوجی چھاونیاں قائم کر دی، اور اس کے ایک سال بعد ۱۹۱۹ء میں "شاہِ کجکلاہ" کے سامنے ایک معاہدہ پیش کیا گیا جس کی رو سے کل ایران برطانیہ

---

[1] دیکھو شسٹر کی کتاب The Strangling of Persia صفحہ ۲۲۶ اور ٹرکی اینڈ بغداد ریلوے صفحہ ۲۳۹

کے فوجی اور سیاسی اقتدار میں آجاتا تھا۔ شاہ نے اس معاہدے پر دستخط کر دیئے اور پورا ایران یونین جیک کے سائے میں آگیا۔

یہ دیکھ کر روس کی نئی حکومت نے ایران کے شمالی صوبوں میں "اشتراکی جمہوریتیں" قائم کرنی شروع کر دیں۔ سب سے پہلے ۱۹۲۰ء میں گیلان کے صوبے میں اشتراکی جمہوریت قائم کی گئی اور اس کے بعد صوبہ ماژندران کے زرخیز میدانوں میں بھی اس کے قیام کی کوشش کی جانے لگی۔

غرض اس وقت ایران کی آزادی بالکل سلب ہو چکی تھی اور سب کو یہ یقین ہو چکا تھا، شمال کے صوبوں میں اشتراکیت قائم ہو جائے گی اور جنوب میں برطانوی اقتدار کا جھنڈا لہرائے گا۔ لیکن ابھی ایران کے دماغ سے بوئے آزادی نہ گئی تھی۔ ایرانی فوجیں شمال میں اشتراکیت کے مقابلے میں شکست کھا رہی تھیں اور پیچھے ڈھکیلی جا رہی تھیں مگر شاہ ایران اپنے قصر نشاط میں بیٹھا عیش کر رہا تھا اور ہر اُس معاہدے پر بے دھڑک دستخط کرنے کے لئے تیار تھا جس میں اس کے اسباب عشرت پر آنچ نہ آتی ہو، ایرانی عوام اس صورت حالات پر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ مگر ان کے ہاتھ میں کوئی اقتدار و اختیار نہ تھا۔ ایران کا بادشاہ مطلق العنان تھا اور اپنے "منشائے اقدس و اعلیٰ" سے جو چاہتا تھا کر سکتا تھا، عوام بادشاہ کو قتل کر سکتے تھے۔ لیکن اب قتل کرنے سے کیا ہوتا ہی جب کہ سارا ملک دوسروں کے زیر نگیں آچکا ہی ——— ؟

رضا شاہ پہلوی

رضا شاہ پہلوی اس وقت ایک بالکل غیر معروف فوجی افسر تھا اور اس کی فوج روسی محاذ پر شکست کھا چکی تھی۔ شاہِ ایران کے احکامات سے سپاہی اور جنرل دونوں بددل ہو رہے تھے دشمن کے پھیلتے ہوئے اقتدار سے زیادہ خود اپنی اندرونی بدحالی سے ان کے دل بیٹھے جا رہے تھے۔ لیکن رضا شاہ پہلوی نے ہمت نہ ہاری اور ایران کو بچانے کی

ایک آخری کوشش کے طور پر ۱۹۲۱ء میں تھوڑی سی فوج نے کرشاہی محل پر دھاوا بول دیا۔ شاہِ ایران اب محض شاہِ شطرنج تھا، اُس نے یہ دیکھا تو گھبرا اٹھا اور فوراً رضا شاہ کو بلاکر اس سے گفتگو کی، رضا شاہ نے کہا، ایران کی حالت حد سے زیادہ خراب ہو چکی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب یہ برائے نام شاہی بھی ختم ہو جائے، ایران اغیار کے پنجۂ اقتدار میں پھنس چکا ہے اور اب اس کی نجات کی صورت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ آپ مجھے قسمت آزمائی کا موقع دیں اور موجودہ کمانڈران چیف اور وزیر اعظم کو معزول کر کے مجھے یہ فرائض سپرد کر دیں

شاہ بے اختیار تھا، رضا شاہ کی طاقت اس سے جو چاہتی منوا سکتی تھی۔ مجبوراً شاہ نے یہ مطالبہ منظور کر لیا۔ لیکن اصل مشکل اب یہ تھی کہ برطانیہ اور روس کا مقابلہ کیا جائے رضا شاہ پوری ہمت و بے جگری کے ساتھ اس میدان مقابلہ میں اُترا۔ ایران کے عوام کی پوری تائید و ہمدردی اس کے ساتھ تھی۔ ایران کو صرف ایک بہادر جنرل اور مدبر قائد کی ضرورت تھی رضا شاہ کی شکل میں وہ اُسے میسر آگیا۔ پھر ایک طرف تو عوام کی طاقت اپنے حق کو منوانے کے لئے پورے عزم وارادے کے ساتھ سر سے کفن باندھ کر میدانِ عمل میں اتر آئی اور دوسری طرف روس و برطانیہ کی باہمی رقابتوں نے روسی ایران یا برطانوی ایران کے مقابلہ میں آزاد ایران کو ترجیح دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دن بعد گیلان کی اشتراکی جمہوریت منسوخ ہوئی اور یہ صوبہ ایران کو واپس دیا گیا۔ ماژندران پر روسی فوجیں جو دھاوے بول رہی تھیں، وہ بھی ختم ہوئے اور روس سے معاہدۂ مصالحت ہوا۔ برطانیہ نے ۱۹۱۹ء میں جس معاہدے پر دستخط کرائے تھے اس پر بھی خط تنسیخ پھیر اگیا۔ برطانوی فوجیں ایران کے شہروں سے واپس ہوئیں اور ایران پھر ایرانیوں کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔

اب ایران میں رضا شاہ کی طاقت بے پناہ تھی۔ بادشاہ نے ۱۹۲۳ء میں اُسی

وزیراعظم بنا دیا اور اس طرح ملک کے نظم و نسق کی تمام ذمہ داریاں اس کے سپرد کر دی گئیں۔ اسی سال شاہ ایران اپنے آبائی دستور کے مطابق یورپ کی سیاحت کے لئے چلا گیا ایرانی عوام شاہ کی عیاشیوں اور فضول خرچیوں سے تنگ تھے، رضا شاہ نے ملک کو غیروں کے ہاتھ سے چھڑا لیا تھا مگر ابھی اپنوں سے بچانا باقی تھا۔ جب ترکی میں مصطفیٰ کمال نے جمہوریت کا اعلان کیا اور سلطنت و خلافت کو منسوخ قرار دیا تو رضا شاہ پہلوی کے دل میں بھی یہی حوصلہ پیدا ہوا، لیکن ایران و ترکی میں زمین و آسمان کا فرق ہے ترک تنظیم و اطاعت کے پتلے ہوتے ہیں، انھیں کسی ایک لڑی میں منسلک کر دینا اور ایک تنظیم کا پیرو بنا دینا بہت آسان ہے۔ وہ قدرتی فوجی اور پیدائشی سپاہی ہیں، ترکوں میں یا جنرل پیدا ہوتے ہیں یا سپاہی۔ لیکن ایران فرہاد و شیریں کا ملک ہے جہاں شاعر و مصور پیدا ہوتے ہیں اور رومان کی گلابی فضا میں شعر خوانی کرتے ہیں، ایران کی اس قومی افتادِ طبیعت کی بنا پر کسی ایک تنظیم میں ایرانیوں کو منسلک کرنا سخت دشوار ہے پھر ترکی میں ایک ترکی نسل بستی ہے۔ لیکن ایران میں کئی نسلیں آباد ہیں

ایران کی سیاسی پسماندگی اور شیعیت

مگر رضا شاہ ان تمام مشکلات پر قابو پا لیتا اگر مذہب کی زبردست مشکل اس کے راستے میں حائل نہ ہوتی۔ ایران کے عوام زیادہ تر شیعہ ہیں اور وہ خلفاء کے انتخاب کے قائل نہیں۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ داعی اسلام کے بعد ان کا جانشین ان کے بیٹے کو ہونا چاہیئے تھا مگر چونکہ آپ کا کوئی بیٹا نہ تھا، اس لئے یہ منصب آپ کے داماد حضرت علی کو ملنا چاہیئے تھا۔ اسی بنا پر وہ حضرت علی سے قبل کے تینوں منتخبہ خلفاء کو غاصب سمجھتے ہیں جنھوں نے آلِ رسول کا حق مار کر داعی اسلام کی جانشینی کی شیعوں کے اس عقیدے کی وجہ سے وہ جمہوریت کو اسلام کے اصول کے منافی سمجھتے ہیں اور اُسی مطلق العنان شہنشاہیت کے قائل ہیں جس میں باپ کے بعد بیٹا اور بیٹے کے بعد پوتا جانشین ہوتا ہے۔

شیعوں کے اس عقیدے کی بنا پر رضا شاہ پہلوی مصطفےٰ کمال کی تقلید میں جمہوریت قائم نہ کر سکا۔ اس نے اس بارے میں ایرانی اہل الرائے حضرات کو ہموار کرنے کی بہت کوشش کی، مگر صدیوں کے پرانے عقیدے کو مٹا دینا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ نجف و کربلا کے مجتہدین اس کے لئے تیار نہ تھے کہ رضا شاہ کو جمہوریت کا پریذیڈنٹ بنا دیں۔ مجبوراً رضا شاہ کو سپر ڈالنی پڑی۔ اور جس نمائندہ اسمبلی کو وہ جمہوریت میں تبدیل کر کے اقتدار و اختیار کی باگ عوام کے ہاتھ میں دینا چاہتا تھا، اس نے جمہوریت کے حق میں فیصلہ کرنے کے بجائے صرف شاہ کو معزول کرنے پر اتفاق کیا اور دسمبر ۱۹۲۵ء میں رضا شاہ کو شاہی اختیارات سونپے گئے۔ تاہم رضا شاہ نے ایک دستورِ حکومت مرتب کیا اور وہ کم از کم مطلق العنان شاہی کے بجائے "دستوری شاہی" نافذ کی گئی۔ مگر اس دستوری شاہی میں اقتدار و اختیار کا سرچشمہ عوام نہیں، بادشاہ ہے۔ یہ دستوری شاہی اپنے عمل اور اصول دونوں کے اعتبار سے انگلستان کی "دستوریت" سے بالکل مختلف ہے۔

سیاسی حالت ایرانی عوام کی ذہنی کیفیت اور مذہبی عقائد کی وجہ سے رضا شاہ کی کوششیں پوری طرح بار آور نہ ہو سکیں، اس نے ایک پارلیمنٹ (مجلس) بنائی اور اسی میں سے وزراء کا انتخاب کرنا شروع کیا۔ مگر اس کے باوجود عوام میں سیاسی اقتدار کے حصول کا جذبہ پیدا نہ ہوا اور پیدا کیسے ہوتا جب وہ شاہی کو مذہب کے عین مطابق سمجھتے ہیں اور جمہور کے ہاتھ میں اقتدارِ اعلیٰ کو سونپنا مذہب کے خلاف جانتے ہیں؟ اس صورتِ حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ دستوری حکومتوں میں جس قسم کی سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں، وہ ایران میں نہ بن سکیں جب مجلس (پارلیمنٹ) کے الکشن کا زمانہ آتا ہے تو وقتی طور پر کچھ جماعتیں بن جاتی ہیں، مگر جیسے ہی انتخاب ختم ہوتا ہے۔ ان جماعتوں کا شیرازہ بھی بکھر جاتا ہے۔ پھر جو لوگ منتخب ہو کر "مجلس" میں پہنچتے ہیں، وہاں بھی ان کی کوئی پارٹی نہیں ہوتی۔ ہر ایک وقتی و عارضی طور پر اپنے اپنے مفاد کے مطابق ادھر

اُدھر جھکتا رہتا ہے، اخبارات دس پندرہ نکلتے ہیں۔ مگر حکومت پر کوئی نکتہ چینی کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی۔ دستوری و جمہوری حکومتوں میں عوام کو حکومت کے اعمال و افعال پر احتساب و نکتہ چینی کا جو حق ہوتا ہے اس کا تصور ایران میں مفقود ہے۔ عوام کا نظریہ صرف یہ ہے کہ بادشاہ تو ہونا ہی چاہیئے، البتہ اُسے رعایا کا خیال رکھنا چاہیئے۔

لیکن شمال میں روسی اشتراکیت کے اتصال اور مغرب میں ترکی اور عراقی دستوریت کے پڑوس کی وجہ سے یہ خیالات روز بروز کم ہونے لگے اور ایسے افراد کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی جو موجودہ حالات سے مطمئن نہیں تھے اور معاشرت و معیشت کے نظام میں ایک بنیادی تبدیلی کرنا چاہتے تھے۔

رضا شاہ کے سامنے سب سے بڑے سوال دو تھے۔ ایک تو امن عامہ کو برقرار رکھنا اور دوسرے ملک کی معاشی حالت کو ٹھیک کرنا۔ سابق شاہ کے زمانہ میں ہر ضلع اور ہر صوبہ برائے نام طہران سے تعلق رکھتا تھا۔ ہر جگہ جو طاقتور تھا وہ چھایا ہوا تھا اور وہاں اسی کا ڈنکا بجتا تھا۔ لیڈروں اور ڈاکوؤں کا دور دورہ تھا اور ملک میں کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو ان کی سرکوبی کر سکے۔ رضا شاہ نے سب سے پہلے اسی طرف توجہ کی اور فوج کی مدد سے ایران میں امن و امان قائم کیا۔

معاشی حالات

لیکن معاشی سوال کو حل کر دینا اتنا آسان کام نہ تھا۔ ایران کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ ایک دم نئے آلات سے کاشتکاروں اور مزدوروں کو مسلح کر سکتا۔ ایران کا رقبہ سوا چھ لاکھ مربع میل ہے یعنی ہندوستان کا ایک تہائی لیکن اس کا ایک بہت بڑا علاقہ ریگستان ہے تاہم ایک وسیع رقبہ بہت سرسبز و شاداب ہے۔ جہاں گیہوں، چاول، گنّا، تمباکو اور افیم کی پیداوار بکثرت ہے۔ صنعت و حرفت کے میدان میں بھی ایران کچھ کم نہیں، یہاں کے قالین آج بھی یورپ اور امریکہ کی بہترین عمارتوں کی زینت بنائے جاتے ہیں، اونی شال اور ریشمی کپڑے بھی بکثرت تیار ہوتے ہیں۔

زرکاری کا کام بھی اعلیٰ پیمانے پر کیا جاتا ہی۔ لوہے کے ہتھیار بنانے والوں کی تعداد بھی کافی ہی لیکن مشین سازی کی صنعت میں ابھی ایران بہت پیچھے ہی۔ اچس شکر اور کپڑے کے کچھ کارخانے رضا شاہ نے قائم کرائے ہیں مگر ابھی دوسری مصنوعات میں ایران بہت بڑی حد تک یورپ کا دستِ نگر ہی۔

تاہم ایران کی عام حالت ہندوستان کے مقابلے میں اچھی ہی۔ اے۔ ٹی ولسن اپنی کتاب "پرشیا" میں لکھتا ہی:

"ایران کا معیار زندگی ہندوستان سے بلند ہی اگرچہ یورپ کا مقابلہ نہیں کرتا۔ ایران کے معمولی خوشحال کسان اور دیہاتی بھی خمیری روٹی، پنیر، گوشت، چاول مُرغ اور انڈے استعمال کرتے ہیں البتہ بہت غریب دیہاتیوں کی گذر صرف جو کی روٹی پر ہوتی ہی۔ شکر اور چائے کا استعمال ایران میں بے حد ہی۔ لوگ عموماً اچھے لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں اور بہت کم چہروں پر مفلسی کی مردنی نظر آتی ہی۔ ایران میں انتہائی غربت اور انتہائی دولت کے مناظر بہت کم نظر آتے ہیں جیسا کہ صنعتی یورپ میں دیکھے جاتے ہیں۔ یہاں کا عام معیار زندگی سادہ ہی مگر ایسا جو انسانی ضروریات کی کافی تکمیل کرتا ہی۔"

اگرچہ رقبے کے اعتبار سے ایران، ہندوستان کا ایک تہائی حصّہ ہی، لیکن آبادی میں اسے ہندوستان سے کوئی نسبت نہیں۔ ہندوستان کی چالیس کرور آبادی کے مقابلے میں ایران کی آبادی صرف سوا کرور نفوس پر مشتمل ہی۔ آبادی کی اس کمی کی وجہ سے ایران اپنے فرزندوں کی کافی کفالت کرسکتا ہی۔ لیکن اگر آج کل کے ترقی یافتہ طریقوں کو استعمال کیا جائے اور جدید آلات اور مشینوں سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے تو ایران موجودہ آبادی سے کئی گنی زیادہ آبادی کی پرورش بھی اچھی طرح کرسکتا ہی۔

تیل آج کل کی دنیا میں ایران کی سب سے بڑی اہمیت اس کے تیل کے چشموں

کی بنا پر ہو جو جنوبی ساحل کے قریب واقع ہیں اور خیال کیا جاتا ہو کہ شاید بعض اور مقامات بھی ایسے ہیں جہاں مزید چشمے دریافت ہو سکتے ہیں۔ اسی بنا پر سنہ ۱۹۰۱ء میں برطانیہ نے شاہ ایران سے یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ تبریز سے لے کر خراسان تک کے جنوبی علاقے میں جتنے چشمے دریافت ہوں گے، ان پر برطانوی سرمایہ دار قابض ہوں گے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں رضا شاہ نے یہ رعایت منسوخ کر دی جس نے برطانوی حلقوں میں تھوڑی سی کھلبلی مچا دی تھی مگر ایک سال بعد ہی ایک نیا معاہدہ مرتب ہوا جس میں سابقہ علاقے کو کم کر کے نصف کر دیا گیا۔ اس وقت ایران میں جو چشمے ہیں ان میں ایران اور برطانیہ دونوں کا سرمایہ لگا ہوا ہو لیکن برطانوی سرمایہ کے مقابلے میں ایرانی سرمایہ ایک چوتھائی کے قریب ہو۔ ان چشموں سے ہر سال کروڑوں من تیل نکالا جاتا ہو سنہ ۱۹۳۹ء میں ۲۸ کروڑ من تیل نکالا گیا۔[۱۵] مگر اس کی آمدنی کا جو حصہ ایران کو ملتا ہو وہ ایرانی بجٹ کا ایک چوتھائی ہوتا ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان چشموں پر ایران کا ہی تسلط ہو جائے تو ایران کے موجودہ بجٹ میں کافی اضافہ ہو سکتا ہو لیکن آجکل یہ رقم ایران کے بجائے انگلستان چلی جاتی ہو۔

افیم اور موتی

تیل کے بعد ایران کی قیمتی پیداوار افیم ہو۔ لیکن افیم چونکہ نشہ لانے والی چیز ہو جس کو اخلاقی اعتبار سے کم سے کم کرنے کی ضرورت ہو اس لئے انجمن اقوام نے رضا شاہ سے کہا تھا کہ اس کی کاشت کو ختم کر کے اس کے بجائے کسی اور چیز کی کاشت کی جائے اس کے جواب میں رضا شاہ نے کہا کہ میں اس کے لئے بخوشی تیار ہوں بشرطیکہ انجمن اقوام کے "ساتھی ممبر" ایران کی دوسری پیداوار کو اپنے ملک میں بلا محصول یا کم سی کم محصول سے جانے دیں اور

---

۱۵ اسٹیمین ایر بک سنہ ۱۹۴۴ء

جنگی کے محصولوں کی جو اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہیں انھیں ہٹا دیں یا کم از کم اُن کی لمبائی کو کچھ کم کر دیں۔ رضا شاہ کے اس جواب پر گفت و شنید منقطع ہو گئی۔[1]

ایران کے بالمقابل عمان اور کویت کے ساحلی علاقے ہیں۔ یہ دونوں علاقے برطانیہ کی "حمایت" میں ہیں۔ اس کے علاوہ خلیج فارس کا ایک چھوٹا سا جزیرہ بحرین (جو تجارتی اور فوجی نقطۂ نظر سے ایک اہم جگہ ہے) وہ بھی برطانیہ کی سرپرستی میں ہے۔ رضا شاہ پہلوی کو بحرین کی برطانوی سرپرستی پر سخت اعتراض ہے۔ اس لئے کہ دنیا کے بہترین موتی پیدا کرنے والے علاقوں میں ایک بڑا علاقہ بحرین کے ارد گرد کا سمندر بھی ہے۔ دنیا میں موتیوں کی جو مجموعی پیداوار ہر سال ہوتی ہے اس کا دسواں حصّہ یہاں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایران اس اہم ترین معاشی مرکز پر تسلط چاہتا ہے۔

ریلیں

ایران میں ریلوے لائن صرف ایک ہے جو شمال میں بحرِ اسود کے کنارے سے چل کر جنوب میں خلیج فارس تک آتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے ایک ریل ایران کی سرحد میں صرف چند میل داخل ہو کر دُزداب پر ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عراق سے آنیوالی دو ریلیں تبریز اور قصر شیریں کے سرحدی مقامات تک آکر رک جاتی ہیں۔ ریل نہ بنانے کی وجہ یہ ہے کہ رضا شاہ کو روس اور برطانیہ کا سخت ترین خوف لاحق رہا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اگر ایران میں ریلیں بنا دی گئیں تو ان قوموں کو حملہ کرنے کی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ بحرِ اسود سے خلیج فارس تک جو ریل ہے وہ بھی روس کے مسلسل اصرار پر بنائی گئی ہے اس لئے کہ روس کو اپنے سامان تجارت کو بحرِ ہند تک لے جانے کے لئے اس کی سخت ضرورت تھی۔

روس اور برطانیہ دونوں کے مفاد ایران کے ساتھ وابستہ ہیں۔ روس کے پاس

---

[1] پوسٹ وار ورلڈ: جیکسن

سمندر تک جانے کا کوئی آزاد راستہ نہیں اس لئے وہ ہر اُس علاقے پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتا ہے جہاں سے اُسے سمندری راستہ مل سکتا ہے۔ قسطنطنیہ اور دردانیال پر سالہا سال تک روس اور ترکی کی جنگیں صرف اسی وجہ سے ہوئیں۔ پروفیسر براؤن نے خوب کہا ہے کہ "جب تک ایران کے ساحل سے بحرِ ہند کا پانی ٹکراتا رہے گا، روس اپنی ترقی کے لئے اس پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتا رہے گا۔"[۱]

برطانیہ کو کسی بحری راستے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہندوستان کی حفاظت اور مشرق کی تجارت کی نگرانی کے لئے اُسے ایران پر اپنا پہرہ قائم رکھنے کی ضرورت ہے ان ہی وجوہ کی بنا پر رضا شاہ نے ایران کی معاشی ترقی کے کام کے لئے برطانیہ اور روس سے ماہرینِ فن تک بلانا پسند نہیں کیا۔ ان کے بجائے اس نے ہمیشہ فرانس بلجیم اور امریکہ کے ماہرین کو بلایا۔

شیعہ سنی قضیہ

معاشرتی اصلاح کے میدان میں بھی رضا شاہ نے بہت کچھ کام کیا۔ شیعہ سنی کا جھگڑا یہاں صدیوں سے چلا آتا تھا اور یہی قضیہ ایران کا سب سے بڑا قضیہ اور سب سے بڑا عقدۂ لاینحل تھا۔ اس لئے کہ دنیا میں صرف ایران ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں شیعہ اکثریت میں ہیں اور حکومت بھی شیعہ مذہب کے افراد کی رہی ہے۔ شیعوں میں تبرّے کے نام سے اوّل کے تین خلفائے راشدین کو لعنت ملامت کرنا ثواب میں داخل ہے جس کی وجہ سے سُنی عقیدے کے لوگوں سے قدرتاً تصادم ہوتا ہے۔ رضا شاہ نے اس سلسلہ میں کافی اصلاح کی اور علانیہ تبرّا کرنے کو جرم قرار دیا۔ اس کے علاوہ سنیوں کو پرسنل لا (قانونِ شریعت) کی آزادی دی گئی اور سُنی مقدمات کو فیصل کرنے کے لئے سُنی قاضی مقرر کئے گئے اس طرح دونوں فرقوں

---

[۱] "انقلاب ایران" (پرشین ریوولیوشن) (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۹ء) صفحہ ۱۰۲

کے درمیان باہمی تعلقات کی تلخیاں بہت بڑی حد تک دور ہوگئیں۔ پھر رضا شاہ نے اسی مقصد سے ۱۹۳۶ء میں سلطان مصر کی بہن سے اپنے بیٹے محمد رضا پہلوی کی شادی کی اور اس طرح شیعہ سُنی اتحاد کی ایک نئی مثال ایرانی عوام کے سامنے پیش کی۔

ایران اور ترکی

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ابھی ایران ترقی کے میدان میں ایک نوآموز سے آگے نہیں بڑھا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں مذہبی عصبیت کی وجہ سے جمہوری نظام قائم نہیں ہوسکا۔ رضا شاہ ایران کا محسن عظیم تھا مگر جب اُسے مطلق العنان شاہ بنا دیا گیا تو آہستہ آہستہ اُس میں بھی شاہانہ صفات پیدا ہوگئیں اور اسی لئے اس کی ابتدائی دور میں جو خوبیاں تھیں وہ بعد میں باقی نہ رہیں۔ ترکوں کی طرح ایرانی عوام کو ہیئت حاکمہ کے ساتھ براہ راست رابطہ پیدا نہ ہوسکا اور ان میں وہ مضبوطی نہ آسکی جو کسی قوم کی حفاظت کی سب سے بڑی ضمانت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۱ء میں برطانیہ اور روس کو بڑی آسانی کے ساتھ ایران میں داخل ہو جانے کی جرأت ہوئی اور رضا شاہ کو مجبوراً عنانِ حکومت اپنے بیٹے محمد رضا پہلوی کو دے کر خود ایران کو خیرباد کہنا پڑا۔

ایران کی سیاست و معاشرت پر مجتہد اعظم کو بہت بڑا اقتدار حاصل ہے جو نجف اور کربلا میں رہتا ہے۔ ایران کے تقریباً تمام شہروں اور قصبوں اور شہروں میں اُس کے سند یافتہ مجتہد پھیلے ہوئے ہیں اور عوام کی رائے عامہ پر زبردست اثر و اختیار رکھتے ہیں، تاہم یہاں کی حالت خلافتِ عثمانیہ کی ترکی سے مختلف ہے کیونکہ مجتہد اعظم کو ترکی کے شیخ الاسلام کی طرح سرکاری و آئینی طور پر کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ملک کا سرکاری مذہب اثنا عشری تبعیت ہے۔ لیکن چونکہ بارھویں امام محمد (متوفی ۸۷۹ء) کے بعد شیعوں میں الوہی امامت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ترکی میں جو مذہبی حیثیت شیخ الاسلام اور خلیفۃ المسلمین کو حاصل تھی وہ ایران

میں نہ مجتہد اعظم کو حاصل رہی نہ شاہ کو، یہ لوگ اسلام کی اُس مرکزیت سے بھی بے تعلق ہیں جو خلافت کے نام سے مسلمانوں میں پائی جاتی تھی، اسی بنا پر شیخ جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی سے بھی یہاں بہت زیادہ دلچسپی نہ لی گئی، شیعہ سنی اختلافات کی وجہ سے ترکی اور افغانستان کی ہمسایہ حکومتوں سے ایران کا معاشرتی اور سیاسی تعلقات ہمیشہ تلخ رہے۔

میثاق سعد آباد عالم اسلام سے ایران کی اس بے تعلقی کو جو مذہبی تعصب پر مبنی تھی شاہ ایران نے بہت شدت سے محسوس کیا اور کچھ تو اندرونی اصلاحوں کی مدد سے اور کچھ مصر و ترکی وغیرہ کے ساتھ نئے رابطے پیدا کر کے اس حالت کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۳۷ء میں ترکی، عراق، اور افغانستان کے درمیان باہم دوست رہنے اور ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہ اٹھانے کا ایک سمجھوتہ کیا گیا جو میثاق سعد آباد کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ ایران کے قصر سعد آباد میں اس پر دستخط کئے گئے تھے۔ اس میثاق نے آس پاس کے اسلامی ممالک سے ایران کو بہت قریب کر دیا اور باہمی ارتباط کی ایک ایسی نئی فضا پیدا ہونے لگی جو شاہ طہماسپ صفوی (از ۱۵۲۳ء) کے بعد سے ناپید ہو گئی تھی۔

تعلیم رضا شاہ سے پہلے ایرانی عوام کی تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ سارا دار و مدار صرف ان مکاتب و مدارس پر تھا جو اوقاف کی رقم سے چلائے جاتے تھے اور جن میں سے بعض کو کچھ امداد حکومت دیتی تھی ان مکاتب و مدارس میں پرانے ڈھب کی مذہبی تعلیم دی جاتی تھی اور سائنس یا صنعت و حرفت کی تعلیم کا نام بھی کوئی نہ جانتا تھا، رضا شاہ کے نئے ایران نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے طہران میں ایک یونیورسٹی کھولی اور اوقاف کے مدارس و مکاتب کو بھی منظم کرنے کی کوشش کی۔ ایران کی تعلیمی رفتار کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ۱۹۲۱ء میں یہاں صرف ۶۱۲

مدارس تھے جن میں ۵۵ ہزار طالب علم پڑھتے تھے۔ مگر سولہ سال بعد ۱۹۳۶ء میں مدارس کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ گئی اور پڑھنے والے طلبا پونے تین لاکھ کے قریب ہوگئے[۱]۔ لیکن ماضی کے لحاظ سے یہ تبدیلی کتنی ہی خوشگوار ہو، ایران کی معیاری ضرورت کے نقطۂ نظر سے کچھ بھی نہیں۔ ان اعداد و شمار کا مطلب یہ ہے کہ ایران میں صرف تین چار فی صدی آبادی کے لئے تعلیم کا انتظام ہے۔

آبادی ایران میں عام مردم شماری اب تک نہیں کی گئی، البتہ بڑے بڑے شہروں کی مردم شماری کی گئی ہے۔ تاہم اندازہ یہ ہے کہ مجموعی آبادی ڈیڑھ کروڑ سے دو کروڑ تک ہوگی، ایران کے وسیع رقبے کو دیکھتے ہوئے یہ آبادی بہت کم ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ایران میں آٹھ دس کروڑ انسانوں کو جذب کرنے کی قابلیت موجود ہے۔ بشرطیکہ اس کی اقتصادی صلاحیتوں سے صحیح طور پر فائدہ اٹھایا جائے۔ یہاں تیل کے علاوہ مینگنیز، نکل، لوہا اور بورکس وغیرہ کے ذخیرے کافی تعداد میں زمین کے اندر دفن ہیں، اگر ان کے نکالنے کا پورا انتظام کیا جا سکے تو ایران کی حالت کہیں سے کہیں پہنچ سکتی ہے۔ نیشاپور میں فیروزے کی کان بھی ہے۔

فوجی طاقت ہر ملک کی فوجی طاقت کا دامن معاشی حالت سے بندھا ہوتا ہے۔ اس لئے ڈیڑھ دو کروڑ کی ایرانی آبادی کے ایک غریب ملک کی فوجی طاقت موجودہ دنیا میں کوئی قابلِ اعتبار چیز نہیں ہو سکتی۔ تاہم رضا شاہ نے اکیس سال سے زیادہ کی عمر والے ہر ایرانی کے لئے فوجی تربیت لازمی اور جبری قرار دے کر پہلے کے مقابلے میں حالت بہت بہتر کر دی ہے۔ تھوڑی سی ہوائی فوج بھی ہے جن میں کام کرنے والوں کو یورپ بھیج کر تعلیم دلائی جاتی ہے۔

---

[۱] اسٹیٹسمین ایر بک ۱۹۴۴ء

غرض مجموعی حیثیت سے آج کا ایران قطعی طور پر کل کے ایران سے بہتر ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ رضا شاہ کے ابتدائی عہد میں جس سرگرمی کے ساتھ اصطلاحات کا کام جاری کیا گیا تھا، وہ رفتہ رفتہ بہت ہلکا پڑتا گیا۔ ورنہ صورت حال میں نمایاں تبدیلی ہو سکتی تھی۔ رضا شاہ نے ایران کو ایک قومی وحدت بنانے اور حکومت و عوام کے درمیان یکجہتی و یک رنگی پیدا کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ اصطلاحات جاری کی گئیں، مگر عوام میں جوش پیدا نہ کیا گیا۔ قبائلی تعصب، خانہ بدوش افراد کی جہالت اور مجتہدوں کی دقیانوسیت نے ایران کو نئی دنیا کے دوش بدوش کھڑے ہونے کا موقعہ بہت کم دیا۔ دوسری طرف روس کے ڈر سے سڑکیں اور ریلیں بنانے میں بے حد تامل سے کام لیا گیا۔[۱]

غرض یہ تھی ایران کی حالت جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور اس کے تیسرے سال ۱۹۴۱ء میں اتحادی فوجیں اس کے حدود میں دندناتی ہوئی داخل ہو گئیں۔ اس کے بعد ایران پر جو کچھ بیتی وہ ان حوادث کا ایک حصہ ہے جو جنگ اور جنگ کے اثرات مابعد کی داستان سے تعلق رکھتے ہیں اور جو جلد دوم کے آخری ابواب کا موضوع بحث ہیں۔

---

[۱] ایران کی سیاسیات، معاشیات اور قدیم و جدید تاریخ کے لئے دیکھو "پرشیا آف دی پرشینز" از سردار اقبال علی شاہ (لندن ۱۹۲۹ء) ماڈرن پرشیا اینڈ ہر اکونومک سسٹم از صادق (نیویارک ۱۹۳۲ء) نیو پرشیا (نیویارک ۱۹۳۷ء) اَن ویلڈ ایران از Rodkins (لندن ۱۹۴۲ء) ماڈرن ایران (لندن ۱۹۴۱ء) از Elwell-Seton

باب ۲۶

افغانستان

روس و برطانیہ کی رقابتوں کی آماجگاہ

ہندوستان کی وجہ سے افغانستان، برطانیہ کی نگاہ میں زبردست اہمیت رکھتا ہی ڈھائی لاکھ مربع میل کا یہ پہاڑی علاقہ ہندوستان کو روس کی حوصلہ مندانہ دستبرد سے دور رکھتا ہی۔ یہی وجہ ہی کہ جب سے ہندوستان کی زرخیز و سرسبز وادیاں انگریزی تسلط میں آئی ہیں۔ افغانستان کو برطانوی حلقۂ اثر میں لانے کی سخت ترین کوششیں کی گئی ہیں۔ ہندوستان دنیا کا زرخیز ترین ملک ہی اور چونکہ یہاں چالیس کروڑ انسانوں کا جم غفیر بستا ہی اس لئے تجارتی دُنیا کے لئے نہ صرف یہ ایک بہترین "بازارِ خریداری" ہی ہی بلکہ "بازار فروخت" بھی بہترین ہی۔ جس قوم کو چالیس کروڑ گاہک اپنے مال کی کھپت کے لئے مل جائیں پھر اُسے دنیا میں اور کیا چاہیے، ہندوستان میں کچا سامان اتنی افراط سے پیدا ہوتا ہی کہ صنعتی ممالک کے کارخانوں کیلئے اس سے اچھا بازار دنیا میں اور کوئی نہیں ابن بطوطہ جس نے چودھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی اور جو اس زمانے کے ہندوستان پر ایک معتبر ترین شاہد مانا جاتا

ہے، اس نے اپنے سفرنامے میں ہندوستان کے صرف ایک صوبے بنگال کی سرسبزی و شادابی اور زرخیزی و زرپاشی کی بیحد تعریف کی ہے۔ لیکن چونکہ وہ مراکش کی آب و ہوا کا رہنے والا تھا، اس لئے ہندوستان کی آب و ہوا تو اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ مگر یہاں کی دولت و پیداوار کی بنا پر اس نے بنگال کا نام "دوزخ پُر از جنت" رکھا تھا یعنی اگرچہ گرمی یہاں جہنم کی سی ہوتی ہے، مگر پیداوار و سرسبزی کے لحاظ سے اس کی سرزمین جنت الفردوس سے کم نہیں۔

افغانستان برطانوی مفاد کے دائرے میں

زمانے کے انقلابات سے یہ "دوزخ پُر از جنت" انیسویں صدی میں برطانوی جھنڈے کے نیچے آ گئی۔ لیکن اس کی دولت و ثروت کا نظارہ کچھ اتنا دلفریب ہے کہ دنیا کی ہر طاقتور قوم اس پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتی ہے۔ اس لئے انگریزوں کو ابتدا ہی سے اس کے تحفظ کی بڑی فکر رہی ہے۔ اسی ہندوستان کی خاطر ملایا پر قبضہ کر کے سنگاپور کو فوجوں سے مسلح کیا گیا، اسی کی غرض سے ایران، عراق اور فلسطین کو انتداب کی گرفت میں لایا گیا۔ پھر ظاہر ہے کہ جس ہندوستان کی حفاظت کے لئے اتنے دور و دراز مقامات پر چوکیاں قائم کی گئی تھیں، وہ اپنے ایک قریب ترین پڑوسی افغانستان کی طرف سے بے پروا کیسے رہ سکتا تھا۔ چنانچہ جس طرح ہندوستان کے مشرقی بازو برما کو فتح کر کے اسے ہندوستان کا پشتیبان بنایا گیا اسی طرح مغربی بازو افغانستان کو بھی ہندوستان کی پشت پناہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش ۱۸۳۸ء میں کی گئی تھی جو ۱۸۴۲ء تک جاری رہی۔ مگر افغانستان میں چونکہ مذہب و معاشرت کا اختلاف نہیں ہے یا برائے نام ہے اور نسل و نسب کے اعتبار سے بھی وہ بڑی حد تک ایک ہے، اس لئے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی یہاں کامیاب نہ ہو سکی اور اگرچہ برطانیہ کی منظم فوجوں نے کئی بار

کابل تک یلغار بول کر افغانستان کے اہم مقامات کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ مگر اس پر قبضہ رکھنا ممکن نہ ہوا اور ہر بار واپس ہٹنا پڑا۔

پہلی گرفتاری اور رہائی

اٹھارویں صدی تک افغانستان کا مغربی حصہ ایران کے قبضے میں تھا اور مشرقی حصے پر ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کا پرچم لہراتا تھا۔ مگر ایران میں نادر شاہ کی وفات کے بعد اور ہندوستان میں اورنگ زیب کے بعد سے افغانستان پر ایران و ہندوستان کی گرفتیں ڈھیلی ہونی شروع ہوئیں ایک صدی تک سخت قسم کی خانہ جنگیوں کا سلسلہ جاری رہا، ہر حوصلہ مند امیر آگے بڑھ کر اپنا سکہ جمانا چاہتا تھا مگر کسی کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوتی تھی۔ ادھر ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا جو آفتاب طلوع ہو رہا تھا اس کی کرنیں بھی افغانستان تک پہنچ رہی تھیں، ایک چالاک شکاری کی طرح انگریز، داؤ گھات میں لگے ہوئے تھے اور اس بات کی سرتوڑ کوشش ہو رہی تھی کہ کسی طرح افغانستان کو بھی برطانوی جھنڈے کے نیچے لے آیا جائے۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں پنجاب پر رنجیت سنگھ کی قیادت میں سکھوں کا زور تھا۔ انگریزوں نے رنجیت سنگھ کی درپردہ امداد کر کے افغانستان کو اپنے قبضے میں لانا چاہا۔ مگر ۱۸۳۴ء میں امیر دوست محمد نے سکھوں کو ایسی زبردست شکست دی کہ انگریزوں کو اس کی نئی ابھرتی ہوئی طاقت سے خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ۱۸۳۸ء میں یہ بہانہ بنا کر کہ رنجیت سنگھ ہمارا دوست تھا۔ اس لئے ہم اس کی مدد کریں گے افغانستان پر دھاوا بول دیا گیا۔ تھوڑی جدوجہد کے بعد انگریزی فوج نے (جس میں ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد، انگریزی سپاہیوں سے زیادہ تھی) افغانستان کے اہم شہروں پر قبضہ کر لیا اس کامیابی پر کلکتہ سے لے کر لندن تک بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ کابل میں انگریزی چھاؤنی بنائی گئی اور سولہ سترہ ہزار مسلح سپاہی متعین کئے گئے۔ سر میک لیٹن اور سر برنیز کو بطور گورنر مقرر کیا گیا۔ لیکن افغانستان کی حالت، ہندوستان سے مختلف تھی

انگریزوں نے افغانیوں کی فطرت کو سمجھنے میں غلطی کی۔ برطانیہ کا قبضہ تو ہو گیا مگر بغاوت کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگتی رہیں، دوسرے ہی سال یہ چنگاریاں بھڑک اٹھیں ہر طرف سے بغاوت کا طوفان امنڈ پڑا، ہزاروں مسلح افغانیوں نے انگریزی چھاونی کو گھیر لیا اور سر برنیز اور اس کے بھائی کو چاقوؤں سے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا بہت سے انگریز افسر مار ڈالے گئے اور جو بچے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سولہ سترہ ہزار فوجیوں میں سے صرف ایک شخص ڈاکٹر برائڈن جان بچا کر بھاگ سکا۔

دوسری گرفتاری

اپنے عزائم کی شکست کے بعد انگریزوں نے افغانستان میں مداخلت نہ کرنے کی پالیسی بنائی اور افغانیوں کو مختلف طریقوں سے یہ یقین دلایا گیا کہ ہم تمہاری آزادی میں مطلق کوئی دخل دینا نہیں چاہتے مگر چونکہ افغانستان میں کوئی طاقتور حکمراں ابھی تک پیدا نہ ہوا تھا اور مختلف قبائلی سردار باہم برسر پیکار تھے۔ اس لئے انگریزوں نے اس ڈر سے کہ کہیں روس کا اثر افغانستان سے گذر کر ہندوستان تک نہ پہنچ جائے آہستہ آہستہ پھر قدم بڑھانے شروع کئے۔ ۱۸۸۷ء میں ایک بار پھر افغانستان پر انگریزی فوجوں نے چڑھائی کر کے اس کے تمام اہم مورچے سر کر لئے۔ کابل میں ایک انگریز ریذیڈنٹ متعین کیا گیا اور اس کی حفاظت کے لئے انگریزوں اور ہندوستانیوں پر مشتمل ایک ہتھیار بند فوج بھی رکھی گئی۔ مگر اس مرتبہ بھی افغانیوں کو دبانے کی کوشش ناکام رہی۔ اسی سال ہزاروں افغانیوں کے غول کے غول چاروں طرف سے امنڈ پڑے اور ریذیڈنسی پر حملہ کر کے ریذیڈنٹ اور اس کے عملے کو مولی گاجر کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔

اس واقعے کے بعد انگریزوں نے پوری طرح یہ محسوس کر لیا کہ افغانستان کو محکوم بنا کر رکھنا ناممکن ہے۔ تاہم اب یہ کوشش کی گئی کہ کسی طرح یہاں کی حکومت سے دوستانہ تعلقات پیدا کئے جائیں اور کم از کم ایسی آزاد حکومت بنا دی جائے جو روس کے

کے بجائے انگریزوں کی دوست ہو۔

امیر عبدالرحمان ۱۸۸۰ء میں امیر عبدالرحمان تخت پر بیٹھے یہ بہت بیدار مغز اور معاملہ فہم آدمی تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ روس اور برطانیہ دونوں کے مقاصد کو خوب سمجھتے تھے اور دونوں کی اغراض کے اسباب جانتے تھے۔ انہوں نے انگریزوں کو یقین دلایا کہ اگر وہ افغانستان کو اپنی سازشوں کا مرکز بنانا چھوڑ دیں تو ہندوستان وافغانستان کے تعلقات خوشگوار رہ سکتے ہیں۔ انگریزوں نے اس پیشکش کو غنیمت سمجھا اور ۱۸۸۱ء میں تمام برطانوی فوجیں افغانستان سے نکل آئیں۔ تاہم روس کے مقابلے میں انگریزوں کو اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ امیر عبدالرحمان نے برطانوی حکومت سے جو صلحنامہ کیا اس میں افغانستان کے خارجی معاملات پر نگرانی رکھنے کا اختیار برطانیہ کو دیا گیا لیکن بعد میں جب افغانستان کی طاقت بڑھتی گئی، تو رفتہ رفتہ یہ اختیار کم سے کمتر ہوتا چلا گیا اور آخر امان اللہ خاں کے زمانے میں بالکل ختم ہو گیا۔

امیر عبدالرحمان کی حکومت سے افغانستان کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے انہوں نے قبائلی سرداروں کی باہمی رقابتوں اور خانہ جنگیوں کو ختم کیا اور افغانستان کو ایک ہم آہنگ وہم رنگ حکومت کے واحد شیرازے میں منسلک کیا۔ امیر عبدالرحمان افغانستان کا پہلا فرمانروا ہے جس نے ایک طرف تو خارجی تعلقات میں روس وبرطانیہ سے باعزت سمجھوتہ کر کے بیرونی مداخلت و فوج کشی کی وبا کو ختم کیا اور دوسری طرف اندرونی معاملات میں مرکزیت پیدا کر کے منتشر قبائل کو ایک نقطے پر جمع کیا۔ امیر موصوف سے پہلے افغانستان کا چھوٹا سا خطہ بہت سے قبائلی سرداروں میں بٹا ہوا تھا جو ملک کی کمزوری کا سب سے بڑا سبب تھا اور اسی کمزوری سے روس وبرطانیہ فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ مگر امیر عبدالرحمان کے بعد سے یہ کمزوری ختم ہو گئی[۵]۔ امیر عبدالرحمان

---

[۵] لائف آف عبدالرحمان از سلطان محمد خاں

کے عہد میں" برطانیہ نے یہ محسوس کیا کہ ایک آزاد و مطمئن افغانستان ہی وسی منصوبوں کے کے خلاف بہترین حد فاصل ہو۔ چنانچہ برطانوی وزیر اعظم نے اس زمانے کے ہندستانی وائسرائے لارڈرپن کو لکھا کہ "یہ زیادہ تر تمہاری ہمت اور دور اندیشی ہی کا نتیجہ تھا کہ ہماری ہندوستانی حکومت کی حفاظت کے لئے ایک عمدہ قسم کی سرحد (افغانستان کی شکل میں) حاصل ہو گئی۔[1]"

تہذیب یورپ اور افغانستان

امیر عبدالرحمان اس راز کو پاگئے تھے کہ جدید شہنشاہیت میں کسی ملک پر قبضہ کرنے کا ایک طریقہ وہ بھی ہوتا ہے جسے "پُر امن مداخلت" Peaceful peneteration کہتے ہیں اور جس کے آثار تہذیب و تمدن، تعلیم و تبلیغ، تجارت و صنعت اور قرضے وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے اس "پُر امن مداخلت" کے سیلاب پر بند باندھنے کے لئے آپ نے شروع ہی سے یہ فیصلہ کیا کہ انگریزی تہذیب و تعلیم کے ایجنٹوں کو کسی راہ سے بھی ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں۔ نہ مشنری اسکولوں اور کالجوں کے قیام کی اجازت دی اور نہ تجارت و صنعت کی ترقی کے نام پر سفید فام سرمایہ داروں کو "ترقی" پھیلانے کا موقعہ دیا۔ انگریزوں اور روسیوں دونوں نے معاشی تجارتی، تبلیغی اور تعلیمی مختلف حیلوں سے اپنے گماشتے بھیجنے چاہے لیکن امیر عبدالرحمان نے ایک نہ سُنی، اس پر انہیں "غیر مہذب اور گنوار" مشہور کیا گیا۔ مگر امیر موصوف نے اس کے جواب میں کہا: میں یہ گوارا کرتا ہوں کہ یورپ والے افغانستان کو جاہل اور گنوار کہیں لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اپنی آزادی و خود مختاری کو بیچ کر تہذیب و تعلیم کا سبق حاصل کیا جائے۔[2]

---

[1] ہسٹری آف ماڈرن یورپ از گوچ صفحہ ۲۷
[2] لائف آف عبدالرحمان، از سلطان محمد خان

امیر حبیب اللہ خاں ۱۹۰۱ء میں امیر عبد الرحمان کا انتقال ہوا اور ان کا بیٹا امیر حبیب اللہ جانشین ہوا۔ اس میں اپنے باپ کی سی دانائی و تدبیر کی نہ تھی۔ انگریزوں نے بڑی آسانی سے اس پر اپنی "تہذیب و تعلیم" کا جادو چلا لیا اور آہستہ آہستہ "تہذیب و ترقی" کے نام پر شہنشاہی اقتدار کے گماشتے افغانستان میں داخل ہونے لگے، افغانیوں نے یہ دیکھا تو جگہ جگہ سے اشتعال و بےچینی کی لہریں ابھرنی شروع ہوئیں

اس بےچینی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۸۸۰ء کے صلحنامے پر نظر ثانی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس مطالبے کی بنا پر ۱۹۰۷ء میں ایک نیا معاہدہ مرتب ہوا جس نے بےچینی کو کچھ کم کیا تاہم اب بھی افغانستان کا دامن برطانیہ سے بندھا ہوا تھا۔

امان اللہ خاں ۱۹۱۷ء میں جب روس میں زار کی شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا اور انقلاب کے بعد نئی بالشویک حکومت بنائی گئی تو روس کی طرف سے افغانستان کو جو خطرہ لگا رہتا تھا، وہ عارضی طور پر جاتا رہا۔ ادھر انگریزوں کی گرفت ۱۹۱۴ء کی جنگ کے زمانے میں افغانستان پر بہت کڑی رہی۔ امیر حبیب اللہ سے عوام ناراض ہوتے چلے جا رہے تھے۔ آخر ۱۹۱۹ء میں امیر موصوف کو قتل کر دیا گیا اور چند دن کی خوفناک ابتری کے بعد امیر امان اللہ خاں تخت حکومت پر بٹھائے گئے۔ امیر موصوف نے انگریزوں کے اثرات سے افغانستان کو پوری طرح آزاد کر دینے کا دعویٰ کیا اور اپنے اس دعوے کی سچائی کو عوام کے دل پر نقش کر دینے کے لئے اسی سال ہندوستان پر حملہ کر کے برطانیہ کے گریباں میں ہاتھ ڈال دیا۔

افغانی عوام اپنے نئے امیر کے اس اقدام سے بہت خوش ہوئے۔ امان اللہ کا اصلی مطلب بھی صرف اتنا ہی تھا کہ عوام کے اعتماد کو حاصل کر لیا جائے، ورنہ انگریز کی طاقت سے وہ واقف تھا اور خوب جانتا تھا کہ جو قوم ۱۹۱۸ء میں چار

سال کی خوفناک جنگ سے فتح و ظفر کا پھریرا اڑاتی ہوئی نکل آئی ہے۔ اس کا مقابلہ افغانستان جیسا نیم مسلح ملک کیسے کر سکتا ہے۔

امان اللہ کا مقصد اس جنگ سے یہ بھی تھا کہ برطانیہ سے افغانستان کی کامل آزادی کو تسلیم کرا لیا جائے اور معاملات خارجہ پر انگریزی نگرانی کی جو بیخ لگی ہوئی ہے اُسے ختم کرا دیا جائے۔ چنانچہ چند ماہ کی لڑائی کے بعد ۱۹۲۱ء میں جو نیا معاہدہ ہوا اُس میں برطانیہ کے تمام اثرات سے افغانستان کو نجات میسر ہوئی اور سرحدی مسائل کا تصفیہ بھی مساویانہ طور پر عمل میں آیا۔ گویا جو کام امیر عبدالرحمان نے شروع کیا تھا اس کی تکمیل امیر امان اللہ خاں نے کی۔

اس وقت تک افغانستان کے فرمانروا کو "امیر" کے لفظ سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ مگر ۱۹۲۶ء میں امان اللہ نے "بادشاہ" کا لقب اختیار کیا اور تمام حکومتوں نے شاہِ افغانستان کو شاہ برطانیہ کے ہم پلہ ہونا تسلیم کیا۔

امان اللہ کی جلد بازی اور انقلاب

امان اللہ عہد جدید کی سیاست سے کافی واقفیت رکھتا تھا۔ ترکی میں مصطفےٰ کمال اور ایران میں رضا شاہ اسی زمانے میں ابھر رہے تھے اور ایران و ترکی کی ترقی کے چرچے دنیا میں ہو رہے تھے، امان اللہ بھی افغانستان کا رضا شاہ اور مصطفےٰ کمال بننا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ افغانستان کو مستقل طور یورپ کے سیاسی و معاشی حملوں کی مقاومت و مدافعت کے قابل بنا دے چنانچہ ۱۹۲۳ء میں افغانستان کی تاریخ میں پہلا "دستورِ اساسی" تیار ہوا جس کی رو سے بادشاہ کے اختیارات کو آئین و قوانین کی حدود میں جکڑ بند کیا گیا اور عوام کو حکومت کے کاروبار میں داخل کرنے کی پہلی بار کوشش کی گئی۔

اسی کے ساتھ امان اللہ نے معاشرتی اصلاح کا کام بھی شروع کیا۔ لیکن

یہاں افغانیوں کے کردار کو نیز اپنی طاقت کو سمجھنے میں اس نے سخت ٹھوکر کھائی۔ امان اللہ کے اس جذبۂ اصلاح پسندی کے خلاف ۱۹۲۳ء ہی میں شورش و ہیجان برپا ہونا شروع ہو گیا تھا، لیکن مختلف ترکیبوں سے اسے دبا دیا گیا۔ تاہم مخالفت کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔

معاشرتی و ذہنی اصلاحات کا یہ اصول ہے کہ اگر طاقت و اقتدار کے ساتھ اُن کو حکماً عوام پر ٹھونسا جائے، تو ان میں غم و غصّہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کے خلاف پوری قوت سے صف آرا ہو جاتے ہیں۔ افغانستان میں یہی ہوا۔ امان اللہ خاں بادشاہ تھا۔ اس لئے وہ بزور شمشیر اپنے اصلاحی پروگرام کو نافذ کرنا چاہتا تھا۔ کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر جو کچھ امان اللہ کہتا ہے، اُسے مانو۔ عوام کی کوئی اصلاحی تحریک ملک میں نہ تھی۔ عوام کے ہر دلعزیز لیڈروں کی مدد حاصل کرنے اور اُن کے قلب کو مطمئن کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ ایک طرف تو عوام کی طرف سے یہ لاپرواہی برتی گئی اور دوسری طرف ڈاڑھی منڈوانے، فوٹو کھچوانے، عورتوں کو بے پردہ کرنے یا سوٹ بوٹ پہننے کی قسم کی نہایت ہی سطحی اصلاحیں (اگر ان کو اصلاحیں کہا جائے)، بڑی بے باکی اور دھڑلّے سے جاری کی گئیں، تیسری طرف ۱۹۲۱ء میں برطانیہ سے جو معاہدہ کیا گیا تھا اور جس کی رو سے افغانستان سے برطانوی اثر و اقتدار کا بالکل خاتمہ ہو گیا تھا اس کی کھٹک برطانیہ کے دل میں باقی تھی ——— ان چیزوں کا قدرتی ردِّ عمل یہ ہوا کہ ۱۹۲۹ء میں امان اللہ خان کے خلاف زبردست بغاوت برپا ہو گئی۔ جس کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر اُسے افغانستان چھوڑنا پڑا۔ اس بغاوت میں اندرونی و بیرونی دونوں قسم کی سازشوں کو دخل تھا، امان اللہ نے انگریزی اثرات کو قبول کرنے سے بالکل انکار کر دیا تھا۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت کو امان اللہ خاں کی اس آزاد پسندی

سے سخت تشویش پیدا ہو رہی تھی جب تک ہندوستان پر برطانیہ کا اقتدار قائم ہے برطانیہ افغانستان کے مسائل سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ امان اللہ خاں کے خلاف جو بغاوت برپا ہوئی اس کی آگ کو ہوا دینے والوں میں انگریزی ہاتھ پوری طاقت سے کام کر رہے تھے۔ چنانچہ امان اللہ خاں کے یورپ چلے جانے پر بغاوت کو فرد کرنے کے لئے جنرل نادر خاں (جو یورپ میں مقیم تھے) افغانستان آئے، تو انھیں ہندوستان کے برطانوی خزانے سے ساڑھے سات سو پونڈ قرض بغیر سود کے دیا گیا، دس ہزار رائفل دیئے گئے جس کے ساتھ پچاس لاکھ راؤنڈ فائر کے کارتوس بھی تھے[1]

جنرل نادر خاں کو فتح ہوئی اور بغاوت دب گئی۔ مگر جنرل موصوف نے امان اللہ کو واپس بلانے کے بجائے اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اور انگریزوں نے اسے فوراً تسلیم بھی کر لیا۔ جنرل نادر خاں کے تعلقات انگریزی حکومت سے اچھے رہے مگر ان کی یہ پالیسی انھیں راس نہ آئی اور ۱۹۳۳ء میں کسی دل جلے کے ہاتھوں قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد ان کے بیٹے ظاہر شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی۔

مجبوریاں

افغانستان اگرچہ آزاد ہے، لیکن وہ اتنا طاقتور ہرگز نہیں کہ آجکل کی قومی تنظیم، قومی حوصلہ مندی اور سائنس کی حیرتناک ایجادات کے زمانے میں اپنی آزادی کو اغیار کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ سمجھ سکے۔ یہ چھوٹا سا ملک جس طرح کل تک روس اور برطانیہ کی شہنشاہی امنگوں کے پیچ میں دبا ہوا تھا اسی طرح آج بھی دبا ہوا ہے۔ اسی ڈر سے آج تک ریلوے لائن نہ بن سکی۔ دنیا میں صرف افغانستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں آج تک ریل کی ایک انچ

---

[1] پوسٹ وار ورلڈ از جیکسن (باب افغانستان)

پٹری بھی نہیں بچھائی گئی۔ ہندوستان اور روس سے ریلیں اس کی سرحد تک آتی ہیں مگر افغانی سرحد پر آکر رک جاتی ہیں کیونکہ سرحد کو عبور کرنے کی اجازت دیتی ہوئی شاہ افغانستان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ لیکن ریل کی کمی موٹروں اور لاریوں سے پوری کی جاتی ہے جس کے لئے بڑی پختہ سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ تار، ٹیلی فون اور ڈاک کا انتظام بھی ہندوستان سے کسی طرح کم نہیں۔

موجودہ سیاسی حالت

افغانستان کا رقبہ ایران سے دو تہائی کم ہے یعنی صرف ڈھائی لاکھ مربع میل۔ لیکن آبادی میں ایران کے برابر ہے اور زرخیزی میں ایران سے بڑھ کر ہے۔ میوؤں اور پھلوں کی تجارت کا خاص مرکز ہے۔ وہ پودا جس سے ہینگ نکلتی ہے، افغانستان کے جنگلوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ معدنیات ابھی تک پوری طرح نکالی نہیں جاسکی ہیں، البتہ یہ دریافت ہو چکا ہے کہ سونا، چاندی، لوہا، تانبا، کوئلہ، سیسہ، ایزبسٹاس، ابرک اور گندھک کے علاوہ شمالی افغانستان اور ہرات میں پیٹرول کے ذخیرے بھی پائے جاتے ہیں۔ بدخشاں میں لعل کی کان ہے جس کا لعل دنیا میں آج بھی بہترین مانا جاتا ہے۔

افغانستان کے لوگ ترکوں کی طرح پیدائشی سپاہی ہیں! اور اپنے اسی وصف کی بنا پر صدیوں ہندوستان پر حکمراں رہے ہیں۔ لیکن آج چونکہ سائنس کی جدید ایجادات کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچی ہے اس لئے وہ جو کل تک شیر سمجھے جاتے تھے آج بھیڑ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جسمانی قوت میں اب بھی ان کی وہی حالت ہے۔ ضرورت صرف تعلیم و تربیت کی ہے مگر بدنصیبی سے ایک طرف تو برطانیہ اور روس کا زغہ ہے، اور دوسری طرف غیر جمہوری طرز حکومت۔ دونوں نے مل کر عوام کی بیداری پر پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ تاہم آہستہ آہستہ سیاسی شعور بڑھ رہا ہے اور ایسے لوگ کافی تعداد میں پیدا ہو رہے ہیں جو وقت کے تقاضوں کو پوری

شدت سے محسوس کرتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ آج کل کی جمہوری دُنیا میں ان کے وطن کی حفاظت چند وزیروں، امیروں یا چند جنرلوں اور کمانڈروں کے بس کی بات نہیں بلکہ اس کے لئے پورے سوا کروڑ افغانیوں کو تعلیم و سیاست سے آشنا کرنے کی ضرورت ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر افغانستان کے ان سوا کروڑ قوی ہیکل اور بہادر انسانوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو جائے اور حکومت و اقتدار پر عوام اس طرح قابض ہو جائیں کہ حکومت و عوام کے مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہو جائیں اور ہر فرد خود کو افغانی قوم کا جزو لاینفک سمجھ کر قومی وملی ترقی و سربلندی کے جذبات سے سرشار ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقتور سے طاقتور قوم بھی ان کی آزادی پر چھاپہ مارنے کا تصور نہیں کر سکتی یہی نہیں بلکہ دنیا کی عام خوشحالی و سرسبزی اور بنی نوع انسان کی ذہنی، دماغی اور تہذیبی ترقی و سربلندی میں بھی افغان قوم دنیا کی بہت بڑی امداد و معاونت کر سکتی ہے۔

افغانستان میں باقاعدہ تنخواہ دار فوج کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے۔ لیکن فوجی بھرتی جبری ہے اس لئے اٹھارہ سال سے چالیس کی عمر تک کے ہر مرد کو کم از کم دو سال فوجی تربیت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ فوجی افسری پر تقرر عمر بھر کے لئے ہوتا ہے۔ قبائلی علاقے ہتھیاروں سے مسلح ہیں اور ضرورت کے وقت ان کی خدمات بھی حاصل کی جاتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی ہوائی فوج بھی ہے جس میں تین چار سو آدمی باقاعدہ کام کرتے ہیں۔

عوام کی تعلیمی ترقی کی طرف گذشتہ چند سالوں سے توجہ کی گئی ہے۔ ابتدائی اور ثانوی دونوں قسم کی تعلیم مفت ہے اور کسی قسم کی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں کابل میں یونیورسٹی کی قسم کا ایک بڑا تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا ہے جس میں ڈاکٹری کیمسٹری سائنس اور قانون کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔

ایشیا کے دوسرے ممالک کی طرح افغانستان بھی صنعتی انقلاب سے بہت

دور ہے۔ "یہاں کے معزز لوگ اب بھی شہروں میں رہنا پسند نہیں کرتے، جو لوگ حکومت سے متعلق ہیں یا قبائلی سردار واقع ہوئے ہیں، ان کے علاوہ تجارت پیشہ وحرفت پیشہ قسم کے جتنے شہروں میں بود و باش رکھتے ہیں انھیں حقیر سمجھا جاتا ہے ان کے مقابلے میں زمینداری و باغبانی کو زیادہ باعزت ذریعہ معاش خیال کیا جاتا ہے۔"[1]

لیکن اب صنعت اور انڈسٹری کی طرف توجہ ہو رہی ہے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے کارخانے کھولے گئے ہیں۔ مثلاً بٹن بنانے، ماچس بنانے۔ چمڑا لگانے، جوتے بنانے، فرنیچر بنانے، شکر بنانے اور اون اور سوت کو تیار کرنے کے کارخانے ـــــــ تمام کارخانوں پر حکومت کی براہِ راست نگرانی ہوتی ہے۔ اس معاملے میں افغانستان نے روس کے اشتراکی نظام کا تھوڑا بہت اثر قبول کیا ہے۔ ایک چھوٹا سا کارخانہ موٹر بنانے کا بھی ہے۔ اس کے علاوہ مشترک سرمائے کی (جوائنٹ اسٹاک) کمپنیوں کی شکل میں پھلوں، میوں اور چمڑے اور اون وغیرہ کی اندرونی و بیرونی تجارت بھی بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔"[2]

حکومت کے سالانہ بجٹ کا تخمینہ عموماً اٹھارہ کرور افغانی (تقریباً پانچ کروڑ روپیہ) رہتا ہے۔[3]

مستقبل کے امکانات

داخلی وخارجی ہر باب میں افغانستان بالکل آزاد ہے ایران کی طرح یہاں کوئی ایسا قاچاری فرمانروا کبھی پیدا نہیں ہوا جس نے ملک کے وسائل آمدنی پر غیروں کو تسلط دے دیا ہو لیکن

---

[1] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا۔ جلد اول صفحہ ۵۵۳
[2] و [3] اسٹیٹسمین ایربک ۱۹۴۴ء

چونکہ خود اس میں اپنے ذخائر دولت سے فائدہ اٹھانے کی صنعتی طاقت نہیں ہے اس لئے بالقوہ دولت مند ہونے کے باوجود بالفعل ایک مفلس ملک ہے، لوگ قبائل میں بٹے ہوئے ہیں اور اگرچہ یہ قبائل شاہ افغانستان کی اطاعت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن عوام پر ان کا بلا واسطہ اثر بہت زیادہ ہے، پیروں اور ملاؤں کا اثر بھی بہت زیادہ ہے اور قدیم طرز کی تعلیم کے سوا جدید خیالات و نظریات کا چرچا بہت کم ہے۔ یہاں کی آزادی کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے کہ "فرنگی" کے خلاف نفرت کا جذبہ بے حد ہے۔ مگر اس جذبے کو صحیح طور سے استعمال کرنے کی طاقت مفقود ہے۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں جو آئینی اصلاحات نافذ کی گئی تھیں وہ جمہوریت کی بہت ہی ابتدائی اور ناقص قسط تھی جس پر وقتاً فوقتاً اضافے کی ضرورت تھی۔ مگر ایسا نہ ہوا تعلیم کو عام کرنے کی طرف بھی بہت کم توجہ کی گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک عام جہالت کو دور نہ کیا جائے، جمہوری نظام کی کوئی بڑی قسط مفید ہونے کے بجائے اور الٹے مضر نتائج پیدا کرنے والی ثابت ہوتی ہے۔

بدنصیبی سے افغانستان میں کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو ان نقائص کا علاج کر سکتی۔ عام احساس موجود ہے لیکن اس احساس کو عملی شکل دینے والی طاقت موجود نہیں۔ پھر روس و برطانیہ کے دوگونہ خطرات میں گھرے ہونے کی وجہ سے حکومت کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے بھی لوگ ڈرتے ہیں۔ ان مشکلات کی وجہ سے افغانستان کو موجودہ دنیا کے طاقتور ممالک کی صف میں کوئی جگہ حاصل نہیں ہے۔ آزادی میں یہ عراق، مصر، ایران اور شام وغیرہ سے بہت آگے ہے۔ لیکن ترکی کی طرح اپنی آزادی سے پورا فائدہ اٹھانے کے نااہل ہے۔ لیکن اب نوجوانوں کا ایک طبقہ ایسا پیدا ہوتا جا رہا ہے جسے ان باتوں کا پورا احساس ہے۔ ذہنی بے چینی پیدا ہو رہی ہے اور موجودہ

حالات کو بدل ڈالنے کی چنگاریاں دماغوں میں سلگ رہی ہیں ———— جو مناسب موقع ملنے پر ابھر سکتی ہیں۔

افغانستان کی طاقت و دولت کے لئے صنعت و انڈسٹری کی ضرورت ہے اور صنعت و انڈسٹری کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک حکومت عوام کی اور عوام حکومت کے نہ ہوں۔ یہ چیز موجودہ حالات میں بہت مشکل نظر آتی ہے۔ لیکن جو لوگ حسّاس دماغوں کی اندرونی لہروں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ موجودہ حالت بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔[1]

---

[1] اس باب کو لکھنے میں ذیل کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

۱۔ تاریخ افغانستان از سر پرسی سائکس

۲۔ افغانستان آف دی افغانز (لندن ۱۹۲۸ء) از سردار اقبال علی شاہ

۳۔ افغانستان از جمال الدین احمد و محمد عبد العزیز

۴۔ ماڈرن افغانستان (مطبوعہ ۱۹۳۹ء) از شاہ

۵۔ افغانستان از McMunn

باب ۲۷

روس

اشتراکی انقلاب کا نقیبِ اوّل

دولت اور تقسیم دولت میں توازن پیدا کرنے کا سوال انیسویں صدی کے اوائل میں مشینوں کی ایجاد کے بعد ہی پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اشتراکیت یا سوشل ازم کے نام سے ایک مکمل فلسفہ اُس وقت سامنے آیا جب ۱۸۶۷ء میں کارل مارکس کی کتاب سرمایہ (کیپٹل) شائع ہوئی۔ سوشل ازم یا کمیونزم کے بنیادی اصول مارکس کی تصنیف سے پہلے بھی موجود تھے۔ لیکن مارکس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے معاشی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے زندگی کے تمام معاشرتی، مذہبی، سیاسی اور تاریخی نظریوں کو ایک نئی بنیاد پر قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معاشیات کا دامن زندگی کے ہر شعبے سے بندھا ہوا ہے۔ اس لئے اگرچہ مارکس کا نظریہ صرف مشینوں سے پیدا ہونے والی معاشی مشکلات کو سلجھانا چاہتا ہے، لیکن جب پرانے مذہبی و معاشرتی خیالات اُس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں، تو وہ ان سب کو ایک نئے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے

ایک کسان جو کسی زمین میں گیہوں بونے چلا ہو، کھیت کی ہر روئیدگی کو

خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اپنی درانتی کی نذر کر دیتا ہے اسی طرح مارکس بھی اپنے معاشی نظریے کی تخم پاشی کے لئے خیالات و عقائد کی تمام اگلی پچھلی عمارتوں کو (خواہ وہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہوں) اپنے ہتھوڑے اور درانتی کے سپرد کر دیتا ہے۔

لیکن مارکس کا یہ ہتھوڑا اور درانتی اس کی زندگی میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ جرمنی میں پیدا ہوا، انگلستان میں رہا اور سارے یورپ میں گھومتا پھرا، مگر اشتراکی تحریک جلسوں اور جماعتوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ دو ایک بار "مسلح انقلاب" کی کوشش بھی کی گئی، مگر ناکام ہوئی۔ لیکن مارکس کی موت کے چونتیس سال بعد، اس کی توقعات کے بالکل خلاف اشتراکی فلسفے کا پہلا پودا روس کی سرزمین میں لگایا گیا۔ ۱۹۱۷ء کے اس انقلاب سے پہلے کوئی شخص مشکل سے یہ یقین کر سکتا تھا کہ شہنشاہ زار کے مقبوضات میں کبھی اشتراکیت کا جھنڈا لہرائیگا۔ خود مارکس کا خیال بھی یہ تھا کہ اس کے فلسفے کے لئے بہترین ملک انگلستان ہو سکتا ہے یا وسطی یورپ۔ لیکن زار کی حماقتوں اور نادانیوں نے مارکس کے مریدوں کو اپنی فتوحات کا پہلا موقعہ روس ہی میں عطا کر دیا۔

جب ۱۹۱۴ء کی جنگ کا آغاز ہوا تو ملک گیری کی بڑی بڑی توقعات لے کر زار کی فوجیں جرمنی اور آسٹریا ہنگری کی مخالفت میں پوری طاقت کے ساتھ اتر آئی تھیں اور برطانیہ و فرانس، اس کے اتحادیوں میں شامل تھے۔ مگر ۱۹۱۷ء میں اسے جرمنی کے ہاتھوں بہت بری طرح شکست ہوئی اور ملک میں سخت ابتری پھیل گئی۔ اشتراکی تحریک کے لیڈروں نے اس ابتری سے فائدہ اٹھا کر زار کے خلاف کھلی بغاوت کر دی اور اُسے معزول کر کے نئی حکومت بنانے کی کوشش کی۔ اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لئے جرمنی سے صلح کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ برسیٹ لٹاسک کے مقام پر نئی اشتراکی حکومت نے جرمنی سے بہت دب کر ایک عاجز و کمزور قوم کی طرح صلح کی۔ اس صلح کے نتیجے میں روس کو اپنا بہت سا علاقہ ہاتھ سے دینا پڑا۔ اور

بہت سی پابندیاں بھی قبول کرنی پڑیں۔ اس کے ایک سال بعد ۱۹۱۸ء میں جرمنی کو بھی شکست ہوئی، مگر برطانیہ، فرانس اور امریکہ کو چونکہ روس کی نئی اشتراکی حکومت سے ہمدردی نہ تھی اس لئے ان کی طرف سے بھی بریسٹ لٹافسک کے صلحنامے کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی۔ جب ۱۹۱۹ء میں صلح کانفرنس ہوئی تو "نئے" روس کے کسی نمائندے کو شرکت کی دعوت نہ دی گئی۔ کہا گیا کہ ابھی اس ملک میں بدامنی پھیل رہی ہے اس لئے اسے حکومت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ غرض اس طرح روس کی غیر حاضری میں صلح کانفرنس کی ممبر ریاستوں نے بریسٹ لٹافسک کی پیدا کی ہوئی نئی ریاستوں اور پابندیوں کو مان لینے کا اعلان کر دیا۔

زار کی حکومت

زار کی حکومت مطلق العنان شاہی کا بدترین نمونہ تھی۔ زار مذہبی اور دنیوی دونوں لحاظ سے اپنی رعایا کا "باپ" تھا اور دربار و کلیسا دونوں جگہ اس کے آگے عقیدت و اطاعت کی گردن جھکانا ضروری تھا ترکی میں جو حیثیت خلیفۃ المسلمین کو حاصل تھی، ایک حد تک وہی حیثیت زار کی روس میں تھی۔ چنانچہ جب سلطان محمد ثانی کے زمانے میں یونانیوں پر سختیاں ہوئیں تو زار نے سلطان سے ان سختیوں کے ازالہ کا مطالبہ اس بنیاد پر کیا کہ وہ یونان کے عیسائیوں کا محافظ ہے۔ محافظت کے اس سوال نے سلطان کو چونکا دیا۔ وہ اپنی رعایا کا محافظ خود رہنا چاہتا تھا، روس کی یہ مداخلت اُسے گوارا نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی سے لیکر پہلی جنگ عظیم تک روس اور ترکی کے درمیان سخت جنگیں ہوئیں اور دونوں کے باہمی تعلقات بالشویک حکومت کے قیام تک نہایت برے رہے۔

انعدام پسندی یا نائلزم
Nihilism

زار اگرچہ روحانی پیشوا بھی تھا اور دنیوی سردار بھی، مگر اس کے باوجود روس کے عیسائی عوام اُس سے سخت نالاں تھے۔ یورپ کی جمہوری یا دستوری دُنیا

ہیں اب صرف زار کی حکومت ہی خالص مطلق العنانی پر مبنی تھی عوام میں فقر و افلاس انتہا کو پہنچ چکا تھا اور بغاوت و سرکشی کا سمندر بری طرح موجیں لے رہا تھا۔ انارک اِزم یا نراج کے جذبات نوجوانوں میں بُری طرح پھیل رہے تھے اور ہر انارکسٹ نے دہشت پسندی اور قتل و غارت گری کا "پیشہ" اختیار کر لیا تھا۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر نالزم (انعدام پسندی) کے نام سے ایک نئی تحریک نے جنم لیا تھا جس کے ممبروں کا کام قتل و تباہی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ نالزم یا انعدام پسندی دراصل انتقام، نفرت اور غصّے کے جذبات کے اُس خوفناک ترین ردّ عمل کا نام تھا جو زار کی شہنشاہیت کے خلاف روس کے حساس نوجوانوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ موجودہ معاشرت و سیاست کا ہر ہر گوشہ گندہ ہو چکا ہے۔ اس لئے ہر چیز کو کاملاً تباہ کر دیا جائے۔ آسکر وائلڈ کے الفاظ میں اس تحریک کے ممبروں کے الفاظ یہ تھے:

——"جب تک منزل مقصود حاصل نہ ہو جائے ہر فطری جذبے کا گلا گھونٹ دینا، نہ محبت کرنا، نہ محبوب بننا، نہ رحم کرنا نہ رحم کی درخواست کرنا، نہ شادی کرنا نہ شادی کرانا راتوں کو چھپ چھپ کر چھریاں بھونکنا، پینے کی چیزوں میں زہر گھولنا باپ کو بیٹے سے لڑانا دینا۔ بغیر کسی امید کے اور بغیر کسی اچھے مستقبل کی تمنا کے مصائب برداشت کرنا، تباہ کرنا اور انتقام لینا۔"[1]

اس صورت حالات کا نتیجہ یہ ہُوا، کہ سرکاری عہدیداروں کو قتل کر دینے کے وقوعے آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ خود شہنشاہ کو اپنی جان کا سخت خطرہ لگا رہتا تھا۔ انتہائی حفاظتی تدبیروں کے باوجود کئی شہنشاہ محل میں قتل کر دیئے گئے۔ جرائم کی خفیہ تحقیقات کا محکمہ (جسے اوچرانا Ochrana کہا جاتا تھا) باغیوں کا کھوج

---

[1] ویرا: آسکر وائلڈ۔ نیز دیکھو ریسینٹ پولیٹیکل تھاٹس از کوکر۔ حصّہ اول باب ہفتم

لگانے میں بہت تیز تھا اور کھوج لگانے کے بعد سزا دینے میں بھی کافی بیرحم۔ لاکھوں آدمی شک وشبہ پر گرفتار کرلئے جاتے تھے جنھیں یا تو سزائے موت ملتی تھی یا پھر سائبیریا کے برفانی میدانوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ جہاں معمولی لباس وخوراک دے کر اُن سے جبری کام لیا جاتا تھا، جس کے نتیجے میں یہ لوگ چند ہی دن میں مختلف امراض کا شکار ہو کر مر جاتے تھے۔ مگر ان تمام سختیوں کے باوجود شہنشاہیت کے خلاف روسیوں کا غم وغصہ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

روس دراصل ایک زراعتی ملک ہے لیکن انیسویں صدی کے آخر میں زار نے یہ چاہا کہ اپنے ملک کو بھی یورپ کے دوسرے ممالک کی طرح صنعتی بنا دے مگر روسیوں کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ وہ بڑے بڑے کارخانے کھول سکتے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے برطانیہ اور فرانس وغیرہ سے تجارتی معاہدے کئے گئے جس کے بعد ان ممالک کا سرمایہ روس میں آنے لگا، اور ماسکو میں بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے۔ ۱۹۱۴ء میں جب جنگ چھڑی تھی تو ماسکو کے کارخانوں میں ۲۵ لاکھ سے زائد مزدور کام کر رہے تھے۔ مگر ان مزدوروں کی حالت بہت ردی تھی زیادہ سے زیادہ کام لیا جاتا تھا، مگر کم سے کم مزدوری ملتی تھی، بڑھاپے یا بیماری کی صورت میں کوئی رعایت نہ تھی؛ جب تک تندرست ہو کام کرو۔ بیمار ہو جاؤ یا ہاتھ پیر ٹوٹ جائے تو گھر بیٹھو۔ مزدوروں کے لئے عمر کی بھی کوئی قید نہ تھی۔ مزدور بچہ ہو یا بڑا، لڑکا ہو یا لڑکی، اگر کارخانے دار کو اس کی ضرورت ہے تو خوب رگڑ رگڑ کر اُس سے کام لیا جاتا تھا۔ کسی کی زندگی تباہ ہوتی ہے تو اس کی قسمت، کارخانے دار کا اس میں کیا قصور ہے؟

اشتراکی خیالات کی تخم پاشی مزدوروں کی اس بدحالی نے روس کے بہت سے رحمدل انسانوں کو ان کی ہمدردی

کی طرف متوجہ کیا۔ اس سلسلہ میں ایک جماعت ۱۸۹۸ء میں بنائی گئی جس کا نام اشتراکی جماعت تھا اور جس کا الحاق یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کی اشتراکی جماعتوں سے تھا۔ اس سے ۳۴ سال پہلے اشتراکیت کے باوا آدم کارل مارکس کی رہبری میں "مزدوروں کی انجمن" کے نام سے ایک اور جماعت بھی بنی تھی جس نے ۱۸۸۱ء میں زارِ روس کے خلاف بغاوت کرکے انقلاب لانے کی کوشش کی تھی، مگر جب اس میں ناکامی ہوئی اور زار کی طرف سے باغیوں کی سخت ترین سرکوبی کی گئی تو کچھ دنوں تک سناٹا چھایا رہا، مگر آخر اشتراکی جماعت کے نام سے پھر ایک جماعت قائم ہوئی جو اپنے اصولوں کے لحاظ سے پہلی جماعت کے مقابلے میں امن پسند اور صلح جو تھی۔ مزدوروں کی ابتری و بدحالی کی وجہ سے اس جماعت کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی اور ننگے بھوکے مزدوروں کی بھیڑ جوق در جوق اس کی ممبر بننے لگی لیکن روس کی شہنشاہیت میں اس پُرامن وصلح جُو جماعت کی بھی گنجائش نہ تھی، زار کی حکومت کسی ادنیٰ سی ادنیٰ شورش کو بھی پسند نہ کرسکتی۔ اس کا قول تھا کہ شہنشاہِ اعظم عوام کا جسمانی و روحانی باپ ہے اس لئے وہ جو کچھ مناسب سمجھتا ہے، کرتا ہے۔ رعایا کے کسی فرد کو یہ حق نہیں کہ اس کے یا اس کی حکومت کے کسی فعل پر نکتہ چینی کرے یا جو کچھ دیا جارہا ہے اس سے زائد کچھ مانگے۔

قدرت کا یہ بہت پرانا قانون ہے کہ حق کی آواز کو جتنا دبایا جائے، اتنا ہی زیادہ شدت سے ابھرنے کی ہمت اس میں پیدا ہوتی ہے۔ مظلومیت، ظلم کے پانی سے سیراب ہوتی ہے اور مظلوموں کے غم و غصے کی آگ کو تشدد و سخت گیری سے بجھانے کی جتنی کوشش کی جاتی ہے۔ اُتنی ہی زیادہ خوفناکی کے ساتھ اس کے شعلے اندر ہی اندر سلگنا شروع ہوجاتے ہیں۔ شہنشاہِ روس کے اسی طرزِ عمل نے روس میں مزدوروں

کے جذبات کو بیحد مشتعل کر دیا تھا۔ اور لینن اور ٹراسکی کی رہنمائی میں اُن کے دلوں میں تخت شاہی کو الٹ دینے کے زبردست خونی احساسات بڑی سرعت کے ساتھ پرورش پا رہے تھے۔[1]

لینن لینن ایک اسکول ماسٹر کا لڑکا تھا جو ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا۔ زمانہ طالبعلمی ہی سے وہ اقتدار و اختیار کی چیرہ دستیوں کے خلاف تھا اور اسکول میں اس قسم کے جو مظاہرے ہوتے تھے، ان میں بہت آگے بڑھ کر حصہ لیتا تھا ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ماں باپ نے اُسے سینٹ پیٹرس برگ (جو آج کل اس کے نام پر لینن گراڈ کے نام سے مشہور ہے) بھیجا تاکہ وکالت کا امتحان پاس کر سکے۔ لیکن یہاں اس کی "باغیانہ" حرکتیں اور زیادہ نمایاں ہوئیں جن کے نتیجے میں اسے سائبیریا کے برفانی میدانوں میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۹۰۰ء میں وہاں سے رہائی ملی مگر اب رُوس کی آب وہوا اس کے لئے سازگار نہ تھی۔ اس لئے پیرس چلا آیا۔ پھر یہاں سے لندن چلا آیا۔ ۱۹۰۵ء میں جب روس میں بغاوت کی آندھیاں چلیں تو یہ واپس آیا۔ مگر بغاوت کے فیل ہو جانے پر اسے پھر روس کو خیرباد کہنا پڑا۔ اب اس کی سکونت زیادہ تر سوئٹزرلینڈ میں رہنے لگی۔ اور بین "الاقوامی اشتراکیت" کا ایک بڑا لیڈر بن گیا۔ یہیں ٹراٹسکی سے اس کی ملاقات ہوئی جو اکیس سال کی عمر میں روس کے ایک شہر اوڈیسہ میں مزدوروں کی ایک جماعت بنانے کے سلسلے میں جلاوطن کیا گیا تھا۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو تاریخ روس مرتبہ Chaninov (مطبوعہ لندن ۱۹۳۰ء)
و مرتبہ (Kluchevsky) (پانچ جلدوں میں روسی زبان سے براہ راست)
و مرتبہ ٹراٹسکی (تین جلدوں میں)

ٹراٹسکی ٹراٹسکی عمر میں لینن سے سات سال چھوٹا تھا مگر اشتراکی جوش و خروش میں اپنے دوست سے کسی طرح کم نہ تھا ۱۸۹۸ء میں انقلاب پسندی کے جرم میں اُسے گرفتار کرکے سائبیریا بھیجا گیا لیکن یہاں سے چھپ کر بھاگ نکلا اور سیدھا لندن پہنچا جہاں لینن سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ۱۹۰۵ء کی بغاوت کے وقت لینن کے ساتھ وہ بھی روس آیا اور پھر پکڑ لیا گیا۔ مگر اس بار بھی فرار ہوگیا اور بھاگ کر آسٹریا کے پایۂ تخت ویانا پہنچا اور ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس تک بین الاقوامی اشتراکی انجمن کا سرگرم لیڈر رہا۔ ٹراٹسکی نسلاً یہودی تھا اور ادب وخطابت میں اپنے ساتھیوں پر غیر معمولی فوقیت رکھتا تھا۔ روس کے انقلاب کی جو تاریخ اس نے تین جلدوں میں لکھی ہے اور جس کا مکمل انگریزی ترجمہ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا ہے اس کی ادبی صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہے

اسٹالن لینن کے دوستوں میں اسٹالن کا نام بھی خاص جگہ پانے کا مستحق ہے اسٹالن عمر میں ٹراٹسکی سے دو سال اور لینن سے نو سال چھوٹا تھا۔ اس کا باپ موچی کا کام کرتا تھا جسکی خواہش یہ تھی کہ اپنے بیٹے کو مذہبی تعلیم دلا کر پادری بنا دیا جائے۔ مگر ابھی اس کی عمر ۱۰ سال ہی کی تھی کہ مذہبی تعلیم کے بجائے انقلابی سرگرمیوں کی طرف اس کا رجحان ہوگیا اور روس کے اشتراکی جمہوری (سوشل ڈیموکریٹ) پارٹی کے ساتھ شریک ہوکر اس نے اپنی وطنی صوبے جارجیا میں شورش برپا کرنا شروع کردی ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۲ء تک دس سال میں اُسے بارہ تیرہ مرتبہ گرفتار کیا گیا مگر ہر بار جیل سے بھاگ نکلا۔ آخر میں چار سال کے لئے اسے سائبیریا میں جلاوطن کردیا گیا۔

ان لوگوں کے علاوہ روسی اشتراکیت کے لیڈر اور بھی بہت تھے۔ شہنشاہ کی حکومت ان جذبات کو ملیامیٹ کرنے کی ان تھک کوششیں کرتی تھی، مگر ہر ظالمانہ کوشش اس آگ پر تیل کا کام دیتی تھی جس کی وجہ سے ان لوگوں میں مذہبی مبلغوں

کا سا جوش و ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے مذہب کے نام پر ظلم سہنے والے، ہنستے اور مسکراتے ہوئے ہر مصیبت کو برداشت کرتے ہیں، اسی طرح روسی شہنشاہیت کے یہ مخالف بھی ہر ظلم وستم کو انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ سہتے تھے اور زار کی ہر ضرب پر ان کا جوش وخروش پہلے سے دوبالا ہو جاتا تھا۔

۱۹۰۵ء میں جب روسی فوجوں نے سائبیریا کے مشرقی ساحل میں جاپان سے شکست کھائی تو زار کی تمام فوجیں تتر بتر ہو گئیں۔ اشتراکیوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ مگر اس بغاوت کے کامیاب ہونے سے پہلے سائبیریا کے میدانوں سے فوجی رسالے کافی تعداد میں واپس آ گئے، جن کی مدد سے اس بغاوت کو کچل دیا گیا۔ اشتراکیوں نے اس ناکامی سے یہ سبق لیا کہ کسی ایک ملک میں اشتراکی بغاوت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تمام دنیا کے مزدوروں کو متحد کرنا چاہیے اور پھر ایک ہی وقت میں ہر جگہ بغاوت کی آگ لگا دینی چاہیے تاکہ ہر طرف سے بے بس ہو کر سرمایہ داروں کی عمارت دھڑام سے زمین پر آ پڑے۔ چنانچہ اس کے بعد ان لوگوں کی کوششیں صرف روس تک محدود نہ رہیں بلکہ بین الاقوامی ہو گئیں [۱]

انقلابِ روس

جب ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہوئی تو روس نے اپنی فوجیں جرمنی اور ترکی کے خلاف صف آرا کر دیں۔ ۱۹۱۷ء تک زبردست لڑائی ہوتی رہی۔ لیکن آخر روس کے سپاہی جرمن کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے۔ جرمنی کا نظام حکومت بھی اگرچہ اس وقت تک شاہی تھا مگر روس کے

---

[۱] دیکھو "سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ" (انگریزی ترجمہ) یہ کتاب خود روسی کمیونسٹوں نے مرتب کی ہے اور پہلی بار ۱۹۳۵ء میں روس میں چھپی ۱۹۳۹ء میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی روس ہی سے شائع ہوا۔

مقابلے میں بہت ترقی یافتہ تھا۔ روس کے سپاہی محض کرائے کے ٹٹوؤں کی طرح شہنشاہ کے حکم کی بنا پر لڑ رہے تھے۔ جرمن سپاہیوں کے دل میں قوم و وطن کی ترقی و سربلندی کا جذبہ بھی تھا۔ جذبات کے اس اختلاف نے جرمن سپاہیوں کے جوش و ولولے میں جو اضافہ کر دیا تھا وہ روسیوں کو حاصل نہ تھا۔ جب لڑائی نے طول پکڑا اور لاکھوں آدمی مجروح و مقتول ہو گئے تو قدرتاً اس لڑائی کے خلاف بددلی پھیلی جو نہ صرف روس کی شکست کا باعث ہوئی بلکہ اس کی طوفانی سیلاب میں زار روس کی شہنشاہیت بھی گھاس کے تنکے کی طرح بہہ گئی۔ ۱۹۱۷ء میں فوج اور عوام دونوں نے بغاوت کی اور زار کو معزول کر کے جمہوریت کی بنا ڈالی گئی۔ مگر جب لینن روس آیا تو اسے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ شہنشاہیت کے کھنڈر پر جو نئی حکومت قائم ہوئی ہے وہ اعتدال پسندوں (منشویک[1]) کے ہاتھ میں ہے جس میں اوپر کے طبقے کے امیر و رئیس بھی شامل ہیں، لینن نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ اس احتجاج کے نتیجے میں نئی حکومت کی نظر میں بھی لینن اور لینن کے ساتھی خار کی طرح کھٹکنے لگے اور ان کی گرفتاری کا حکم صادر ہوا۔ لیکن لینن روپوش ہو گیا اور موقعہ کی گھات میں بیٹھا رہا۔ آخر ۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو اس نے نئی حکومت کے ایوان پر دھاوا بول کر قبضہ کر لیا۔ قبضہ کا یہ عمل اس قدر پھرتی اور دانائی سے عمل میں آیا کہ بہت ہی معمولی سی کشمکش کے بعد نئی حکومت کے ارباب اقتدار نے بالشویک لیڈروں سے ہار مان لی اور اب بالشویک[2] حکومت کا اعلان

---

[1] و [2] بالشویک روس کے اشتراکیوں کا نام ہے۔ یہ نام اس لئے پڑا کہ روس میں جو اشتراکی پارٹی زار کے زمانے میں قائم تھی اس کے انتہا پسند ممبروں کو "بالشویک" (Bolshevik) کہتے تھے اور اعتدال پسند ممبر "منشویک" (Menshevik) کہلاتے تھے۔ لینن اور ٹراٹسکی وغیرہ اول الذکر جماعت کے لیڈر تھے۔

(بقیہ صفحہ ۵۶۷ پر)

کر دیا گیا۔ حکومت کی یہ تبدیلی جس تیزی اور جس خاموشی کے ساتھ ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ پایۂ تخت (سینٹ پیٹرس برگ) میں ممالک غیر کے جو سفیر اور نمائندے تھے ان تک کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ شہر میں کوئی غیر معمولی بات ہو گئی۔ چنانچہ جب انہوں نے حکومت کی تبدیلی کا اعلان سُنا تو ہکّے بکّے رہ گئے۔

اشتراکی نظام بالشویک حکومت نے قائم ہوتے ہی سیاست و معیشت کا جو نظام رائج کیا وہ مختصراً یہ تھا:۔

۱۔ تمام دولت اور وسائلِ حصولِ دولت کو حکومت کی ملکیت قرار دیا گیا
۲۔ ممالک غیر سے تجارت کرنے کا اختیار حکومت کو سپرد کیا گیا۔
۳۔ زار کے زمانے کے جتنے قرضے ممالک غیر کو واجب الادا تھے وہ سب منسوخ کئے گئے۔
۴۔ افراد کی ذاتی ملکیت کو ختم کر کے دولت کو قوم کی مشترک ملکیت قرار دیا گیا
۵۔ کسانوں سے حکومت کی مقرر کردہ قیمت پر غلہ مانگا گیا اور جو نہ دے اُس کے لئے سزائے موت تجویز کی گئی۔

علاوہ ازیں بالشویک حکومت نے روس کو جنگ کے اکھاڑے سے نکال کر جرمنی سے صلح کی بات چیت کی۔ بات یہ ہے کہ جرمنی نے روس کو پچھاڑ تو دیا تھا مگر ابھی روس نے آخری طور پر ہتھیار نہیں ڈالے تھے اور جنگ کا سلسلہ جاری تھا لیکن لینن بالکل نہیں چاہتا تھا کہ روس کا ایک آدمی بھی جنگ میں شریک ہو اس لئے اس نے جرمنی سے بریسٹ لٹافسک کے مقام پر صلح کر لی۔ اس صلح کی شرائط

(بقیہ صفحہ ۵۶۶) کے لیڈر تھے جو انقلاب روس میں غالب آئی۔ اس کے بعد سے روسی اشتراکیت کا ایک نام بالشوزم بھی ہو گیا۔ "ب"

جرمنی کے لئے فاتحانہ اور روس کے لئے مفتوحانہ تھیں مگر لینن نے ذلت کے اس کڑوے گھونٹ کو یہ سمجھ کر پی لیا کہ جرمنی کی شکست بھی اسی مستقبل قریب میں صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو یقین دلایا کہ آج جرمنی جو شرائط بھی لائے اُسے منظور کر لو کیونکہ چند دن میں خود اُسے شکست ہونے والی ہے جس کے بعد یہ شرائط خود بخود کالعدم ہو جائیں گی۔ جہاں تک جرمنی کی شکست کا تعلق ہے لینن کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی لیکن اس شکست کے باوجود بریسٹ لٹافسک کے معاہدے نے روس کے جو حصّے کاٹ کر خود مختار ریاستوں میں تبدیل کر دیئے تھے وہ روس میں شامل نہ کئے جا سکے۔ چنانچہ پولینڈ کے نام سے جو خود مختار ریاست روس کے مغربی حصّے کو قطع کر کے بنا دی گئی تھی وہ بدستور قائم رہی اور لینن کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی پولینڈ روسی اشتراکیت کا جزو نہ بن سکا۔ اسی طرح روس کے پورے مغربی ساحل پر فن لینڈ، اسٹونیا، لیٹویا اور لتھوائے نیا کے نام سے روس کے جن صوبوں کو خود مختار قرار دیا گیا تھا وہ بھی علی حالہ قائم رہے۔ لینن نے ان کی واپسی کی کوشش کی مگر آخر ناکام ہو کر ان کی آزادی تسلیم کرنی پڑی۔ آخرالذکر چاروں صوبوں کے نکل جانے سے روس کی سیاسی و تجارتی حیثیت کو سخت نقصان پہنچا، اس لئے کہ جہاز رانی کے قابل جتنا سمندری ساحل تھا وہ سب انہی علاقوں میں واقع تھا، اب روس کے پاس لینن گراڈ کے بندرگاہ کی صرف چند میل کی ساحلی پٹی رہ گئی، اور وہ بھی چاروں طرف سے غیر ملکی حکومتوں سے گھری ہوئی۔ پولینڈ کے چھن جانے سے ایک بہت زرخیز علاقہ اس کے قبضے سے باہر ہو گیا، البتہ یوکرین کا زرخیز علاقہ روس کی کوششوں سے باقی رہ گیا۔ اگر یہ بھی چھن جاتا تو پھر روس کی معاشی ترقی کا کام بہت دشوار ہو جاتا۔

جرمنی سے صلح کرنے کے بعد بالشویک حکومت کو خانہ جنگی سے نبٹنا تھا جب

بھی کوئی نئی حکومت آتی ہو۔ قدرتی طور پر وہ عناصر جو خسارے میں رہتے ہیں، اُس کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ روس زبردست خانہ جنگی کا اکھاڑہ بن گیا۔ دوسری طرف بالشویک حکومت کے قیام نے اتحادیوں کو بھی چونکا دیا اور وہ بھی اس کے خلاف ہو گئے اس لئے کہ دنیا کا کوئی سرمایہ دار ملک اشتراکیت کے اصولوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا یہی وجہ ہو کہ روس کے اشتراکی نظام کی مخالفت اتحادیوں نے خود بھی کی اور دوسروں کو بھی اس پر اکسایا حالانکہ پریذیڈنٹ ولسن کے چھٹے نکتے کے بموجب ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا۔ چھٹا نکتہ یہ تھا:۔

"روس کو آزاد اور بے روک موقعہ دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی سیاسی ترقی اور قومی پالیسی کے مسئلے کو طے کر سکے۔ روس میں جو نظام حکومت بھی قائم ہو، اُسے تسلیم کر کے جمعیت اقوام میں اُسے خوش آمدید کہا جائے ——— بلکہ خوش آمدید سے بھی کچھ زیادہ مخلصانہ خیر مقدم کیا جائے اور اُسے ہر قسم کی امداد دی جائے۔"

اس دو رخی لڑائی میں بالشویکوں کو سخت ترین مشکلات کے دور سے گذرنا پڑا۔ جنوب میں رومانیہ نے ایک زرخیز ترین علاقے بے سرابیہ پر قبضہ کر لیا اور مغرب میں بریسٹ لٹافسک کی ساختہ پرداختہ ریاستوں کو باوجود کوشش کے واپس نہ لیا جا سکا۔ تاہم جو علاقہ بالشویکوں کے قبضے میں تھا اُس کا تحفظ بڑی بہادری و پامردی سے کیا گیا۔ بیرونی دشمنوں سے میدانِ جنگ میں جانبازانہ مقابلہ ہوا، اور اندرونی "باغیوں" کے محکمۂ خفیہ یعنی اوچرانا (Ochrana) کے نمونے پر ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ اوچرانا شہنشاہیت شکن طاقتوں کو بیدردی سے کچلتا تھا، اس نئے ادارے نے اتنی ہی بیدردی سے انقلاب شکن طاقتوں کو تباہ و برباد کرنا شروع کیا۔ چنانچہ سرکاری رپورٹ کی رو سے ۱۹۱۸ء کے آخر سے ۱۹۱۹ء کے اوائل تک اس ادارے نے سات ہزار باغیوں کو سزائے موت کا حکم دیا[1]۔

---

[1] پوسٹ وار ورلڈ: جیکسن

اس زمانے میں جو نظام حکومت قائم کیا گیا اس کا نام جنگی اشتراکیت رکھا گیا جس میں ڈکٹیٹرشپ (آمریت) اپنی انتہائی حدوں کو پہنچ گئی اور جبر و تشدد کی بے رحم طاقتوں سے مدد لے کر ہر مخالفت کو کچلا گیا۔

آخر بالشویک جیت گئے۔

کسانوں کی بغاوت اور نیا معاشی پروگرام

مگر اب ایک نئی مشکل پیش آئی۔ بالشویک حکومت کے قیام کے وقت کسانوں کو اپنی طرف کرنے کے لئے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ آج سے زمینداری کا پرانا نظام ختم ہوتا ہے اس لئے کاشتکار بطور خود زمینوں پر قابض ہو جائیں۔ اس اعلان نے واقعی کسانوں کو بہت خوش کیا اور انہوں نے مار دھاڑ مچا کر زمینداروں کو نکال باہر کیا۔ مگر اب پرانے زمینداروں کے بجائے نئے زمیندار پیدا ہو گئے۔ بالشویک حکومت جو اشتراکی اصولوں کی بنیاد پر امیر و غریب کا امتیاز مٹانا چاہتی ہے اور دولت کی کمی زیادتی کی وجہ سے انسانوں میں جو طبقات قائم ہیں اُن کو ختم کرنا چاہتی ہے، اس کے لئے دیہات کی یہ صورت حالات ناقابل برداشت تھی۔ مگر جب "نئے زمینداروں" کے خلاف کارروائی شروع ہوئی تو ان میں برہمی پھیل گئی پھر چونکہ عام کاشتکار جاہل تھے اس لئے ان کھاتے پیتے کسانوں نے ان کو بھی بہکا دیا جس کی وجہ سے کسانوں کا پورا طبقہ بالشویک حکومت کے خلاف ہو گیا۔ بالشویکوں نے سختی کے ساتھ اس شورش کو دبانا چاہا تو اور آگ لگی۔ کسانوں نے کہا کہ ہم نے پرانے ظالم زمینداروں کو اس لئے تو نہ نکالا تھا کہ ان کی جگہ پر تم جیسے خونخوار انسانوں کو قائم کریں۔ بدنصیبی سے اُسی زمانے میں خشک سالی بھی آ گئی۔ غرض ۱۹۲۱ء میں حکومت کی سختیوں اور ارضی و سماوی آفتوں دونوں سے کسانوں کو جو نقصان پہنچا اس میں تقریباً ایک کروڑ انسانی جانیں ہلاک ہوئیں۔

لیکن اس کے باوجود کسانوں کی بغاوت نہ دبی۔ آخر لینن نے ایک نیا اقتصادی پروگرام بناکر کاشتکاروں سے سمجھوتہ کیا۔ اس نئے پروگرام میں اُسے اشتراکی اصولوں سے کچھ ہٹنا پڑا، مگر اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس پروگرام کی رو سے:۔

۱۔ یہ طریقہ ختم کیا گیا کہ کاشتکار اپنی ضرورت کے مطابق غلّہ رکھ کر باقی تمام کا تمام حکومت کو دیدیں۔ اس کے بجائے یہ طے ہوا کہ صرف ایک خاص مقدار غلے کی ٹیکس کے طور پر اُن سے وصول کی جائے۔ اور اس کے بعد جو کچھ بچ جائے وہ ان کی ذاتی ملکیت ہو جسے وہ حسب دستور بازاروں میں لیجاکر بیچ سکتے ہیں۔

۲۔ کارخانوں اور صنعتی کاروبار کے اداروں پر حکومت نے جو تسلط قائم کردیا تھا اُسے کچھ کم کیا گیا۔ اور چھوٹے چھوٹے کارخانوں کو یہ موقعہ دیا گیا کہ وہ پہلے کی طرح مال بناکر بیچیں اور نفع کمائیں

۳۔ ممالک غیر کی کمپنیوں کو روس میں کاروبار کرنے کے سلسلے میں کچھ مراعات دی گئیں۔

۴۔ بڑے کارخانوں کو بھی خود مختاری کے ساتھ (معاشی ادارۂ عالیہ" کی برائے نام نگرانی میں) اپنی تنظیم کرنے کی اجازت دی گئی مگر ان کو اس کا پابند کیا گیا کہ مزدوروں کی اجرت وغیرہ ادا کرنے اور کاروبار کی ترقی کی اسکیموں کے اخراجات کو نکالنے کے بعد جو رقم بچے وہ معاشی ادارۂ عالیہ کو دیں،

۵۔ اب تک جو "جنگی اشتراکیت" قائم تھی اس میں ہر ایک کو کھانے پینے کے لئے ٹکٹ (راشن کارڈ) ملتے تھے مگر اب ان کے بجائے ایک نیا سکہ جاری کیا گیا۔

یہ تھے اس نئے "اقتصادی پروگرام" کے خاص خاص نمبرات۔ ان کی رو سے ایک محدود دائرے میں سرمایہ جمع کرنے اور ذاتی ملکیت کو فراہم کرنیکی اجازت دی گئی تھی مگر اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ تجارت میں مقابلہ (کمپیٹشن) کی جو اسپرٹ ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے تھوڑی پونجی والے سخت خسارے میں رہتے ہیں، اس کو ختم کیا جائے اور اس کی بجائے باہمی تعاون و اشتراک عمل کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔

اس نئے پروگرام نے کسانوں کی مخالفت کو بھی ختم کر دیا اور شہریوں کی بے چینی کو بھی بہت بڑی حد تک رفع کر دیا، لوگ آہستہ آہستہ پھر دولت جمع کرنے لگے البتہ ان کی دولت کی مقدار بڑے سرمایہ داروں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی تھی، تاہم یہ چھوٹے سرمایہ دار جنھیں روسی زبان میں نیپ مین (Nepmen) کہا جاتا تھا، تیزی سے ابھرنا شروع ہوئے۔ دوسری طرف گاؤں والے دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، کلک (Kulaks) یا مالدار اور بین ڈی ایک (Bendiaks) یا غریب —— اس پروگرام سے اشتراکی حکومت کو ایک وقفۂ سکون میسر آگیا اور اس وقفے میں وہ اسٹیٹ کیپٹل ازم یعنی حکومت کو ملکی معاشیات پر قابض کرنے کی تجویزیں سوچنے لگے۔ اس لئے کہ اشتراکیت کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ملک کے تمام معاشی وسائل حکومت کی براہ راست نگرانی اور قبضے میں ہوں تاکہ ہر شخص کی معاشی ضروریات کی تکمیل حکومت جانب سے عمل میں آتی رہے۔

پہلا اشتراکی نظام چار پانچ سال تک بالشویک حکومت کو خارجی جنگوں اور داخلی بدامنیوں میں مصروف رہنا پڑا۔ ۱۹۲۴ء میں اس کا پہلا دستور اساسی شائع ہوا تھا۔ جس طرح ۱۸۷۵ء میں دنیا کا پہلا

جمہوری دستورِ اساسی انقلاب کے بعد فرانس میں تیار ہوا تھا، اسی طرح ۱۹۲۳ء میں دُنیا کا پہلا اشتراکی دستور انقلابِ روس کے بعد بالشویک حکومت نے مرتب کیا۔ اس دستورِ اساسی کی خصوصیات یہ تھیں :-

۱۔ زار کی حکومت میں اس بات کی کوشش کی جاتی تھی کہ روس میں ایک قسم کی متحدہ قومیت پیدا ہو جائے۔ اس بنا پر اقلیتوں کے تمدن و تہذیب کو بُری طرح پامال کیا جاتا تھا۔ مگر اب اقلیتوں کے ساتھ خاص مراعات کی گئیں اور ان کو ایک متحدہ قومیت میں گڈمڈ کرنے کے بجائے ان کے جداگانہ مستقل وجود کو قائم رکھنے کی تدابیر اختیار کی گئیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بہت سی جمہوریتیں قائم کی گئیں اور ہر جمہوریت کو اپنے معاملات میں خود مختار بنایا گیا۔ ان سب جمہوریتوں کا تعلق ایک مرکزی حکومت سے کیا گیا مگر بہت ہی خاص صورتوں کے علاوہ مرکزی حکومت کو بھی ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا حق نہیں دیا گیا۔

۲۔ روس میں بیسیوں مختلف قومیں اور نسلیں بستی ہیں جو اپنی نسل، زبان، تمدن و تہذیب اور مذہب و معاشرت ہر لحاظ سے باہم گر بہت مختلف ہیں، نئے دستورِ اساسی میں ان میں سے ہر ایک کو تہذیبی خود مختاری کلچرل آٹانومی، تو دی گئی، لیکن معاشی وسائل و ذرائع کو متحد رکھا گیا۔ یعنی معاشی ترقی کا تعلق روس کی مرکزی حکومت کو دیا گیا جو تمام روس کے مجموعی مفاد کو سامنے رکھ کر اسکیمیں تیار کرنے کی مجاز ہے۔

۳۔ مزدوروں اور محنت کش طبقوں کو حکومت میں زیادہ دخل دیا گیا۔ کسانوں کو اس سے کم۔ اسکی صورت یہ رکھی گئی کہ مزدوروں کے حلقہ ہائے انتخاب کے ووٹروں کی تعداد کسانوں کے حلقہ ہائے انتخاب کے مقابلے میں بہت زیادہ رکھی گئی۔

۴۔ مذہبی تعلیم ختم کر دی گئی اور یہ طے ہوا کہ مذہب کے نام پر حکومت کے خزانے سے کسی قسم کی کوئی امداد نہ دی جائے گی۔

اس دستور میں کمیونسٹ پارٹی (اشتراکی جماعت) کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ روس کی اصلی حکمراں طاقت اسی پارٹی کے ہاتھ میں تھی اور اب تک ہے، روس میں بھی ترکی کی طرح کسی جماعت کے بنانے کی اجازت نہیں صرف کمیونسٹ پارٹی کے نام سے ایک جماعت ہے۔

کمیونسٹ (اشتمالیت پسند) مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، لیکن اس پارٹی کے ممبروں میں ایثار و اخلاص، بے لوث خدمت خلق اور سادہ زندگی بسر کرنے کے جو اوصاف ہوتے ہیں وہ کسی پکے مذہبی سے کم نہیں کہے جا سکتے۔ اس جماعت میں بڑی چھان بین کے بعد کسی ممبر کو داخل کیا جاتا ہے اور طالب علموں کی طرح سکھایا پڑھایا جاتا ہے۔ ہر ممبر سے یہ اقرار لیا جاتا ہے کہ ہم سادہ زندگی بسر کریں گے اور پارٹی کے لیڈروں کی طرف سے ہمیں جو حکم ملے گا۔ اس کی بے چون وچرا اطاعت کریں گے۔ پارٹی کا ضبط و نظم (ڈسپلن) بیحد سخت ہے، ہر ممبر کو اپنے ذاتی چال چلن اور خدمتِ خلق کے ایک بہت بلند معیار کے مطابق رہنا پڑتا ہے۔ اگر ذرا بھی اس ڈگر سے کوئی اِدھر اُدھر ہوا تو اس سے سخت بازپرس کی جاتی ہے، ہر ممبر کو تنخواہ دی جاتی ہے مگر صرف اتنی جو معمولی گذر بسر کرنے کے لئے کافی ہو۔ ہر ممبر کے کام، چال چلن اور اس کے عام حالات واطوار کا ایک مستقل ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ جس کی جانچ وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہے، اور اگر ذرا بھی کسی ممبر میں کوئی کمزوری پائی جاتی ہے تو اُسے فوراً نکال دیا جاتا ہے۔

غرض اس جماعت کے ممبروں میں فداکاروں کی سی وہی شان ہوتی ہے جو کسی الہامی مذہب کے معتقدوں میں پائی جاتی ہے۔

کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ کسی دوسری جماعت کے بنانے کی اجازت اگرچہ نہیں ہے۔ لیکن اس جماعت کی ہم مقصد وہم آواز جماعتیں دوسری بھی ہیں۔ مثلاً ہر کارخانے، کان اور ریل میں، ہر جہاز اور ہر بڑے کھیت میں، ہر کالج اور ہر پبلک

ادارے میں مزدوروں کی ایک کمیٹی ہوتی ہے جو انتخاب یا انتخاب سے قریب تر کسی ذریعہ سے بنتی ہے۔ یہ کمیٹی اپنے حلقے کے تمام محنت کش افراد کی نمائندہ ہوتی ہے اور ڈسپلن کو قائم رکھنے اور جماعتی احساس کو باقی رکھنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ مزدوروں اور منتظموں کے کام کی دیکھ بھال کرتی ہے، ان پر حسب ضرورت نکتہ چینی کرتی ہے، سست افراد کو سزا دیتی ہے اور محنتی افراد کا دل بڑھاتی ہے۔ کام کرنے کے طریقے میں اگر کوئی تبدیلی مفید سمجھتی ہے تو مرکزی اشتراکی حکومت سے اس کی سفارش کرتی ہے اور حکومت کی طرف سے کام کا جو نقشہ بنا کر بھیجا جاتا ہے، اس میں ضروری ترمیمیں کرتی ہے۔ غرض یہ بہت اہم جماعت ہوتی ہے اور بہت اہم اور ذمہ داری کے کام انجام دیتی ہے۔

او۔ جی۔ پی۔ یو زار کے زمانے میں اوجرانا کے نام سے ایک تعزیری محکمہ تھا جو انقلاب پسندوں کی بیخ کنی کرتا تھا۔ اشتراکی حکومت نے بھی اس کی تقلید میں ایک محکمہ او۔ جی۔ پی۔ یو (O. G. P. U.) کے نام سے قائم کیا جو "انقلاب شکن" لوگوں کو سخت ترین سزائیں دیتا ہے۔ اس محکمہ کے پاس ایک فوج ہے۔ لیکن اس فوج کے علاوہ روس کی پوری فوج سے مدد لینے کا بھی اسے اختیار ہے۔ خود مختار جمہوریتوں کے داخلی معاملات میں مرکزی حکومت کے عہدیداروں کو مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے، لیکن او۔ جی۔ پی۔ یو کو یہ حق حاصل ہے۔ اس محکمے کے عہدیداروں کے لئے ہر ریل میں ایک وسیع ڈبہ مخصوص ہوتا ہے۔ جس میں اس کے کچھ ملازمین ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر جگہ اس کے خفیہ آدمی چھوٹے رہتے ہیں۔ اگر اس محکمے کی نظر میں کوئی شخص مجرم قرار دیا جاتا ہے تو عام طور سے اسے یا تو قید تنہائی میں رکھا جاتا ہے اور یا جبری مشقت اس سے لی جاتی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۳۲ء تک اس قسم کے ڈھائی لاکھ مجرموں کو شمال کے

برفستانی سمندر بحر سفید میں نہر بنانے کے کام پر لگا گیا۔

او۔جی۔پی۔یو (O. G. P. U) کا نام ہی سخت ترین دہشت پیدا کر دیتا ہے۔ روسیوں میں اس کے بارے میں عجیب عجیب ہیبت ناک روایتیں مشہور ہیں اگر بازار میں یا کسی پبلک مقام پر او۔جی۔پی۔یو کا نام لے دیا جائے تو لوگوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس محکمے کی "عدالت" سے مجرموں کو جس قسم کی سزائیں دی جاتی ہیں اس کی بہت ہی مہیب کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن بعض واقفکار لوگوں کا خیال ہے کہ "غالباً خود او۔جی۔یو۔پی ہی اس قسم کے ہیبت ناک قصوں کو ڈرانے اور دہشت پیدا کرنے کے لئے پھیلاتا ہے اور اس لئے یہ بالکل صحیح ہے کہ اس نے عوام کے دلوں میں سخت ترین خوف پیدا کر دیا ہے حتیٰ کہ روس میں لوگ کھلم کھلا اس کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ اس سے مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں میں عام دہشت پیدا ہو جائے تاکہ انقلاب شکن کوششوں کی طرف ان کا میلان نہ ہو سکے۔"[۵]

لینن کا انتقال ۱۹۲۴ء تک لینن بالشویک حکومت کی رہنمائی کرتا رہا مگر اس کی صحت بہت پہلے سے جواب دے چکی تھی ۱۹۱۸ء میں اپنی انقلابی کوششوں کے سلسلے میں وہ بندوق کی ایک گولی کا نشانہ بن چکا تھا خوش قسمتی سے یہ گولی اس کے لئے جان لیوا تو ثابت نہ ہوئی، لیکن اُسے مستقل روگی ضرور بنا گئی۔ یہ گولی کچھ اس طرح پھنس گئی تھی کہ آخر دم تک اس کے جسم ہی میں پیوست رہی۔ مگر اس کے باوجود وہ حد سے زیادہ کام کرتا رہا خصوصاً انقلابِ روس کے بعد تو وہ بیل کی طرح کام میں جت گیا۔ ۱۹۲۲ء میں اُس پر

۵؎ "ماسکو" ۱۹۱۸ء تا ۱۹۳۳ء بحوالہ پوسٹ وار ورلڈ۔ نیز دیکھو "اسٹالنز روشا" از لوئی فشر

مرض کا سخت حملہ ہوا مگر جانبر ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اُسے آرام کرنے کی سخت ترین ہدایت کی۔ مگر اس نے نہ مانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر بعد ہی دوسرا شدید دورہ پڑا۔ اس مرتبہ حملہ سخت تھا جس نے جسم کے دائیں حصے کو مفلوج کر دیا اور بولنے کی قوت جاتی رہی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ کسی گاؤں میں چلا جائے اور سکون کی زندگی گذارے۔ مگر وہ گاؤں میں بھی کام سے باز نہ آیا۔ یہاں سے اشتراکی حکومت کے بارے میں رہنمائی کرتا رہا۔ اسٹالن اس کا دست راست تھا مگر طبعاً بہت سخت مزاج واقع ہوا تھا۔ لینن اُسے اقلیتوں پر ظلم کرنے سے باز رکھتا تھا اور نئے معاشی پروگرام کے سلسلے میں بہت کچھ رہبری کرتا تھا۔ لیکن آخر یہ ناؤ زیادہ دن تک چلنے والی نہ تھی۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں انقلاب روس کا یہ ہیرو اور مارکسی اشتراکیت کو عملی شکل دینے والا یہ عظیم القدر رہنما دنیا سے اٹھ گیا۔ روس نے اس سانحے کی خبر سنی تو سراپا ماتم بن گیا۔

لینن کا انتقال بہت بے وقت ہوا۔ روس میں لینن ہی کی شخصیت ایک ایسی مقناطیسی کشش رکھتی تھی جو سب کو جوڑے ہوئے تھی اور جس کی وجہ سے بہت سے فتنے دبے ہوئے تھے۔ وہ طبعاً بہت نرم مزاج، خلیق اور رافر انداز تھا، مگر اسی کے ساتھ اپنے فیصلوں کو زیر عمل لانے میں انتہائی بیرحمی سے کام لیتا تھا، وہ وقت کی نبض کو پہچانتا تھا اور لوگوں سے ان کی فطرت کے مطابق کام لیتا تھا۔ یہ لینن ہی تھا جس کی رہنمائی کی بدولت روس میں اشتراکی حکومت قائم ہو سکی، لینن ہی تھا جس نے کسانوں کو زمینداروں کی زمین پر قابض کرا کے آنِ واحد میں انھیں اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ لینن ہی تھا جس نے اتحادیوں کے فوجی حملوں کی مدافعت کر کے روس کی آزادی کو تسلیم کرایا، لینن ہی تھا جس نے خانہ جنگی کو ختم کیا اور "نیا معاشی پروگرام" بنا کر اشتراکی اصولوں سے اگرچہ کسی قدر ہٹا مگر روس میں اشتراکیت کو

فنا ہونے سے بچا لیا، لینن ہی تھا جس کی سرکردگی میں روس کی اقلیتوں کو کامل خود اختیاری دی گئی اور ان پر ظلم و زیادتی کا دروازہ بند ہوا۔ لینن ہی تھا جس نے روس کی معاشی ترقی کے بارے میں ہمہ گیر پروگرام بنائے، جس نے ایک طرف تو اشتراکی کارکنوں کے دلوں میں جوش و جذبے کا ایک بے پناہ سمندر موج زن کر دیا اور دوسری طرف اُن کے سامنے عمل کی ایک وسیع شاہراہ کھول دی۔[۱]

غرض لینن کی شخصیت روس کے لئے بے مثال تھی۔ اس کے مرنے کے بعد دوسرا لینن پیدا نہ ہو سکا۔ سوال اٹھا کہ لینن کا جانشین کون ہو؟ لوگوں کی نگاہیں ٹراٹسکی کی طرف اٹھیں، ساری دنیا میں اس کی لیاقت و قابلیت کی دھوم تھی اور روسی زبان کے ادیب کی حیثیت سے روس کا بچہ بچہ اس سے واقف تھا۔ ادیب کے علاوہ وہ بہترین خطیب بھی تھا اور بہترین جنرل بھی۔ عوام کی تنظیم کرنے میں اس کی قابلیت بے نظیر تھی۔ کروڑوں گھروں میں لینن کے فوٹو کے پہلو بہ پہلو اس کے فوٹو ٹنگے ہوئے تھے اور لینن کے ساتھ ٹراٹسکی کا نام خود بخود زبان پر آ جاتا تھا۔ مگر اتفاق سے لینن کی موت کے وقت ٹراٹسکی بیمار تھا اور دارالسیاست سے دور ایک گاؤں میں مقیم تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں اسٹالن کی کوششوں سے (جو کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سکریٹری تھا) بالشویک حکومت کی عنانِ اقتدار تین ممبروں کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دی گئی جس میں خود اسٹالن کے علاوہ کامنیف اور زنوویف شامل تھے، زنویف کی سیاسی قابلیت سے کسی کو انکار نہ تھا۔ اسی طرح کامنیف کی بلیغ خطابت و تقریر گوئی سے سارا روس متاثر تھا، لیکن لینن کے قائم مقام یہ دونوں نہ ہو سکتے تھے۔ اسٹالن ان دونوں سے بھی زیادہ اس منصب کے لئے نا اہل سمجھا جاتا تھا وہ کمیونسٹ پارٹی

---

[۱] دیکھو لینن ز شاہ لوئی فشر (مطبوعہ پدما پبلیکیشنز بمبئی)

کا جنرل سکریٹری ہونے کی وجہ سے ایک اہم، ذمہ دار اور با اختیار منصب پر فائض ضرور تھا، لیکن اس کی شہرت بہت کم تھی اور خاص خاص حلقوں کے سوا عام لوگ اُسے بالکل نہ جانتے تھے جو لوگ اُسے جانتے تھے وہ بھی یہ کہتے تھے کہ اسٹالن ایک اچھا سپاہی ہے لیکن جنرل بننے کی قابلیت اس میں نہیں"۔

ٹراٹسکی پورے سال بیمار رہا۔ جب ۱۹۲۵ء میں وہ شفایاب ہوا تو اُسے بتایا گیا کہ اگرچہ آپ اب تک وزیر جنگ کے عہدے پر مامور تھے۔ لیکن آج سے آپ سے یہ عہدہ واپس لیا جاتا ہے اور اس کی جگہ "بجلی اور سائنس" کا محکمہ دیا جاتا ہے۔ ٹراٹسکی نے اس تبدیلی کو منظور کر لیا، اس نے کہا کہ "بجلی اور سائنس" کے محکمے کے ذریعہ روس میں کام کرنے کا بہت وسیع میدان ہے، اس لئے کہ انہی دو طاقتوں کی مدد سے پورے روس کی صنعت کو ترقی دے کر اسے ایک دولت مند ملک بنایا جا سکتا ہے۔

ٹراٹسکی اور لینن اگرچہ شہرت میں ایک دوسرے سے کم نہ تھے، لیکن طبیعت میں زمین آسمان کا فرق رکھتے تھے۔ ٹراٹسکی اپنے رائے کے اظہار میں بہت بیباک تھا اور اس کا مطلق خیال نہ کرتا تھا کہ کوئی خوش ہوگا یا ناخوش۔ پھر جو لوگ ناخوش ہو جاتے تھے، ان کو منانے کی کوشش بھی نہ کرتا تھا، اُسے اپنی طاقت، اپنے دماغ اور اپنی صلاحیت پر بہت غرہ تھا اور وہ کسی کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ اس کی اِس افتادِ طبیعت کی وجہ سے روس کے سیاسی کام کرنے والوں میں اس کے کافی مخالف پیدا ہو گئے تھے، مگر یہ مخالفت بہت حقیر تھی۔ لینن کے انتقال کے بعد مخالفوں کو بڑی فکر ہوئی۔ وہ ٹراٹسکی کو برسر اقتدار نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لئے اندر ہی اندر کھچڑی پکنے لگی۔ ادھر ٹراٹسکی نے کسی بات کی مطلق پرواہ نہ کی اور اپنے کام اور اپنی صلاحیت کے نشے میں دھڑلّے سے سب پر نکتہ چینی شروع کر دی اور تو

اور اس نے لینن کے "نئے معاشی پروگرام" کی بھی سخت مخالفت کی۔ اس نے کہا کہ یہ کیسی اشتراکیت ہے کہ دیہات میں ایک نیا زمیندار طبقہ پیدا ہو رہا ہے؟ اس نے بڑی بلند آہنگی سے اپنی پارٹی کو مطعون کیا اور کہا کہ وہ سرمایہ داری کی حمایت کر رہی ہے اور حکومت کو سرمایہ دار بنانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے، حالانکہ اس کا کام صرف یہ تھا کہ انقلاب کی آگ کو اس وقت تک روشن رکھتی جب تک ساری دنیا میں اشتراکیت کا نظام رائج نہ ہو جاتا۔ ٹراٹسکی کہتا تھا کہ اشتراکیت قومی نہیں بین الاقوامی ہے، اس لئے صرف روس میں اپنی کوششوں کو محدود کر دینا سخت غلطی ہے۔

ٹراٹسکی کی جلاوطنی اور اسٹالن کا عروج

غرض ٹراٹسکی کو پارٹی کے عمل کے خلاف سخت اعتراضات پیدا ہو گئے تھے، اس چیز نے قدرتاً کارکنوں میں اور بددلی پھیلائی۔ سب سے بڑا اختلاف قومی اور بین الاقوامی سوال پر پیدا ہوا۔ ٹراٹسکی کے مخالفوں کا کہنا تھا کہ پہلے روس میں ہمیں اپنی مکمل تنظیم کر لینا چاہئیے اور اس کے بعد دوسرے ممالک کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا چاہئیے۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی کہتے تھے کہ فی الحال دُنیا کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ آسانی سے اشتراکی پروگرام کو قبول کرے۔ چین سے کافی آس بندھی تھی کہ اپنی غربی و بدحالی کی وجہ سے وہ دنیا کا پہلا ملک ہوگا جو روس کے نظام کی طرف بڑھے گا۔ لیکن وہاں سخت مایوسی کا سامنا ہوا۔ یہی حال ترکی میں ہوا۔ خیال تھا کہ ترک اتحادیوں کے نرغے سے آزاد ہو جانے کے بعد روسی اشتراکیت کو قبول کر لیں گے۔ لیکن مصطفےٰ کمال نے اسے نہ مانا اور وہاں خود مختار جمہوریت قائم ہو گئی، بہرحال اس قسم کے دلائل دے کر ٹراٹسکی کو خاموش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن ٹراٹسکی کو ان میں سے کوئی چیز مطمئن نہ کر سکی۔ وہ بدستور اپنی سی کہتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ اسٹالن نے اس کے خلاف فضا ہموار کر لی اور بڑی چالاکی و حکمت عملی سے پہلے تو زنوویف اور کامنیف کو اقتدار اعلیٰ کی مسند کا

کمیٹی سے علیحدہ کرکے تنہا خود کو اقتدار کا مالک بنایا اور پھر ۱۹۲۷ء میں ٹراٹسکی کو بھی پارٹی سے خارج کرکے اُسے روسی ترکستان میں جلاوطن کر دیا۔ جہاں سے ۱۹۲۹ء میں وہ قسطنطنیہ گیا لیکن انگلستان اور ڈنمارک نے اپنے ممالک میں مقیم ہونے کی اجازت اُسے نہ دی۔ البتہ ۱۹۳۱ء میں اسپین میں رہنے کی اجازت اُسے مل گئی اور آخر اس غریب الوطنی کی حالت میں ۱۹۴۱ء میں کسی مخالف کی گولی سے جنوبی امریکہ میں اس کی موت واقع ہوئی۔

اب اسٹالن روس کا ڈکٹیٹر تھا۔ اسٹالن کوئی اثر انداز شخصیت رکھنے والا نہ تھا البتہ سخت محنتی، جفاکش اور بیل کی طرح کام کرنے والا شخص ضرور تھا، اس کی سب سے بڑی قابلیت یہ تھی کہ وہ لینن کے اندھے معتقدوں میں سے تھا اور اس کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتا تھا۔ اس کا اصلی نام اسٹالن نہ تھا۔ یہ دراصل اس کا لقب ہے جو لینن ہی نے اُسے دیا تھا۔ اسٹالن کے معنے روسی زبان میں "فولادی انسان" کے ہیں ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں اس نے کوئی خاص نمایاں خدمت انجام نہیں دی تھی، البتہ "خانہ جنگی" کے زمانے میں اُس نے زارسٹین کے شہر کا بچاؤ اتنی بہادری اور دلیری سے کیا تھا کہ بصورت دیگر شاید وہ "باغیوں" کے قبضے میں چلا جاتا۔ اسی لئے اس شہر کا نام بدل کر اسٹالن گراڈ رکھا گیا۔ اس کے علاوہ خانہ جنگی کے دوران میں وہ سائبریا میں بھی لڑا تھا اور پیٹرو گراڈ کو بھی اسی نے دشمنوں کے نرغے سے بچایا تھا۔ خانہ جنگی کے ختم ہونے پر وہ انتہائی مستقل مزاجی کے ساتھ خاموشی سے پارٹی کا کام کرتا رہا۔

۱۹۲۱ء میں کچھ جہازی فوج نے بغاوت کی تو اس مہم پر اسٹالن کو بھیجا گیا جہاں اس نے انتہائی بیرحمی کے ساتھ مشین گن لگا کر اور سب کو نیست و نابود کرکے امن کو بحال کیا۔ اس واقعے کے بعد لینن نے اُسے کمیونسٹ پارٹی کا سکریٹری بنا دیا۔ لینن کا دلی منشا، یہ تھا کہ ٹراٹسکی کو سکریٹری بنایا جائے۔ مگر ٹراٹسکی نے اس عہدے کو اپنی شان

سے کمتر سمجھ کر قبول نہ کیا۔ مجبوراً یہ عزت اسٹالن کو دینا پڑی۔

روس کا آمر مطلق (ڈکٹیٹر) بن جانے کے بعد اسٹالن نے مطمئن ہو کر کام کرنا شروع کیا۔ وہ تمام سرمائے کو حکومت کی ملکیت یا ریاستی سرمائے میں منتقل کر دینا چاہتا تھا یعنی بہت سے چھوٹے بڑے سرمایہ داروں کے مقابلے میں ریاست یا حکومت کے نام سے ایک سب سے بڑا مگر واحد سرمایہ دار پیدا کرنا چاہتا تھا، ٹراٹسکی اس خیال کا مخالف تھا۔ مگر اب ٹراٹسکی کی مخالفتوں سے اسٹالن کو نجات مل چکی تھی۔ اسٹالن نے جس ریاستی سرمایہ داری (State Capitalism) کو رواج دیا اس میں تجارت و صنعت کا تمام نفع حکومت کو دیدیا جاتا ہے اور پھر ان اداروں کو جو صنعتی ترقی کی غرض سے بنائے جاتے ہیں، حکومت کچھ رقم فی صدی کے حساب سے دیتی ہے۔ اسی طرح چیزوں کی قیمت کا فیصلہ دنیا کے عام اصول کے مطابق مانگ اور کھپت (Demand and Supply) کے پیمانے سے نہیں کیا جاتا بلکہ حکومت خود اشیا کا نرخ مقرر کرتی ہے۔ بعض صورتوں میں یہ نرخ لاگت سے کم ہوتا ہے اور بعض اوقات زیادہ۔ جن چیزوں کی قیمت زیادہ تجویز کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب در اصل خریداروں پر ایک قسم کا بالواسطہ ٹیکس عائد کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے روزمرہ کی ناگزیر ضروریات کی چیزوں کا نرخ کبھی زیادہ نہیں کیا جاتا۔ آسائش و تعیش کی فالتو چیزوں کا نرخ عموماً زیادہ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ صنعت و حرفت کو امداد بھی دی جاتی ہے اور یہ امداد دیتے وقت اس بات کا قطعاً خیال نہیں کیا جاتا کہ نفع کتنا آرہا ہے، بلکہ صنعت کی حالت اور ملک کی عام ضرورت کے پیش نظر ہر امداد دی جاتی ہے۔

کارخانوں کی نگرانی کا براہِ راست تعلق اگرچہ منیجروں اور ڈائرکٹروں ہی سے ہوتا ہے۔ لیکن کارخانوں کی منتخبہ کمیٹیاں جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے ان کا بھی کافی اثر

ہوتا ہے اگر اس کمیٹی کے ممبروں اور کارخانے کے منیجر یا ڈائرکٹر میں کسی مسئلے پر اختلاف ہو جائے تو پھر ایک تیسری جماعت کی طرف دونوں رجوع کرتے ہیں۔

لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ روس کا یہ نظام اصلی اشتمالیت (کمیونزم) سے بہت دور ہے۔ بالشویک دراصل کمیونزم کو قائم کرنے میں اتنے کامیاب نہیں ہوئے جتنی کامیابی انھیں سرمایہ داری کو گرانے میں ہوئی، واقفکار کمیونسٹوں کا یہ کہنا سو فیصدی صحیح ہے کہ روس کا انقلاب اُن لائنوں کی بالکل خلاف چل رہا ہے جو کارل مارکس نے متعین کی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ مارکس کے نظریے کے مطابق کمیونزم کو سب سے پہلے انگلستان جیسے کسی ترقی یافتہ ملک سے شروع ہو کر دنیا میں پھیلنا چاہئے تھا لیکن روس میں اس کا برعکس ہوا، کیونکہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی ہر لحاظ سے روس یورپ کا ایک پسماندہ علاقہ ہے۔[۱]

تاہم روس کے سیاسی کارکن مارکس کو اپنا پیغمبر سمجھتے ہیں اور اس کی تصنیفات کو قرآن کی طرح پڑھتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء کا اشتمالی منشور (کمیونسٹ مینی فسٹو) انقلاب روس کا صحیفۂ آسمانی ہے جس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کو زیر عمل لانے کی کوشش کی جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس میں روسو کا "معاہدۂ عمرانی" انقلابیوں کی توریت و انجیل بنا ہوا تھا اور اس کی ہر ہر سطر کو ایک الہامی کتاب کی سی تقدیس و تعظیم کے ساتھ دیکھا اور پڑھا جاتا تھا۔ لینن کو مارکس کے اصول کا "الہامی شارح" سمجھا جاتا ہے۔ جب ٹراٹسکی اور اسٹالن کا اختلاف بڑھا تو دونوں ایک دوسرے کو مارکس اور لینن کے اصول و عمل سے ہٹ جانے کا الزام دیتے تھے۔ اس بحثا بحثی

---

[۱] دیکھو Essays of Communist Manifesto: Adorostsky (مطبوعہ نیشنل بک ایجنسی۔ کلکتہ)

میں اسٹالن کی فتح کا مطلب یہ تھا کہ اس کی بتائی ہوئی شرح و تفسیر کو صحیح سمجھا گیا اور ٹراٹسکی کی تشریحات کو باطل قرار دیا گیا۔ اس فیصلے کے بعد اسٹالن کی تفسیر کو نہ ماننا "کفر والحاد" سے کم نہ تھا جس کی سزا روس کی اشتراکی سرزمین میں وہی ہے جو مذہبی دنیا میں کفر و الحاد کی ہوتی ہے —— یعنی جلا وطنی، حبس دوام یا موت[1]!!

معاشی ترقی کا پانچسالہ پروگرام

لینن کہا کرتا تھا کہ اگر ہم اپنی بھاری صنعتوں کو منظم کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تو ہم "اشتراکی ریاست" تو کجا "مہذب ریاست" کہلانے کے بھی حقدار نہ ہو سکیں گے۔ اس سلسلے میں اس نے برقی ترقی کے پروگرام کو سب پر مقدم رکھا اور ۱۹۲۰ء میں اس کے لئے حکومت کی طرف سے ایک وفد (کمیشن) جاری کیا جس نے برقی ترقی کے لئے سارے روس میں زبردست پروپیگنڈا کیا اور عوام کو اس کے فوائد و منافع سے واقف بنایا۔ لیکن لینن کی عمر نے وفا نہ کی اس لئے اس کی زندگی میں تو کچھ نہ ہو سکا۔ البتہ اس کے بعد صنعتی و زراعتی ترقی کا ایک پانچ سالہ پروگرام بنایا گیا جس کا آغاز یکم اکتوبر ۱۹۲۸ء سے ہوا۔ اس پروگرام کے دو حصے تھے: ایک کا تعلق صنعتی ترقی سے تھا اور دوسرے کا زرعی ترقی سے۔ پہلے حصے میں زبردست کامیابی ہوئی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ روس کی نئی حکومت دراصل صنعتی مزدوروں کے ہاتھ میں تھی اور اس میں ان کے نمائندے بہت بڑی تعداد میں تھے۔ یہ لوگ شہروں میں رہتے تھے، تعلیم یافتہ تھے، دنیا کے حالات سے باخبر تھے اور اپنے سامنے ایک

---

[1] روسی انقلاب کی تفصیلات کے لئے دیکھو "تاریخ انقلاب روس" از ٹراٹسکی۔ اور "بالشویک انقلاب" مرتبہ Binyan and Fisher (مطبوعہ لندن ۱۹۳۰ء) اور "ہسٹری آف سول وار ان یو ایس ایس آر" آخر الذکر کتاب کو کئی روسی کمیونسٹوں نے مرتب کیا ہے جن میں اسٹالن بھی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ہے۔

بہت شاندار مستقبل رکھتے تھے۔ لیکن روس کے کسانوں کے سامنے اس قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ جس طرح پہلے زمین کھودتے تھے، اب بھی یہی کام کرتے رہے۔ صرف یہ ہوا کہ پرانے زمینداروں کی جگہ نئے زمینداروں نے لے لی۔ اس پانچ سالہ پروگرام[1] میں یہ کوشش کی گئی کہ زمین کی انفرادی ملکیت کو ختم کرکے اجتماعی ملکیت پیدا کی جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر لینن کے بنائے ہوئے "معاشی پروگرام" کو منسوخ قرار دیا گیا اور کسانوں سے زمینیں چھین چھین کر یا تو انھیں ریاستی ملکیت قرار دیا گیا اور ریاست کی طرف سے کسانوں کی ایک جماعت بنا کر ان کی اجتماعی ملکیت میں کوئی علاقہ دے دیا گیا۔ دونوں صورتوں میں مدعا یہ تھا کہ زمین کی ملکیت مشترکہ ہو اور اس کے نفع پر بھی سب کا یکساں حق ہو اور محنت بھی سب مل جل کر کریں۔ لیکن اس چیز نے کسانوں میں سخت بددلی پھیلائی۔ کیونکہ مزدور تو زیادہ کام کرکے یا پیداوار کو زیادہ کرکے اُجرت کی زیادتی کا مطالبہ کر سکتے تھے، لیکن کسانوں کو تو اسی پیداوار میں سے حصّہ ملے گا جو زمین سے ہوگی۔ پھر زمین کوئی مشین تو ہے نہیں کہ اگر دو گھنٹے کے بجائے دس گھنٹے لگ لپٹ کر کام کیا جائے تو زیادہ پیداوار ہونے لگے۔ زمین کی پیداوار تو بس ایک حد تک ہی بڑھ سکتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر کسانوں نے یہ پسند نہ کیا کہ وہ کھیت کے مزدور ہو کر رہ جائیں اور پھر جو کچھ پیدا ہو اس میں سے ایک معقول مقدار حکومت کو بھی بلامعاوضہ ادا کریں۔ پھر جب ان کے ہاتھ میں حکومت بھی نہ تھی اور نہ کوئی خوشگوار مستقبل تھا تو قدرتاً اس بددلی میں اور اضافہ ہوا۔

---

[1] اقتصادی تعمیر کی اس پنج سالہ اسکیم کا مکمل ترجمہ انگریزی میں ۱۹۳۰ء میں لندن سے شائع ہوا ہے اس کا نام ہے

نیز دیکھو سویٹ اکنامکس مرتبہ (مطبوعہ لندن)

کسانوں کی دوسری بغاوت

اشتراکی کارکنوں نے جب دیکھا کہ اُن کا پروگرام فیل ہورہا ہے تو پہلے تو انہوں نے خوشامد درآمد اور ترغیب و تشویق سے کام نکالنا چاہا۔ مگر جب اس سے کچھ نہ ہوا تو ۱۹۲۹ء کے موسم سرما سے سختی شروع کی گئی۔ مالدار زمینداروں کو پکڑ پکڑ کر شمال کے برفستانی علاقوں میں "جبری مشقت" پر بھیجا گیا اور ان کے زن و فرزند کو بھی گھر سے بے گھر کر دیا گیا۔ جب کسی کسان نے پانچ سالہ پروگرام کے مطابق عمل پیرا ہونے میں ذرا بھی پس و پیش سے کام لیا۔ اس کی فوری سزا کا حکم صادر ہو گیا۔

اس صورتِ حالات نے قدرتاً ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ روس میں کاشتکاروں کی تعداد کل آبادی کا اسّی فی صدی ہے، اس لئے سب کو سزا دیدینا تو ممکن نہ تھا تاہم بہت کچھ کیا گیا مگر پھر بھی کامیابی نہ ہوئی۔ تشدد و سخت گیری نے اور زیادہ گھبراہٹ اور بد دلی پھیلائی۔ کسانوں سے اور کچھ نہ ہوسکا تو انہوں نے مارے غصّے کے اُن نئی مشینوں اور نئے آلاتِ کشاورزی کو توڑنا شروع کر دیا جو انھیں دیئے گئے تھے غلے کے گوداموں میں آگ لگادی، فصلیں خود ہی تباہ کر دیں اور کام اگر کیا بھی تو ہارے تھکے دل سے۔

اشتراکی حکومت کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ مرکزی حکومت کے دفتر میں روزانہ تار پر تار اور خط پہ خط چلے آرہے تھے، ہر طرف ایک تہلکہ مچا ہوا تھا اور ترقی کے بجائے تباہی کے آثار نظر آرہے تھے۔ اسٹالن نے کچھ دن تک اس صورتِ حالات کو غور سے دیکھا۔ آخر اس نے بڑی موقعہ شناسی سے کام لے کر مارچ ۱۹۳۰ء میں روس کے اخبارات میں اپنے نام سے ایک مضمون بھیجا جس کا عنوان تھا:——— "کامیابی کا نشہ!"

اس مضمون میں اسٹالن نے اپنی پارٹی کے کارکنوں کو سخت ملامت کی اور

ان کو سختی و زیادتی کا ملزم قرار دیا۔ اس نے لکھا کہ جو احکام مرکز سے بھیجے گئے تھے ان کی بجا آوری میں ان لوگوں نے ناروا سختی و تشدد سے کام لیا۔ انہوں نے کسانوں کو ان کی مرضی و منشا کے خلاف "اجتماعی کاشت" (Collective Farm) میں شریک کیا۔ آئندہ ایسا ہرگز نہ کیا جائے۔ انہوں نے ہر کھاتے پیتے کسان پر دولتمند (Kulaks) ہونے کا الزام لگا کر اُسے سختیوں کا شکار بنایا؛ آئندہ ایسا ہرگز نہ کیا جائے"[1]

غرض اسٹالن نے اس بات پر زور دیا کہ "اجتماعی کاشت" اور "ریاستی کاشت" دونوں میں شریک ہونا ہر کسان کی ذاتی مرضی و خواہش پر منحصر رکھا جائے اس لئے کہ کھاتا پیتا کسان ہمارے لئے مضر نہیں مفید ہے، اس میں اور مالکِ دولت یا سرمایہ دار میں ہمیں فرق کرنا چاہیے۔

اشتراکی کارکنوں نے اسٹالن کی ان ہدایات کو خوش دلی کے ساتھ سُنا اور قبول کیا۔ لیکن یہ چیز دراصل کمیونسٹ پارٹی کے زبردست ضبط و نظم (ڈسپلن) کی شہادت دیتی ہے۔ یہ اسی ضبط و نظم کا نتیجہ تھا کہ کسی کارکن کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ اسٹالن کی اس تنبیہ پر حرفِ اعتراض زبان سے نکالتا۔ رہ گئے کسان، سو وہ تو یہ مضمون دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ انہوں نے اسے اپنی صاف و واضح فتحمندی سمجھا اور اس پر بڑے اطمینان سے مسرت کا اظہار کیا حتیٰ کہ بہت سے کسانوں نے اس مضمون کے تراشے (کٹنگ) اخباروں میں سے کاٹ کاٹ کر اور تعویذ کی طرح بنا کر اپنے پاس رکھ لئے ——— اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ روس کے کسان اپنے شہری مزدور بھائیوں سے عقائد و خیالات کے لحاظ سے کتنے دور ہیں ——!!

---

[1] پوسٹ وار ورلڈ از جیکسن

بہر حال اسٹالن کی اس موقعہ شناسی نے ایک سلگتی ہوئی آگ کو دبا دیا اور اب پھر کھیتوں میں امن وسکون کے ساتھ کام ہونے لگا۔ کسانوں نے خوب کام کیا اور اس سال کی فصل اتنی اچھی رہی کہ روس کی تاریخ میں اتنی اچھی فصل کبھی نہ ہوئی تھی۔

۱۹۳۳ء میں جب یہ پانچ سالہ پروگرام ختم ہوا تو روس کو اس میں غیر معمولی کامیابی ہوئی خصوصاً صنعت کی لائن میں۔ لیکن پھر بھی چونکہ یہ مدت بہت کم تھی اس لئے بہت کام نہ ہو سکے۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں دوسرا پانچ سالہ پروگرام شروع ہوا۔ جو ٹھیک اس وقت ختم ہوا جب یورپ میں جنگ کے بادل گرجنے لگے تھے اور سیاسی افق پر جنگ کی بجلیاں کوندنا شروع ہو گئی تھیں۔ یہ دوسرا پروگرام بھی بہت بڑی حد تک کامیاب رہا۔

دوسرا دستور اساسی

روس کا پہلا دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) ۱۹۲۳ء میں بنایا گیا تھا۔ لیکن چونکہ اس وقت تک اشتراکی خیالات عوام کے دماغ میں پوری طرح جمے نہ تھے۔ اس لئے اس کی نوعیت بہت بڑی حد تک "آمرانہ" تھی۔ بارہ سال کے بعد ۱۹۳۶ء میں دوسرا دستور تیار کیا گیا جو پہلے کے مقابلے میں کم "آمرانہ" تھا۔ پہلے دستور کی رو سے ووٹ خفیہ نہ دیئے جاتے تھے۔ اب خفیہ ووٹ کا اصول رائج کیا گیا۔ نیز اس اعتراض کو رفع کرنے کی کوشش بھی کی گئی کہ روس میں کمیونسٹ پارٹی کے سوا کسی دوسری جماعت کے بنانے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ اس دستور کی دفعہ ۱۴۱ کا منشا یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے امیدواروں کے علاوہ مزدور سبھاؤں (ٹریڈ یونین)، کوآپریٹو جماعتوں، نوجوانوں کی انجمنوں اور تہذیبی (کلچرل) جمعیتوں کو بھی اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا حق ہے۔

لیکن یہ تمام جماعتیں اپنے اصول سیاست اور طریق عمل دونوں اعتبار سے

اشتمالیت کے خلاف نہیں جاسکتیں۔ اشتمالی دائرے کے اندر رہ کر ہی وہ جو چاہیں کرسکتی ہیں —— اس لحاظ سے کمیونسٹ پارٹی میں اور ان جماعتوں میں کوئی خاص اصولی یا بنیادی فرق نہیں ہے۔ "روس کی کمیونسٹ پارٹی اشتمالی نظام کو ترقی دینے اور طاقتور بنانے میں مزدوروں کے مقدمۃ الجیش کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی وہ جماعت ہے جسے روس کے محنت کشوں کی تمام سرکاری و غیر سرکاری جماعتوں کی مرکزی رہنمائی کا درجہ حاصل ہے" (موجودہ آئین ۱۹۳۶ء کی دفعہ ۱۲۶)

۱۹۳۶ء کا یہ دستور چونکہ نہ صرف دنیائے اشتراکیت بلکہ کل دنیائے انسانیت کی سیاست و معیشت کے مسائل میں کافی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے اس کی خاص خاص دفعات کا ماحصل ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

اس ریاست کا نام "مزدوروں اور کسانوں کی اشتراکی ریاست[1]" ہے۔

اس ریاست میں کام کرنا ہر شہری[2] پر فرض ہے بشرطیکہ وہ کام کرنے کے قابل ہو۔ "ہر وہ شخص جو کام نہیں کرے گا، اُسے کھانے کو نہیں دیا جائے گا۔"

---

[1] علم السیاست کی اصطلاح میں "ریاست" کے مفہوم میں وہ تمام افرادِ رعایا شامل ہوتے ہیں جو باہم مل جل کر ایک حکومت، ایک تمدن اور ایک ضابطۂ اخلاق کے ماتحت رہتے ہیں۔ حکومت اور ریاست میں اصطلاحی فرق یہ ہے کہ حکومت جس چیز کا نام ہے وہ دراصل "ریاست" کے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط کو نافذ کرنے کا آلۂ کار ہوتی ہے۔ اسلئے حکومت بدل بھی سکتی ہے اور ٹوٹ بھی سکتی ہے لیکن ریاست ہمیشہ اپنی حالت پر قائم

[2] آجکل کی سیاسی اصطلاح میں "شہری" کا لفظ "دیہاتی" کے مقابل کے طور پر مستعمل نہیں ہوتا بلکہ "پردیسی" کے مقابل بولا جاتا ہے یعنی شہری دراصل "رعایا" کا مترادف ہے اس لئے گاؤں کا رہنے والا بھی شہری ہے بات یہ ہے کہ رعایا کے لفظ میں پچھلے زمانے کی شاہی و شہنشاہی کی بو آتی تھی جب رعایا کو بادشاہ کی جائداد سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے انقلاب فرانس کے بعد جہاں حکومت و سیاست کی اور اصطلاحیں بدلیں اسی طرح رعایا کے بجائے بھی شہری کا لفظ رائج ہوا۔

اس ریاست کا اصول کار یہ ہے کہ "ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لو اور ہر شخص کو اس کی محنت کے مطابق دو۔"

اس ریاست کی ہر طاقت کا سرچشمہ شہروں اور گاؤں کے مزدوروں کی پنچائتیں (سوویٹ) ہیں۔

پیداوار اور پیداوار کے حصول کے تمام آلات و ذرائع کی واحد مالک اشتراکی ریاست ہے کوئی چیز کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے اور نہ کوئی آدمی کسی دوسرے کی محنت سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔

زمین، زمین کے اندر کی تمام دولت، پانی، جنگل، مِل، کارخانے، کانیں، ریلوے، ہوائی اور دریائی راستے، سڑکیں، بینک، وہ تمام کھیتیاں جن کو ریاست نے بڑے پیمانہ پر منظم کیا ہے۔ شہروں اور صنعتی مرکزوں کے تمام رہائشی مکانات —— یہ سب ریاست کی ملکیت ہیں۔

اس اشتراکی ریاست کی ملکیت دو طرح کی ہے: ایک تو وہ جس کا تعلق براہِ راست حکومت سے ہے اور جس کی دیکھ بھال اور نگرانی وہ خود ہی کرتی ہے۔ اور دوسرے وہ جماعتی کاشت یا فارم (Collective Farm) جو چند لوگوں کی مشترک قبضے میں ہیں۔ لیکن یہ مشترکہ جماعتی کاشت بھی جماعت کی ذاتی ملکیت نہیں سمجھی جائے گی بلکہ پبلک جائداد سمجھی جائے گی۔ البتہ اس قسم کی کاشت میں ہر خاندان کی ضرورت کے لئے رہائش کے مکان، مویشی کے باڑے، مرغیوں کے ڈربے اور چھوٹے موٹے آلاتِ کشاورزی کو محفوظ رکھنے کی غرض سے ایک قطعۂ زمین دیا جائے گا جو ہر شخص کی ذاتی ملکیت قرار دیا جائے گا۔

اس قسم کی مشترکہ جماعتی کاشت جو لوگ کرینگے ان کا پٹہ دائمی ہوگا یعنی یہ زمین اُن سے کبھی واپس نہ لی جائے گی۔

مذکورہ بالا ذاتی ملکیت کے علاوہ وہ تھوڑی بہت دولت بھی کسانوں اور دستکاروں کی ذاتی ملکیت سمجھی جائیگی جسے وہ اپنی ذاتی محنت سے پیدا کی ہوئی دولت میں سے بچالیں گے یا جو ان کے خانگی

مصارف یا اسبابِ آسائش میں سے کچھ بچت کر کے فراہم کی جائیگی لیکن کسی شخص کو یہ حق نہ ہوگا کہ اس قسم کی ذاتی ملکیت حاصل کرنے کی غرض سے دوسروں سے کام لے کر ان کی محنت سے خود فائدہ اٹھائے۔

اس قسم کی ہر ذاتی جائداد کی حفاظت قانون کے ذریعے کی جائے گی یعنی اگر اسے کوئی چرائے لوٹے یا چھین لے تو اُسے سزا دی جائے گی۔

ہر شہری کا یہ حق ہی کہ ریاست اُسے کام دے اور اس کے کام کی کیفیت و کمیّت کے لحاظ سے اس کی اُجرت ادا کی جائے۔

ہر شہری کو آرام لینے کا حق ہی۔ اس لئے سات گھنٹے روزانہ سے زیادہ کام نہیں لیا جاسکتا اس کے علاوہ سال میں کچھ تعطیلیں بھی ہر مزدور کو دی جائیں گی جن کی اُجرت کاٹی نہیں جائیگی نیز صحت گاہوں، آرام گاہوں کا انتظام مزدوروں کے لئے کیا جائے گا۔

ہر شہری کا حق ہی کہ بیماری اور بڑھاپے کی صورت میں یا کسی عضو کے ٹوٹ جانے یا بیکار ہوجانے کی وجہ سے کام کے ناقابل ہوجانے کی صورت میں اس کی معقول پرورش کا انتظام کیا جائے۔

تعلیم ہر شہری کا حق ہی۔ ابتدائی تعلیم تو ہر ایک کو جبراً دی ہی جائیگی لیکن اعلیٰ تعلیم بھی جس کا جی چاہے مفت حاصل کر سکتا ہی۔

مرد اور عورت دونوں کو ہر مسئلے اور ہر باب میں یکساں اور بالکل یکساں حقوق حاصل ہیں اختلاف جنسیت کا کوئی امتیاز تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

مذہب یا کلیسا کو ریاست سے کوئی تعلق نہیں۔ نیز عوام کی تعلیم میں بھی مذہب مداخلت نہیں کرسکتا۔ البتہ ذاتی طور پر مذہب کو ماننے یا مذہبی رسوم کو ادا کرنے کی آزادی ہر ایک کو حاصل ہی۔ لیکن اسی کے ساتھ مذہب کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا حق بھی ہر شخص کو حاصل ہی۔ مگر مذہب کی حمایت میں تبلیغ کرنے یا مذہبی تعلیم دینے کا حق کسی کو نہیں۔

اٹھارہ سال یا اٹھارہ سال سے زائد عمر رکھنے والے ہر مرد اور ہر عورت کو ہر ریاستی ادارے

میں انتخاب کرنے یا انتخاب کے لئے کھڑے ہونے کا حق ہی بشرطیکہ وہ پاگل نہ ہو یا کسی علالت مجاز نے اُسے کسی جرم کی بنار پر ووٹ کے حق سے محروم نہ کردیا ہو۔

ووٹ خفیہ دئے جائیں گے۔

عوام کا ہر منتخبہ نمائندہ ہر وقت اپنے رائے دہندوں کو جوابدہ ہوگا اور جب کبھی رائے دہندہ یہ محسوس کریں گے کہ وہ اپنے فرائض منصبی کی بجاآوری ان کی مرضی کے مطابق نہیں کر رہا تو ان کی اکثریت کو ہر وقت یہ حق ہوگا کہ اس کے انتخاب کو مسترد کردیں۔

جبری تعلیم کے علاوہ فوجی تربیت بھی ہر شہری کو جبری دی جائے گی۔

کسی قومی یا نسلی امتیاز کا پروپیگنڈا کرنے یا نسل و قومیت کے لحاظ سے شہریوں میں فرق مراتب پیدا کرنے کی اجازت نہیں ہی۔

وہ غیر ملکی شہری جو اپنے دیس کے مزدوروں کی حمایت کرنے یا مبنی بر سائنس سرگرمیوں[1] میں مصروف ہونے یا اپنی قوم کو آزاد کرانے کی جد وجہد کی وجہ سے ستائے جائیں انھیں روس کی یہ حکومت اپنی حدود میں پناہ گزیں ہونے کا حق دیتی ہی۔

تہذیبی خود مختاری کا اصول

روس میں سب سے اہم اور پیچیدہ سوال مختلف قوموں نسلوں اور تہذیبوں کا ہی۔ زار کے زمانے میں مسلسل یہ کوشش کی گئی کہ جتنی قومیں اقلیت میں ہیں ان سب کو اکثریت میں ضم کرکے پورے روس میں ایک زبان، ایک تہذیب اور ایک قومیت رائج کردی جائے۔ اس مقصد کے لئے بڑے بڑے مظالم ہوئے اور محکوم قوموں اور نسلوں کو سخت ترین صبر آزما دور سے گزرنا پڑا۔ اشتمالی حکومت جب قائم ہوئی

---

[1] مبنی بر سائنس سرگرمیوں میں مصروف ہونے سے زیادہ تر اشارہ ان سرگرمیوں کی طرف ہی جو مذہب خدا اور لا دینیت کے خلاف ہوتی ہیں! اور جنھیں دوسرے لفظوں میں "الحاد و دہریت" سے تعبیر کیا جاسکتا ہی۔

توجہاں اس نے شہنشاہیت و سرمایہ داری میں زار کے عہدِ پارینہ کا خاتمہ کیا، وہاں اس یاد کو بھی لوگوں کے دلوں سے محو کرنے کا پروگرام بنایا۔ اشتراکیت اصولاً بھی قومیت پر نہیں بین الاقوامیت پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لئے بالشویکوں کو مختلف نسلوں اور تہذیبوں کے مسئلے کے حل کرنے میں اصولی طور پر کوئی دقت نہ تھی، وہ ایک تہذیب و تمدن اور ایک نسل و قومیت کی برتری کے قائل نہ تھے اس لئے ان کے لئے اصولی طور پر یہ طے کر دینا بہت آسان تھا کہ روس میں ہر تہذیب و تمدن کو پنپنے اور پروان چڑھنے کا موقع دیا جائے گا لیکن اس اصول کو عملی شکل دینا کارے دارد تھا روس کی آبادی ہندوستان سے آدھی بھی نہیں، لیکن اس کے باوجود ۱۹۲۶ء کی روسی مردم شماری بتاتی ہے کہ یہاں ایک نہ دو پوری ۱۷۴ قومیتیں بستی ہیں، سترہ کروڑ انسانوں کی بستی میں پونے دو سو قومیتوں کو تہذیبی و لسانی اعتبار سے مطمئن کرنا سخت کٹھن کام تھا لیکن حق یہ ہے کہ اس کٹھن منزل کو بالشویکوں نے حیرت انگیز طور پر طے کر لیا۔ انہوں نے روس میں ایک حکومت نہیں بنائی بلکہ بہت سی جمہوری حکومتوں کا ایک وفاق (فیڈریشن) بنایا اور پھر جس جمہوری وفاقی حکومت میں ایک سے زائد قومیں بستی تھیں ان کو بھی چھوٹی چھوٹی خود مختار جمہوریتوں یا خود مختار "علاقوں" میں تقسیم کر دیا، پھر ان سب چھوٹی بڑی وفاقی جمہوریتوں اور خود مختار علاقوں کو ایک مرکزی اتحاد (یونین) میں منسلک کر دیا جسے مرکزی حکومت سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اس تقسیم کی رو سے روس میں مندرجہ ذیل گیارہ وفاقی جمہوریتیں ہیں

۱۔ روس	۴۔ جارجیا
۲۔ سفید روس	۵۔ آرمینیا
۳۔ یوکرین	۶۔ قازقستان

۷- کرغیز ۹- اوزبکستان

۸- تاجیکستان ۱۰- آذربائی جان

۱۱- ترکمانستان

آخر کی چھ جمہوریتیں زیادہ تر مسلم آبادی پر مشتمل ہیں اور ان میں سمرقند و بخارا سے لے کر ترکی کے مشرقی حدود تک کا علاقہ شامل ہے جو کشمیر کے شمال سے لے کر افغانستان و ایران کی پوری شمالی سرحد سے گذرتا ہوا مشرقی ترکی تک پہنچ گیا ہے لیکن روس کی اصلی آبادی اوّل الذکر تین چار جمہوریتوں میں بستی ہے جو خالصاً عیسائی یا "عیسائی اشتراکی" آبادی پر مشتمل ہیں۔ ان کی آبادی کا تناسب تین چوتھائی کے قریب ہے۔ باقی ایک چوتھائی (تقریباً چار کروڑ) آبادی دوسری جمہوریتوں میں بستی ہے۔

مذکورہ بالا جمہوریتیں بڑی بڑی جمہوریتیں ہیں۔ ان کے اندر پھر جو مختلف عناصر بستے ہیں ان کی تہذیبی اور لسانی حفاظت کے لئے "جمہوریت اندر جمہوریت" کے طور پر چھوٹی چھوٹی حکومتیں بنائی گئی ہیں جو علاقے اتنے چھوٹے تھے کہ اُن کو جمہوریت کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی جداگانہ تہذیب رکھتے تھے ان کو "خود مختار علاقہ" قرار دے کر کسی جمہوریت سے متعلق کر دیا گیا۔

لیکن اس قسم کی تمام جمہوریتوں کو صرف تہذیبی و لسانی خود مختاری حاصل ہے یعنی یہ اپنے مدارس میں اپنی زبان پڑھاتی ہیں، ان کے دفتروں اور عدالتوں میں ان ہی کی زبان رائج ہے، ان کا اپنا الگ دستور اساسی ہے جس میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا حق وہ رکھتی ہیں۔ بشرطیکہ کوئی تبدیلی اشتمالی اصولوں کے خلاف نہ ہو، ان کے اپنے الگ عہدیدار ہیں اور مرکزی حکومت کو ان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ لیکن اقتصادی و معیشی معاملات میں کُل روس صرف ماسکو کی مرکزی حکومت کا ماتحت ہے اور ہر جمہوریت کو اپنی تمام خود مختاریوں کے باوجود

مرکز کے احکام کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے

ہر وفاقی جمہوریت (یعنی سوویٹ یونین کی ہر وحدت) کے دائرۂ اختیار میں مندرجہ ذیل امور شامل ہیں[۱]:-

۱- کھانے پینے کی چیزوں کی پیداوار اور اس کی متعلقہ صنعت؛
۲- ہلکی صنعت؛
۳- عمارتی لکڑی کی صنعت،
۴- زراعت
۵- غلّے کے ریاستی گودام اور مویشی
۶- مالیات (فنانس)
۷- اندرونی تجارت
۸- عدل و انصاف
۹- صحتِ عامہ

اس کے علاوہ جو اُمور ہیں وہ سب مرکزی حکومت کے تحت ہیں۔ یعنی:-

۱- بیرونی حملہ آوروں سے ملک کا بچاؤ
۲- بیرونی معاملات
۳- بیرونی تجارت
۴- ریلوے
۵ تمام وسائل آمد و رفت
۶- تمام دریائی راستے

---

[۱] دیکھو دستور اساسی ۱۹۳۶ء

۷۔ بھاری صنعت

یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ تذکرہ ہے کہ مرکزی یونین میں شامل ہونا ہر جمہوریت کی آزادانہ خواہش و مرضی پر منحصر ہے۔ یہ شرکت جبری نہیں ہے (دفعہ ۱۳) نیز ہر جمہوریت کو ہر وقت یونین سے علیحدہ ہو جانے کا اختیار بھی حاصل ہے (دفعہ ۱۴)

معاشی اعتبار سے روس کی تقسیم سیاسی تقسیم سے مختلف ہے۔ اس لحاظ سے زمین کی نوعیت اور معدنی اور زرعی پیداوار کی کیفیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے روس کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور پھر ان کو بارہ حلقوں میں۔ معاشی ترقی یا معاشی اسکیم کے مسئلے میں ہر جمہوریت مرکزی ہدایات کے ماتحت عمل کرتی ہے۔ اور ان ہدایات کے خلاف چلنے کی مجاز نہیں۔

طرز حکومت

حکومت کا اصول کاملاً منتخبہ ہے حتیٰ کہ عدالتوں کے جج اور منصف بھی ایک مقررہ میعاد کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں

نظم و نسق کے چھوٹے چھوٹے یا ابتدائی حصے، ضلعے، شہر اور گاؤں ہیں، ان میں محنت کشوں کی منتخبہ سودی ایٹ (پنچائت) حکمراں ہوتی ہے۔ یہی محنت کش افراد اپنی سودی ایٹ کی مجلس عاملہ منتخب کرتے ہیں اور ایک صدر اور ایک نائب صدر چنتے ہیں۔ ہر انتخاب دو سال کے لئے ہوتا ہے۔

اس کے بعد وفاقی جمہوریت اور مرکزی جمہوریت کا درجہ آتا ہے۔ ان میں اعلیٰ حکمراں جماعت "مجلس اعلیٰ" (سپریم کونسل) کہلاتی ہے جو چار سال کے لئے منتخب ہوتی ہے۔ پھر یہ جماعت ایک پریزیڈیم (مجلس العمال) منتخب کرتی ہے اور یہ پریزیڈیم حکومت کرتا ہے اور ہر مسئلے میں "مجلس اعلیٰ" کو ہر وقت جوابدہ ہوتا ہے۔

عدالت العالیہ اور دوسری بڑی عدالتوں کے ججوں کو "مجلس اعلیٰ" کے ممبر پانچ سال کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ اس سے نیچے کی عدالتوں کے منصفوں کو اسی ضلع

کے شہری منتخب کرتے ہیں۔ اس انتخاب میں ہر بالغ کو یکساں اور بلاواسطہ ووٹ کا حق ہوتا ہے۔ تعلیم یا جائداد کی کوئی قید نہیں ہوتی جو جج اور منصف ایک بار منتخب ہو جاتے ہیں وہ اپنی مقررہ معیاد تک بالکل آزاد ہوتے ہیں اور قانون کے سوا اور کسی کے ماتحت نہیں ہوتے۔ تمام عدالتوں میں جیوری کے طور پر پبلک کے کچھ مقررہ افراد بھی مقدمے کی سماعت ججوں کے ساتھ کرتے ہیں اور جج ان کے اشتراک و تعاون سے فیصلے کرتے ہیں۔

تعلیم ابتدائی تعلیم جبری ہے اور اعلیٰ تعلیم مفت۔ لیکن مذہبی تعلیم کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے بجائے آثار قدیمہ (آرکیالوجی) السنہ فن تعمیر اور تاریخ کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ معترض کہتے ہیں کہ روس میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں اُن میں مارکسی اشتمالیت کے پروپیگنڈے اور سرمایہ دار ممالک کو غلط رنگ میں پیش کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ بالشویک اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ تمہاری تاریخوں میں بھی تو پادریوں اور بادشاہوں کی کہانیوں اور ان کے نام نہاد کارناموں، جنگوں اور باہمی جھگڑوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ تم بھی تو جان بوجھ کر عوام اور عوام سے متعلق جو چیزیں ہیں ان کو غلط رنگ میں پیش کرتے ہو —— یعنی روس کے جواب کی نوعیت زیادہ تر الزامی ہوتی ہے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو "روس کی تعلیمی پالیسی" از Hans and Hessen (مطبوعہ لندن ۱۹۳۰ء)

جب بالشویک حکومت قائم ہوئی تو تمام ادیبوں، شاعروں
شعر و ادب
اور مصوّروں سے کہا گیا کہ یا تو اپنی نقاشی و تصویر کشی اور اپنے شعر و ادب کو انقلابی روس کے مطابق بناؤ اور یا پھر اس مشغلے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا شغل اختیار کرو۔ چنانچہ جو لوگ اس حکم کی تعمیل نہ کر سکے ان سب کی زبان بند کر دی گئی۔ جنہوں نے زبان بند کرنے سے انکار کیا ان کا سر اڑا دیا گیا، جو پرانے ادیب و شاعر باقی رکھے گئے ان میں ایک میکسم گورکی ہی کا نام قابلِ ذکر ہے۔

بالشویک حکومت نے آر۔ اے۔ پی۔ پی (R. A. P. P.) کے نام سے ایک سنسر قائم کیا تھا جس میں ہر تحریر کی جانچ پڑتال ہوتی تھی اور سوائے اُن تحریروں کے جن میں انقلاب روس کا پروپیگنڈا ہو اور کسی کو اشاعت کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جتنی تحریریں ہوتی تھیں وہ سب نذرِ آتش!!

یہ سنسر، تصویر کشی و نقاشی اور شعر و ادب کی موت ثابت ہوا۔ ہر ذاتی اُپج رکھنے والے شاعر و ادیب کے حوصلے اس نے پست کر دیئے اور صرف "کرائے کے ٹٹو" قسم کے ادیب میدان میں نظر آنے لگے۔ ۱۹۳۲ء تک یہ سنسر قائم رہا اس عرصے میں روس میں جو لٹریچر شائع ہوا وہ بالکل روکھا پھیکا تھا۔ اس کے بعد البتہ کچھ تازگی اس میں آئی۔ لیکن پھر بھی ادیب کا دماغ چونکہ بالکل آزاد نہیں تھا اس لئے آزاد لٹریچر پیدا نہ ہو سکا۔[۱]

---

[۱] علم و ادب پر اس قسم کی پابندیوں کی تہ میں کمیونسٹ روس کا اصل مقصد ایک بالکل نئی تہذیب و مدنیت کا پیدا کرنا تھا اس موضوع پر دیکھو Webb کی کتاب "سوویٹ کمیونزم: اے نیو سولزیشن" (مطبوعہ لندن ۱۹۴۱ء)

روس کے عوام انقلابِ فرانس کے وقت ستر فیصدی سے زیادہ بالکل ناخواندہ اور جاہل تھے۔ اشتمالی روس نے جب ان کو تعلیم دینے کا پروگرام بنایا تو سب سے بڑی دقت زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے پیش آئی۔ لیکن اس دقت پر جلدی ہی قابو پا لیا گیا یعنی ہر زبان میں تعلیم کا انتظام کر دیا گیا۔ بعض مقامات پر مخلوط آبادی ہونے کی وجہ سے ایک ہی جگہ کئی کئی زبانوں میں تعلیم کا انتظام کرنا پڑا۔ مثلاً خارکوف کے ایک شہر میں یونانی، آرمینی، جرمن، تاتاری، روسی اور یوکرینی چھ زبانوں کے جداگانہ اسکول کھولنا پڑے۔

بالشویک حکومت کی یہ کوشش پوری طرح بارآور ہوئی۔ اور آج اسی روس میں جس کے عوام کو جنگ عظیم سے پہلے پست و پسماندہ اور جاہل و ناکارہ سمجھا جاتا تھا۔ سو فی صدی تعلیم یافتہ ہیں اور ان میں سے بیشتر اعلیٰ تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ ہیں۔

روس کے بارے میں دنیا کی رائے

روس کے اشتراکی انقلاب کے بارے میں سرمایہ دار ممالک کی رائے عامہ نے کئی کروٹیں بدلیں۔ اوّل اوّل تو بالشویکوں کو شیطانی جماعت کہا گیا اور روس کے انقلاب کو چند شیطانوں کی ایک ایسی شورش پروری سے تعبیر کیا گیا جس کو قیام و ثبات حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب لینن کے "نئے معاشی پروگرام" نے اندرونی بدامنیوں کو ختم کر دیا اور کسانوں اور محنت کشوں میں اطمینان و سکون کی فضا نظر آنے لگی تو کہا گیا کہ اشتراکی اصول ناکام ہو گئے ——؟ اس لیے کہ اس نئے پروگرام میں "ذاتی ملکیت" کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا تھا اور ایک حد تک سرمایہ فراہم کرنے کی بھی اجازت دی گئی تھی۔ کہا گیا کہ اشتراکیت کے نام سے جو شور مچایا گیا تھا، آخر اس کا فضول ہونا ثابت ہو گیا اور بالشویکوں نے خود یہ

تسلیم کر لیا کہ سرمایہ داری کا نظام ایک ناقابل عمل نظام ہے مگر اس کے باوجود بھی روس کی حکومت کو ایک جائز حکومت تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا اور نہ یہ تسلیم کیا گیا کہ موجودہ حالات میں روس کوئی ترقی کر سکتا ہے یا اپنی کفالت آپ کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ ہر طرف روس کی پسماندگی، اس کے غربت و افلاس، اس کی صنعتی بے چارگی و واماندگی اور اس کی جہالت و بے علمی کا چرچا تھا اور یہ یقین کیا جا رہا تھا کہ وہ وقت بہت ہی قریب ہے جب بالشویکوں کا یہ نیم اشتراکی ڈھانچہ بھی ٹوٹ کر گر پڑے گا اور پھر وہ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح سرمایہ دارانہ اصول پر ایک نئی جمہوریت قائم کرنے پر مجبور ہو گا —— لیکن ۱۹۲۳ء میں پہلے پانچسالہ پروگرام کا جو شاندار نتیجہ برآمد ہوا اس کے بعد ان پیشین گوئیوں کا بازار بھی مندا پڑ گیا اور آخر یہ مان لیا گیا کہ انقلاب کامیاب ہو گیا ہے۔ اشتراکی نظام نے بھی ایک حد تک عملی جامہ پہن لیا ہے۔ مگر ابھی روس پر ڈکٹیٹر شپ کا طعن دیا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہاں آزادی رائے پر زبردست پابندیاں ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے سوا کسی دوسری پارٹی کے قیام کی اجازت نہیں اور ووٹ علانیہ لئے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے عوام اپنی صحیح رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ ۱۹۳۶ء میں روس میں جو نیا دستور اساسی بنایا گیا اس میں ان اعتراضوں کو رفع کرنے کی طرف قدم بڑھایا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی بہت سے اعتراض اپنی جگہ پر باقی ہیں اور خود روس کو ان کی صحت و صداقت کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں لینن کا قول تھا کہ جب تک عوام کے دماغوں میں اشتراکی اصول خوب اچھی طرح رچ بس نہ جائیں اور جب تک سرمایہ دارانہ ذہنیت کی ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر نہ پھینک دی جائے اس وقت تک مزدوروں کی جماعت کو ڈکٹیٹرانہ فرائض انجام دینا ہی چاہئیں اور تشدد و سخت گیری سے بے دھڑک کام لیکر

ہر مخالفت کو کامل بیدردی و بیرحمی سے کچلتے رہنا چاہیئے۔ چنانچہ لینن کے زمانے میں بھی اس اصول پر عمل ہوتا رہا اور اس کے مرنے کے بعد بھی یہی طریقہ رائج رہا اور اب تک ہے بلکہ اسٹالن چونکہ فطرتاً بھی سخت مزاج اور تند خو واقع ہوا ہے اور قدرت کے خزانے سے رحم و بخشائش کا بہرہ اُسے بہت ہی کم ملا ہے اس لئے تشدد و سخت گیری کی آمرانہ مشین اس کے ہاتھوں پوری طاقت سے چلائی گئی حتیٰ کہ وہ لوگ جو لینن کے دست و بازو تھے اور جو اشتراکی انقلاب کو لانے اور اُسے باقی رکھنے میں سب سے پیش پیش تھے ان کے اختلافات کو بھی برداشت نہ کیا گیا اور پھانسی کا حلقہ بیدریغ ان کی گردنوں میں پہنا دیا گیا۔ ٹراٹسکی نے سنہ ۱۹۴۰ء میں غربت و آوارگی کے عالم میں وطن سے ہزاروں میل دور جان دی اور زنوویف اور بخارین وغیرہ بیسیوں زبردست اشتراکی خطیب و رہنما روس میں پھانسی کے تختے پر چڑھا دیئے گئے الزام یہ تھا کہ وہ روس کی اشتراکیت کے خلاف سازش کر رہے تھے۔ لیکن وہ جن کی زندگیاں اشتراکیت کے پرچار میں صرف ہوئیں اور جن کی تصنیفات آج بھی اشتراکیت پر زبردست سند سمجھی جاتی ہیں اور خود روس کی یونیورسٹیوں میں جن کی تعلیم آج تک دی جاتی ہے۔ ان پر اشتراکیت کی مخالفت کے الزام سے اسٹالن کی آمریت پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔[۱]

روس اور مذہب

تشدد پسندانہ ڈکٹیٹری یا آمریت کے اس الزام کے بعد روس کے خلاف دوسرا الزام مذہب کی مخالفت سے متعلق ہے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں جب جرمنی نے روس کے خلاف اچانک اعلان جنگ کیا اور برطانیہ اور امریکہ نے دشمن کے دشمن کو دوست سمجھ کر روس کی مدد کرنا طے کیا تو ان

---

[۱] دیکھو اسٹالنزرشا از لوئی فشر (مطبوعہ بمبئی)

ممالک میں عام طور سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا روس مذہب کے خلاف ہی؟ کیا اشتراکیت کو خدا سے بیر ہی؟ کیا اشتراکی نظام میں خدا اور مذہب کی کوئی جگہ نہیں ہی۔ اس کے جواب میں روس کی طرف سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف اتنا تھا کہ ——— ہمارے یہاں ضمیر کی پوری آزادی حاصل ہی حتیٰ کہ خدا کے منکروں اور مذہب کے مخالفوں کو بھی کھلے پروپیگنڈے کی اجازت ہی۔

اس جواب ہی سے ظاہر ہوتا ہی کہ روس کا دامن اس الزام سے پاک وصاف نہیں ہی۔ علاوہ ازیں ۱۹۳۶ء کے دستور اساسی کی دفعہ ۱۲۴ میں صاف مذکور ہی کہ مذہب وکلیسا کو تعلیم عامہ کے مسئلے میں دخل دینے کی اجازت نہیں اور نہ سیاست وحکومت کے معاملات میں مذہب کی کوئی آواز ہی۔ البتہ مذہبی رسوم کو ادا کرنے کی بھی اجازت ہی اور مذہب کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کی بھی۔

ظاہر ہی کہ اگر مذہب کی حمایت میں نہ تو تعلیم دینے کی اجازت ہو اور نہ کسی اور طرح کے پبلک پروپیگنڈے کو روا رکھا جائے تو مذہب پر موت طاری ہو جائے گی خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اشتراکیت کے تمام صاحب اقتدار افراد لامذہب ہوں اور مذہب کے خلاف مضحکہ اڑانے اور اُسے ایک لغو ولایعنی "رسم کہنہ" قرار دینے میں سب سے آگے ہوں۔

اشتراکی حکومت میں مذہب کے نام سے کوئی رقم بجٹ سے ادا نہیں ہو سکتی پادریوں کو ووٹ کا حق بھی نہیں اور اگر ہی تو بعض شرائط کے ساتھ۔ کلیساؤں کے پاس جو دولت تھی وہ سب قرق کرلی گئی اور پادریوں کو ہدایت کردی گئی کہ وہ نہ تو مذہبی تعلیم کے لئے کوئی درسگاہ کھول سکتے ہیں اور نہ مذہبی وعظ ونصیحت علی الاعلان کر سکتے ہیں، ماسکو میں جو سب سے بڑا کلیسا تھا اُسے ڈھادیا گیا اور اس کی جگہ اشتراکی مجالس کے لئے ایک محل تیار کیا گیا۔ ابتدا میں صرف

رومن کیتھولک مذہب کے کلیساؤں پر پابندیاں لگائی گئی تھیں اور پراٹسٹینٹ عقیدے کے لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن بہرحال وہ بھی مذہب تھا اور خدا کا تصور اس میں بھی تھا، اس لئے ۱۹۲۹ء میں ایک قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے پراٹسٹنٹ عقیدے کی عام اشاعت کو بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ البتہ کلیسا کے اندر جا کر خاموشی کے ساتھ اگر کوئی عبادت کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اگر مذہب کی تبلیغ و اشاعت کئے بغیر اُسے صرف اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہے تو اس پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ لیکن یہ ایسی اجازت ہے کہ اگر نہ بھی ہوتی تب بھی لوگوں کے دلوں کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مزید براں اشتراکی لیڈر اس فلسفے سے خوب واقف ہیں کہ مذہبی خیالات کو بجبر دبانے کا نتیجہ برعکس ہوتا ہے۔ اس لئے وہ تعلیم و تربیت اور ترغیب و تشویق کے زیادہ موثر ذرائع سے کام لے کر مذہب کے تصور کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک نسل میں نہیں تو دوسری نسل میں کم از کم روس میں مذہب کا ماننے والا کوئی نہ رہے گا۔ آج کل بھی حالت یہ ہے کہ روس کی مسلمان رعایا کے علاوہ باقی تمام افراد اکثریت کے ساتھ لامذہب ہیں عیسیٰؑ یا مریمؑ کا نام شاذ و نادر ہی کسی کی زبان پر آتا ہے۔ اس کے بجائے "اشتراکی پیغمبر" مارکس اور لینین کے نام عقیدت و احترام سے لئے جاتے ہیں اور توریت و انجیل کی جگہ ان "پیغمبروں" کی کتابوں کی "تلاوت" کی جاتی ہے[1]

---

[1] دیکھو "چرچ اینڈ اسٹیٹ ان رشا" از کرٹس (مطبوعہ نیویارک ۱۹۴۰ء) اور ریلیجن ان سوویٹ رشا از ۱۹۱۷ء تا ۱۹۴۲ء از Timasheff (مطبوعہ لندن ۱۹۴۳ء) اور دی اسٹوری آف رشن چرچ از Reyburn (مطبوعہ ۱۹۲۴ء)

روس کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ

غرض روس کی عیسائی اور یہودی آبادی سے تو مذہب بہت بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے البتہ مسلم آبادی سے اسلام کو نابید کر دینے میں روسیوں کو ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں کافی سختیاں بھی کی گئیں اور ترغیب و تشویق سے بھی کام لیا گیا۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کو لامذہب بنانے اور داعی اسلام کی بجائے مارکس اور لینن سے رشتۂ عقیدت استوار کرانے میں اشتراکیوں کو سخت مایوسی ہوئی ہے۔ تاہم اسلام کے پرانے تاریخی مقامات سمرقند و بخارا اشتراکی پروپیگنڈے کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ سمرقند کی جامع مسجد کا وہ منارہ جہاں سے کھڑے ہو کر مؤذن اذان دیا کرتا تھا گرا دیا گیا ہے اور اس کی جگہ لینن کا ایک بہت بڑا بت قائم کیا گیا ہے۔ اس کے نیچے جو عبارت درج ہے اس کا مفہوم یہ ہے :۔

> آج سے اس منارے سے اذان کی آواز بلند نہیں ہو گی بلکہ مارکس اور لینن کی آواز سنائی دے گی۔

اشتراکیت میں اخلاق کا اصول یہ ہے کہ اگر مقصد اچھا ہے تو اس کے حاصل کرنے کے لئے ہر ذریعہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کسی اشتراکی مقصد تک پہنچنے کے لئے ایک اشتراکی ہر گناہ، ہر معصیت، ہر بداخلاقی اور ہر جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے وہ جھوٹ بول سکتا ہے، لوٹ مار مچا سکتا ہے، چوری کر سکتا ہے غرض اگر اس کے نزدیک مقصد اچھا ہے تو پھر اس کے حصول کے لئے کوئی ذریعہ برا نہیں اس اصول اخلاق کی بنا پر بالشویک حکومت خوب پیٹ بھر کر جھوٹ بولتی ہے اور خوب جی بھر کر تشدد کرتی ہے۔ اپنی مسلم رعایا کے مسئلے میں خاص طور سے تشدد اور جھوٹ دونوں پر عمل کیا گیا ہے۔ تشدد تو ملک کے اندر اور جھوٹ ملک کے باہر عام دنیائے اسلام میں۔[1]

(فٹ نوٹ صفحہ ۶۰۵ پر)

روس اور مذہب کی مخالفت

لیکن سوال یہ ہے کہ بالشویکوں کو مذہب سے اتنا بیر کیوں ہے؟ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہی کہ مارکس کے کمیونزم میں کائنات کی تخلیق و تکوین صرف مادے کے تصادم در تصادم Dialectic Materialism پر منحصر ہے اور کسی ماورائے احساس و ادراک دنیا کا کوئی وجود نہیں۔ اور دوسرے اس لئے کہ زار چونکہ روس کا سیاسی بادشاہ ہی نہ تھا بلکہ "روحانی باپ" بھی تھا، اس لئے اس کے مظالم میں مذہب و کلیسا سے بھی خوب مدد لی گئی تھی اس چیز نے قدرتاً زار کی مطلق العنان شہنشاہیت کے ساتھ ساتھ مذہب سے بیزاری کے جذبات بھی عام کر دیئے تھے۔ آخر وہ کیسا خدا اور کیسا مذہب ہے جو ہمیشہ زار ہی کی حمایت کرتا ہے اور جو غریبوں اور بیکسوں کو صرف ضبط و برداشت ہی کی تلقین کرتا ہے؟ یہ سوال عام طور سے لوگوں کے دماغ میں پیدا ہوتا تھا، پھر مفلسی و فاقہ زدگی کا جو کچھ عالم تھا اس کا اندازہ اس دور کے مشہور مصنف میکسم گورکی اور ٹالسٹائے کی تصنیفات سے ہو سکتا ہے۔ میکسم گورکی نے امیروں اور رئیسوں کو مخاطب کر کے اپنی ایک تصنیف میں لکھا تھا۔

"تم لوگوں نے اس دنیا کو غلاظت و گندگی کا ایک اتھاہ گڑھا بنا رکھا ہے۔ تمہارے ہر فعل اور تمہارے ہر قول سے نجاست و ناپاکی کے چھینٹے اڑتے ہیں۔ کیا تمہارے دل میں ایمان و ضمیر کی کوئی ہلکی سی تڑپ بھی موجود ہے؟ کیا تم کبھی بھی اس دنیا کے خالقِ اصلی کو

(فٹ نوٹ صفحہ ۷۰۵) لے انقلاب کے بعد روس میں اسلام کی جو کچھ حالت ہوئی اس پر Toynbee نے "اسلام ان رشا" کے نام سے پانچ جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے جو اگرچہ ایک مسلمان کا نقطۂ نظر پیش نہیں کرتی۔ مگر کافی معلومات اس سے ملتی ہیں۔

یاد کرتے ہو؟ ہر گز نہیں، تمہارا خدا صرف پیسہ ہے اور صرف اسی کی پوجا تم کرتے ہو۔ اے سرمایہ پرستو! اُس عذاب الٰہی کے لئے تیار رہو جو جلد ہی تم پر پھٹ پڑنے والا ہے! انسانیت کا لہو چوسنے والی جونکو! تم کمزوروں اور بے بسوں کی محنت و قوت کے سہارے جیتے ہو لیکن یاد رکھو کہ ایک دن تم برباد ہو جاؤ گے اور تمہیں پائی پائی کا حساب دینا ہوگا، یہاں تک کہ غریبوں اور بیکسوں کے آنسوؤں کے ان قطروں کی باز پرس بھی تم سے کی جائے گی جو تمہاری دولت پروری کے ہاتھوں بہائے جا رہے ہیں۔"

میکسم گورکی نے اِن الفاظ میں جو کچھ کہا تھا، وہ ایک کھلی ہوئی پیشین گوئی تھی جسے پورا ہو کر رہنا تھا۔ زار کے مظالم کی تخم پاشی سے انارکزم اور نائلزم کے نام سے نراج اور انہدام پسندی کے جو پودے تیار ہوئے تھے، انہیں تناور ہو کر برگ و بار لانا تھا اور وہ وقت آکر رہنا تھا جب غریبوں کے آنسوؤں کے سیلاب میں تاجِ شاہی اور تاج شاہی کے سارے حامی بہہ جائیں۔ پھر اگر مذہب و کلیسا اس تاج کے حامی تھے، تو آج ان کی تباہی و بربادی کونسی غیر فطری بات ہے جس پر تعجب کیا جائے؟ روس کا بچہ بچہ زار کے مظالم کی یاد کربلا کے سانحے کی طرح کرتا ہے۔ پھر کیا ایسی ہر یادگار کو بھی شاہی محلات کی طرح نیست و نابود کر دینے کا جذبہ "باغیوں" میں پیدا نہ ہوتا ——— ؟

آج روس میں جو تشدد و سخت گیری اور آمریت و ڈکٹیٹری نظر آرہی ہے وہ دراصل کل کے مظالم کا نتیجہ ہے۔ کل عوام کے حامیوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی تھی، آج تاریخ نے ورق الٹا ہے تو عوام کے حامی، پچھلے زمانے کے "خواص" کی ہر یادگار کو ملیامیٹ کر رہے ہیں ——— !!

لیکن روس کے مسلم عوام کا مسئلہ اس سے جدا ہے۔ وہ زار کے سیاسی مظالم کے شکار ضرور تھے۔ مگر اس معاملہ میں اسلام زار کا حامی نہیں تھا۔ اسلام سے

زار کو بیر تھا۔ اگرچہ عیسائیت جس کا وہ باپ تھا وہ بھی اس کے ہاتھ سے فریاد کر رہی تھی اور زبانِ حال سے چیخ رہی تھی کہ

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

مگر بہر حال دنیا نے یہ منظر دیکھا کہ عیسائیت کا ذرہ ذرہ زار کے آگے سر اطاعت خم کئے کھڑا ہے۔ مگر اسلام کی حالت یہ نہ تھی۔ اس لئے بالکل فطری، لازمی اور منطقی نتیجے کے طور پر روس کے مسلم عوام اسلام سے کیوں بیزار ہوں؟ عیسائی اپنے "روحانی باپ" کے محل اور گرجا دونوں کو ڈھادیں، مگر مسلمان کیوں مسجدیں ڈھائیں؟ دراصل یہی وہ نفسیاتی فرق ہے جو آج روس کے مسلمانوں اور عیسائیوں میں نظر آرہا ہے۔ اور جس کی وجہ سے اشتراکیت کے اربابِ اقتدار ہر قسم کی سختیوں اور فریب آمیزیوں کے باوجود اسلام کی محبت کو اوزبک، تاجیک، ترکمان اور کرد باشندوں کے دل سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

روس اور اشتراکیت روس کے موجودہ نظام کے بارے میں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آیا یہ اشتراکیت کا صحیح نظام بھی ہے یا نہیں؟ اس بارے میں اشتراکی لیڈروں کا عام رجحان ٹراٹسکی کے ان الفاظ کا موید ہے کہ:۔

"سوویت یونین میں ابھی تک سوشلزم نہیں آیا۔ جو حالت وہاں اس وقت ہے وہ محض عبوری دور کی سی حالت ہے۔ اسی لئے اس میں بہت سی متضاد چیزیں نظر آتی ہیں، اور اسی وجہ سے ابھی یہ دور، ماضی کی بھاری روایتوں سے بوجھل ہے۔ مزید برآں ابھی یہ نظام دنیا کی سرمایہ دار ریاستوں کے چوطرفہ دباؤ کے بیچ میں پھنسا ہوا ہے۔ روس کے انقلاب نے ابھی صرف نئی سوسائٹی کے اصولوں کا اعلان کیا ہے اور اشتمالی جمہوریت کے مقصد کی

ابھی پہلی منزل ہی حاصل ہوئی ہے[1]،

لیکن روس میں کامل اشتراکی نظام آیا ہو یا نہ آیا ہو، وہاں ڈکٹیٹرشپ ہو یا نہ ہو اور مذہب کی مخالفت کامیاب ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو یہ حقیقت ہے کہ معاشی لحاظ سے آج وہاں کے باشندوں کی حالت کل کے مقابلے میں بدرجہا اچھی ہے۔ پھر یہ صحیح ہے کہ ابھی یہاں کی دولت انگلستان و امریکہ کے برابر نہیں ہو سکی اور نہ یہاں کے عوام کا معیار زندگی اور معیار اکتساب دنیا کے مالدار ممالک کے ہم پلہ ہو سکا ہے، مگر پھر بھی زار کے زمانے سے آج کی حالت بہت اچھی ہے، کسان اب بھی غریب ہیں اور اب بھی ان کے کپڑے پھٹے ہوئے ہوتے ہیں، مگر کل وہ اس سے کئی درجہ زیادہ غریب تھے اور بہت کم تھے جن کو پھٹے ہوئے کپڑے بھی پوری طرح میسر آتے تھے۔ طبی اصول کے لحاظ سے آج بھی عام مزدوروں اور کسانوں کی غذا میں دہنیت اور وٹامن کی کمی پائی جاتی ہے، مگر کل کی طرح آج یہ کمی جان لیوا نہیں، آج بھی صحت و تندرستی کا خاطر خواہ انتظام نہیں مگر کل کی طرح آج کے روسیوں کی نگاہ میں دنیا وہ دنیا نہیں رہی جس میں زندگی کے بجائے موت کی دعا مانگی جاتی تھی اور جس میں حزن و یاس کے سناٹے کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا تھا ——— !!

روس کے پہلے پانچ سالہ پروگرام کی کامیابی کے بعد دنیا کی شہنشاہی اور سرمایہ دار قوموں نے اشتراکی نظام کے استحکام اور انقلاب روس کے ثبات و قیام کو چار و ناچار تسلیم کر لیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں جب اسے مجلس اقوام (لیگ آف نیشن) میں داخل کیا گیا تب تو دنیا میں کوئی ملک بھی ایسا نہ رہا جسے اشتراکیت سے

---

[1] بحوالۂ پوسٹ وار ورلڈ از جیکسن

اختلاف ہونے کے باوجود، روس کے کامیاب نظام حکومت سے انکار ہو حالانکہ اس سے قبل اس نظام کے ناکام ہو جانے کا اتنا یقین سرمایہ دار دنیا کو تھا کہ بالشویک روس کے نمائندوں کو دوسری قوموں کے شانہ بشانہ مجلس اقوام میں بیٹھنے کی اجازت بھی نہ دی گئی تھی۔

روس نے معاشی اعتبار سے جو ترقی کی ہے اس کا ایک اجمالی اندازہ اس سے کیجئے کہ آج دنیا کے چند اہم ملکوں میں اس کا شمار ہے چنانچہ السی جس کے ریشے سے بہترین کپڑا تیار ہوتا ہے کل عالم کی مجموعی پیداوار کا ۷۵ فیصدی صرف روس میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے شاعروں کا "لباسِ کتاں" جو نورِ قمر کے سامنے پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ اسی السی کے ریشوں سے تیار ہوتا ہے یا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک قسم کا سَن جسے ہیمپ (Hemp) کہتے ہیں، وہ بھی یہاں دنیا کی مجموعی پیداوار کے تناسب سے پینتالیس فی صدی ہوتا ہے۔ جو کی پیداوار میں تو دنیا کا کوئی واحد ملک روس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ساری دنیا کے ممالک مل کر جتنا جو ہر سال پیدا کرتے ہیں اس کا ایک چوتھائی اکیلا روس پیدا کرتا ہے۔ گیہوں کی پیداوار میں "ریاست ہائے متحدہ امریکہ" کے بعد دُنیا میں روس کا نمبر ہے جو اپنی زمین سے دنیا کی مجموعی پیداوار کا ۲۰ فیصدی گیہوں ہر سال حاصل کرتا ہے۔ یہی تناسب آلو کی پیداوار کا ہے۔

انقلاب روس کا ردِّعمل دنیا کے دوسرے ممالک پر

روس کی اس کامیابی کا ردعمل صرف یہی نہیں ہوا کہ اس کے نئے نظام کو مان لیا گیا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر دنیا کے عوام نے بڑی گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور سرمایہ دار دنیا نے آنے والے خطرات کا سدباب کرنے کے لئے اس کی تقلید شروع کی۔ چنانچہ آج سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے خلاف نکتہ چینی کرنے کی اجازت دنیا کی اکثر قوموں کو حاصل ہے حالانکہ انقلاب روس

سے قبل اس پر کڑی نگرانی تھی اور اس قسم کے خیالات کو سخت خطرناک و مہلک سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج بڑے بڑے سرمایہ پرست ممالک بھی اس حد تک ماننے لگے ہیں کہ بے روک سرمایہ داری یقیناً دنیا کی مادی و روحانی ترقی کے لئے سخت مضر ہی اس لئے اس پر کچھ نہ کچھ پابندیاں ضرور لگانی چاہئیں۔ اسی طرح قوم پرستی کے اس اصول کو آج غلط سمجھا جانے لگا ہی کہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اپنی سیاسی و علمی ترقی صرف قومی لائنوں پر کی جائے۔ آج یہ تسلیم کر لیا گیا ہی کہ معاشی دنیا میں قوم پرستی کے جذبات کو دخل دے کر دوسری قوموں سے علیحدگی و بے تعلقی برتنا ہر قوم کے لئے مشکلات و مصائب کا موجب ہی

کمیونسٹ پارٹیاں پہلے خلاف قانون قرار دی جاتی تھیں، لیکن آج دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں ان کے قیام کو جائز سمجھ لیا گیا یعنی دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح ان کی سیاسی و معاشی سرگرمیوں کو بھی روا رکھا جاتا ہی۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں انگلستان کی کمیونسٹ پارٹی نے پارلیمنٹ کے لئے اپنے جو امیدوار کھڑے کئے تھے ان کو مجموعی طور سے چھہتر ہزار ووٹ ملے۔ اس کا مطلب یہ ہی کہ ۱۹۳۱ء میں انگلستان جیسے آسودہ و ترقی یافتہ ملک میں کھلے ہوئے کمیونسٹوں کی تعداد پون لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ اسی طرح ٹریڈ یونین (مزدور سبھا) بھی انگلستان کے ہر صنعتی مقام پر قائم ہی۔ ۱۹۳۷ء میں ان کی تعداد ۹۴۸ تھی جن میں صرف ۱۹ بڑی بڑی یونین کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۳۵ لاکھ سے متجاوز تھی۔ اور ان سب کا مجموعی فنڈ پونے دو لاکھ پونڈ (۲۷ لاکھ روپیہ) کے قریب تھا۔

مزدوروں کے مفاد کے لئے ایک مستقل محکمہ انگلستان میں ۱۹۱۶ء ہی میں قائم ہو گیا تھا، مگر ۱۹۲۳ء میں مزدوروں نے اتنی طاقت پکڑی کہ پارلیمنٹ میں اپوزیشن (حزب الاختلاف) کی حیثیت سے نمایاں ہوئے اور دوسرے ہی سال وزارت

پر قابض ہوگئے۔ اس وزارت کی زندگی اگرچہ زیادہ طویل نہ تھی مگر چند ہی سال بعد ۱۹۲۹ء میں پھر مزدور وزارت بنی جو ۱۹۳۱ء تک قائم رہی لیکن اس کے بعد عام کساد بازاری کی وجہ سے "قومی حکومت" کے نام سے سب پارٹیوں کی مخلوط وزارت بنائی گئی جس کا وزیر اعظم مزدوروں کا لیڈر ریمزے میکڈانلڈ ہی رہا۔ لیکن مزدوروں کو "یہ شرک" پسند نہ آیا اور انہوں نے اپنے "وزیر اعظم لیڈر" کو مزدور پارٹی سے خارج کر دیا جس سے مزدوروں کے جذبے اور ڈسپلن کا اندازہ ہوتا ہے۔

انگلستان کی طرح دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی مزدور پارٹی نے طاقت حاصل کی آسٹریلیا میں انہوں نے وزارت بنائی، فرانس میں ایک اشتراکی لیڈر لاول Laval وزیر اعظم بنا، امریکہ تک نے ۱۹۳۰ء کی عالمگیر کساد بازاری میں سوشلسٹ بنیادوں پر مشترک جماعتی کاشت کا اصول بعض مقامات پر رائج کیا اور بیروزگاروں کی روزینے مقرر کئے۔ اسپین نے ۱۹۳۱ء میں اشتراکی جمہوریت قائم کی۔ اس کے دوسرے سال جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل پر چلی نے اشتراکیت کے نظام کو قبول کیا۔ جنوبی امریکہ کے ایک چھوٹے سے ملک یوروگوئے کا نظام معیشت اشتراکی بنایا گیا۔ جرمنی اور اٹلی روس اور روس کی اشتراکیت کے سخت ترین مخالف تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے فسطائیت کے نام سے سیاست و معیشت کا جو نیا خاکہ بنایا اس میں بہت بڑی حد تک اشتراکی اصولوں کا رنگ بھرا گیا ہے۔ لیگ آف نیشن میں بھی دنیا کے مزدوروں کی امداد و اعانت کے لئے انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (بین الاقوامی مزدور جماعت) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس نے دنیا کے مزدوروں، حکومتوں اور کارخانے داروں کے نمائندوں کی متعدد کانفرنسیں وقتاً فوقتاً منعقد کیں اور ان میں اس امر پر غور ہوا کہ کم ترقی یافتہ قوموں میں مزدوروں کے معیار زندگی کو اس سطح پر کیسے لایا جا سکتا ہے جو ترقی یافتہ قوموں میں ہے ——— غرض انقلاب روس کے اثرات آج دنیا کے ہر ہر

گوشے میں نظر آتے ہیں اس لئے اگرچہ یہ ممکن ہے کہ بالشویک لیڈروں کی کامل تقلید کے لئے شاید دنیا کبھی تیار نہ ہو، لیکن یہ قطعاً ناممکن ہے کہ اشتراکیت واشتمالیت جن مشکلات ومصائب کا نتیجہ ہیں ان کے حل کی طرف دنیا کی توجہ ہرگز نہ ہو اور معیشت وسیاست کے موجودہ نظام میں بنیادی تبدیلیاں رونما نہ ہوں۔

سنہ ۱۹۴۱ء میں روس کے خلاف جرمنی کا اعلان جنگ کر دینا، روس کی خوش نصیبی کا ایک ایسا سبب ثابت ہوا جس کا تصور بھی مشکل تھا۔ اس جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد روس کو جو کچھ حیثیت حاصل ہوئی ہے، اس کا تذکرہ بعد کے ابواب کے لئے مخصوص ہے۔

باب ۲۸

اٹلی

قومی اتحاد اور فسطائیت

آٹھویں صدی قبل مسیح سے لے کر ۴۵۵ء تک اٹلی، رومۃ الکبریٰ کی عظیم الشان سلطنت کا مرکز تھا۔ یہاں کے تاجداروں کا پرچم عظمت وجلال مصر و ایران کی سرزمین تک لہراتا تھا۔ اور رومن نسل سے تعلق رکھنا دنیا کی سب سے بڑی عزت، سب سے بڑی شان اور سب سے بڑی عظمت سمجھی جاتی تھی۔ سیزر اور آگسٹس جیسے اولوالعزم شہنشاہ جن کے کارناموں کو تاریخ کے صفحات ہمیشہ دہراتے رہیں گے اسی سلطنتِ روما سے تعلق رکھتے تھے لیکن چوتھی صدی عیسوی میں اس سلطنت کی بنیادیں کمزور ہونا شروع ہوئیں اور آخر ۴۵۵ء میں دنیا کی دوسری شہنشاہیتوں کی طرح اس کی آخری یادگار بھی ہمیشہ کے لئے منہدم ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد ۸۰۰ء میں جب پوپ نے شارلی مان کی تاج پوشی کر کے مقدس سلطنتِ روما کے نام سے ایک عیسائی سلطنت کی بنیاد رکھی، تو اگرچہ اس کا مرکز اٹلی کا شہر روما ہی قرار پایا لیکن اب اٹلی کئی ٹکڑوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ اور ہر ٹکڑے پر ایک مستقل حکمران قابض تھا جو برائے نام مرکزی سلطنت

سے وابستگی رکھتا تھا۔ تاہم چونکہ پاپائیت کا مرکز روما میں واقع تھا اور یہیں ویٹی کن کے مقام پر پوپ کا وہ عظیم الشان محل بنایا گیا تھا جو آج بھی دنیا کی حسین و شاندار عمارتوں میں شمار ہوتا ہے، اس لئے اٹلی کی عظمت و برتری کا سکہ سارے یورپ پر قائم تھا، پوپ کی وجہ سے روما ساری دنیائے عیسائیت کا روحانی مرکز تھا اور یہاں کی لاطینی زبان پورے یورپ کی علمی، مذہبی اور ادبی زبان تھی[1]

مگر جب مارٹن لوتھر نے پوپ کے اقتدار پر ضرب لگائی اور "اصلاح مذہب" کی تحریک نے مختلف عنوانوں سے روم کے "روحانی پایۂ تخت" سے بے تعلقی کا اظہار کیا تو اٹلی کی اہمیت تبدریج گرنے لگی۔ پھر جب قومیت و وطنیت کے جذبات کا زور ہوا تو اس کا رہا سہا وقار بھی جاتا رہا اور اب لاطینی زبان کے بجائے ہر قوم نے اپنی قومی زبان میں لکھنا اور بولنا شروع کیا۔ اسی طرح اخلاقی، مذہبی اور علمی ہر مسئلے میں روما کی طرف دیکھنے کے بجائے یورپ میں اپنی قوم اور اپنی قوم کی پچھلی "شاندار تاریخ" کی طرف رجوع کرنے کا میلان پیدا ہوا۔ ادھر اٹلی کی اندرونی حالت یہ تھی کہ ہر صوبہ خود مختار تھا اور ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک تاریخی روایات رکھنے کے باوجود ان میں اتحاد و یک رنگی کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی تک اٹلی کی پراگندہ حالی کا یہی عالم تھا۔ لیکن اس زمانے میں جب چاروں طرف قوم پرستی کی ہوائیں چلنا شروع ہوئیں اور ہر قوم نے ایک نئی قوت و طاقت اور ایک نئے جوش و ولولے کے ساتھ اپنی تنظیم شروع کر دی تو اطالوی باشندوں میں بھی قومی اتحاد کی تحریک نے جنم لیا اور قومیت و وطنیت کے نام پر "متحدہ اٹلی"

---

[1] سلطنت روما کی تاریخ یورپ کے مورخوں کا ایک "کلاسکل" موضوع ہے۔ دیکھو تواریخ از مام سین، پیلہام، اسٹوارٹ جونز، ا۔ گبن اور بیری۔ نیز "ہولی رومن ایمپائر" از برائس

سے تصور نے لوگوں کے دل و دماغ پر قبضہ پانا شروع کیا اس سلسلے میں میزنی (Mazzini) کی قولی، عملی اور قلمی کوششوں کو اٹلی کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میزنی بہترین دل و دماغ رکھنے والا اطالوی تھا جس کے دل میں اٹلی کو ایک "متحدہ قوم" بنا دینے کی آرزو کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ پھر چونکہ یہ اتحاد اٹلی کے تمام چھوٹے چھوٹے رئیسوں اور زمینداروں کے لئے تباہ کن تھا۔ اس لئے ان لوگوں نے میزنی کی آواز میں اپنے اقتدار کا خطرہ محسوس کیا اور متحدہ اٹلی" کے نعرے کو دبانے کے لئے ۱۸۳۰ء میں میزنی کو جلا وطن کر دیا گیا۔ مگر یہ جلا وطنی میزنی کے جذبات کو ٹھنڈا نہ کر سکی۔ وہ سیدھا فرانس پہنچا اور مارسیلز میں "نوجوان اٹلی" کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ اس نے سارے یورپ میں اٹلی کے اتحاد کے لئے پروپیگنڈا کیا اور یورپ کی ہر قوم کی اخلاقی ہمدردیاں اس بارے میں حاصل کیں۔ آخر اس کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ اٹلی کے باہر اور اٹلی کے اندر دونوں جگہ "متحدہ اٹلی" کے جذبات عام ہونے لگے اور آخر ۱۸۶۱ء میں جزیرۂ سارڈینیا کے رئیس وکٹر امانوال (Victor Amanuel) اٹلی کی پوری حدود کا پہلا تاجدار بنایا گیا۔ چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں نے شروع شروع میں اس تاجدار کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا۔ لیکن چونکہ اٹلی اور یورپ کی رائے عامہ ان کے خلاف تھی اس لئے یہ کشمکش بہت جلد ختم ہو گئی اور اٹلی کے تمام صوبے ایک حکومت اور ایک بادشاہ کے ماتحت آ گئے

میزنی نے اپنی موت (۱۸۷۲ء) سے قبل اپنے خواب کی تعبیر دیکھ لی۔

لہ میزنی کی سوانحیات پر کئی کتابیں ہیں۔ ہمارے پیش نظر بولٹن کنگ کی تصنیف ہے۔ بولٹن کنگ نے ہسٹری آف اٹالین یونٹی" کے نام سے "اتحاد اٹلی" کی تحریک پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ مگر یہاں صرف چند اشاروں پر اکتفا کرنا پڑا۔

سیاسی اعتبار سے اٹلی متحد ہوگیا تھا، مگر ابھی معاشی لحاظ سے وہ بہت پیچھے تھا۔ یورپ کی دوسری قوموں نے جو قومیت کی دوڑ میں اٹلی سے بہت آگے تھیں، دُنیا کے معیشی اڈّوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اٹلی کے ہمسایہ ممالک میں اطالوی عوام سے کہیں زیادہ قومی اتحاد و یک رنگی کا شعور و احساس پیدا ہو چکا تھا۔ تاہم اب اٹلی نے بھی ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ ۱۸۸۲ء میں اس نے جرمنی اور آسٹریا ہنگری" سے اتحاد و دوستی کا ایک معاہدہ کیا جو "اتحادِ ثلاثہ" کے نام سے مشہور رہی۔ اس اتحاد کی رو سے ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے موقعہ پر دنیا کا خیال تھا کہ اٹلی کی امداد جرمنی اور آسٹریا ہنگری کے ساتھ شامل ہوگی، لیکن اٹلی سال بھر تک تو غیر جانبدار رہا۔ اس کے بعد" اتحادِ ثلاثہ" کے پیمانِ وفا کو توڑ کر فرانس و برطانیہ کے ساتھ شامل ہوگیا۔ دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ لیکن یہ حیرانی صرف اس لئے تھی کہ اٹلی اور اتحادیوں کے درمیان لندن کے مقام پر ۱۹۱۵ء میں جو خفیہ معاہدہ ہوا تھا اور جنگ میں فتحیاب ہونے پر اٹلی کو جو معاوضہ دینا طے کیا گیا تھا اس سے دُنیا بے خبر تھی۔

۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد اٹلی کی مایوسی

اٹلی ایک شاندار مستقبل کے لالچ میں ۱۹۱۴ء کی جنگ میں شریک تو ہوگیا تھا۔ لیکن ابھی اس کی فوجی طاقت اتنی نہ تھی کہ آسٹریا ہنگری اور جرمنی جیسے طاقتور دشمنوں کا مقابلہ کر سکتا۔ اس لئے اکتوبر ۱۹۱۷ء میں آسٹریا کی فوج نے ایک جرمن جنرل میکن سن کی کمانڈ میں اُسے زبردست شکست دی۔ یہ اتنی زبردست شکست تھی کہ اس کے بعد اگرچہ برطانیہ اور امریکہ کی فوجی کمک اُسے حاصل ہوئی جس کی مدد سے آسٹریا ہنگری کی اس سلطنت پر جو اب نیم مردہ ہو چکی تھی۔ اٹلی نے ایک فاتحانہ ضرب لگائی اور دِتوری دینی ٹو کے مقام پر

فتح بھی پائی، مگر پچھلی شکست کی یاد دلوں سے محو نہ ہو سکی تاہم ابھی اٹلی کے سامنے ۱۹۱۵ء کا لندن والا معاہدہ موجود تھا جس سے کافی ڈھارس بندھی ہوئی تھی۔ مگر جب جنگ ختم ہونے پر ۱۹۱۹ء میں صلح کی گفت وشنید شروع ہوئی تو اٹلی نے محسوس کیا کہ "مالِ غنیمت" میں سے اس نے جو حصہ لینا طے کیا تھا، وہ نہ مل سکے گا۔ میدانِ جنگ میں ناکام ہو جانے کے بعد "ایوانِ امن" کی یہ ناکامی اٹلی کے لئے ناقابلِ برداشت تھی وہ اس زخم پر چیخ اٹھا اور اس کا نمائندہ آرلینڈ و صلحنامہ ترتیب دینے والی کمیٹی کے جلسے سے انتہائی غیظ وغضب کی حالت میں اٹھ کر چلا آیا۔

اٹلی نے دراصل نئی زمینوں پر قبضہ کرنے اور اپنی حدود سلطنت کو وسعت دینے کے لئے جنگ میں شرکت کی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں اس نے جرمنی اور آسٹریا کا ساتھ دینے کا ارادہ کیا تھا لیکن ان طاقتوں نے اُسے صرف ٹرین ٹی نو دینے پر اکتفا کی۔ اس کے مقابلے میں لندن میں "اتحادیوں" نے بہت زیادہ دینا منظور کیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ٹرین ٹی نو کے علاوہ برنیر تک ٹیرول کا علاقہ بھی اٹلی کو دیا جائے گا۔ نیز ٹرائی ایسٹ اور ریسٹریا اور اٹلی کے مشرق میں بحیرۂ ایجین کا پورا مشرقی ساحل جو ساحلِ ڈل ماشین کہلاتا ہے اور البانیہ کا بندرگاہ ویلونا اور پورے البانیہ کی "سرپرستی" بھی اٹلی کے حصے میں آئے گی۔ ترکی میں اوالیہ کا علاقہ اور افریقہ میں ترکی اور جرمنی مقبوضات میں "مناسب حصہ" بھی اٹلی کو ملے گا ——— اٹلی کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے تھا؟ وہ مستقبل کی شاندار اطالوی سلطنت کے خواب دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ جنگ کے خاتمے پر ایک بار پھر رومتہ الکبریٰ کی سلطنت کی طرح اس کا ستارۂ اقبال چمک اٹھے گا، اسی لئے اس نے ساٹھ لاکھ سپاہی میدانِ جنگ میں بھیجے جس میں سے سات لاکھ کے قریب جنگ کی خونی دیوی کی بھینٹ چڑھے۔ مگر اسے یقین تھا کہ یہ بھینٹ اکارت نہ جائے گی، اس کا اجر اُسے ملے گا۔ ڈل ماشین

ساحل کا بندرگاہ فیوم لندن کے معاہدے میں اٹلی کو دینا طے نہیں کیا گیا تھا، مگر وہ سمجھ رہا تھا کہ لڑ جھگڑ کر اسے بھی لے گا۔ پریذیڈنٹ ولسن نے ہر قوم کو خود مختار بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ اور فیوم میں اطالوی آبادی کافی تھی، اس بنیاد پر اٹلی کو یقین تھا کہ اگر فیوم کی رائے عامہ حاصل کی گئی تو وہاں کی اکثریت اٹلی میں شامل ہونا پسند کرے گی۔

لیکن اتحادیوں نے اٹلی کے ان منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ انہوں نے برنیئر تک ٹرین ٹی نو کا علاقہ اور زورا تک ڈل ماشین ساحل کا علاقہ اور لیگا سٹو کا جزیرہ تو اٹلی کو دینا طے کیا۔ لیکن اس کے بعد کچھ نہیں، پورا ڈل ماشین ساحل اٹلی کو نہیں دیا گیا، فیوم اٹلی کو نہیں دیا گیا، البانیہ کی "سرپرستی" اٹلی کو نہیں دی گئی۔ جرمنی کے افریقی مقبوضات میں سے بھی اٹلی کو کچھ نہ دیا گیا ——— جو اٹلی رومۃ الکبریٰ کی شاندار سلطنت کو واپس لانے کے رنگین خواب دیکھ رہا تھا، اس نے جب اتحادیوں کے یہ فیصلے سُنے تو جوشِ غضب سے دیوانہ ہو گیا اور سارا اٹلی پیرس کانفرنس کے "غدار ساتھیوں" کے خلاف مسلح بغاوت کے لئے تیار ہو گیا۔ اٹلی نے محسوس کیا کہ وہ دنیا بھر کی نظروں میں ذلیل ہو گیا اور خود اسی کے ساتھیوں نے اُس سے دغا کی۔ جنگ کی بہت بھاری قیمت اٹلی نے ادا کی تھی، کروڑوں روپیہ صرف ہوا اور لاکھوں جانیں ضائع گئیں۔ جنگ کے خاتمے پر جو بجٹ بنا اس میں بارہ ارب لیرا (تقریباً تین ارب روپیہ) کا خسارہ تھا، مگر اس کے باوجود اس کو کیا ملا؟ ان خیالات نے جوش و خروش کو ضبط و اختیار سے باہر کر دیا۔

لیکن اس زمانے میں جو جماعت برسر اقتدار تھی وہ اٹلی کے اس مجنونانہ جوش میں شریک نہ تھی۔ اس جماعت کے افراد سمجھتے تھے کہ اٹلی نے جو منصوبے باندھے تھے وہ حد سے بڑھے ہوئے تھے اور ان کا پورا ہونا ناممکن تھا۔ علاوہ ازیں وہ اٹلی کی

کمزوری کو بھی محسوس کرتے تھے اور اتحادیوں کو جنگ کی للکار سنانا اٹلی کے لئے مزید ہلاکت کا باعث جانتے تھے۔ مگر ان لوگوں کی فلسفہ طرازی عوامی جوش کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ٹھنڈا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر یہ اصحاب اپنے خیالات میں ایسے کھوئے ہوئے تھے، اور ان پر مایوسی و افسردگی کا ایسا غلبہ تھا کہ مخالفت میں بھی کوئی جوش نہ دکھا سکے۔ ان حالات میں اٹلی کا عوام ان سے باغی ہو گیا خفیہ انجمنیں بننی شروع ہوئیں۔ جانبازوں نے اپنے اپنے خون سے اتحادیوں کے خلاف حلفنامے لکھنے شروع کئے اور مختلف قسم کے دہشت انگیز جتھے ملک میں پھیلنے لگے اٹلی کی سرزمین اس قسم کی سازشوں کے لئے تاریخی وروایتی طور سے بہت سازگار ہے۔ اس لئے اندر ہی اندر زبردست آگ سلگنے لگی چند دن کے بعد پُرجوش وطن پرستوں کی ایک کثیر تعداد نے اٹلی کے ایک قومی شاعر ڈی اینن زیو (D Annunzio) ـــــــ کی قیادت میں فیوم کے بندرگاہ پر دھاوا بول دیا اور اتحادیوں کے احتجاج کے باوجود اس پر قبضہ کر کے اٹلی کا جھنڈا لہرا دیا۔ تین مہینے تک یہ شہر ان پُرجوش وطن پرستوں کے قبضے میں رہا۔ ڈی اینن زیو، جو اس جماعت کا لیڈر تھا سرتاپا جذبات ہی جذبات تھا۔ کیسے ہوگا اور کیونکر ہوگا کے دور اندیشانہ سوالات اس کے دماغ میں آتے ہی نہ تھے۔ وہ صرف شاعر تھا اور دنیا کو شعر و ادب اور رومان و موسیقی کی رنگین عینک سے دیکھتا تھا۔ اٹلی، رومۃ الکبریٰ کی عظیم الشان سلطنت کا مرکز تھا، اس لئے اب پھر وہی زمانہ واپس آنا چاہیئے۔ رومن نسل دنیا کی برگزیدہ ترین نسل تھی اور اس کے رعب و جلال کی دھاک دنیا میں بیٹھی ہوئی تھی، آج بھی اٹلی کے ہر باشندے کو رومن نسل کے افراد کی طرح دنیا سے اپنی قوت و طاقت کا لوہا منوا دینا چاہیئے۔ روم تین ہزار سال سے دنیا کا تہذیبی روحانی مرکز ہے؛ آج پھر یہ مرکزیت اُسے واپس ملنی چاہیئے ـــــــ اس قسم کے تمام

تصورات سے اس کا دماغ لبریز تھا اور یہی حال اس کے پیچھے چلنے والوں کا تھا لیکن جذبات آخر کب تک واقعات کو جھٹلا سکتے تھے؟ اٹلی نے جنگ میں برائے نام فتحمندی حاصل کی تھی، اس کی قومی تنظیم ناقص تھی۔ اس کی معاشی حالت کمزور تھی اور اس کی سیاسی طاقت امریکہ، فرانس یا انگلستان جیسی کسی طاقت کو دعوتِ مقابلہ نہ دے سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین مہینے کے بعد اٹلی کے وزیرِ اعظم جیولیتی (Giolitti) نے ایک بحری فوج بھیجی جس نے ان "سراپا جذبات" قوم پرستوں کو فیوم سے نکال باہر کیا۔[1]

فسطائیت کا نشوونما

لیکن اٹلی میں اتحادیوں کے فیصلے سے جو نارضگی پھیل گئی تھی وہ بدستور باقی رہی۔ جگہ جگہ جماعتیں بن رہی تھیں اور سیاسی برتری حاصل کرنے کے لئے نئے نئے پروگرام تیار کئے جا رہے تھے۔ مگر فسطائی یا فاشسٹ (Fascist) نام کی جماعت نے سب سے زیادہ ہردلعزیزی حاصل کرنا شروع کی، اس جماعت میں وہ لوگ شامل تھے جو جنگ کے نتیجے سے غیر مطمئن تھے۔ خاص طور سے وہ لوگ جو جنگ میں شامل رہ چکے تھے، اس کے بڑے سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے خالص فوجی انداز پر اس جماعت کی تنظیم کی اور رضاکاروں کی ایک روز افزوں کور بنائی جن کی قمیص کا رنگ سیاہ تھا۔ اس جماعت کا مقصد اور نصب العین یہ تھا کہ اٹلی کو اشتراکیت وجمہوریت کے ملے جلے اصول کے مطابق ترقی کرنا چاہیئے۔ مگر اس کے بالمقابل اشتمالیت پسندوں کی ایک جماعت بھی اٹلی میں قائم تھی اور یہ بھی عام لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ فسطائیت پسندوں کے خیال میں اشتمالیت اٹلی کے لئے سخت خطرناک تھی، وہ یہ سمجھے کہ اگر یہ تحریک

---

[1] تفصیلات کے لئے دیکھو اٹلی اینڈ دی ورلڈ وار از پیج۔ اور میمائرز آف جیولیتی۔

کامیاب ہوئی تو اٹلی اپنی آزادی کھو کر روس کی بالشویکیت میں ضم ہو جائے گا۔ اس لئے اب فسطائیت کے پروگرام میں اشتمالیت کی مخالفت، سب سے بڑی اہمیت حاصل کر گئی۔ اس کے نتیجے میں اشتمالیوں اور فسطائیوں کے درمیان کئی جگہ بلوے ہوئے اور سخت فساد برپا ہوا۔ مگر اس جنگ و جدال میں کامیابی زیادہ تر فسطائیت ہی کو ہوئی اور بڑی تعداد میں لوگ اس کے ممبر ہونے لگے، قوم پرستوں کے جتنے جذباتی نعرے تھے وہ سب اس جماعت نے اپنا لئے تھے اس لئے قدرتاً اس کی ہر دلعزیزی میں بہت زیادہ اضافہ ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن پھر بھی فسطائیت اٹلی کو کسی ایک کز پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اشتمالیت پسندوں کی جماعت ملوں اور فیکٹریوں میں کافی طاقت رکھتی تھی اور وہاں فسطائیت کا گذر نہ تھا۔ اسی طرح اور بہت سی جماعتیں ملک میں کھڑی ہوئی تھیں جن میں سے اکثر محض ذاتی انتقام یا ذاتی نفرت و عناد کے جذبات پر قائم تھیں۔

ابتدا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس گڑبڑ میں کوئی منظم معاشرتی نظام قائم نہ ہو سکے گا۔ الیکشن جب آتا تھا تو زیادہ تر آئین پسند امیدوار کامیاب ہوتے تھے لیکن یہ آئین پسند افراد بھی کسی ایک جماعت سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو وزیر اعظم جیولیتی کی لبرل پارٹی میں تھے، کچھ اعتدال پسند پارٹی میں اور کچھ کیتھولک پارٹی میں۔ البتہ یہ تینوں جماعتیں تشدد کی مخالفت کرنے اور آئینی طریقوں کو پسند کرنے کے مسئلے میں متحد تھیں۔ ان سب کی مجموعی طاقت یقیناً زیادہ تھی مگر دہشت پسندوں اور خفیہ جماعتوں کے ممبروں کے مقابلے میں وہ بے بس تھیں۔

۱۹۱۹ء میں پورے سال اٹلی میں ہڑتالوں کا زور شور رہا۔ ۱۹۲۰ء میں ہڑتالوں نے اور زور پکڑا اور اول اول بندرگاہ کے مزدوروں میں شروع ہوئی لیکن آخر میں ریلوے کے مزدوروں اور چھاپے خانوں کے کام کرنے والوں تک پھیل گئی۔ مزدوروں کے

یہ جیتے تشدد پر عامل تھے۔ اس لئے انہوں نے دھڑا دھڑ کارخانوں پر حملہ کر کے قبضہ کرنا شروع کیا۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں چھ سو بڑے بڑے کارخانے مزدوروں کے قبضے میں تھے جن میں پانچ لاکھ مزدور کام کرتے تھے۔ یہاں مزدوروں نے روسی اشتراکیت کی نمونے پر اپنی پنچائتیں (سوویٹ) قائم کئے۔ لیکن ان لوگوں کو نظم و نسق کا تجربہ نہ تھا۔ علاوہ ازیں نہ ان کے پاس کچا سامان تھا اور نہ بازار۔ اس لئے وہ کام نہ چلا سکے۔ ڈھائی مہینے مسلسل ان کے اور کارخانے داروں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔ آخر مزدور ہار گئے اور مالکوں کو فیکٹریاں واپس مل گئیں۔ مزدوروں کی یہ ہار دراصل اٹلی میں اشتراکیت کی ہار تھی، اس کے بعد ہی کمیونسٹ پارٹی سے بہت سے شوسلسٹ ممبر ٹوٹ کر فسطائی جماعت میں شامل ہو گئے، مگر اس کے باوجود مئی ۱۹۲۱ء کے انتخاب میں فسطائیوں کے صرف ۳۲ ممبر اطالوی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہو سکے۔ ان ممبروں میں سے ایک مسولینی بھی تھا۔ اس جماعت میں جوش و خروش کافی تھا، مگر اتحاد اور ڈسپلن مفقود تھا۔ نہ کوئی ایک پروگرام تھا جس پر سب ممبر عامل ہوتے اور نہ کوئی ایسی مرکزی طاقت تھی جس کے احکام کو سب مانتے۔ روز خبریں آتی تھیں کہ آج اس مقام پر فسطائی ممبروں نے حملہ کر دیا۔ بم پھینکنے اور قتل کرنے کی سرگرمیاں بڑی شدت سے جاری تھیں۔ لیکن مرکزی جماعت کو ان کا علم وقوع کے بعد ہوتا تھا۔ مسولینی جو اس جماعت کا لیڈر تھا۔ اس نے یہ ابتری و بدنظمی دیکھ کر جماعت سے استعفا دے دیا۔ اس نے کہا کہ اس افراتفری کے عالم میں مَیں کچھ نہیں کر سکتا۔ مسولینی کے اس احتجاج کا اثر یہ ہوا کہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں فسطائیوں کی جو کانفرنس ہوئی اُس میں سب نے مل کر مسولینی سے وعدہ کیا کہ آئندہ سے اس کے احکام کا اتباع کیا جائے گا اور کوئی ممبر خود رائی کے ساتھ کچھ نہ کرے گا۔ اسی کے بعد سے مسولینی کے بجائے اُسے اِل ڈوچے (Ill Duce) یعنی سردار کہا جانے لگا۔

اس تنظیم اور ڈسپلن کے بعد فسطائیوں کی طاقت بے پناہ طور پر بڑھنے لگی۔ اب مسولینی نے سوشلزم اور جمہوریت کے تمام نعروں کو چھوڑ کر "شاہیت پسندی" کا اعلان کیا۔ اور پارٹی کا مقصد یہ بتایا کہ وہ ملک کو بالشویکی خطرات سے بچانا چاہتی ہے۔ اس پر اگست ۱۹۲۲ء میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں اور فسطائیوں میں تصادم ہو گیا مگر فسطائیوں نے اپنے پرانے ہتھیاروں یعنی ڈنڈوں اور کیسٹر آئل کی بوتلوں سے کمیونسٹوں کی خوب مزاج پرسی کی۔ اس واقعہ کے بعد کمیونزم کا رہا سہا زور بھی گھٹ گیا۔ مگر ابھی "آئین پسندوں" کی طاقت سے فسطائیت کو نبٹنا تھا۔ اب فسطائیت کی طاقت اتنی بڑھ چکی تھی کہ اگر "آئین پسند" ان کا راستہ نہ روکیں تو وہ حکومت کی کرسیوں پر قابض ہو سکتے ہیں۔ مگر ان آئین پسندوں سے مقابلہ کیسے کیا جائے؟ عوام کی اکثریت انہی کے ساتھ تھی اور دوسرے طاقت و اقتدار بھی ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ ان حالات میں مسولینی نے رضا شاہ پہلوی کی طرح فوجی طاقت کی مدد سے ناگہانی انقلاب لانے کا ارادہ کیا۔[1]

حکومت میں ناگہانی انقلاب

۲۷ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو اٹلی کے پایۂ تخت روم پر "حملہ" کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اور جب وہ دن آیا تو دو لاکھ مسلح فسطائی رضا کار روم میں داخل ہوئے۔ بادشاہ نے یہ حالت دیکھی تو گھبرا گیا۔ مسولینی کے رفیق کار بادشاہ سے ملے اور کہا کہ اگر اٹلی کو خانہ جنگی کے شعلوں سے بچانا ہے تو موجودہ وزارت کو برخاست کر کے فسطائیوں کو وزارت کی مسند سپرد کرو۔ بادشاہ مجبور تھا۔ اگر وہ اس درخواست کو رد کرتا تو شاید کسی فسطائی کی گولی اس کے سینے کے پار ہوتی۔ آخر اس نے اس پارٹی کے لیڈر مسولینی کو

---

[1] دیکھو "دی فاشسٹ موومنٹ ان اٹالین لائف" از Gorglini

وزارت بنانے کی دعوت دی۔ اس دعوت پر ۳۰ر اکتوبر کو ڈوچے روم میں وارد ہوا
ـــــ مگر شان وشوکت سے نہیں بلکہ انتہائی خاموشی کے ساتھ ـــــ

مسولینی نے جو وزارت بنائی اس میں کل تیس وزیر تھے۔ ۱۵ فسطائی جماعت کے اور ۱۵ دوسری جماعتوں کے۔ بیرونی معاملات اور اندرونی امن وانصاف کے محکمے وزیر اعظم کی حیثیت سے مسولینی نے خود اپنے ہاتھ میں رکھے۔

یہ پوری تبدیلی یا انقلاب کامل امن وسکون کے ساتھ رونما ہو گیا۔ نہ خون کا ایک قطرہ گرا اور نہ بندوق کا کوئی فائر ہوا۔ فسطائی رضا کاروں کو حکم ملا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر روم کو خالی کر دیں۔ بعد میں یہ سب رضا کار "قومی فوج" (نیشنل ملیشیا) میں بھرتی کرلئے گئے۔

اب مسولینی اور فسطائیت دونوں کامیاب تھے۔ لیکن کس قدر حیرتناک بات ہے کہ مسولینی جو اٹلی کی سب سے بڑی طاقت بن چکا تھا، وہ ابھی تک بہت ہی غیر مشہور انسان تھا۔ اٹلی کے بہت کم لوگ اس کے نام سے واقف تھے اور بیرونی دنیا تو اسے جانتی ہی نہ تھی۔ جب یہ وزیر اعظم بنا تو ہر طرف سے آوازیں اٹھیں: مسولینی کون ہے؟

مسولینی

مسولینی سنہ۱۸۸۳ء میں ایک لوہار باپ کے گھر پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اسکول میں پائی جہاں سے معلمی کا سرٹیفکٹ ملا۔ جس کے بعد ایک سال تک معلمی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ مگر یہ مشغلہ اس کی فطری ذہانت وصلاحیت سے بہت کمتر تھا۔ اس لئے اس میں اس کا جی نہ لگا اور سنہ۱۹۰۲ء میں اٹلی سے سوئٹزرلینڈ آیا۔ چونکہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس لئے محنت ومزدوری کرکے روزی پیدا کرتا تھا اور جو وقت اس سے بچتا تھا اس کو پڑھنے میں صرف کرتا تھا۔ یہیں اس نے فرانسیسی زبان سیکھی اور سیاسی ومعاشی مصنفوں کی کتابوں کو خوب مطالعہ کیا۔ سوشلزم کے اصول اسے بہت پسند آئے اور وہ سخت قسم کا سوشلسٹ لیڈر بن گیا۔

اس نے مزدوروں کی ایک جماعت بنائی اور جگہ جگہ دھواں دھار تقریریں کرنی اور ہڑتالیں کرانی شروع کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوئٹزرلینڈ سے نکالا گیا۔ یہاں سے واپس اٹلی آیا اور ایک اخبار نکالا۔ مگر ایک مضمون پر حکومت نے گرفتار کر کے سزا دیدی سزا کاٹنے کے بعد اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی کا لیڈر بن گیا اور اخبار نکالنے لگا۔ اب پھر ایک سخت مضمون کی پاداش میں حکومت نے اس کی گرفت کی۔ مگر اس بار قید کے بجائے جلا وطنی کی سزا دی گئی۔ جلا وطنی کی حالت میں بھی اس نے اخبار نکالا اور اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس نے اٹلی کو غیر جانبدار رہنے کی طرف مائل کیا۔ اسی سال اس نے فوجی حملے کی مدد سے حکومت میں ناگہانی انقلاب لانے کی کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن جب ۱۹۱۵ء میں لندن میں اتحادیوں نے اٹلی سے خفیہ معاہدہ کر کے زبردست توقعات دلائیں تو اتحادیوں کا طرفدار بن گیا۔ اس پر سوشلسٹ سخت خفا ہوئے اور انہوں نے "قوم پرستی" کے الزام میں اُسے پارٹی سے خارج کر دیا۔ مگر مسولینی نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے ایک اخبار نکالا اور ایک سپاہی کی حیثیت سے فوج کے لئے اپنی خدمات پیش کیں جو قبول کر لی گئیں۔ جنگ میں خوب لڑا۔ مگر ۱۲ فروری ۱۹۱۷ء کو سخت زخمی ہوا جس کی وجہ سے فوج سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اب پھر اس نے اپنا اخبار سنبھالا اور جنگ جاری رکھنے کا وعظ کہنا شروع کیا۔ جب جنگ ختم ہو گئی تو اتحادیوں سے ناخوش ہو کر فسطائی جماعت بنائی اور آخر تین چار سال کی جد و جہد کے بعد ۱۹۲۲ء میں جب کہ اس کی عمر صرف ۳۹ سال تھی۔ اٹلی کے نظم و نسق کا مالک و مختار بن گیا ——— اس منصب تک پہنچنے سے قبل اس نے جتنی بار سزائیں بھگتیں ان کی مجموعی تعداد گیارہ ہے۔

مسولینی، فسطائی یا فاشسٹ پارٹی کا لیڈر تھا۔ لیکن

فسطائیت کیا ہے فسطائیت یا فاشزم کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ مسولینی کی پارٹی کا یہ نام کسی فلسفی تخیل پر مبنی نہیں ہے۔ ہاں بعد میں اس نے ایک جداگانہ فلسفۂ سیاست کی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ فاشزم جس اطالوی لفظ سے مشتق ہے اس کے معنی ہیں گٹھا یا بنڈل ۱۹۱۴ء کے بعد اٹلی کی سیاسی و معاشی حالت کو سدھارنے کے لئے جہاں اور جماعتیں بنیں وہاں ایک گروہ نے اپنی جماعت کا نام فاشسٹ رکھا جس سے مطلب صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہم میں ویسا ہی اتحاد و استحکام ہے جیسا بنڈل یا گٹھے میں ہوتا ہے اور ہم سب کے دل ایک گٹھے کی طرح ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ ابتدا میں اس جماعت کا اصولِ سیاست اشتراکی جمہوریت یا جمہوری اشتراکیت تھا۔ یعنی ایسی جمہوریت جس میں معاشی مسائل کا حل اشتراکی اصولوں کے مطابق ہو۔ لیکن جب ملک میں کمیونزم کی آندھیاں تیزی سے چلنی شروع ہوئیں اور ادھر روس میں بالشویکوں نے سرمایہ داروں سے خونی انتقام لینا شروع کیا تو اٹلی کو روس سے خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس خطرے نے فاشسٹوں کا اصولِ سیاست بدل دیا اور اب وہ کمیونزم کی مخالفت کرنے لگے اور پھر شاہیت پسند بن گئے۔ پھر جب انھیں عنانِ اقتدار ملی تو وہ مکمل ڈکٹیٹر شپ کے قائل ہو گئے۔ اٹلی کی سیاست میں جو انتشار و پراگندگی پھیلی ہوئی تھی اس کے ہوتے ہوئے کسی اصلاحی کام کی گنجائش نہ تھی۔ ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی تھی اور ہر ایک کا نعرۂ سیاست ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ ان حالات میں فاشسٹوں نے اپنے وطن کی بھلائی اسی میں دیکھی کہ پہلے پورے اٹلی کو ایک سیاسی مرکز پر مجتمع کیا جائے اور تمام بکھری ہوئی طاقتوں کو ایک نقطے پر لا کر اکٹھا کیا جائے۔ چنانچہ اس جماعت کی ایک "مجلس اعلیٰ" یا فاشسٹ گرانڈ کونسل کے چند افراد ہی جمہوریت کے پردے میں اٹلی کے واحد حکمراں بن گئے۔

بظاہر پارلیمنٹ بھی تھی اور اس میں ہر خیال کے ممبر بھی منتخب ہو کر آتے تھے۔ لیکن ہر مسئلہ پہلے اس گرانڈ کونسل میں طے ہوتا تھا اور پارلیمنٹ اس کے فیصلے کی اتباع کرنے پر عملاً مجبور تھی۔

فسطائیت کے فلسفہ سیاست کی بنیاد دراصل اٹلی کے مشہور حکیم سیاست میکیاولی

میکیاولی (Machiavilli) کے بتائے ہوئے اصول پر قائم کی گئی ہے۔ میکیاولی کی شخصیت سولہویں صدی عیسوی میں اٹلی کی ایک بہت بڑی شاندار شخصیت رہی ہے۔ فرمانروا (The Prince) کے نام سے اس نے حکومت و سیاست کے فلسفے پر جو تصنیف اپنے پیچھے چھوڑی ہے اُسے دنیائے سیاست کا ایک بہترین صحیفہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس "صحیفہ سیاست" میں جو کچھ بتایا گیا ہے اس کا لُب لباب یہ ہے کہ ——— فرمانروا اپنی قومیت و برتری کو باقی رکھنے کے لئے ہر کام کر سکتا ہے۔ خواہ وہ کام عام اصول اخلاق کے اعتبار سے صحیح ہو یا غلط۔ حکومت و فرمانروا کا کوئی اخلاق نہیں ہوتا۔ اس کا ہر فعل اپنی سرداری کو قائم رکھنے کی غرض سے ہوتا ہے اور اس غرض کے حصول کے لئے دُنیا کا کوئی کام اس کے لئے ناجائز نہیں ہے حکومت کو اخلاقی اصول پر عمل کرنے کا خیال مطلق نہ کرنا چاہیئے بلکہ جب جس چیز کی ضرورت ہو بلا تامل کر گزرنا چاہیئے۔ اگر ضرورت ہو تو مکر و دغا بازی اور حیلہ جوئی و جعل سازی سے مدد لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ علی ہذا القیاس اگر اس سے بھی آگے بڑھ کر کچھ اور کرنے کی احتیاج ہو تو اُسے بھی بے جھجک کر ڈالنا چاہیئے، فرمانروا یا حکومت کے اخلاق کا بنیادی اصول صرف یہ ہے کہ اس کی عظمت و برتری قائم رہے۔ اس کے اخلاق کی بنیاد اس عظمت و برتری کو قائم رکھنے کی ضرورت پر ہے۔ جب جیسی ضرورت ہو ویسا ہی عمل کرے۔[1]

---

[1] دیکھو مقالات لارڈ مارلے اور لارڈ میکالے۔ نیز انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

میکیاولی ۱۵۲۷ء میں مرگیا۔ لیکن اس کے یہ اصول سیاست آج تک زندہ ہیں۔ کہنے کو اس فلسفے پر ہر طرف سے طعن تشنیع کی بوچھار کی گئی، اور "شیطانی فلسفہ" کا لقب دیا گیا اور آج تک دیا جاتا ہے لیکن عملاً مشکل ہی سے کوئی ایسی حکومت ہوگی جو اس "شیطانی" فلسفے پر عامل نہ ہو، خصوصاً شخصی حکومتوں میں تو میکیاولی کی روح ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اصل یہ ہے کہ میکیاولی نے جو کچھ کہا وہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ البتہ جو عمل، حکومتوں کا رہا ہے اُسے الفاظ میں بیان کر دینے کا گنہگار وہ ضرور ہے۔ میکیاولی کے "فرمانروا" میں پیش کئے ہوئے فلسفے سے قبل بھی دنیا کے فرمانروا اخلاقی اصول کا بہت کم خیال کرتے تھے۔ مگر جب میکیاولی کے فلسفہ طراز قلم نے ان کے اس عمل کو جائز وحق بجانب بھی ثابت کر دیا۔ تب تو کہنا ہی کیا تھا لیکن بظاہر زبان سے اس فلسفے کی اتباع کا اقرار کرنے والوں کی تعداد اب بھی بہت کم ہے اٹلی میں فسطائیت سو فی صدی اسی اصول پر عامل رہی۔ لیکن زبان سے اُس نے بھی خود کو میکیاولی کا مرید نہیں کہا۔ روس میں بالشویک حکومت نے بھی لفظ بلفظ ان اصولوں پر عمل کیا، مگر بظاہر وہ بھی میکیاولی پر لعنت بھیجتی رہی۔ یہی حال دوسرے ممالک کا ہے۔

فسطائی طرز حکومت مسولینی نے فوجی طاقت کے بل پر راج حاصل کیا تھا، اس لئے اپنے اس راج کو منوانے اور اس کی عظمت وبرتری کا سکہ بٹھانے کے لئے قدم قدم پر میکیاولی کے اصولوں سے مدد لینی پڑی۔ فسطائی جماعت کے علاوہ تمام دوسری سیاسی جماعتیں ختم کی گئیں مخالفوں کو دبایا گیا اور جو نہ دبے انھیں گولی کی نذر کیا گیا۔ بہت سے جھوٹے وعدے گئے اور بے شمار سبز باغ عوام کو دکھائے گئے۔ مسولینی نے عنان وزارت سنبھالنے کے بعد جتنی پُر زور و پرشور اور سراپا جوش وخروش تقریریں کیں وہ دنیائے خطابت

سے تو یقیناً بہت بڑا صلہ پانے کی مستحق ہیں، لیکن ویسے ان میں کوئی ٹھوس اور تعمیری چیز نہ تھی۔ ۱۹۲۵ء تک اُسے مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس دوران میں دنیا کچھ نہ سمجھ سکی کہ مسولینی کی فسطائیت کا مطلب کیا ہے۔ جب جس بات کا موقعہ ہوتا تھا وہ کہتا تھا اور جس جماعت کو جن الفاظ سے مرعوب کیا جاسکتا تھا، کرتا تھا۔ تاہم تین چار سال کی لگاتار کوشش کے بعد اس نے مخالفت کو ختم کر دیا اور اب اٹلی میں اسی کا راج تھا۔ اب فاشسٹ پارٹی کی برتری کو شک وشبہ سے دیکھنے والا کوئی نہ رہا تھا، اور اس پارٹی نے بلاغل وغش حکومت کرنا شروع کر دیا تھا۔

اس جماعت کا ممبر اٹھارہ سال یا اٹھارہ سال سے زائد کا ہر شخص بن سکتا تھا اٹلی کا کوئی اخبار اس جماعت کی بتائی ہوئی پالیسی کے خلاف ایک حرف بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب تعلیم میں کوئی ایسی کتاب داخل نہیں کی جاسکتی تھی جو اس جماعت کو ناپسند ہو۔ کوئی پروفیسر کوئی ٹیچر اور کوئی معلم ومدرّس اپنے طلبار کے کان میں کوئی ایسی بات نہیں ڈال سکتا جو فسطائی اصولوں کے خلاف ہو۔ ۱۹۳۱ء میں ہر درسگاہ کے معلم سے یہ حلف لیا گیا:۔

"میں قسم کھاتا ہوں کہ بادشاہ کا، بادشاہ کے جانشینوں کا اور فسطائی حکومت کا وفادار رہوں گا۔ میں حکومت کے آئین اور اس کے بنائے ہوئے تمام قوانین پر کامل اطاعت وفرمانبرداری کے ساتھ عمل کروں گا۔ میں ایک عالم اور معلم کی حیثیت سے اس بات کا حلف لیتا ہوں کہ ہمیشہ ایسے محنتی شہری پیدا کرنے کی کوشش کروں گا جو مادر وطن اور فسطائی حکومت کے خیر خواہ و وفادار ہوں گے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں کسی ایسی جماعت سے تعلق نہیں رکھوں گا جو میرے اس حلف نامے کی بجاآوری میں حارج ہو۔"[1]

---

[1] پوسٹ وار ورلڈ از جیکسن

فسطائی جماعت کے ممبروں کو ممبر بنتے وقت جو حلف لینا پڑتا تھا وہ مختصراً یہ تھا:

"میں حکومت کی اہمیت پر عقیدہ رکھتا ہوں اور یہ یقین کرتا ہوں کہ حکومت کو علیحدہ ہو کر کامل انسانیت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ میں اس پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ اٹلی کا یہ مقدس منصب ہے کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی روحانی اثر رکھنے والی طاقت بنے میں ڈوچے کی مکمل اطاعت کروں گا۔ اس لئے کہ اطاعت ہی میں سلامتی ہے۔"[1]

یہ نصب العین خود مسولینی نے وزیر اعظم کی حیثیت سے کامل ذمہ دارانہ طور پر شائع کیا تھا۔

مسولینی سے جب یہ پوچھا جاتا تھا کہ فسطائیت کیا ہے تو وہ اس کا جواب ایجابی انداز میں دینے کے بجائے سلبی جملوں میں دیا کرتا تھا۔ یعنی وہ "کیا ہے" پر اتنا زور نہیں دیتا تھا جتنا "کیا نہیں ہے" پر دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا ——— فسطائیت، بین الاقوامیت نہیں ہے، اشتراکیت نہیں ہے، جمہوریت نہیں ہے۔ یہ انسانی مساوات کی بھی قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک آدمیوں آدمیوں میں بہت اختلاف ہے اور یہ اختلاف رحمت و برکت کا باعث ہے جسے عام حق رائے دہی جیسے اوچھے ہتھیاروں سے مٹانے کی کوشش کرنا غلط ہے۔ اس قسم کے حربوں سے انسانوں میں جو اندرونی امتیازات ہیں انہیں فنا کر کے ساری دنیا کو ایک سطح پر لے آنے کا خیال حماقت پر مبنی ہے ——— فسطائیت امن پسندی کی بھی قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک نہ تو دنیا میں کبھی عالم گیر امن قائم ہو سکتا ہے اور نہ ایسا امن دنیا کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ صرف جنگ ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کی تمام بہترین صلاحیتوں کو ابھارتی ہے اور جنگ کا میدان ہی ایک ایسا میدان ہے جو انسانی دل و دماغ کو شرافت و بلندی کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ امن پسندی

---

[1] پوسٹ وار ورلڈ از جیکسن

بزدلی کا نام ہے، اس لئے فسطائیت، امن پسندی کو حقارت کے پاؤں سے ٹھکراتی ہے۔

فسطائیت کا فلسفہ اشتراکیت کی طرح روحانیت کا انکار نہیں کرتا۔ اس لئے مذہب کے مسئلے میں مسولینی اور اسٹالن کے عمل میں اختلاف رہا ہے۔ اسٹالن نے مذہب کو ہر ممکن ذریعے سے ختم کر دینا چاہا۔ لیکن مسولینی نے صرف یہ چاہا کہ مذہب کی حدود متعین ہو جائیں اور سیاست و حکومت کے مسائل میں مذہب کوئی دخل کبھی نہ دے۔ اس سوال پر پوپ سے اس کا جھگڑا ہوا جو عرصہ تک چلتا رہا۔ بعد میں دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا اور ویٹی کن (Vatican) کا تاریخی علاقہ پوپ کے حوالے کیا گیا اور یہ طے ہوا کہ اس علاقے کی حدود میں پوپ جو چاہے کر سکتا ہے لیکن اس سے باہر کچھ نہیں کر سکتا۔ باہمی اختلاف کے زمانے میں پوپ کی جائداد بحق حکومت ضبط کر لی گئی تھی۔ اس سمجھوتے کے بعد وہ جائداد تو واپس نہیں ملی البتہ اس کے معاوضے میں کچھ رقم دیا جانا طے ہوا۔ یہ سمجھوتہ سنہ ۱۹۲۹ء میں ہوا تھا جس کے بعد سے ویٹی کن کے ایک سو آٹھ ایکڑ رقبے پر پوپ "کامل آزادی و خود مختاری" کے ساتھ حکومت کرتا ہے۔ اس علاقہ میں پاپائیت کے رفیع الشان محل کے علاوہ کچھ اور عمارتیں اور جائدادیں بھی شامل ہیں ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے غیر ملکوں کے سفیر یہاں رہتے ہیں اور یہاں کے سفیر غیر ملکوں میں جاتے ہیں۔ اس کی حدود میں جو ریلوے ہے وہ پاپائیت کی ملکیت ہے۔ ڈاک کے ٹکٹ بھی پوپ کے اپنے ہیں۔ سکہ بھی جدا ہے اور جھنڈا بھی علیحدہ ہے۔ پوپ کا ایک براڈ کاسٹنگ اسٹیشن بھی ہے جہاں سے تمام دنیا میں پوپ کے احکام وغیرہ نشر کئے جاتے ہیں۔ لیکن آبادی صرف ایک ہزار نفوس پر مشتمل ہے —— بچے بوڑھے، مرد، عورت، بیمار و تندرست سب ملا کر۔

فسطائیت اور دنیا انیسویں صدی کے آخر میں جب اٹلی نے اپنی طاقت کو منظم کرنا شروع کیا تھا برابر بحیرۂ روم پر اثر و اقتدار جمانے کے

خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر آسٹریا، روس اور فرانس کی ملک گیری کے منصوبے اس کی راہ میں حائل تھے اسی بنا پر ۱۹۱۴ء کی جنگ میں اس نے "اتحادیوں" کی طرفداری کرنے میں اپنی عافیت دیکھی مگر جب ۱۹۱۹ء کی صلح کانفرنس میں اس کے منصوبوں کی تکمیل نہ ہو سکی تو قدرتاً اسے سخت مایوسی ہوئی مسولینی کی خارجی پالیسی ابتدا ہی سے اتحادیوں اور اتحادیوں کی مجلس اقوام کے خلاف رہی اور خلاف کیوں نہ رہتی جب اس کی جماعت کا سنگ بنیاد ہی اتحادیوں کے فیصلوں کی ناراضی پر رکھا گیا تھا۔ اٹلی کی قومی ترقی کے لئے جن لوازم کی ضرورت تھی ان میں بحیرۂ ایڈریاٹک اور بحیرۂ روم پر قابض ہونے کا سوال سب سے پہلے آتا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں اٹلی اسی لالچ میں اپنے پرانے ساتھیوں سے ٹوٹ کر اتحادیوں سے ملا تھا۔ مگر اتحادی بھی اس کو پوری طرح مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لئے جب مسولینی کی جماعت کو اقتدار ملا تو ضروری تھا کہ اپنی ہردلعزیزی کو باقی رکھنے کے لئے جو کچھ کہا گیا تھا، اُسے کر کے بھی دکھایا جائے فیوم پر جو بحر ایڈریاٹک کا ایک بہت اہم بندرگاہ ہے۔ اطالویوں کی نگاہیں عرصے سے لگی ہوئی تھیں مگر ۱۹۱۹ء کی "صلح کانفرنس" میں اس شہر کو ایک "آزاد ریاست" بنا دیا گیا تھا۔ مسولینی نے اس مسئلے پر اتحادیوں سے یا مجلس اقوام سے کچھ گفتگو نہ کی بلکہ براہ راست یوگوسلاویہ سے اندرونی طور پر بات چیت کر کے آس پاس کا کچھ علاقہ تو یوگوسلاویہ کو دے دیا اور شہر پر خود تسلط جما لیا۔ مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) نے یہ دیکھا اور اس پر احتجاج کیا، مگر مسولینی نے کسی کی نہ سُنی۔ وہ لڑائی کے لئے بھی تیار تھا، مگر چونکہ برطانیہ و فرانس نے لڑائی کا دروازہ کھولنے سے احتراز کیا اس لئے فیوم پر اٹلی کا قبضہ مسلم ہو گیا

مگر اٹلی کی شہنشاہی تمناؤں کے سامنے صرف فیوم پر قبضہ کر لینا کوئی معنی نہ رکھتا تھا وہ رومۃ الکبریٰ کی پرانی شان و شوکت کو واپس لانے کے خواب دیکھ رہا تھا اور افریقہ کے شمالی ساحل کے علاوہ یورپ میں یوگوسلاویہ سے لے کر البانیہ و یونان تک اپنا پرچم لہرا دینا چاہتا تھا۔ جذبات کا طوفان اندر ہی اندر پرورش پا رہا تھا۔ اور

ذرا سے بہانے کا منتظر تھا۔ ۱۹۳۳ء میں جب جرمنی میں ہٹلر کی نازی پارٹی برسر اقتدار آئی اور جرمنی کو طاقتور بنانے کا کام فرانس و برطانیہ کی مخالفتوں کے باوجود بڑے دھڑلّے کے ساتھ شروع ہونے لگا تو مسولینی نے فوراً موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ مئی ۱۹۳۶ء میں حبشہ پر حملہ کر کے اٹلی سے اس کا الحاق کیا گیا۔ پھر اپریل ۱۹۳۹ء میں البانیہ پر فوجی یلغار بول کر قبضے میں کیا گیا۔ ہٹلر اور مسولینی کے اغراض مشترک تھے، اس لئے دونوں میں اتحاد بڑھتا رہا۔ اگست ۱۹۳۹ء میں جب ہٹلر نے پولینڈ پر دھاوا بول کر دوسری جنگ عظیم کے طبل پر چوب لگائی تو مسولینی کی آنکھیں اس ہنگامے میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے لگیں۔ اور آخر ۱۰ ار جون ۱۹۴۰ء کو کھلے طور پر جرمنی کی آواز میں آواز ملا کر برطانیہ و فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ اس دوران میں مسولینی نے فوجی طاقت بہت مضبوط کر لی تھی، اس کے فوجی دستے یورپ میں دوڑنے لگے۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں یونان سے مطالبہ کیا گیا کہ فوراً اطاعت قبول کر و ورنہ تلوار اُٹھالی جائے گی۔ اور آخر اپریل ۱۹۴۱ء میں جرمنی کی مدد سے یونان کی گردن میں اطاعت و فرمانبرداری کا طوق ڈال دیا گیا۔ اسی طرح یوگوسلاویہ پر اپنی گرفت مضبوط کی گئی۔

مگر ابھی اٹلی کو صرف ساڑھے چار ہزار مربع میل زمین پر قبضہ ملا تھا کہ لڑائی کا پانسہ پلٹنا شروع ہوا۔ پہلے افریقی مقبوضات ہاتھ سے نکلے، پھر اٹلی کی حدود میں اتحادی فوجیں داخل ہوئیں اور آخر شاہ اٹلی نے مسولینی کو معزول کر کے نظر بند کر دیا۔ مگر ہٹلر کے طوفانی دستوں نے حیرتناک طریقے پر اُسے چھڑا لیا۔ تاہم اب مسولینی کا اقتدار گر چکا تھا۔ ادھر ہٹلر کی ہوا بھی اکھڑ رہی تھی۔ مسولینی نے اٹلی میں کچھ لوگ جمع کر کے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر آخر غضبناک ہجوم نے ایک دن اُسے قتل کر دیا۔

اس طرح اٹلی ہی کا نہیں، دنیا کا ایک حیرت انگیز کردار دنیا سے اٹھ گیا لیکن اٹلی کی پیچیدگیاں اس سے ختم نہیں ہوگئیں، مسولینی اپنے پیچھے جو ورثہ چھوڑ گیا ہے،

وہ ختم ہونے والا نہیں۔[1]

البانیہ

رقبے میں البانیہ صرف دس ہزار مربع میل کا ایک چھوٹا سا خطہ ہے جہاں صرف دس لاکھ آدمی بستے ہیں لیکن چونکہ بحر ایڈریاٹک کے مغربی ساحل پر اٹلی کے عین بالمقابل واقع ہے، اس لئے اٹلی کے لئے تجارتی، سیاسی اور فوجی مقاصد کے اعتبار سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہاں کی آبادی زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل ہے جن کا تناسب ستر فیصدی سے زاید ہے۔ باقی تیس فی صدی آبادی عیسائی ہے لیکن یورپ میں ہونے کی وجہ سے ان مسلمانوں کا مذہب بھی چینی مسلمانوں کی طرح کا ہو کر رہ گیا ہے۔ ۱۹۱۲ء تک اس پر ترکوں کا قبضہ تھا۔ مگر اس کے بعد اس کی آزادی تسلیم کی گئی لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہونے کے ایک سال بعد اٹلی اور برطانیہ نے مل کر ایک خفیہ معاہدہ کیا جس میں البانیہ کو آپس میں بانٹ لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ مگر بعد میں اٹلی نے آدھے پر قناعت کرنے کے بجائے پورے علاقے کو ہضم کرنے کی تمنا کی اس تمنا کو پورا کرنے کے لئے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ البانیہ کی آزادی کو تسلیم کرنے کا اعلان ہوا۔ اٹلی کا خیال تھا کہ البانیہ ایک کمزور پڑوسی ہے۔ اس لئے اگر اس کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے تو رفتہ رفتہ مختلف طریقوں سے اس پر پنجہ جمایا جائیگا۔ مگر دوسری طاقتیں بھی اس ارادے کو بھانپ گئیں تاہم ۱۹۲۰ء میں اس کی آزادی تسلیم کر لی گئی۔

البانیہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جس کے باشندے سپاہیانہ طاقت و قوت اور جنگجویانہ تدبیر و صلاحیت میں وہی مرتبہ رکھتے ہیں جو ہندوستان میں نیپال و بھوٹان کے گورکھوں

---

[1] مسولینی کے فلسفۂ زندگی اور سوانح حیات کے لئے دیکھو۔ مسولینی کی خود نوشت سوانح حیات

یا سرحد آزاد کے قبائلی پٹھانوں کو حاصل ہے۔ جب تک اس پر ترکی کا قبضہ رہا بہترین فوجی سپاہی اور اعلیٰ سپہ سالار یہاں سے ملتے رہے۔ مصر کے موجودہ شاہی خاندان کا بانیٔ اوّل محمد علی پاشا، البانیہ ہی کا رہنے والا تھا۔ مصطفیٰ کمال بھی اپنی ماں کی طرف سے البانی تھا۔

اگرچہ ۱۹۱۳ء میں البانیہ کو ترکی سلطنت سے علیحدہ کر کے ایک "آزاد ریاست" قرار دے دیا گیا تھا۔ مگر چونکہ جدید صنعتی کارخانوں اور جدید آلات جنگ کے لحاظ سے اس کی حیثیت بالکل صفر ہے، اس لئے البانی لاکھ جنگجو سہی، یورپ کی منظم قوموں کے مقابلے میں ان کی حیثیت کچھ نہ تھی۔ چنانچہ جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو یہاں کی سیاست میں ایک زلزلہ آ گیا اور بالآخر ۱۹۱۷ء میں اٹلی نے اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن جنگ کے خاتمہ پر ۱۹۲۰ء میں مجلس اقوام کی اصول کی بنا پر اس کی آزادی پھر تسلیم کی گئی اور ایک آزاد جمہوریت کا قیام عمل میں آیا۔ اس جمہوریت کا پہلا صدر اعظم احمد بے زوغو کو منتخب کیا گیا۔ مگر ۱۹۲۸ء میں اندرونی ابتری کچھ ایسی بڑھی کہ جمہوریت کو ختم کر کے دستوری شاہی کو ختم کیا گیا۔ اور احمد زوغو کو بادشاہ کا لقب ملا۔ مگر یہ "بادشاہ سلامت" آخر کب تک اپنی خیر منا سکتے تھے؟ اوّل تو ان کی مملکت کی کل آبادی دس لاکھ اور پھر یہ دس لاکھ بھی نہ تو معاشی اعتبار سے آسودہ و خوش حال اور نہ سیاسی و قومی اعتبار سے مستحکم و مضبوط۔ بھیڑ بکریوں کے دودھ، گوشت اور اون پر یا تھوڑی بہت کاشت پر گذر، نہ کارخانے، نہ صنعت و تجارت، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اٹلی اس "لقمہ تر" کو ہڑپ کر لینے کیلئے صرف وقت اور موقعے کا منتظر تھا۔ لیکن عہد حاضر میں کسی ملک پر قبضہ کرنے کیلئے فوجی کارروائی ہی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اقتصادی تسلط کر کے بھی سیاسی تسلط حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مسولینی نے انتہائی فیاضی و فراخدلی سے البانیہ کی مفلس حکومت اور مفلوک الحال عوام کو قرض دینا شروع کیا۔ جب قرض کی رقم کی اتنی زیادہ ہو گئی

کہ البانیہ سے اس کی ادائیگی کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہا تو مطالبہ کیا گیا کہ جب تک حساب بے باق ہو۔ البانیہ کے مالی اور فوجی محکموں پر اٹلی کا قبضہ رہے گا۔ مقروض البانیہ کیا کر سکتا تھا! اٹلی کے مہاجن نے قرض کی زنجیروں میں اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیئے تھے اور اس کی زبان بند کر دی تھی۔ مجبوراً مالی اور فوجی شعبے اٹلی کو دے دیئے گئے اٹلی نے یہاں سے یوگوسلاویہ کی سرحد تک فوجی آمدورفت کی سڑک بنائی اور تمام معاشی اداروں کو اپنے بینکوں کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ ۱۹۳۹ء تک "آزاد" البانیہ پر اٹلی کی "معنوی حکومت" ہوتی رہی۔ جیسے نہر سوئز کے بعد "آزاد مصر" پر برطانوی ایجنٹ حکمرانی کرتے تھے۔ اس کے بعد، ۷ اپریل ۱۹۳۹ء کو دنیا نے سنا کہ مسولینی کی فوجیں دندناتی ہوئی "شاہ البانیہ" کے ملک میں داخل ہو گئیں اور ۱۴ اپریل کو بادشاہ کو معزول کر کے البانیہ کو اٹلی کی سلطنت کا جزو بنا دیا گیا

مگر البانیہ اپنی اس حالت کے خلاف سراپا بغاوت تھا۔ ۱۹۴۰ء کے اعلان جنگ کے دوسرے سال جب اٹلی کی طاقت گرنی شروع ہوئی تو ان لوگوں نے موقعہ پا کر گوریلا جنگ شروع کر دی جو بڑھتے بڑھتے کھلم کھلا لڑائی کی شکل اختیار کر گئی۔ ۱۹۳۹ء کی لڑائی میں اٹلی کو شکست ہوئی تو اس کی آزادی پھر بحال کی گئی۔

یونان

بحر روم میں غلبہ حاصل کرنے کے لئے اٹلی کو یونان کے بعض ساحلی مقامات اور بعض جزیروں پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔ اس لئے مسولینی کے ابتدائی زمانے ہی سے یونان پر حملہ کرنے کے بہانے ڈھونڈھے جانے لگے۔ ابھی مسولینی کو برسر اقتدار آئے ایک آدھ سال ہی گزرا تھا کہ اتفاق سے یونان کے ایک جزیرے کارفیو میں چار اطالیوں کو کسی نے مار ڈالا۔ مسولینی اس پر آگ بگولا ہو گیا۔ اور ان چار آدمیوں کے

خوں بہا کے طور پر زبردست رقم کا مطالبہ یونان سے کیا۔ یونان نے کچھ تامل کیا تو کچھ پس وپیش کئے بغیر اس جزیرے پر بموں کی بارش شروع کر دی گئی۔ یونان نے مجلس اقوام کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا، مگر مجلس اقوام کے ممبر ابھی پچھلی جنگ سے اتنے بے دم تھے کہ وہ نئی جنگ شروع کرنے کے لئے تیار نہ ہو سکے اور مفاہمانہ بات چیت سے مسولینی "راہ راست" پر آنے والا نہ تھا، مجبور ہو کر یونان نے خوں بہا کی رقم ادا کی۔

لیکن مسولینی کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت یونان کے لئے مستقل خطرہ ثابت ہونے لگی۔ یونان اپنی تاریخی اور علمی روایات کے لحاظ سے یورپ ہی کا نہیں، ایشیاء کا بھی استاد رہا ہے۔ ارسطو، افلاطوں اور بقراط کی قسم کی مشہور عالم ہستیاں جن کی فلسفیانہ موشگافیوں کا اعتراف آج تک دنیا کو ہے، اسی سرزمین کی پیداوار ہیں اسی بنا پر شیخ سعدی نے کہا تھا۔

عقل و دانش ہمہ با مردم یونان داوند!

سکندر جس کی خوش نصیبی وملک گیری دنیا میں ضرب المثل بن چکی ہے، یونان ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سیاسیات کے باریک نکتے اور جمہوریت ودستوریت کے بنیادی اصول بھی سب سے پہلے یہیں دریافت کئے گئے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جمہوریت کے موضوع پر دنیا کی سب سے پہلی کتاب افلاطوں کی "ری پبلک"[۱] ہی ہے۔ لیکن اس شاندار ماضی کے باوجود آہستہ آہستہ اس کے عروج کا آفتاب ڈھلنا شروع ہوا۔ اور جب مقدس سلطنت روما کی بنیادیں اٹلی میں استوار کی گئیں، تب تو اس کی اہمیت روز بروز گھٹنے لگی۔ پھر جب ترکی سلطان

---

[۱] "ری پبلک" کا اردو ترجمہ جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کر کے اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا تو اس کا رہا سہا وقار بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یونان کی حدود پر سلطان ترکی کا جھنڈا لہرانے لگا اور پورا علاقہ ترکی کے زیر نگیں آ گیا۔ سنہ ۱۸۲۱ء تک یونان، خلافت ترکیہ کا ایک صوبہ تھا۔ لیکن انقلاب فرانس کی جمہوریت پسندانہ آوازوں اور قومیت و خود اختیاری کی ہواؤں نے یہاں بھی نئی امنگوں کا چراغ روشن کیا اور یورپ کی طاقتوں کی اندرونی مدد سے خلافت ترکیہ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا گیا۔ بغاوت کی یہ جد وجہد سنہ ۱۸۲۹ء تک جاری رہی۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں اس کی آزادی تسلیم کی گئی اور پرانی روایات کے سحر طراز تصورات کے ہجوم میں ایک یونانی رئیس کو شاہِ یونان بنایا گیا۔

سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں یونان کی حالت بہت نازک تھی، بہر حال خطرات کے نرغوں میں گھرے ہونے کے باوجود، اس کی آزادی سلامت رہی، مگر اس آزادی میں یونان کا شاہی تخت و تاج باقی نہ رہا۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں بادشاہ معزول کیا گیا اور جمہوری نظام نافذ ہوا۔ مگر جب مسولینی کے فسطائی فلسفے نے زور پکڑا اور متحدہ اٹلی کے واحد ڈکٹیٹر نے آس پاس کے علاقوں میں ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کیے تو پھر شاہی کے جذبات عود کر آئے اور سنہ ۱۹۳۵ء میں جارج دوم کو دوبارہ تخت نشین کیا گیا۔

مسولینی کی دراز دستیوں کے علاوہ یونان کو روسی اشتراکیت کا خطرہ بھی بری طرح ستا رہا تھا۔ خطرات کے ان دو طرفہ ہجوم میں گھر جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اشتراکیت پسندوں کا زور بڑھنا شروع ہوا تو سنہ ۱۹۳۶ء میں پارلیمنٹ کو توڑ کر اور آئین کو معطل کر کے بادشاہ کو ڈکٹیٹرانہ اختیارات سونپ دیئے گئے اور یونان کے سامنے قومیت متحدہ کے سوا اور کوئی سوال اہم نہ رہا۔

تاہم اٹلی اپنی کوششوں سے غافل نہ تھا اور جب ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کا اعلان ہوا تو گویا مسولینی کی منہ مانگی مراد بر آئی۔ ۱۹۴۰ء میں اٹلی کی فوجیں یونان میں داخل ہوگئیں۔ مگر یونان نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اگر جرمنی مدد کو نہ پہنچتا تو اٹلی کے منصوبے خاک میں مل گئے تھے۔

لیکن جرمنی کے اقتدار کے بعد اگرچہ بظاہر تمام مخالف آوازیں دب گئیں، مگر نازیت کے خلاف اندرونی طور پر تمام سیاسی جماعتیں متحد ہوگئیں ——— جن سے بعد میں برطانیہ اور روس دونوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی[1]

وسط یورپ

بحر ایڈریاٹک اور بحر روم کے علاوہ، اٹلی اپنی معاشی ترقی کے لئے وسط یورپ کی تجارتی منڈی میں بھی داخل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں جو صلح نامے مرتب ہوئے ان کی وجہ سے یہ راستہ بھی اٹلی کے لئے بند تھا۔ فرانس نے یہ صلحنامے تیار ہی اس لئے کرائے تھے کہ یورپ میں اس کے سوا کسی کا چراغ نہ جل سکے۔ اسی مقصد کے پیش نظر آسٹریا ہنگری کی طاقت کو دو ٹکڑوں میں منقسم کیا گیا تھا اور پھر آسٹریا میں ستانوے فی صدی جرمن آبادی ہونے کے باوجود محض اسی بنا پر جرمنی کے ساتھ اس کا الحاق نامنظور کیا گیا تھا۔ چیکوسلواکیہ کی نئی ریاست بھی اسی غرض سے قائم کی گئی تھی اور رومانیہ اور یوگوسلاویہ کے سابق علاقوں کو بھی اسی مقصد کے پیش نظر وسیع کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب فسطائی جماعت اٹلی کی حکومت پر

---

[1] دیکھو (۱) گریس اگینسٹ دی ایکسس از Casson

(۲) شارٹ ہسٹری آف ماڈرن گریس ۱۹۲۱ء تا ۱۹۴۰ء از Forster

قابض ہوئی اور مسولینی کی نظریں وسط یورپ پر پڑنا شروع ہوئیں تو فرانس کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ پھر چونکہ لاکھوں اطالوی مزدور فرانس میں رہتے ہیں اور تیونس میں فرانس کا تسلط ہونے کے باوجود فرانسیسیوں سے زیادہ اطالوی نو آباد کار بستے ہیں۔ اس لئے اس خطرے نے اور بھی زیادہ شدید صورت اختیار کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسولینی نے یوگوسلاویہ اور رومانیہ سے تجارتی معاہدہ کرنا چاہا تو فرانس بیچ میں حائل ہو گیا اور اس نے اپنی نزائیدہ پروردہ ریاست چیکوسلاویکیہ کی مدد سے اس گفت و شنید کو ختم کرا دیا۔ بات یہ ہے کہ چیکوسلاویکیہ تو خیر ۱۹۱۴ء کی جنگ کی پیداوار ہی تھا لیکن رومانیہ اور یوگوسلاویہ کی حدود بھی اس جنگ ہی کے بعد دوگنی تگنی ہو گئی تھیں۔ اس لئے یہ تینوں طاقتیں صلحناموں پر نظر ثانی کرنے کے سخت خلاف تھیں اور اسی بنا پر انہوں نے فرانس کے ایما سے آپس میں ایک معاہدہ کر رکھا تھا۔ اسی معاہدے کی رو سے تینوں نے عہد کیا تھا کہ اگر ان میں سے کسی ایک کے وقار و اقتدار پر بھی کوئی آنچ آئی تو سب مل کر اس کا تحفظ کریں گے۔ اٹلی نے چاہا تھا کہ اس "معاہدۂ ثلاثہ" میں وہ بھی شامل ہو جائے مگر چونکہ اٹلی کی باگ فرانس کے ہاتھ میں نہ تھی، اس لئے فرانس کی پس پردہ کوششوں سے اٹلی کی یہ خواہش بارآور نہ ہوئی۔

اس ناکامی کے بعد مسولینی نے آسٹریا کی طرف رخ کیا۔ آسٹریا پہلے ہچکچایا اس لئے کہ ٹیرول کا جو علاقہ جنگ عظیم کے بعد اٹلی کو دیا گیا تھا اس میں پچیس لاکھ آسٹریائی نسل کے لوگ بستے ہیں: بالفاظ دیگر جرمن نسل کے۔ اٹلی کی قوم پرستی نے ان پاؤ کروڑ انسانوں کے جم غفیر کو ان کی زبان، تہذیب اور کلچر سے محروم کر کے بجبر اطالوی زبان، تہذیب اور کلچر میں ضم کیا تھا۔ آسٹریا کے دل پر اس ظلم کا داغ تازہ تھا۔ اس لئے جب مسولینی نے اس سے تجارتی معاہدہ کرانا چاہا تو

وہ پہلے تو تیار نہ ہوا مگر بعد میں اس لئے تیار ہوگیا کہ ۱۹۱۹ء کے صلحناموں نے اس کی معاشی ترقی کے وسائل کو اس طرح محدود و مقید کر دیا تھا کہ آزاد ہونے کے باوجود وہ عملاً غلام ہو کر رہ گیا تھا اور عوام میں مفلسی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اٹلی کے ساتھ تجارتی دوستی کرنے میں اُسے کچھ فائدہ نظر آیا۔ اس لئے اس نے اس دوستی کو قبول کرنا چاہا۔ مگر فرانس کب ماننے والا تھا۔ اس نے یہ سانٹھ گانٹھ دیکھی تو فوراً کان کھڑے کئے اور آخر اپنا اندرونی اثر ڈال کر اس گفت و شنید کو بھی ناکام بنا دیا۔

جنگ عظیم کے صلحناموں کی رو سے وسط یورپ پر فرانس نے اپنا جو اثر قائم کر لیا تھا اس کی وجہ سے اٹلی کی اس تجارتی گفت و شنید کو تو اس نے نہ چلنے دیا۔ لیکن مسولینی جس بے پناہ طور پر پورے اٹلی کو ایک فوجی کیمپ بنا رہا تھا، وہ فرانس کے لئے خصوصاً اور باقی دنیا کے لئے عموماً تشویشناک تھا۔ اس نے وسیع پیمانے پر اسلحہ سازی کی فیکٹریاں کھلوانا شروع کیں اور ہر سال تقریباً ۲ لاکھ نوجوانوں کو بھرتی کرنا شروع کیا جنھیں چند سال فوجی تربیت دینے کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ تاکہ اپنے اپنے پیشوں میں مشغول ہو جائیں لیکن ان سے عہد لیا جاتا تھا کہ جب کبھی بھی ملک کو ان کی ضرورت پیش آئے گی، بلا تامل وہ اپنی خدمات فوج کے لئے پیش کریں گے۔

مسولینی کی ان تمام معاشی، سیاسی اور فوجی اصلاحوں کی وجہ سے ۱۹۳۴ء تک اٹلی کا شمار دنیا کی بڑی طاقتوں میں ہونے لگا حالانکہ اس سے پہلے اُسے "دوسرے درجے کی طاقت" سمجھا جاتا تھا۔

شہری آزادی پر پابندیاں

اٹلی کی متحدہ قومیت کا آغاز ۱۸۶۱ء سے ہوتا ہے اس لئے جب مسولینی نے عنان اقتدار ہاتھ میں لی تو اس نے محسوس کیا کہ یورپ کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کے مقابلے میں "نوجوان تر قوم" ہونے کی وجہ سے نہ تو اٹلی کی قومی تنظیم قابلِ اطمینان ہے اور نہ سیاسی و معاشی

حالت تسلی بخش ہو۔ ملک میں بیسیوں جماعتیں ہیں اور ہزاروں لیڈر جن میں سے ہر ایک اپنا راگ الگ الاپتا ہے۔ مسولینی نے اس انتشار کو ختم کرکے ساری قوم کو ایک "گٹھے" میں جکڑ دینے کے لئے مصطفےٰ کمال کی طرح ڈکٹیٹرشپ کے اصول پر عمل کرنا شروع کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ اٹلی میں فسطائی جماعت کے سوا اور کوئی دوسری سیاسی جماعت قائم نہیں کی جاسکتی، کوئی اخبار کوئی رسالہ یا کوئی کتاب ایسی شائع نہیں کی جاسکتی جس میں فسطائیت پر مخالفانہ نکتہ چینی ہو، ہر اخبار مجبور ہے کہ فسطائی جماعت کے صدر دفتر سے اُسے جو اطلاعات ملیں انھیں موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ پہلے ورق پر چھاپے اور باقی اخبار میں جو کچھ لکھے وہ بھی فسطائی لیڈروں کی بتائی ہوئی پالیسی کے مطابق ہو۔ ان احکام کا اثر یہ ہوا کہ اٹلی کے تمام اخباروں کا پہلا صفحہ سرخیوں سے لے کر خبر کے خاتمے تک ایک ہی نے لگان خبروں میں فسطائی سرگرمیوں کا تذکرہ ہوتا تھا اور فسطائی لیڈروں کو سراہا جاتا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں "ملک کے تحفظ" کے لئے ایک "اسپیشل عدالت" قائم کی گئی جس کا مقصد یہ قرار پایا کہ جو لوگ فسطائیت کے مخالف ہیں اُن پر مقدمہ چلایا جائے اس عدالت کے تمام جج ملیشیا (بے قاعدہ فوج) کے افسروں میں سے منتخب کیے گئے۔ انھیں قتل تک کی سزا دینے کا اختیار دیا گیا۔ پھر "فسطائیت شکن" سرگرمیوں کی تعریف میں ایسے گول مول الفاظ استعمال کئے گئے کہ جج جس شخص کو بھی چاہے ان کے تحت لاکر سزا دے سکتا تھا۔ اس کے قانونی الفاظ یہ تھے:۔

(۱) بادشاہ، بادشاہ کے قائم مقام، ملکہ، ولی عہد یا حکومت کے کسی محکمے کے افسر کی جان یا شخصی آزادی یا سلامتی پر حملہ کرنا، (۲) مادرِ وطن کے اتحاد پر حملہ کرنا یا وطنی آزادی کو خطرے میں ڈالنا (۳) کسی ایسے راز کا فاش کرنا جس کا تعلق حکومت کے بچاؤ سے ہو (۴) اندرونی امن کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرنا جس میں مسلح بغاوت، خانہ جنگی، توڑ پھوڑ کا عمل اور لوٹ مار کا عمل شامل ہے"۔

اس دفعہ کی خلاف ورزی پر تین سال قید سخت سے لے کر پھانسی تک کی سزا دی جا سکتی تھی۔ اس کے الفاظ میں جو لچک ہے وہ ظاہر ہے۔ پھر ان الفاظ کی تعبیر کرنے والے جج فسطائی جماعت کے صرف ممبر ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ فوج کے کرنل اور جنرل بھی ہوتے تھے جو صرف سرسری تحقیقات کرنے اور تشدد و سخت گیری کی مدد سے معاملات کو طے کرنے کے عادی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس "قتل عام" میں تحریر و تقریر کی آزادی کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہا۔

سرکاری طور پر جو اعداد و شمار شائع کئے گئے ان کی رو سے اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جو لوگ "فسطائیت شکن" جرموں میں سزا بھگت رہے تھے ان کی تعداد ایک ہزار چھپن تھی۔ لیکن جو لوگ پھانسی کے تختے پر چڑھا دیئے گئے ان کی تعداد کا ظاہر کرنا اطالوی حکومت نے مناسب نہیں سمجھا۔

ابتدائی تعلیم مُفت اور جبری کی گئی۔ کوئی لڑکا یا کوئی لڑکی جاہل نہیں رہ سکتی۔ لیکن اسکولوں میں ٹیچر فسطائی خیال کے رکھے گئے۔ تعلیمی نصاب میں جتنی کتابیں داخل کی گئیں وہ سب فسطائی جماعت کے ممبروں کی لکھی ہوئی تھیں۔ ہر اسکول کے ہر کلاس میں مسولینی کا ایک بہت بڑا فوٹو نصب ہوتا تھا جس کے نیچے یہ الفاظ درج ہوتے تھے:۔

"مسولینی کبھی غلطی نہیں کرتا"

بچوں کو یہ جملہ یاد کرایا جاتا تھا، اس کے ہجے ان سے کرائے جاتے تھے اور اس کا املا لکھایا جاتا تھا۔ یہ جملہ دراصل پاپائیت کے اس جملے کی نقل تھا کہ

"پوپ کبھی غلطی نہیں کرتا"

آج بھی جب کہ "اصلاحِ مذہب" کی تحریک نے یورپ کو لامذہب بنا دیا ہے۔ ویٹی کن کے پوپ کے بارے میں یہ جملہ صحیح سمجھا جاتا ہے اور ۱۸۷۰ء میں "مذہبی

بغاوت" کے عین شباب میں بڑے اہتمام و انتظام کے ساتھ پاپائیت کے دربار سے اس جملے کی صحت وصداقت کا جو اعلان آخری بار ہوا تھا، وہ آج تک قائم ہے پھر جب مذہب کے نام پر پوپ اپنی سربلندی وسرداری کو منوانے کی سعی کرے تو مسولینی کا کیا قصور تھا، اگر وہ قوم پرستی و وطن پرستی کے نئے مذہب کا "پوپ" ہونے کی حیثیت سے اپنے "معصوم عن الخطا" ہونے کا اعلان کرنے لگا ـــــ؟

ہر اسکول میں روزانہ چھٹی کے بعد طلبار کو فوجی تربیت دی جاتی تھی۔ ان کے لئے کھیل اور تفریح کے بڑے بڑے میدان تھے۔ جہاں صفائی و پاکیزگی کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا، بچوں کی جسمانی ورزش، جسمانی طاقت اور صحت وتندرستی کی طرف خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ان اسکولوں اور کالجوں میں کوئی نحیف وضعیف طالب علم دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔ کمزور و نحیف افراد کی جگہ ہسپتالوں میں تھی جو بڑے وسیع پیمانے پر جگہ جگہ قائم تھے اور جہاں نادار مفلس لوگوں کا مفت ہی نہیں جبراً علاج کیا جاتا تھا۵

فسطائیت اور اشتراکیت فسطائیت کا معاشی نظام بہت بڑی حد تک اشتراکیت سے میل کھاتا ہے۔ مسولینی نے بھی سرمایے پر حکومت کی کڑی نگرانی قائم کی اور صنعت تجارت کے منافع میں سے حکومت کو بہت بڑا حصہ دیا گیا۔ مسولینی نے بڑے بڑے سرمایہ داروں کو ختم کر دیا اور دولت کو پھیلا دیا جس سے عریانی اور فاقہ کشی کا کافی علاج ہو گیا۔ پھر بھی اشتراکیت کی طرح فسطائی نظام "معاشی طبقات" کو فنا کر کے بالکل مساوی معاشی حالت پیدا کرنے کا حامی نہیں ہے۔ فسطائی پروگرام کی رو سے یہ تو بلاشبہ ضروری ہے کہ قوم کے ہر فرد کو پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر آئے، اس کی صحت و تندرستی

---

۵ پوسٹ وار ورلڈ از جیکسن

ٹھیک رہے اور اس کی تعلیم وتربیت اتنی ہو کہ وہ ایک اچھا شہری بن سکے۔ لیکن اشتراکیت کی طرح وہ ساری دولت کو حکومت کے قبضے میں لاکر سرمایہ داروں کو بالکل نیست ونابود کرنا نہیں چاہتا۔

اشتراکیت اور فسطائیت میں اتحاد واشتراک اس حد تک ہی کہ سیاسی اصولوں کی کھلی نکتہ چینی پر دونوں کے یہاں سختی کے ساتھ پابندی ہی۔ البتہ جزئیات وفروع پر بحث وتمحیص ہو سکتی ہی۔ لیکن کسی مخالفِ اشتراکیت یا مخالف فسطائیت سیاسی یا معاشی اصول پر نہ تو کوئی کتاب لکھی جا سکتی ہی۔ نہ تقریر کی جا سکتی ہی اور نہ کوئی جماعت بنائی جا سکتی ہی۔ اٹلی میں اشتراکیت پسند کوئی جماعت نہیں بنا سکتے اور نہ اپنا پروپیگنڈا کر سکتے ہیں اسی طرح روس میں فسطائیت پسند اپنی سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتے۔ علاوہ ازیں اشتراکیت اور فسطائیت دونوں کا بنیادی اصول یہ ہی کہ جماعت کی ترقی پر فرد کو قربان کر دینا چاہیے۔ بالفاظ دیگر: اگر جماعت کی ترقی چند افراد کے ساتھ ظلم کرنے، ان کی آزادی کا گلا گھونٹنے یا ان کو قتل کر دینے سے ہوتی ہو تو بلا تأمل یہ قدم اٹھا لینا چاہیے اور اخلاق وانصاف کا مطلق کوئی خیال نہ کرنا چاہیے۔

لیکن ان چند باتوں کے علاوہ باقی اور تمام اصولوں میں فسطائیت اور اشتراکیت میں زمین آسمان کا فرق ہی۔ مثلاً فسطائیت میں معاشی نابرابری ایک قدرتی، لازمی اور لابدی چیز ہی جسے مٹانے کے بجائے باقی رکھنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ لیکن اشتراکیت میں معاشی نابرابری غیر فطری بھی ہی اور غیر ضروری بھی فسطائیت میں قوم ونسل کی پاکیزگی پر بہت زور دیا جاتا ہی اور اپنی قوم اور اپنی نسل کو دنیا میں سب سے اچھی، سب سے افضل اور سب سے برگزیدہ قرار دیا جاتا ہی جس کا یہ حق ہی کہ ساری دنیا کی "معلمی" کرے یا بالفاظ دیگر ساری دنیا پر حکمرانی کرے۔ لیکن اشتراکیت میں مختلف نسلی وقومی امتیازات کو ترقی کرنے کا

موقعہ دیا جاتا ہے اور کسی نسل کو بھی دنیا کی برگزیدہ ترین نسل قرار نہیں دیا جاتا۔ جس طرح انسان انسان برابر ہیں، اسی طرح نسلیں نسلیں بھی سب برابر ہیں۔ اس وقت جو فرق ہے وہ محض تنگ حالی و خوشحالی کی وجہ سے ہے۔ لیکن یہ چیز منشائے قدرت کے خلاف ہے جسے مٹنا چاہئے۔ لیکن فسطائیت اس خیال کی تردید کرتی ہے۔

فسطائیت میں عورت کو مرد سے فروتر ٹھہرایا گیا ہے اور اس کی سرگرمیوں کو صرف گھر کی چہار دیواری میں بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی پرورش و نگہداشت کے بعد امورِ خانہ داری کی تکمیل تک محدود کیا گیا ہے۔ سیاست و حکومت کے میدان میں عورت کو مرد کے برابر یکساں حقوق دینا فسطائیت کے نزدیک غلط ہے لیکن اشتراکیت میں جنس کا کوئی امتیاز نہیں۔ مرد و عورت دونوں زندگی کے ہر شعبے میں یکساں حقوق رکھتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء کے جدید آئین میں روس نے کئی دفعات میں مرد و عورت کی سیاسی معاشی اور معاشرتی مساوات کو تصریحاً بیان کیا ہے۔ اشتراکیوں کے خیال میں عورتوں کو اپاہج بنا کر گھروں میں بٹھا دینا دنیا کی معاشی ترقی کے لئے سخت مضرت رساں ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی انسان کے دو ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کاٹ ڈالا جائے، یا ایک ہاتھ کو معطل و ناکارہ بنا دیا جائے۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کی دماغی اور ذہنی حالت میں قدرت نے کوئی فرق و امتیاز نہیں رکھا ہے جو فرق اس وقت نظر آتا ہے وہ محض غلط قسم کی معاشرت کے فاسد اثرات کا نتیجہ ہے۔

حکومت و ریاست کے مسئلے میں بھی فسطائیت اور اشتراکیت باہم گہرا اختلاف رکھتے ہیں۔ اشتراکیت کہتی ہے کہ ریاست مقصود بالذات نہیں بلکہ انسانی معاشرت کو صحیح ڈھنگ پر ڈالنے کے لئے اس کی ضرورت محض ایک ہتھیار کے طور پر ہے۔ جب یہ ہتھیار اپنا مقصد حاصل کرلے یعنی جب تمام انسان اتنے مہذب اتنے

شائستہ اور اتنے انصاف پسند ہو جائیں کہ دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کو معیوب سمجھنے لگیں۔ دوسروں کے حقوق کو غصب نہ کریں، معاشی مساوات کو عقیدے کے طور پر ماننے لگیں۔ غرض جب اشتراکیت کے اصول ہر انسان کی رگ و پے میں مذہبی عقائد کی طرح سرایت کر جائیں۔ تب ریاست یا حکومت کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی اور اس وقت دنیا میں نراج (انارکزم) کا دور دورہ ہوگا۔ گویا اشتراکی تصور کا نقطۂ کمال نراج ہے۔ لیکن فسطائی تصور اس کے بالکل خلاف ہے۔ مسولینی کہتا ہے "فسطائی تصور کا کمال ریاست ہے"۔ لنین کہتا ہے "ریاست صرف ایک ہتھیار ہے جس سے محنت کش طبقہ اپنی طبقاتی جنگ چلاتا ہے۔ ریاست صرف ایک خاص قسم کا ڈنڈا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں"۔

فسطائیت اور مذہب مذہب کے معاملے میں بھی اشتراکیت و فسطائیت کی راہیں مختلف ہیں۔ فسطائیت مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہتی ہے، مگر اس کی روحانی طاقت و بلندی سے انکار نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ فسطائیت کا داعی اعظم مسولینی پکّا رومن کیتھولک تھا اور اس کی جماعت میں اکثر ممبر عیسائی مذہب پر دل سے عقیدہ رکھتے تھے۔ اس کے برعکس اشتراکی لیڈر تمام کے تمام خدا کے وجود سے منکر ہیں اور صرف مادے کے قائل ہیں۔ اشتراکیت میں مذہب روح یا خدا کے تصور کو جس قدر جلد ممکن ہو مٹا دینا چاہیے۔ کیونکہ اشتراکیت کی رائے میں انسانیت کی معاشی ترقی میں مذہب سنگ گراں کی طرح حائل ہے، لیکن فسطائیت کے نزدیک مذہب کے حدود متعین کر کے اگر اسے گرجا گھر تک محدود کر دیا جائے اور شادی، طلاق، پیدائش اور موت وغیرہ کی رسوم کی بجاآوری کے سوا اگر پادری کی بادریت کا وجود پارلیمنٹ اور کیبنٹ میں نظر نہ آئے تو مذہب کو ضرور باقی رکھنا چاہیے۔[۱]

---

[۱] دیکھو ریسنٹ پولٹیکل تھاٹس از کوکر حصہ اول و حصہ سوم

حبشہ

مسولینی کے فسطائی فلسفے اور اس کی فوجی تنظیم سے یوں تو دنیا عرصے سے کھٹک رہی تھی اور فسطائیت کے خلاف دنیا میں کافی لٹریچر شائع ہو رہا تھا۔ لیکن ابھی اٹلی کا نام مجلس اقوام (لیگ آف نیشن) کے رجسٹر پر درج تھا اور دنیا کو یہ حسن ظن تھا کہ وہ دنیا کے امن میں خلل نہ ڈالے گا اور مجلس اقوام کے امن پسند اصولوں کے مطابق عمل کرے گا۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں حبشہ (ابی سینیا) کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے میں جب اس نے لیگ کی ثالثی کو منظور کرنے سے انکار کر دیا اور تمام بین الاقوامی معاہدوں کو علی الاعلان ٹھکرا کر حبش کے خلاف فوج کشی شروع کر دی تو کچھ کھل بلی سی مچ گئی۔ لیکن یہ کھل بلی صرف زبانوں تک محدود رہی۔ مسولینی نے کہا اگر کسی قوم نے ہمارے ہاتھ ہتھیار بیچنا ممنوع قرار دیا تو ہم اس کے خلاف کھلی جنگ کا اعلان کر دیں گے۔ اس دھمکی نے سب کو سہما دیا۔ تاہم فرانس مُصر تھا کہ ابی سینیا کی مدد کی جائے۔ بہر حال بڑی بحثا بحثی کے بعد یہ طے پایا کہ مجلس اقوام کی صرف اُن دفعات کو استعمال کیا جائے جن میں تیل، کوئلے اور لوہے وغیرہ پر پابندی لگانا مذکور تھا۔ ظاہر ہے کہ ابی سینیا کی امداد کا یہ نیم دلانہ اقدام مسولینی کے جوش و خروش کے سیلاب پر بند لگانے میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ آخر حبش کی کمزور قوم اطالوی سلطنت میں شامل کر لی گئی اور جب یہ سب کچھ ہو گیا تو لیگ نے بھی "پابندیاں" اٹھالیں۔ البتہ حبشہ کی اطالوی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا رہا۔

اگر ۱۹۴۰ء میں اٹلی کی طرف سے جرمنی کی حمایت میں اعلانِ جنگ نہ کیا جاتا تو حبشہ کا یہ علاقہ یقیناً اٹلی کے "جائز مقبوضات" میں تسلیم کر لیا جاتا۔ لیکن یہ

اعلانِ جنگ حبش کے بے کس و بے بس باشندوں کے لئے بہت بڑی رحمت ثابت ہوا۔ ۵ اپریل ۱۹۴۱ء کو اس کے پایہ تخت عدیس ابابا پر اتحادیوں نے قبضہ کیا اور چونکہ اس وقت جنگ پوری طاقت سے جاری تھی اس لئے اپنے مقاصد جنگ اور اپنی نیک نیتی کا بہترین پروپیگنڈا اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا کہ جو شاہ حبشہ اپنے وطن سے بھاگ کر ۱۹۳۶ء سے لندن میں مقیم تھا، اُسے دوبارہ فرمانروا بنا دیا جائے۔ علاوہ ازیں اس طرح حبش کے باشندوں کی امداد و اعانت بھی اطالوی طاقت کو زیر کرنے کے لئے استعمال کی جا سکتی تھی چنانچہ ۵ رمئی ۱۹۴۱ء کو یہ کارنامہ بڑے شور و غوغا کے ساتھ انجام پایا۔ جو اطالوی فوجیں دور دراز علاقوں میں باقی تھیں ان کو نکالنے کا کام کئی مہینے تک جاری رہا۔ جس میں حبش کے باشندوں نے بڑی ہمت سے کام لیا اور نومبر تک پورا ملک اطالوی فوجوں سے خالی ہو گیا۔ اس کے چند ماہ بعد ۳۱ رجنوری ۱۹۴۲ء کو تمام اتحادی اقوام نے باضابطہ طور سے حبش کی اس نئی حکومت کو تسلیم کرنے کا باضابطہ اعلان بھی کر دیا۔

باب ۲۹

فرانس

بے چینی، کشمکش اور رقابتیں

زندگی کے دو اصولوں کی کشاکش

فرانس دنیا کا وہ واحد ملک ہے جو گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں بار بار سیاسی و معاشی انقلابات کا گہوارہ رہا ہے۔ ۱۷۸۹ء میں یہاں سب سے پہلے جمہوری انقلاب کا غلغلہ بلند ہوا اور لوئی شانزدہم کے خاندان کی دو سو سالہ تاریخ پر خط تنسیخ کھینچ گیا۔ کئی سال تک شورش و بدامنی کی آندھیاں چلتی رہیں۔ اور انسانی خون پانی کی طرح بہتا رہا۔ آخر بڑی کشمکش کے بعد ۱۷۹۲ء میں جمہوریت کے اصول پر پہلا عوامی آئین تیار ہوا اور شاہی کا خاتمہ کیا گیا۔ لیکن شاہیت کے تصورات اتنی جلدی دماغوں سے محو نہ ہو سکے۔ اور نپولین اول کی بے پناہ صلاحیتوں نے ایک بار پھر شاہی کا جھنڈا بلند کر دیا۔ ۱۸۰۴ء میں دوبارہ فرانس کی سرزمین میں تخت شاہی بچھایا گیا اور نپولین اس پر جلوہ افروز ہوا۔ مگر انقلاب کی دبی ہوئی چنگاریوں نے پھر اندر سے ابھرنا شروع کیا اور چوالیس سال کے بعد دوسری بار شاہی تاج و تخت کی بساط کو الٹ کر جمہوریت کا آئین و دستور نافذ کیا گیا

لیکن ابھی چار سال ہی ہوئے تھے کہ انقلاب پرور ہاتھوں نے اس نظام کو پھر درہم برہم کر کے رکھدیا اور نپولین ثالث کو بادشاہ بنایا گیا۔ لیکن عوام کی بے چینی بدستور باقی رہی ۔اس بے چینی کو دور کرنے کے لئے نپولین (ثالث) نے کچھ دستوری اصلاحات کا اعلان کیا، مگر اس کے شاہی اختیارات کے آگے یہ اصلاحات محض ایک فریب ہو کر رہ گئیں آخر نپولین (ثالث) نے عوام کی توجہ ہٹانے اور اپنی ذات کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے جرمنی پر حملہ کر کے فرانس کی شان و شوکت میں اضافہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اور ۱۵ر جولائی ۱۸۷۰ء کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔

لیکن نپولین ثالث نے جرمنی کی طاقت کا اندازہ لگانے میں سخت غلطی کی۔ بسمارک جیسے مدبّر و سیاستداں کی قیادت میں جرمنی کے مختلف صوبوں میں زبردست اتحاد پیدا ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں سپاہیانہ طاقت میں جرمن قوم فطرتاً فرانسیسیوں پر سبقت رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی نے پانچ لاکھ سے زیادہ سپاہی اور ڈیڑھ ہزار سے زیادہ توپیں میدانِ جنگ میں لا کھڑی کیں۔ اس کے مقابلے میں نپولین ثالث بہت کوشش کرنے کے باوجود، سوا لاکھ آدمیوں اور سوا نو سو توپوں سے زیادہ کا انتظام نہ کر سکا۔

چند ماہ کی خونریز جنگ کے بعد فرانس کو بہت بُری طرح شکست ہوئی جس نے نپولین ثالث کے خلاف عوام کے جذبات کو بیحد مشتعل کر دیا اور جمہوریت پسندوں کی آواز کو زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل ہونے لگی

جمہوریت کی کامیابی

۱۸۷۰ء میں تیسری بار جمہوریت قائم ہوئی مگر شاہیت و جمہوریت کی کشمکش ابھی باقی تھی جمہوریت پسندوں کی تعداد اگرچہ زیادہ تھی، لیکن شاہی کے حامی بھی کافی پائے جاتے تھے۔ تاہم بادشاہت کا اعلان تو نہ ہو سکا۔ البتہ یہ طے ہوا کہ تیسری جمہوریت کا صدر مارشل میکماہن کو سات سال تک کے لئے منتخب کیا جائے۔ شاہیت پسندوں کا خیال

تھا کہ اس دوران میں وہ رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرلیں گے۔ لیکن ۱۸۷۶ء میں عام انتخابات ہوئے تو شاہیت پسند امیدواروں کو زبردست شکست ہوئی۔ جمہوریت کے حامی غیر معمولی اکثریت میں منتخب ہوئے اور دونوں ایوانوں میں ان کو واضح اکثریت حاصل ہوگئی۔ مجبوراً ۱۸۷۹ء میں مارشل میکماہن نے صدارت سے استعفا دے دیا اور ایک پکا جمہوریت پسند ایم گریوی صدر بنایا گیا۔ فرانس کی تاریخ میں یہ بہت بڑا موڑ تھا جس کے بعد سیاسی حالات آہستہ آہستہ ایک نہج پر استوار ہونے شروع ہوگئے اور جمہوری نظام حکومت کو استقلال دیا مداری حاصل ہونے لگی۔

لیکن جرمنی سے شکست کھا جانے کا جو داغ نپولین ثالث کی شہنشاہیت کی بدولت فرانس کے دامن پر لگ گیا تھا، وہ بدستور باقی رہا۔ ۱۸۷۱ء میں جرمنی سے جو صلحنامہ فرانس نے کیا، اس کی رو سے پانچ ارب فرانک (تقریباً پونے دو ارب روپیہ) بطور تاوانِ جنگ فرانس پر عائد کیا گیا۔ نیز یہ طے کیا گیا کہ جب تک یہ رقم پائی پائی سے بے باق نہ ہو جائے گی جرمن فوجیں، فرانس میں مقیم رہیں گی۔ ۱۸۷۳ء تک فرانس نے جوں توں کر کے بڑی مشکل سے یہ رقم ادا کی۔ مگر اس ادائگی نے قومی دولت پر زبردست اثر ڈالا۔ اس کے علاوہ الساس اور لارین کے مشرقی علاقے بھی فرانس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ صنعتی لحاظ سے ان علاقوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہاں کوئلے، لوہے اور پوٹاس وغیرہ کی کانیں ہیں جو موجودہ مشینی دور میں سونے سے بھی زیادہ قیمتی درجہ رکھتی ہیں۔

جرمنی اور فرانس کی رقابت

۱۸۷۱ء کی شکست کا یہ داغ فرانس کو رہ رہ کر بے چین کرتا رہتا تھا۔ اور جرمنی سے بدلہ لینے کے جذبات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ فرانس کے ان قدرتی جذبات سے

جرمنی بھی ناواقف نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بقول گوچ "۱۸۷۱ء سے بسمارک کا اصولِ حکمرانی اپنی فتوحات کو باقی رکھنے کے لئے یہ رہا کہ فرانس کو فرنطینے میں رکھا جائے"[۱] یعنی دوسرے ممالک سے اس کے تعلقات استوار نہ ہونے دیئے جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جرمنی نے وسط یورپ کی اہم طاقت آسٹریا ہنگری سے یارانہ گانٹھنا ضروری سمجھا تاکہ فرانس اس سے سازباز نہ کر سکے۔ اسی طرح اٹلی کی نئی اُبھرتی ہوئی طاقت کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات پیدا کئے گئے۔ غرض "جرمنی کی خارجہ پالیسی مسلسل یہ رہی کہ فرانس یورپ کی قوموں کے ساتھ مل کر کوئی جرمن کُش اتحاد قائم نہ کر سکے۔"[۲]

لیکن قوموں کی باہمی رقابتوں اور اغراض کی کشمکشوں کی وجہ سے "بسمارک کو انیسویں صدی کے آخری سالوں میں ہی یقین ہو گیا تھا کہ فرانس سے لڑائی ہو کر رہے گی اس نے اپنی ایک تحریر میں لکھا تھا: "ہمیں فرانسیسی حملے کا خوف ہر وقت لگا رہتا ہے خواہ وہ دس دن میں ہو جائے یا دس برس میں۔ فرانس جب بھی خود کو طاقتور سمجھے گا، ہم سے لڑے بغیر نہ رہے گا، پھر اگر وہ جیت جاتا ہے تو ہمارے ساتھ ایسا نرم سلوک ہرگز نہیں کرے گا، جیسا ہم نے ۱۸۷۱ء میں اس کے ساتھ کیا تھا۔ وہ ہمارا خون چوس کر ہمیں نیلا کر دے گا۔ یہی حال ہمارا بھی ہے۔ ہم بھی اگر اس پر فتح پائیں گے تو ایسا ہی کریں گے۔ اب جو جنگ ہو گی اس کے مقابلے میں ۱۸۷۰ء کی جنگ بچوں کا کھیل معلوم ہو گی۔"[۳]

---

[۱] ہسٹری آف ماڈرن یورپ از گوچ صفحہ ۵۰

[۲] " " " صفحہ ۱۵۵

[۳] " " " صفحہ ۱۳۲

۱۹۰۷ء میں فرانس نے مختلف اغراض و مفاد کی رشوتیں دے کر برطانیہ و فرانس سے ایک معاہدہ کیا۔ اس کے جواب میں جرمنی نے آسٹریا ہنگری اور اٹلی سے یارانہ گانٹھا۔ مگر ان پیش بندیوں سے کام نہ چلا۔ ادھر فرانس کے انتقامی جذبات بھڑکتے رہے اور اُدھر جرمنی اس کی ہر نقل و حرکت کو تشکوک و شبہات کی نظر سے دیکھتا گیا ——— نتیجہ ظاہر تھا۔ ۱۹۱۴ء میں یہ آتش گیر مادہ پھٹ پڑا اور دنیا واقعی اُس جنگ کی بھٹی میں جھونک دی گئی جس کے آگے، بقول بسمارک، ۱۸۷۰ء کی جنگ درحقیقت بچوں کے کھیل سے زیادہ نہ رہی۔ پھر چونکہ اس جنگ میں کامیابی کا سہرا فرانس کے سر رہا۔ اس لئے بسمارک کی پیش گوئی کے بموجب اُسنے جرمنی کا خون چوس کر اُسے نیلا کر ڈالا۔

فرانس کا ہولناک انتقام اس فتح کے بعد فرانس نے یہ کوشش کی کہ جرمنی کو پیس کر رکھدیا جائے تاکہ اس میں سر اٹھانے کی ہمت ہی باقی نہ رہے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں فوجی طاقت کے لحاظ سے جرمنی کو بالکل اپاہج بنا دینے کے لئے یہ طے کیا گیا کہ (۱) جرمنی ایک لاکھ سے زائد فوج نہ رکھ سکے گا (۲) جنرل اسٹاف ختم کر دیا جائے گا (۳) بڑی توپیں رکھنے کا اختیار نہ ہوگا (۴) چھوٹی توپیں اور بارود وغیرہ کی مقدار بھی بہت تھوڑی سی رکھ سکے گا (۵) دریائے رائن کے مشرق میں تیس میل تک کوئی فوجی استحکام نہ کیا جائے گا (۶) بحری جہاز چھ سے زیادہ نہ رکھے جا سکیں گے، ہلکے کروزر بھی صرف چھ۔ ڈیسٹرائر اور آبدوز کشتیاں بارہ (۷) ان کی حفاظت کے لئے بحری فوج پندرہ ہزار سے زائد نہ ہوگی (۸) کوئی نئی آبدوز کشتی نہیں بنائی جائے گی (۹) بحر بالٹک پر کوئی فوجی استحکام نہ کیا جائیگا (۱۰) فوجی قسم کا کوئی ہوائی جہاز نہ بنایا جائے گا اور جو پہلے سے بنے ہوئے ہیں انھیں توڑ دیا جائے گا (۱۱) سولہ ہزار ٹن سے زائد وزن رکھنے والے جتنے تجارتی جہاز

ہیں، وہ سب ضبط کرلئے جائیں گے (۱۲) آٹھ ہزار ٹن سے لے کر سولہ ہزار ٹن تک کے تجارتی جہازوں میں سے صرف نصف پر جرمنی کا قبضہ رہے گا، باقی نصف ضبط (۱۳) مچھلیاں پکڑنے کا کاروبار کرنے والے جہازوں میں سے بھی پچیس ۲۵ فی صدی ضبط (۱۴) آگے چل کر بھی جرمنی ہر سال صرف دولاکھ ٹن کے ہوائی جہاز بنا سکے گا۔ اس سے زیادہ کے نہیں۔ (۱۵) دس سال تک جرمنی میں پیدا ہونے والے کوئلے کی ایک بڑی مقدار صرف فرانس بھیجی جائے گی (۱۶) امن کو بحال کرنے میں جو بیرونی فوجیں جرمنی میں رکھی جائیں گی، ان کے مصارف جرمن خزانے سے ادا ہوں گے۔ (۱۷) جرمنی اور اتحادی ممالک کے درمیان پانچ سال تک جو تجارت ہوگی اس پر کسی قسم کا کوئی محصول جرمنی کی طرف سے عائد نہ کیا جائے گا (۱۸) اتحادی ممالک میں جرمنی کے رہنے والوں کی جو جائدادیں ہیں، وہ سب فروخت کردی جائیں گی (۱۹) اس کے علاوہ جرمنی تاوان جنگ کی رقم بھی ادا کرے گا اور اگر اس کی ادائگی میں کوتاہی ہوئی تو جرمنی پر قبضہ کرلیا جائے گا۔[۵]

جرمنی کی اندرونی سیاست پر یہ پابندیاں لگانے کے علاوہ، وسطی یورپ کی نئی تقسیم بھی اس طرح کی گئی کہ جرمنی کو سر اٹھانے کا کوئی موقعہ کبھی مل ہی نہ سکے جرمنی کے جو علاقے معدنی دولت کے لحاظ سے بیحد اہم تھے وہ سب نئی تقسیم میں دوسروں کے حوالے کردیئے گئے۔ آسٹریا ہنگری کی سلطنت کو جو جرمنی کی سب سے بڑی حلیف تھی، ٹکڑے ٹکڑے کردیا گیا۔ اس کے کچھ حصّے تو رومانیہ اور یوگوسلاویہ کو دیئے گئے اور باقی میں سے تین آزاد حکومتیں بنائی گئیں: ایک آسٹریا دوسری ہنگری اور تیسری چیکوسلوواکیہ۔ روس اور جرمنی کے میل ملاپ کو روکنے کے لئے پولینڈ

---

۵ ہسٹری آف ماڈرن یورپ۔ از گوچ صفحہ ۶۹۲-۶۹۱

کے نام سے جو نئی حکومت ۱۹۱۸ء میں بن گئی تھی، اس کی آزادی و خود مختاری کی حمایت کی گئی اور بریسٹ لٹافسک کے صلحنامے کی رو سے روس کے ساحل پر جو چار نئی آزاد حکومتیں بنائی گئی تھیں، ان سب کو بھی تسلیم کیا گیا ــــــ مقصد یہ تھا کہ یورپ میں نہ تو کوئی ایسی زبردست طاقت بن سکے اور نہ جرمنی یا روس میں اتنی ہمت پیدا ہو سکے کہ وہ فرانس پر حملہ کرنے کا خیال دل میں لائے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یورپ کی جو حالت ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد ہوئی، اس کی سب سے بڑی ذمہ داری صرف فرانس پر عائد ہوتی ہے۔

تہذیبی برتری کا احساس

اس میں کوئی شک نہیں کہ تہذیب و شائستگی کے باب میں فرانس صدیوں سے پورے یورپ کا استاد رہا ہے۔ سترھویں صدی عیسوی سے فرانس کو یورپ میں وہی حیثیت حاصل ہے جو انیسویں صدی کے آخر تک ہندوستان میں دہلی اور لکھنو کے حصے میں آئی تھی۔ یورپ کی ہر قوم نشست و برخاست کے آداب، لباس کی وضع قطع، گفتگو کے انداز و اطوار اور زندگی کے طور و طریق میں آنکھیں بند کر کے فرانس کی تقلید کرتی تھی۔ انگلستان سے لے کر روس کے شاہی دربار تک ہر جگہ فرانسیسی زبان جاننا، شائستگی کی سب بڑی نشانی سمجھا جاتا تھا، ہر وہ شخص جو مہذب بننے کا حوصلہ کرتا تھا۔ اس کے لئے فرانس کے لباس کی کاٹ چھانٹ، اور فرانس کے آداب و اطوار معیار کا کام دیتے تھے۔ پھر جمہوریت و مساوات کا سب سے پہلا نعرہ بھی فرانس ہی سے اٹھا تھا اور فرانس ہی تھا جس نے آزادی اور برابری کا پیغام دنیا کے عوام کو سنایا تھا اور جس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ کی ہر حکومت کے آئین و دستور میں جمہوری اصول پر ترمیمیں کی گئی تھیں۔ ان حالات میں کوئی تعجب کی بات نہیں اگر فرانس خود کو تہذیب و تمدن کا امین و محافظ سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ساری دنیا کو مہذب بنانے

کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس کو سیاسی تفوق و برتری کی اتنی خواہش نہیں ہوتی جتنی تہذیبی تفوق و برتری کی ہوتی ہے۔ اسی جذبے نے مراکش سے لے کر تیونس تک کے عربوں کو فرانس کی تہذیب میں ضم کرنے کی خواہش پیدا کی اور اسی جذبے کی وجہ سے ترکی، مصر اور شام میں فرانسیسی درسگاہیں، کتب خانے اور اخبار جاری ہیں۔ یورپ میں صرف فرانس ہی ایسا ملک ہے جہاں کے باشندے اپنی تہذیب کو پھیلانے کی خاطر غیر اقوام سے میل جول پیدا کرنا حتّٰی کہ مذہب تک بدل دینا گوارا کر لیتے ہیں افریقہ و ایشیا، میں فرانس کے جو مقبوضات ہیں، ان میں دیسی باشندوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات پیدا کرنے میں فرانسیسی سے زیادہ بے جھجک قوم اور کوئی نہیں۔

فرانس کا باشندہ دنیا کی ہر چیز کی قربانی دے سکتا ہے، لیکن فرانسیسی تہذیب کی قربانی دینا اس کے لئے ناممکن ہے۔ وہ اپنی تہذیب پر ناز کرتا ہے اور اس کی نفاست و پاکیزگی کو باقی رکھنے کے لئے شیر سے زیادہ خونخوار اور لومڑی سے زیادہ عیار ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد جو صلحنامے مرتب ہوئے ان میں فرانس کی یہ دونوں صفتیں نمایاں تھیں۔ یورپ کا جو نیا نقشہ بنایا گیا، اس میں بظاہر پریذیڈنٹ ولسن کے اس اصول کو پیش نظر رکھنے کا اعلان کیا گیا کہ ہر قوم کو "خود اختیاری" ملنی چاہیے۔ لیکن باطن مدعا یہ تھا کہ یورپ کی کسی طاقت کو فرانس کی ہمسری کرنے کا حوصلہ کبھی نہ ہو سکے اس مقصد کی تکمیل کے لئے قدرتاً بہت سے حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کرنی پڑیں سوڈیٹن لینڈ اور آسٹریا میں جرمنوں کی زبردست اکثریت ہے، مگر ان میں سے اول الذکر کو جرمنی سے ملحق کرنے کے بجائے چیکوسلوواکیہ کا صوبہ بنایا گیا اور ثانی الذکر کو خود مختار ریاست میں تبدیل کر کے یہ ہدایت کر دی گئی کہ جرمنی سے کسی قسم کا تعلق کبھی بھی پیدا نہ کیا جائے۔ ہنگری کے نام سے میگیار قوم کی ایک جُدا حکومت قائم کرنا طے ہوا۔ مگر اس کے باوجود ایسے علاقے جہاں اس قوم کے ایک تہائی فرزند یعنی ۳۲ لاکھ

افراد بستے تھے ان کو دوسری حکومتوں میں دے دیا گیا۔ اور اسی کے ساتھ یہ فرمان بھی نافذ ہوا کہ شکست خوردہ بادشاہ کے خاندان، ہیپس برگ میں سے کسی کو بادشاہ نہ بنایا جائے یوگوسلاویہ میں سرب قوم کے افراد کی تعداد صرف ۴۶ فی صدی تھی، مگر حکومت، سرب فرمانروائی کے ہاتھ میں رکھی گئی جس سے دوسری اقلیتوں کو بالعموم اور کروٹ قوم کو بالخصوص سخت ترین شکایت پیدا ہوئی۔ یوکرین کے ساٹھ لاکھ انسانوں کو خودمختاری دینے کا اصول طے کیا گیا تھا۔ مگر جب پولینڈ نے بروز شمشیر اس علاقے پر قبضہ کر لیا تو اُسے پولینڈ کا جزو تسلیم کر لیا گیا، وغیرہ وغیرہ

پھر سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جن قوموں کو خودمختاری کے خلعت سے سرفراز کیا گیا تھا، اُن کی حدود مملکت کچھ اس طرح بنائی گئیں کہ سیاسی آزادی کے باوجود معاشی آزادی کسی کے حصے میں بھی نہ آسکی۔ مثلاً دریائے رائن کی لہروں پر کافی مقدار میں تجارتی سامان لایا اور لے جایا جاتا ہے۔ لیکن نئی تقسیم کی رو سے اس تجارتی شاہراہ کی صورت یہ ہو گئی کہ مخرج سے لے کر سو میل تک تو فرانس کی حدود میں بہتا پھر تین سو میل تک جرمنی کے علاقے میں اور اس کے بعد سمندر تک ہالینڈ کے علاقے میں سے ہو کر گذرتا اسی طرح دریائے ڈینیوب وسطی یورپ کا ایک بہت بڑا دریا ہے جو تجارتی مال کو اِدھر اُدھر منتقل کرنے میں مدد دیتا ہے لیکن ۱۹۱۹ء کے صلحناموں کے بعد اسے سات آزاد و خودمختار ریاستوں سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا۔ چیکوسلواکیہ کا کوئی حصہ سمندر سے متصل نہیں تھا اور جن دریاؤں کے راستے تجارتی مال سمندر تک لایا اور لے جایا جا سکتا تھا وہ سب کے سب جرمنی سے ہو کر گذرتے تھے

یہ تمام حقیقتیں کسی کی نظر سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ مگر فرانس نے محض اس لئے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا گوارا کیا کہ اس کے بغیر اُسے اپنی مشرقی سرحد کا تحفظ کسی اور طرح نظر نہ آتا تھا۔

۱۹۱۹ء کی "صلح کانفرنس" میں جو عہد نامے کئے گئے تھے

جرمنی سے خطرہ ان میں جرمنی کو ہر حیثیت سے کچل ڈالا گیا تھا جرمنی کے دوبارہ سر اٹھانے کے جتنے امکانات بھی انسانی دماغ میں آ سکتے تھے، ان سب کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا گیا۔ مگر فرانس پھر بھی جرمنی کی طرف سے مطمئن نہ تھا۔ اس کی وجہیں تین تھیں (۱) جرمن قوم کی تعداد یورپ میں ہر قوم سے زیادہ ہے جو زبان معاشرت، تاریخ و روایات اور سپاہیانہ کردار میں زبردست یکسانیت رکھتے ہیں۔ اس لئے آٹھ نو کروڑ انسانوں کے جذبۂ قومیت کا مقابلہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ (۲) یورپ میں اگر کسی قوم کو "پیدائشی سپاہی" کہا جا سکتا ہے تو جرمنوں کو کہا جا سکتا ہے۔ ان میں وہ تمام جوہر موجود ہوتے ہیں جو ایک فوجی کے لئے ضروری ہیں (۳) فرانس اور جرمنی اگرچہ نسلی، لسانی اور معاشرتی اعتبار سے مختلف ہی نہیں ایک دوسرے کے زبردست حریف بھی ہیں۔ لیکن جغرافیائی اعتبار سے ان دونوں کے درمیان کوئی قدرتی حدِ فاصل نہیں ہے۔ فرانس کے شمال و مغرب میں بحرِ اوقیانوس کی لہریں بہترین محافظ ہیں، جنوب میں پرے نیز کے اونچے اونچے پہاڑ ایک مضبوط ترین فصیل کا کام دیتے ہیں۔ لیکن مشرق میں جرمنی کی دراز دستیوں سے بچنے کے لئے اس قسم کی کوئی قدرتی دیوار نہیں ہے۔ پیرس سے کر برلن تک ایک صاف ہموار میدان پڑا ہے جس کو ہر حملہ آور فوج بے روک ٹوک عبور کر سکتی ہے۔ پھر اس سرحدی علاقے میں لوہے، کوئلے اور پوٹاس وغیرہ کی کانیں بھی واقع ہیں جو مشینی صنعت کی اس دور میں بہترین خزانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ۱۸۷۱ء میں جب جرمنی نے فرانس کو شکست دی تو یہ قیمتی علاقہ فرانس سے چھین لیا گیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں فرانس نے پھر اسے واپس لے لیا۔ یہ علاقے جو السَاس اور لارین کے نام سے موسوم ہیں، اتنی زبردست اہمیت رکھتے ہیں کہ جب ۱۹۱۴ء میں جرمنی نے بلجیم میں فوجیں

داخل کیں تو اس کی طرف سے بار بار یہ اعلان کیا گیا کہ "ہم بلجیم پر قبضہ کرنا ہرگز نہیں چاہتے۔ البتہ السا س و لارین کی حفاظت ہم ہر قیمت پر کریں گے"۔ اس جنگ کے خاتمے سے چند ماہ پیشتر ۱۹۱۸ء میں برطانیہ نے جرمنی سے کہا کہ اگر فرانس کو السا س ولارین کا علاقہ واپس کر دیا جائے تو صلح کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن جرمنی نے نہایت سختی کے ساتھ جواب دیا کہ جب تک ہمارے ہاتھ میں ایک رائفل بھی موجود ہے۔ السا س ولارین کو جرمنی سے جدا نہیں کیا جا سکتا[۵]۔

ان وجوہ کی بنا پر مشرقی سرحد کی حفاظت کا سوال فرانس کے لئے بیحد اہم تھا اس گھتی کو سلجھانے کے لئے فرانس نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کے اور جرمنی کے بیچ میں دریائے رائن کے مغربی ساحل سے لے کر فرانس کی سرحد تک ایک نئی حکومت رائن لینڈ کے نام سے قائم کر دی جائے جو حد فاصل کا کام دے سکے۔ مگر قومی اور نسلی اعتبار سے اس نئی ریاست کو بنانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہاں کے بسنے والے ٹھیٹ جرمن تھے۔ آخر انھیں باقی جرمنی سے کیوں علیحدہ کیا جائے؟ علاوہ ازیں فرانس کی اس خود حفاظتی تدبیر سے برطانیہ اور امریکہ وغیرہ کو کوئی دلچسپی کیوں ہو؟ غرض فرانس کی یہ تجویز منظور نہ کی گئی۔ البتہ فرانس کو آئندہ کے خطرات سے بچانے کے لئے یہ طے کیا گیا کہ جو علاقہ دریائے رائن سے لے کر فرانس کی سرحد تک واقع ہے وہ "غیر مسلح" رہے گا اور وہاں کسی قسم کا کوئی فوجی استحکام کسی طرف سے کبھی نہ کیا جا سکیگا۔

مگر فرانس کو اس سے اطمینان نہ ہوا۔ اس لئے اس نے دوسری تجویز یہ پیش کی کہ دنیا کی تمام قومیں ملکر اس بات کی ضمانت دیں کہ اگر کبھی فرانس پر حملہ ہوا تو وہ سب مل کر فرانس کی مدد کریں گی۔ لیکن امریکہ اور انگلینڈ دونوں نے اس قسم کی ضمانت

---

[۵] ہسٹری آف ماڈرن یورپ از گوچ صفحہ ۶۳۷

دینے سے انکار کیا۔ تاہم فرانس برابر اسی کوشش میں لگا رہا۔ اس نے تیسری یہ تجویز بھی پیش کی کہ لیگ آف نیشن (مجلسِ اقوام) کی ایک مسلح فوج تیار کی جائے جو اس امر کی نگہداشت کرتی رہے کہ کوئی قوم بین الاقوامی امن وسلامتی میں رخنہ نہ ڈال سکے۔ لیکن یہ تجویز بھی کسی نے نہ مانی۔ البتہ ۱۹۲۶ء میں لوکارنو پیکٹ کے نام سے جو معاہدہ ہوا اس میں برطانیہ نے فرانس کے تحفظ کی ضمانت لی۔ جس نے فرانس کو ایک حد تک مطمئن کیا۔ جس کے بعد اس نے رائن لینڈ کے نام سے ایک وسطی ریاست (Buffer State) بنانے کا خیال ترک کر دیا۔ پھر ۱۹۲۹ء میں برائنڈ کیلاگ پیکٹ کے نام سے ایک دوسرا معاہدہ ہوا اس کی رو سے امریکہ بھی اس ضمانت میں شریک ہوگیا۔ اس پیکٹ پر امریکہ کے علاوہ باون ۵۲ قوموں کے دستخط تھے اس پیکٹ کی رو سے ہر قوم نے یہ عہد کیا تھا کہ آئندہ سے ہم کبھی کسی حملہ آور کے ساتھ جنگ میں شریک نہ ہوں گے۔

صلحنامہ ورسیلز کی طرح یہ معاہدے بھی فرانس کے مدبرین سیاست کی جیت ضرور تھے، مگر پھر بھی مدبرین فرانس کو پورا اطمینان نصیب نہ ہوا، وہ سوچتے تھے، اگر جرمنی یا اٹلی یا روس نے ان معاہدوں کی پروا نہ کی تو پھر کیا ہوگا؟ یہ سوال فرانس کے دل ودماغ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے خاتمے پر فرانس فاتح تھا۔ دنیا میں اس کے پاس سونے کا ذخیرہ بہت زیادہ تھا، وہ کافی مالدار تھا اس کی سیاسی حالت بہت اچھی تھی۔ اس کے بجٹ میں بڑی توفیر ہو رہی تھی، مگر اس کے باوجود آئندہ کے خطرات سے اس کا دل نڈھال تھا۔ شکست خوردہ جرمنی، شکست خوردہ آسٹریا ہنگری، غیر مطمئن اٹلی، اور اشتراکیت نواز روس کل کیا کریں گے؟ یہ سوال فرانس کے خواب شیریں کو بے کیف بنائے رکھتا تھا۔ وہ دولت مند تھا مگر خوش نہ تھا۔ فاتح تھا مگر سکونِ خاطر اسے حاصل نہ تھا۔ سونے

چاندی کے انبار اس کے قدموں میں پڑے تھے، مگر اطمینان و دلجمعی کی نعمت سے وہ محروم تھا، جرمنی کی افریقی نوآبادیات کے ایک بہت بڑے علاقے پر اس کا جھنڈا لہرا رہا تھا، مگر اس کے دل کی دنیا مستقبل کے خطرات سے لبریز تھی ——— جب لیگ آف نیشن میں بین الاقوامی فوج رکھنے کی تجویز میں اُسے ناکامی ہوئی تو اس نے ایک اور نسخہ پیش کیا، اس نسخے کا مقصد یہ تھا کہ لیگ کے یورپین ممبر لیگ کے اندر ایک لیگ اور بنائیں تاکہ امنِ عالم کو قائم رکھنے میں زیادہ شدت و سرگرمی سے کام کیا جا سکے۔ اور آہستہ آہستہ ایک ایسی فضا تیار ہو جائے کہ یورپ کی موجودہ حکومتوں میں وہی اتحاد نظر آنے لگے جو جمہوریۂ امریکہ کی "وفاقی ریاستوں" میں نظر آتا ہے۔ یہ نسخہ بظاہر اچھا تھا مگر اس میں ایک خرابی یہ تھی کہ اس کی رو سے بلجیم پولینڈ چیکوسلوواکیہ، رومانیہ اور یوگوسلاویہ تو ممبر ہو سکتے تھے۔ لیکن برطانوی نوآبادیات و مقبوضات چونکہ غیر یورپین تھے اس لئے وہ ممبر نہ بن سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ فرانس کو تو اس نئی لیگ میں چھ ووٹ ملتے۔ مگر برطانیہ کے پاس صرف اپنا ایک ووٹ ہوتا۔ علاوہ ازیں اس لیگ سے فرانس نے ترکی اور روس کو الگ رکھنا تجویز کیا تھا، جس کے معنی یہ سمجھے گئے کہ اس طرح فرانس ایک ایسی سازش کرنا چاہتا ہے کہ یورپ پر اس کا اقتدار ہمیشہ کے لئے باقی رہے اور جو صلحنامے مرتب ہو چکے ہیں وہ اگر ناقابلِ عمل بھی ہو جائیں، تب بھی ان میں ترمیم و تنسیخ نہ کی جا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ "نسخۂ امن" بھی نامنظور کر دیا گیا ——— ان مایوسیوں کے بعد فرانس نے مجبوراً خود اپنی فوجی طاقت بڑھانے کی طرف توجہ کی۔ وہ جانتا تھا کہ طاقت کے بغیر ہر معاہدہ بیکار ہے۔ ورسیلز ہو یا ورسیلز سے بھی زیادہ مضبوط و مستحکم کوئی دستاویز ہو، اگر اس کے پیچھے طاقت نہیں ہے تو اس کی وقعت ایک کاغذ کے پُرزے سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ فرانس نے بڑی تعداد میں فوج تیار کرنی شروع کی اور اسلحہ سازی

کو کم کرنے کے امن پسندانہ راگ الاپنے کے باوجود، اپنی بحری، بری اور ہوائی طاقت بڑھانی شروع کی، جرمنی اور فرانس کی درمیانی سرحد چونکہ سب سے زیادہ خطرناک تھی اس لئے وہاں میجنو لائن کے نام سے زبردست ترین فوجی استحکامات کئے گئے، ان فوجی استحکامات کا تعلق زمین کے اوپر اور زمین کے نیچے دونوں جگہ سے تھا۔ ہزاروں میل کے فاصلے پر زمین کی گہرائی سے لے کر زمین کی سطح تک سائنس کی مدد سے جتنے خوفناک و ناقابل عبور اور ناقابل تسخیر انتظامات ممکن تھے وہ سب عمل میں لائے گئے

فرانس کے اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالمگیر امن اور تخفیف اسلحہ کے بارے میں اس کا تمام وعظ دنیا کی نظر میں منافقانہ ہو کر رہ گیا۔ اور دوسری قوموں نے بھی وسیع پیمانے پر اسلحہ بنانے اور فوجی تربیت دینے کا کام شروع کر دیا۔ لیکن جب ۱۹۳۹ء میں جنگ کا اعلان ہوا تب دنیا کو یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ جنگی تیاریوں کی اس کوشش میں جرمنی اور جاپان سب سے آگے بڑھ گئے تھے۔[1]

---

[1] اس باب کی تیاری میں ذیل کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

(۱) دی پوسٹ وار فرانس (مطبوعہ ۱۹۳۴ء) از Vaucher

(۲) ہسٹری آف ماڈرن فرانس از Bourgeois

(۳) ڈیولپمنٹ آف ماڈرن فرانس (از ۱۸۷۰ء تا ۱۹۳۹ء) از Brogan مطبوعہ لندن ۱۹۴۰ء

(۴) میڈیول فرانس اینڈ ماڈرن فرانس از Tilley

(۵) فرنچ سویلیزیشن (انیسویں صدی میں) از Guerard

(۶) ایضاً (ابتدا سے قرون وسطیٰ تک) ایضاً

باب ۳۰

ہر قوم کے لئے حق خود اختیاری

نئی ریاستیں اور نئے ہتھکنڈے

انیسویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے اوائل تک مشینوں کی ایجادات اور قوائے فطرت کی فتوحات نے پوری دنیا کو ایک رشتے میں جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس لئے اس نئی دنیا میں پرانے سیاسی و معاشی نظام کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ ایک طرف یورپ کی طاقتور قومیں، ایشیا و افریقہ کی کمزور بستیوں کو کچے سامان کے حصول اور تیار شدہ مال کی کھپت کے لئے ڈھونڈھتی پھر رہی تھیں، دوسری طرف خود یورپ میں باہمی رشک و رقابت کا بازار گرم تھا۔ اسی اضطراب و بے چینی کا نتیجہ تھا جو ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کی شکل میں نمودار ہوا۔ دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب لانے کی یہ ایک زبردست جدو جہد تھی جس میں پوری انسانیت شریک تھی، ہا بلیت و قابلیت پوری طاقت کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئیں اور روئے زمین کے ہر گوشے میں ایک نیا کہرام بپا ہو گیا، چار سال تک دنیا موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہی آخر وہ وقت آیا کہ سب کے قویٰ تھک گئے۔ اور جنگ کے خاتمے کا اعلان ہوا۔ اگرچہ

قابلی ہتھکنڈوں کی وجہ سے ہابلیت کو پوری کامیابی نہ ہو سکی۔ تاہم دو اصول مستقل طور پر طے ہو گئے (۱) مطلق العنان بادشاہت و شہنشاہیت کے لئے کوئی گنجائش نہ رہی (۲) ہر قوم کو دنیا کے وسیع کنبے کی ایک وحدت قرار دے کر ہر ایک کو آزادی و خود مختاری کے ساتھ اپنے مسائل طے کرنے کا حق تسلیم کیا گیا۔

اس جنگ کے بعد جو "صلح کانفرنس" ۱۹۱۹ء میں ہوئی اس کے فیصلوں کا بنیادی نقطہ یہی دو اصول تھے۔ لیکن اب قابلیت نے نئے جوڑ توڑ شروع کئے اور نئی ترکیبوں اور نئے ہتھکنڈوں سے اپنی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھالنے کی کوشش کی گئی۔ اس میں ایک حد تک کامیابی ضرور ہوئی۔ تاہم دنیائے مظلوم کو بہت سی مصیبتوں سے نجات ملنے کا راستہ ضرور دریافت ہو گیا۔

دنیا کی نئی تقسیم میں ہر قوم کو خود اختیاری (سیلف ڈیٹر مینے شن) دینے کا اصول تو طے ہو گیا تھا، البتہ کسر صرف یہ تھی کہ جو قومیں کمزور تھیں، وہ اپنے اس حق کو پوری طرح منوانے کے قابل نہ تھیں۔ بلاد اسلامیہ کو اس کمزوری سے جو نقصان پہنچا، اس کی تفصیلات گذشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہیں، تاہم یہ کہنا صحیح نہ ہو گا کہ اس خونریز انقلاب نے بلاد اسلامیہ کی مشکلات کو حل کرنے میں کوئی مدد ہی نہ دی۔ دنیا ایک منزل ضرور طے کر چکی، اور دوسری منزلوں کے لئے نئی کشمکش کا راستہ بھی ہموار ہو گیا تھا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ امراض کا پورا علاج ابھی نہ ہو سکا تھا۔

قوموں کو حقِ خود اختیاری دینے کے اصول کی جو تعبیر یورپ میں کی گئی، اس میں فرانس کی خود غرضی نے معاملات کو بگاڑنے کی بہت کوشش کی۔ ان ہی خود غرضانہ کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۳۹ء کی دوسری خونریز انقلاب کی بنیادیں ۱۹۱۹ء ہی میں رکھ دی گئی تھیں۔

آسٹریا ہنگری

۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد مطلق العنان بادشاہوں پر جو زلزلہ گرا، اس میں جرمنی روس اور آسٹریا ہنگری کے تینوں شاہی خاندان ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو گئے تاہم روس اور جرمنی کی پرانی حدود سلطنت تو بہت بڑی حد تک جوں کی توں باقی رہ گئیں۔ لیکن آسٹریا ہنگری سب سے زیادہ بدنصیب سلطنت ثابت ہوئی۔ قومی خود اختیاری کے اصول کے مطابق زیادہ تر عمل جراحی اسی پر کیا گیا۔ چیکوسلواکیہ کے نام سے ایک بالکل نئی ریاست اس کے اعضا کو کاٹ کر بنائی گئی۔ آسٹریا اور ہنگری کو دو جدا جدا حکومتوں میں تبدیل کیا گیا۔ اسی طرح کئی ہزار مربع میل کا علاقہ سربیا کے ساتھ جوڑ کر یوگوسلاویہ کے نام سے ایک نیا ملک تخلیق کیا گیا۔ اس کے علاوہ رومانیہ پولینڈ اور اٹلی کو بہت سے علاقے دیئے گئے۔ غرض اس طرح آسٹریا ہنگری کی شاہی عمارت کو گرا کر اس کی اینٹوں سے یورپ میں کئی نئی عمارتیں تیار ہو گئیں۔

۱۹۱۴ء کی جنگ سے پہلے آسٹریا ہنگری (روس کو چھوڑ کر) یورپ کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ اس کا رقبہ پونے تین لاکھ مربع میل کے قریب تھا اور آبادی باون لاکھ نفوس سے زیادہ۔ لیکن مذکورہ بالا عمل جراحی کے بعد آسٹریا کی آبادی صرف پینسٹھ لاکھ اور ہنگری کی اسی لاکھ رہ گئی۔

آسٹریا ہنگری کی آنجہانی سلطنت کی اس بدنصیبی کی وجہ فرانس کے ذاتی اغراض کے علاوہ یہ بھی تھی کہ یورپ میں صرف یہی ایک حکومت ایسی تھی جو تقریباً درجن بھر قوموں پر حکمرانی کرتی تھی۔ آسٹریا میں جرمن بستے تھے۔ ہنگری میں میگیار قوم آباد تھی۔ اس کے علاوہ چیک سلاوی، اطالوی، رومانوی، رو تھینی، پولستانی سرب اور کروٹ قوم کے افراد بھی مختلف علاقوں میں سکونت پذیر تھے اور

ہر ایک میں آزادی و خود مختاری کی اُمنگ پیدا ہو رہی تھی، خصوصاً ہنگری کی میگیار نسل تو کسی شکل میں بھی اپنا دامن آسٹریا کی جرمن نسل کے ساتھ باندھنے پر تیار نہ تھی۔

آسٹریا ہنگری میں مختلف قوموں کی یہ کشمکش روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر یورپ میں یہ واحد سلطنت تھی جس کے قبضے میں یورپ سے باہر کوئی نو آبادی نہ تھی۔ یعنی باہر کی دولت سے اندرونی کشمکش کا جو تھوڑا بہت علاج ممکن ہو سکتا تھا، وہ بھی ناپید تھا۔ اِن حالات میں آسٹریا ہنگری کی آخری پچاس ساٹھ سالہ تاریخ سازشوں اور خفیہ معاہدوں کی مسلسل داستان ہو کر رہ گئی۔ یورپ میں کسی طاقت نے اتنے خفیہ معاہدے نہیں کئے، جتنے اس سلطنت نے کئے۔ مقصد اس کا صرف یہ تھا کہ کسی طرح اندرونِ ملک اپنی حیثیت مضبوط کی جائے اور بیرونِ ملک کچھ نئی منڈیاں حاصل کی جائیں۔ اس سلطنت کے زوال کے بعد آسٹریا کی ایک ذمے دار شخصیت پروفیسر پری برام (Pribram) نے حکومت کی ملازمت سے باقاعدہ چھٹی لے کر ان خفیہ معاہدوں پر ایک مستقل کتاب لکھی جو ۱۸۷۹ء سے یورپ کی اس شہنشاہیت کو گھن کی طرح کھا رہے تھے اور جو آخر کار ۱۹۱۴ء میں ایک ہولناک جنگ کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ "ان خفیہ معاہدوں نے رفتہ رفتہ آسٹریا ہنگری کا گلا بُری طرح دبا لیا تھا، اس لئے اگر وہ جنگ کی بھٹی میں نہ کودتا تو یہ حالات خود ہی اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتے"[1]

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز سربیا کے خلاف آسٹریا ہنگری کے اعلانِ جنگ ہی سے ہوا تھا۔ بظاہر یہ اعلانِ جنگ بادشاہ نے کیا۔ لیکن حقیقت میں بادشاہ کو اس پر کوئی اختیار نہ تھا جس طرح ہوا کے زور سے درخت کی ٹہنیاں ہلنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح قومیت و جمہوریت کی اندرونی تحریکوں کی آندھیوں میں بادشاہ بھی مجبور تھا۔ آسٹریا ہنگری

---

[1] دیکھو Recent Revelations: page 67

میں بسنے والی مختلف قوموں میں خود اختیاری حاصل کرنے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ دوسری طرف ہمسایہ ملکوں کی رقابتیں کام کر رہی تھیں۔ آسٹریا ہنگری کے لئے اب یہ ناممکن ہوتا جا رہا تھا کہ دوسری قوموں خصوصاً بلقان کے علاقوں کو اپنی شاہی پر مطمئن رکھ سکے۔ اب اس کی نجات کا واحد راستہ صرف یہی رہ گیا تھا کہ بلقان کی سب سے زیادہ پرشور ریاست سربیا کے خلاف اعلان جنگ کرکے اپنی دھاک بٹھا دے۔ اعلانِ جنگ نہ کرنے کی صورت میں آسٹریا ہنگری کے لئے یورپ کی ایک بڑی طاقت بنا رہنا ناممکن تھا۔ البتہ جنگ کی صورت میں کچھ امکانات تھے[1] اس لئے ایک جوا تھا جو گھبرائے ہوئے جواری نے اگست ۱۹۱۴ء میں کھیلا، ایک آخری پانسہ تھا جو بدحواس کھلاڑی نے اپنی بگڑی ہوئی قسمت کو سدھارنے کے لئے پھینکا۔ آخری داؤ تھا جو موت و زندگی کے نام پر لگایا گیا۔

لیکن اس جوئے میں یہ جواری ہار گیا۔ ۱۹۱۹ء کی صلح کانفرنس میں اس سلطنت کے ٹکڑے کرکے قومیت کی بنیاد پر نئی حکومتوں کی حدبندی کی گئی مگر اس میں فاتح اقوام کی وجہ سے بہت سی ایسی خرابیاں رہ گئیں جنہوں نے ہر نئی حکومت کی آزادی کو کھلونا بنا کر رکھ دیا۔ مثلاً آسٹریا ہنگری کی دونوں نئی حکومتیں سمندری ساحل سے محروم ہو گئیں، اس لئے کہ بحر ایڈریاٹک کا پورا ساحلی علاقہ ان سے علیحدہ کرکے یوگوسلاویہ کو دیدیا گیا۔ ایسی صورت میں صرف دریائے ڈینیوب ہی ایک دریائی راستہ ان دونوں ملکوں کے لئے رہ جاتا تھا۔ مگر یہ راستہ بھی یوگوسلاویہ، رومانیہ اور بلگیریا سے ہو کر گزرتا تھا پھر چونکہ اس کا مخرج جرمنی میں ہے اور چیکوسلوواکیہ کی مغربی سرحد بھی اس کی گذرگاہ ہے اس لئے وسط یورپ کی ان تمام ریاستوں کے لئے یہ یکساں طور پر اہم تھا، مگر اس پر

---

[1] ہسٹری آف ماڈرن یورپ از گوچ صفحہ ۵۵۵

واحد قبضہ کسی کا نہ تھا۔ جو حکومت جب چاہے، دوسرے کے مال پر چنگی کا محصول بڑھا کر مشکلات پیدا کر سکتی تھی۔ اس بناء پر ۱۹۱۹ء کی "صلح کانفرنس" نے اس دریا کو بین الاقوامی قرار دے کر اس کی نگرانی ایک کمیشن کے سپرد کی تھی۔ مگر اس کمیشن میں رومانیہ کے علاوہ باقی اور کوئی ممبر ان ریاستوں سے نہیں لیا گیا جن کا براہ راست مفاد اس سے وابستہ تھا۔ یعنی ہنگری یا آسٹریا وغیرہ اصل فریقوں کو لینے کے بجائے اس کمیشن کا تسلط رومانیہ کے علاوہ برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے نمائندوں کو سونپا گیا۔

آسٹریا

آسٹریا کے ساتھ ۱۹۱۹ء میں سینٹ جرمین میں جو صلحنامہ مرتب ہوا اور اس کی رو سے اس ریاست کی جو نئی حدود مقرر کی گئیں، انہوں نے اس ملک کی حالت دنیا سے بالکل نرالی کر دی۔ کل علاقے کی آبادی گھٹ پٹ کر پینسٹھ لاکھ رہ گئی، مگر پایہ تخت ویانا کی آبادی ۲۵ لاکھ کے لگ بھگ تھی، گویا ۲۵ لاکھ انسانوں کی آبادی رکھنے والے پایہ تخت کی کفالت کا بار صرف ۳۵ لاکھ انسانوں کو سونپا گیا پھر اس پایہ تخت ویانا کے باشندے صنعتی، تجارتی اور آزاد خیال سوشلسٹ تھے، لیکن پورے ملک کی آبادی زراعتی اور قدامت پسند رومن کیتھولک تھی، اصل میں ویانا اس آسٹریا ہنگری کی متحدہ سلطنت کا پایہ تخت تھا جو پانچ کروڑ انسانوں پر حکومت کرتی تھی اور جس میں بیسیوں صنعتی کارخانے تھے، مگر جب اس کے ٹکڑے کر کے نئی نئی ریاستیں بنا دی گئیں اور صنعتی علاقے چیکوسلوواکیہ کے نام سے ایک دوسرے ملک میں ضم کر دیئے گئے تو قدرتاً ویانا کی حالت اس عالیشان محلسرا کی سی ہو کر رہ گئی جس کے رہنے والوں سے تو یہ کہا جائے کہ تم بدستور رئیس کی حیثیت سے اس کے مالک ہو مگر ان کی ریاست کے تمام گاؤں چھین لئے جائیں۔

۱۹۱۴ء کی جنگ سے پہلے ویانا یورپ کا مہذب ترین شہر شمار ہوتا

تھا یہاں کے ڈاکٹروں، سائنسدانوں، سیاسی مدبروں اور پروفیسروں کی دُور دُور شہرت تھی۔ لیکن ۱۹۱۹ء کے بعد آبادی تو اتنی ہی رہی مگر معاشی ذرائع مفقود ہو گئے کارخانوں کی بڑی بڑی شاندار عمارتیں کھڑی آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، لیکن کچے سامان کے حصول کے تمام ذرائع بند ہو جانے کی وجہ سے اُن میں اُلّو بول رہے تھے۔ پھر جو تھوڑا بہت مال برآمد کیا جا سکتا تھا وہ بھی چاروں طرف "غیر ممالک" سے گِھر جانے کی وجہ سے ہر ملک کے "چنگی" لگانے والے محکمے کے رحم و کرم پر تھا۔ اس صورتِ حالات میں افلاس و فاقہ کشی یقینی تھی۔ پروفیسرن اور ڈاکٹروں کی تعداد اب بھی بہت زیادہ تھی، مگر سب بیکار و بیروزگار۔ سائنسداں اور ماہرین علم و ادب بکثرت تھے۔ مگر معاش کے ذرائع سب کے لئے معدوم تھے، وہی ویانا جس کے باشندے دولت میں جھومتے تھے۔ جنگ کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہو کر دربدر مارے مارے پھرنے لگے۔ انقلاب روزگار کا یہ حیرت ناک منظر تھا کہ اگرچہ یورپ کی دولت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی اور نہ ویانا کے رہنے والوں کے دل و دماغ میں کوئی خرابی آئی تھی مگر اس کے باوجود وہ بھکاریوں اور گداگروں کا ایک گروہ بن کر رہ گئے تھے۔ یہ حالت اس درجہ دردناک تھی کہ خود اتحادی اس کو دیکھ کر چیخ اٹھے اور امریکہ نے سابق بادشاہ کے محل میں ایک لنگرخانہ کھلوایا جہاں فاقہ کشوں کو مفت کھانا تقسیم ہوتا تھا، برطانیہ بھی دنیا کے ایک مہذب ترین شہر کی یہ بدحالی دیکھ کر متاثر ہوا، اور اس نے افلاس و بیروزگاری کی ماری ہوئی مخلوق کے لئے ایک بہت بڑی رقم وقف کی ـــــ لیکن جس صلحنامے نے اس "مہذب ترین شہر" کی یہ حالت کر رکھی تھی اس کو بدلنے کی طرف کسی نے توجہ نہ کی ـــــ گویا جڑ میں جو آگ ڈال دی گئی تھی اُسے نہ چھیڑا گیا۔ مگر جھلسے ہوئے پتوں پر پانی چھڑکا جانے لگا۔ زخموں کو بدستور باقی رہنے دیا گیا۔ مگر پٹیاں رگڑ رگڑ کر دھوئی جانے لگیں۔

اس ملک کے باشندوں نے اپنی اس بدحالی کے علاج کے لئے جرمنی کے ساتھ ملحق ہونا چاہا اس لئے کہ یہاں کے تمام باشندے نسلاً، لساناً اور تہذیباً جرمن تھے، مگر کہا گیا کہ صلحنامے کی رو سے یہ نہیں ہو سکتا، پھر انہوں نے اٹلی کے ساتھ زرِ تبادلہ (کرنسی) اور چنگی کے محصول میں متحد ہونے کی درخواست کی مگر فرانس، چیکوسلوواکیہ اور یوگوسلاویہ یہ گوارا نہ کر سکے کہ اٹلی کی طاقت بڑھے اس لئے یہ درخواست بھی صلحنامے کے خلاف قرار دے کر نامنظور کی گئی۔

الغرض یہ تھی پہلی جنگ عظیم کے بعد اُس آسٹریا کے پایۂ تخت کی حالت جہاں اب بھی پروفیسروں کی اتنی ہی بہتات تھی کہ آدھی دنیا کو تعلیم دے سکیں ڈاکٹر اتنے تھے کہ پورے یورپ کا علاج کر سکیں —— مگر حکومت کی ساخت ایسی تھی کہ یہ سب دانے دانے کو محتاج تھے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے رہے تھے۔

پایۂ تخت کی حالت تو یہ تھی۔ اب رہ گئے کسان و کاشتکار سو اُن کے پاس غلے کی پیداوار کافی تھی مگر بازار ندارد تھا۔ ویانا کا پایۂ تخت مفلس اور چاروں طرف اغیار —— قدرتاً آسٹریا کی معاشی حالت بُری طرح گر گئی۔ اس حالت میں وہ مجبور تھا کہ قرض لے کر کام چلائے۔ فرانس اور امریکہ کے پاس جنگ کے بعد دُنیا بھر کا سونا کھنچ کھنچ کر پہنچ چکا تھا۔ اس لئے یہاں کے سیٹھ ساہوکار ہر وقت قرض لینے والے کی تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ آسٹریا نے جیسے ہی ان کے آگے دستِ سوال دراز کیا، فوراً دعا مستجاب ہوئی اور قرض کا سیلاب آسٹریا کی حدود میں داخل ہونے لگا۔ آسٹریا جانتا تھا کہ یہ قرض، اس کی معاشی آزادی کو بالکل تباہ کر دے گا۔ مگر فاقہ کش آسٹریا کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اُسے کچھ پتہ نہ تھا کہ اس قرض کی ادائیگی کی صورت کیا ہوگی۔ مگر موت کے

مُنہ سے بچنے کے لئے وہ ہر خطرے کو مول لینے پر مجبور تھا

یہ حالت ۱۹۲۹ء تک جاری رہی اس کے بعد صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ پہلے بینک فیل ہوئے۔ پھر بازاروں پر اُداسی چھا گئی۔ یورپ کے دوسرے ممالک کی طرح آسٹریا نے بھی اپنی حالت کو سنبھالنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر کوئی خاطرہ خواہ کامیابی اُس وقت تک ناممکن تھی جب تک ورسیلز اور سینٹ جرمین کے معاہدوں سے اس کا اور اس کی ہمسایہ طاقتوں کا بال بال بندھا ہوا تھا۔ اسی دوران میں جرمنی میں ہٹلر اُبھرنا شروع ہوا۔ آسٹریا کو اپنے ہمسایہ بھائیوں کی اس بیداری میں کچھ آثار نجات نظر آئے۔ آسٹریا کی خواہش عرصے سے تھی کہ کسی طرح جرمنی سے الحاق ہو جائے، مگر ورسیلز کے فاتحوں کی اغراض، راہ میں حائل تھیں۔ لیکن جب ہٹلر کی نازی پارٹی نے کافی طاقت حاصل کر لی تو ۱۳ مارچ ۱۹۳۸ء کی صبح اچانک یہ خبر لائی کہ ہٹلر کی فوجوں نے آسٹریا پر یلغار بول کر اُسے جرمنی کا جزو بنا لیا ہے۔ آسٹریا نے اس تبدیلی کو بڑی آسانی سے قبول کر لیا۔ برطانیہ و فرانس اسوقت جنگ چھیڑنے کے لئے تیار نہ تھے اس لئے لفظی احتجاج کے سوا اور کچھ نہ ہوا —— اور آسٹریا کو عملاً جرمنی کا صوبہ تسلیم کر لیا گیا۔ مگر اس کے ڈیڑھ سال بعد ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا، اُس کے اسباب میں آسٹریا کے اس الحاق کو کافی دخل ہے

ہنگری

ہنگری میں زیادہ تر میگیار نسل کے لوگ بستے ہیں۔ ہنگری اگرچہ "آسٹریا ہنگری" کی متحدہ سلطنت کا ایک صوبہ تھا اور ایک بادشاہ کے ماتحت سمجھا جاتا تھا لیکن ۱۸۶۷ء میں ایک آئین کی رو سے اس کے باشندوں کو نظم و نسق میں اتنی زبردست خود مختاری دیدی گئی تھی کہ وہ خود کو عملاً آزاد ہی سمجھتے تھے جب ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہوئی تو ہنگری نے پوری وفاداری سے آسٹریا کا ساتھ دیا۔ لیکن اس سلطنت میں جو دوسری قومیں اور نسلیں بستی تھیں، اتحادیوں نے انھیں آزادی و خود مختاری دینے

کا وعدہ کرکے خانہ جنگی کا بازار گرم کرادیا۔ رومانوی، سلاوی، چیک وغیرہ اپنی آئندہ آزادی کی خاطر آسٹریا ہنگری کی حکومت کا تختہ الٹ دینے کی کوششوں میں کسی سے کم نہ تھے تاہم جب صدر ولسن کے نکات شائع ہوئے تو میگیار قوم نے اطمینان کی سانس لی اور یہ سمجھا کہ ان کی قومی حیثیت کو نقصان نہ پہنچے گا۔ لیکن ٹرائی نان کے صلحنامے کے بعد انھیں یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ میگیار کی ایک تہائی تعداد یوگوسلادیہ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ کی حدود میں شامل کردی گئی ہے۔[۱]

قومی نفسیات کا یہ ایک اہم پہلو ہے کہ قومیں موت گوارا کرسکتی ہیں، لیکن جن لوگوں پر کسی قوم نے حکمرانی و سرداری کی ہو اس کا محکوم و غلام بننا گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ میگیار قوم عرصے تک رومانوی چیک اور سلاوی وغیرہ نسلوں کو نیم جاہل و نیم مہذب سمجھ کر اُن پر آقائی کرچکی تھی، اس لئے جب اس آقائی کو غلامی میں بدلا گیا تو میگیار کی نظر میں دنیا تاریک ہوگئی۔ پھر سرب، چیک اور رومانیہ نے موقع پاکر اپنے پرانے آقاؤں سے بدلہ لینے میں بھی کسر نہ چھوڑی۔ اگرچہ التوائے جنگ کے عارضی صلحنامے پر دستخط ہوچکے تھے۔ اور ہنگری نے اپنی شکست کو تسلیم کرلیا تھا۔ مگر دوسری قوموں کی طرف سے میگیار کہلانے والی نسل پر لوٹ مار کا سلسلہ بدستور جاری تھا، ہر روز اس قوم کے ہزاروں لُٹے پٹے انسان ہنگری کے پایۂ تخت میں آتے تھے اور ظلم و غارتگری کی ہولناک داستانیں سناتے تھے۔ یہ لوٹ مار اتنی خوفناک تھی کہ چند ماہ کے اندر جو پناہ گزیں بوڈاپسٹ میں آکر جمع ہوئے ان کی تعداد سات لاکھ سے متجاوز ہوگئی ہنگری کی نئی حکومت کے لئے اس صورت حالات کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے وزیر اعظم نے تنگ آکر استعفا دیدیا۔ مگر استعفا دینے سے قبل ایک سوشلسٹ لیڈر،

---

[۱] دیکھو "معاہدۂ ٹرائی نان اور اس کے نتائج" (از ۱۹۱۹ء تا ۱۹۳۷ء) مرتبہ میکارنی

مسمی بیلا کُن (Bela Kun) کو قید سے رہا کرتا گیا۔ بیلا کن نہایت پرجوش و سرگرم کارکن تھا اور تنظیم کی زبردست قابلیت اپنے اندر رکھتا تھا۔ رہا ہوتے ہی اس نے اپنا کام شروع کیا اور چند ہی دن بعد ہنگری میں "اشتراکی جمہوریت" قائم کردی گئی۔ اتحادیوں نے یہ دیکھا تو انھیں سخت خطرہ پیدا ہوا خصوصاً فرانس بُری طرح گھبرا اُٹھا۔ دنیا کا کوئی سرمایہ دار ملک بھی اشتراکی سیلاب کو بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر فرانس تو چند اور وجوہ کی بنا پر بھی اس "فتنے" کو برداشت نہ کر سکتا تھا، اس لئے رومانیہ کو اُکسا کر ہنگری پر حملہ کرا دیا گیا نہتّے شکست خوردہ اور ابتر و منتشر ہنگری کے ہر ہر شہر اور ہر ہر قصبے میں رومانوی سپاہیوں نے خوب قتل و غارتگری مچائی۔ جب فرانس نے دیکھ لیا کہ اب ہنگری سے اشتراکیت کا قلع قمع ہو گیا، تو رومانوی کٹھ پتلیوں کا تار کھینچ لیا گیا اور فوجیں واپس آگئیں۔ ہنگری کو سمجھایا گیا کہ اس تباہی و بربادی کی ذمے داری صرف اشتراکی لیڈروں کی ناعاقبت اندیشانہ رہنمائی پر ہے۔ اس چیز نے ہنگری کے جوشِ غضب کا دھارا ایک دم اشتراکیت کے خلاف پھیر دیا۔ پھر چونکہ اشتراکیت کا قائدِ اعظم بیلا کُن اتفاق سے یہودی واقع ہوا تھا۔ اس لئے ہر یہودی کو اشتراکیت کا مجرم قرار دے کر بیدریغ قتل کیا جانے لگا۔ یہودیوں کی جانِ ناتواں پر یہ مشقِ ستم عرصے تک جاری رہی۔ ہنگری کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اتحادی فاتحوں کو خوش کر کے صلحنامے کی شرائط حسب مرضی حاصل کر سکے گا۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں ٹرائی نان کے مقام پر جو "مستقل صلحنامہ" ہوا اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔ اس صلحنامے میں یہی نہ تھا کہ ایک تہائی میگیار دوسروں کی حکومت میں دے دیئے گئے تھے، بلکہ یہ ہدایت بھی تھی کہ سابق شاہی خاندان ہیپس برگ میں سے کسی کو بادشاہ نہ بنایا جائے گا۔ ہنگری نے اس پر احتجاج کیا اور کہا کہ اپنے نظامِ سیاست کی نوعیت کا فیصلہ کرنے میں ہمیں کامل

خود مختاری ملنی چاہیے، مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ نئے ہنگری میں مقابلے کی مجال نہ تھی مگر پھر بھی احتجاج کے طور پر تخت شاہی کو خالی رکھا گیا اور ایڈمرل ہارا تھی نے نائب السلطنت (ریجنٹ) کے طور پر حکومت قائم کی۔ یہ بھی ایک نادر صورت حالت تھی۔ تخت موجود، نائب السلطنت موجود، مگر بادشاہ معدوم اصول حکومت شاہی مگر شاہ ندارد —— ہنگری دراصل اپنے اس طرز عمل سے "صلحنامہ ترتیب دینے والے فاتحوں" پر یہ امر واضح کر دینا چاہتا تھا کہ وہ اس صلحنامے سے مطمئن نہیں ہے اور اُسے جب بھی موقع ملے گا اس کو مسترد کرنے کی کوشش کرے گا چنانچہ ہنگری کی حکومت نے بار بار ان صلحناموں کو ناقابل عمل بنانے کی جدوجہد کی اور بار بار اس کا اعلان کیا کہ جب بھی موقع ہاتھ آئے گا، وہ جبر و تشدد سے کام لے کر اس کی دفعات کو بدل ڈالے گا۔

ہنگری کے مطالبات یہ تھے: (۱) چیکوسلوواکیہ اور یوگوسلاویہ میں جو میگیار بستے ہیں انھیں ہنگری میں شامل کیا جائے۔ (۲) ٹرانس سلوانیہ کا صوبہ جسے رومانیہ میں شامل کرایا گیا ہے، اُسے خود مختار بنایا جائے اور (۳) یوگوسلاویہ کے کروٹ، برگن لینڈ کے آسٹریائی اور مشرقی چیکوسلوواکیہ کے یوکرینی افراد سے "رائے عامہ" (Plebiscite) کے ذریعے یہ معلوم کیا جائے کہ وہ کس حکومت میں رہنا چاہتے ہیں۔

آسٹریا کی طرح ہنگری کی معاشی حالت بھی بہت خراب تھی۔ ایڈمرل ہارا تھی نے جب حکومت قائم کی تو مجبوراً پرانے زمیندارانہ نظام کو واپس لانا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری زمین صرف پچیس فی صدی زمینداروں کے حصے میں آئی اور پچھتر فی صدی کسان زمین کے مالک نہ ہونے کی وجہ سے سقیم الحال "کھیت مزدوروں" میں تبدیل ہو کر رہ گئے، آسٹریا کی طرح ہنگری کی نئی حکومت بھی بحری

راستے سے محروم کردی گئی تھی۔ صرف دریائے ڈینیوب ہی ایک دریائی راستہ تھا اور اس کی جو کچھ حالت تھی اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

ہنگری ۱۹۱۹ء کی نئی تقسیم سے مطمئن نہ تھا، اُسے شکایت تھی کہ میگیار نسل کی کثیر التعداد افراد دوسرے علاقوں میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اُسے یہ شکایت بھی تھی کہ ہیپس برگ خاندان کے کسی فرد کو بادشاہ نہ بنانے کی پابندی کیوں عائد کی گئی ہے، وہ موقع کا منتظر تھا اور یورپ میں ہر نئی گڑبڑ سے فائدہ اٹھانے کی خواہش دل میں لئے بیٹھا تھا کہ یکایک جرمنی سے طوفان اُٹھنا شروع ہوا ہنگری کی نفسیاتی کیفیت اس طوفان کا خیر مقدم کرنے کے لئے بہت موزوں تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء کے اعلانِ جنگ سے چند ماہ قبل فروری ۱۹۳۹ء میں اس نے جرمنی کے ساتھ مل کر روسی اشتراکیت کے خلاف ایک معاہدے پر دستخط کئے۔ جنگ کا اعلان ہونے پر وہ بظاہر غیر جانبدار رہا لیکن نومبر ۱۹۴۰ء میں جرمنی، اٹلی اور جاپان کے ساتھ اتحاد و دوستی کے معاہدے میں شرکت کرلی۔

جرمنی نے ہنگری پر بہت زور ڈالا کہ وہ اعلان جنگ کردے۔ مگر اس کی احتیاط پسندی نے یہ گوارا نہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی حالت ایسی رکھے کہ جو بھی فاتح ہو، اُس سے فائدہ اٹھا سکے، مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور مارچ ۱۹۴۴ء میں جرمن فوجوں نے ہنگری پر قبضہ کر کے اپنی مرضی کے مطابق ایک حکومت قائم کرادی[۱]۔

---

[۱] تفصیلات کے لئے دیکھو

(۱) ماڈرن ہنگری (از ۱۸۶۰ء تا ۱۹۲۰ء) مرتبہ ہارواتھ

(۲) تاریخ ہنگری مصنفہ کوساری۔ نیز مصنفہ زارک

(۳) "ہنگری" از مارس (۴) دی ریل ہنگری۔ (مطبوعہ ۱۹۳۹ء) از ٹیبر

پولینڈ

ایک خود مختار آزاد ملک کی حیثیت سے پولینڈ کا کوئی وجود انیسویں صدی کے نصف آخر سے نہ رہا تھا، اس کے کچھ حصے پر جرمنی قابض تھا اور کچھ روس کے ماتحت تھا، لیکن یہاں کے باشندے اس محکومی کے باوجود اپنے آپ کو ایک مستقل قوم سمجھتے رہے، اور یورپ کی دوسری قوموں کی طرح آزادی کے خواب دیکھتے رہے، ۱۹۱۴ء کی جنگ نے ان خوابوں کی تعبیر کا بہترین موقعہ فراہم کیا، اتحادیوں نے جرمنی اور آسٹریا، ہنگری کے خلاف پولینڈ کی تمام طاقتوں کو صف آرا کرنے کے لئے پولینڈ کو آزادی کا یقین دلایا، چنانچہ جب جرمنی کو شکست ہوئی تو نومبر ۱۹۱۸ء میں تقریباً ایک صدی کے بعد پولینڈ کی آزاد جمہوریت کو تسلیم کرنے کا اعلان ہوا اور جون ۱۹۱۹ء میں ورسیلز کی دستاویز نے اس اعلان پر مہر تصدیق ثبت کی

پل سوڈسکی اس آزاد پولینڈ کی آزاد جمہوریت کا پہلا صدر منتخب ہوا۔

پل سوڈسکی

پل سوڈسکی کو پولینڈ کی تاریخ میں وہی اہمیت حاصل ہے جو ترکی میں مصطفیٰ کمال کو ایران میں رضا شاہ کو یا مصر میں سعد زاغلول پاشا کو ہے

پل سوڈسکی دراصل لتھوانیا کا رہنے والا تھا، مگر اس کی ساری زندگی، پولینڈ کی آزادی کو قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں صرف ہوئی حتیٰ کہ خود اپنی جائے پیدائش لتھوانیا کا بہت بڑا رقبہ فتح کرکے پولینڈ میں شامل کیا، ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوا طالب علمی کے زمانے ہی سے اس میں قوم پرستی اور اشتراکیت پسندی کے جذبات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے روس کے ارباب اقتدار کی نگاہوں میں

۱؎ پولینڈ کی تاریخ اور قومی جدوجہد کے لئے دیکھو آؤٹ لائنز آف پولش ہسٹری از Dyboski اور ہسٹری آف پولینڈ از Haleki

ابتداہی سے کھٹکنے لگا تھا۔ ابھی نوجوان ہی تھا کہ اخراج کا حکم صادر ہوا اور چار سال تک وطن اور اہلِ وطن سے جدا ہو کر سائبیریا کے برفانی جنگلوں میں رہنا پڑا، واپس آنے پر بھی اپنی انہی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دن بعد پھر گرفتار ہوا، مگر اس بار جیل سے بھاگ نکلا اور بھاگ کر یورپ اور انگلستان میں گھومتا رہا۔ تیرہ چودہ سال اسی دشت نوردی میں گزرے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑنے پر واپس آیا اور جرمنی کا طرفدار ہو کر پول قوم کی ایک بہت بڑی فوج تیار کی۔ پل سوڈسکی بذات خود بہت بہادر دلیر اور مضبوط انسان تھا، اور فوجی تربیت بھی اس نے پائی تھی۔ اس کی کمانڈ میں پول فوج نے روس کے اقتدار پر پیاپے حملے کئے۔ پول چونکہ اپنی عظمت رفتہ کو واپس لانے اور زار کے مظالم کا انتقام لینے کے لئے لڑ رہے تھے۔ اس لئے ان میں بے حد جوش و جذبہ تھا اور آخر یہ جوش و جذبہ روسی شہنشاہیت کے نیم دلی سے لڑنے والے سپاہیوں پر غالب آگیا جرمنی اور آسٹریا ۱۹۱۸ء میں ہار گئے لیکن پولینڈ اپنے محاذ پر ڈٹا رہا اور برابر روسی فوجوں کو پیچھے دھکیلتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں آزاد پولینڈ کی جو جمہوریت قائم ہوئی اس کا پہلا صدر پل سوڈسکی کو بنایا گیا۔

روس کے اشتراکی انقلاب کی وجہ سے "اتحادی طاقتیں" پولینڈ کی جدوجہدِ آزادی کی حامی ہو گئی تھیں — اس لئے کہ یہ نئی حکومت ایک طرف تو روسی اشتراکیت کی لہروں کو وسط یورپ میں پھیلنے سے روک سکتی تھی اور دوسری طرف جرمنی کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کے سیلاب پر بھی بند باندھنے میں کامیاب ہو سکتی تھی چنانچہ ۱۹۱۹ء کی پیرس کانفرنس نے ورسیلز کے معاہدے میں جرمنی کا پورا مشرقی علاقہ اور روس کا مغربی علاقہ ملا کر پولینڈ کی نئی ریاست کا قیام تسلیم کیا تھا۔ لیکن پل سوڈسکی

یوکرین

نے ۱۹۲۰ء میں بالشویک روس پر حملے کر کے اپنی حدود کو روس کے اندر بہت دور تک بڑھا دیا اور "سفید روس" اور یوکرین کا ایک بہت

بڑا علاقہ پولینڈ میں شامل کر لیا۔ ورسیلز میں پولینڈ کی جو حدود متعین کی گئی تھیں اُن میں واقعی طور پر پول آبادی کی اکثریت تھی، مگر ۱۹۲۰ء میں روس کے جو نئے علاقے چھین کر پولینڈ کا جزو بنائے گئے، ان میں "سفید روسی اور "یوکرینی" قوم کے افراد کی اکثریت آباد تھی۔ علاوہ ازیں اسی سال پول فوج نے پل سوڈسکی کی کمانڈ میں لتھوانیا پر حملہ کر کے ولنا پر قبضہ کر لیا جس سے روس اور لتھوانیا کے درمیان پولینڈ کی حدِ فاصل قائم ہو گئی۔ مگر پولینڈ کی ان فتوحات پر نہ تو یوکرین کے باشندے مطمئن ہو سکے اور نہ لتھوانیا کے۔ یوکرینی قوم نے بار بار لیگ آف نیشن کو درخواستیں دیں کہ پریذیڈنٹ ولسن کے نکات کے بموجب پولستانی یوکرین کے ساٹھ لاکھ نفوس کو خود مختاری عطا کی جائے۔ ۱۹۲۳ء میں پل سوڈسکی نے جمہوریت کے صدر کی حیثیت سے ذمہ دارانہ طور پر اتحادیوں سے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ یوکرینی قوم کو خود مختار بنا دے گا۔ لیکن یہ وعدہ شرمندۂ ایفا نہ ہوا۔ اس کے برعکس یوکرین پر پولستانی فوج اور پولیس کے زور سے انتہائی تشدد و سخت گیری کے ساتھ حکومت کی گئی۔ ان کے مدارس و مکاتب توڑ دیئے گئے اور انھیں مجبور کیا گیا کہ اپنی زبان، اپنی روایات اور اپنی معاشرت کو خیرباد کہہ کر پولستانیوں کی تہذیب و زبان میں خود کو ضم کر ڈالیں۔ جنگ سے دو سال پہلے ۱۹۱۲ء میں یوکرین کی اس آبادی میں دو ہزار چار سو بیس اسکول تھے مگر پولینڈ کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ۱۹۲۸ء میں گھٹتے گھٹتے صرف سات سو پنتالیس رہ گئے۔

یوکرین کا جو علاقہ روس میں واقع تھا۔ وہاں ایک "خود مختار جمہوریت" قائم کی گئی۔ روس کے اشتراکی لیڈروں نے اعلان کیا کہ پولستان کو یہ حق نہیں ہے کہ یوکرین کے اتحاد میں خلل انداز ہو کر یوکرین کی آبادی پر بجبر حکومت کرے۔ روس چاہتا تھا کہ پولستانی یوکرین کو بھی روسی یوکرین میں شامل کر لیا جائے۔ غرض یوکرین کا

سوال روس اور پولینڈ کے درمیان ابتدا ہی سے مابہ النزاع بنا رہا۔ اور دنیا کی رائے عامہ بھی اس بارے میں پولینڈ کی حامی نہیں تھی۔

اسی طرح لتھوانیا بھی اپنے مفتوحہ علاقہ کو پولینڈ سے واپس لینا چاہتا تھا پولینڈ سے لڑنے کی جرأت تو اس نے کبھی نہ کی، البتہ اپنے غم و غصے کا اظہار اس طرح کیا کہ فی مین کے بندرگاہ میں پولستانی مال کی آمد و رفت بند کر دی۔ لیگ آف نیشن نے ان دونوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کئی بار کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی۔

روس اور لتھوانیا کی اس مخالفت کے علاوہ جرمنی کے تعلقات بھی شروع ہی سے پولینڈ کے ساتھ اچھے نہیں رہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۱۹ء کی "صلح کانفرنس" میں جرمنی کا ایک بہت بڑا علاقہ پولینڈ کے حوالے کر دیا گیا تھا جن علاقوں میں پول آبادی اکثریت کے ساتھ آباد تھی، ان کو پولینڈ میں شامل کر دینے پر جرمنی کو زیادہ اعتراض نہ تھا، اس کا اصل اعتراض اس پر تھا کہ پولینڈ کو سمندری ساحل دینے کی خاطر جرمن آبادی کا ایک وسیع علاقہ اسے کیوں دیدیا گیا ہے۔ اصل میں پولینڈ کی جو آزاد حکومت بنائی گئی تھی، اس کے پاس تجارتی سامان کی درآمد برآمد کے لئے کوئی بندرگاہ نہ تھا۔ اس نے لتھوانیا کو فتح کر کے لتھوانیا کی ساحل پر قبضہ کرنا چاہا۔ مگر اس میں ناکامی ہوئی تاہم ۱۹۱۹ء کی "صلح کانفرنس" نے پولینڈ کی

ڈان زگ

اس کمی کو یوں پورا کر دیا کہ جرمنی کے شمال میں ڈان زگ کا بندرگاہ جرمنی سے علیحدہ کر کے لیگ آف نیشن کی نگرانی میں دے دیا گیا اور اور پولینڈ کو اجازت دی گئی کہ وہ اس بندرگاہ تک پہنچنے کے لئے جرمن علاقہ میں پچاس میل لمبا خطہ گذرگاہ (کاریڈور) کے طور پر اپنے قبضے میں رکھے۔

ڈانزگ میں جرمن آبادی کی اکثریت تھی اور جب ہٹلر برسر اقتدار آیا تو وہاں

بھی نازی پارٹی بنائی گئی اور اندرونی نظم ونسق اسی پارٹی کے ہاتھ میں آگیا

ان تمام مخالفتوں کے باوجود پولینڈ کو فرانس کی زبردست حمایت حاصل تھی فرانس اپنی اغراض کے ماتحت پولینڈ کو آزاد ہی نہ دیکھنا چاہتا تھا بلکہ مکمل طور پر مسلح بھی کردینا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں دونوں کے درمیان دوستانہ معاہدہ ہوا اور اس کے دو سال بعد تیس کروڑ گولڈ فرانک (تخمیناً دس کروڑ روپیہ) پولینڈ کو قرض دیا گیا۔ پھر ۱۹۲۵ء میں فرانس نے مارشل فاک کو اپنا نمائندہ بنا کر پولینڈ بھیجا تاکہ دونوں کے مابین اتحاد ویکجہتی کے تعلقات اور زیادہ مضبوط ہوسکیں، اسی کے ساتھ ساڑھے تین کروڑ گولڈ فرانک (تقریباً سوا کروڑ روپیہ) کا مزید قرض دیا گیا، یہ رقم ڈان زگ کے مغرب میں ایک نیا بندرگاہ بنانے پر صرف ہوئی۔

گڈی نیا

ڈانزگ کی جرمنی آبادی کی وجہ سے پولستانیوں کو دقتیں پیش آتی تھیں، اس لئے انہوں نے مناسب سمجھا کہ سمندری گذرگاہ (کاریڈور) کے طور پر انھیں زمین کی جو پٹی سمندر تک ملی ہوئی ہے اس کے مغربی گوشے میں اپنا ایک بندرگاہ الگ بنالیں۔ اس بندرگاہ کے بنانے کا ٹھیکہ فرانسیسی ٹھیکے داروں کو دے دیا گیا۔[1]

۱۹۳۵ء میں پل سوڈسکی اس جہان کو خیرباد کہہ چکا تھا، یہی زمانہ تھا جب جرمنی میں نازی پارٹی کا ڈکٹیٹر، ہٹلر جرمنی کے جزو کل پر چھانا شروع ہوگیا تھا آخر ۱۹۳۹ء کے وسط میں جرمنی کی فوجوں نے پہلے ڈانزگ پر قبضہ کرلیا اور پھر

---

[1] دیکھو پولیٹکل ہسٹری آف پولینڈ از (Lewinski-Korwin) اور پولینڈ آف پلسوڈسکی از (Machray) اور پولینڈ (کی ٹو یورپ) از (Buell) (مطبوعہ لنڈن ۱۹۳۹ء)

پولینڈ کے اُس علاقے کو بھی واپس لینا چاہا جو ورسیلز کے معاہدے کی رو سے جرمنی سے کاٹ کر پولینڈ کو دے دیا گیا تھا۔ پہلی ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے باقاعدہ پولینڈ پر فوج کشی شروع کر دی۔ اس وقت تک چونکہ روس اور جرمنی میں صلح تھی، اس لئے روس خاموشی کے ساتھ بیٹھا تماشا دیکھتا رہا، مگر جب دو ہفتے کے بعد اُس نے دیکھا کہ جرمن فوجوں نے آدھے پولینڈ پر قبضہ کر لیا ہے تو اس نے بھی مغرب کی طرف سے اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ اس دو طرفہ مار کا نتیجہ یہ ہوا کہ ستمبر کے آخر تک پولینڈ کا پورا علاقہ روس و جرمنی کے قبضہ میں آ گیا۔ ۲۹ ستمبر کو ان دونوں طاقتوں نے اس کے حصے بخرے کر لئے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ سے قبل جو علاقہ جرمنی کے پاس تھا، وہ جرمنی نے لے لیا۔ اور جو روس کے قبضے میں تھا اُس پر روس نے تصرف کر لیا۔ لتھوانیا کو بھی چونکہ پولینڈ سے سخت شکائتیں تھیں اس لئے روس اور جرمن بڑی آسانی سے اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرانس و برطانیہ ۱۹۱۹ء کے صلحناموں کی اس توہین پر بہت چراغ پا ہوئے اور آخر اعلانِ جنگ بھی کر دیا گیا۔ مگر پولینڈ چاروں طرف سے مخالفوں کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا اس لئے کوئی مؤثر امداد نہ کر سکے، مگر اس کے دو سال بعد جون ۱۹۴۱ء میں جب جرمنی نے روس پر دھاوا بولا تو رفتہ رفتہ حالات کا رُخ پلٹنا شروع ہو گیا۔

بلغاریہ

بلغاریہ کو بھی ہنگری کی طرح ۱۹۱۹ء کے صلحناموں پر سخت ترین اعتراض رہا ہے۔ اسی بنا پر اسے "ریاست ہائے بلقان کا ہنگری" کہا جاتا تھا۔ بلغاریہ ۱۸۷۸ء تک ترکی حکومت میں شامل تھا، اس کے بعد اس نے آزادی کا اعلان کیا۔ ۱۹۱۲-۱۳ء میں "جنگ بلقان" کے موقعہ پر یہ ترکی کے خلاف لڑا۔ لیکن اگرچہ

ترکی اس جنگ میں ہار گیا مگر "دولِ عظمےٰ" کے پنچایتیوں نے اس کا بہت بڑا علاقہ یونان کے حصے میں لگا دیا۔ اسی زمانے میں سربیا کی حکومت نے مقدونیہ کے صوبہ پر قبضہ کرلیا۔ سالونیکا یونان نے لے لیا اور جنوبی ڈاب رُڈجا کا علاقہ رومانیا نے دبا لیا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں بلغاریہ جرمنی کے حلیفوں کا طرفدار تھا، اس لئے اس جنگ کے اختتام پر فاتح اتحادیوں نے بحر ایجین کا ساحلی علاقہ بھی بلغاریہ سے لے کر یونان کو دے دیا۔

ان حالات میں بلغاریہ کی سیاسی ذہنیت جو کچھ ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے یوگوسلاویہ میں اس کا جو علاقہ شامل تھا، اُسے واپس لینے کے لئے سخت ترین جد و جہد جاری تھی، اسی طرح یونان نے بھی جن علاقوں کو لے لیا تھا، انھیں واپس لینے کی ٹیس برابر بلغاریوں کے دل میں اُٹھتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۱ء میں جب جرمنی اور اٹلی نے مل کر یونان کو زیر کرنا شروع کیا تو بلغاریہ بڑی آسانی سے محوری طاقتوں کی طرف آگیا[1]۔

چیکوسلواکیہ

چیکوسلواکیہ کی پوری ریاست آسٹریا ہنگری سے قطع کر کے بنائی گئی تھی۔ صرف شمال میں "بالائی سلیشیا" کا تھوڑا سا علاقہ جرمنی سے لیا گیا تھا۔ ساٹھ سے لے کر ستر فی صدی تک یہاں کی آبادی میں چیک اور سلوواک نسل کے افراد بستے ہیں اور اسی وجہ سے اس کا نام "چیک وسلوواکیہ" رکھ کر ان دونوں نسلوں کو خود مختاری دی گئی۔ لیکن بیس فی صدی جرمن آبادی جو زیادہ تر شمال کے علاقہ سوڈٹین لینڈ میں بستی ہے

---

[1] دیکھو بلقان داسٹوری آف دی نیشنز سیریز انیز ہسٹری آف دی فرسٹ بلگیرین ایمپائر از رنسی مین

اُسے بھی اسی علاقہ میں شامل کر دیا گیا۔ دس فی صدی میگیار اور روتھینی نسل کے لوگوں کی قسمت بھی اسی کے ساتھ نتھی کر دی گئی۔ اس طرح گویا اس نئی آزاد حکومت میں چیک اور سلوواک کے علاوہ دوسری قوموں کی ایک تہائی تعداد کو ضم کر کے نئی مشکلات پیدا کر دی گئیں۔ پھر یہ اقلیتیں کچھ اس طرح بکھری ہوئی بھی نہ تھیں کہ ان کو مجبوراً شامل کرنا پڑا ہو، اس کے برعکس جرمن آبادی کی کثیر تعداد ایک مخصوص علاقے میں بستی تھی، اسی طرح میگیار قوم کے فرزند بھی ایک ہی جگہ اکٹھے آباد تھے اور اس لحاظ سے "قومی خود اختیاری" کے اصول پر ان علاقوں کو جرمنی اور ہنگری کے ساتھ شامل ہونا چاہیے تھا، لیکن فرانس کی مصلحت اندیشیوں کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔ میگیار قوم کا جو علاقہ چیکوسلوواکیہ میں شامل کیا گیا تھا۔ وہاں اس قوم کے شرفا و عمائدین بستے تھے، اس لئے انھیں اس تقسیم پر سخت ترین اعتراض تھا۔ اس سلسلے میں ہنگری کی حکومت کا ایک مستقل احتجاج اُس وقت تک رہا، جب تک ۱۹۳۹ء میں چیکوسلوواکیہ کی ریاست کو جرمنی نے "یادگارِ پارینہ" نہ بنا دیا اور جس کے نتیجے میں میگیار علاقہ ہنگری کو نہ مل گیا۔

چیکوسلوواکیہ کی نئی حکومت بنانے کی اصل غرض یہ تھی کہ "آسٹریا ہنگری" کے تین چوتھائی سے زیادہ صنعتی علاقے اور اسلحہ سازی کے بڑے بڑے کارخانے جن صوبوں میں واقع تھے اُن کو الگ کر لیا جائے اور پھر ان صوبوں میں دو چار صوبے اور ملا کر ہنگری کی نئی حکومت کے چاروں طرف ایک ٹھوس دیوار کھڑی کر دی جائے تاکہ ایک تو ہنگری کا اتحاد دوسرے ممالک سے ناممکن ہو جائے اور دوسرے معاشی و صنعتی اعتبار سے وہ کبھی طاقتور نہ ہو سکے۔ اس تقسیم کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ چیکوسلوواکیہ کی نئی ریاست بہت جلد ایک مالدار حکومت بن گئی۔ زراعت کے لحاظ اس کو جو علاقے ملے تھے وہ بہت زرخیز تھے، اس لئے کھانے پینے کی

چیزوں میں یہ کسی کا محتاج نہ رہا۔ لیکن اس کی دولت مندی کا اصل سرچشمہ صنعت (انڈسٹری) تھی "آسٹریا ہنگری" کی عظیم الشان سلطنت کے تمام صنعتی علاقوں اور کارخانوں کو ہڑپ کر لینے کے بعد قدرتاً چیکوسلوواکیہ کی صنعتی حالت کو اچھا ہو جانا ہی چاہئے تھا۔ چنانچہ چیکوسلوواکیہ بہت ہی معمولی سی کوشش سے یورپ کی سب سے بڑی صنعتی طاقت بن گیا۔ یہاں سے مشینیں، سوتی اور اونی کپڑے، چینی اور شیشے کے برتن بہت بڑی مقدار میں برآمد کئے جاتے تھے۔ باٹا کا کارخانہ جس سے کروڑوں جوتے ہر سال باہر بھیجے جاتے تھے۔ یہیں واقع تھا جس نے "صنعتی ظلم" میں چنگیز کو اور سرمایہ اندوزی میں فورڈ کو مات کر رکھا تھا۔

سرسبزی و آسودہ حالی کی وجہ سے چیکوسلوواکیہ کی حکومت آخر وقت تک بہت مضبوط و مستحکم رہی۔ ماسارائک اور بے نیز ابتدا سے لے کر انتہا تک اس کے اقتدار کے مالک رہے اور بار بار انتخاب میں کامیاب ہو کر حکومت کا کاروبار سرانجام دیتے رہے۔ حکومت کی اس یکسانیت کی وجہ سے چیکوسلوواکیہ کی سیاسی اور معاشی پالیسی ہم آہنگی کے ساتھ ترقی کرتی رہی۔[ل]

لیکن چیکوسلوواکیہ کے قبضے میں سمندر تک جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا چاروں طرف سے اس کی سرحدوں پر زمین کا قفل لگا ہوا تھا اور سمندر کی لہروں تک اس کی رسائی نہ تھی جو ایک صنعتی ملک کے لئے سخت نقصان رساں بات ہو۔ اس نقصان کی تلافی اس طرح کی گئی کہ چیکوسلوواکیہ کے جو دریا جرمنی سے گذرتے ہوئے

[ل] دیکھو چیکوسلوواکیہ (جمہوریت کے بیس سال) مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۴۰ء از کرینر۔ نیز دیکھو "فارین پالیسی آف چیکوسلوواکیہ" (از سنہ ۱۹۱۸ء تا سنہ ۱۹۳۵ء) از جان (مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۳۷ء)

سمندر تک پہنچے تھے، ان کو "بین الاقوامی" نگرانی میں لیا گیا (یعنی عملاً فرانس کی نگرانی میں) اور چیکوسلوواکیہ کو ان کے ذریعے اپنا سامان سمندر تک، لانے لے جانے کا موقعہ دیا گیا۔

چیکوسلوواکیہ کی نئی ریاست چونکہ جرمنی اور "آسٹریا ہنگری" سے کاٹ کر بنائی گئی تھی، اس لئے اپنے ان ہمسایوں کے انتقام کا خطرہ اسے روز اوّل ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس خطرے کی سب سے بڑی حفاظت فرانس کی طاقت تو تھی ہی جن نے صلحناموں کی دفعات کے ذریعے کافی استحکامات کر رکھے تھے، لیکن مزید احتیاط کے خیال سے چیکوسلوواکیہ نے رومانیہ اور یوگوسلاویہ سے مل کر مودت واتحاد کا ایک معاہدہ بھی کر لیا تھا جو "معاہدہ صغیر" (Little Entente) کے نام سے مشہور ہوا۔ رومانیہ اور یوگوسلاویہ کی عظمت وشوکت کی عمارت بھی چونکہ آسٹریا ہنگری کے آثار شکستہ ہی پر رکھی گئی تھی، اس لئے چیکوسلوواکیہ کے ساتھ ان کا پیمانِ اتحاد بالکل قدرتی چیز تھی۔ تینوں نے مل کر یہ عہد کیا کہ جو صلحنامے ہو چکے ہیں، ان پر نظر ثانی کبھی نہ ہونے دیں گے اور ہنگری کے مطالبات کے خلاف ہمیشہ متحدہ آواز اٹھائیں گے۔ اس معاہدے کے بعد ہنگری کی طرف سے کافی اطمینان حاصل ہو گیا اور چیکوسلوواکیہ کو اپنی صنعتی پیداوار کے لئے وسطِ یورپ کا پورا بازار ہاتھ آ گیا۔[۱]

لیکن جرمنی کو مطمئن کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک تو سوڈیٹن لینڈ نام کا پورا ضلع جرمن آبادی کی اکثریت پر مشتمل تھا، دوسرے جرمنی کی اقتصادیات

---

[۱] چیکوسلوواکیہ کی سیاسی ومعیشی تاریخ کے لئے دیکھو "ہسٹری آف دی چیکس اینڈ سلوواکس" (مطبوعہ لندن ۱۹۴۳ء) اور "چیکوسلوواکیہ (دی لینڈ اینڈ اٹس پیپلز)" از ہالینڈ (مطبوعہ لندن ۱۹۳۱ء)

کو فرانس کی اس دست پروردہ حکومت سے سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ آخر اکتوبر ۱۹۳۸ء میں جرمنی نے سوڈیٹن لینڈ کو بزور چھین لیا۔ برطانیہ و فرانس نے یہ دیکھا تو تکتے رہ گئے لیکن جرمنی کے تیور دیکھ کر معاملے کو رفع دفع کرتے ہی بن پڑی اور میونخ میں بیٹھ کر جرمنی کی اس فتح کو جائز قرار دینے کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن جرمنی کو اپنی سابقہ طاقت واپس لانے کے لئے سوڈیٹن لینڈ سے کچھ زیادہ چاہیئے تھا۔ دراصل چیکوسلوواکیہ کی نئی حکومت ہی جرمنی کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹک رہی تھی۔ چنانچہ مارچ ۱۹۳۹ء میں چیکوسلوواکیہ پر باقاعدہ چڑھائی شروع کر دی گئی، دو ہی دن میں پورا علاقہ جرمنی کے قبضے میں تھا۔ ۱۶ مارچ کو ہٹلر نے ایک فرمان جاری کیا جس میں اعلان کیا گیا کہ آج سے چیکوسلوواکیہ کو جرمن کا زیر حمایت علاقہ قرار دیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس ملک کے دو ٹکڑے کئے گئے: ایک میں صرف چیک قوم کی حکومت بنائی گئی اور دوسری میں سلوواک قوم کو حکمراں تسلیم کیا گیا۔ ان دونوں ریاستوں کو خود اختیاری دی گئی اور پارلیمنٹ باقی رکھی گئی لیکن اقتدار و اختیار کا آخری سرچشمہ جرمن پارلیمنٹ کو قرار دیا گیا۔ معاملات خارجہ اور دفاع کی نگرانی بھی جرمنی کو عطا کی گئی، ریل، تار گھر، ٹیلی فون اور ڈاک خانے بھی جرمنی کے تصرف میں رکھے گئے مزید براں چیکوسلوواکیہ کے تمام بینکوں کو جرمن بینک سے متعلق کر دیا گیا اور سکہ جرمنی کا نافذ کیا گیا۔[۱]

ہنگری اس صورت حالات سے بہت خوش ہوا اور جرمنی نے اُسے مطمئن کرنے کے لئے روتھینیا کا وہ علاقہ اس کے حوالے کر دیا جس میں میگیار قوم کی اکثریت ہے اور جس کو چیکوسلوواکیہ میں شامل کر دینے کی وجہ سے ۱۹۱۹ء کے صلحناموں پر ہنگری کو سخت اعتراض تھا۔

---

[۱] دیکھو چیکوسلوواکیہ: "دی فرسٹ یوروپین پروٹیکٹوریٹ آف جرمنی" (مطبوعہ لندن ۱۹۴۲ء) اور "دی چیک انڈر نازی رول" (ایضاً)

لیکن انقلابات کی گردش نے حالات کی اس نوعیت کو بھی باقی نہ رہنے دیا[1]

رومانیہ

۱۹۱۸ء سے رومانیہ ایک چھوٹا سا علاقہ تھا جو ۱۸۷۸ء تک سلطنت عثمانیہ کے ماتحت تھا لیکن اس کے بعد ترکی کے انتشار و کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی خود مختاری کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو یہ ترکوں کی مخالفت میں اتحادیوں کا طرفدار ہو گیا۔ جرمن فوجوں نے اسے بُری طرح شکست دے کر اس سے اطاعت منوالی۔ لیکن جب جرمنی کی طاقت کمزور ہوئی اور اُس کی شکست کے آثار صاف نظر آنے لگے تو التوائے جنگ کے صلحنامے پر دستخط ہونے سے صرف دو دن پہلے ۹؍ نومبر کو رومانیہ نے پھر جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، اور اس طرح جب "صلح کانفرنس" منعقد ہوئی تو ایک فاتح ساتھی کی حیثیت سے اس میں شریک ہوا اور مالِ غنیمت میں سے اپنا حصہ مانگا۔ امید کے مطابق یہ حصہ اُسے دیا گیا اور آسٹریا ہنگری اور بلگیریا کا ایک وسیع علاقہ اس کے نصیب میں آیا۔ اِدھر روس کے انقلابی انتشار سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۱۹ء میں اس نے روس کے ایک زرخیز صوبہ بے سرابیا پر بھی قبضہ جمالیا اور اس طرح اس کی حدود مملکت پہلے سے دوگنی ہو گئیں۔

بے سرابیا کا جو صوبہ رومانیہ نے بزور شمشیر فتح کیا تھا، وہاں کے باشندے رومانیہ کے مقابلے میں بالشویک روس سے اتحاد پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء

---

[1] اس دوران میں جیکوسلواکیہ کی حالت جو کچھ رہی اس کی تفصیلات کے لئے دیکھو "جیکوسلواکیہ ان یوروپین ہسٹری" از تھامسن (مطبوعہ ۱۹۴۳ء)

میں یہاں کی جورائے عامہ ووٹ کے ذریعے حاصل کی گئی تھی، اس میں طے پایا تھا کہ یہ صوبہ بالشویک جمہوریت کے ساتھ ملحق ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب رومانیہ نے اس پر قبضہ کر لیا تو اگرچہ روس اپنی اندرونی الجھنوں کی وجہ سے رومانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ تو نہ کر سکا مگر اس نے اس علاقہ کو رومانیہ کا صوبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ تھا کہ روس نے اعلان کیا کہ جب بھی ممکن ہوگا رومانیہ کی اس غاصبانہ ملکیت کے خلاف روس ہتھیار اٹھا سکے گا۔ اس چیز نے رومانیہ کو روس کی طرف سے سخت بے چین بنا دیا تھا اور اگرچہ روس نے یہ یقین دلایا تھا کہ وہ جبر و طاقت کی مدد سے اس صوبے کو چھیننے کی کوشش کبھی نہ کرے گا، پھر بھی رومانیہ کو روس سے سخت خطرہ لاحق تھا، جس کی وجہ سے اشتراکیت کی قسم کی ہر تحریک پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ جب مسولینی نے فسطائیت کا جھنڈا بلند کیا اور اٹلی میں تحریر و تقریر پر پابندیاں لگائی گئیں، تو رومانیہ میں بھی اس کی تقلید کرنے والے پیدا ہوئے اور "سیاہ قمیص" کا زور یہاں بھی ہونے لگا مگر ۱۹۳۹ء میں جب جرمنی نے روس سے صلح کرکے ورسیلز کی دفعات کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو روس نے بھی موقع پاکر بے سرابیا میں اپنی فوجیں داخل کرکے اسے رومانیہ سے واپس لے لیا۔ مگر جب ۱۹۴۱ء میں روس اور جرمنی میں ٹھن گئی تو قدرتاً حالات نے دوسرا رخ اختیار کرنا شروع کر دیا۔[1]

---

[1] رومانیہ کی سیاسی تحریکات اور تاریخ کے لئے دیکھو

(۱) یونائیٹڈ رومانیہ از کلارک

(۲) پالٹکس اینڈ پولیٹکل پارٹیز ان رومانیا (ایضاً)

(۳) تاریخ رومانیہ از Seton- Watson

یوگوسلاویہ

یوگوسلاویہ کی نئی مملکت سربیا کی سابق حکومت میں "آسٹریا ہنگری" کے کچھ صوبوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی، ان صوبوں کے جوڑنے سے پہلے اس کا رقبہ ۳۷ ہزار مربع میل تھا۔ لیکن اس کے بعد ۹۵ ہزار ہو گیا۔ یعنی دو گنے سے زائد، اس بڑھے ہوئے رقبے میں مانٹی نیگرو کی سابق حکومت، کا علاقہ بھی شامل تھا، سربیا اور مانٹی نیگیرو دونوں حکومتیں ۱۸۷۸ء تک ترکی کے ماتحت تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے بغاوت کی اور اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں دونوں حکومتیں اتحادیوں کی طرف تھیں مگر دونوں نے بُری طرح شکست کھا کر دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ لیکن بعد میں جرمنی اور آسٹریا ہنگری کی شکست نے ان کی قسمت کا پانسا بھی پلٹ دیا۔ ۱۹۱۹ء کی "صلح کانفرنس" میں مانٹی نیگیرو کو سربیا کے ساتھ ملحق کیا گیا اور پھر آسٹریا ہنگری کی کروٹ اور سلووین قوم کے علاقے کو بھی اس میں ضم کر کے اولاً اس کا نام "سرب، کروٹ اور سلووین کی سلطنت" تجویز ہوا، مگر ۱۹۲۹ء میں "یوگوسلاویہ" کا مختصر نام دیا گیا۔

سرب اور کروٹ کی کشمکش

یوگوسلاویہ کی اس نئی حکومت میں سرب قوم کے افراد کی تعداد صرف چھیالیس فی صدی تھی، مگر اس کے باوجود بادشاہ بھی سرب ہی تھا اور حکومت بھی سرب ہی کے ہاتھ میں تھی اور حکمرانی بھی سربیوں ہی کے مفاد میں کی جاتی تھی۔ سرب چاہتے تھے کہ اس نئی مملکت کے ہر گوشے کو سربی رنگ میں رنگ دیں۔ اس صورتِ حالات سے کروٹ قوم کو سخت شکایت پیدا ہوئی۔ کروٹ اپنے کو سرب کے مقابلے میں زیادہ مہذب، زیادہ شائستہ اور زیادہ تعلیم یافتہ سمجھتے تھے۔ اس

لئے سرب کی ماتحتی انھیں پسند نہ آئی۔ سربیوں نے کروٹ کو مطمئن کرنے کے لئے حکومت میں کچھ حصہ دینا طے کیا مگر یہ حصہ کروٹ کو مطمئن نہ کرسکا۔ اور ان کی جماعت نے احتجاجاً اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر کروٹ کا مشہور لیڈر ریڈی ٹیب (Raditeb) جیل میں بند کردیا گیا۔ مگر جب اس سے کچھ مفید نتیجہ نہ نکلا تو سمجھوتہ کرکے رہا کیا گیا اور وزارتِ تعلیم کا قلمدان اُسے سونپا گیا۔ اب کروٹ نے حکومت میں حصہ لینا شروع کیا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی پارلیمنٹ سرب اور کروٹ کی باہمی سخت کلامیوں کا اکھاڑہ بن کر رہ گئی۔ یہ سخت کلامی اکثر اوقات، الفاظ سے گذر کر گھونسوں، لاتوں اور مکّوں تک پہنچ جاتی تھی اور پارلیمنٹ ہال میں سخت ادھم مچ جاتا تھا۔ اسی قسم کے ایک جنگ وجدال کے موقعہ پر ۱۹۲۸ء میں ایک سرب ممبر کا جوش گھونسوں سے بھی آگے بڑھ گیا اور اُس نے عین پارلیمنٹ کے فرش پر ریوالور سے ایک کروٹ ممبر ریڈچ کو گولی ماردی جس کے نتیجے میں اس نے وہیں پھڑک کر دم دیدیا اس واقعہ نے کروٹ قوم کے جوش وخروش کو بے پناہ طور پر بڑھا دیا، ریڈچ کو "شہید قوم" قرار دیا گیا۔ اور لاکھوں کروٹ نے اس کے جنازے میں شرکت کرکے اپنی قوم میں غم وغصہ کا ایک خوفناک طوفان بپا کردیا۔

اس افراتفری سے فائدہ اٹھاکر بادشاہ نے ۱۹۲۹ء میں آئین کو معطل کردیا اور ایک ڈکٹیٹر کی طرح ملک پر حکومت کرنے لگا۔ سیاسی جماعتوں میں صرف ایک جماعت کو جائز قرار دے کر باقی ہر قسم کی مخالفت کو "غیر قانونی" قرار دیا گیا۔ یہ ڈکٹیٹری ۱۹۳۱ء تک رہی۔ اس کے بعد ایک محدود شکل میں آئینی حکومت کو واپس لایا گیا۔ لیکن کروٹ قوم نے اپنے "ڈکٹیٹر بادشاہ" کی زندگی کا خاتمہ کردینا طے کرلیا تھا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں جب یہ پیرس کی ایک اہم کانفرنس میں شرکت

کے لئے جا رہا تھا، راستے میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے مرنے پر اس کا بیٹا پیٹر تخت پر بٹھایا گیا مگر چونکہ اس کی عمر گیارہ سال سے زائد نہ تھی، اس لئے نظامِ حکومت ایک نائب سلطنت (ریجنٹ) کے ہاتھ میں دیا گیا۔ اس کے بعد کروٹ کو مطمئن کرنے کی کوشش پھر شروع ہوئی مگر قومیت کے جذبات کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس میں کسی دوسرے عنصر کی کھپت نہیں ہو سکتی۔ سرب اور کروٹ دونوں اپنی اپنی قومیت پر نازاں تھے اور دونوں اپنے تہذیبی، نسلی اور قومی خصائص سے ایک انچ ادھر اُدھر ہونے کو تیار نہیں تھے۔ ایسی صورت میں اتحاد کی فضا کا پیدا ہونا سخت دشوار تھا۔ پھر لطف یہ تھا کہ یوگوسلاویہ میں صرف سرب اور کروٹ ہی کا سوال نہیں تھا بلکہ ان کے علاوہ یہاں دس قومیں اور بھی بستی تھیں، گویا بارہ مختلف قوموں کا پیوند لگا کر اس حکومت کی گدڑی تیار کی گئی تھی۔ اس گدڑی میں مانٹی نیگرو اور بلغاریہ کے باشندوں کا جو پیوند تھا، وہ سخت نالاں تھا اور بلغاریہ کی حکومت سے علیحدہ کئے جانے پر اس میں سخت اضطراب تھا۔ اسی طرح رومانوی نسل کے لوگ رومانیہ سے الگ ہونے پر شاکی تھے۔

سرب اور کروٹ کی کشمکش روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر اگست ۱۹۳۹ء میں کروٹ اکثریت کے علاقوں کا نظم و نسق علیحدہ کر کے کروٹ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس نئے خود مختار صوبے کا نام بے نو دینا کروشیا (Banovina-Crotia) رکھا گیا اور زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، جنگل معدنیات، حفظانِ صحت، تعلیم اور عدالت و قانون سازی کے کامل اختیارات اس صوبے کو تفویض کئے گئے۔ البتہ خارجی معاملات، فوج، خارجی تجارت دفاع (ڈیفنس) اور مذہب کے محکمے مرکزی حکومت کے تحت رکھے گئے۔

یوگوسلاویہ کی نئی حکومت کو قائم کرنے کا مطلب دراصل یہ تھا کہ اٹلی کے

بلند حوصلوں پر ایک بند باندھا جائے اور ڈل ماشی ساحل پر اٹلی کو قابض نہ ہونے دیا جائے۔ ۱۹۳۹ء کی دوسری جنگ عظیم میں اٹلی کے شامل ہونے کی ایک بہت بڑی وجہ ترغیب یہی تھی کہ یوگوسلاویہ کے ان علاقوں پر قبضہ کرلیا جائے۔ چنانچہ جب ۱۹۴۱ء میں جرمن فوجوں نے یوگوسلاویہ پر قبضہ کیا تو فوراً اس کے حصّے بخرے کر لئے گئے اور مانٹی نیگیرو کے علاقے کو آزاد قرار دے کر اٹلی کی "حمایت" میں دے دیا گیا

یوگوسلاویہ کا علاقہ زیادہ تر پہاڑی ہے۔ سمندر کے ساحل کے قریب اونچے اونچے ناقابل عبور پہاڑ کھڑے ہیں جن میں صرف دو وادیاں آمد و رفت کے قابل ہیں انہی وادیوں میں سے ایک پر فیوم کا بندرگاہ ہے اور دوسری پر اسپلٹ کا۔ فیوم کو ۱۹۱۹ء "صلح کانفرنس" میں "آزاد شہر" بنایا گیا تھا، مگر مسولینی نے برسر اقتدار آنےکے بعد یوگوسلاویہ سے اندر ہی اندر کچھ سانٹھ گانٹھ کر کے اسے اٹلی میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد صرف اسپلٹ کا بندرگاہ ہی یوگوسلاویہ کے پاس رہ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دریائے ڈینیوب اگرچہ آمد و رفت کا ایک اچھا راستہ تھا۔ مگر یہ — بلگیریا اور رومانیہ سے ہو کر گذرتا تھا۔

ان وجوہ کی بناء پر یوگوسلاویہ کی نئی حکومت ابتداء ہی سے بہت غریب رہی اور ابتداء ہی سے ملکی ترقی کے پروگرام کے لئے اسے قرض لینے کی ضرورت پیش آئی قرض دینے والے مہاجنوں میں سب سے پہلا نمبر فرانس کا تھا اور دوسرا امریکہ کا۔ ان قرضوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی صنعت و تجارت پر فرانس اور امریکہ قابض ہو گئے۔ یہ نظارہ اٹلی اور جرمنی کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ آزاد یوگوسلاویہ کو برداشت کر سکتے تھے لیکن فرانس اور امریکہ کی مالی محکومی میں جکڑا ہوا یوگوسلاویہ ان کی معاشی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہا تھا۔ اٹلی اور جرمنی کی قدرتی خواہش یہ تھی کہ وسط یورپ کی تجارت و صنعت پر وسط یورپ کی طاقتوں

ہی کا تصرف ہونا چاہیئے۔ ۱۹۴۱ء میں یوگوسلادیہ پر قبضہ کر کے اسی خواہش کی تکمیل کی گئی تھی۔ مگر چونکہ بہت سے دوسرے محرکات وعوامل کو نظر انداز کر دیا گیا، اس لئے نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔[1]

بحر بالٹک کی نئی ریاستیں

جب ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہوئی تو روس کا شمار "اتحادیوں" کی صف میں ہوتا تھا، اور برطانیہ وفرانس اس پر پورا بھروسہ رکھتے تھے۔ لیکن جب ۱۹۱۷ء میں جرمنی سے شکست کھانے پر زار کی شہنشاہیت کا تختہ اُلٹا اور بالشویک انقلاب کے لیڈروں نے بساطِ سیاست پر قبضہ جمانا شروع کیا تو اتحادیوں نے روس کی مخالفت شروع کر دی، مگر جب اشتراکی انقلاب کا سیلاب کسی طرح رکتا ہوا نظر نہ آیا تو قومی خود اختیاری کے اصول پر نئی ریاستیں قائم کرنے کا جو حربہ جرمنی کو کمزور کرنے کے لئے وسطی یورپ میں استعمال کیا جا رہا تھا، اسی کو روس میں بھی شروع کر دیا گیا چنانچہ ہارے ہوئے جرمنی کے باقی تمام اگلے پچھلے عہد نامے توڑ دی کی ٹوکری کی نذر کر دیئے گئے، مگر روس کو شکست دینے کے بعد برسٹ لٹافسک کے مقام پر روس وجرمنی کا جو معاہدہ ہوا تھا اور جس میں آدھی درجن کے قریب نئی ریاستیں روس سے کاٹ کر بنائی گئی تھیں، اُسے جوں کا توں باقی رکھا گیا۔

اس معاہدے کی رو سے مغربی روس کے صوبوں کو چھ مستقل ریاستوں میں تبدیل کرنا طے ہوا تھا۔ ان میں سے صرف یوکرین کی ریاست تو نہ بن سکی، باقی سب بن گئیں

---

[1] دیکھو "یوگوسلادیہ" از Ellison

[2] ایضاً از Patterson

تاہم یوکرین کا بہت بڑا حصہ پولینڈ نے دبالیا اور "اتحادیوں" نے اُسے تسلیم کرلیا روس اس زمانہ میں اپنی اندرونی مشکلات میں پھنسا ہوا تھا، اس لئے اس نے اگرچہ ان نئی ریاستوں کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کیا، تاہم یہ یقین بھی دلایا کہ بزورِ شمشیر اِن پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ لیکن پروپیگنڈے اور سیاسی تحریکات کے زور سے "پُرامن داخلے" کی جدوجہد کا دروازہ کُھلا رکھا گیا۔

فن لینڈ روس کے مغربی ساحل پر فن لینڈ کا صوبہ بحر بالٹک تک پہنچنے کا بہترین راستہ تھا۔ چنانچہ جب ۱۹۱۸ء میں اس کی آزادی تسلیم کی گئی تو روس کو سخت پریشانی ہوئی۔ مگر جب روس کی فوجی طاقتیں ناکام رہیں تو اندرونی پروپیگنڈے کا حربہ استعمال کیا گیا اور اشتراکیت کی حمایت میں رائے عامہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جس سے فن لینڈ کی سیاست رفتہ رفتہ دو مختلف جماعتوں میں بٹنے لگی: ایک اشتراکیت پرست، اور دوسری وطن پرست، لیکن جب روس کی بیرونی طاقت نے اشتراکیت کے حامیوں کی حمایت کرنی شروع کی تو وطن پرستوں کو سخت خطرہ لاحق ہوا، اور ۱۹۳۰ء میں اشتراکی جماعت بنانا، اشتراکی کتابیں پڑھنا اور اشتراکی عقائد کی تبلیغ کرنا قانوناً جرم قرار دیدیا گیا۔

فن لینڈ اگرچہ ایک صدی سے روس کا ماتحت تھا اور اس سے قبل بھی صدیوں تک سویڈن اور روس کی دو طاقتوں کے درمیان ہمیشہ موضوعِ رقابت بنا رہا تاہم اس کی نسلی اور قومی خصوصیات ہمیشہ باقی رہیں اور جب قومیت کے نام سے جمہوری سیاست کا نیا اصول عام ہونا شروع ہوا تو فن لینڈ کے عوام پر بھی اس نے جادو کا کام کیا۔ اتحادیوں نے اشتراکی روس کو کمزور کرنے کے لئے اس سے فائدہ اُٹھایا اور نئے روس نے مجبوراً سرِ تسلیم خم کردیا[۱]

---

[۱] دیکھو نیشنلزم ان ماڈرن فن لینڈ از Wuoriuen

روس کے لئے ایک وجہ تسلی یہ بھی تھی کہ فن لینڈ، بحر بالٹک کے شمالی ساحل پر واقع ہونے کی وجہ سے ایک منجمد سمندر سے تعلق رکھتا ہی، اس لئے اس کے جنوبی علاقے اسٹونیا، لیٹویا اور لتھوانیا پر روس کی توجہ زیادہ رہی۔ ان تینوں صوبوں کو بھی نئی ریاستوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا، مگر چونکہ رقبے اور آبادی کے لحاظ سے ان کی حیثیت بہت کمزور تھی۔ اس لئے نئے روس کو امید تھی کہ ان پر ہاتھ صاف کرنا زیادہ آسان ہی۔

لیٹویا

لیٹویا کی خاص آبادی لیسٹ نسل پر مشتمل ہی۔ لیکن نصف کے قریب یہودی، جرمن، پولش، لتھوانینی، اسٹونی، جرمن اور پولش قومیں بھی یہاں آباد ہیں۔ اس لئے اس اختلاف سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا روس کی کامیابی کا بہترین راستہ تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں زار کے شہنشاہی روس نے لیٹویا کو روسی قومیت کے سانچے میں ڈھالنے کی بہت کوشش کی تھی جس میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی — مگر اب نئے روس نے معاشی اشتراک اور بین الاقوامی اتحاد کے نام سے نیا حربہ استعمال کرنا شروع کیا، لیکن ان تھک جد و جہد کے باوجود لیٹویا کے قومی جذبات غالب رہے اور اس نے سوویٹ ری پبلک بن کر اشتراکی وفاق میں شامل ہونا گوارا نہ کیا۔ ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو روس کو بہت عمدہ موقعہ ہاتھ آیا اور ۳ اگست ۱۹۴۰ء میں لیٹویا کو اشتراکی لباس پہنا دیا گیا، جرمنی اور روس کی جنگ نے اس پروگرام کو چند سال کے لئے کھٹائی میں ڈال دیا تھا۔ مگر جب آخر میں میدان روس ہی کے ہاتھ رہا تو معاملہ پھر بن گیا[1]

---

[1] دیکھو "لیٹویا" مصنفہ Urch منیز مصنفہ Zolmanis

استھونیا یہی صورت استھونیا کی رہی۔ استھونیا میں بھی استھونی نسل کے علاوہ جرمن، سوئیڈش اور روسی اقلیتیں کافی تعداد میں بستی ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی سے یہ جرمنی اور روس کی ماتحتی میں ادلتا بدلتا رہا ہے۔ مگر لباس، طرزبودوباش رسم ورواج اور زبان کی انفرادیت چونکہ باقی رہی، اس لئے قومیت کا تصور باقی رہا۔[1]

لتھوانیا لتھوانیا کو بھی ۱۹۴۰ء میں روسی وفاق میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کی سرحد چونکہ پولینڈ سے ملتی ہے اور ایک عرصہ تک پولینڈ کا ماتحت بھی رہا ہے، اس لئے جرمنی اور روس کے علاوہ پولینڈ کی دراز دستیوں کا بھی شکار رہا۔ لیکن روس کے لئے سمندری ساحل حاصل کرنے کی غرض سے اپنے اس پرانے صوبے کو واپس لینا بے حد ضروری تھا۔ اس لئے اشتراکی تحریک کی راہ سے "پرامن داخلے" کی جدوجہد جاری رہی۔ اس کوشش میں اتنی کامیابی ہوئی کہ ۱۹۲۶ء کے عام انتخابات میں اشتراکی امیدوار زبردست اکثریت سے کامیاب ہوئے اور پارلیمنٹ میں قوم پرستوں کی تعداد برائے نام رہ گئی۔ یہ وقت لتھوانیا کی قومی تحریک کے لئے بہت نازک تھا۔ ہر ایک یہ سمجھ رہا تھا کہ پارلیمنٹ کے پہلے ہی اجلاس میں بالشویک وفاق کے ساتھ لتھونیا کے الحاق کی قرارداد پاس ہو جائے گی۔ لیکن عین موقع پر فوج نے قوم پرستوں کا ساتھ دیا اور اسلحہ کی طاقت سے قوم پرست لیڈروں نے ڈکٹیٹر بن کر اشتراکیوں کا سارا نظام درہم برہم کر ڈالا۔ پارلیمنٹ توڑ دی گئی، آئین معطل کر دیا گیا اور فسطائی اصولوں کے مطابق ڈکٹیٹروں کی حکومت قائم کر دی گئی۔

لیکن روس کے اس خطرے کے علاوہ قوم پرستوں کے سامنے پولینڈ سے نبٹنے

---

[1] دیکھو "استھونیا" مصنفہ Pullerits نیز مصنفہ Jackson

کا سوال بھی بہت نازک صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ پولینڈ کا ڈکٹیٹر صفت لیڈر پل سوڈسکی لتھوانیا کو پولینڈ میں شامل کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا، فرانس و برطانیہ کی ہمدردیاں بھی اس کے ساتھ شامل تھیں، کیونکہ انھیں یہ خطرہ تھا کہ اگر لتھوانیا کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو روس کے ساتھ اس کا الحاق کسی نہ کسی دن ہو جائے گا لیکن لتھوانیا نے بہت کامیاب مقابلہ کیا اور ۱۹۲۷ء میں پولینڈ سے صلح ہو گئی[1]

لتھوانیا میں روس کی اس ناکامی کے بعد بحر بالٹک کا پورا ساحل روس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جنوب میں قسطنطنیہ (استامبول)، اور دردانیال کا ساحلی علاقہ پہلے ہی ترکی لے چکا تھا۔ یونان میں بھی اشتراکی جدوجہد ناکام ہو چکی تھی، مشرق میں کوریا پر جاپان کا قبضہ تھا۔ غرض روس کے لئے سمندر میں جانے کا راستہ ہر طرف سے بند تھا۔ شمال میں بحر منجمد ضرور موجود تھا، مگر اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا، کیونکہ یہ پانی کا نہیں جمی ہوئی برف کا سمندر ہے جس میں جہاز رانی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ چیز روس کی بیرونی تجارت کی ترقی میں بری طرح حائل تھی چنانچہ جب جرمنی نے وسط یورپ میں اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے جنگ کا بگل بجانا چاہا تو اپنی ہی اغراض کی بنا پر روس نے جرمنی کے ساتھ تعاون کر لیا۔ روس کو یقین تھا کہ برطانیہ و فرانس وغیرہ کی دوستی سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ البتہ جنگ کی صورت میں ممکن ہے کچھ بات بن جائے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۰ء کو لتھوانیا، لیٹویا اور استھونیا پر حملہ کر کے انھیں ماسکو

---

[1] دیکھو لتھوانیا (ماضی و مستقبل) از Benedicten

[2] ایضاً از Harrison

کے اشتراکی وفاق میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے ایک سال بعد جب جرمنی نے روس پر دھاوا بولا تو روس کی یہ فتوحات پھر خطرے میں پڑ گئیں۔ لیکن بعد کے حالات نے پھر روس کا پلہ بھاری کر دیا۔

باب ۲۱

جرمنی

نسلی برتری اور قومی شہنشاہیت

تاریخی پس منظر جرمنی قوم یورپ کی وہ واحد قوم ہے جو نسلی، لسانی، معاشرتی اور جغرافیائی اتحاد کے لحاظ سے سب سے بڑی ہے۔ سیاسی لیاقت اور جسمانی طاقت میں بھی وہ دوسروں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اطاعت کرنے اور اطاعت کرانے کی اہلیت بھی اس میں سب سے زیادہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنی قوم کو برتر و برگزیدہ سمجھنے کا جذبہ بھی سب سے زیادہ جرمنی میں ہے۔ تاریخی روایات کے لحاظ سے جرمن اس پر فخر کرتے ہیں کہ سیزر اور آگسٹس جیسے شہنشاہوں کی رومن سلطنت سے کامیاب ٹکر لینے کا کام انہی کے ہاتھوں سرانجام پایا ہے۔ اس کے بعد جب مقدس سلطنت روما کے نام سے قرونِ وسطیٰ کا شاندار تاریخی عہد شروع ہوا تو اس کی فرمانروائی بھی جرمنی کے افراد ہی کے ہاتھ میں رہی۔ پھر اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی تحریک کا پودا لگانے والا لوتھر بھی جرمن نسل ہی کا فرزند تھا۔ اس کے علاوہ علمی و فنی تحقیقات اور سائنسی ایجادات کے میدان میں بھی جرمنی خود کو یورپ کا معلّم سمجھتا

ہی۔ وہ یہ فخر کرتا ہی کہ ہیگل و مارکس اور اینگلز جیسے فلاسفر اسی کی سرزمین کی پیداوار ہیں، اسی طرح نیٹشے اور گوئٹے بھی اسی کی خاک سے اُٹھے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب جمہوریت و قومیت کے جذبات زیادہ قوت سے اُبھرنے شروع ہوئے تو قدرتاً جرمنی کا یہ نسلی تفاخر اور زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ لیکن اس کے باوجود صنعتی انقلاب کے بعد جرمنی نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ فرانس و برطانیہ کے مقابلے میں اس کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہی۔ ہوا یہ کہ بعض وجوہ کی بنا پر نوآبادیاں حاصل کرنے کی دوڑ میں وہ دوسروں سے کچھ پیچھے رہ گیا۔ علاوہ ازیں انقلاب فرانس نے فرانس کی قومی طاقت کو منظم کرنا شروع کیا، لیکن جرمنی میں چونکہ وہی پرانا جاگیردارانہ نظام باقی رہا، اس لئے فرانس کے مقابلے میں وہ کمزور پڑنے لگا۔ فرانس نے جمہوری انقلاب کے بعد خود کو سیاست کا استاد سمجھنا شروع کر دیا تھا اور اس استادی کا پہلا شکار جرمنی کو بنایا گیا۔ جرمن عوام جمہوریت کو تو شاید قبول کر لیتے مگر فرانسیسی معلموں سے سیاست کا کوئی درس لینا انھیں کسی طرح گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ فرانس نے ۱۸۷۰ء میں جرمنی سے زبردست ٹکر لی جس نے جرمنی کے منتشر قوای کو متحد کرنے میں بڑی مدد پہنچائی۔ ایک مشترک قومی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے سب جرمن رئیس ایک محاذ پر جمع ہو گئے۔ پھر جب فرانس کو اس معرکے میں شکست ہوئی تو اتحاد کا یہ تصور اور زیادہ قوی ہو گیا بسمارک کی قیادت میں، سب چھوٹے موٹے رئیسوں نے مل کر ایک وسیع ترین جرمن سلطنت کا سنگِ بنیاد رکھا اور ۱۸۷۱ء میں سب نے ولیم اوّل کو اپنا شہنشاہ تسلیم کیا۔ اب جرمنی کی حیثیت ایک وفاق (فیڈریشن) کی ہو گئی جس میں چھبیس[۲۶] چھوٹی چھوٹی ریاستیں شامل تھیں جن کا مرکز برلن کو قرار دیا گیا۔

سنہ ۱۸۷۰ء میں فرانس کی شکست کے بعد جرمنی نے اپنی طاقت کو بڑھانے کی زبردست جدوجہد شروع کی۔ اس جدوجہد کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ فرانس کو کوئی ایسا موقعہ نہ دیا جائے کہ وہ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر اپنا جتھا مضبوط بنائے۔ مگر ہر قوم کے اغراض ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ اس لئے فرانس، برطانیہ اور روس آہستہ آہستہ قریب تر ہوتے گئے۔ اس خطرے کو روکنے کے لئے جرمنی نے آسٹریا ہنگری اور ترکی سے رشتۂ اتحاد استوار کرنا شروع کیا۔ اس طرح باہمی رقابتیں بڑھتی چلی گئیں اور آخر انیسویں صدی کے اوائل میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ "پوری دنیا ایک بارودخانہ بن کر رہ گئی جس میں آگ لگا دینے کے لئے صرف ایک چنگاری کافی تھی۔ خواہ یہ چنگاری کوئی ارادۃً ڈال دے یا کسی اتفاقی حادثے سے اس بارودخانے میں گر پڑے"[1]

چنانچہ سنہ ۱۹۱۴ء میں یہ بارودخانہ پھٹ پڑا اور قومی رقابت کے ان شعلوں نے رفتہ رفتہ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں اس جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد جرمنی کے چند چوٹی کے لوگوں نے مستند سرکاری دستاویزوں کی مدد سے اسباب جنگ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس جنگ کا آغاز صرف جنگ بلقان۔ الحاق بوسینیا سنہ ۱۹۰۸ء کے ہنگامۂ مراکش پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصلی آغاز سنہ ۱۸۷۰ء کی جنگ جرمن و فرانس سے ہوتا ہے۔ اس کشاکش کے نتیجے میں جو عہد نامے ہوئے وہی دراصل سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کا سبب بنے[2]

---

[1] ہسٹری آف ماڈرن یورپ از گوچ صفحہ ۵۵۹

[2] ریسنٹ ریولیشنز از گوچ صفحہ ۴۰۲

جرمنی کا مطالبہ تھا کہ جب دُنیا کا بٹوارہ ہو رہا ہے اور افریقہ و ایشیا کی دولت سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے تو مجھے بھی اس میں حصہ ملنا چاہیئے اور اتنا ہی ملنا چاہیئے جتنا میرے ملک کی وسعت اور میری طاقت کی کفالت کے لئے ضروری ہے[1]

جرمنی کو انگلستان سے یہ شکایت رہی ہے کہ وہ کبھی امن سے اور کبھی جبر سے اپنی تجارت کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے اور جرمنی کو پس پشت ڈال دیتا ہے[2]

غرض ان رقابتوں کا نتیجہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ آسٹریا ہنگری اور ترکی بھی چونکہ ٹوٹی ہوئی امنگوں کے لحاظ سے جرمنی کے شریک تھے۔ اس لئے وہ بھی جرمنی کے ساتھی بن گئے۔ مگر بدنصیبی سے ان دونوں ملکوں کے دامن میں دوسری قوموں کا جو پیوند لگا ہوا تھا وہ شہنشاہیت کے خرقہ محکومی کو پسند نہ کر سکا۔ ترکی میں عربوں اور مصریوں وغیرہ نے اور آسٹریا ہنگری میں سلاوی اور کروٹ جیسی اقوام نے اپنے بادشاہوں کا ساتھ نہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پرستی اور جمہوریت پسندی کے اصول کی جیت تو ایک حد تک ضرور ہوئی مگر جرمنی اور اس کے حلیفوں کی قومی شہنشاہیت کے منصوبے خاک میں مل گئے۔

۱۹۱۹ء کے بعد

اس جنگ کے بعد ۱۹۳۹ء کے دوسرے اعلان جنگ تک جرمنی میں جتنی تبدیلیاں ہوئیں وہ بہت بڑی حد تک فرانس کی رہین منت ہیں جرمنی عوام نے پریزیڈنٹ ولسن کے نکات و اصول کی آواز سن کر اپنے آقاؤں سے بغاوت کی تھی اور قیصر ولیم کی شاہی کو توڑ کر جمہوریت قائم کرنے کے بعد بڑی امیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ صلح کی جھنڈی ہلائی تھی۔ مگر

---

[1] "انٹرنیشنل انارکی" از ڈکنسن صفحہ ۱۲۷

[2] ریسنٹ ریولیشنز صفحہ ۱۲۰

صلح ہو جانے کے بعد سب سے پہلی مایوسی جرمنی کو یہ ہوئی کہ جنگ کے دوران میں کھانے پینے کی چیزوں کو جرمنی تک پہنچنے سے روکنے کے لئے جو "معاشی حصار" جرمنی کے چاروں طرف قائم کیا گیا تھا، اُسے اٹھانے سے فرانس نے انکار کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ شکست کا اعتراف کر لینے کے باوجود جرمن عوام مہینوں بھوکوں مرتے رہے اور انسانیت و رحم کے نام پر جتنی اپیلیں کی گئیں وہ سب بہرے کانوں سے سُنی گئیں اس کے بعد جب "صلحنامہ" کا اعلان ہوا تو اس کی دفعات دیکھ کر جرمنی پر سناٹا چھا گیا۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ صلحنامہ بھی پوری طرح فرانس کی مرضی کے مطابق نہ تھا۔ فرانس چاہتا تھا کہ اپنی مشرقی سرحد کو

رائن لینڈ

محفوظ کرنے کے لئے جرمنی کے مغربی علاقے کو دریائے رائن سے لے کر سرحد تک ایک چھوٹی سی آزاد ریاست میں تبدیل کر دے تاکہ یہ "وسطی ریاست" جرمنی اور فرانس کے بیچ میں حدِ فاصل کا کام دے اور اگر مشرق کی طرف سے کبھی کوئی حملہ آور فرانس کا رُخ کرے تو جنگ کا میدان فرانس کی سرزمین نہ بنے بلکہ رائن لینڈ کے نام کی ایک جرمنی ریاست ہی پر عرصۂ کارزار بپا ہو۔ پھر چونکہ فرانس اس نئی ریاست کا "حق نگرانی" بھی اپنے لئے محفوظ کر لینا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کے صاف معنی یہ تھے کہ جرمنی کا یہ علاقہ فرانس کے قبضے میں چلا جائے۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ نے فرانس کی اس خواہش کو منظور نہ کیا، دریائے رائن کے اُس پار کوئلے اور لوہے کی بہت قیمتی کانیں ہیں۔ اگر ان کو جرمنی سے لے لیا جائے تو پھر جرمنی معاشی اعتبار سے بالکل تباہ ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک تباہ شدہ قوم دنیا کے امن کے لئے بہت زیادہ خطرناک بن سکتی ہے۔ جس قوم کے سامنے مستقبل کی تمام روشنیاں ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں۔ پھر اُسے قتل و غارت گری سے روکنے والی طاقت کونسی ہو سکتی ہے؟ برطانیہ و امریکہ کے اس

اعتراض کی وجہ سے فرانس کا یہ مطالبہ پورا نہ ہو سکا۔ البتہ ان دونوں طاقتوں نے یہ وعدہ کیا کہ ہم دریائے رائن کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔ اس وعدے پر فرانس مطمئن ہو گیا۔ لیکن جب پریزیڈنٹ ولسن امریکہ پہنچا تو وہاں کی کانگریس نے اس وعدہ کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا۔ امریکہ کے نزدیک اس قسم کا وعدہ مان رو اصول کے خلاف تھا! ادھر برطانیہ نے اپنے وعدے کو امریکہ کے ساتھ مشروط کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کے ہاتھ نہ تو رائن لینڈ کی ریاست آئی اور نہ تحفظ کا وعدہ۔ اس طرف سے مایوس ہو جانے پر اس نے تاوانِ جنگ کے مطالبے پر زور دینا شروع کیا اور اتنا زبردست تاوان جرمنی پر عائد کیا جسے وہ نہ دے سکے تاکہ اس بہانے سے رائن لینڈ کے اہم فوجی اور تجارتی مقامات پر قبضہ کیا جا سکے۔ ورسیلز میں یہ تو طے ہو گیا تھا کہ چونکہ لڑائی چھیڑنے کی پوری ذمہ داری جرمنی پر ہے اس لئے اُسے اُن نقصانات کی تلافی کرنی چاہیئے جو اس جنگ سے دُنیا کو ہوئے لیکن یہ طے نہ ہوا تھا کہ "تلافی" کی رقم کیا ہوگی۔ آخر طویل بحث وتمحیص کے بعد مئی ۱۹۲۱ء میں اس رقم کا تعین ایک لاکھ بتیس ہزار ملین گولڈ مارک (ایک کھرب روپیہ) کیا گیا۔ اس رقم میں سے ۵۲ فی صدی کا حق دار فرانس قرار پایا۔

جنگ کے بعد جرمنی کی حالت

یہ رقم اتنی زبردست تھی کہ لُٹے پِٹے جرمنی کے لئے اس کی کوئی قسط ادا کرنا بھی فوری طور پر ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ۱۱ر جنوری ۱۹۲۳ء کو فرانس نے رائن لینڈ کے کوئلے اور لوہے کی کانوں پر یہ بہانہ کر کے حملہ کر دیا کہ کوئلے اور لوہے کی جو قسط "تلافی" کے سلسلے میں جرمن کو ادا کرنی چاہیئے تھی وہ ادا نہیں کی گئی۔ حملے کے بعد قبضہ یقینی تھا۔ جرمنی کارخانوں کے تمام ڈائرکٹر گرفتار کر لئے گئے اور ہر چیز پر فرانس کے

عہدیدار قابض ہوگئے۔ جرمنی میں معاشی ابتری پہلے ہی تھی اس سے اور بڑھ گئی جنگ سے پہلے جرمنی کے سکے (مارک) کی قیمت بارہ آنے سے کم نہ تھی۔ مگر جنگ کے بعد مارچ ۱۹۲۲ء میں اس سکے (مارک) کی قیمت کا یہ حال تھا کہ ۷۰۶ مارک میں امریکہ کا ایک ڈالر (جس کی قیمت تقریباً تین روپیہ ہوتی ہے) ملتا تھا لیکن یہ قیمت بھی روز بروز گر رہی تھی۔ یہاں تک کہ پانچ چھ مہینے کے بعد اگست میں گرتے گرتے یہ حال ہوگیا کہ ساڑھے چار ہزار مارک میں بھی ایک ڈالر سستا سمجھا جانے لگا۔ جب فرانس کا حملہ ہوا تو حکومت کی ساکھ بالکل ہی جاتی رہی اور جرمن سکے کی قیمت کنکر پتھر سے زیادہ نہ رہی۔ لاکھوں مارک دے کر بھی کسی بیرونی ملک کا سکہ حاصل کرنا مشکل ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے پاس جرمن سکوں کا ڈھیر لگا تھا، مگر بازار میں ان کی کوئی قیمت نہ تھی اور وہ بھوکے مر رہے تھے قیمتیں لحظہ بلحظہ بڑھ رہی تھیں، ہر شخص مارک کو بُری طرح خرچ کر رہا تھا۔ مزدوروں کو ادھر اُجرت ملی اور ادھر وہ ہانپتے کانپتے بازار میں پہنچے کہ خدا جانے گھنٹہ بھر کے بعد قیمتیں چڑھ کر کہاں پہنچیں ——— سکے کی ساکھ حکومت کی ساکھ پر منحصر ہوتی ہے جب حکومت ہی ڈانواڈول ہو تو پھر ظاہر ہے کہ اس کی بنائی ہوئی ہر چیز ڈانواڈول ہوگی۔

جرمنی کی بدحالی دیکھ کر برطانیہ بہت متاثر ہوا۔ فرانس کی خود غرضی اگر شامل نہ ہوتی تو وہ بھی متاثر ہوتا۔ لارڈ کرزن اس وقت برطانیہ کا "وزیر خارجہ" تھا۔ اس نے اس وحشیانہ خود غرضی پر فرانس کو ایک مراسلے میں تنبیہہ کی اور جتنے سخت الفاظ اس عمل پر ملامت کرنے کے لئے استعمال کر سکتا تھا، وہ کئے۔ اس وقت فرانس کے حل وعقد پر قدامت پسند طبقہ چھایا ہوا تھا جس کا لیڈر پوئن کارے تھا۔ پوئن کارے نے جنگ کے زمانے میں وزارت عظمیٰ کی ذمے داریاں

سنبھالی تھیں۔ اس لئے اب امن کے زمانے میں بھی وہ جرمنی کے ساتھ کوئی انصاف کرنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن فرانس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اس کے وزیر اعظم کی یہ پالیسی دنیا میں فرانس کی اخلاقی ساکھ کو گرا دے گی اور امریکہ و برطانیہ کی ہمدردیوں سے بھی وہ ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ چنانچہ پوئن کارے نئے انتخاب میں ہار گیا۔ مگر جرمنی کی ابتری و بدحالی کا علاج ۱۹۲۵ء تک معرض التوا میں پڑا رہا۔ البتہ اندرونی طور پر "مارک" کی ساکھ کو بحال کرنے کے لئے جرمنی نے ڈاکٹر شاچٹ کی مدد سے ایک نئی اسکیم بنائی۔ پرانا سکہ منسوخ کیا گیا اور ریٹن مارک (Reten— Mark) کے نام سے ایک نیا سکہ جاری ہوا جو رفتہ رفتہ بازار میں استحکام کے ساتھ قائم ہو گیا۔ اس نئے سکے نے ابتری کو تو دور کر دیا لیکن وہ لوگ جن کے پاس پرانے سکے تھے مفلس و قلاش ہو کر رہ گئے اس لئے کہ ان کے سکے بہت ہی کم قیمت میں خریدے گئے۔ بہرحال متوسط اور اعلیٰ طبقے کو مفلس بنا کر جرمنی نے کم از کم عام بدحالی کو ختم کر دیا اور دنیا کی تجارتی منڈی میں اس کے سکے کی ساکھ ڈانواڈول نہ رہی۔

اقتصادی کمیٹی "تلافی نقصان" کی ادائگی کا جو جھگڑا فرانس اور جرمنی کے مابین چل رہا تھا، اس نے برطانیہ اور امریکہ دونوں کو اس کا یقین دلا دیا کہ اس میں صرف جرمنی ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ خود اُن کی "تجارتِ برآمد" کو بھی سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس "تلافی" کی ادائگی نے جرمنی کی اندرونی حالت کو سخت ناگفتہ بہ بنا دیا تھا اور وہ معاشی اعتبار سے اس قابل بالکل نہ رہا تھا کہ امریکہ یا انگلستان کا گاہک بن سکے۔ اس نقصان سے متاثر ہو کر ۱۹۲۴ء میں اس قضیے کو مناسب طور پر طے کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کا کام یہ معلوم کرنا تھا کہ "تاوانِ جنگ" کی ادائی کی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے۔ اس کمیٹی کی

خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ممبر سیاسی حلقوں سے نہیں لئے گئے تھے بلکہ "ماہرین معاشیات" میں سے ان کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس کا چیرمین چارلس۔جی ڈاویز (C. G. Dawes) تھا جو شکاگو (امریکہ) کا ایک بہت بڑا اسیٹھ تھا؛ اس کمیٹی نے تحقیقات کرنے کے بعد اس کھلی ہوئی حقیقت کی تصدیق کی کہ جرمنی تاوان کی رقم کو صرف اسی صورت میں ادا کر سکتا ہے جب کہ اس کی صنعتی حالت اچھی ہو۔ اس لئے جہاں اسے ہر سال سونے اور سامان کی شکل میں بالاقساط تلافی کی رقم ادا کرنی چاہیئے، وہاں اتحادیوں کو بھی لازم ہے کہ اس کی صنعت و حرفت کی بحالی و سرسبزی کے لئے قرضہ دیں۔ اس کمیٹی نے جو عہدنامہ ترتیب دیا تھا اس پر ۱۹۲۴ء میں مختلف حکومتوں کے دستخط ہوئے۔ اس عہدنامے کی رو سے طے ہوا کہ جرمنی کو پہلے سال ایک ہزار ملین گولڈ مارک (پچھتر کروڑ روپیہ) ادا کرنا چاہیئے پھر ہر سال اس رقم کی تعداد تدریجاً بڑھتی رہے گی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء میں اور اس کے بعد کے سالوں میں آخری قسط تک ہر سال ڈھائی ہزار ملین (تقریباً دو ارب روپیہ) ادا کیا جائے گا۔

اسی سال جرمنی کی صنعتی ترقی کی بحالی کے لئے اسی کروڑ گولڈ مارک (چھ کروڑ روپیہ) کا قرض دیا گیا۔ قرضے کی یہ رقم وقتاً فوقتاً بڑھتی رہی تا آنکہ ۱۹۲۸ء میں اس کی تعداد اٹھارہ ارب گولڈ مارک (ایک ارب ۳۵ کروڑ روپیہ) ہو گئی۔

معاہدہ لوکارنو اس کوشش کے بعد، جرمنی کی سرسبزی کے لئے دوسری کوشش سیاسی بنیادوں پر کی گئی۔ جرمنی نے ابھی تک ورسیلز کے صلحنامے پر دل سے رضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا اور نہ ابھی تک اُسے لیگ آف نیشن کا ممبر ہی بنایا گیا تھا۔ اب برطانیہ اور امریکہ نے فرانس کو یقین

دلایا کہ جب تک یہ حالت رہے گی یورپ میں مستقل امن کی توقع ناممکن ہے۔ ادھر ۱۹۲۴ء کے انتخاب میں قدامت پسندوں کا لیڈر پوئن کارے بھی ہار گیا تھا اور اس کی جگہ ہیریاٹ اور برائنڈ برسر اقتدار آ گئے تھے جو بہت اعتدال پسند اور آزاد خیال واقع ہوئے تھے۔ ان حالات میں برطانیہ کے مشورے سے جرمنی کے وزیر خارجہ نے ایک کانفرنس کی تجویز پیش کی جو بالآخر ۱۹۲۵ء میں لوکارنو پیکٹ پر منتج ہوئی اور اسی سال فرانس نے رائن لینڈ کے تمام مقامات سے فوجیں ہٹالیں اور جرمنی کو اس کے تمام صنعتی علاقے واپس دے دیئے گئے۔ لوکارنو پیکٹ کی رو سے یہ طے پایا کہ جرمنی کو لیگ کا ممبر بنالیا جائے، علاوہ ازیں ورسیلز کے صلحنامے میں فرانس کی جو مشرقی سرحد متعین کی گئی تھی اُسے جرمنی نے تسلیم کرلیا اور اس کے بدلے میں فرانس نے رائن لینڈ کے نام سے ایک وسطی ریاست بنانے کا خیال ترک کر دیا جرمنی نے الساس اور لارین کے علاقوں سے ہمیشہ کے لئے دستبرداری دیدی اور انھیں مستقل طور پر فرانس کی حکومت میں تسلیم کرلیا۔ لیکن جس چیز نے فرانس کو سب سے زیادہ مطمئن کیا وہ برطانیہ کا یہ وعدہ تھا کہ اگر فرانس کی مشرقی سرحد میں جرمنی نے کوئی مداخلت کبھی کی تو، فرانس کی حمایت کی جائے گی۔ فرانس یہ بھی چاہتا تھا کہ جرمنی کی جو مشرقی سرحد پولینڈ سے ملحق ہے اس کی حفاظت کی ضمانت بھی برطانیہ کرے۔ لیکن برطانیہ نے اس سے انکار کیا اور نہ جرمنی ہی ہمیشہ کے لئے ڈانزگ اور ڈوانزگ تک پہنچنے کی گذرگاہ (کاریڈور) کو پولینڈ کے حوالے کر دینے پر تیار تھا۔ چنانچہ ان سرحدوں کی حفاظت کے لئے اسی سال لوکارنو ہی کے مقام پر فرانس نے بطور خود پولینڈ اور چیکوسلوواکیہ سے معاہدے کئے۔

لوکارنو پیکٹ کو برطانیہ کے سیاسی تدبر کی بہت بڑی جیت کہا گیا اور اس جیت کا سہرا مسٹر نیول چیمبرلین کے سر باندھا گیا جن کی جناب میں سوئڈن کے

مشہور وقف "نوبل" کی جانب سے امن عالم کو برقرار رکھنے کے اس کارنامے پر انعام کی تھیلی بھی پیش کی گئی اور یہ کہا گیا کہ جنگ دراصل ورسیلز میں نہیں بلکہ آج لوکارنو میں ختم ہوئی ہی۔

ڈاویز کمیٹی کی اقتصادی سفارشوں نے جرمنی کی بڑی ڈھارس بندھائی جس کے بعد جرمنی نے انتہائی جوش وخروش کے ساتھ معاشی ترقی..... کا کام شروع کیا۔ ۱۹۲۴ء میں ساڑھے چار کروڑ پونڈ (تقریباً ستر کروڑ روپیہ) کی رقم زیادہ تر امریکہ سے اور کمتر برطانیہ سے قرض لی گئی اور ۱۹۲۶ء تک اتنی ترقی کرلی گئی کہ جنگ سے پہلے جرمنی کی جو صنعتی پیداوار تھی اس کے مقابلے میں صرف پانچ فیصدی کی کمی رہ گئی۔ ادھر لوکارنو پیکٹ نے بھی بہت سی آسانیاں فراہم کردیں جن کی وجہ سے ۱۹۲۷ء میں جرمنی وفرانس کے سرمایہ داروں نے اپنے مشترک مفاد میں لوہے کی صنعت وتجارت کے متعلق ایک سمجھوتہ کیا۔ پھر اسی قسم کا سمجھوتہ پوٹاس کے سلسلے میں ہوا۔

آئینِ ویمر امریکہ نے اس زمانے میں جرمنی کو دل کھول کر قرضہ دیا جس سے جرمنی نے اپنے شہروں اور قصبوں کو دوبارہ نئے انداز سے بنانے اور سجانے کا کام وسیع پیمانے پر شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک جرمن جمہوریت بہترین حالت میں تھی۔ جنگ عظیم کے بعد شاہی کو شکست کرکے ۱۹۱۹ء میں جو جمہوری نظام جرمنی کے مدبرین سیاست نے تیار کیا تھا وہ چونکہ ویمر کے مقام پر مرتب ہوا تھا اس لئے ویمر کانسٹی ٹیوشن یا آئین ویمر کہلاتا تھا۔ یہ آئین جمہوریت کا صحیح آئینہ دار تھا۔ اس میں تحریر وتقریر کی کامل آزادی عوام کو دی گئی تھی۔ اور نظامِ حکومت کے ہر ہر گوشے کو عوام کے اختیار میں دے دیا گیا تھا۔ لیکن آئین کتنا ہی اچھا ہو، اگر معاشی ترقی کے وسائل محدود ہوں تو پھر سب

بیکار رہی۔ ویمر کے مدبّروں نے جرمنی کو آئین تو دیا، مگر یہ آئین انھیں نہ تو عزت دلا سکا اور نہ روٹی۔ عزت تو اس لئے نہ ملی کہ ورسیلز کے معاہدے کی ہر دفعہ جرمنی کے وقار پر ایک زبردست ضرب سے کم نہ تھی ـــــــ اُسے جنگ کا مجرم قرار دیا گیا، تاوان جنگ کی زبردست رقم اس پر عائد کی گئی۔ اس کے اہم ترین علاقے دوسروں کے قبضے میں گئے، اس کی تمام نوآبادیاں دوسروں کے حصے میں آئیں۔ اس کو چند ہزار سے زیادہ فوج رکھنے کی ممانعت ہوئی اور جرمن نسل کے لاکھوں افراد غیر ملکوں کی حکومت میں دے دیئے گئے، مگر جرمنی کی مجال نہ تھی کہ چوں کرے۔ ویمر کانسٹی ٹیوشن جرمنی کی اس بے عزتی کا کوئی علاج نہ کر سکا، اس لئے اگرچہ اس نے عوام کو آزادی دی مگر عوام کو مسرت و کامیابی نہ دے سکا۔ پھر چونکہ تمام نوآبادیوں کے چھن جانے سے بازار ہاتھ سے نکل گیا تھا اور تاوانِ جنگ کی رقم نے رہی سہی پونجی کا رُخ بھی فرانس کی طرف کر دیا تھا اس لئے غربت و افلاس کا کوئی علاج بھی "آئین ویمر" نہ کر سکا۔ سات آٹھ سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد رائن لینڈ کی کچھ کانیں جرمنی کو واپس مل گئی تھیں۔ مگر اس کے باوجود بہت سی کانیں پولینڈ، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کے قبضے میں مستقلاً جا چکی تھیں جن کی واپسی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ جرمنی لاکھ ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود بھی فارغ البالی کی زندگی بسر نہ کر سکتا تھا۔

نازی جماعت کی پیدائش

جرمن قوم کے افراد بھی ترکوں کی طرح اطاعت و تنظیم (ڈسپلن) کے پتلے ہوتے ہیں۔ مشہور ہے کہ جرمنی میں صرف دو طرح کے آدمی پیدا ہوتے ہیں: سپاہی اور جنرل یعنی اطاعت کرنے والے اور اطاعت کرانے والے۔ جرمن قوم کی زندگی کا نصب العین ہے "فرض اور عزت" (Duty and Honour) : یعنی ہر حالت میں ادائ

فرض کے احساس کو نہ بھولو اور عزت کے لئے دنیا کی ہر چیز قربان کر دو۔ ویمر کانسٹی ٹیوشن چونکہ شکست کی حالت میں مرتب ہوا تھا اور اہانت آمیز شرائط صلح کا تصور اس کے ساتھ وابستہ تھا، اس لئے اس میں "عزت" نہ تھی اور جب عزت نہ تھی تو جرمن قوم کے لئے اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔ پھر اس کانسٹی ٹیوشن میں تحریر و تقریر کی جو عام آزادی دی گئی تھی اس کی وجہ سے ملک میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے پیدا ہو گئے، حتیٰ کہ شرافت و اخلاق کے مسلمہ اصول کے خلاف بھی آوازیں اٹھنے لگیں اور بد اخلاقی و لا مذہبیت کے طوفانی جھکڑ ملک میں چلنے لگے۔ یہ صورتِ حالات جرمن قوم کے "ادائے فرض" کے احساس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی

غرض ویمر کا جمہوری آئین، انتہائی جمہوریت پسندانہ ہونے کے باوجود جرمن قوم کے طبعی قوام اور اس وقت کی صورتِ حالات کے بالکل خلاف تھا۔ اس لئے ہر طرف سے اس کی مخالفت میں آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ ڈاویز کمیٹی کی سفارشوں اور لوکار نو پیکٹ کے فیصلوں کے بعد ملک کی صنعتی حالت بہتر ضرور ہوئی، مگر چونکہ اس بہتری کے نتائج کو تاوان جنگ کی شکل میں فرانس وغیرہ کی طرف منتقل کرنا ضروری تھا۔ اسلئے ہر کارخانے میں کفائت شعاری کے اصول کو مد نظر رکھا گیا تا کہ کم از کم مصارف پر زیادہ سے زیادہ منافع ملے۔ اس چیز نے لاکھوں مزدوروں کو بیکار کر دیا، البتہ تھوڑے سے سرمایہ دار جن میں یہودیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس صورتِ حالات سے بہت فائدے میں رہے اور خوب دولت بٹورنے لگے۔ اس چیز نے جرمن قوم کی نگاہ میں یہودیوں کو خود غرضی، غداری اور نفس پرستی کا مجسمہ بنا دیا۔ مگر یہودیوں نے اس کی پرواہ نہ کی جس کی وجہ سے جرمن عوام کی نظر میں ان کی طرف سے غم و غصے کے جذبات روز بروز بڑھنے لگے —— بہر حال ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک جرمنی کی حالت بیرونی

دنیا کی نظر میں اگرچہ بہت اچھی تھی۔ مگر اندرونی طور پر وہ غم و غصے کے جذبات سے اُبل رہا تھا اور مختلف جماعتوں کے نام پر مختلف اصولوں کا پرچار کرنے والے ملک میں نظر آرہے تھے۔ ایک طرف کمیونسٹ تھے جو مزدوروں اور محنت کشوں میں پُرزور تقریریں کرکے انھیں روس جیسا نظام قائم کرنے پر ابھار رہے تھے، دوسری طرف سنٹر پارٹی کے کیتھولک تھے جو بداخلاقی و لامذہبیت کے خلاف وعظ و نصیحت کرتے پھر رہے تھے، تیسری طرف قوم پرستوں کی جماعت تھی جو قدامت پسندی ہی میں ملک کی نجات دیکھتی تھی اور "عزت و فرض" کے نام پر شاہی کو واپس لانے کی تبلیغ کر رہی تھی، چوتھی طرف قوم پرست اشتراکیوں (نیشنل سوشلسٹ) کا گروہ تھا جو "قدامت پسندی" میں تو قوم پرستوں کا مویّد تھا، مگر اسی کے ساتھ ملک کی معاشی تنظیم اشتراکی بنیادوں پر کرنے کا بھی قائل تھا۔ لیکن صلحنامۂ ورسیلز کے خلاف اسے سب سے زیادہ غصّہ تھا اور یہ اس الزام کو ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا کہ جنگ چھیڑنے کی ساری ذمے داری جرمنی پر عائد ہوتی ہے۔ اس گروہ کے افراد کا اشتراکی پروگرام مزدوروں کے علاوہ متوسط طبقے کے لوگوں کے لئے بھی بہت جاذب نظر تھا اس لئے کہ ڈاکٹر ساچٹ کی اسکیم نے ان کو بالکل مفلس و نادار بنا دیا تھا۔ وہ اپنی پچھلی حالت کو واپس لانے کے لئے، ہر طرف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ مگر کامیابی کی کوئی شکل نظر نہ آتی تھی۔ پھر ورسیلز کی مخالفت میں جو لفظ بھی کہا جاتا تھا، جرمن قوم کے جذبات پر تیر و نشتر کا کام کرتا تھا ——— اس لئے قدرتاً اس آخر الذکر پارٹی کی ہر دلعزیزی روز بروز بڑھنے لگی۔ ۱۹۲۰ء میں اس کے ممبر صرف سات تھے۔ لیکن ۱۹۲۹ء میں ان کی تعداد ایک لاکھ اٹھتر ہزار تک پہنچ گئی۔

اس جماعت کے ممبروں نے اپنا مختصر نام نازی رکھ لیا تھا جو دراصل "قومی اشتراکی جماعت" کے جرمن نام کا اختصار ہے۔ اس نازی پارٹی نے رفتہ رفتہ

اتنی ترقی کی کہ ۱۹۱۹ء کے بعد سے آج تک کے جرمنی کی تاریخ، در اصل اسی جماعت کی تاریخ ہو کر رہ گئی ہے۔

جمہوریت کے خلاف جذبات کیوں پیدا ہوئے

جرمنی کی جو تباہی ۱۹۱۴ء کے اعلان جنگ سے شروع ہوئی تھی وہ کسی طرح ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔ جنگ ختم ہوئی تو شاہی کے خلاف انقلاب آیا جس میں لاکھوں بنے بنائے گھر بگڑ گئے۔ لیکن نئے گھر بہت کم بن سکے۔ پھر سکّے کی ساکھ جانے سے ایک نئی قیامت بپا ہوئی "دولت کے ڈھیر" مگر افلاس کا زور۔ جیب میں سکے بہت مگر بازار میں ان کی قیمت برائے نام۔ اس قیامت خیزی کے بعد ڈاکٹر ساچٹ کی اسکیم آئی، اس نے جرمن سکے کی قیمت کو تو ایک معیار پر ضرور قائم کر دیا، مگر اسی کے ساتھ تمام پرانے سکے رکھنے والے لوگ دیوالیہ ہو گئے۔ ڈاکٹر ساچٹ کے "ریٹن مارک" نے "مارک" رکھنے والوں کی "دولت" کو کوڑیوں کے مول بکوا دیا۔ ۱۹۲۵ء کے بعد "صنعتی ترقی" کا دور شروع ہوا مگر تاوان جنگ کی وجہ سے کفایت شعاری کے اصول پر کارخانوں کی جو نئی تنظیم ہوئی اس نے لاکھوں مزدوروں کو بیروزگار بنا دیا۔ پھر نفع جو ہوا وہ تاوانِ جنگ کے بعد قرضوں کے سود میں دیا گیا۔ عوام جہاں تھے وہیں رہے۔ نوجوانوں میں کام کا جوش تھا، مگر کام کا کہیں وجود نہ تھا۔ نہ کام تھا نہ روٹی۔ پھر مستقبل کا مطلع بھی تاریک تھا، تاوانِ جنگ کی اربوں رقم کی ادائی کس نے دیکھی ہے۔ پھر قرضوں کے بوجھ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا لیکن ان کی ادائی کی کوئی صورت بھی نہ تھی بجز اس کے کہ فاقہ کشی و عریانی کی زندگی بسر کی جائے —— مگر کب تک؟ اس کا کوئی جواب کسی جرمن لیڈر کے پاس نہ تھا۔

ان حالات میں قدرتاً جرمن قوم کے جذباتِ غم و غصہ سمٹ کر صلح نامۂ ورسلز

اور آئین ویمر کے خلاف مجتمع ہو گئے وہ کہتے تھے کہ ورسیلز نے ہمیں امن دیا مگر ذلت کے ساتھ، صلح کی، مگر اہانت کے ساتھ، جنگ سے بچایا مگر فقر و افلاس اور مفلسی و بیروزگاری کے بھوتوں کو ہم پر سوار کر دیا ـــــــ اسی طرح ویمر کانسٹی ٹیوشن کے لیڈروں کے خلاف ان کا الزام یہ تھا کہ انہوں نے آزادی دی، مگر رہنمائی نہ کی، انہوں نے جرمن قوم کو "ہادی و مصلح" دینے کے بجائے ناجائز نفع کمانے والے سرمایہ دار دیئے اور اطمینان و سکون کے بجائے ابتری و بدنظمی کی فضا پیدا کی۔

ان حالات میں سوال یہ تھا کہ عوام کس جماعت کی طرف جائیں؟ اشتراکیت پسندوں کی جماعت کو مزدوروں میں بڑی مقبولیت حاصل تھی مگر یہ لوگ پوری قوم کے بجائے صرف مزدور و محنت کش طبقے کی سربزی چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں اس جماعت کا نصب العین قومیت کے بجائے بین الاقوامیت کے اصولوں پر قائم تھا لیکن بین الاقوامیت جرمن قوم کی سرشت کے بالکل خلاف ہے۔ جرمن اپنے کو دنیا کی سب سے بلند و برتر قوم سمجھتے ہیں اور دنیا کی تمام قوموں کو اپنے مقابلے میں ہر حیثیت سے ذلیل و خوار قرار دیتے ہیں۔ جس قوم کے یہ خیالات ہوں اُسے کوئی بین الاقوامی پروگرام کیسے پسند آسکتا ہے؟ اس لئے اشتراکیت پسندوں کی جماعت جرمن قوم کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب نہ ہوسکی اب رہ گئے اخلاقی وعظ کہنے والے اور قوم پرستی کا درس دینے والے۔ سو اول الذکر کے پاس سوائے الفاظ کے کچھ نہ تھا، اس لئے بھوکوں، مفلسوں اور بیروزگاروں کے لئے ان کا عدم وجود برابر تھا۔ موخر الذکر جماعت کے سامنے ایک معاشی پروگرام ضرور تھا لیکن اس پروگرام میں غریبوں کے بجائے سرمایہ داروں، صنعتی کاروبار کرنے والوں اور کارخانہ داروں کے مفاد زیادہ شامل تھے، اس لئے

یہ جماعت بھی اپنے اندر عوام کے لئے کوئی وجہ کشش نہ رکھتی تھی۔ اب صرف "قومی اشتراکیوں" کی نازی جماعت رہ جاتی تھی جس میں عوام کو اپنی نجات نظر آتی تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کے ممبروں کی تعداد نہایت تیزی سے بڑھنے لگی اور بڑی تیز رفتاری کے ساتھ عوام کے دل و دماغ پر اس جماعت کے لیڈروں نے قابو پانا شروع کر دیا۔

ہٹلر

لیکن نازی جماعت کی قوت وطاقت دراصل اُس شخص کی رہینِ منت ہے جسے دُنیا اڈولف ہٹلر کے نام سے جانتی ہے۔ ہٹلر جب پیدا ہوا تو کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ نہ آسکتا تھا کہ ایک معمولی باپ کا یہ معمولی لڑکا بڑا ہو کر جرمنی کی تاریخ بدل دے گا۔ اس کا باپ آسٹریا کے رہنے والا تھا اور چنگی کے محکمے میں نوکری کر کے گذر اوقات کرتا تھا۔ ہٹلر بھی آسٹریا کے ایک گاؤں براناؤ (Braunau) میں پیدا ہوا۔ سنہ پیدائش ۱۸۸۹ء ہے۔ مگر ابھی زندگی کی صرف بارہ بہاریں دیکھنے پایا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور اب ہٹلر کی کفالت کا کوئی سہارا نہ رہا۔ کسی نے بتایا کہ ویانا میں غریب و نادار طالب علموں کو وظیفہ دیا جاتا ہے اس اُمید میں گھر چھوڑ کر ویانا پہنچا، مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا اور وظیفے کی درخواست نامنظور ہوئی۔ اس مایوسی کے بعد اتنے بڑے شہر میں ہٹلر کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ مجبوراً محنت و مزدوری کر کے پیٹ بھرنے لگا۔ ایک تجربہ کار معمار نے اس کی نوعمری پر ترس کھایا اور اپنے ساتھ رکھ کر مددگار کے طور پر کام لینا شروع کر دیا۔ اب ہٹلر کا کام دیواروں پر وارنش کرنا، فرش بنانا اور چھتوں کی مرمت کرنا تھا۔ اس حالت میں اُس نے دس بارہ سال گذارے۔ لیکن اس کی طبیعت میں قیادت و اقتدار طلبی بچپن ہی سے تھی، مگر ایک نوعمر "مزدور بچے" میں ان چیز کو کون گوارا کر سکتا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے دنوں میں مزدور اس سے نفرت کرنے لگے اور مزدوروں کے

گروہ میں اس کا رہنا ناممکن ہوگیا۔ مجبور ہو کر ویانا چھوڑنا پڑا۔ وہاں سے میونخ آیا۔ اتفاق سے اس کے بعد ہی جنگ کے بادل فضا میں منڈلانے لگے اور آخر ۱۹۱۴ء کا وہ دن آیا جو دنیا کی تباہی و بربادی کا یوم آغاز تھا۔ ہٹلر کو سپہ گری سے بچپن ہی سے شوق تھا۔ اس نے اس جنگ کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا اور فوراً فوج میں بھرتی ہوگیا۔ میدان جنگ میں اس نے بڑی دلیری و جیداری کے مظاہرے کئے جن کے صلے میں اُسے کارپورل (Corporal) بنا دیا گیا۔ جنگ کے دوران میں کئی بار زخمی بھی ہوا مگر آخر وقت تک میدان میں ڈٹا رہا۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی اور فوجی رسالے توڑ دیئے گئے تو غربت و پریشانی کے دن پھر عود کر آئے۔ ادھر جرمنی میں ہر طرف تباہی و ابتری کی گھٹائیں چھا رہی تھیں اور شکست کی ذلت کے بعد صلحنامے کی ذلت نے جرمنی کے دل و دماغ کو پراگندہ بنا رکھا تھا۔ "قومی اشتراکی جماعت" جنگ کے بعد ہی قائم ہوگئی تھی، مگر ۱۹۲۰ء میں جب ہٹلر اس کا ممبر بنا تو اس کے کُل ممبر چھ تھے ساتواں نام ہٹلر کا لکھا گیا۔ جرمنی میں کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ "نیشنل سوشلسٹوں" کی بھی کوئی جماعت ملک میں ہے۔ مگر ہٹلر نے کامل عزم و ارادے کے ساتھ اس میں کام کرنا شروع کیا۔ اس نے اس جماعت کا جو پروگرام تیار کیا اس کی بنیاد ان اصولوں پر تھی۔

یہودیوں کی مخالفت، نفع اندوزوں کی مخالفت، پردیسیوں کی مخالفت آئینِ ویمر کی مخالفت اور ورسیلز کی مخالفت۔

یہی نکات تھے جو بعد میں نازیوں کا "قرآن" بن گئے

یہ پانچ نکات دراصل جرمن قوم کے دل کی آواز تھے۔ جرمنی کا کوئی طبقہ کوئی فرقہ اور کوئی گروہ ایسا نہ تھا جو ان نکات میں سے کسی نہ کسی سے متفق نہ ہو۔ چنانچہ جیسے ہی ہٹلر نے اس جماعت کے پروگرام کی تبلیغ کرنا شروع کی، لوگ جوق در جوق اس کی طرف دوڑنے لگے۔ خصوصاً نچلے متوسط طبقے کے نوجوانوں کے دل و دماغ پر

تو اس نے جادو کا کام کیا۔ ان لوگوں کو اشتراکیت پسندوں نے سرد مہری ولاپرواہی کے ساتھ نظر انداز کر رکھا تھا، اس لئے جب ان کو ایک سرپرست و مربی نظر آیا تو بے تحاشا اس کی طرف دوڑ پڑے۔ بڑے بڑے کارخانے دار جو اشتراکی سرگرمیوں سے نالاں تھے وہ بھی اس جماعت سے خوش ہوئے اور اشتراکی لیڈروں کو بے اثر بنانے کے لئے انہوں نے روپے سے اس جماعت کی مدد کرنا شروع کی۔ ڈاکٹر گوبلز کی قسم کے کچھ اعلیٰ تعلیمیافتہ مدبروں نے بھی اس کی طرف توجہ کی جنہوں نے اس جماعت میں چار چاند لگا دیئے۔ گوئبلز ایک لائق و فائق انسان تھا۔ اور "ڈاکٹر آف فلاسفی" ہونے کی وجہ سے اس کی نظر بہت گہری، دور رس اور نکتہ شناس تھی، خصوصاً پروپیگنڈا کرنے میں تو اسے بے مثال مہارت حاصل تھی۔ اس نے پارٹی کے مقاصد اور پروگرام کو اس خوبی سے پھیلانا شروع کیا کہ سالوں کا کام چند دنوں میں انجام پانے لگا۔

انقلاب لانے کی سعی ناکام

اسی زمانے میں ہٹلر کی ملاقات مارشل لڈن ڈراف (Ludendroff) سے ہو گئی جس نے ہٹلر کو مشورہ دیا کہ جس طرح مسولینی نے اٹلی کے پایۂ تخت روم میں فوجی داخلہ کر کے ناگہانی انقلاب بپا کیا تھا، اسی طرح جرمنی میں بھی کیا جائے۔ مارشل مذکور نے یہ بھی کہا کہ اگر ایسا کیا جائے تو میں اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار ہوں۔ یہ ۱۹۲۳ء کا زمانہ تھا جب فرانس نے رائن لینڈ کی کانوں پر حملہ کیا تھا اور جرمن جمہوریت کے اجزاء میں ایک ہولناک انتشار برپا ہو رہا تھا۔ نازیوں نے لڈن ڈراف کی اس تجویز کو حالات کے پیش نظر بہت مناسب سمجھا اور "فوجی داخلے" کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ لیکن جب اس داخلے کا دن آیا تو نازی دستے ابھی میونخ سے باہر ہی تھے کہ حکومت کی فوج نے انھیں روک دیا۔ کچھ لیڈر گرفتار ہوئے مگر بہت سے بھاگ نکلے۔ مگر ہٹلر نہ بھاگ سکا۔ البتہ ہٹلر کا مشہور رفیق کار گوئرنگ اگرچہ بری طرح زخمی ہوا، مگر گرفتاری سے

بال بال بچ نکلا۔ یہ اتنا زخمی ہو چکا تھا کہ نازی رضا کار اسٹریچر پر ڈال کر راتوں رات اسے جرمنی کی پہاڑی سرحد سے گزار کر اٹلی لے گئے جہاں کچھ دنوں بعد یہ اچھا ہو گیا ہٹلر پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا اور پانچ سال قید کی سزا تجویز ہوئی۔ مگر ملک میں جو انتشار و برہمی پھیلی ہوئی تھی اور نازی جماعت کی طاقت جس بری طرح روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، اُس کی بنا پر چند ماہ ہی میں رہا کر دیا گیا۔

۱۹۲۵ء میں ڈاویز کمیٹی کی تجاویز زیر عمل آئیں تو جرمنی میں کچھ اطمینان وسکون کی فضا پیدا ہو گئی۔ اس چیز نے نازیوں کی اہمیت کو گرانا شروع کیا اس کمیٹی سے ایک سال قبل ۱۹۲۴ء میں انہوں نے ریشتاغ (جرمن پارلیمنٹ) کے انتخاب میں جو حصہ لیا تھا۔ اس میں نازیوں کو مجموعی طور سے ۱۹ لاکھ ووٹ ملے تھے اور ۳۲ نشستوں پر قبضہ ہوا تھا۔ مگر اس کے بعد جو انتخاب آیا اس میں صرف نو لاکھ ووٹروں نے نازی جماعت کے امیدواروں کو ووٹ دیئے اور ریشتاغ میں صرف ۱۴ نشستیں مل سکیں۔

نازیت کی خصوصیات

نازیوں کی یہ کمزور حالت ۱۹۲۹ء تک رہی۔ لیکن اس کے بعد عالمگیر کساد بازاری کا جو دور شروع ہوا اُس میں بحران کی اُڑ کے لگ گئی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۰ء کے انتخاب میں ۶۵ لاکھ لوگوں نے نازی امیدواروں کو رائے دی اور ریشتاغ میں ایک سو سات نازی ممبر پہنچ گئے۔ اب اس جماعت کی تنظیم جرمنی میں سب سے بلند تر تھی۔ میونخ میں ایک بہترین عمارت پر اس کا قبضہ تھا۔ فوج کے سابق سپاہیوں اور بیروزگاروں کی ایک نیم تربیت یافتہ و نیم مسلح رضا کار فوج اس کے پاس تھی اور عوام کی تائید وحمایت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہٹلر، جرمن قوم کی آنکھ کا تارا بنا ہوا تھا اور قومیت و اشتراکیت کے مشترک مسلک کی تائید

میں دھواں دھار تقریریں کر رہا تھا، اُس نے جو مسلک اختیار کیا تھا، وہ ایک ایسی قوم کے لئے جو ذلیل بھی کی جا چکی ہو اور بھوکی بھی ہو۔ بہت بڑی کشش اپنے اندر رکھتا تھا بھوک کا علاج اشتراکیت تھا، اور ذلت کا چارۂ کار قومیت۔ موجودہ نظام بدل ڈالو درسیلز کو ختم کردو۔ جرمنی کے ماتھے سے یہ داغ ہمیشہ کے لئے مٹادو کہ وہ جنگ چھیڑنے کا مجرم ہے ——— ظاہر ہے کہ یہ باتیں جرمنوں کے قومی جوش کو دوبالا کرتی تھیں جس کی وجہ سے وہ دیوانہ وار ہٹلر کی جے پکارتے تھے۔ ورسیلز کی اہانت اور جنگ چھیڑنے کے الزام کے مقابلے میں ہٹلر نے بتایا کہ تم آرین نسل کی سب سے زیادہ برگزیدہ ومنتخبہ شاخ ہو اور سفید اقوام میں سب سے اعلیٰ وافضل مرتبہ رکھتے ہو۔ تمہاری تہذیب و ثقافت ساری دنیا پر بھاری ہے اور پورا یورپ بندر کی طرح تمہاری نقالی کرتا ہے ——— یہ ایسے خیالات نہ تھے جو جرمن قوم کو وجد میں لانے کے لئے کافی نہ ہوتے!!

انقلابی فضا

ویمر کانسٹی ٹیوشن نے جو جمہوریت جرمنی کو دی تھی چونکہ اس میں ذلت اور بھوک کا کوئی علاج نہ تھا، اس لئے ہٹلر نے بڑی آسانی سے اُس کی مخالفت میں فضا پیدا کرلی۔ اُس نے اپنی قوم کو یقین دلایا کہ جب تک نظم ونسق کے اس ڈھانچے کو بنیادی طور پر نہ بدلا جائے گا، افلاس و بے روزگاری کا علاج ممکن نہ ہو سکے گا۔ اس نے جرمنوں کو مقدس سلطنت روما کا زمانہ یاد دلایا اور کہا کہ اگر ہم سب مل کر کام کرتے رہے تو وہ زمانہ پھر لوٹ کر آسکتا ہے۔ ——— بلکہ اس سے بھی زیادہ شاندار و پُرجلال زمانہ ——— ویمر کانسٹی ٹیوشن نے مرد و عورت کو یکساں حقوق دیئے تھے، مگر جب مردوں ہی کے لئے کام ملنا عنقا ہو رہا تھا تو عورتیں کس شمار میں تھیں، مگر اس کے باوجود وہ مردوں کا مقابلہ کرتی تھیں جس کی وجہ سے جنسی رقابت کے جذبات پیدا ہو رہے تھے اور لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ عورتیں اپنے میدان سے ہٹ کر مردوں

کامقابلہ کر رہی ہیں۔ ہٹلر نے اس صورت حالات کو پوری طرح سمجھ کر اعلان کیا کہ مرد و عورت ہرگز برابر نہیں ہیں۔ مرد گھر کا سردار ہے اور عورت پر خانگی زندگی کی تدبیر و تکمیل کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اشتراکیت پسند لیڈر، عورت کو مرد کے دوش بدوش بٹھا رہے تھے اور ہر میدان میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ کھوے سے کھوا ملا کر کھڑا کر رہے تھے۔ اگر ملک میں اقتصادی سرسبزی کافی ہوتی اور سیاسی ابتری کا نام و نشان نہ ہوتا تو یہ چیز کسی کو ناگوار نہ گذرتی، مگر جرمنی جن حالات سے گذر رہا تھا، اُن میں جنسی مساوات کے اس وعظ نے اُسے اور مضطرب بنا دیا تھا۔ اس لئے جب ہٹلر نے پکار کر کہا کہ "عورت کا کام باورچی خانے، زچہ خانے اور گرجا گھر میں ہے اور بس"۔ تو ہر جرمن کے دل سے اس کی صدائے بازگشت بلند ہوئی حتّٰی کہ چند حوصلہ مند عورتوں کو چھوڑ کر باقی تمام جرمن خواتین نے بھی ہٹلر کے اس نعرے کا خیر مقدم کیا۔ ہٹلر کے اس نعرے کا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف تو محنت و مزدوری کے میدان سے عورت و مرد کا مقابلہ ختم ہوا اور دوسری طرف گھروں کی حالت سدھرنی شروع ہوئی اور ضبطِ تولید کی رسم نے پیدائش پر جو بند باندھ رکھا تھا وہ ٹوٹا۔

یہودیوں سے نفرت کے اسباب

ناجائز نفع اندوزوں اور بیدریغ سرمایہ جمع کرنے والوں میں یہودیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ پھر چونکہ یہودی سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے قوم پرستی کے جذبات ان میں بہت کم ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں جرمن قومیت کے اس انمل بے جوڑ اور نفع اندوز عنصر کے خلاف آواز اُٹھانا وقت کا سب سے موزوں حربہ تھا۔ پھر یہودیوں اور عیسائیوں میں جو تاریخی و روایتی بغض و عناد چلا آتا ہے اس کی وجہ سے یہود کی مخالفت مذہبی حلقوں میں بھی جوش پیدا کر سکتی تھی۔ ہٹلر نے ان باتوں کے پیش نظر یہودیوں کو جرمن قوم کی آتشِ انتقام کا ایندھن بنا دیا۔ ویسے بھی ایک غضبناک قوم

کو غصہ اتارنے کے لئے کسی روزن کی ضرورت تھی۔ ہٹلر نے یہودیوں کی شکل میں غم و غصے کے بخارات کو نکالنے کا یہ روزن قوم کو دے دیا۔ یہودیوں کی مخالفت، قومی تحریک کا جزو بن گئی اور یہودیوں سے نفرت کرنا، جرمنی سے محبت کرنے کے ثبوت میں پیش کیا جانے لگا۔

لیکن ابھی حکومت ہٹلر کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی ہنڈن برگ رئیس مملکت تھا اور ہین ریخ وزیر اعظم۔ نوابوں، رئیسوں اور سرمایہ

فان پان

داروں کا گروہ ہنڈن برگ کے ساتھ تھا۔ یہ گروہ جمہوریت کی موجودہ شکل کو تو پسند نہ کرتا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ نازیوں کے مسلک سے بھی اختلاف رکھتا تھا۔ اس لئے قدرتاً حکومت کو ان کی امداد حاصل تھی، لیکن عوام کو اپنی طرف کرنا، حکومت کے لئے سخت دشوار کام تھا۔ بیرونی قرضے کی ادائی کے لئے روپے کی ضرورت تھی جس کے لئے ٹیکس پر ٹیکس لگانا پڑ رہے تھے۔ یہ چیز حکومت کی ہر دلعزیزی کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا رہی تھی اور جن لوگوں کو بظاہر موافق ہونا چاہیئے تھا، وہ بھی مخالف بنتے جا رہے تھے۔ ان حالات میں ہنڈن برگ کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں نازی جماعت برسر اقتدار نہ آجائے۔ اس اندیشے سے اس نے ہن ریخ کی عام مخالفت کو محسوس کر کے اُسے فوراً ہی وزارتِ عظمیٰ سے الگ کر دیا اور اس کی جگہ فان پاپن کو وزیر اعظم بنایا۔ فان پان بہت مدبر و دانشمند انسان تھا اور عوام میں بھی اس کا تھوڑا بہت اثر تھا۔ ہنڈن برگ کا خیال تھا کہ اس کی مدد سے عوام کی تحریک کا زور کچھ توڑا جا سکے گا۔ لیکن اس نے جو کیبنٹ بنائی وہ خالصاً نوابوں اور رئیسوں پر مشتمل تھی جن کو ملک میں شمہ برابر مقبولیت بھی حاصل نہ تھی، تاہم اس کیبنٹ نے قوم پرستی کا راگ بڑی شدت سے الاپنا شروع کیا، مگر اسی کے ساتھ اشتراکیت کی مخالفت میں بھی ایڑی چوٹی کا زور

لگا دیا۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ "اشتراکی جمہوریت پسندوں" (سوشل ڈیموکریٹ) کی جماعت کو میدان سے نکالنے میں یہ کیبنٹ کامیاب ہو گئی۔ اسی زمانے میں لوزان میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں "تاوان جنگ" کی ادائی کو عملاً منسوخ کر دیا گیا اگرچہ یہ منسوخی امریکہ کے ساتھ مشروط کر دی گئی تھی مگر پھر بھی جرمن قوم کے لئے یہ سب سے بڑی خوشی کی بات تھی۔ فان پاپن نے اس تنسیخ کا کریڈٹ اپنی کیبنٹ کو دیا اور بڑے زور شور سے ملک کے طول و عرض میں اس پر قصیدے پڑھے گئے۔ کہا گیا فان پاپن نے ایسا کام کیا ہے جو کوئی دوسرا کبھی نہ کر سکتا تھا۔

فان پاپن کے اس عمل نے اشتراکی اور جمہوری دونوں پارٹیوں کو تو بری طرح گھائل کر دیا مگر نازیوں کا مقابلہ کرنا ابھی باقی تھا۔ جولائی ۱۹۳۲ء کا جو انتخاب آیا اس میں نازی جماعت نے ایک کرور ۳۷ لاکھ ۳۲ ہزار ووٹ حاصل کئے اور ریشتاغ میں دو سو تیس کرسیوں پر قبضہ کر لیا۔ اب فان پاپن مجبور ہوا کہ نازیوں کو حکومت میں داخل کرے۔ چنانچہ اس نے ہنڈن برگ سے کہا کہ ہٹلر کو بلا کر اس سے گفتگو کی جائے اور اگر وہ تیار ہو سکے تو کیبنٹ میں ایک وزارت اُسے دے دی جائے۔ لیکن ہٹلر نے گفتگو کے بعد وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ نازی جماعت یا تو مکمل اقتدار لے گی یا کچھ نہ لے گی۔ ہٹلر کے اس انکار پر فان پاپن کو نازیوں کے مقابلے کے لئے تیار ہو جانا پڑا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پریزیڈنٹ سے کہہ کر ریشتاغ کو ایک غیر معین مدت تک کے لئے معطل کرا دیا اور اس کے بجائے "قومی ڈکٹیٹر شپ" قائم کر دی۔ اخبارات کے منہ میں لگام دی گئی، وائرلیس اور ریڈیو پر حکومت کا قبضہ کیا گیا۔ تقریر و تحریر پر پابندیاں لگائی گئیں، پروشیا کو عملاً مرکزی حکومت کے ماتحت لایا گیا، اشتمالیت پسندوں پر

جیل کے دروازے کھولے گئے، اور یہودیوں کو ایک دم ہر سرکاری ذمے داری سے برخاست کیا گیا۔

فان پاپن کی یہ پالیسی پوری طرح کامیاب رہی۔ ہٹلر کی آواز بہت دھیمی پڑگئی اور ملک میں نازیت کا زور کم ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد جو الیکشن آیا اس میں نازیوں کو صرف بیس لاکھ آدمیوں نے ووٹ دیئے اور بس!

نازیت کا اقتدار

ان حالات میں نازیوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ مسولینی اور رضا شاہ کی طرح "فوجی حملے" کی مدد سے حکومت میں ناگہانی انقلاب لایا جائے۔ چنانچہ اس کی تیاریاں شروع ہو گئیں مگر ہنڈن برگ نے وقت سے پہلے ان تیاریوں کی بو سونگھ لی اور حفظ ما تقدم کے طور پر فان پاپن کو سبکدوش کر کے جنرل فان شلیچر[1] کو چانسلر (وزیر اعظم) بنایا جس کے متعلق خیال تھا کہ ٹریڈ یونین کے ممبروں پر کچھ اثر رکھتا ہے۔ مگر ان کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور انقلابی بادلوں کی گرج سیاسی اُفق پر سنائی دینے لگی۔ آخر ۳۰ر جنوری ۱۹۳۳ء کو پریذیڈنٹ مجبور ہوا کہ ہٹلر کو بلا کر اس کی جناب میں چانسلری (وزارت عظمیٰ) کا منصب پیش کرے۔

چانسلر ہو جانے کے بعد ہٹلر کے سامنے دو کام تھے: ایک تو سارے ملک کو نازی رنگ میں رنگ دینا اور دوسرے ملک کی اقتصادی حالت سُدھارنا۔ پہلا کام نسبتاً آسان تر تھا اس لئے سب سے پہلے اسی طرف توجہ ہوئی۔ ہٹلر کی چانسلری کے چند دن کے بعد ۲۷ر فروری کو لامعلوم طور پر کسی نے ریشتاغ کی عمارت کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا تھا۔ ہٹلر نے اس کا الزام کمیونسٹوں پر لگایا۔ ہٹلر کا یہ پروپیگنڈا اتنا ہی کامیاب ثابت ہوا جتنا ۱۹۲۴ء میں انگلستان کے مزدور انتخاب کو ناکام بنانے میں زنو ویف کے خط کی اشاعت کو کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد جو انتخاب

[1] Schleicher

آیا اُس میں نازیوں کو اتنے ووٹ ملے کہ جرمنی کی تاریخ میں کبھی کسی جماعت کو نہ ملے تھے غرض اب جو نیا ایوان حکومت بنا اس میں ساری طاقت نازیوں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ ۲۳ مارچ کو اس ایوان نے ہٹلر کو چار سال کے لیے مطلق العنان طور پر تمام اختیارات سونپ دیئے۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

اب ہٹلر نے اطمینان سے کام کرنا شروع کیا۔ ملک میں وحدت خیال اور وحدتِ عمل پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلا وار مخالف جماعتوں پر کیا گیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے مسولینی نے برسر اقتدار آنے کے بعد کیا تھا تمام غیر نازی جماعتوں کی جڑ پر بدریغ کلہاڑا چلایا گیا۔ مزدوروں کی تمام جماعتیں شکست کی گئیں، کمیونسٹ جیل بھیجے گئے، ان کی جماعتوں کے پاس جو کچھ سرمایہ تھا، وہ ضبط کیا گیا، جہاں ضرورت پڑی وہاں گولیوں یا ڈنڈوں کا استعمال بھی کیا گیا۔ اور بعض حالات میں جسمانی ایذائیں پہنچا کر دہشت زدہ بنانے کے اصول پر بھی عمل کیا گیا جیسا کہ دس سال قبل فسطائیت کے عروج پر اٹلی میں کیا گیا تھا "اشتراکی جمہوریت پسندوں" کے نام فرمان جاری ہوا کہ یا تو اپنے "گناہ" کا اعتراف کر کے ہٹلر پر "ایمان" لاؤ ورنہ نظر بندوں کے کیمپ میں قیدیوں کی سی زندگی کاٹو۔ مذہب و اخلاق کا درس دینے والوں کی کیتھولک سنٹر پارٹی کو بھی شکست کیا گیا اور کلیسا کے ارباب کار کو بھی مجبور کیا گیا کہ وہ نازیت کے خلاف کسی قسم کا کوئی لفظ منہ سے نہ نکالیں، اخبارات تھیٹر، لیکچر ہال، ریڈیو اور وائرلیس سب کے سب نازی مقاصد کی اشاعت کے لئے وقف کر دیئے گئے اور نازیت کے خلاف ہر آواز بند کر دی گئی۔

یہودیوں کے خلاف عام فضا دیکھ کر اُن کو حکومت کی ذمے داریوں سے تو فان پاپن ہی نے علیحدہ کر دیا تھا، مگر اب وہ عام نفرت و انتقام کا نشانہ بھی بنائے جانے لگے۔ اگرچہ وہ قتل تو نہیں کئے گئے لیکن ستانے چھیڑنے اور آوازے کسنے کا عمل ان کے خلاف بڑی شدت سے جاری ہو گیا۔ ان کے مال کا بائیکاٹ کیا گیا، ان کی دوکانوں سے سامان خریدنا ترک کیا گیا، اُن کی فرموں میں کام کرنا چھوڑا گیا اور ان سے اپنا ہر کام لینا بند کیا گیا حتےٰ کہ مریضوں نے یہودی ڈاکٹروں سے علاج کرانا، طالب علموں نے یہودی پروفیسروں سے پڑھنا، موکلوں نے یہودی وکیلوں کو مقدمے دینا اور کارخانے کے مالکوں نے یہودی ماہرین سائنس کی خدمات سے فائدہ اٹھانا تک چھوڑ دیا۔ جرمنی میں یہودیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ صرف ایک فیصدی یہود بستے تھے مگر یہ ایک فیصدی، دولت و ثروت، علم و فضل اور دانش و ہنرمندی میں گل سر سبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ جرمنی کے بہترین ڈاکٹر، بہترین قانون داں، بہترین فنِ تعمیر کے ماہر۔ بہترین سائنسداں یہودی ہی تھے، اس لئے جب نازیوں نے ان کے خلاف ہنگامہ شروع کیا تو جرمن قوم کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن جرمن قومیت کے احیائے جدید پر ہر نقصان قربان تھا ——— !!

ہٹلر کی اس پالیسی کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا: یعنی ۱۹۳۴ء تک پورا جرمنی نازی رنگ میں رنگ گیا۔ نازیوں کے سوا اگر کوئی جماعت تھی بھی تو برائے نام جتنے سربرآوردہ مخالف تھے یا جن پر مخالفت کا شبہ کیا جا سکتا تھا وہ سب قتل کر دیئے گئے یہاں تک کہ ریشتاغ کے آخری چانسلر شلیچر کو بھی زندہ نہ چھوڑا گیا۔ اس لئے کہ اس کے خلاف یہ "شبہ" تھا کہ وہ کوئی سازش کر

رہا ہے۔

اس زمانے میں یورپ میں تخفیف اسلحہ کا مسئلہ بڑے زور و شور سے چھڑا ہوا تھا۔ ہٹلر نے جرمنی کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا کہ وہ اسلحہ کم کرنے کے لئے تیار رہے۔ بشرطیکہ اُسے بھی دوسری قوموں کے مساوی اسلحہ رکھنے کا حق دیا جائے لیکن اس مطالبے کے جواب میں کہا گیا کہ چونکہ یہ شرط صلحنامۂ ورسیلز کے خلاف ہے کہ جرمنی کو "بڑی طاقتوں" کے برابر حق اسلحہ سازی دیا جائے۔ اس لئے اسے منظور نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر جرمنی نے تخفیف اسلحہ کانفرنس اور لیگ آف نیشن دونوں کی ممبری سے استعفا دے دیا، گویا یہ ہٹلر کا صاف و صریح اعلان تھا کہ اب جرمنی پچھلے معاہدوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے بعد فروری ۱۹۳۴ء میں جرمنی کے دستور اساسی میں یہ ترمیم کی گئی کہ ہر طاقت و اقتدار کا مرکز "وفاقی ریاستوں" کے بجائے مرکزی حکومت (ریشتاغ) کو بنایا گیا، آئین ویمر کی رو سے جرمنی میں مختلف ریاستوں کا جو فیڈریشن یا وفاق قائم کیا گیا تھا، اس میں ہر ریاست کو ایک وحدت قرار دے کر تمام اندرونی معاملات کا اقتدارِ اعلیٰ وہیں کی اسمبلی کو دیا گیا تھا، مگر اب ہٹلر نے جرمنی کے اتحاد کے نام پر ریاستوں سے یہ اختیار مرکز کی طرف منتقل کر دیا۔

ڈکٹیٹری کا عروج

نازیوں کی خوش قسمتی سے اگست ۱۹۳۴ء میں ستاسی سالہ بوڑھا پریزیڈیٹ ہنڈن برگ بھی اپنی طویل، پُر از محنت و آلام اور گوناگوں تجربات سے لبریز زندگی کے دن پورے کر کے اس جہاں کو خیرباد کہہ گیا۔ اب ہٹلر کے لئے اقتدارِ اعلیٰ کی مکمل باگ ڈور حاصل کرنے کا میدان صاف تھا۔ اُس نے اپنے پریزیڈنٹ ہونے کا اعلان کیا اور چانسلر بھی خود ہی رہا۔

اب ہٹلر کا آفتاب اقتدار نصف النہار پر پہنچ گیا اور نازی پارٹی کی طاقت شباب پر آگئی۔ اب ہٹلر اپنے دو ہم خیال و ہم عمل رفیقوں یعنی گوئبلز اور گوئرنگ کے ساتھ جرمنی کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔

معاشی ترقی کا کام

الغرض جرمنی کو نازی بنانے اور نازیت کو حاکم علی الاطلاق بنانے کا مقصد تو حاصل ہو گیا تھا، مگر اصل سوال ملک کی معاشی اصلاح کا تھا۔ جرمن عوام نے اسی امید میں ہٹلر اور ہٹلر کی پارٹی کو آسمان پر چڑھایا تھا۔ وہ منتظر تھے کہ دیکھیں اب ہمارا یہ لیڈر کیا کرتا ہے۔ لیکن یہ کام بہت مشکل تھا۔ سار کا علاقہ جہاں کوئلے کی زبردست کانیں ہیں پندرہ سال کے لئے "بین الاقوامی" قرار دیا گیا تھا۔ اس حساب سے ۱۹۳۵ء میں "رائے عامہ" کے استصواب (Plebiscite) کے بعد یہ طے ہونا تھا کہ آیا اسے جرمنی کو واپس کیا جائے یا نہیں۔ ہٹلر مجبور تھا کہ اس تاریخ کا انتظار کرے۔ بارے جب وہ تاریخ آئی تو یہاں کے باشندوں کی اکیانوے فی صدی رائیں جرمنی سے الحاق کی حمایت میں دی گئیں۔ جس کے نتیجے میں یہ علاقہ جرمنی کو دے دیا گیا۔ یہ کامیابی صنعتی ترقی کے لئے بہت مفید تھی۔ لیکن صرف اس سے جرمنی کی کایا پلٹ کر دینا ممکن نہ تھا ابھی جرمنی کے پاس دنیا میں اپنے مال کی کھپت اور کچے سامان کی خرید کے لئے کوئی بازار نہ تھا۔ اس لئے کہ جنگ کے بعد اس کی تمام نو آبادیاں انگلستان فرانس اور جاپان کے درمیان تقسیم کی جا چکی تھیں۔ جس سے ایک لاکھ ۲۸ ہزار مربع میل رقبہ اور ڈیڑھ کروڑ کے قریب انسانی آبادی اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ پھر جرمنی کی مشرق و مغرب کی سرحدیں جس طرح متعین کی گئی تھیں وہ بھی جرمنی کی معاشی و صنعتی ترقی کی راہ میں سخت رکاوٹ تھیں۔ جرمنی کی مغربی سرحد پر جو علاقہ ہے اسے جغرافیائی اور معاشی لحاظ سے ایک وحدت ہونا چاہئے۔ لیکن

قومی جھگڑوں کے پیش نظر اسے کئی حکومتوں میں تقسیم کر دیا گیا حالانکہ یہ تقسیم یہاں کے معاشی تقاضوں سے بالکل میل نہیں رکھتی تھی۔ دریائے رائن اور اس دریا میں گرنے والی دوسری چھوٹی چھوٹی ندیاں دراصل اس علاقے میں سامان لانے لیجانے کے قدرتی ذرائع رسل و رسائل ہیں مگر جس طرح شمالی فرانس، بلجیم ریوہ سار اور رلارین کی لوہے اور کوئلے کی کانیں کئی آزاد ریاستوں میں بٹی ہوئی تھیں اسی طرح یہ قدرتی وسائل آمد و رفت بھی کسی ایک کے قبضے میں نہیں تھے۔

اسی بنا پر دریائے رائن کے مغربی ساحل کے پار جو علاقہ ہے اُسے ورسیلز میں غیر مسلح رکھا جانا تجویز ہوا تھا مگر جب ہٹلر نے لیگ آف نیشن ہی کو علی الاعلان ٹھکرا دیا تھا، تو پھر ہر معاہدے کی خلاف ورزی آسان ہو گئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء کے موسم بہار میں یکایک جرمن فوجیں اس علاقے میں داخل کر دی گئیں اور تمام فوجی استحکامات وہاں کر دیئے گئے۔ لیگ آف نیشن اس سے کچھ دن پیشتر جرمنی کی پالیسی پر لعنت و نفریں کا اظہار کر چکی تھی۔ لیکن جس طرح ایک سال پہلے مسولینی نے لیگ کی پروا کئے بغیر حبشہ کو روند ڈالا تھا، ہٹلر نے بھی اس کی تقلید کی تاہم اس کے بعد مختلف ذرائع سے دُنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ جہاں تک مغربی سرحدوں کا تعلق ہے، جرمنی ورسیلز کی خلاف ورزی نہ کرے گا، البتہ مشرق میں ڈانزگ، کاریڈور (سمندری گذرگاہ) بالائی سلیشیا اور میمل لینڈ وغیرہ کی نسبت نظر ثانی ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ بالائی سلیشیا کی کوئلے کی کانیں جرمنی کے لئے بہت قیمت رکھتی ہیں، مگر ۱۹۲۱ء میں "رائے عامہ کے استصواب" (   ) کے بعد یہ علاقہ پولینڈ کو دیدیا گیا تھا۔ اسی طرح میمل لینڈ کو ۱۹۲۴ء میں لتھوانیا کا جزو ہونا تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کی متعلق ۱۹۳۵ء میں ہٹلر نے لیگ سے کہا تھا کہ "افسوسناک واقعات رونما ہونے

سے قبل میمل کے سوال پر نظر ثانی کر لی جائے کیونکہ میمل کا تعلق ہر اعتبار سے جرمنی سے ہی"۔

تحریک اتحادِ جرمن نازی جماعت اپنے جن مقاصد کو لکار لکار کر بیان کیا کرتی تھی اُن میں سب سے زیادہ اہمیت اس پر دی جاتی تھی کہ وسطی یورپ میں جتنے جرمن رہتے ہیں، ان سب کو ایک جھنڈے تلے جمع ہونا چاہیئے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۳۳ء میں نئے انتخاب کے بعد جو پارلیمنٹ (رشتاغ) بنتی اس نے آئین ویمر کو معطل کر کے تمام اختیارات ہٹلر اور اس کے وزیروں کی کیبنٹ کو سونپ دیئے۔ اس کے بعد سے پھر جرمن پارلیمنٹ کا کوئی انتخاب نہیں ہوا جب مدت زیادہ گذر گئی تو جنوری ۱۹۴۳ء میں ہٹلر نے یہ فرمان جاری کیا کہ یہی پارلیمنٹ ۱۹۴۷ء تک کام کرے گی۔

اس ڈکٹیٹر شاہی کا واحد مقصد صرف یہ تھا کہ جرمن قوم میں مرکزیت پیدا کی جائے حتیٰ کہ نازی پارٹی کے سوا باقی تمام سیاسی جماعتوں کو ناجائز قرار دے کر شکست کر دیا گیا، اپریل ۱۹۳۳ء میں ایک "قانونِ اتحاد" پاس ہوا جس نے عملاً ہٹلر کو بادشاہ بنا دیا اور رشتاغ محض مشیروں کی مجلس بن کر رہ گئی۔

اپنی حدود میں اتحاد و مرکزیت کی یہ فضا پیدا کرنے کے بعد نازیوں کی نظر وسط یورپ کے اُن جرمن علاقوں کی طرف اٹھی جو ۱۹۱۹ء کے صلحنامہ ورسیلز کی رو سے جرمنی سے کاٹ کر علیحدہ کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ جہاں جہاں جرمن آباد تھے وہاں نازی پارٹیاں قائم کی گئیں۔ اور آخر ۱۹۳۸ء میں وہ وقت آیا کہ جرمنی کی فوجیں آسٹریا کے علاقے میں داخل ہو گئیں اور ۹۷ فیصدی جرمن آبادی کے اس ملک کو جسے ورسیلز نے جرمنی سے کاٹ دیا تھا جرمنی میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے بعد پہلے چیکو سلو واکیہ کے جرمن

علاقے سوڈیٹین لینڈ پر دھاوا بولا گیا اور پھر پورے چیکوسلوواکیہ پر تصرف کر لیا گیا۔ پھر ڈانزگ اور میمل لینڈ کی باری آئی جس کے نتیجے میں پولینڈ سے دست و گریباں ہونا یقینی تھا۔ جرمنی کی ان مسلسل ہنگامہ آرائیوں نے فرانس اور برطانیہ کو چونکا دیا اب تک یہی کوشش کی جا رہی تھی کہ جس طرح ہو جنگ کو ٹال دیا جائے، مگر جب ہٹلر کے حوصلوں نے صلحنامۂ ورسیلز کی دھجیاں بکھیرنی شروع کر دیں تو برطانیہ و فرانس کی قوت برداشت نے جواب دیدیا اور ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو اعلانِ جنگ کر دیا گیا۔

یوکرین نازی اپنے مقاصد کا اعلان کرتے وقت یہ بھی کہا کرتے تھے کہ یوکرین کی سرزمین کو روس اور پولینڈ کے قبضے سے نکال کر ایک آزاد ریاست میں تبدیل ہونا چاہیئے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں برسیٹ لٹافسک کا جو معاہدہ روس و جرمنی کے مابین ہوا تھا اس میں فن لینڈ وغیرہ ریاستوں کے علاوہ یوکرین کو بھی ایک مستقل ریاست بنانا تجویز ہوا تھا، مگر جرمنی کی شکست کے بعد بالشویک روس نے خونی لڑائیاں لڑ کر یوکرین کا بہت سا خطہ اشتراکی نظام میں شامل کر لیا۔ تھوڑا علاقہ پولینڈ نے اپنے ماتحت کر لیا۔ اس لئے یوکرین کی آزادی کے سوال پر قدرتاً پولینڈ اور فرانس دونوں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے، مگر دنیا سنہ ۱۹۳۹ء میں...... یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ روس اور جرمنی جو اپنے اصول سیاست کے لحاظ سے بعد المشرقین رکھتے ہیں۔ اچانک طور پر ایک معاہدے کی رو سے متحد ہو گئے ہیں۔ اس معاہدے کے بعد دنیا نے عجیب عجیب قیاس آرائیاں کیں، اور روس کی اشتراکیت اور جرمنی کی قومی اشتراکیت کو ایک خانے میں رکھنے کے لئے بہت کچھ اوراق سیاہ کئے گئے۔ لیکن دنیا کی یہ حیرت جلد ہی دور ہو گئی جب ۲۲ جون سنہ ۱۹۴۱ء کو یکایک یہ خبر فضا میں گھومتی ہوئی سنائی

دی کہ ہٹلر کی طوفانی فوجوں نے اسٹالن کی اشتراکی دنیا پر دھاوا بول دیا۔

لیکن روس پر حملے کا واقعہ دراصل ایک ایسا موڑ تھا جس نے نازی اقتدار کا رُخ پلٹ دیا۔ اب جرمنی ساری دنیا سے معرکہ آرا ہو گیا تھا۔ اٹلی اس کا حلیف ضرور تھا مگر فوجی طاقت کے لحاظ سے اٹلی کی کوئی حیثیت نہ تھی جاپان اپنے جداگانہ منصوبوں کی تکمیل میں لگا ہوا تھا۔ تاہم شروع شروع میں جرمن فوجیں روس کی سرحد میں دور تک گھستی ہوئی چلی گئیں لیکن ۱۹۴۳ء کے اوائل سے حالت بگڑنے لگی۔ چار پانچ سال کی مسلسل خونی معرکہ آرائیوں نے جرمن عوام کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا، اب جو شکست کے آثار شروع ہوئے تو ملک میں مایوسی کے ساتھ غم و غصّے کے جذبات بھی تیزی سے پھیلنے لگے۔ ہٹلر نے ان مخالفتوں کو آہنی بازو سے دبانے کی کوشش کی مگر اب نقشہ پلٹتا جا رہا تھا

آخر ۱۹۴۵ء میں ہٹلر کی موت کی خبر شائع ہوئی اور اس کے چند روز بعد جرمنی دوسری بار اپنے حریفوں کے آگے ذلت و رسوائی کے ساتھ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا۔[1]

(۱۹۳۹ء کی جنگ کے اسباب و وجوہ اور نتائج پر تبصرہ دوسری جلد میں کیا گیا ہے)

---

[1] اس باب کی تیاری میں حسب ذیل کتابیں پیش نظر رہی ہیں۔ ۱۹۳۹ء کے اعلان جنگ کے بعد جرمنی پر بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں مگر جن کتابوں میں جنگ جیتنے کے جانبدارانہ پروپیگنڈے کو کافی دخل تھا، انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے:

(1) The House that Hitler Built: Roberts.

(2) My Struggle: Hitler.

(3) From Bismark to Hitler: Syndes.

(باقی فٹ نوٹ دیکھو صفحہ ۷۳۵ پر)

(4) The Spirit and Structure of German Fascism: Brady.

(5) The Roots of National Socialism (1783-1933): Butler.

(6) The New Germany: Earmarth.

(7) Hitler's Reich: Armstrong.

(8) Educational Philosophy of National Socialism: Kneller.

(9) Hitler over Europe: Henri.

(10) Imperial Germany and the Industrial Revolution: Vebben.

(11) Germany: Schierbrand.

(12) Post War World Jakson.

(13) The Fall of German Republic: Clark.

(14) Germany: Gooch.

(15) A Short History of Germany: Henderson,

باب ۳۲

اسپین

تہذیب مغرب کا لنگڑا کھلاڑی

آٹھ سو سالہ تہذیبی ورثے کی تباہی

سیاسی شعور و احساس اور قومی تنظیم و یکجہتی کے لحاظ سے اسپین، یورپ کا سب سے گھٹیا ملک سمجھا جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی کے آخر تک مسلسل آٹھ سو سال کی مدت میں عربوں نے تہذیب و تمدن کا جو قالب تیار کیا تھا اور معاشرت و معیشت کے مختلف گوشوں میں جو ترقیاں ہوئی تھیں، وہ سب عیسائی تعصب و تنگ نظری کا شکار ہو گئیں ۱۴۹۲ء میں جب عرب سلطنت کے آخری تاجدار نے اسپین کی حدود کو خیرباد کہا اور اسپین کے ہر گلی کوچے میں مسلمانوں کے خلاف نعرۂ بزن بلند کیا گیا تو عیسائی دُنیا نے اپنا سب سے بڑا اور شاندار کارنامہ ہی یہ سمجھا کہ اسلام و عیسائیت کے باہمی ربط و ضبط کے نتیجے میں فکر و نظر کا جو ترقی پسندانہ ماحول تیار ہو اتھا، اُسے "خلاف عیسائیت" قرار دے کر نیست و نابود کر دیا جائے

اس مقصد کے لئے انکوئزیشن کے نام سے ایک عدالت قائم کی گئی جس نے بیشمار انسانوں کو زندہ جلوانے، پھانسی پر لٹکانے اور طرح طرح کے جسمانی آزار پہنچاکر مار ڈالنے کا وہ کارنامہ سرانجام دیا جس پر آج خود یورپ کے مؤرخوں کی نگاہیں بھی شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں، انکوئزیشن کے مشہور مؤرخ لارینٹ (Llorent) نے سرکاری دستاویزوں کی شہادت دیکر لکھا ہے کہ اس محکمے کے پہلے افسر نے صرف سولہ سال کی مدت میں نو ہزار انسانوں کو آگ میں زندہ جلوایا۔ اس کے بعد دوسرے حاکم نے آٹھ سال کے عرصے میں سولہ سو سے زائد کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ اسی طرح یہ سلسلہ سالہا سال تک چلتا رہا۔

غرض انکوئزیشن کے مظالم کی تفصیلات اتنی بھیانک ہیں کہ جب یورپ کو ذرا ہوش آیا اور مذہبی جنون و دیوانگی کا جوش کچھ ہلکا پڑا، تو ان جرائم کی داستان سن کر ہر شخص لرز اٹھا بعض لوگوں نے یورپ کے دامن سے اس داغ کو دھونے کے لئے ان تمام واقعات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور مذکورہ بالا مؤرخ لارینٹ کے بیانات کی تردید میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر ان کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے جیمبرس انسائکلوپیڈیا کا یوروپین مورخ لکھتا ہے" —— ان تمام تردیدی بیانات کے باوجود یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ انکوئزیشن نے انسانیت پر ایسے خوفناک مظالم ڈھائے ہیں کہ اُن کے تصور سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں[۵]۔"

بہرحال جب جنون و دیوانگی کا یہ دور ختم ہوا تو دنیا نے یہ دیکھا کہ اسپین کی حدود سے ہر مسلمان کو نیست و نابود کرنے اور اسلام کی ہر نشانی کو مٹا دینے

---

[۵] جلد ۶ صفحہ ۱۴۹

کی کوشش میں آٹھ سو سال کے قومی ورثے اور صدیوں کے تہذیبی اندوختے کو بھی تباہ و برباد کر دیا گیا ہے۔ دنیا میں روزِ ازل سے شاہیاں بنتی اور بگڑتی رہی ہیں اس لئے اسپین کی عرب شہنشاہیت کا مٹ جانا نہ تو کوئی غیر قدرتی بات تھی اور نہ حیرتناک لیکن ہر غیر عیسائی باشندے کو چن چن کر قتل کر دینا اور مسلمانوں کی ہر یادگار، ہر نشانی اور ہر اثر کو مٹانے کے درپے ہو جانا، بلا شبہ دنیا کا سب سے بڑا غیر قدرتی اور حیرتناک واقعہ تھا، دنیا کی جتنی تاریخ انسانی دماغ معلوم کر سکا ہے اس میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جو یورپ کی اس وحشت و بربریت کا مقابلہ کر سکے، عربوں کی آٹھ سو سالہ عہدِ حکومت میں اہلِ اسپین کی ذہنیت، فنونِ لطیفہ، شعر و ادب اور علم و فضل ہی کی دنیا میں انقلاب بپا نہ ہوا تھا، بلکہ اسپینی اتحاد و یکجہتی کی داغ بیل بھی آہستہ آہستہ پڑتی جا رہی تھی، لیکن روم کے پاپائے اعظم نے مذہب کا جو نرالا تصور یورپ کے دل و دماغ میں بھر دیا تھا اس نے لوتھر کی "اصلاح مذہب" کی تحریک سے قبل۔ یورپ کی عیسائیت کو ہر انسانی تصور سے معرا کر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ پانچویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں صدی عیسوی تک کے "وسطی زمانے" کی وحشت و جہالت، درندگی و بربریت کو یاد کر کے کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے، اور "وسطی زمانہ" ——— (Middle Ages) کا لفظ ہی "وحشت و خونخواری" کے مترادف ہو کر رہ گیا ہے

پاپائی اقتدار اور اس کے نتائج

عربوں نے یہودیوں اور عیسائیوں سے مل کر اسپین کی تجارت کو بہت ترقی دی تھی، قرطبہ و غرناطہ کی درسگاہوں نے علم و فضل کی بخشائش ہر کس و ناکس

پر عام کر رکھی تھی اور فنِ تعمیر میں تو ایسے نادر نمونے دنیا کے سامنے پیش کئے گئے تھے کہ غرناطہ کا قصر الحمرا، اور اسی قسم کی دو چار عمارتیں جو عیسائی دستبرد سے بچ رہی ہیں، آج تک دنیا کے لئے باعثِ حیرت بنی ہوئی ہیں، لیکن جب عیسائی فاتحوں نے مسلمانوں اور یہودیوں کو یہ فرمان سنایا کہ یا تو عیسائی ہو جاؤ یا اسپین چھوڑ دو، تو اسپینی معاشرت و معیشت کی یہ ساری عمارت یکلخت زمین پر آرہی اور تجارت و صنعت کا سارا ڈھانچہ تباہ و برباد ہو کر رہ گیا، پھر اس کے بعد "عیسائیت" کا دور شروع ہوا۔ لیکن یہ عیسائیت دراصل "پاپائیت" کا دوسرا نام تھی اور "پاپائیت" اقتدار طلبی کے ہم معنی تھی، اس لئے عیسائیت کے نام پر جو کچھ ہوا اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ بن بیاہے پادریوں اور بن بیاہی کلیسائی لڑکیوں کا ایک گروہ ملک میں پیدا ہونے لگا، اور دولت و ثروت کے انبار "مذہب" کے نام پر ان "پادریوں" اور "پادرنوں" کے لئے وقف کئے جانے لگے، رہبانیت و ترکِ دنیا کے نام پر معصیت کوشی و عیش پرستی کی یہ فضا روم کے پاپائے اعظم کے سایۂ اقتدار میں پل رہی تھی۔ اس چیز نے گویا اسپین کی ذہنی و معاشی ترقی پر قفل لگا دیا اور ملک میں غربت و جہالت کی تاریکی روز بروز بڑھنے لگی۔

اتفاق سے اسی زمانے میں امریکہ کی "نئی دنیا" کا انکشاف سیاحوں نے کیا تھا۔ انکوزیشن کے زمانے میں اسلامی آثار و نقوش کو مٹا ڈالنے کا جو کام اسپین نے انجام دیا تھا، اس کی بنا پر وہ خود کو عیسائی دنیا کا "غازی ملک" سمجھنے لگا تھا۔ اب اسپین کا سب سے بڑا فخر یہ تھا کہ عیسائی تبلیغ و تعلیم کا مقدس فرض قدرت نے اسی کو سونپا ہے۔ چنانچہ "نئی دنیا" کی دریافت کے بعد ملک کے وہ بہترین دل و دماغ جو قوم و وطن کی اصلاح کر سکتے تھے

"مذہب کی تبلیغ" کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے، مگر یہ تبلیغ صرف اس طرح کی گئی کہ "نئی دنیا" کے قدیم باشندوں کو کامل بیرحمی و بیدردی کے ساتھ مٹا کر، اپنی حکومتیں قائم کی گئیں۔ چنانچہ آج چار سو سال بعد بھی جو قدیم باشندے قتل و غارتگری سے بچے ہوئے ہیں، اُن پر عیسائی تبلیغ کا صرف اتنا اثر ہے کہ اسپین کے سفید فام افراد کو وہ اپنا حاکم علی الاطلاق سمجھیں اور بے زبان جانوروں کی طرح ان کی خدمت و اطاعت میں اپنی عزت، صحت اور محنت سب کچھ قربان کرتے رہیں۔

انقلاب فرانس اور اسپین

یہ تھی اسپین کی حالت جب اٹھارویں صدی کے آخر میں فرانس میں جمہوری انقلاب کا وہ عظیم الشان سیلاب اٹھا تھا جس کے سامنے یورپ کے ہر تاجدار کے تخت وتاج کے پرخچے اُڑے جا رہے تھے اور جس نے عوام کی حکومت دستوری کا سکہ دنیا سے منوانا شروع کر رکھا تھا۔ لیکن اسپین چونکہ ایک ہزار سال پیچھے ڈھکیلا جا چکا تھا اور اس نے اپنی پچھلی ترقی کی تمام عمارتوں کو یکسر منہدم کر کے رکھدیا تھا، اس لئے انقلاب فرانس کا یہ سیلاب اس خشک و سنگلاخ زمین کو سرسبزی و روئیدگی کی نعمت نہ بخش سکا۔ اسپین نے خود کو جہاں پہنچا دیا تھا، وہیں کھڑا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب نپولین اعظم کا ستارۂ اقبال چمکا تو اس نے بڑی آسانی سے اسپین پر قبضہ کر لیا اور یہاں کے بادشاہ کو تخت سے اُتار کر اپنے بھائی جاسف کو اس کا فرمانروا بنا دیا۔ ادھر اٹھارویں صدی کے آخر ہی سے "نئی دُنیا" کے نوآبادکاروں نے "مادر وطن" سے بغاوت کرنا شروع کر دی تھی جو آخر کار انیسویں صدی کے اوائل تک پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور اسپین کے ہاتھ سے سمندر پار

کی تمام نوآبادیاں ایک ایک کرکے نکل گئیں، ہر جگہ جو اسپینی نوآبادکار تھے، انہوں نے اپنی آزاد و خود مختار حکومتیں قائم کرلیں، اس چیز نے اسپین کی دولت میں بھی بہت کمی کردی اور ایک دلچسپ مشغلہ بھی عوام کے ہاتھ سے جاتا رہا اب قدرتاً عوام کی بدحالی رنگ لائی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ حکومت کی سختیاں بھی شروع ہوئیں۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں بادشاہ کی تخت نشینی پر سخت خانہ جنگی ہوئی۔ ایک گروہ ملکہ ایزابیلا کو تخت نشین کرانا چاہتا تھا، دوسرا گروہ اس کے مقابلے ایک دوسرے بادشاہ کو تاج و تخت کا مالک بنانے کا ساعی تھا، آخر میں ایزابیلا کے حامی جیت گئے، مگر یہ حکومت کسی کو مطمئن نہ کرسکی، تاہم وہ ستائس سال تک جس طرح ممکن ہوا حکومت کرتی رہی لیکن اس کے بعد ناؤ نہ چل سکی۔ بغاوت کے آثار نمودار ہوئے اور ملکہ مذکور کو اپنے بیٹے کے حق میں تخت سے دستبردار ہونا پڑا، مگر نیا بادشاہ بھی کیا کرسکتا تھا؟ بگڑی ہوئی حالت کو سدھارنا اس کے بس کا روگ نہ تھا اب عوام نے شاہی کا بوجھ گردن سے اُتار پھینکنے ہی میں اپنی نجات کی صورت دیکھی اور بادشاہ کو معزول کرکے جمہوریت قائم کی گئی۔ لیکن جمہوریت ہو یا شاہی، وسائل دولت کے بغیر وہ عوام کو مطمئن کیسے کرسکتی ہے؟ اس لئے یہ جمہوریت بھی ناکام رہی۔ عوام میں نہ اتنی بیداری تھی اور نہ ان کا سیاسی شعور اتنا ترقی یافتہ ہوا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ جمہوری لائنوں پر خوشحالی و سرسبزی کی عمارت کھڑی کرتے۔ اس کے برعکس ہوا یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آیا، انہوں نے "بادشاہت" شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوریت کے بجائے "دستوری شاہی" کی طرف عود ہوا، عوام کی ایک منتخبہ پارلیمنٹ قائم ہوئی

اور حکومت کا ایک دستور اساسی ترتیب دیا گیا۔ لیکن نتیجے میں یہ دستوری حکومت بھی محض فریب نظر ثابت ہوئی اور اصل طاقت بادشاہ ہی کے ہاتھ میں رہی، اسپین کی فضا مکر و فریب، حیلہ جوئی و جعلسازی اور تخویف پسندی و رشوت ستانی جیسے افعال کے لئے بہت سازگار ہے، اس لئے کہ یہی وہ حربے تھے جن کو عرب سلطنت کے خاتمے کے بعد ہی مسلسل استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ چنانچہ اس دستوری حکومت کا ہر شعبہ بھی انہی حربوں کا شکار بنا بظاہر انتخاب ہوتا تھا، مگر رائے شماری کے وقت حسب مرضی پرچے گھٹا بڑھا دیئے جاتے تھے، جھوٹے اعداد و شمار پیش کرنا، دھمکیاں دے کر اپنی مرضی کے مطابق رائے حاصل کرنا، رشوتوں سے کام نکالنا، ووٹوں میں گڑبڑ کر دینا، غرض فریب کاری و جعلسازی کی جتنی شکلیں ممکن ہو سکتی تھیں وہ سب بیدریغ استعمال کی جاتی تھیں، عوام میں اوّل تو ان چیزوں کو سمجھنے کا شعور ہی بہت کم تھا اور اگر کچھ تھوڑا بہت تھا بھی تو اس کے دفعیہ کی طاقت ان کے پاس نہ تھی اس لئے یہ حالت عرصے تک چلتی رہی۔ جب ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کا اعلان ہوا تو اسپین غیر جانبدار رہا۔ اس غیر جانبداری نے اُسے بہت فائدہ پہنچایا سامانِ جنگ اور سامانِ خور و نوش کے لئے دونوں فریق اس کے گاہک تھے۔ اس صورت حالات نے اسپین کی اندرونی صنعت و تجارت کو بہت چمکایا۔ بیسیوں نئے نئے کارخانے کھل گئے اور ملک میں بیروزگاری کا نام و نشان نہ رہا، یورپ کے ہر گوشے سے ہر روز لاکھوں کی فرمائشیں آتی تھیں اور اسپینی تاجر منہ مانگے داموں ان فرمائشوں کی فراہمی کرتے تھے۔

پہلی جنگ کے بعد اسپین کی حالت

لیکن ظاہر ہے کہ خوش نصیبی کا یہ دور عارضی تھا۔ جب جنگ ختم ہوئی

تو ایک دم تجارتی فرمائشوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا، اور جس تیز رفتاری سے دورانِ جنگ میں نئے نئے کارخانے قائم ہوئے تھے اسی تیز رفتاری سے اب بنے بنائے کارخانے بند ہونے لگے اور سینکڑوں جمے جمائے کاروبار اکھڑنا شروع ہو گئے، لاکھوں مزدور کام پر سے ہٹائے گئے جس نے بے روزگاروں کی ایک غضبناک فوج ملک میں تیار کر دی اور جگہ جگہ ہڑتالیں اور ہنگامے ہونا شروع ہو گئے۔

ریف پر حملہ

اسپین کا بادشاہ الفانسو کافی سمجھدار اور تجربہ کار انسان تھا۔ مگر اس شور و شر کو دبانے کے لئے جن وسائل دولت کی ضرورت تھے وہ اس کے پاس نہ تھے۔ اس لئے ملک کی توجہ کو ہٹانے کے لئے اس نے ایک نئی چال چلی۔ اسپین کے قبضے میں مراکش کا جو علاقہ ہے اس میں ریف ایک مقام ہے۔ جہاں بربر قوم بستی ہے۔ یہ لوگ شجاعت و جنگجوئی میں ضرب المثل ہیں، مگر چونکہ عہد حاضر کے آلاتِ حرب سے بالکل بے بہرہ ہیں، اور آجکل کے سیاسی ہتھکنڈوں سے بھی نا آشنا ہیں، اس لئے اسپین اور فرانس کے محکوم ہو گئے، مگر یہ محکومی محض خارجی معاملات تک محدود ہے اندرونی نظم و نسق میں وہ اپنے "سلطان" کے ماتحت ہیں لیکن یورپ کی یہ "سرپرستی" بھی انہوں نے دل سے کبھی قبول نہیں کی، ان کی تلواریں آزادی کے حصول کے لئے ہمیشہ بے نیام رہی ہیں اور جب کبھی بھی موقعہ ہاتھ آیا ہی، انہوں نے استقلال وطن کے لئے کسی قربانی کے پیش کرنے سے دریغ نہیں کیا ہی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۹ء، میں غازی عبدالکریم کی سرکردگی میں بربر قوم نے اسپین سے بغاوت کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا شاہ الفانسو نے سوچا کہ اسپین کے قدیم مذہبی تعصبات کو ابھار کر قرطبہ و

غرناطہ کے سلاطین کے ان نام لیواؤں کے خلاف اگر صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا جائے گا تو اسپین کے بھوکے اور بیروزگار عوام کے شور و ہنگامے سے قدرے نجات مل جائے گی۔ چنانچہ کروسیڈ کا بگل ہر ہر کلیسا سے بجایا گیا اور مسیح کی عظمت اور انجیل کے نام پر ریف کے "بے دینوں" کے خلاف اسپینی نوجوانوں کو سر ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ مقابلہ میں آنے کے لئے للکارا گیا۔ الفانسو کا یہ منتر کارگر ثابت ہوا۔ اسپین کے جاہل و نیم جاہل جوق در جوق اس آواز پر اکٹھا ہونے لگے اور ایک بڑے جم غفیر کے ساتھ ۱۹۲۱ء کے موسم گرما میں مجاہدینِ ریف کے حامیوں پر یلغار بولی گئی۔ مگر تمام ساز و سامان کے باوجود اسپین کو زبردست شکست ہوئی۔ دس ہزار اسپینی سپاہی قتل ہوئے، پندرہ ہزار قیدی بنے، کمانڈر نے خودکشی کر لی اور تمام سامانِ حرب پر ریف کے مجاہدوں کا قبضہ ہو گیا۔

یہ شکست اتنی ہولناک اور ایسی تباہ کن تھی کہ اسپین کا بچہ بچہ اس پر چیخ اٹھا اور الفانسو کی مخالفت میں ہر طرف سے آوازیں اُٹھنے لگیں بادشاہ نے عوام کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے شکست کے اسباب کو معلوم کرنے کے لئے فوراً ایک شاہی کمیشن مقرر کیا، مگر اس سانحے کی ذلت اور تباہی اتنی شدید تھی کہ اس قسم کے حیلے بہانوں سے عوام کا جوش ٹھنڈا ہونے والا نہ تھا، بادشاہ نے محسوس کیا کہ اگر صورتِ حالات یہی رہی تو اُسے تخت و تاج سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں ری ویرا نامی ایک لیڈر عوام میں بہت مقبول ہو رہا تھا۔ بادشاہ نے اپنے آپ کو بچانے کے خیال سے یہ طے کیا کہ ری ویرا کو ڈکٹیٹر بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس نے اس کی ڈکٹیٹری کا راستہ ہموار کرنے کے لئے

وزیر جنگ سے استعفا دلایا، وزیر خارجہ پر دباؤ ڈال کر اسپین کو الوداع کہلوایا اور لطائف الحیل سے کام لے کر پارلیمنٹ کے اجلاس کو ملتوی کرتا رہا۔ ان حالات نے قدرتاً ری ویرا کو حکومت کے جز و کل پر چھا جانے کا موقعہ دیا۔ آخر ری ویرا نے ۱۴ ستمبر ۱۹۲۳ء کو اپنی ڈکٹیٹری کا اعلان کر دیا اور بادشاہ نے سارے اختیارات اس کو سونپ دیئے، مگر یہ عمل ظاہر میں اس طرح ہوا کہ عوام یہ سمجھے کہ ری ویرا نے خود اپنی طاقت سے بادشاہ کو مجبور کر کے یہ رتبہ حاصل کیا ہے۔

اس حکمت عملی نے الفانسو کے تخت و تاج کو بچا لیا۔

ری ویرا

ری ویرا کا پورا نام پیر امو ڈی ری ویرا ہے ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا، اسپین کے پایۂ تخت میڈرڈ میں فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد بذات خود مراکش کی جنگ میں شریک ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اور جنگوں میں بھی یہ شامل رہا تھا جس کے صلے میں اسے لیفٹننٹ جنرل کا عہدہ دیا گیا تھا۔ یہ فطرتاً بہت بلند حوصلہ، اولوالعزم اور بہادر تھا اور اسی کے ساتھ قائدانہ صفات کا مالک بھی تھا جب الفانسو نے وزیر جنگ اور وزیر خارجہ کو راہ سے الگ کر دیا اور پارلیمنٹ کو منعقد ہونے سے روکے رکھا تو قدرتی طور پر اس نے میدان خالی پاکر اپنی فوجی طاقت کے بل پر حکومت پر قبضہ کر لیا اور چندی دن میں وہ تمام طاقت و اقتدار حاصل کر لیا جو اٹلی میں مسولینی کو حاصل تھا۔

ری ویرا نے بھی مسولینی کے فسطائی اصولوں پر کاربند ہونا شروع کیا۔ لیکن فرق یہ تھا کہ اٹلی میں عوام کی طاقت پوری طرح مسولینی کے ساتھ تھی۔ لیکن یہاں یہ صورت نہ تھی۔ مسولینی نے اپنے ہموطنوں کی

دل و دماغ پر قابو پا رکھا تھا، اس کے فلسفۂ فسطائیت نے عوام کے خیالات و احساسات میں ایک زبردست تحریک پیدا کر دی تھی اور وہ رومۃ الکبریٰ کی عظمت رفتہ کو دوبارہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ لیکن اسپین میں ری ویرا اپنی قوم کو اتنا متاثر نہ کر سکا۔ وہ ڈکٹیٹر ضرور تھا اور ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا، لیکن عوام کے قلوب کی کنجی اس کے ہاتھ میں نہ تھی۔ تاہم سات سال تک وہ اسپین کا حاکم رہا۔ مگر اس دوران میں نہ تو داخلی اعتبار سے اسپین کچھ اوپر اٹھ سکا اور نہ خارجی اعتبار سے۔ ۱۹۲۶ء میں جب لوکارنو پکٹ کے بعد جرمنی کو لیگ کی کونسل (مجلسِ عاملہ) میں لیا جانا طے ہوا تو اس نے مطالبہ کیا کہ اسپین کو بھی یہ عزت دی جائے۔ مگر جب یہ مطالبہ منظور نہ ہوا تو ری ویرا نے اپنے نمائندے کو ہدایت کی کہ لیگ سے واک آوٹ کر جائے۔ جبرالٹر یا جبل الطارق کی جنوبی گوشے پر طنجہ کا ایک مختصر ساخطہ بین الاقوامی قرار دیا گیا ہے۔ ری ویرا نے مطالبہ کیا کہ یہ اسپین کو ملنا چاہیے مگر یہ مطالبہ بھی پورا نہ ہو سکا۔ البتہ ۱۹۲۶ء میں فرانس کی امداد حاصل کر کے غازی عبدالکریم کے خلاف دونوں حکومتوں نے متحدہ محاذ بنایا اور غازی موصوف سے اطاعت منوالی۔ اس ایک چیز کے سوا ری ویرا کی خارجی پالیسی کچھ زیادہ کامیاب نہ رہی۔ مزید براں ملک کی اندرونی حالت کی اصلاح و ترقی کے کام میں بھی کچھ خاص ترقی نہ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں اس کی طرف سے سخت بد دلی پیدا ہو گئی۔ کلیسا کے ارباب اقتدار کو اس نے اپنا حامی بنا رکھا تھا۔ مگر یہ چیز بجائے مفید ہونے کے اور مضر ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ اب اسپین کے عوام پندرھویں صدی کے عوام نہ رہے تھے کہ مذہب کے نام پر جاہ طلبی و عیش پرستی کے ان مجسموں کو برداشت کر سکتے۔ چنانچہ جب ری ویرا نے کلیسا کی بعض درسگاہوں کی "دینی اسناد" کو یونیورسٹی کی اسناد کا ہم پلہ

قرار دینا چاہا تو ملک میں سخت شور و شغب مچا جس کی وجہ سے بالآخر اس تجویز کو ختم کرنا پڑا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا، ری ویرا کا آخری وقت قریب ہوتا نظر آتا جاتا تھا۔ آخر ۱۹۲۹ء کی عالمگیر کساد بازاری کا جھٹکا اس کے اقتدار کے خاتمے کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور بادشاہ نے ری ویرا استعفا مانگ لیا۔ مگر اب پھر بادشاہ کو اپنے تخت و تاج کی فکر ہوئی۔ ملک میں ہر طرف گڑبڑ مچی ہوئی تھی اور سخت گیری و تشدد کے تمام ذرائع کے باوجود بے چینی و بے اطمینانی کے شعلے روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ جمہوریت پسندوں کی جماعت نے ارادہ کیا کہ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو مسولینی کی طرح حکومت پر فوجی دھاوا بول دیا جاوے، لیکن اتفاق سے راز طشت از بام ہو گیا اور حکومت نے مقابلے کے کافی انتظامات کر لئے۔

اب تاریخ ۲۸ر اکتوبر کے بجائے ۱۵ ر دسمبر مقرر ہوئی، لیکن جے کا کی فوجی چھاؤنی کے افراد اپنے جوش پر قابو نہ پا سکے۔ اور انہوں نے مقررہ وقت سے تین دن پہلے ہی آزادی کا جھنڈا لہرا دیا۔ اس چھوٹی سی باغی جمعیت کو بڑی آسانی سے گرفتار کر لیا گیا اور ان پر مقدمات چلائے گئے۔ اس واقعے نے سب کے حوصلے پست کر دیئے اور سارا پروگرام غارت ہو کر رہ گیا۔ طے یہ ہوا تھا کہ ۱۵ر دسمبر کو ایک طرف تو پایۂ تخت میں ہر سمت سے فوجیں داخل ہوں گی اور دوسری طرف مکمل ہڑتال کر دی جائے گی، لیکن چند لوگوں کے حد سے بڑھے ہوئے جوش کی وجہ سے کچھ نہ ہو سکا بلکہ جتنے مشتبہ جمہوریت پسند تھے وہ سب ایک ایک کر کے گرفتار کر لیئے گئے اور میڈرڈ کا قید خانہ ملک کے تمام سیاسی لیڈروں سے بھر گیا۔

جمہوریت کا قیام

ان گرفتاریوں سے اسپین کے طول و عرض میں ایک کہرام مچ گیا اور جگہ جگہ بغاوت کی تیاریاں ہونے لگیں ادھر قید کے اندر جو لوگ تھے وہ بھی خاموش نہ بیٹھے بلکہ اس جبری اجتماع سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ایک سیاسی پروگرام بنایا جو "جیل پروگرام" کے نام سے سارے ملک میں مشہور ہو گیا۔ عوام کی بے چینی و اضطراب روزبروز بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کو مجبوراً تمام قیدیوں کو رہا کرنا پڑا، رہائی کے فوراً ہی بعد پارلیمنٹ کے انتخاب کا اعلان ہوا۔ اس انقلاب میں جمہوریت پسندوں کو زبردست اکثریت حاصل ہوئی۔ جب پارلیمنٹ منعقد ہوئی تو سب سے پہلا سوال آئین حکومت کا پیش ہوا۔ آخر ۱۳ر اپریل ۱۹۳۰ء کو فیصلہ ہوا کہ آج سے اسپین کی شاہی ختم کی جاتی ہے اور اس کی جگہ جمہوری نظام قائم کیا جاتا ہے۔ بادشاہ کے متعلق طے ہوا کہ اُسے قتل تو نہ کیا جائے البتہ جلاوطن کر دیا جائے۔ اسپین میں نہ رہے، اسپین سے باہر جہاں چاہے آزادی سے رہ سکتا ہے۔

عوام کا یہ فیصلہ اٹل تھا۔ بادشاہ میں اس کو بدل ڈالنے کی طاقت نہ تھی۔ چند حاشیہ نشین نیاز مندوں کے سوا، سارا ملک بادشاہت کو ختم کر دینے پر اصرار کر رہا تھا۔ بادشاہ نے یہی غنیمت سمجھا کہ اس کی جان لینے کا فیصلہ نہیں ہوا۔ آخر اسی دن رات کی تاریکی میں تھوڑا بہت ضروری سامان لے کر اسپین سے نکل گیا۔

دنیا کو جب اسپین کے اس انقلاب کا علم ہوا تو وہ حیرت میں رہ گئی کہ اتنا بڑا تغیر اور اس قدر پُرامن طور پر پایۂ تکمیل تک کیسے پہنچ گیا، شاہیت پسندوں کے حوصلے اتنے پست ہو گئے تھے کہ انہوں نے مطلق کوئی مقابلہ

نہ کیا۔ فوج پہلے ہی باغی تھی، اس لئے اس کا ایک سپاہی بھی بادشاہ کی حمایت میں نہ تھا۔ ادھر انقلابی جماعت برسر اقتدار آئی تو اس نے بھی کوئی انتقام نہ لیا۔ حتےٰ کہ بادشاہ کے خاندان کو بڑی عزت کے ساتھ اسپین سے باہر جانے دیا۔ شاہی خاندان یا اس کے متعلقین میں سے کسی ایک کو بھی ستانے یا چھیڑنے کا واقعہ رونما نہ ہوا۔ البتہ کلیسا کے ارباب اقتدار جو ہر آن و ہر لحظہ شاہیت کے دست و بازو بنے رہتے تھے، اُن کو خوب ستایا گیا یہ لوگ ہمیشہ سے عوام کے مقابلہ میں اقتدار کا ساتھ دیتے تھے، ان کے قبضے میں کروڑوں روپے کی جائدادیں تھیں اور سلطنت کے حل و عقد میں ان کو ہمیشہ بہت بڑا دخل رہا تھا، اس لئے جس طرح ۱۷۸۹ء میں انقلابِ فرانس کے موقع پر کلیسا کے ان اعمال کا انتقام عوام نے لیا تھا، اسی طرح انقلاب اسپین کے وقت اسپین میں لیا گیا۔ دو سو سے زائد گرجا گھر جلا کر خاک کر دیئے گئے اور "پاپائیت" کی ہر پناہ گاہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ البتہ یہ امر حیرت انگیز ہی کہ غیظ و غضب کے اس جوش میں پادریوں کی جان پر کسی نے ہاتھ صاف نہیں کیا۔ اور کوئی واقعہ بھی ایسا نہ ہوا جس میں کوئی پادری مارا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہی کہ اکثر پادری بھی خفیہ طور سے اس تحریک میں شامل تھے۔

نئی جمہوری حکومت نے ملک کا جو آئین (کانسٹی ٹیوشن) بنایا وہ بہت زیادہ جمہوری تھا اور اس کی ترتیب میں جرمنی کے "آئین ویمر" اور انگلستان کے دستورِ حکومت دونوں کی تقلید کی گئی تھی۔ پرائمو ڈی ویرا نے اپنی ڈکٹیٹری کے زمانے میں بین الاقوامی تعلقات خراب کر لئے تھے۔ اس کانسٹی ٹیوشن میں خاص طور سے ان تعلقات کو اچھا کرنے کے لئے دفعات

بڑھائی گئیں۔ لیکن اس آئین میں برطانوی دستور حکومت کی تقلید کی وجہ سے ایک خرابی یہ تھی کہ اگر پارلیمنٹ اس کے تحت ٹھیک ٹھیک قوانین بنا دے تب تو عوام کو بہت کچھ مل سکتا تھا۔ لیکن اگر اس اختیار کے استعمال میں عیاری و چالاکی سے کام لیا جائے تو پھر کچھ بھی نہیں۔

کلیسا اور جمہوریت

آئین کی ترتیب کے بعد کلیسا کا جھگڑا اچھلا۔ کلیسا چاہتا تھا کہ اس کے اقتدار کو تسلیم کیا جائے لیکن جمہوریت اس کے لئے تیار نہ تھی۔ بالآخر بڑی ردّ و قدح کے بعد ایک سمجھوتہ ہوا جسکی رو سے یہ طے پایا کہ پادری اپنے مذہبی مشاغل میں مصروف رہ سکتے ہیں اور گرجا گھر بھی تعمیر کئے جا سکتے ہیں لیکن ارباب کلیسا کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ ملک کی تعلیم میں حصہ لیں اور نہ حکومت کی طرف سے کسی وظیفے یا جاگیر پانے کے حقدار وہ ہوں گے، مگر عیسائیوں کا وہ فرقہ جو یسوعی (Jesuits) کہلاتا ہے اور جس کے افراد سیاست و حکومت پر اپنا اثر قائم کرنے کی وجہ سے سارے یورپ میں بدنام ہیں، اور جگہ جگہ سے نکالے بھی جا چکے ہیں ان کو اب اسپین بھی برداشت نہ کر سکا۔ اور ان کی جماعت کو حکماً شکست کر دیا گیا۔ اس جماعت کے فنڈ میں ساڑھ لاکھ گنی کی جو رقم تھی وہ سب بحق حکومت ضبط قرار دی گئی البتہ ایک کرور چالیس لاکھ گنی کی جو رقم یسوعیوں کی ذاتی ملک تھی اور جو انہی کے نام پر بنکوں میں جمع تھی اسے ضبط نہ کیا گیا۔

صوبوں کا مطالبۂ خود مختاری

اس سمجھوتے کے بعد ایک حد تک سکون کی فضا پیدا ہو گئی۔ لیکن کلیسا چونکہ اس سے مطمئن نہ تھا اس لئے ہر مناسب موقعہ پر وہ احتجاج کی آواز بلند کرتا رہا جس کی وجہ سے انتشار کی حالت پوری طرح ختم نہ ہو سکی۔ چرچ کے علاوہ

اشتراکیت پسندوں اور مزدوروں سے بھی جمہوریت کو سخت مقابلے کا سامنا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں سخت بلوے ہوئے اور جگہ جگہ ہڑتالیں کی گئیں اور مزدوروں کے جلوس نکالے گئے، ادھر اسپین کے دو صوبے بیسک اور کے ٹے لونیا میں خود مختار ہونے کی تحریک بڑے زور شور سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ صوبے اپنی معاشرت و تہذیب کی وجہ سے ہمیشہ اسپین سے الگ ہو کر خود مختار رہنے کے آرزومند رہے ہیں۔ شاہیت کے دور میں ان کو اندرونی معاملات میں کامل آزادی حاصل تھی اور میڈرڈ سے برائے نام ان کا تعلق تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جب پیرس میں صلح کانفرنس ہوئی اور یورپ میں قوموں کے لحاظ سے حکومتوں کی حدود کھینچی گئیں تو یہاں کے لوگوں نے بھی اپنی خود مختاری کے لئے درخواستیں پیش کیں، مگر اس وقت یہ چیز ممکن نہ ہو سکی۔ پھر جب ریویرا کی ڈکٹیٹری کا زمانہ آیا تو علیحدگی کے اس رجحان کو سختی کے ساتھ دبانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جب ۱۹۲۹ء میں ریویرا کا دور آمریت ختم ہوا تو دبے ہوئے جذبات پھر ابھر آئے۔ جب جمہوریت بنی اور نیا آئین حکومت تیار ہوا تو بیسک اور کے ٹے لونیا کے مطالبۂ خود مختاری پر کافی توجہ کرنا پڑی اور اندرونی معاملات میں پورا اقتدار ان کو دیا گیا، لیکن اس سے علیحدگی پسندوں کا اطمینان نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان علاقوں کے علیحدگی پسند افراد بھی اشتراکیت پسندوں اور مزدوروں کے ساتھ مل کر حکومت کے مخالف ہوگئے۔

ان مخالفتوں پر قابو پانے کی کامیاب ترین صورت یہی ہو سکتی تھی کہ کم از کم کسانوں کو مطمئن کر دیا جاتا۔ چونکہ اسپین بہت بڑی حد تک زراعتی ملک ہے اور کسانوں کی تعداد ملک میں سب سے زیادہ ہے، اس لئے اس جم غفیر کی ہمدردی، جمہوریت کی سب سے بڑی پشت پناہ ثابت ہو سکتی تھی مگر اس کے

لئے بڑے زمینداروں سے دشمنی مول لینی پڑتی تھی۔ اسلئے جمہوریت اس پروگرام میں بھی کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کے بجائے اس نے زمینداروں، پادریوں اور متوسط طبقے کے تاجروں اور صناعوں وغیرہ کے افراد سے ایک سمجھوتہ کرکے حکومت کی بنیادوں کو مضبوط بنانا چاہا۔ اس "اتحاد ثلاثہ" نے بیسک اور کے ٹے لونیا کے علیحدگی پسندوں، اور اشتراکیت پسندوں دونوں کو بُری طرح نظر انداز کرنا شروع کیا خصوصاً مزدوروں کی تحریک کو بری طرح پیسا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوری حکومت کے خلاف ایک طاقتور محاذ بننے لگا جس میں اکش وریف کے سیدھے سادے عربوں اور بربروں کو بھی شامل کرلیا گیا۔

جنرل فرانکو نئی جمہوریت نے ملک کے غیر مطمئن عناصر کو مختلف طریقوں سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن بےچینی کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی اور آخر ۱۷ جولائی ۱۹۳۶ء کو کھلم کھلا مسلح بغاوت شروع ہوگئی جس میں فوج کا ایک حصہ بھی شامل ہوگیا، قومیت و وطنیت کے پرستاروں نے ایک فوجی جنرل، فرانکو کی قیادت میں اپنا طوفانی جہاد شروع کردیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وسطی یورپ میں ہٹلر اور مسولینی کا طوطی بول رہا تھا۔ جنرل فرانکو کے پیرو بھی چونکہ قومی سربلندی کے داعی تھے، اس لئے نازیت و فسطائیت کے فلسفے نے ان پر گہرا اثر کیا۔

جنرل فرانکو نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ہٹلر اور مسولینی کے نقش قدم پر چلنا شروع کردیا۔ اٹلی اور جرمنی نے قدرتاً فرانکو کے اس عمل کا خیر مقدم کیا اور اسپین کو اپنے حلیفوں کی فہرست میں شامل کرنے کے لئے فرانکو کی ہر ممکن امداد کی گئی۔ اس صورتِ حال نے روس اور فرانس کو بہت زیادہ پریشان کیا۔ برطانیہ کے لئے بھی حالات کی یہ رفتار قابلِ برداشت نہ تھی۔ لیکن فرانکو نے عوام کے قومی وطنی جذبات کو اتنا مشتعل کیا کہ جمہوریت و اشتراکیت دونوں فلسفے اس سیلاب

میں بہہ کر رہ گئے اور وہ کامیابی پر کامیابی حاصل کرتا چلا گیا، دو سال کی خونریزی کے بعد مئی ۱۹۳۸ء میں حکومت کا آخری مورچہ بھی سر ہو گیا اور نئی حکومت کا اعلان کر دیا گیا جس میں فرانکو کو ٹھیک ٹھیک وہی اختیارات دیئے گئے جو ہٹلر نے جرمنی میں اور مسولینی نے اٹلی میں حاصل کر رکھے تھے۔ فرانکو نے اسپین کی تمام سیاسی جماعتوں کو شکست کر کے صرف ایک سیاسی جماعت بنائی اور اس پر بھی اپنا اقتدار قائم کر کے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا[1]

فرانکو کے خلاف بغاوت

لیکن ابھی فرانکو اپنی اس نئی ڈکٹیٹرانہ مسند پر سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ کا طوفان امڈ پڑا۔ یہ موقعہ فرانکو کے لئے بہت نازک تھا ایک طرف مسولینی اور ہٹلر کے وہ احسانات تھے جن کی وجہ سے اسپین کا ڈکٹیٹر بننے میں زبردست مدد ملی تھی، دوسری طرف دو تین سال کی خانہ جنگی کی وجہ سے ملک کی حالت اتنی ابتر تھی کہ وہ اس احسان کا بدلہ چکانے کے بالکل ناقابل تھا۔ ان حالات میں وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ اسپین کو غیر جانبدار رکھے اور اخلاقی طور پر اپنے دوستوں کی جو امداد اس طرح

---

[1] مزید تفصیلات کے لئے دیکھو:۔

(1) The Origion of Modern Spain: Trend.

(2) Spanish Ordeal

(3) The Nazi Conspiracy in Spain,

(4) Spain: Madriege.

(5) The Politics of Modern Spain: Manual.

ممکن ہو سکتی ہی، کرتا رہے۔ لیکن ہٹلر و مسولینی کی شکست کے بعد اس غیر جانبداری کا وہی نتیجہ نکلا جو نکلنا چاہیئے تھا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی برطانیہ، فرانس اور روس نے فرانکو کو گرانے کے لئے اندرونی و بیرونی دونوں طریقوں سے اُن عناصر کی حوصلہ افزائی شروع کردی جو اس مقصد میں مفید ہو سکتے تھے۔ چنانچہ جنگ کے خاتمے پر ۱۹۴۶ء میں صورت حالات یہ تھی کہ ——— "اگرچہ اسپین کے اندر فرانکو کی طاقت بہت مضبوط تھی لیکن برطانیہ کی کوششوں سے اس کی مخالف طاقتیں منظم ہونے لگیں خصوصاً شاہیت پسند عناصر کے حوصلے بہت بڑھ گئے لیکن روس کسی شکل میں بھی شاہی کو واپس لانے کا حامی نہ تھا۔ اسی طرح فرانس کے کمیونسٹ بھی شاہی کو پسند نہ کرتے تھے۔ فرانس کے سوشلسٹوں میں سے بھی اکثر اس باب میں کمیونسٹوں سے متفق تھے۔ برطانیہ کی رائے عامہ بھی شاہیت کو واپس لانے کے خلاف تھی۔ البتہ امریکہ کا رویہ کچھ بین بین تھا وہ چاہتا تھا کہ فرانکو کو گرانے کے لئے شاہیت اور جمہوریت کا جو ہتھیار بھی مفید ہو، استعمال کرلیا جائے، تاہم اس کا جھکاؤ بھی زیادہ تر جمہوریت کی طرف تھا۔ باہر کی اس رائے عامہ کے علاوہ خود اسپین کے شاہیت پسند حلقے بھی وزیروں کی نئی کیبنٹ کے معاملے میں بے حد اختلاف رکھتے تھے۔ ایک طبقہ جن افراد کی وزارت کو پسند کرتا تھا، دوسرا اس پر صاد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔"[۱۵]

لیکن ان اختلافات کے باوجود فرانکو کی طاقت کو توڑ دینے میں سب متفق تھے۔ ۲۷ فروری ۱۹۴۶ء کو فرانس نے اپنی جنوبی سرحد کو اسپین پر

[۱۵] "اسٹیٹسمین" (دہلی) ۲۴ فروری ۱۹۴۶ء بحوالہ نیویارک ٹائمز

بند کرکے اُن فرانکو شکن عناصر کو زبردست مہمیز دی جس کے نتیجے میں فرانکو کے خلاف اندر اور باہر ایک طاقتور جدوجہد شروع ہوگئی۔

(بعد کی تفصیلات کے لئے دیکھو حصہ دوم)

(ختم شد حصّہ اوّل)

ہماری نئی ادبی مطبوعات

لندن سے آداب عرض (دوسرا ایڈیشن) مصنفہ آغا محمد اشرف۔ آغا اشرف کے اُن مضامین کا مجموعہ جو جنگ کے دوران میں بی۔ بی۔ سی لندن سے نشر ہوئے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے۔

دیس سے باہر مصنفہ آغا محمد اشرف۔ دُنیا کے مختلف حصوں کی سیر و سیاحت کے بعد آغا صاحب کے تاریخی و ادبی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (عہ/)۔

ادبستان تیسرا ایڈیشن۔ مولانا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی [illegible] بہترین مجموعہ۔ قیمت عہ۔

شیشہ و سنگ مصنفہ مرزا محمد اعلیٰ خنجر لکھنوی۔ بارہ اصلاحی معاشری اور اخلاقی افسانوں کا مجموعہ لکھنوی زبان میں بہترین تصنیف۔ قیمت مجلد دو روپے (عہ)۔

اتفاقات مصنفہ مرزا محمد اعلیٰ خنجر لکھنوی۔ یہ مرزا صاحب کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں رومانوی معاشری زندگی کے اتفاقات کو بہترین پیرایہ اور پاکیزہ زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت عہ۔

دھڑکتے دل مصنفہ جناب اختر شیرانی۔ ہندوستان کے رومانوی شاعر کے بہترین ادبی مضامین اور افسانوں کا مجموعہ۔ وہ مضامین جو مقبولیت عامہ حاصل کر چکے ہیں۔ اختر شیرانی کا نام ہی مضامین کی خوبی کا ضامن ہے۔ قیمت مجلد سے (تین روپے)۔

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ مرتبہ جناب اختر شیرانی۔ ڈرامائی دُنیا میں بے نظیر کتاب کا اضافہ۔ یہ کتاب چوٹی کے ڈرامسٹ فن کاروں کی کد و کاوش کا مجموعہ ہے۔ جس کو اختر شیرانی نے انتخاب کیا ہے۔ قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے۔

مقالاتِ شیرانی مصنفہ حافظ محمود شیرانی۔ ادبی حلقوں میں حافظ صاحب کے ذہنی نقش و نگار جس قدر و منزلت سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر یہ کتاب آپ کے جذبات کی ترجمانی کرے گی۔ اس میں حافظ صاحب کے بہترین ادبی مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔ قیمت سے۔

اُردو زبان اور ہندو مصنفہ ناظم سیوہاروی۔ اُردو زبان کی ترقی و سربلندی میں ہندو اہلِ وطن نے جو بے بہا خدمات سر انجام دی ہیں۔ اس کتاب میں ان کی خدمات و حالاتِ زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ قیمت [illegible]

تاریخ انقلابِ روس مصنفہ شیر جنگ۔ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی، اخلاقی اور مجلسی رد و بدل کی روح فرسا تاریخ جو ایک سیاسی مصنف کی طویل جد و جہد کد و کاوش کا بہترین مرقع ہے۔ موجودہ تمام تاریخوں سے کامیاب و کامل کتاب ہے۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے (للعہ)۔

اوراقِ پارینہ مصنفہ شیر جنگ۔ ایک قیدی ادیب، سیاسی رہنما کے ادبی جواہر پاروں کا مجموعہ۔ ادباء کے لئے درسی کتاب کا کام دیتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ/)۔

کارل مارکس اور اُس کی تعلیمات از شیر جنگ۔ کارل مارکس کی تحریک نے روس کے ظلم و تعدی کا قلع قمع کر کے جس امن و سلامتی کی حکومت کی داغ بیل ڈالی، فاضل مصنف نے اُس کی مفصل روداد دیکر کارل مارکس کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ قیمت مجلد [illegible]

آنسو از عارف جالندھری۔ چیدہ اور معرکۃ الآرا افسانوں کا مجموعہ جس میں ادب، اخلاق اور معاشری زندگی کے نشیب و فراز کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے (عہ/۱۲)۔

سکھ عہدِ اسلامی میں از مولانا عباد اللہ گیانی۔ موجودہ تواریخ اور حکایات میں سلاطینِ اسلام کے عہدِ حکومت میں سکھوں پر موہوم و بے بنیاد مظالم کے افسانے مشہور کئے گئے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں مشہور و مستند سکھ تصانیف سے ثابت کیا ہے کہ یہ تمام کہانیاں سراسر غلط ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ/)۔

تذکرۂ حسینی مصنفہ صاحبزادہ مولانا مولوی علم الدین صاحب القادری کرجی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر علماء اہلِ سنت والجماعت کی مستند کتابوں سے استفادہ کر کے مناقب محرم پر بہترین تصنیف ہے۔ قیمت [illegible]

پتہ:۔ کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور

برانچ:۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجرانِ کتب بوچالی فریر روڈ، کراچی